USMAN
PUBLIC
FREE
LIBRARY
for
EVERYONE

عثمان پبلک
فری لائبریری

امجد اسلام امجد کی 11 کتابوں کا مجموعہ

Hum Us kay Hain By Amjad Islam Amjad

Sapne Kaise Baatain Karain By Amjad Islam Amjad

Shehar Dar Shehar By Amjad Islam Amjad.pdf

Us Paar By Amjad Islam Amjad

بارش کی آواز از امجد اسلام امجد

پس گفتگوامجد اسلام امجد

ذرا پھر سے کہنا امجد اسلام امجد

سپنے بات نہیں کرتے از امجد اسلام امجد

فشار... امجد اسلام امجد

ساحلوں کی ہوا امجد اسلام امجد

سحر آثار از امجد اسلام امجد

بارش کی آواز
امجد اسلام امجد
amjad 97

ترتیب

پنجابی کلام

سات سمندر پار سے (تراجم)

رِم جِھم

زندگی کی طرح بارش کے بھی بے شمار رُوپ ہیں۔ میں غالب کی طرح گردشِ سیارہ کی آواز تک تو رسائی حاصل نہیں کر سکا مگر بارش کی مختلف آوازوں نے زندگی بھر مجھے اپنے جادُو کا اسیر رکھا ہے میں نے ان آوازوں کو پہاڑوں، میدانوں، ریگستانوں، برف زاروں، شہروں، ویرانوں، ہنگاموں اور تنہائی میں بہت دفعہ سُنا ہے۔ کبھی کبھی یہ آوازیں اور ان کے سُر جب اندر کے موسموں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو زندگی اپنے کچھ ایسے اسراروں سے پردہ اُٹھاتی ہے جنھیں صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ کیفیات کے اظہار میں لفظ بعض اوقات گونگے کے اشاروں سے بھی زیادہ مبہم ہو جاتے ہیں۔

بارش کا رومانیت سے کیا تعلق ہے؟ انسان کی رُوح، نفسیات، سماعت اور باطنی کیفیات سے اس کے رشتے کس بنیاد پر استوار ہوتے ہیں؟ اور بارش کی آواز کھڑکیوں کے شیشوں، درختوں کے پتّوں اور چھتوں کی منڈیروں سے ہوتی ہُوئی کس طرح وجُود کے صنم کدے میں بُت تراشیاں کرتی ہے اور کیسے بارش میں بھیگ کر مٹّی کی سوندھی خوشبو مساموں میں اُترتی چلی جاتی ہے؟ میرے پاس اس کی وضاحت کے لیے کوئی عقلی یا سائنسی دلیل نہیں میں تو بس اِتنا جانتا ہُوں کہ بارش اور اس کی آواز میرے لیے فطرت کے حسین ترین تحفے ہیں۔ "برزخ" سے لے کر "اتنے خواب کہاں رکھوں گا" تک کی نظموں میں آپ نے بارش اور اُس کے متعلقات کو مختلف تمثالوں، پیرایوں، رنگوں اور کیفیات کے حوالے سے دیکھا ہوگا۔ یہ کتاب بھی اُسی تسلسل

کی ایک کڑی ہے اور اس کا نام گویا ایک قرض تھا جسے ادا کرنا واجب تھا کہ ہر خوبصورت تعلق اپنا اظہار بھی چاہتا ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ پروین شاکر اگر آج زندہ ہوتی تو اس نام کو سُن کر بہت خوش ہوتی کہ "بارش" اُس کی بھی بہت بڑی کمزوری تھی۔ کیا عجیب اور لرزا دینے والا تصور ہے کہ اُس کی قبر پر برسنے والی ہر بارش کے ساتھ ساتھ اُس کے لیے رونے والی آنکھوں سے آنسو کم سے کم ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔ اس کتاب میں اس کی وفات پر لکھی ہوئی ایک نظم بھی شامل ہے ۔ ایک اور ماتمی نظم میرے عزیز دوست دلدار پرویز بھٹی کے حوالے سے ہے ۔ یوں تو ان دونوں کی یاد ایک خوشبو کی طرح سدا میرے آس پاس رہتی ہے لیکن بارشوں کے موسم میں تو کبھی کبھی میں نے سچ مچ اُن کی آوازیں بھی سُنی ہیں ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مرنے والوں کی آوازیں بارش کی آواز میں دوبارہ زندہ ہو جاتی ہوں ! یا شاید پیچھے رہ جاتی ہوں کہ خاک میں صُورتیں تو پنہاں ہو جاتی ہیں لیکن ......

اس کتاب کے آخر میں میں نے کم و بیش اپنا تمام پنجابی کلام جمع کر دیا ہے اور سچی بات ہے کہ اس کے انتہائی مختصر حجم کو دیکھ کر مجھے اندر ہی اندر کچھ ندامت بھی محسوس ہو رہی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان میری قومی، تعلیمی اور ادبی زبان ہے اور میرا بنیادی تعارف بھی اُردو شاعر اور ادیب کا ہے لیکن اپنی مادری زبان کا قرض مجھ پر ابھی تک واجب ہے ۔ سو یہ چند چیزیں محض اسی احساسِ ندامت کو کم کرنے اور اس بات کا اظہار کرنے کے لیے شامل کی جا رہی ہیں کہ اس کوتاہی کی بہت سی وجوہات میں کم از کم پنجابی کے بارے میں کوئی احساسِ کمتری یا معذرت خواہی شامل

نہیں ہے ۔

کئی برس قبل میں نے دو انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا ۔ اتفاق سے یہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکیں ، سو انھیں بھی کتاب کے آخر میں اس خیال سے شامل کر دیا گیا ہے کہ اِس طرح یہ محفوظ تو ہو ہی جائیں گی ۔ عین ممکن ہے کہ کچھ قارئین انھیں اپنے دل اور ذوق سے بھی قریب تر پائیں ۔ وارث شاہ نے ہیر کے حُسن و جمال کا نقشہ پنجابی زبان میں جس خوبی اور مہارت سے کھینچا ہے وہ تو اپنی مثال آپ ہے ہی لیکن مارلو نے ہیلن آف ٹرائے کے حُسن کو بزبانِ انگریزی جس فن کاری سے بیان کیا ہے اس کی داد نہ دینا بھی ناانصافی ہو گی ۔ چند برس قبل میں نے پنجابی کے عظیم ڈرامہ نگار اور اپنے مہربان بزرگ دوست سجاد حیدر مرحوم کے ایک اُردو افسانے کے لیے اُن کی فرمائش پر اس شہ پارے کی کچھ لائنیں ترجمہ کی تھیں اُنھیں بھی " ہیلن " کے عنوان سے درج کر دیا گیا ہے ۔

برادرِ عزیز شمیم اختر سیفی غالب کے کم معروف مگر اعلیٰ اشعار کی بازیافت کے ماہر ہیں ، گزشتہ چند دنوں سے اُن کا سنایا ہُوا ایک شعر دھیان سے چمٹا ہُوا ہے ۔ آپ بھی سُن لیجیے :

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کے شایاں یہی ویرانہ تھا

۹ - بی / جی - او - آر III
شادمان - لاہور
امجد اسلام امجد

خزاں کی شام کو صُبحِ بہار تُو نے کیا
مِرے خُدا، مِرے پروردگار تُو نے کیا

میں یُونہی خاک کی پستی میں ڈولتا رہتا
ترا کرم کہ مجُھے استوار تُو نے کیا

مِرے لہُو میں رکھے اپنی خلوتوں کے راز
پھر اس کے بعد مجُھے بے قرار تُو نے کیا

خَطا کے بعد خَطا، پے بہ پے ہُوئی مجُھ سے
معاف مجُھ کو مگر بار بار تُو نے کیا

شبیہہ اپنی بنا دی ہماری آنکھوں میں
پھر ان کو وقفِ رہِ انتظار تُو نے کیا

جُھلستی ریت میں اُگنے لگے ہیں پُھول ہی پُھول
کرم جو مُجھ پہ کیا بے شُمار تُو نے کیا

(ق)

مِری رسائی میں رکھ دی خلا کی پہنائی
میں گردِ رہ تھا مجھے شہ سوار تُو نے کیا

مِرے وُجود سے لپٹے تھے تفرقے کیا کیا
میں آبجو تھا مجھے بے کنار تُو نے کیا

میں ایک ذرّہ ریگِ رواں تھا صحرا میں
مجُھے ثبات دیا ، کوہسار تُو نے کیا

ہَوا خلاف تھی موسم کا ذائقہ تھا تلخ
ہر ایک شے کو مگر خُوش گوار تُو نے کیا

چلا جو مَیں ترے رستے پہ، میرے صحرا کو
اُمنڈتے اَبر دیئے ، مرغزار تُو نے کیا

بنائی پہلے تو یہ کائنات چاروں طرف
پھر اس کے بعد مجھے آشکار تُو نے کیا

مرے قلم پہ ہُوئی جس گھڑی ، نظر تیری
مِرے سخن کو، مجھے، ذی وقار تُو نے کیا

نعت

سخن کے نوُر سے کردار کے اُجالے سے
یہ کائنات بنی ہے ترے حوالے سے

بس ایک دستِ کرم نے مٹا دیئے یکسر
دلوں کے بیچ تھے جو تفرقوں کے جالے سے

ہر ایک تخت سے بالا ہے بوریا جِس کا
ہمیں ہے کام اُسی دو جہان والے سے

ترے جمال کا یوں عکس ہیں ترے اصحاب
کہ جیسے چاند کا رشتہ ہے اپنے ہالے سے

رواں رہیں گے اَبد تک دِلوں کے میخانے
تری نظر کے سُبو سے عطا کے پیالے سے

وہ جس کا ذائقہ رُوحیں اُجاڑ دیتا ہے
ترا کرم کہ رکھّا دُور اُس نوالے سے

عجب ہے شہرِ محمدؐ کی آرزو امجد
کہ میرا دِل تو سنبھلتا نہیں سنبھالے سے

نعتیہ نظم

یہ جو بے رنگ سی، بے آب سی آتی ہے نظر
اِسی مٹّی پہ پڑا کرتے تھے وہ نُور قدم
جن کی آہٹ کا تسلسل ہے یہ سارا عالم
جن کی خوشبو میں ہرے رہتے ہیں دل کے موسم
جس کی حیرت سے بھرے رہتے ہیں خوابوں کے نگر

وہ جو اِک تنگ سا رستہ ہے حرا کی جانب
اُس کے پھیلاؤ میں کونین سمٹ جاتے ہیں
آنکھ میں چاروں طرف رنگ سے لہراتے ہیں
پاؤں خُود جس کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں
یہی جادہ ہے جو جاتا ہے خُدا کی جانب

کتنی صدیوں سے مسلّط تھا کوئی شک مجھ پر
اپنے ہونے کی گواہی بھی نہیں ملتی تھی
حبس ایسا تھا کوئی شاخ نہیں ہلتی تھی!
اک کلی ایسی نہیں تھی جو نہیں کِھلتی تھی
جب کھُلی شانِ "رفعنا لک ذِکرک" مجھ پر

آپ کا نقشِ قدم میرا سہارا بن جائے!
بادِ رحمت کا اشارا ہو سفینے کی طرف
وہ جو اِک راہ نکلتی ہے مدینے کی طرف
اُس کی منزل کا نشاں ہو مرے سینے کی طرف
مرے رستے کا ہر اک سنگ، ستارا بن جائے!!

تمھیں مجھ سے محبّت ہے

محبّت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے!
کہ یہ جتنی پرانی جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اِسے تائیدِ تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے

یقیں کی آخری حد تک دِلوں میں لہلہاتی ہو!
نگاہوں سے ٹپکتی ہو، لہُو میں جگمگاتی ہو!
ہزاروں طرح کے دلکش، حسیں ہالے بناتی ہو!
اِسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے

محبّت مانگتی ہے یوں گواہی اپنے ہونے کی
کہ جیسے طِفلِ سادہ شام کو اِک بیج بوئے
اور شب میں بارہا اُٹھے
زمیں کو کھود کر دیکھے کہ پودا اب کہاں تک ہے!
محبّت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خُو ہے
کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سُننے سے نہیں تھکتی
بچھڑنے کی گھڑی ہو یا کوئی ملنے کی ساعت ہو
اسے بس ایک ہی دُھن ہے
کہو — "مجھ سے محبّت ہے"
کہو — "مجھ سے محبّت ہے"

تمھیں مجھ سے محبّت ہے
سمندر سے کہیں گہری، ستاروں سے سوا روشن
پہاڑوں کی طرح قائم، ہواؤں کی طرح دائم

زمیں سے آسماں تک جس قدر اچھے مناظر ہیں
محبّت کے کنائے ہیں، وفا کے استعارے ہیں
ہمارے ہیں۔
ہمارے واسطے یہ چاندنی راتیں سنورتی ہیں
سُنہرا دن نکلتا ہے
محبّت جس طرف جائے، زمانہ ساتھ چلتا ہے"

(۲)

کچھ ایسی بے سکُونی ہے وفا کی سرزمینوں میں
کہ جو اہلِ محبّت کو سدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے پھُول میں خُوشبو، کہ جیسے ہاتھ میں پارا
کہ جیسے شام کا تارا
محبّت کرنے والوں کی سحر راتوں میں رہتی ہے
گماں کے شاخچوں میں آشیاں بنتا ہے اُلفت کا!
یہ عینِ وصل میں بھی ہجر کے خدشوں میں رہتی ہے

محبّت کے مُسافر زندگی جب کاٹ چُکتے ہیں
تھکن کی کرچیاں چُنتے، وفا کی اَجرکیں پہنے
سمے کی رہگزر کی آخری سرحد پہ رُکتے ہیں
تو کوئی ڈوبتی سانسوں کی ڈوری تھام کر
دھیرے سے کہتا ہے،
"یہ سچ ہے نا ـــــ!
ہماری زندگی اِک دُوسرے کے نام لکّھی تھی!
دُھندلکا سا جو آنکھوں کے قریب و دُور پھیلا ہے
اِسی کا نام چاہت ہے!
تمھیں مجُھ سے محبّت تھی
تمھیں مجُھ سے محبّت ہے!!"

محبّت کی طبیعت میں
یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکّھا ہے!

وہ فقط میرا ہی دِلدار نہ تھا

(دِلدار بھٹی کے لیے ایک نظم)

کِس کا ہمدرد نہ تھا، دوست نہ تھا، یار نہ تھا
وہ فقط میرا ہی دلدار نہ تھا

قہقہے بانٹتا پھرتا تھا گلی کوچوں میں
اپنی باتوں سے سبھی دَرد بُھلا دیتا تھا
اُس کی جیبوں میں بھرے رہتے تھے سکّے، غم کے
پھر بھی ہر بزم کو گلزار بنا دیتا تھا۔

ہر دُکھی دل کی تڑپ
اُس کی آنکھوں کی لہو رنگ فضا میں گُھل کر
اُس کی راتوں میں سُلگ اُٹھتی تھی

میری اور اُس کی رفاقت کا سفر
ایسے گزُرا ہے کہ اب سوچتا ہُوں
یہ جو پچّیس برس
آرزو رنگ ستاروں کی طرح لگتے تھے
کیسے آنکھوں میں اُتر آئے ہیں آنسو بن کر!
اُس کو روکے گی کسی قبر کی مٹی کیسے!
وہ تو منظر میں بکھر جاتا تھا خوشبو بن کر!
اُس کا سینہ تھا مگر پیار کا دریا کوئی
ہر دُکھی رُوح کو سیراب کیے جاتا تھا
نام کا اپنے بھرم اُس نے کچُھ ایسے رکھا
دلِ احباب کو مہتاب کیے جاتا تھا

کوئی پھل دار شجر ہو سرِ راہے، جیسے
کسی بدلے، کسی نسبت کا طلبگار نہ تھا
اپنی نیکی کی مسرّت تھی، اثاثہ اُس کا
اُس کو کچھ اہلِ تجارت سے سروکار نہ تھا

کس کا ہمدرد نہ تھا، دوست نہ تھا، یار نہ تھا
وہ فقط میرا ہی دلدار نہ تھا۔

جو دیکھنے کا تمھیں اہتمام کرتے ہیں
زمیں سے جُھک کے ستارے کلام کرتے ہیں

تو آؤ آج سے ہم ایک کام کرتے ہیں
وفا کے نام سبھی صبح و شام کرتے ہیں

یہ راستہ ہے مگر ہجرتی پرندوں کا
یہاں سمے کے مُسافر قیام کرتے ہیں

وفا کی قبر پہ کب تک اِسے جلا رکھیں
سو یہ چراغ ہواؤں کے نام کرتے ہیں

کبھی جو بام پہ ٹھہرے تو چاند رُک جائے
غزال دیکھ کے اُس کو خرام کرتے ہیں

(ق)

یہ اہلِ درد کی بستی ہے زرگروں کی نہیں
یہاں دلوں کا بہت احترام کرتے ہیں

جہاں پناہوں کی جانب نظر نہیں کرتے
غریبِ شہر کو جُھک کر سلام کرتے ہیں

ہے اِن کی چشمِ توجّہ میں روشنی ایسی
کہ جیسے اِس میں ستارے قیام کرتے ہیں

یہاں پہ سکّۂ اہلِ ریا نہیں چلتا
کہ اہلِ درد نظر سے کلام کرتے ہیں

یہ حق پرست ہیں کیسے عجیب سوداگر
فنا کی آڑ میں کارِ دوام کرتے ہیں

جہاں جہاں پہ گرا ہے لہو شہیدوں کا
وہاں وہاں پہ فرشتے سلام کرتے ہیں

نہ گھر سے اِن کو ہے نسبت نہ کوئی نام سے کام
دِلوں میں بستے، نظر میں مقام کرتے ہیں

رواجِ اہلِ جہاں سے انھیں نہیں مطلب
کہ یہ تو رسمِ محبّت کو عام کرتے ہیں

جہاں میں ہوتے ہیں ایسے بھی کچھ ہُنر والے
جو اِک نگاہ میں امجد غلام کرتے ہیں

تیرے میرے خواب

آسمان کے چاند اور تارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !
یہ جو فرشِ خاک پہ بکھرا ریزہ ریزہ آئینہ ہے
اِس میں جتنے عکس ہیں ، سارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں!

دیر رہیں جو آنکھوں میں تو خواب پرندے بن جاتے ہیں
لاکھ انھیں آزاد کرو یہ پھر کر واپس آ جاتے ہیں
یہ جو قفس کے دروازے میں پَر پھیلائے بیٹھے ہیں
یہ درماندہ ، اوگن ہارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !

پلکوں کی دہلیز سے لگ کر دیکھ رہے ہیں رستوں کو
مٹتی بنتی شکلوں کو اور جلتے بجھتے رنگوں کو
بوجھل چُپ اور اوجھل دُکھ کے سائے سائے بیٹھے ہیں
یہ بے چہرہ اور بے چارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !

بحرِ فنا میں مل جانے تک ملنے سے مجبور بھی ہیں
اِک دُوجے کے ساتھ بھی ہیں اور اِک دُوجے سے دُور بھی ہیں
لمحوں کے گرداب سفر میں جو چکرائے بیٹھے ہیں
یہ دونو ـــــ دریا کے کنارے
تیرے میرے خواب نہ ہوں !!

○

حسابِ عُمر کا اِتنا سا گوشوارا ہے
تمھیں نکال کے دیکھا تو سب خسارا ہے

کسی چراغ میں ہم ہیں، کسی کنول میں تُم
کہیں جمال ہمارا، کہیں تمھارا ہے

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشّے میں
تمام عُمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارا کہ یہ دوبارا ہے

وہ منکشف مِری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حُسن کسی حُسن کا اشارا ہے

عجب اُصول ہیں اِس کاروبارِ دُنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اُتارا ہے

کہیں یہ ہے کوئی خوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالمِ موجود، استعارا ہے

نجانے کب تھا! کہاں تھا! مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گذارا ہے

یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے، ہم تم!
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے!

ایک عجیب خیال

کسی پرواز کے دوران اگر
اِک نظر ڈالیں جو
کھڑکی سے اُدھر
دُور، تا حدِّ نگہ
ایک بے کیف سی یکسانی میں ڈوبے منظر
محوِ افسوس نظر آتے ہیں
کسی انجان سے نشّے میں بھٹکتے بادل
اور پھر اُن کے تلے
بحر و بر، کوہ و بیابان و دمن
جیسے مدہوش نظر آتے ہیں
شہر خاموش نظر آتے ہیں

شہر خاموش نظر آتے ہیں لیکن ان میں
سینکڑوں سڑکیں ہزاروں ہی گلی کوچے ہیں
اور مکاں — ایک دُوجے سے جُڑے
ایسے محتاط کھڑے ہیں جیسے
ہاتھ چھُوٹا تو ابھی،
گِر کے ٹوٹیں گے، بکھر جائیں گے۔
اِس قدر دُور سے کچھ کہنا ذرا مشکل ہے
اِن مکانوں میں، گلی کوچوں، گزرگاہوں میں
یہ جو کچھ کیڑے مکوڑے سے نظر آتے ہیں
کہیں اِنساں تو نہیں!
وہی انساں — جو تکبّر کے صنم خانے میں
ناخُدا اور خُدا، آپ ہی بن جاتا ہے
پاؤں اِس طرح سرِ فرشِ زمیں رکھتا ہے
وُہی خالق ہے ہر اِک شے کا، وُہی داتا ہے

اِس سے اب کون کہے !

اے سرِ خاکِ فنا رینگنے والے کیڑے !

یہ جو مستی ہے تجھے ہستی کی

اپنی دہشت سے بھری بستی کی

اس بلندی سے کبھی آن کے دیکھے تو کھُلے

کیسی حالت ہے تری پستی کی !

اور پھر اُس کی طرف دیکھ کہ جو

ہے زمانوں کا ، جہانوں کا خُدا

خالقِ ارض و سما ، حیّ و صمد

جس کے دروازے پہ رہتے ہیں کھڑے

مثلِ دربان ، ازل اور ابد

جس کی رفعت کا ٹھکانہ ہے نہ حدّ ۔

اور پھر سوچ اگر

وہ کبھی دیکھے تجھے !!!

کوئی چاند چہرہ کُشا ہُوا

کوئی چاند چہرہ کُشا ہُوا

وہ جو دُھند تھی وہ بِکھر گئی

وہ جو حبس تھا وہ ہوا ہُوا

کوئی چاند چہرہ کُشا ہُوا

تو سمٹ گئی

وہ جو تیرگی تھی چہار سُو

وہ جو برف ٹھہری تھی رُوبرُو

وہ جو بے دِلی تھی صدف صدف

وہ جو خاک اُڑتی تھی ہر طرف ۔

مگر اِک نگاہ سے جل اُٹھے
جو چراغِ جاں تھے بُجھے ہُوئے
مگر اِک سخن سے مہک اُٹھے
مِرے گُلستاں، مِرے آئینے
کسی خُوش نظر کے حصار میں
کسی خُوش قدم کے جوار میں

کوئی چاند چہرہ کُشا ہُوا
مِرا سارا باغ ہرا ہُوا

پروین کے "گیتو" کے لیے ایک نظم

ہاں مری جان، مِرے چاند سے خواہر زادے!
بُجھ گئیں آج وہ آنکھیں کہ جہاں
تیرے سپنوں کے سِوا کُچھ بھی نہ رکھا اُس نے،
کتنے خوابوں سے، سرابوں سے اُلجھ کر گُزری
تب کہیں تجھ کو، ترے پیار کو پایا اُس نے
تو وہ "خُوشبُو" تھا کہ جس کی خاطر
اُس نے اِس باغ کی ہر چیز سے "اِنکار" کیا
دشتِ "صد برگ" میں وہ خُود سے رہی محوِ کلام
اپنے رنگوں سے تری راہ کو گلنار کیا

اے مری بہن کے ہر خواب کی منزل "گیتو"
رونقِ "ماہِ تمام"
سوگیا آج وہ اِک ذہن بھی مٹی کے تلے
جس کی آواز میں مہتاب سفر کرتے تھے
شاعری جس کی اثاثہ تھی جواں جذبوں کا
جس کی توصیف سبھی اہلِ ہُنر کرتے تھے

ہاں مری جان، مرے چاند سے خواہرزادے
وہ جسے قبر کی مٹّی میں دبا آئے ہیں
وہ تری ماں ہی نہ تھی
پُورے اِک عہد کا اعزاز تھی وہ
جس کے لہجے سے مہکتا تھا یہ منظر سارا
ایسی آواز تھی وہ
کس کو معلوم تھا "خوشبو" کے سَفر میں جس کو
مسئلہ پھُول کا بے چین کیے رکھتا ہے

اپنے دامن میں لیے
کُو بکُو پھیلتی اِک بات شناسائی کی
اِس نمائش گہِ ہستی سے گُزر جائے گی
دیکھتے دیکھتے مٹی میں اُتر جائے گی
ایسے چُپ چاپ بِکھر جائے گی۔

○

اے گردشِ حیات کبھی تو دِکھا وہ نیند
جس میں شبِ وصال کا نشّہ ہو، لا وہ نیند

ہرنی سی ایک آنکھ کی مستی میں قید تھی
اِک عُمر جس کی کھوج میں پھرتا رہا، وہ نیند

پھُوٹیں گے اَب نہ ہونٹ کی ڈالی پہ کیا گلاب!
آئے گی اب نہ لَوٹ کے آنکھوں میں کیا، وہ نیند!

کچھ رَت جگے سے جاگتی آنکھوں میں رہ گئے
زنجیرِ انتظار کا تھا سلسلہ، وہ نیند

دیکھا کچھ اِس طرح سے کسی خُوش نگاہ نے
رُخصت ہُوا تو ساتھ ہی لیتا گیا وہ، نیند

خُوشبو کی طرح مجھ پہ جو بکھری تمام شب
میں اُس کی مست آنکھ سے چُنتا رہا، وہ نیند

گھُومی ہے رتجگوں کے نگر میں تمام عُمر
ہر رہگذارِ درد سے ہے آشنا، وہ نیند

تُو جس کے بعد حشر کا میلہ سجائے گا!
میں جس کے انتظار میں ہُوں، اے خُدا، وہ نیند!

امجد ہماری آنکھ میں لَوٹی نہ پھر کبھی
اُس بے وفا کے ساتھ گئی بے وفا، وہ نیند

...... کئی سال ہو گئے

خوابوں کی دیکھ بھال میں آنکھیں اُجڑ گئیں
تنہائیوں کی دُھوپ نے چہرے جلا دیئے
لفظوں کے جوڑنے میں عبارت بکھر چلی
آئینے ڈھونڈنے میں کئی عکس کھو گئے
آئے نہ پھر وہ لوٹ کے، اِک بار جو گئے

ہر رہگذر میں بھیڑ تھی لوگوں کی اِس قدر
اِک اجنبی سے شخص کے مانوس خدّ و خال
ہاتھوں سے گِر کے ٹوٹے ہُوئے آئنہ مثال
جیسے تمام چہروں میں تقسیم ہو گئے
اِک کہکشاں میں لاکھ ستارے سمو گئے

وہ دن، وہ رُت، وہ وقت، وہ موسم، وہ سرخوشی
اے گردشِ حیات، اے رفتارِ ماہ و سال!
کیا جمع اس زمیں پہ نہیں ہوں گے پھر کبھی؟
جو ہم سفر فراق کی دلدل میں کھو گئے
پتّے جو گر کے پیڑ سے رستوں کے ہو گئے

کیا پھر کبھی نہ لوٹ کے آئے گی وہ بہار!
کیا پھر کبھی نہ آنکھ میں اُترے گی وہ دھنک!
جس کے وفورِ رنگ سے چھلکی ہُوئی ہَوا
کرتی ہے آج تک
اِک زُلف میں سجے ہُوئے پھولوں کا انتظار!

لمحے زمانِ ہجر کے، پھیلے کچھ اِس طرح
ریگِ روانِ دشت کی تمثال ہو گئے

اس دشتِ پُر سراب میں بھٹکے ہیں اس قدر
نقشِ قدم تھے جتنے بھی، پامال ہو گئے

اب تو کہیں پہ ختم ہو رستہ گمان کا!
شیشے میں دل کے سارے یقیں، بال ہو گئے

جس واقعے نے آنکھ سے چھینی تھی میری نیند
اُس واقعے کو اب تو کئی سال ہو گئے!!

ہَوا بُرد

مرے ہم سَفر
مرے جسم و جاں کے ہر ایک رشتے سے معتبر، مرے ہم سَفر
تجھے یاد ہیں ! تجھے یاد ہیں !
وہ جو قربتوں کے سُرور میں
تری آرزو کے حصار میں
مری خواہشوں کے وفور میں
کئی ذائقے تھے گھُلے ہُوئے
درِ گلستاں سے بہار تک
وہ جو راستے تھے، کھُلے ہُوئے!

سرِ لوحِ جاں ،
کسی اجنبی سی زبان کے
وہ جو خُوشنما سے حروف تھے !
وہ جو سرخوشی کا غبار سا تھا چہار سُو
جہاں ایک دُوجے کے رُوبرو
ہمیں اپنی رُوحوں میں پھیلتی کسی نغمگی کی خبر ملی
کسی روشنی کی نظر ملی ،
ہمیں روشنی کی نظر ملی تو جو ریزہ ریزہ سے عکس تھے
وہ بہم ہُوئے
وہ بہم ہُوئے تو پتہ چلا
کہ جو آگ سی ہے شرر فشاں مری خاک میں
اُسی آگ کا
کوئی اَن بُجھا سا نشان ہے، تری خاک میں !
اسی خاکداں میں وہ خواب ہے
جسے شکل دینے کے واسطے

یہ جو شش جہات کا کھیل ہے یہ رواں ہُوا
اسی روشنی سے "مکاں" بنا، اسی روشنی سے "زماں" ہُوا
یہ جو ہر گُماں کا یقین ہے !
وہ جو ہر یقیں کا گمان تھا !
اسی داستاں کا بیان تھا !

(۲)

کسی دھیان کے، کسی طاق پر ہے دھرا ہُوا
وہ جو ایک رشتۂ درد تھا
مرے نام کا ترے نام سے ،
تری صبح کا مری شام سے،
سرِ رہگذر ہے پڑا ہُوا وہی خوابِ جاں
جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے واسطے
کئی لاکھ تاروں کی سیڑھیوں سے اُتر کے آتی تھی کہکشاں،
سرِ آسماں

کسی اَبر پارے کی اوٹ سے
اُسے چاند تکتا تھا رات بھر
مرے ہم سفر
اُسی رخصتِ غم کو سمیٹتے
اُسی خوابِ جاں کو سنبھالتے
مرے راستے، کئی راستوں میں اُلجھ گئے
وہ چراغ جو مرے ساتھ ساتھ تھے، بُجھ گئے
وہ جو منزلیں
کسی اور منزلِ بے نشاں کے غبارِ راہ میں کھو گئیں
(کئی وسوسوں کے فشار میں شبِ انتظار سی ہو گئیں)
وہ طنابِ دل جو اُکھڑ گئی
وہ خیامِ جاں جو اُجڑ گئے
وہ سفیر تھے، اُسی داستانِ حیات کے
جو وَرق وَرق تھی بھری ہُوئی
مرے شوق سے ترے روپ سے

کہیں چھاؤں سے، کہیں دھوپ سے

(۳)

مرے ہم سفر، تجھے کیا خبر!
یہ جو وقت ہے کسی دُھوپ چھاؤں کے کھیل سا
اِسے دیکھتے، اِسے جھیلتے
مری آنکھ گرد سے اَٹ گئی
مرے خواب ریت میں کھو گئے
مرے ہاتھ برف سے ہو گئے
مرے بے خبر، ترے نام پر
وہ جو پھول کھلتے تھے ہونٹ پر
وہ جو دیپ جلتے تھے بام پر،
وہ نہیں رہے
وہ نہیں رہے کہ جو ایک ربط تھا درمیاں وہ بکھر گیا
وہ ہَوا چلی

کسی شام ایسی ہَوا چلی
کہ جو برگ تھے سرِ شاخِ جاں، وہ گرا دیئے
وہ جو حرف درج تھے ریت پر، وہ اُڑا دیئے
وہ جو راستوں کا یقین تھے
وہ جو منزلوں کے امین تھے
وہ نشانِ پا بھی مِٹا دیئے!
مرے ہم سفر، ہے وہی سفر
مگر ایک موڑ کے فرق سے
ترے ہاتھ سے مرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اُسے ناپتے، اُسے کاٹتے
مرا سارا وقت نکل گیا
تو مرے سفر کا شریک ہے
میں ترے سفر کا شریک ہوں

پہ جو درمیاں سے نکل گیا
اُسی فاصلے کے شمار میں
اُسی بے یقیں سے غبار میں
اُسی رہگزر کے حصار میں
ترا راستہ کوئی اور ہے
مرا راستہ کوئی اور ہے۔

دِل کے آتشدان میں شب بھر

دل کے آتشدان میں شب بھر
کیسے کیسے غم جلتے ہیں !
نیند بھرا سنّاٹا جس دَم
بستی کی ایک ایک گلی میں
کھڑکی کھڑکی تھم جاتا ہے
دیواروں پر دَرد کا کہرا جم جاتا ہے
رستہ تکنے والی آنکھیں اور قندیلیں بجھ جاتی ہیں

تو اُس لمحے،
تیری یاد کا ایندھن بن کر
شعلہ شعلہ ہم جلتے ہیں
دُوری کے موسم جلتے ہیں۔

تُم کیا جانو،
قطرہ قطرہ دل میں اُترتی اور پگھلتی
رات کی صحبت کیا ہوتی ہے !

"آنکھیں سارے خواب بُجھا دیں
چہرے اپنے نقش گنوا دیں
اور آئینے عکس بُھلا دیں
ایسے میں اُمّید کی وحشت
درد کی صُورت کیا ہوتی ہے !

ایسی تیز ہوا ہیں پیارے ،
بڑے بڑے منہ زور دیئے بھی کم جلتے ہیں
لیکن پھر بھی ہم جلتے ہیں
ہم جلتے ہیں اور ہمارے ساتھ تمہارے غم جلتے ہیں
دل کے آتشدان میں شب بھر
تیری یاد کا ایندھن بن کر
ہم جلتے ہیں ۔

ہم لوگ نہ تھے ایسے

ہیں جیسے نظر آتے
اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے
یہ شہر نہ تھا ایسا
یہ روگ نہ تھے ایسے

دیوار نہ تھے رستے ــ زندان نہ تھی بستی
آزار نہ تھے رشتے ــ خلجان نہ تھی ہستی
یوں موت نہ تھی سستی!

یہ آج جو صُورت ہے ــــ حالات نہ تھے ایسے
یوں غیر نہ تھے موسم ــــ دن رات نہ تھے ایسے

تفریق نہ تھی ایسی
سنجوگ نہ تھے ایسے
اے وقت گواہی دے
ہم لوگ نہ تھے ایسے

اہلِ نظر کی آنکھ میں تاج و کلاہ کیا !
سایا ہو جن پہ دَرد کا ، اُن کو پناہ کیا ؟

ٹھہرا ہے اِک نگاہ پہ سارا مقدّمہ
کیسے وکیل ! کون سا مُنصف ! گواہ کیا !

کرنے لگے ہو آٹھوں پہر کیوں خُدا کو یاد ؟
اُس بُت سے ہو گئی ہے کوئی رسم و راہ کیا ؟

اے ربِّ عدل تُو مری فردِ عمل کو چھوڑ
بس یہ بتا کہ اِس میں ہے میرا گُناہ کیا ؟

سارے فراق سال دُھواں بن کے اُڑ گئے
ڈالی ہمارے حال پہ اُس نے نگاہ کیا !

کیا دل کے بعد آبروئے دِل بھی رُول دیں
دکھلائیں اُس کو جا کے یہ حالِ تباہ کیا ؟

جو جتنا کم بساط ہے، اُتنا ہے معتبر
یارو یہ اہلِ فقر کی ہے بارگاہ، کیا !

کیسے کہیں کہ کر گئی اِک ثانیے کے بیچ
جادُو بھری وہ آنکھ، وہ جھُکتی نگاہ کیا !

(ق)

وہ بر بنائے جبر ہو یا اقتضائے صبر
ہر بُوالہوس سے کرتے رہو گے نباہ کیا ؟
ہر شے کی مثل ہو گی کوئی بے کسی کی حد !
اِس شہرِ بے ہُنر کا ہے دِن بھی سیاہ کیا ؟

رستے میں تھیں غنیم کے پھولوں کی پتّیاں
سالار بک گئے تھے تو کرتی سپاہ کیا !

دِل میں کوئی اُمّید نہ آنکھوں میں روشنی
نکلے گی اِس طرح کوئی جینے کی راہ کیا ؟

امجد نزولِ شعر کے کیسے بنیں اُصول !
سیلاب کے لیے کوئی ہوتی ہے راہ کیا ؟

آنے والا کل

نصف صدی ہونے کو آئی
میرا گھر اور میری بستی
ظُلم کی اندھی آگ میں جل جل راکھ میں ڈھلتے جاتے ہیں
میرے لوگ اور میرے بچّے
خوابوں اور سرابوں کے اِک جال میں اُلجھے
کٹتے ، مرتے ، جاتے ہیں
چاروں جانب ایک لہُو کی دَلدل ہے
گلی گلی تعزیر کے پہرے، کوچہ کوچہ مقتل ہے

اور یہ دُنیا ـــ !
عالمگیر اُخوّت کی تقدیس کی پہرے دار یہ دُنیا
ہم کو جلتے ، کٹتے ، مرتے ،
دیکھتی ہے اور چُپ رہتی ہے
زور آور کے ظلم کا سایا پَل پَل لمبا ہوتا ہے
وادی کی ہر شام کا چہرہ خُون میں لتھڑا ہوتا ہے

لیکن یہ جو خونِ شہیداں کی شمعیں ہیں
جب تک اِن کی لَویں سلامت !
جب تک اِن کی آگ فروزاں !
دَرد کی آخری حد پہ بھی یہ دل کو سہارا ہوتا ہے
ہر اِک کالی رات کے پیچھے ایک سویرا ہوتا ہے

فنا کی راہیں بقا کے رستوں کی ہم سفر ہیں

ہتھیلیوں پہ جو سج کے نکلے ہیں
کیسے سر ہیں !
ہر ایک آندھی کے راستے میں جو معتبر ہیں
یہ کیا شجر ہیں !

یہ کیسا نشّہ ہے جو لہو میں سرور بن کر اُتر گیا ہے!
تمام آنکھوں کے آنگنوں میں یہ کیسا موسم ٹھہر گیا ہے!
وفا کی راہوں میں جلنے والے چراغ روشن رہیں ہمیشہ
کہ ان کی لَو سے جمالِ جاں کا ہر ایک منظر سنور گیا ہے

گھروں کے آنگن ہیں قتل گاہیں ، تمام وادی ہے ایک مقتل
چنار شعلوں میں گھر گئے ہیں سُلگ رہا ہے تمام جنگل
مگر ارادوں کی استقامت میں کوئی لغزش کہیں نہیں ہے
لہو شہیدوں کا کر رہا ہے جوان جذبوں کو اور صیقل

جو اپنی حُرمت پہ کٹ مرے ہیں
وہ سر جہاں میں عظیم تر ہیں
لہُو سے لکھی گئیں جو سطریں
وُہی امر تھیں ، وُہی امر ہیں

بارش

ایک ہی بارش برس رہی ہے چاروں جانب
بام و در پر —— شجر حجر پر
گھاس کے اُجلے نرم بدن اور ٹین کی چھت پر
شاخ شاخ میں اُگنے والے برگ و ثمر پر ،
لیکن اس کی دِل میں اُترتی گُھم گُھم سی آواز کے اندر
جانے کتنی آوازیں ہیں —— !!
قطرہ قطرہ دِل میں اُترنے ، پھیلنے والی آوازیں
جن کو ہم محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن

لفظوں میں دوہرا نہیں پاتے
جانتے ہیں ، سمجھا نہیں پاتے
جیسے پت جھڑ کے موسم میں ایک ہی پیڑ پہ اُگنے والے
ہر پتّے پر ایسا ایک سماں ہوتا ہے
جو بس اُس کا ہی ہوتا ہے
جیسے ایک ہی دُھن کے اندر بجنے والے ساز
اور اُن کی آواز ——
کھڑکی کے شیشوں پر پڑتی بوندوں کی آواز کا جادُو
رِم جھم کے آہنگ میں ڈھل کر سرگوشی بن جاتا ہے
اور لہُو کے خلیے اُس کی باتیں سُن لگ جاتے ہیں ،
ماضی ، حال اور مستقبل ، تینوں کے چہرے
گڈ مڈ سے ہو جاتے ہیں
آپس میں کھو جاتے ہیں
چاروں جانب ایک دھنک کا پردہ سا لہراتا ہے
وقت کا پہیّہ چلتے چلتے ، تھوڑی دیر کو تھم جاتا ہے

(۲)

آج بہت دن بعد سُنی ہے بارش کی آواز
آج بہت دن بعد کسی منظر نے رستہ روکا ہے
رِم جِھم کا ملبوس پہن کر یاد کسی کی آئی ہے
آج بہت دن بعد اچانک آنکھ یونہی بھر آئی ہے

(۳)

آنکھ اور منظر کی وسعت میں چاروں جانب بارش ہے
اور بارش میں، دُور کہیں اِک گھر ہے جس کی
ایک ایک اینٹ پہ تیرے میرے خواب لکھے ہیں
اور اُس گھر کو جانے والی کچھ گلیاں ہیں
جن میں ہم دونوں کے سائے تنہا تنہا بھیگ رہے ہیں
دروازے پر قفل پڑا ہے اور دریچے سُونے ہیں
دیواروں پر جمی ہُوئی کائی میں چُھپ کر

موسم ہم کو دیکھ رہے ہیں
کتنے بادل، ہم دونوں کی آنکھ سے اوجھل
برس برس کر گُزر چکے ہیں!

ایک کمی سی،
ایک نمی سی،
چاروں جانب پھیل رہی ہے،
کئی زمانے ایک ہی پَل میں
باہم مِل کر بھیگ رہے ہیں
اندر یادیں سُوکھ رہی ہیں
باہر منظر بھیگ رہے ہیں

○

عمر اک خواب سجانے میں گئی
تیری تصویر بنانے میں گئی

کٹ گئی کچھ تو غمِ ہجراں میں
اور کچھ ملنے ملانے میں گئی

ایک شعلہ سا کبھی لپکا تھا
زندگی آگ بجھانے میں گئی

ایسے سودے میں تو گھاٹا ہے، اگر
آبرو، سر کے بچانے میں گئی!

تم بھی چاہو تو نہیں بن سکتی
بات، جو بات بنانے میں گئی

رہ گئی کچھ تو ترے سُننے میں
اور کچھ اپنے سنانے میں گئی

عُمر بھر کی تھی کمائی میری
جو ترے بام پہ آنے میں، گئی

عکس در عکس فقط حیرت تھی
عقل جب آئنہ خانے میں گئی

کوئی تصویر مکمّل نہیں ہونے پائی

اَب جو دیکھیں تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی
یہ شب و روز و مہ و سال کا پُرپیچ سفر
قدرے آسان بھی ہوسکتا تھا!
یہ جو ہر موڑ پہ کچھ اُلجھے ہُوئے رستے ہیں
ان میں ترتیب کا اِمکان بھی ہوسکتا تھا!
ہم ذرا دھیان سے چلتے تو وہ گھر
جس کے بام و در و دیوار پہ ویرانی ہے!
جس کے ہر طاق میں رکھی ہُوئی حیرانی ہے!
جس کی ہر صُبح میں شاموں کی پریشانی ہے!
اِس میں ہم چین سے آباد بھی ہوسکتے تھے،

بخت سے امن کی راہیں بھی نکل سکتی تھیں
وقت سے صُلح کا پیمان بھی ہوسکتا تھا

(۲)

اب جو دیکھیں تو بہت صاف نظر آتے ہیں
سارے منظر بھی، پسِ منظر بھی
لیکن اِس دیر خیالی کا صِلہ کیا ہوگا؟
یہ تو سب بعد کی باتیں ہیں مری جان، انھیں
دیکھتے، سوچتے رہنے سے بھلا کیا ہوگا؟
وہ جو ہونا تھا ہُوا ـــــ ہو بھی چکا
وقت کی لَوح پہ لکّھی ہُوئی تحریر کے حرف
خطِ تنسیخ سے واقف ہی نہیں
بخت، مکتب کے رجسٹر کی طرح ہوتا ہے
اپنے نمبر پہ جو "لبّیک" نہیں کہہ پاتے
اُن کا کچھ عُذر نہیں ـــ کوئی بھی فریاد نہیں
یہ وہ طائر ہیں جنھیں اپنی نوا یاد نہیں

(۳)

لائنیں کٹتی رہیں لفظ بدلنے کے سبب
کوئی تحریر ، مسلسل نہیں ہونے پائی
حاصلِ عمر — یہی چند ادھورے خاکے!
کوئی تصویر ، مکمّل نہیں ہونے پائی ۔

فرق

کہا اُس نے دیکھو،
"اگر یہ محبّت ہے، جس کے دوشالے
میں لپٹے ہُوئے ہم کئی منزلوں سے گزر آئے ہیں!
دھنک موسموں کے حوالے ہمارے بدن پہ لکھے ہیں!
کئی ذائقے ہیں،
جو ہونٹوں سے چل کر لہُو کی روانی میں گھُل مل گئے ہیں!

تو پھر اُس تعلّق کو کیا نام دیں گے ؟
جو جسموں کی تیز اور اندھی صدا پر رگوں میں مچلتا ہے
پوروں میں جلتا ہے

اور ایک آتش فشاں کی طرح
اپنی حدّت میں سب کچھ بہاتا ہُوا ___ سنسناتا ہُوا
راستوں میں فقط کچھ نشاں چھوڑ جاتا ہے
(جن کو کوئی یاد رکھتا نہیں)
تو کیا یہ سبھی کچھ ،
اُنہی چند آتش مزاج اور بے نام لمحوں کا اِک کھیل ہے ؟
جو اَزل سے مری اور تری خواہشوں کا
انوکھا سا بندھن ہے ___ ایک ایسا بندھن
کہ جس میں نہ رسّی نہ زنجیر کوئی ،
مگر اِک گرہ ہے ،
فقط اِک گرہ ہے کہ لگتی ہے اور پھر
گرہ در گرہ یہ لہو کے خلیّوں کو یُوں باندھتی ہے
کہ اَرض و سما میں کشش کے تعلّق کے جتنے مظاہر
نہاں اور عیاں ہیں ،
غلاموں کی صُورت قطاروں میں آتے ہیں

نظریں جُھکائے ہوئے بیٹھ جاتے ہیں
اور اپنے رستوں پہ جاتے نہیں
بات کرتے نہیں ،
سر اُٹھاتے نہیں ۔"

کہا میں نے ، جاناں !
"یہ سب کچھ بجا ہے
ہمارے تعلق کے ہر راستے میں
بدن سنگِ منزل کی صُورت کھڑا ہے !
ہوس اور محبّت کا لہجہ ہے یکساں
کہ دونوں طرف سے بدن بولتا ہے ۔!
بظاہر زمان و مکاں کے سفر میں
بدن ابتدا ہے ، بدن انتہا ہے
مگر اس کے ہوتے ___ سبھی کچھ کے ہوتے
کہیں بیچ میں وہ جو اِک فاصلہ ہے !
وہ کیا ہے !

مری جان، دیکھو
یہ موہوم سا فاصلہ ہی حقیقت ہیں
ساری کہانی کا اصلی سِرا ہے
(بدن تو فقط لوح کا حاشیہ ہے)
بدن کی حقیقت، محبّت کے قصّے کا صرف ایک حصّہ ہے
اور اُس سے آگے
محبّت میں جو کچھ ہے اُس کو سمجھنا
بدن کے تصوّر سے ہی ماورا ہے
یہ اِک کیفیت ہے
جسے نام دینا تو ممکن نہیں ہے، سمجھنے کی خاطر بس اِتنا سمجھ لو
زمیں زادگاں کے مقدّر کا جب فیصلہ ہوگیا تھا
تو اپنے تحفّظ، تشخّص کی خاطر
ہر اک ذات کو ایک تالہ مِلا تھا۔
وہ مخصوص تالہ، جو اِک خاص نمبر پہ کھُلتا ہے لیکن
کسی اور نمبر سے مِلتا نہیں۔

تجھے اور مجھے بھی یہ تالے مِلے تھے
مگر فرق اِتنا ہے دونوں کے کھُلنے کے نمبر وہی ہیں
اور ان نمبروں پہ ہمارے سوا
تیسرا کوئی بھی قفل کھُلتا نہیں۔
تری اور مری بات کے درمیاں
بس یہی فرق ہے!
ہوس اور محبّت میں اے جانِ جاں
بس یہی فرق ہے!!

مگر اک ستارۂ مہرباں

کئی چاند دُھند میں کھو گئے
کئی جاگ جاگ کے سو گئے
مگر اِک ستارۂ مہرباں
جو گواہ تھا

سرِ شام سے دمِ صُبح تک

کسی وصل رنگ سی رات کا
کسی بے کنار سے لُطف کا
کسی مُشکبار سی بات کا

مرے ساتھ تھا،
مرے ساتھ ہے۔!!

ناممکن

آنکھوں کو کیسے مل سکے خوابوں پہ اختیار!
قوسِ قزح کے رنگ کہیں ٹھہرتے نہیں،
منظر بدلتے جاتے ہیں نظروں کے ساتھ ساتھ
جیسے کہ اِک دشت میں لاکھوں سراب ہوں
جیسے کہ اِک خیال کی شکلیں ہوں بے شمار

ہونی ۔ انہونی

بادل ہوں یا کہ دریا، دونوں نہیں رُکیں گے
صحرا کی ریت یونہی بازو کُشا رہے گی!
موسم ہو یا کہ لمحہ، دونوں نہیں رُکیں گے
بے چین منظروں میں بے کُل دُعا رہے گی!
سپنا ہو یا کہ سایا، دونوں نہیں رُکیں گے
رستوں میں ہاتھ ملتی پاگل ہوا رہے گی!

آنکھیں مری ہوں یا ہو چہرا ترا اے جاناں
اس گردِ بادِ غم میں دونوں ہی خاک ہوں گے
دونوں نہیں رہیں گے
لیکن یہ خاک اپنی اِس خاکداں سے اُٹھ کر
تاروں میں جا رہے گی
جو درد کے مسافر، آئیں گے بعد اپنے
اُن کے لیے وفا کا یہ راستہ رہے گی۔

عُمر بھر کی کمائی

وہ جو ایک خواب سی رات تھی
مرے بخت میں
یُونہی ایک پَل میں گزُر گئی
وہ گزُر گئی تو پتہ چلا
وہی ایک کام کی چیز تھی
مِری زندگانی کے رَخت میں

سیلف میڈ لوگوں کا المیہ

روشنی مزاجوں کا کیا عجب مقدّر ہے
زندگی کے رستے میں، بچھنے والے کانٹوں کو
راہ سے ہٹانے میں،
ایک ایک تنکے سے آشیاں بنانے میں
خُوشبوئیں پکڑنے میں، گُلستاں سجانے میں
عُمر کاٹ دیتے ہیں۔
عمر کاٹ دیتے ہیں
اور اپنے حصّے کے پھُول بانٹ دیتے ہیں
کیسی کیسی خواہش کو قتل کرتے جاتے ہیں
درگزر کے گلشن میں اَبر بن کے رہتے ہیں
صَبر کے سمندر میں کشتیاں چلاتے ہیں

یہ نہیں کہ ان کو اِس روز و شب کی کاہش کا
کچھ صِلہ نہیں مِلتا !
مرنے والی آسوں کا خوں بہا نہیں مِلتا !

زندگی کے دامن میں جس قدر بھی خوشیاں ہیں
سب ہی ہاتھ آتی ہیں،
سب ہی مِل بھی جاتی ہیں
وقت پر نہیں ملتیں — وقت پر نہیں آتیں!
یعنی ان کو محنت کا اُجر مِل تو جاتا ہے
لیکن اِس طرح جیسے،
قرض کی رقم کوئی قسط قسط ہو جائے
اصل جو عبارت ہو "پس نوشت" ہو جائے

فصلِ گُل کے آخر میں پھول ان کے کھلتے ہیں
اِن کے صحن میں سورج دیر سے نکلتے ہیں۔

شاعر

کیسے کاریگر ہیں یہ !
آس کے درختوں سے
لفظ کاٹتے ہیں اور سیڑھیاں بناتے ہیں !

کیسے باہُنر ہیں یہ !
غم کے بیج بوتے ہیں
اور دِلوں میں خوشیوں کی کھیتیاں اُگاتے ہیں

کیسے چارہ گر ہیں یہ
وقت کے سمندر میں
کشتیاں بناتے ہیں، آپ ڈوب جاتے ہیں۔

یا سمیع و یا بصیر

* ہجومِ غم سے جب دم آدمی گھبرا سا جاتا ہے
تو ایسے میں
اُسے آواز پہ قابو نہیں رہتا
وہ اِتنے زور سے فریاد کرتا، چیختا اور بلبلاتا ہے
کہ جیسے وہ زمیں پر اور خُدا ہو آسمانوں میں

مگر ایسا بھی ہوتا ہے
کہ اُس کی چیخ کی آواز کے رُکنے سے پہلے ہی
خُدا کچھ اِس قدر نزدیک سے اور اس قدر
رحمت بھری مسکان سے اس کو تھپکتا اور اس کی بات سُنتا ہے
کہ فریادی کو اپنی چیخ کی شدّت،
صدا کی بے یقینی پر ندامت ہونے لگتی ہے

کسی کی دُھن میں، کسی کے گماں میں رہتے ہیں
ہم ایک خواب کی صُورت جہاں میں رہتے ہیں

ہمارے اشک چمکتے ہیں اُس کی آنکھوں میں
زمیں کا رزق ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں

جو لوگ کرتے ہیں دُنیا سے سُود کی خواہش
ہمیشہ گردشِ دورِ زیاں میں رہتے ہیں

نظر کے سامنے، آبِ رواں کے ہوتے ہُوئے
جو اہلِ صبر ہیں، تشنہ لباں میں رہتے ہیں

ہر اک بھنور سے زیادہ تباہ کار ہیں یہ
جو چند خوف پھٹے بادباں میں رہتے ہیں

اُنھی کے دم سے ہے جاری یہ روشنی کا سفر
جو دل چراغ کی صُورت جہاں میں رہتے ہیں

یہ اہلِ درد ہیں ان کا چلن ہے سب سے الگ
مکان رکھتے ہیں اور لامکاں میں رہتے ہیں

یہ جان کر بھی کہ انتم ہے بھُربھری مٹی
یہ لوگ خواہشِ نام و نشاں میں رہتے ہیں!

کسی سراب کی صُورت، کسی گُماں کی طرح
ہم اپنے ہست کی ریگِ رواں میں رہتے ہیں

سمے کا چاک ہے اور خاک ہے حوادث کی
زمین زاد، سدا امتحاں میں رہتے ہیں

یہ معجزہ جو نہیں ہے تو اور کیا ہے ، حباب!
کہ آگ ہیں اور خاکداں میں رہتے ہیں

ہمارے بختِ ستم ساز کا کمال ہے یہ
گُلِ بہار ہیں لیکن خزاں میں رہتے ہیں

حصارِ دشت میں متروک راستوں کی طرح
ہمارے گیت، ترے گُلستاں میں رہتے ہیں

مکاں کی قید سے، حدِ زماں سے باہر
ہم اپنے ذہن کی موجِ رواں میں رہتے ہیں

غموں کی دُھوپ سے ڈرتے نہیں ہیں وہ امجد
کسی نگاہ کے جو سائباں میں رہتے ہیں

ہَوا ہے آتشیں مزاج

ہَوا ہے آتشیں مزاج
بدل رہے ہیں سب رواج
بھٹک رہی ہے ، روشنی
ہُوا ہے ظُلمتوں کا راج
ہر ایک سانس قرض ہے
تمام زندگی ہے باج
وہ جس کا منتظر تھا "کل"
اُسی کا مُنتظر ہے "آج"
نشّے میں گُم ہیں تخت و تاج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

وفا کا خُوں ہے ہر طرف
کسی جبیں پہ بَل نہیں
طرح طرح کے تجزیئے
مگر کوئی عمل نہیں
سوال ہی سوال ہیں
کسی کے پاس حل نہیں
بکھر گئے ہیں پھُول سَب
کسی شجر پہ پھَل نہیں
نہ شرم ہے کوئی نہ لاج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

جو پُل تھی سب کے بیچ میں
وہ رسم و راہ کھو گئی
سروں سے چھت سَرک گئی
ہر اِک پناہ کھو گئی

ہے لفظ لفظ روشنی
صداقتوں کے درمیاں

(ق)

جو زندگی فروش تھے
وہی ہیں شہر کی زباں

جو خُود زمیں کا بوجھ ہیں
بنے ہیں میرِ کارواں

جو روشنی کے چور تھے
وہی ہیں روشنی نشاں

(ق)

غلام سر اُٹھائیں گے
کہاں تھا تخت کو گُماں!

وَفا کا خُوں ہے ہر طرف
کِسی جبیں پہ بَل نہیں
طَرح طرح کے تجزیئے
مگر کوئی عمل نہیں
سوال ہی سوال ہیں
کِسی کے پاس حل نہیں
بِکھر گئے ہیں پھُول سَب
کِسی شجر پہ پھَل نہیں
نہ شرم ہے کوئی نہ لاج
ہَوا ہے آتشیں مزاج

جو پُل تھی سب کے بیچ میں
وہ رسم و راہ کھو گئی
سروں سے چھت سَرک گئی
ہراِک پناہ کھو گئی

ہے لفظ روشنی
صداقتوں کے درمیاں

(ق)

جو زندگی فروش تھے
وہی ہیں شہر کی زباں

جو خُود زمیں کا بوجھ ہیں
بنے ہیں میرِ کارواں

جو روشنی کے چوَر تھے
وہی ہیں روشنی نشاں

(ق)

غلام سر اُٹھائیں گے
کہاں تھا تخت کو گُماں!

زمین کھا گئی اُنھیں
جو بَن رہے تھے آسماں

جو زندگی کا حُسن تھے
وہ لوگ رہ گئے کہاں

بہت تلاش ہو چکی
بس اب تو تھک گئے میاں

کہاں ہیں میرے ہم نفس
کہاں ہیں میرے ہم زباں!

○

یوں تو کیا چیز زندگی میں نہیں
جیسے سوچی تھی اپنے جی میں، نہیں

دِل ہمارا ہے چاند کا وہ رُخ
جو ترے رُخ کی روشنی میں، نہیں

سب زمانوں کا حال ہے اِس میں
اِک وہی شام! جنتری میں نہیں

ہیں خلاؤں میں کتنی دُنیائیں
جو کِسی حدِّ آگہی میں نہیں!

ہو کلیسا، حَرم کہ بُت خانہ
فرق ان میں ہے، بندگی میں نہیں

ایک اِنساں ہے، زندگی جیسا
اور وہ میری زندگی میں نہیں!

تُو نہیں، تیرا غم ہے چاروں طرَف
جس طرح چاند، چاندنی میں نہیں

اَجر تو صَبر کے جِلو میں ہے
موجِ دریا میں، تشنگی میں نہیں

ایک بے نام سے خلا کے سوا
کون سا رنگ، کافری میں نہیں!

مرنے والے مر جاتے ہیں

جیون کے اسٹیج پر اُن کا رول مکمل ہو جاتا ہے

لیکن اُن کی ایگزٹ پر یہ منظر ختم نہیں ہوتا

اِک اور ڈرامہ چلتا ہے

اخباروں کے لوگ بھڑکتی لیڈیں گھڑنے لگ جاتے ہیں

جن کے دَم سے اُن کی روزی چلتی ہے اور

ٹی وی ٹیمیں کیمرے لے کر آ جاتی ہیں

تاکہ وژیول سج جائے اور

اعلیٰ افسر

اپنی اپنی سیٹ سے اُٹھ کر رَش کرتے ہیں

ایسا ناں ہو حاکمِ اعلیٰ

یا کوئی اُس سے مِلتا جُلتا

اُن سے پہلے آ پہنچے

پھر سب مِل کر اس "ہونی" کے پس منظر پر

اپنے اپنے شک کی وضاحت کرتے ہیں اور

حاکمِ اعلیٰ یا کوئی اس سے مِلتا جُلتا

دہشت گردی کی بھرپور مذمت کر کے

مرنے والوں کی بیواؤں اور بچّوں کو

سرکاری امداد کا مژدہ دیتا ہے

اور چلتے چلتے ہاسپیٹل میں

زخمی ہونے والوں سے کچھ باتیں کر کے جاتا ہے

حزبِ مخالف کے لیڈر بھی

اَپنے فرمودات کے اندر

کُرسی والوں کی ناکامی، نااہلی اور کم کوشی کا

خُوب ہی چرچا کرتے ہیں

گرجا برسا کرتے ہیں

اگلے دِن اور آنے والے چند دِنوں تک یہ سب باتیں

خُوب اُچھالی جاتی ہیں پھر دھیرے دھیرے

اِن کے بدن پہ گَرد سی جمنے لگتی ہے

باہر کبھی تو جھانک کے کھڑکی سے دیکھتے،
کس کو پُکارتا ہُوا یہ کُو بہ کُو ہے کون!

آنکھوں میں رات آگئی لیکن نہیں کھُلا
میں کس کا مدّعا ہُوں؟ مری جستجو ہے کون!

کس کی نگاہِ لُطف نے موسم بدل دیئے
فصلِ خزاں کی راہ میں یہ مُشکبو ہے کون!

بادل کی اوٹ سے کبھی تاروں کی آڑ سے
چُھپ چُھپ کے دیکھتا ہُوا یہ حیلہ جُو ہے کون!

تارے ہیں آسماں میں جیسے زمیں پہ لوگ
ہر چند ایک سے ہیں مگر ہُوبہو ہے کون!

ہونا تو چاہیئے کہ یہ میرا ہی عکس ہو!
لیکن یہ آئینے میں مرے رُو برُو ہے کون!

اِس بے کنار پھیلی ہُوئی کائنات میں
کس کو خبر کہ کون ہوں مَیں! اور تُو ہے کون!

سارا فساد بڑھتی ہُوئی خواہشوں کا ہے
دِل سے بڑا جہان میں امجد عدُو ہے کون!

کالا جادُو

میرا تمام فن ، مری کاوشیں ، مرا ریاض
اِک نا تمام گیت کے مصرعے ہیں جن کے بیچ
معنی کا ربط ہے نہ کسی قافیے کا میل
انجام جس کا طے نہ ہُوا ہو، اِک ایسا کھیل!

مری متاع ، بس یہی جادُو ہے عشق کا
سیکھا ہے جس کو مَیں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ
لیکن یہ سحرِ عشق کا تحفہ عجیب ہے
کھلتا نہیں ہے کچھ کہ حقیقت میں کیا ہے یہ!
تقدیر کی عطا ہے یا کوئی سزا ہے یہ!
کس سے کہیں اے جاں کہ یہ قِصّہ عجیب ہے

کہنے کو یوں تو عشق کا جادُو ہے میرے پاس
پر میرے دِل کے واسطے اِتنا ہے اِس کا بوجھ
سینے سے اِک پہاڑ سا، ہٹتا نہیں ہے یہ
لیکن اَثر کے باب میں ہلکا ہے اِس قدر
تجھ پر اگر چلاؤں تو چلتا نہیں ہے یہ

گردِ سفر میں بھول کے منزل کی راہ تک
پھر آ گئے ہیں لوگ نئی قتل گاہ تک

اِک بے کسی کا جال ہے پھیلا چہار سُو
اِک بے بسی کی دُھند ہے دِل سے نگاہ تک

بالائے سطحِ آب تھے جتنے تھے بے خبر
اُبھرے نہیں ہیں وہ کہ جو پہنچے ہیں تھاہ تک

اِک دُوسرے پہ جان کا دینا تھا جس میں کھیل
اب رہ گیا ہے صرف وہ رشتہ نباہ تک

اہلِ نظر ہی جانتے ہیں کیسے اُفق مثال!
حدِّ ثواب جاتی ہے حدِّ گناہ تک

زنجیرِ عدل اب نہیں کھینچے گا کوئی ہاتھ
رُلتے ہیں اب تو پاؤں میں تاج و کلاہ تک

پھُولوں سے اِک بھری ہُوئی بستی یہاں پہ تھی
اب دل پہ اس کا ہوتا نہیں اشتباہ تک

آتی ہے جب بہار تو آتی ہے ایک ساتھ
باغوں سے لے کے دشت میں اُگتی گیاہ تک

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاجل سے اِک بھری ہُوئی چشمِ سیاہ تک

جذبات بُجھ گئے ہوں تو کیسے جلے یہ دِل
مہرِ سپہ کا نام ہے اُس کی سپاہ تک

امجدؔ اب اس زمین پہ آنے کو ہے وہ دِن
عالم کے ہاتھ پہنچیں گے عالم پناہ تک

○

دل کے کہنے پہ جب لڑے تم تھے
پھر زمانے سے کیوں ڈرے تم تھے

نقش تھے ہاتھ کی لکیروں میں
دسترس سے مگر پرے تم تھے

لاکھ پھیلا، سمٹ نہ پائے تم
دل کی اوقات سے بڑے تم تھے

ہم نے جس رہ کا انتخاب کیا
اُس کے ہر موڑ پر کھڑے تم تھے

اک شرارِ گماں کی مانند !
دھیان کی راکھ میں پڑے تم تھے

(ق)

جانے کس لہر میں تھا میں سرشار!
جانے کس موج میں ہرے تم تھے!

ہاتھ کے لمس سے چھلک اُٹھے
جامِ مے کی طرح بھرے تم تھے

کیا تھا! جس میں اُلجھ گیا تھا میں
جانے کس بات پر اَڑے تم تھے؟

ایک ہی لمحۂ خموشی میں
حدِّ آواز سے پرے تم تھے

بادل — میں اور تم

بادل کے اور بحر کے رشتے عجیب ہیں!
کالی گھٹا کے دوش پہ برفوں کا رخت ہے
جتنے زمیں پہ بہتے ہیں دریا، سبھی کا رُخ
اِک بحرِ بے کنار کی منزل کی سَمت ہے

خوابوں میں ایک بھیگی ہُوئی خُوش دِلی کے ساتھ
ملتی ہے آشنا سے کوئی اجنبی سی موج
بادل بھنور کے ہاتھ سے لیتے ہیں اپنا رزق
پھر اس کو بانٹتے ہیں عجب بے رُخی کے ساتھ!
جنگل میں، صحن باغ میں، شہروں میں، دشت میں
چشموں میں، آبشار میں، جھیلوں کے طشت میں

گاہے یہ اوس بن کے سنورتے ہیں برگ برگ
گاہے کسی کی آنکھ میں بھرتے ہیں اِس طرح
آنسو کی ایک بُوند میں دجلہ دِکھائی دے
اور دُوسرے ہی پَل میں جو دیکھو تو دُور تک
ریگِ روانِ دَرد کا صحرا دِکھائی دے!

بادل کے اور ہجر کے جتنے ہیں سلسلے
مُجھ سے بھی تیری آنکھ کے رشتے، وہی تو ہیں!!

○

یہ بولتے ہوئے لمحے یہ ڈھلتی ہُوئی شام
ترے جمال کے صدقے، ترے وصال کے نام

خُدا کرے سَدا کھلتے رہیں — چلیں یوں ہی
ترے لبوں کے ستارے تری نظر کے جام

ترے بَدن کی پہیلی میں رُک گئی خُوشبُو
ترے لباس پہ آکر ہُوئے ہیں رنگ تمام

طلسمِ بندِ قبا سے ہیں اُنگلیاں روشن
لہُو میں آگ کی صُورت اُتر رہی ہے شام

مہک وفا کی سدا ساتھ ساتھ چلتی رہے
محبتوں کے سفر کا بخیر ہو انجام

متاعِ درد تو ورثہ ہے آنکھ والوں کا
تجھے یہ زخم مبارک ہو اے دلِ ناکام!

بھٹک رہے ہیں کسی خواب کی طرح کب سے
اِس آس پہ کہ تری آنکھ میں کریں آرام

میں اُس گلی سے گزرتا ہوں بار بار امجد
کبھی تو بام پہ آئے گا میرا ماہِ تمام

○

کلام کرتی نہیں بولتی بھی جاتی ہے
تری نظر کو یہ کیسی زبان آتی ہے!

کبھی کبھی مجھے پہچانتی نہیں وہ آنکھ
کبھی چراغ سے چاروں طرف جلاتی ہے

عجب تضاد میں پلتی ہے تیرے وصل کی آس
کہ ایک آگ بجھاتی ہے اِک لگاتی ہے

وہ دیکھتی ہے مجھے ایسی مست نظروں سے
مرے لہو میں کوئی آگ سرسراتی ہے

یہ چار سُو کا اندھیرا سمٹنے لگتا ہے
کچھ اِس طرح تری آواز جگمگاتی ہے

یہ کوئی اور نہیں آگ ہے یہ اندر کی
بدن کی رات میں جو روشنی بچھاتی ہے

میں اس کو دیکھتا رہتا ہُوں رات ڈھلنے تک
جو چاندنی تری گلیوں سے ہو کے آتی ہے

یہ روشنی بھی عطا ہے تری محبّت کی
جو میری رُوح کے منظر مجھے دکھاتی ہے

اُمیدِ وصل بھی امجد ہے کانچ کی چُوڑی
کہ پہننے میں کئی بار ٹوٹ جاتی ہے

خُدا اور خلقِ خُدا

یہ خلقِ خُدا جو بکھرے ہُوئے
بے نام و نشاں پتّوں کی طرح
بے چین ہَوا کے رَستے میں گھبرائی ہُوئی سی پھرتی ہے
آنکھوں میں شکستہ خواب لیے
سینے میں دلِ بیتاب لیے
ہونٹوں میں کراہیں ضبط کیے
ماتھے کے دریدہ صفحے پر
اِک مہرِ ندامت ثبت کیے ٹھکرائی ہُوئی سی پھرتی ہے
اے اہلِ حشم اے اہلِ جفا
یہ طبل و علَم یہ تاج و کُلاہ و تختِ شہی
اس وقت تمھارے ساتھ سہی

نارنج مگر یہ کہتی ہے
اِسی خلقِ خدا کے ملبے سے اِک گُونج کہیں سے اُٹھتی ہے
یہ دھرتی کروٹ لیتی ہے اور منظر بدلے جاتے ہیں
یہ طبل و علم، یہ تختِ شہی، سب خلقِ خدا کے ملبے کا
اِک حصّہ بنتے جاتے ہیں

ہر راج محل کے پہلو میں اِک رستہ ایسا ہوتا ہے
مقتل کی طرف جو کھُلتا ہے اور بِن بتلائے آتا ہے
تختوں کو خالی کرتا ہے اور قبریں بھرتا جاتا ہے

○

لبوں پہ رُکتی، دِلوں میں سما نہیں سکتی
وہ ایک بات جو لفظوں میں آ نہیں سکتی

جو دِل میں ہو نہ زرِ غم تو اشک پانی ہے
کہ آگ خاک کو کُندن بنا نہیں سکتی

یقیں گمان سے باہر تو ہو نہیں سکتا
نظر خیال سے آگے تو جا نہیں سکتی

دِلوں کی رمز فقط اہلِ دَرد جانتے ہیں
تری سمجھ میں مری بات آ نہیں سکتی

یہ سوزِ عشق تو گونگے کا خواب ہے جیسے
مری زباں، مری حالت بتا نہیں سکتی

(ق)

سمٹ رہی ہے مرے بازوؤں کے حلقے میں
حیا کے بوجھ سے پلکیں اُٹھا نہیں سکتی

جو کہہ رہا ہے سُلگتا ہُوا بدن اُس کا
بتا بھی پاتی نہیں اور چھُپا نہیں سکتی

اِک ایسی ہجر کی آتش ہے میرے دل میں جسے
کسی وصال کی بارش بُجھا نہیں سکتی

تو جو بھی ہونا ہے امجد یہیں پہ ہونا ہے
زمیں مدار سے باہر تو جا نہیں سکتی!

اکیسویں صدی کے لیے ایک نظم

سَمے کے رستے میں بیٹھنے سے
تو صرف چہروں پہ گرد جمتی ہے
اور آنکھوں میں خواب مرتے ہیں
جن کی لاشیں اُٹھانے والا کوئی نہیں ہے!

ہماری قسمت کے زائچوں کو بنانے والا کوئی ہو شاید
پر ان کا مطلب بتانے والا کوئی نہیں ہے!
وہ سارے رستے روایتوں کے کہ جن کی گرہیں کسی ہُوئی ہیں
ہمارے ہاتھوں سے اور پاؤں سے لے کے خوابوں کی گردنوں تک!
ہماری رُوحوں میں کھُبتے جاتے ہیں
اور ہم کو بچانے والا، چھڑانے والا کوئی نہیں ہے!

زباں پہ زنجیر سی پڑی ہے
دِلوں میں پھندے ہیں
اور آنکھوں میں شامِ زنداں کی بے کسی ہے
چراغ سارے بُجھے پڑے ہیں جلانے والا کوئی نہیں ہے!

مرے عزیزو، مجھے یہ غم ہے
جو ہو چکا ہے بہت ہی کم ہے
سَمے کے رَستے میں بیٹھے رہنے کے دن بھی اَب ختم ہو رہے ہیں
بچے کھُچے یہ جو بال و پَر ہیں
جو راکھ داں میں سُلگنے والے یہ کچُھ شرر ہیں
ہمارے بچّوں کے سر چھپانے کو جو یہ گھر ہیں
اب ان کی باری بھی آ رہی ہے
وہ ایک مہلت جو آخری تھی
وہ جا رہی ہے ___

تو اس سے پہلے زمین کھائے
ہمارے جسموں کو اور خوابوں کو
اور چہروں پہ اپنے دامن کی اوٹ کر دے
یہ سرد مٹی جو بھُربھُری ہے
ہماری آنکھوں کے زرد حلقے لہُو سے بھر دے!

مرے عزیزو چلو کہ آنکھوں کو مَل کے دیکھیں
کہاں سے سُورج نکل رہے ہیں!
سمے کے رستے پہ چل کے دیکھیں!

نعت

اَزلوں پہلاں، اَبدوں پچھے، روشن جس دا ناں
میں قطرہ، اُس بحر دی امجد کیویں صفت کراں!

اپنے حق لئی اُٹھن والے سب ہتھاں دا زور
سارے جگ دے مظلوماں تے کمزوراں دی باں

دُنیا دی اِس راہواں کھُنجی، گھُمن گھیری نوں
اوہدے ناں دے تارے باہجوں کیویں پار کراں!

کھاں دی اس دُھپ اج آقا، پنڈے لُوس گئے
حمت دے بدّل دی کردے ساڈھے سِر تے چھاں

ہدے پاک بدن دی مِٹی اِس دھرتی دا مان
دم زاد دی پگ دا شملہ اوہدا اُچا ناں

جیہڑی اوہنے اپنے سوہنے قدماں نال بنائی
ے راہ وِچ جیواں امجدؔ، اوسے وِچ مراں

سلام

پُھلاں ورگے بچیاں دے سنگھ کنڈیاں وانگر سُکے سَن
ریتاں دے وچ شُوک رئی سی کالی ناگن پیاس
اُتے اَگ ورساندا سُورج، تھلّے بلدی ریت
واواں دے وچ چھپیا دا سی کوئی انوکھا بھیت
چارچوفیرے کنیاں وانگر زہری تیر پئے وسدے سَن
نہر فرات دا کنڈا مل کے ویری دُشمن ہسدے سَن
سارے سجّن بیلیاں دے سَن خُونوں خوُن لباس
ریتاں دے وچ شُوک رئی سی کالی ناگن پیاس

پچھے ہٹنا آندا نئیں سی سامنے آن کھلوتا سی
ہر نیزے دی نوک دے اَگے سینہ تان کھلوتا سی
جد تک نیلے امبر تھلّے آدم زادے وسّن گے
جان دی بازی لاون ویلے نام حسینؑ دا دسّن گے

اِک شہر دِی کہانی

کیڑیاں وانگر چار چوفیرے لوکی جیوندے مَردے نیں
قاتلاں ورگیاں شکلاں والے اپنے آپ توں ڈردے نیں
اَدھی راتیں سُورج نکلے تِکر دوپہرے چمکے چن
اکھاں کڈھ کڈھ اوکردے نیں جیہڑے سجن پیارے سن
چُپ چپیتیاں سڑکاں اُتے کھمبے ہو کے بھردے نیں
کسے اچیہے وہم توں ڈر کے رستے باہواں پھڑدے نیں
شہر تے قبرستان اِچ یارو اِکو فرق ہُن رہ گیا اے
اوتھے لوکی چُپ رہندے نیں ایتھے گلاں کردے نیں!!

اپنے آپ نال گلّاں

ساواں اِک دِن مُک جانا اے
اکھاں اِک دِن سُک جانا اے
سِدّے تیر جواناں نے وی
وانگ کماناں جُھک جانا اے
کِنّاں لِشکن، کِنّاں چمکن
تارے تے ڈُب جاون گے
رنگاں تے خُوشبوواں والے
پُھل اِک دِن مُرجھاون گے
نویں ذناں دیاں سچیاں گلاں
کدتک ٹالی جاویں گا!
جھلیا کدتک قبراں اُتے
دیوے بالی جاویں گا!

گل سجناں دی اِنج اساڈے بلّاں تے ٹُٹ جائے
نویں جوانی جیویں اپنے پنڈے توں شرمائے

دوزخ دل دا دِیوا اتے نئیں بجھے پُھوکاں نال
اتھروہون تے ڈُک وی لیئے ہڑنوں کون سکھائے

نال دُعاواں کد کھِلدے نیں پچھلے سال دے پُھل
ویلے نال پٹی کیوں کھینی اے میرئیے جھلیئے مائے

میں کہنا واں کتھے نیں تے تنو کے تیزا ہوا
شہر دے سارے لوکی آکھن نویں زمانے آئے

امجد کد تک منہ تے غم دی بکل مار کے سوئیں
چل او سورج لبھیے جیہڑا سُتے لوگ جگائے

○

جیہڑی میرے ساواں اندر وانگ مشالاں جگدی اے
اوہدیاں ڈونگیاں اکھاں وچ وی سُرخی اوسے اگ دی اے

تھل اکھاں دا اج وی چارے پاسے کھیہہ اُڈاندا اے
نیں سدھراں دی اج وی اپنے کنڈیوں بار پئی وگدی اے

ہتھ ملا کے وچھڑ جائیے، فیدہ کیہہ بدنامی دا
آپس دی گل آپس اِچ ای مکدی چنگی لگدی اے

اوہدے لئی تے انج سی جیویں سُتے تے فیر جاگ پئے!
رات ہجر دی میرے گھر توں سہک سہک کے لنگھدی اے

سوچاں دی چھنکار نئیں امجدؔ کیتے کن بے کار مرے
اپنی واج وی ہُون تے مینوں ہور کسے دی لگدی اے

بولیاں

چار چوفیرے تھلاں دے وِچ سسّی دے لشکارے
پُنّوں ٹاراں مارے

شہر دے دِل چوں اَدھی راتیں اُٹھدی اے اِک چیخ
گونگی اے تاریخ

نہ تُوں بولیں نہ میں بولاں، بولے گا فیر کیہڑا
پِچھے سُنجا ویہڑا!

چھلتر چھلتر ہوکے بھر گئے رُکھاں ورگے بندے
تیز سمے دے رندے

اساں ای کدھرے سُٹ پائی اے دڑداں والی سانجھ
مٹی تے نئیں بانجھ

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

گلیاں

[D.J. ENRIGHT کی نظم STREETS کا آزاد ترجمہ]

نظم لکھی گئی تو ہنوئی کی گلیوں سے موسوم تھی
اِس میں گرتے بموں سے نکلتی ہُوئی موت کا تذکرہ تھا،
فلاکت، دُکھوں اور بربادیوں کی اذیّت بھری داستاں درج تھی
اِس کے آہنگ میں موت کا رنگ تھا اور دُھن میں تباہی،
ہلاکت، دُکھوں اور بربادیوں کی الم گُونج تھی

نظم کی اِک بڑے ہال میں پیش کش کی گئی
اِک گُلوکار نے اس کو آواز دی
اور ساز ینے والوں نے موسیقیت سے بھری دُھن بنا کر سجایا اِسے

ساز و آواز کی اس حسین پیشکش کو سبھی مجلسوں میں سراہا گیا
جب یہ سب ہو چکا تو کچھ ایسے لگا جیسے عنوان میں
نظم کا نام[1] بھولے سے لکھا گیا ہو حقیقت میں یہ نام سائیگان[2] تھا!
(اور ہر چیز جس رنگ میں پیش آئے وہی اصل ہے)
سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں شاعری اور نغمہ گری کی زباں ایک ہے
جیسے گرتے بموں سے نکلتی ہوئی موت کی داستاں ایک ہے
اور جیسے تباہی، فلاکت دکھوں اور بربادیوں کا نشاں ایک ہے
سچ تو یہ ہے کہ اب کرۂ ارض پر دوسرے شعر گو کی ضرورت نہیں
ہر جگہ شاعری کا سماں ایک ہے
اس کے الفاظ کی بے نوا آستینوں پہ حسبِ ضرورت ستارے بنانا
مقامی حوالوں کے موتی سجانا
تو ایڈیٹروں کے قلم کی صفائی کا انداز ہے
یا وزیرِ ثقافت کے دفتر میں بیٹھے کلرکوں کے ہاتھوں کا اعجاز ہے!!

۱۔ شمالی ویت نام کا شہر
۲۔ جنوبی ویت نام کا شہر

ہیلن

(مارلو کے اشعار کا آزاد ترجمہ)

"یہی وہ چہرہ تھا
جس کی خاطر ہزار ہا بادباں کھلے تھے
اسی کی خاطر
منارِ ایلم کے راکھ بن کر بھسم ہوئے تھے
اے میری جانِ بہار ہیلن!
طلسمِ بوسہ سے میری ہستی امر بنا دے
(یہ اس کے ہونٹوں کے لمسِ شیریں میں کیا کشش ہے کہ
روح تحلیل ہو رہی ہے)
اِک اور بوسہ

کہ میری رُوح پریدہ میرے بدن میں پلٹے
یہ آرزو ہے کہ ان لبوں کے بہشت سائے میں عُمر کاٹوں
کہ ساری دُنیا کے نقش باطل
بس ایک نقشِ ثباتِ ہیلن
سوائے ہیلن کے سب فنا ہے
کہ ہے دلیلِ حیاتِ ہیلن !
اے میری ہیلن !
تری طلب میں ہر ایک ذلّت مجُھے گوارا
میں اپنا گھر بار ، اپنا نام و نمود تجھ پہ نثار کردُوں
جو حکم دے وہ سوانگ بھرلُوں
ہر ایک دیوار ڈھا کے تیرا وصال جیتوں
کہ ساری دُنیا کے رنج و غم کے بدل پہ بھاری ہے
تیرے ہونٹوں کا ایک بوسہ
سُبک مثالِ ہوائے شامِ وصالِ ہیلن !

ستارے پوشاک ہیں تری
اور تیرا چہرہ، تمام سیّارگاں کے چہروں سے بڑھ کے روشن
شعاعِ حسنِ ازل سے خُوشتر ہیں تیرے جلوے
تمُھیں ہو میری وفا کی منزل —— !
تمُھیں ہو کشتی ، تمھیں ہو ساحل "

آدم کُش حربوں کے ردّ میں
مضمونوں کی شکل میں لکھ کر، ٹکٹ لگا کر، اخباروں کو بھیجتے ہیں
ظالم کی پُر زور مذمت کرتے ہیں
بارش کے وہ کم طاقت اور بے قیمت سے قطرے ہیں
جو دریاؤں سے اُٹھتے ہیں اور اُٹھتے ہی گر جاتے ہیں

نامردی کچھ یوں ہے جیسے کوئی ربڑ کی دیواروں میں چھید بنائے
یہ موسیقی، نامردی کی یہ موسیقی، اتنی بے تاثیر ہے جیسے
گھسے پٹے اِک ساز پہ کوئی بے رنگی کے گیت سنائے
باہر دُنیا ـــــ سرکش اور مغرور یہ دُنیا
طاقت کے مُنہ زور نشے میں اپنے رُوپ دکھاتی جائے!!

ہم اُس کے ہیں

امجد اسلام امجد

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

غزلیں

سحر آثار:۔

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

بارش کی آواز:

اتنے خواب کہاں رکھوں گا:

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

اُس پار:۔

http://www.hallagulla.com/urdu/

ذرا پھر سے کہنا۔

http://www.hallagulla.com/urdu/

فشار:۔

ساتواں در:۔

http://www.hallagulla.com/urdu/

http://www.hallagulla.com/urdu/

امجد اسلام امجد

☆

حد سے توقعات زیادہ کیے ہُوئے
بیٹھے ہیں دل میں ایک ارادہ کیے ہُوئے

اس دشت بے وفائی میں جائیں کہاں کہ ہم
ہیں اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیے ہُوئے

دیکھو تو کتنے چین سے اک درجہ مطمئن!
بیٹھے ہیں ارض پاک کو آدھا کیے ہوئے

ق

پاؤں سے خواب باندھ کے شام وصال کے
اک دشت انتظار کو جادہ کیے ہوئے

آنکھوں میں لے کے جلتے ہوئے موسموں کی راکھ!
درد سفر کو تن کا لبادہ کیے ہوئے

دیکھو تو کون لوگ ہیں! آئے کہاں سے ہیں !
اور اب ہیں کس سفر کا لبادہ کیے ہوئے

اس سادہ رُو کے بزم میں آتے ہی بجھ گئے
جتنے تھے اہتمام کا زیادہ کیے ہوئے

http://www.hallagulla.com/urdu/

اُٹھے ہیں اُس کی بزم سے امجد ہزار بار
ہم ترک آرزو کا ارادہ کیے ہوئے

☆

درو دیوار میں ،مکان نہیں
واقعہ ہے ،یہ داستان نہیں

وقت کرتا ہے ہر سوال کو حل
زیست مکتب ہے امتحان نہیں

ہر قدم پر اک نئی منزل
راستوں کا کہیں نشان نہیں

رنگ بھی زندگی کے مظہر ہیں
صرف آنسو ہی ترجمان نہیں

دل سے نکلی ہوئی سدا کے لیے
کچھ بہت دُور آسمان نہیں

کل کو ممکن ہے اک حقیقت ہو
آج جس بات کا گمان نہیں

شور کرتے ہیں ٹوٹتے رشتے
ہم کو گھر چاہیے مکان نہیں

خواب ، ماضی! سراب، مستقبل!
اور " جو ہے " وہ میری جان "نہیں "

اتنے تارے تھے رات لگتا تھا
کوئی میلہ ہے آسمان نہیں

شاخ سدرہ کو چھو کے لوٹ آیا
اس سے آگے میری اُڑان نہیں

یوں جو بیٹھے ہو بے تعلق سے
کیا سمجھتے ہو میری زبان نہیں

کوئی دیکھے تو موت سے بہتر
زیست کا کوئی پاسبان نہیں

اک طرف میں ہوں اک طرف تم ہو
سلسلہ کوئی درمیان نہیں

☆

کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آتا
وہ شخص ایسا گیا پھر نظر نہیں آیا

وفا کے دشت میں رستہ نہیں ملا کوئی
سوائے گرد سفر ہم سفر نہیں آیا

پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صُبح کا بُھولا مگر نہیں آیا

کِسی چراغ نے پُوچھی نہیں خبر میری
کوئی بھی پھُول مِرے نام پر نہیں آیا

چلو کہ کوچۂ قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نخلِ دار پہ کب سے ثمر نہیں آیا!

خُدا کے خوف سے دل لرزتے رہتے ہیں
اُنھیں کبھی بھی زمانے سے ڈر نہیں آیا

کدھر کو جاتے ہیں رستے ، یہ راز کیسے کُھلے
جہاں میں کوئی بھی بارِدگر نہیں آیا

یہ کیسی بات کہی شام کے ستارے نے
کہ چین دل کو مِرے رات بھر نہیں آیا

ہمیں یقین ہے امجد نہیں وہ وعدہ خلاف
پہ عُمر کیسے کٹے گی ، اگر نہین آیا!

☆

ہم تو اسیرِ خواب تھے تعبیر جو بھی تھی
دیوار پر لِکھی ہُوئی تحریر جو بھی تھی

ہر فرد لا جواب تھا ، ہر نقش بے مثال
مِل جُل کے اپنی قوم کی تصویر بھی تھی !

جو سامنے ہے ، سب ہے یہ ،اپنے کیسے کا پھل
تقدیر کی تو چھوڑیئے، تقدیر جو بھی تھی

آیا اور اِک نگاہ میں برباد کر گیا
ہم اہلِ انتظار کی جاگیر جو بھی تھی

قدریں جو اپنا مان تھیں ، نیلام ہوگئیں
ملبے کے مول بِک گئی تعمیر جو بھی تھی

طالب ہیں تیرے رحم کے ہم ' عدل کے نہیں
جیسا بھی اپنا جُرم تھا، تقصیر جو بھی تھی

ہاتھوں پہ کوئی زخم نہ پیروں پہ کُچھ نشاں
سوچوں میں تھی پڑی ہُوئی، زنجیر جو بھی تھی

یہ اور بات چشم نہ ہو معنی آشنا
عبرت کا ایک درس تھی تحریر جو بھی تھی

امجد ہماری بات وہ سُنتا تو ایک بار
آنکھوں سے اُس کو چُومتے، تعزیر جو بھی تھی

☆

منظر کے اِرد گِرد بھی اور آر پار دُھند
آئی کہاں سے آنکھ میں یہ بے شمار دُھند!

کیسے نہ اُس کا سارا سفر رائیگاں رہے
جس کا روانِ شوق کی ہے رہگزار دُھند!

ہے یہ جو ماہ و سال کا میلہ لگا ہُوا
کرتی ہے اِس میں چُھپ کے مِرزا انتظار دُھند

آنکھوں وہ بزم، جس کا نشاں ڈولتے چراغ
دل وہ چمن، کہ جس کا ہے رنگِ بہار دُھند

کمرے میں میرے غم کے سِوا اور کُچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار ' دُھند

فردوس ِ گوش ٹھرا ہے مبہم سا کوئی شور
نظّار گی کا شہر میں ہے اعتبار، دُھند

ناٹک میں جیسے بکھرے ہوں کردار جا بجا
امجد فضائے جاں میں ہے یوں بے قرار دُھند!

☆

اُداسی میں گھرا تھا دِل چراغِ شام سے پہلے
نہیں تھا کُچھ سرِ محفل چراغِ شام سے پہلے

حُدی خوانو، بڑھاؤ لَے، اندھیرا ہونے والا ہے
پہنچنا ہے سرِ منزل چراغِ شام سے پہلے

دِلوں میں اور ستاروں میں اچانک جاگ اُٹھتی ہے
عجب ہلچل، عجب جِھل مِل چراغِ شام سے پہلے

وہ ویسے ہی وہاں رکھی ہے ، عصرِ آخرِ شب میں
جو سینے پر دھری تھی سِل، چراغِ شام سے پہلے

ہم اپنی عُمر کی ڈھلتی ہُوئی اِک سہ پہر میں ہیں
جو مِلنا ہے ہمیں تو مِل، چراغِ شام سے پہلے

ہمیں اے دوستو اب کشتیوں میں رات کرنی ہے
کہ چُھپ جاتے ہیں سب ساحل، چراغِ شام سے پہلے

سَحر کا اوّلیں تارا ہے جیسے رات کا ماضی
ہے دن کا بھی تو مُستقبِل، چراغِ شام سے پہلے

نجانے زندگی اور رات میں کیسا تعلق ہے !
اُلجھتی کیوں ہے اِتنی گُلِ چراغِ شام سے پہلے

محبت نے رگوں میں کِس طرح کی روشنی بھردی !
کہ جل اُٹھتا ہے امجد دِل، چراغِ شام سے پہلے

☆

آنکھیں کا رنگ، بات لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا!

کُچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے پہ نقش
پھریوں ہُوا کہ خُود مِرا چہرا بدل گیا

جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چل پڑی
اُس نے چھڑیا ہاتھ تو صحرا بدل گیا

کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا!

اِک سر خوشی کی موج نے کیسا کیا کمال!
وہ بے نیاز، سارے کا سارا بدل گیا

اٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اُٹھا تو سارا تماشا بدل گیا

حیرت سے سارے لفظ اُسے دیکھتے رہے
باتوں میں اپنی بات کو کیسا بدل گیا

کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی بنی
گھر کی فضا، مکان کو نقشہ بدل گیا

شاید وفا کے کھیل سے اُکتا گیا تھا وہ
منزل کے پاس آکے جو رستہ بدل گیا

قائم کسی بھی حال پہ دُنیا نہیں رہی
تعبیر کھو گئی، کبھی سَپنا بدل گیا

منظر کا رنگ اصل میں سایا تھا رنگ کا
جس نے اُسے جدھر سے بھی دیکھا بدل گیا

اندر کے موسموں کی خبر اُس کی ہوگئی!
اُس نو بہارِ ناز کا چہرا بدل گیا

آنکھوں میں جتنے اشک تھے جگنو سے بن گئے
وہ مُسکرایا اور مری دُنیا بدل گیا

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھو نڈتے ہیں لوگ
امجد یہ کو ن شہر کا نقشہ بدل گیا

☆

آنکھوں کو التباس بہت دیکھنے میں تھے
کل شب عجیب عکس مِرے آئنے میں تھے

سارے دھنک کے رنگ تھے اُس کے لباس میں
خُوشبو کے سارے اَنگ اُسے سوچنے میں تھے

ہر بات جانتے ہُوئے دِل مانتا نہ تھا
ہم جانے اعتبار کے کِس مرحلے میں تھے

وصل و فراق دونوں ہیں اِک جیسے ناگزیر
کُچھ لطف اُس کے قُرب میں، کُچھ فاصلے میں تھے

سیلِ زماں کی موج کو ہر وار سہہ گئے
وہ دن، جو ایک ٹاٹے ہُوئے رابطے میں تھے!

غارت گری کے بعد بھی روشن تھیں بستیاں
ہارے ہُوئے تھے لوگ مگر حوصلے میں تھے!

ہر پھر کے آئے نقطۂ آغاز کی طرف
جتنے سفر تھے اپنے کِسی دائرے میں تھے

آندھی اُڑاکے لے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشان اُسی راستے میں تھے

چُھولیں اُسے کہ دُور سے بس دیکھتے رہیں!
تارے بھی رات میری طرح، مخمصے میں تھے

جُگنو، ستارے، آنکھ، صبا، تتلیاں، چراغ
سب اپنے اپنے غم کے کِسی سلسلے میں تھے!

جتنے تھے خط تمام کا تھا ایک زاویہ
پھر بھی عجیب پیچ مِرے مسئلے میں تھے

امجد کتاب ِ جاں کو وہ پڑھتا بھی کِس طرح !
لکھنے تھے جتنے لفظ، ابھی حافظے میں تھے

☆

ظاہر شِمال میں کوئی تارا ہُوا تو ہے
اِذنِ سفر کا ایک اِشارا ہُوا تو ہے

کیا ہے! جو رکھ دیں آخری داؤ میں نقدِ جاں!
ویسے بھی ہم نے کھیل یہ ہارا ہُوا تو ہے

وہ جان، اُس کو خیر خبر ہے بھی یا نہیں!
دل ہم نے اس کے نام پہ وارا ہُوا ہے

پاؤں میں نارسائی کا اِک آبلہ سہی
اِس دشتِ غم میں کوئی ہمارا ہُواتو ہے

اُس بے وفا سے ہم کو یہ نسبت بھی کم نہیں
کُچھ وقت ہم نے ساتھ گزارا ہُوا تو ہے

اپنی طرف اُٹھے نہ اُٹھے اُس کی چشمِ خوش!
امجد کِسی کے درد کا چارا ہُوا تو ہے
!

———

☆

اُلجھن تمام عُمر یہ تارِ نفس میں تھی!
دِل کی مُراد عاشقی می یا ہوس میں تھی!

دَر تھا کُھلا، پہ بیٹھے رہے پَر سمیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی قفس میں تھی!

سَکتے میں سب چراغ تھے ' تارے تھے دم بخُود!
مَیں اُس کے اختیار میں ' وہ میرے بس میں تھی

اَب کے بھی ہے ' جمی ہُوئی، آنکھوں کے سامنے
خوابوں کی ایک دُھند جو پچھلے برس میں تھی

کل شب تو اُس کی بزم میں ایسے لگا مجھے!
جیسے کہ کائنات مِری دسترس میں تھی

محفل میں آسمان کی بولے کہ چُپ رہے
امجد سدا زمین اسی پیش و پس میں تھی

———

☆

سب کی اِک اوقات "عشق نہ پُوچھے ذات"
بالکل بُھول گئے کرنی تھی کیا بات
سَستا کردے گئی زر کی یہ افراط!
اَب سے تیرے ہیں میرے دن اور رات
سچّے جذبوں سے مہنگی ہوگئی دھات
اب کے خُوب ہوئی بِن موسم برسات
کٹ ہی جاتی ہے کیسی بھی رات!
باسی ہوئی جائے دل میں رکھی بات
کچّی ڈور، میاں! کب تک دیتی ساتھ!
گرہیں کھولے گا جانے کب وہ ہاتھ!
تجھ کو چاہوں مَیں کیا میری اوقات!
کیسے اُجڑ گئے؟ خوابوں کے باغات

(ق)

وقت سمندر میں ایک سے ہیں دن رات
آگے گہری کھائی پیچھے ہے ظُلمات!

———

غم کے دھاگوں سے امجد خوشیاں کاٹ!

———

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

زمین جلتی ہے اور آسمان ٹوٹتا ہے،
مگر گریز کریں ہم تو مان ٹوٹتا ہے !!

کوئی بھی کام ہو انجام تک نہیں جاتا !
کسی کے دھیان میں پَل پَل یہ دھیان ٹوٹتا ہے

کہ جیسے متن میں ہر لفظ کی ہے اپنی جگہ
جو ایک فرد کٹے، کاروان ٹوٹتا ہے

نژادِ صبح کے لشکر کی آمد ہے
حصارِ حلقۂ شب زادگان ٹوٹتا ہے

اگر یہی ہے عدالت ! اور آپ ہیں مُنصِف!
عجب نہیں جو ہمارا بیان ٹوٹتا ہے

وفا کے شہرکے رستے عجیب ہیں امجد
ہر ایک موڑ پہ اِک مہربان ' ٹوٹتا ہے

———

☆

کہتا ہے دَر پن میرے جیسا بن!

تاریکی کی موت! ایک نحیف کِرن

محنت اپنا مال وقت، پرایا دَھن

بات نہ کرنے سے بڑھتی ہے اُلجھن

اپنے دِل جیسا! کوئی نہیں دشمن

دُنیا! لوٹا دے میرا اپنا پن

چُھولے جی اُٹھے جاگ پڑے جامن

روز وہی قِصّہ! روز وہی اُلجھن!

صدیاں لُوٹ گئی پائل کی چَھن چَھن

یہ تو برسے گا ساون ہے، ساون!

سارے خاک سَمان تَن اور مَن اور دَھن

اپنوں ہی سے تو ہوتی ہے اَن بَن

سب سے اچّھا ہے اپنا گھر آنگن!

پیاس بڑی ہے یا سونے کا برتن؟

کیا اُفتاد پڑی! لگتا ناہیں مَن

آدم زاد نہیں، بستی ہے یا بَن!

کیسا بھی ہو رُوپ! مٹی ہے مدفن

سِکّے کے دورُخ برہن اور دُلہن

دھوکہ دیتے ہیں اُجلے پیراہن

راہ میں کِھلتا پُھول بیوہ کا جوبن

دونوں جُھوٹے ہیں ساجن اور سَاون

آہٹ کِس کی ہے تیز ہُوئی دھڑکن

اُتنی خواہش کر جِتنا ہے دامن

ہم تم دونوں ہیں — دَھرتی اور ساون

عکس بنے کیسے؟ — دُھند لا ہے درپن

زیرِ آب ہُوئے — خوابوں کے مسکن

ٹھرگیا ہے کیوں! — آنکھوں میں ساون!

www.HallaGulla.com

(ق)

کچّا سونا ہی — بنتا ہے کُندن

اِک دِن نکھرے گا — سچّا ہے گر، فن!

کیسے روک سکے! — خُوشبو کو گلشن

امجد میرے ساتھ — اَب تک ہے بچپن!

Virtual Home for Real People

☆

کِسی ترنگ ، کسی سر خوشی میں رہتا تھا
یہ کل کی بات ہے، دل زندگی میں رہتا تھا

کہ جیسے چاند کے چہرے پہ آفتاب کی لَو
کُھلا کہ میں بھی کِسی روشنی میں رہتا تھا

سر شتِ آدم خاکی، ذرا نہیں بدلی !
فلک پہ پہنچا مگر، غار ہی میں رہتا تھا

کہا یہ کِس نے کہ رہتا تھا مَیں زمانے میں
ہجومِ درد، غم ِ بے کسی میں رہتا تھا

(ق)

کلام کرتا تھا قوسِ قزح کے رنگوں میں
وہ اِک خیال تھا اور شاعری میں رہتا تھا

گُلوں پہ ڈولتا پھرتا تھا اوس کی صُورت!
صدا کی لہر تھا اور نغمگی میں رہتا تھا

نہیں تھی حُسنِ نظر کی بھی کُچھ اُسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

وہاں پہ اب بھی ستارے طواف کرتے ہیں
وہ جس مکان میں ، جس بھی گلی میں رہتا تھا

---

www.HallaGulla.com

بس ایک شام بڑی خاموشی سے ٹوٹ گیا
ہمیں جو مان ، تری دوستی میں رہتا تھا

کھلا جو پھول تو برباد ہوگیا امجد
طلسم رنگ مگر غنچگی میں رہتا تھا

Virtual Home
for Real People

☆

سب دیکھتے تھے اور کوئی سوچتا نہ تھا
جیسے یہ کوئی کھیل تھا ، اِک واقعہ نہ تھا !

لکھتے بیاضِ وقت پہ ہم کیا تاثرات
سب کچھ تھا درج اور کوئی حاشیہ نہ تھا

آپس کی ایک بات تھی ' دونوں کے درمیان
اے اہلِ شہر آپ کا یہ مسئلہ نہ تھا !

تیری گلی میں آئے تھے بس تجھ کو دیکھنے!
اِس کے سِوا ہمارا کوئی مدّ عا نہ تھا

تھے ثبتِ حُکم ہجر پہ اُس کے بھی دستخط
تقدیر ہی کا لِکّھا ہُوا فیصلہ نہ تھا

اِک سمت پاسِ عشق تھا، اِک سمت اپنا مان
کیسے گُریز کرتے ! کوئی راستہ نہ تھا !!

امجد یہ اقتدار کا حلقہ عجیب ہے
چاروں طرف تھے عکس کوئی آئنہ نہ تھا

☆

جب تک رستے جائیں یوں ہی چلتے جائیں
آئینوں سے کیوں؟ عکس مُکرتے جائیں!
آنکھیں ہیں آباد! خواب اُجڑتے جائیں
ایسی آندھی میں! خاک سنورتے جائیں!!
اپنی سوچوں سے آپ ہی ڈرتے جائیں
عکس کریں تو کیا نقش بگڑتے جائیں
جلتی آنکھوں میں سپنے بُجھتے جائیں
جتنا دُھتکارے اور لپٹتے جائیں
رولیں خُود پر ہی کُچھ تو کرتے جائیں!

(ق)

بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ نہ ملتے جائیں
ایک چراغ سہی راہ میں دَھرتے جائیں
سچّی بات لکھیں جب تک لِکھتے جائیں
جو کچھ بس میں ہے وہ تو کرتے جائیں
رزمِ ہستی سے لڑتے لڑتے جائیں
مُردہ مٹی کر زندہ کرتے جائیں
جب تک زندہ ہیں آگے بڑھتے جائیں

(ق)

آؤ ہم اور تُم ایسا کرتے جائیں
آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتے جائیں

باتوں باتوں میں غُنچے کِھلتے جائیں
رنگوں میں نِکلیں خوشبو ہوتے جائیں
اُمّیدیں پُھوٹیں خدشےمرتے جائیں
امجد سب کے دل اور نِکھرتے جائیں

☆

گُزرے کل سا لگتا ہو جب آنے والا کل
ایسے حال میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ چل

کرتی ہیں ہر شام یہ بِنتی ، آنکھیں ریت بھری
روشن ہوا ے امن کے تارے، ظُلم کے سُورج ، ڈھل

اپنا مطلب کھودیتی ہے دِل مین رکھی بات
رونا ہے تو کُھل کے رو اور جلنا ہو تو ، جل

لمحوں کی پہچان یہی ہے ، اُڑتے جاتے ہیں
آنکھوں کی دہلیز پہ کیسے ٹھر گیا ، وہ پَل !

عشق کے رستے لگ جائیں تو لوگ بھلے چنگے
ہوتے ہوتے ہوجاتے ہیں ، دیوانے ، پاگل !

موسم کی سازش ہے یا پھر مٹی بانجھ ہوئی !
پیڑ زیادہ ہوتے جائیں ، گھٹتا جائے پھل!

جُھکی جُھکی آنکھوں کے اُوپر بوجھل پلکیں تھیں
لیکن کیسے چُھپ سکتا تھا ! کاجل ہے کاجل !

زرد آور کے دستِ ستم میں دونوں ِگروی ہیں
مزدوروں کا خُون پسینہ ، دہقانوں کا ہل !

بُجھتے تاروں کی جِھلمل میں اوس لرزتی ہے
امجد دُنیا جاگ رہی ہے تُو بھی آنکھیں مَل

☆

خُود اپنے لیے بیٹھ کے سوچیں گے کِسی دِن
یُوں ہے کہ تجھے بُھول کے دیکھیں گے کِسی دن

بھٹکے ہُوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں
دُنیا نے دیا وقت تو لکّھیں گے کِسی دن

ہِل جائیں گے اِک بار تو عرشوں کے دَرد بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کِسی دن

آپس کی کِسی بات کا مِلتا ہی نہیں وقت
ہر بار یہ کہتے ہیں کہ " بیٹھیں گے کِسی دن ! "

اے جان تری یاد کے بے نام پرندے
شاخوں پہ مرے درد کی اُتریں گے کِسی دن ؟

جاتی ہے کِسی جھیل کی گہرائی کہاں تک
آنکھوں میں تری ڈوب کے دیکھیں کے کِسی دِن

خُوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اِک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دِن

سوئیں گے تری آنکھ کی خلوت میں کسی رات
سائے میں تری زُلف کے جاگیں گے کِسی دن !

صحرائے خرابی کی اسی گردِ سفر سے
پُھولوں سے بھرے راستے نکلیں گے کِسی دن

خُوشبو کی طرح ، مثلِ صبا ، خواب نما سے
گلیوں سے ترے شہر کی گُزریں گے کِسی دن

امجد ہے یہی اب کہ کفن باندھ کے سر پر
اُس شہرِ ستم گار میں جائیں گے کسی دن

☆

خواہش کی کسی موج کے ریلے میں رہیں گے
شبنم کی طرح ، صُبح کے میلے میں رہیں گے !

دیکھے گی زمیں ، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک ، جھمیلے میں رہیں گے

مر جائیں گے ہم تم تو ، مگر گیت ہمارے
اے دوست رواں، وقت کے بیلے میں رہیں گے

موجود تو ہوں گے مگر احساس کی صُورت!
خُوشبو کی طرح رنگ کے میلے میں رہیں گے

آنکھوں میں اُتر آئے گی اَندر کی اُداسی
امجد جو یونہی آپ اکیلے میں رہیں گے !

☆

درد دل کا جہاں رواج نہیں
ایک انبوہ ہے ، سماج نہیں

اے غمِ ہجر ِ یار ، یہ تو بتا
کیا تجھے کوئی کام کاج نہیں !

وہ ہے ہر جائی ، یہ بجا ، لیکن
دِل بھی تو مستقل مزاج نہیں

تیرے غم کے سِوا زمانے میں
کون سے درد کا علاج نہیں!

حِرص کھا جاتی ہے غریب کا رِزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں

تیری آنکھوں سی ، دوسری آنکھیں
شاید ہوں گی کبھی ، پر آج ، نہیں

مملکت حُسن سہی نہیں کوئی
عشق سا کوئی تخت و تاج نہیں

(ق)

کون سی آنکھ ہے تہی تجھ سے !
کون سے دل پہ تیرا راج نہیں !

اے خُدا ، اے مرے ہُنر کے خُدا
اور کُچھ میری احتیا ج نہیں !

بستیوں کو نہ پستیوں میں رکھ
التجا ہے یہ ، احتجاج نہیں

☆

رات کی سیج خالی خالی ہے
دیکھ ، وہ صبح ہونے والی ہے !

میرے دل سے تری نگاہوں تک
درد نے راہ کیا نکالی ہے !

ہے پرے حدِّ آسمان سے کیا ؟
سب فضا اپنی دیکھی بھالی ہے

کہہ رہی ہے چمک ستاروں کی
درد کی رات ڈھلنے والی ہے !

جو نہ کہنی تھی بات ، کہہ آئے
اور جو کہنی تھی وہ چُھپالی ہے

اِک طرف دل تھا ، اِک طرف دُنیا
ہم نے دونوں سے سُر ملالی ہے

آنکھ والوں کے واسطے ، منظر
ایک روزن ہے ، ایک جالی ہے !

پھر وہی آنسوؤں کی بارش ہے
پھر وہی دل کی خشک سالی ہے !

پھسیلتی جارہی ہے قوسِ قزح
دل پہ کِس نے نگاہ ڈلی ہے

دوستو ں کا وہ دوست ہے امجد
نام جس کا جمیل عالی ہے

☆

افلاک کا سایا ہے جو کُچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میرا تعبیر کہیں پر ہے

کُچھ ایسی نظر ڈالی ہنگامِ و داع اُس نے
میں خُود تو چلا آیا دل اب بھی وہیں پر ہے

اے فکرِ سماواتی ، اے طائرلاہُوتی !
پرواز سے کیا حاصل ! جو کُچھ ہے زمیں پر ہے

" موجود " میں رہنے سے " آئیندہ " نہیں ملتا
اثبات کا ہر جلوہ موقوف " نہیں " پر ہے

اُس لمحے کے جادُوسے پھر وقت نہیں نِکلا
جو چیز جہاں پر تھی وہ چیز وہیں پر ہے

چاہے تو یونہی رکھے ' چاہے تو سَحر کردے
اِس رات کا مُستقبل اُس ماہ جبیں پر ہے

اِس عُمر کی فُرصت میں ہر چیز کا ہونا ہے
جنّت بھی یہیں ہوگی ! دوزخ جو یہیں پر ہے

☆

کرتا ہُوں جمع میں تو بکھر تی ہے ذات اور
باقی ہے کِتنی اے مرے مولا ، یہ رات اور !

لیتی ہے جلتی شمع بھی بُجھنے میں کُچھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں بے ثبات اور !

سیلاب جیسے لیتا ہے دیوار کے قدم
کرتا ہے غم بھی دل سے کوئی واردات اور

یوں تو حضورِ پاک ﷺ کے لاکھوں ہیں مدح خواں
تائب سی لِکھ رہا ہے مگر کون ، نعت اور!

مظہر ، اَزل کے حُسن کے امجد ہیں بے شُمار
لیکن جو دیکھئے تو ہے بارش کی بات اور

☆

شمار ِ گردشِ لیل و نہار کرتے ہُوئے
گُزر چلی ہے ترا انتظار کرتے ہُوئے

خُدا گواہ ، وہ آسُودگی نہیں پائی
تمہارے بعد کسی سے بھی پیار کرتے ہوئے

اَزل سے یونہی چلی آرہی ہے یہ دُنیا
اِسے نہال ، اُسے بے قرار کرے ہُوئے

تمام اہل ِ سَفر ایک سے نہیں ہوتے
کُھلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

ق

عجب نہیں کبھی گُزرے ترے خیال کی رَو
مِرے گمان کے طائر شکار کرتے ہُوئے

کہیں چُھپائے مرے سامنے کے سب منظر
مجھے ، مجھی پہ کبھی آشکار کرتے ہُوئے

کِسے خبر ہے کہ اہلِ چمن پہ کیا گزری !
خزاں کی شام کو صبحِ بہار کرتے ہُوئے

ہَوس کی اور لُغت ہے ' وفا کی اورزباں
یہ راز ہم پہ کُھلا ، انتظار کرتے ہُوئے

عجیب شے ہے محبت کہ شاد رہتی ہے
تباہ ہوتے ہوئے اور غبار کرتے ہُوئے

ق

جو ہوسکے تو کبھی میر جی سے یہ پُوچھیں
یہ جان اُن کی غزل پرنثار کرتے ہُوئے

یہ کار خانہ اگر سرتا پا تو ہّم ہے ؟
تو لوگ کیسے چلیں ، اعتبار کرتے ہوئے

ہمارے بس میں کوئی فیصلہ تھا کب امجد !
جُنوں کے چُنتے ، وفا اختیار کرتے ہُوئے !

---

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

☆

دو گھڑی دِل کا حال سُنتا جا
اے مِرے خُوش جمال سُنتا جا

عِشق کی خُود سُپرد گی کو دیکھ !
عقل کی قِیل و قال ' سُنتا جا

یہ اَماوس کی آخری شب ہے
داستانِ ملال ، سُنتا جا

" من نہ کردم ، شما حذر بکنید "
زندگی کا مآل ، سُنتا جا

تجھ سے کرنا نہیں جواب طلب
آخری اِک سوال سُنتا جا

گُونج میں ٹوٹتے ستاروں کی
سب عُروج و زوال سُنتا جا

تجھ پہ بیتی ہے جو بھی کہہ امجد
کُچھ مِرے حسبِ حال ، سُنتا جا

☆

آئینوں میں عکس نہ ہوں تو حیرت رہتی ہے
جیسے خالی آنکھوں میں بھی وحشت رہتی ہے

ہر دَم دُنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے ،
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں ، فرصت رہتی ہے

کرنی ہے تو کُھل کے کرو ' انکارِ وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

شہرِ سخن میں ایسا کُچھ کر ' عزت بن جائے
سب کُچھ مٹی ہوجاتا ہے ' عزّت رہتی ہے

بنتے بنتے ڈھ جاتی ہے دل کی ہر تعمیر
خواہش کے بہروپ میں شاید قسمت رہتی ہے !

سائے لرزتے رہتے ہیں شہروں کی گلیوں میں
رہتے تھے انسان جہاں اب دہشت رہتی ہے

موسم کوئی خُوشبو لے کر آتے جاتے ہیں
ہر پَل دھیان دریچے میں اِک صورت رہتی ہے

چاپ کوئی جو مُڑ جاتی ہے دل دروازے سے
کیا کیا ہم کو رات گئے تک وحشت رہتی ہے !

دھیان میں میلہ سا لگتا ہے بیتی یادوں کا
اکثر اُس کے غم سے دل کی صحبت رہتی ہے

پُھولوں کی تختی پہ جیسے رنگوں کی تحریر
لوحِ سخن پر ایسے امجد شہرت رہتی ہے

☆

جو بھی اُس چشم خُوش نگاہ میں ہے
حاکمِ وقت کی پناہ میں ہے

فرق سائل کی ہے صدا میں کُچھ!
یا کمی ظرفِ بادشاہ میں ہے!

اُس کو اہلِ ہوس نہ سمجھیں گے!
لُطف جو فاصلے کی چاہ میں ہے

داستاں، شب کے جاگنے کی، رقم
آنکھ کے حلقۂ سیاہ میں ہے

حالتِ جنگ ہی میں رہتا ہے
جب سے دل درد کی سپاہ میں ہے

نہیں وہ خواہشِ نجات میں بھی
جو کشش دامنِ گناہ میں ہے !

بے نیازی سہی طبعیت میں
دِلبری بھی تو اُس نگاہ میں ہے

رُوح بیدار ہوتی جاتی ہے
دل کِسی روشنی کی راہ میں ہے
تیغ دو دم سے بھی سِوا خطرہ
حلقۂ قُرب ِ بادشاہ میں ہے

بہت آساں ہے مُدّعی ہونا !
جتنی مشکل ہے ' سب نباہ میں ہے

کیا یقیں ہو کسی پہ جب ،امجد
اپنا ہونا بھی اشتباہ میں ہے !

———

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

دِل کو حصارِ رنج و اَلم سے نِکال بھی
کب سے بکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی

آہٹ سی اُس حسین کی ہر سُو تھی ، وہ نہ تھا
ہم کو خُوشی کے ساتھ رہا اِک ملال بھی

سب اپنی اپنی موجِ فنا سے ہیں بے خبر
میرا کمالِ شاعری ، تیرا جمال بھی

حُسنِ اَزل کی جیسے نہیں دُوسری مثال
ویسا ہی بے نظیر ہے اُس کا خیال بھی !

مت پُوچھ کیسے مرحلے آنکھوں کو پیش تھے
تھا چودھویں کا چاند بھی ، وہ خُوش جمال بھی

جانے وہ دن تھے کون سے اور کون سا تھا وقت!
گڈ مُڈ سے اب تو ہونے لگے ماہ و سال بھی !

اِک چشمِ التفات کی پیہم تلاش میں
ہم بھی اُلجھتے جاتے ہیں ، لمحوں کا جال بھی !

دنیا کے غم ہی اپنے لیے کم نہ تھے کہ اور
دل نے لگالیا ہے یہ تازہ وبال بھی !

اِک سر سری نگاہ تھی ، اِک بے نیاز چُپ
میں بھی تھا اُس کے سامنے ، میرا سوال بھی !

آتے دنوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ کُھلے
سب کچھ فنا کا رِزق ہے ماضی بھی حال بھی !

تم دیکھتے تو ایک تماشے سے کم نہ تھا
آشتگانِ دشتِ محبّت کا حال بھی !

اُس کی نگاہِ لُطف نہیں ہے ، تو کُچھ نہیں
امجد یہ سب کمال بھی ، صاحبِ کمال بھی !

☆

جو دیکھنے کا تمھیں اہتمام کرتے ہیں
زمیں سے جُھک کے ستاروں کلام کرتے ہیں

تو آؤ آج سے ہم ایک کام کرتے ہیں
وفا کے نام سبھی صبح و شام کرتے ہیں

یہ راستہ ہے مگر ہجرتی پرندوں کا
یہاں سمے کے مُسافرقیام کرتے ہیں

وفا کی قبر پہ کب تک اِسے جلا رکھیں
سو یہ چراغ ہواؤں کے نام کرتے ہیں

کبھی جو بام پہ ٹھرے تو چاند رُک جائے
غزال دیکھ کے اُس کو خرام کرتے ہیں

(ق)

یہ اہلِ درد کی بستی ہے زرگوں کی نہیں
یہاں دِلوں کا بہت احترام کرتے ہیں

جہاں پنا ہوں کی جانب نظر نہیں کرتے
غریب شہر کو جُھک کر سلا م کرتے ہیں

ہے اِن کی چشمِ توجّہ میں روشنی ایسی
کہ جیسے اِس میں ستارے قیام کرتے ہیں

یہاں پہ سِکّۂ اہلِ ریا نہیں چلتا
کہ اہلِ درد نظر سے کلام کرتے ہیں

یہ حق پرست ہیں کیسے عجیب سو دا گر
فنا کی آڑ میں کارِ دوام کرتے ہیں

جہاں جہاں پہ گِرا ہے لہو شہید وں کا
وہاں وہاں پہ فرشتے سلام کرتے ہیں

نہ گھر سے اِن کو ہے نسبت نہ کوئی نام سے کام
دِلوں میں بستے ، نظر میں مقام کرتے ہیں

رواجِ اہلِ جہاں سے انھیں نہیں مَطلب
کہ یہ تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

جہاں میں ہوتے ہیں ایسے بھی کُچھ ہُنر والے
جا اِک نگاہ میں اَمجد غلام کرتے ہیں

☆

حسابِ عُمر کا اِتنا سا گوشوار ہے
تمھیں نکال کے دیکھا تو سب خسارا

کسی چراغ میں ہم ہیں ، کسی کنول میں تُم
کہیں جمال ہمارا کہیں تمہارا

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشّے میں
تمام عُمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

ہر اک صدا جو ہمیں باز گشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دو بارا کہ یہ دوبارا ہے !

وہ منکشف مِری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حُسن کسی حُسن کا اشارا ہے

عجب اُصول ہیں اِس کا روبارِ دُنیا کے
کِسی کا قرض کِسی اور نے اُتارا ہے

کہیں پہ ہے کوئی خوشبو کہ جِس کے ہونے کا
تمام عالمِ موجود ، استعارا ہے

نجانے کب تھا ! کہاں تھا ! مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گذارا ہے

یہ دو کنارے تو دریا کے ہوگئے ، ہم تم !
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے !

———

☆

اے گردشِ حیات کبھی تو دِکھا وہ نیند
جِس میں شبِ وصال کا نشّہ ہو ' لا وہ نیند

ہرنی سی ایک آنکھ کی مستی میں قید تھی
اِک عُمر جس کی کھوج میں پھر تا رہا ، وہ نیند

پُھو ٹیں گے اَب نہ ہونٹ کی ڈالی پہ کیا گلاب!
آئے گی اب نہ لَوٹ کے آنکھوں میں کیا ، وہ نیند !

کُچھ رَت جگے سے جاگتی آنکھوں میں رہ گئے
زنجیر انتظار کا تھا سلسلہ ، وہ نیند

دیکھا کُچھ اِس طرح سے کِسی خُوش نگاہ نے
رُخصت ہُوا تو ساتھ ہی لیتا گیا وہ ، نیند

خُوشبو کی طرح مُجھ پہ جو بِکھری تما شب
میں اُس کی مَست آنکھ سے چُھٹتا رہا ' وہ نیند

گُھومی ہے رتجگوں کے نگر میں تمام عُمر
ہر رہگذارِ درد سے ہے آشنا ' وہ نیند

تُو جس کے بعد حشر کا میلہ سجائے گا !
میں جس کے انتظار میں ہُوں ' اے خُدا ، وہ نیند !

امجد ہماری آنکھ میں لَوٹی نہ پھر کبھی
اُس بے وفا کے ساتھ گئی بے وفا ، وہ نیند

☆

اہلِ نظر کی آنکھ میں تاج و کلاہ کیا !
سایا ہو جن پہ درد کا ، اُن کو پناہ کیا ؟

ٹھرا ہے اِک نگاہ پہ سارا مقدّمہ
کیسے وکیل ! کون سا مُنصب ! گواہ کیا !

کرنے لگے ہو آٹھویں پہر کیوں خُدا کو یاد ؟
اُس بُت سے ہوگئی ہے کوئی رسم وراہ کیا ؟

اے ربِّ عدل تُو مری فردِ عمل کو چھوڑ
بس یہ بتا کہ اِس میں ہے میرا گُناہ کیا ؟

سارے فراق سال دُھواں بن کے اُڑگئے
ڈالی ہمارے حال پہ اُس نے نگاہ کیا !

کیا دل کے بعد آبروئے دِل بھی رَول دیں
دکھلائیں اُس کو جاکے یہ حالِ تباہ کیا ؟

جو جتنا کم بساط ہے ، اُتنا ہے معتبر
یارو یہ اہلِ فقر کی ہے بارگاہ ،کیا !

کیسے کہیں کہ کر گئی اِک ثانیے کے بیچ
جادُو بھری وہ آنکھ ، وہ جُھکتی نگاہ کیا !

(ق)
وہ بر بنائے جبر ہو یا اقتضائے صبر
ہر بُو لہوس سے کرتے رہو گے نباہ کیا ؟

ہر شے کی مثل ہو گی کوئی بے کسی کی حد !
اِس شہرِ بے ہُنر کا ہے دِن بھی سیا ہ کیا ؟

رستے میں تھیں غنیم کے پُھو لوں کی پتّیاں
سالار بِک گئے تھے تو کرتی سپاہ کیا !

دِل میں کوئی اُمّید نہ آنکھوں میں روشنی
نکلے گی اِس طرح کوئی جینے کی راہ کیا ؟

امجد نزولِ شعر کے کیسے بنیں اُصول !
سیلاب کے لیے ہوتی ہے راہ کیا ؟

☆

عمر اِک خواب سجانے میں گئی
تیری تصویر بنانے میں گئی

کٹ گئی کچھ تو غمِ ہجراں میں
اور کُچھ مِلانے میں گئی

ایک شعلہ سا کبھی لپکا تھا
زندگی آگ بجھانے میں گئی

ایسے سودے میں تو گھاٹا ہے ' اگر
آبرو، سر کے بچانے میں گئی !

تم بھی چاہو تو نہیں بن سکتی
بات، جو بات بنانے میں گئی

رہ گئی کچھ تو ترے سُننے میں
اور کُچھ اپنے سنانے میں گئی

عُمر بھر کی تھی کمائی میری
جو ترے بام پہ آنے میں گئی

عکس در عکس فقط حیرت تھی
عقل جب آئنہ خانے میں گئی

———

☆

کِسی کی دُھن میں ، کِسی کے گُماں میں رہتے ہیں
ہم ایک خواب کی صُورت جہاں میں رہتے ہیں

ہمارے اشک چمکتے ہیں اُس کی آنکھوں میں
زمیں کا رزق ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں

جو لوگ کرتے ہیں دُنیا سے سُود کی خواہش
ہمیشہ گردشِ دورِ زیاں میں رہتے ہیں

نظر کے سامنے ، آبِ رواں کے ہوتے ہُوئے
جو اہلِ صبر ہیں ، تشنہ لباس میں رہتے ہیں

ہر اِک بھنور سے زیادہ تباہ کار ہیں یہ
جو چند خوف پھٹے باد باں میں رہتے ہیں

اُنہی کے دم سے ہے جاری یہ روشنی کا سَفر
جو دل چراغ کی صُورت جہاں میں رہتے ہیں

یہ اہلِ درد ہیں اِن کا چلن ہے سب سے الگ
مکان رکھتے ہیں اور لا مکاں میں رہتے ہیں

یہ جان کر بھی کہ انتم ہے بُھر بھری مٹی
یہ لوگ خواہش ِ نام و نشاں میں رہتے ہیں !

کِسی سراب کی صُورت ، کسی گُمان کی طرح
ہم اپنے ہست کی ریگِ رواں میں رہتے ہیں

سَمے کا چاک ہے اورخاک ہے حوادث کی
زمین زاد ، سدا امتحاں میں رہتے ہیں

معجزہ جو نہیں ہے تو اور کیا ہے جاں !
کہ آگ آگ ہیں اور خاکداں میں رہتے ہیں

ہمارے بختِ ستم ساز کا کمال ہے یہ
گُلِ بہار میں لیکن خزاں میں رہتے ہیں

حصارِ دشت میں متروک راستوں کی طرح
ہمارے گیت ، ترے گُلستاں میں رہتے ہیں

مکاں کی قید سے ، حدِّ زمان سے باہر
ہم اپنے ذہن کی موجِ رواں میں رہتے ہیں

غموں کی دُھوپ سے ڈرتے نہیں ہیں وہ امجد
کسی نگاہ کے جا سائباں میں رہتے ہیں

☆

ہمارے سارے خواب ' جاں !
تری ہی سمت رواں

یہی اُدھورے راستے
ہیں منزلوں کے ترجمان

بُجھی ہُوئی زمین پر
جُھکے ہیں سات آسماں

بنیں گی اَبر ایک دن
یہ چھو ٹی چھوٹی بدلیاں

ہے لفظ لفظ روشنی
صداقتوں کے درمیاں

(ق)

جو زندگی فروش تھے
وہی ہیں شہر کی زباں

جو خُود زمیں کا بوجھ ہیں
بنے ہیں میرِ کارواں

جو روشنی کے چور تھے
وہی ہیں روشنی نشاں

(ق)

غلام سَر اُٹھائیں گے
کہاں تھا تخت کو گُماں!

زمین کھاگئی اُنھیں
جو بَن رہے تھے آسماں

جو زندگی کا حُسن تھے
وہ لوگ رہ گئے کہاں

بہت تلاش ہوچکی
بس اب تو تھک گئے میاں

کہاں ہیں میرے ہم نفس
کہاں ہیں میرے ہم زباں !

☆

یوں تو کیا چیز زندگی میں نہیں
جیسے سوچی تھی اپنے جی میں ' نہیں

دِل ہمارا ہے چاند کا وہ رُخ
جو ترے رُخ کی روشنی میں ، نہیں

سب زمانوں کا حال ہے اِس میں
اِک وہی شام ، جنتری میں نہیں !

ہیں خلاؤں میں کِتنی دُنیا ئیں
جو کِسی حدِّ آگہی میں نہیں !

ہو کیسا، حَرم کہ بُت خانہ
فرق ان میں ہے، بندگی میں نہیں

ایک اِنساں ہے، زندگی جَیسا
اور وہ میری زندگی میں نہیں !

تُونہیں، تیرا غم ہے چاروں طَرف
جس طرح چاند، چاندنی میں نہیں

اَجر تو صَبر کے جَلو میں ہے
موجِ دریا میں، تِشنگی میں نہیں

http://www.hallagulla.com/urdu/

ایک بے نام سے خلا کے سوا
کون سا رنگ، کافری میں نہیں !

ایک گرا ب بے خُودی کے سِوا
کیا تماشا ہے جو خُودی میں نہیں !

ہے ہمارا وہ مُدّعا امجد
کوئی بھی جس کی پَیروی میں نہیں

☆

اَب تک نہ کُھل سکا کہ مرے رُو برو ہے کون !
کِس سے مکالمہ ہے ! پسِ گفتگو ہے کون !

سایا اگر ہے وہ تو ہے اُس کا بدن کہاں ؟
مرکز اگر ہوں میں تو مِرے چار سُو ہے کون !

ہر شے کی ماہیت پہ جو کرتا ہے تُو سوال
تجھ سے اگر یہ پُوچھ لے کوئی کہ تُو ہے کون !

اشکوں میں جھلملاتا ہُوا کِس کا عکس ہے !
تاروں کی رہگزار میں یہ ماہ رُو ہے کون !

باہر کبھی تو جھانک کے کھڑکی سے دیکھتے !
کِس کو پُکارتا ہُوا یہ کُو بہ کُو ہے کون !

آنکھوں میں رات آگئی لیکن نہیں کُھلا
میں کِس کا مدّعا ہُوں؟ مِری جستجو ہے کون !

کِس کی نگاہِ لُطف نے موسم بدل دیئے
فصلِ خزاں کی راہ میں یہ مُشکبو ہے کون !

بادل کی اوٹ سے کبھی تاروں کی آڑ سے
چُھپ چُھپ کے دیکھتا ہُوا یہ حیلہ جُو ہے کون !

تارے ہیں آسمان میں جیسے زمیں پہ لوگ
ہر چند ایک سے ہیں مگر ہُو بہو ہے کون !

ہونا تو چاہیے کہ یہ میرا ہی عکس ہو !
لیکن یہ آئینے میں مِرے رُو بُرو ہے کون !

اِس بے کنار پَھیلی ہُوئی کائنات میں
کِس کو خبر کہ کون ہوں مَیں! اور تُو ہے کون !

سارا فساد بڑھتی ہُوئی خواہشوں کا ہے
دِل سے بڑا جہان میں امجد عدُود ہے کون !

☆

گردِ سَفر میں بُھول کے منزل کی راہ تک
پھر آگئے ہیں لوگ نئی قتل گاہ تک

اِک بے کسی کا جال ہے پھیلا چہار سُو
اِک بے بسی کی دُھند ہے دِل سے نگاہ تک

بالائے سطحِ آب تھے جتنے تھے بے خبر
اُبھرے نہیں ہیں وہ کہ جو پہنچے ہیں تھاہ تک

اِک دُوسرے پہچان کا دینا تھا جِس میں کھیل
اب رہ گیا ہے صرف وہ رشتہ نباہ تک

اہل ِ نظر ہی جانے ہیں کیسے اُفق مثال !
حدِّ ثواب جاتی ہے حدِّ گناہ تک

زنجیرِ عدل اب نہیں کھینچے گا کوئی ہاتھ
رُلتے ہیں اب تو پاؤں میں تاج و کُلاہ تک

پُھولوں سے اِک بھری ہُوئی بستی میاں پہ تھی
اب دل پہ اس کا ہوتا نہیں اشتباہ تک

آتی ہے جب بہار تو آتی ہے ایک ساتھ
باغوں سے لے کے دشت میں اُگتی گیاہ تک

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاجل سے اِک بھری ہُوئی چشم ِ سیاہ تک

جذبات بُجھ گئے ہوں تو کیسے جلے یہ دِل
میرِ سپہ کا نام ہے اُس کی سپاہ تک

امجد اب اس زمین پہ آنے کو ہے وہ دِن
عالم کے ہاتھ پہنچیں گے عالم پناہ تک

———

☆

دل کے کہنے پہ جب لڑے تم تھے
پھر زمانے سے کیوں ڈرے تم تھے

نقش تھے ہاتھ کی لکیروں میں
دسترس سے مگر پرے تم تھے

لاکھ پھیلا، سمٹ نہ پائے تم
دل کی اوقات سے بڑے تم تھے

ہم نے جس رہ کا انتخاب کیا
اُس کے ہر موڑ پر کھڑے تم تھے

اِک شرارِ گُمان کی مانند!
دھیان کی راکھ نیں پڑے تم تھے

(ق)

جانے کِس لہر میں تھا میں سر شار!
جانے کِس موج میں ہَرے تم تھے

ہاتھ کے لمس سے چھَلک اُٹھے
جا مِ کی طرح بھرے تم تھے

کیا تھا ! جس میں اُلجھ گیا تھا میں
جانے کِس بات پر اَڑے تم تھے ؟

ایک ہی لمحہ خموشی میں
حدِّ آواز سے پرے تم تھے

☆

یہ بو لتے ہوئے لمے یہ ڈولتی ہُوئی شا م
ترے جمال کے صد قے ، تر ے وصا ل کے نام

خُدا کرے سَدا کِھلتے رہیں۔چلیں یوں ہی
تر ے لبوں کے ستا رے تری نظر کے جام

ترے بدن کی پہیلی میں رک گئی خوشبو
ترے لباس پر آ کر ہوئے ہیں رنگ تمام

طلسم بند قبا سے ہیں انگلیاں روشن
لہو میں آگ کی صورت اُتر رہی ہے شام

مہک وفا کی سدا ساتھ چلتی رہے
محبتوں کے سفر کا بخیر ہوا نجام

متاع درد تو ورثہ ہے آنکھ والوں کا
تجھے یہ زخم مبارک ہو اے دل ناکام !

بھٹک رہے ہیں کسی خواب کی طرح کب سے
اس آس پہ کے تری آنکھ میں کریں آرام

میں اس گلی سے گزرتا ہوں بار بار امجد
کبھی تو بام پہ آئے گا میرا ماہ تمام

☆

کلام کرتی نہیں بولتی بھی جاتی ہے
تری نظر کو یہ کیسی زبان آتی ہے!

کبھی کبھی مجھے پہچانتی نہیں وہ آنکھ
کبھی چراغ سے چاروں طرف جلاتی ہے

عجب تضاد میں پلتی ترے وصل کی آس
کہ ایک آگ بجھاتی ہے اک لگاتی ہے

وہ دیکھتی ہے مجھے ایسی مست نظروں سے
مرے لہُومیں کوئی آگ سر سراتی ہے

یہ چار سو کا اندھیرا سمٹنے لگتا ہے
کچھ اس طرح تری آواز جگمگاتی ہے

یہ کوئی اور نہیں آگ ہے یہ اندر کی
بدن کی رات میں جو روشنی بچھاتی ہے

میں اس کو دیکھتا رہتا ہوں رات ڈھلنے تک
جو چاندنی تری گلیوں سے ہو کر آتی ہے

یہ روشنی بھی عطا ہے تری محبت کی
جو میری روح کے منظر مجھے دکھاتی ہے

امید وصل بھی امجد ہے کانچھ کی چوڑی
کہ پہننے میں کئی بار ٹوٹ جاتی ہے

☆

لبوں پہ رُکتی، دِلوں میں سما نہیں سکتی
وہ ایک بات جو لفظوں میں آ نہیں سکتی

جو دِل میں ہو نہ رِغم تو اشک پانی ہے
کہ آگ خاک کو کُندن بنا نہیں سکتی!

یقین گمان سے باہر تو ہو نہیں سکتا
کہ آگ خاک کو کُندن بنا نہیں سکتی !

دِلوں کی رمز فقط اہلِ درد جانتے ہیں
تری سمجھ میں مِری بات آ نہیں سکتی

یہ سوزِ عشق تر گو نگے کا خواب ہے جیسے
مِر ی زباں، مِری حا لت بتا نہیں سکتی

(ق)

سمٹ رہی ہے مِرے بازوؤں کے حلقے میں
حیا کے بوجھ سے پلکیں اُٹھا نہیں سکتی

جو کہہ رہا ہے سُلگتا ہُوا بدن اُس کا
بتا بھی پاتی نہیں اور چُھپا نہیں سکتی

اَک ایسے ہجر کی آتش ہے میرے دل میں جسے
کسی وصال کی بارش بُجھا نہیں سکتی

تو جو بھی ہونا ہے امجدؔ یہیں پہ ہونا ہے
زمیں مدار سے باہر تو جا نہیں سکتی!

☆

یہ گردِ بادِ تمنّا میں گھومتے ہُوئے دِن
کہاں پہ جا کے رُکیں گے یہ بھاگتے ہُوئے دِن!

غروب ہوتے گئے رات کے اندھیروں میں
نویدِ امن کے سُورج کو ڈھونڈتے ہوئے دِن

نہ آپ چلتے، نہ دیتے ہیں راستہ ہم کو
تھکی تھکی سی یہ شامیں،یہ اُونگھتے ہُوئے دِن

پھر آج کیسے کٹے گی پہاڑ جیسی رات!
گزر گیا ہے یہی بات سوچتے ہُوئے دِن

تمام عُمر مِرے ساتھ ساتھ چلتے رہے
تجھے تلاشتے ،تجھ کو پُکارتے ہُوئے دِن

ہر ایک رات جو تعمیر پھر سے ہوتی ہے
کٹے گا پھر وہی دیوار چاٹے ہُوئے دِن

مِرے قریب سے گُزرے ہیں بار ہا امجدؔ
کِسی کے وَصل کے وعدے کو دیکھتے ہُوئے دِن

www.HallaGulla.com

☆

جو رَستہ بھی دل نے چُنا ہے
تیرے غم کی سمت کُھلا ہے

پانی پر جو حرف لِکھا تھا
دیکھو ،کیسے ٹھہرے گیا ہے

ڈھلتی شام کے سائے سائے
تُو ہے ،تیرا غم ہے !کیا ہے !

آگ بُجھے تو مُدّت گُزری
آنکھوں میں کیا پھیل رہا ہے!

ایک سوال مِلا تھا ،مجھ کو
میں نے تجھ کو مانگ لیا ہے

Virtual Home for Real People

یُوں لگتا ہے جیسے کوئی
مُجھ کو مسلسل دیکھ رہا ہے

شام کی اُنگلی تھام کے سُورج
بُھو کا پیاسا لوٹ رہا ہے

طشتِ فلک میں تارے بھرکر
چاند کِسے مِلنے جاتا ہے!

بارش کی آواز سے امجد
شہر کاچہرہ کِھل اُٹھا ہے

☆

نہ رَبط ہے نہ معانی، کہیں توکِس سے کہیں!
ہم اپنے غم کی کہانی ،کہیں تو کِس سے کہیں!

سِلیں ہیں برف کی سینوں میں اب دِلوں کی جگہ
یہ سوزِ دردِ نہانی، کہیں تو کِس سے کہیں!

نہیں ہے اہل جہاں کو خُود اپنے غم سے فراغ
ہم اپنے دِلگی گرانی ، کہیں تو کِس سے کہیں!

پلٹ رہے ہیں پرندے، بہار سے پہلے
عجیب ہے یہ نشانی ، کہیں تو کِس سے کہیں!

نئے سخن کی طلب گار ہے ، نئی دُنیا
وہ ایک بات پرانی ، کہیں تو کِس سے کہیں

نہ کوئی سُنتا ہے امجدؔ نہ مانتا ہے اِسے
حدیثِ شام جوانی ، کہیں تو کِس سے کہیں

☆

دُنیا کا کچھ بُرا بھی تماشا نہیں رہا
دِل چاہتا تھا جس طرح ویسا نہیں رہا

تُم سے ملے بھی ہم تو جُدائی کے موڑ پر
کشتی ہُوئی نصیب تو دریا نہیں رہا

کہتے تھے ایک پَل نہ جئیں گے ترے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں وہ وعدہ نہیں رہا

کاٹے ہیں اِس طرح سے ترے بعد روز و شب
میں سانس لے رہا تھا پہ زندہ نہیں رہا

آنکھیں بھی دیکھ دیکھ کے خواب آگئی ہیں تنگ
دِل میں بھی اب وہ شوق ' وہ لپکا نہیں رہا

http://www.hallagulla.com/urdu/

کیسے ملائیں آنکھ، کسی آئنے سے ہم
امجدؔ ہمارے پاس تو چہرہ نہیں رہا

☆

کچھ اس طرح دیکھا کِسی بے وفا نے
غضب ہوگئے چند آنسو چھپانے

علی الرغمِ دُنیا پھر اس بار بھی ہم
ڈٹے ہیں ترے سامنے اسے زمانے !

وُہی خُونِ آدم کی بے چارگی ہے
وہی ہیں جنہیں، وہ آستانے !

مقدّر نہ بدلا مجبور ہو کر
خُدا کتنے بدلے ہیں خلقِ خُدا نے !

کسی بے وفا کو نہ قسمت دِکھائے
ہمیں جو دکھایا ہماری وفا نے

کچھ اِس طرح رہتے ہیں ہم پاس اس کے
کہ جیسے گھروں میں کھلونے پرانے

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

جو کُچھ دیکھا جو سوچا ہے وُہی تحریر کر جائیں !
جو کاغذ اپنے حصّے کا ہے وہ کاغذ تو بھر جائیں !

نشے میں نیند کے تارے بھی ، اِک پہ گرتے ہیں
تھکن رستوں کی کہتی ہے چلو اب اپنے گھر جائیں

کُچھ ایسی بے حسی کی دُھند سی پھیلی ہے آنکھوں میں
ہماری صُورتیں دیکھیں تو آئینے بھی ڈر جائیں

نہ ہمت ہے غنیمِ وقت سے آنکھیں ملانے کی
نہ دِل میں حوصلہ اِتنا کہ مٹّی میں اُتر جائیں

گُلِ اُمید کی صُورت ترے باغوں میں رہتے ہیں
کوئی موسم ہمیں بھی دے کہ اپنی بات کر جائیں

دیارِ دشت میں ریگِ رواں ، جن کو بناتی ہے
بتا اے منزلِ ہستی کہ وہ رستے کدھر جائیں ؟

تو کیا اے قاسمِ اشیاء، یہی آنکھوں کی قسمت ہے !
اگر خوابوں سے خالی ہوں تو پچھتاووں سے بھر جائیں!

اگر بخشش میں ملے امجدؔ، تو اُس خُوشبو سے بہتر ہے
کہ اس بے فیض گلشن سے بندھی مُٹھی گزر جائیں

☆

تھکی تھکی سے تنہائی ہے گُھٹی گُھٹی بیزاری ہے
یہ کیسے گر د اب میں ہم نے کشتی خواب اُتاری ہے

شمس وقمر کے جادُو گھر میں ، بحرو بَر کی حیرت میں
یو ں لگتا ہے جیسے اب تک " کُن " کا کلمہ جاری ہے

خاک اور خُوں کا رِزق کیے ہیں کِتنے رنگ اور کِتنے نقش
صفحۂ جاں پر تب جا کر یہ اِک تصویر اُبھاری ہے

روح کے اندر جتنے دیئے ہیں سب ہی جلا لو آج کی رات
جاگنے والو آج کی شب کا لمحہ لمحہ بھاری ہے

دشتِ وفا کے پیڑ عجب ہیں پھل بھی نہین چھاؤں بھی نہیں
اورسفر میں آنے والا اِک اِک چشمہ کھاری ہے

لَو یہ چراغِ آزادی کی امؔجد قائم دائم ہو
میرے بڑوں نے اپنے لہُو سے اس کی نذر اُتار ی ہے

☆

کوئی خواب دشتِ فراق میں سرِ شام چہرہ کشا ہُوا
مِری چشمِ تر میں رُکا نہیں کہ تھارَت جگوں کا ڈسا ہُوا

مِرے دِل کو رکھتا ہے شاد ماں، مرے ہونٹ رکھتا ہے گُل فشاں
وہی ایک لفظ جو آپ نے مِرے کان میں ہے کہا ہُوا

ہے نِگاہ میں مِری آج تک وہ نِگاہ کوئی جُھکی ہُوئی
وہ جو دھیان تھا کِسی دھیان میں، وہیں آج بھی ہے لگا ہُوا

مِرے رَت جگوں کے فشار میں' مِری خواہشوں کے غبار میں
وُہی ایک وعدہ گلاب سا سرِ نخلِ جاں ہے کِھلا ہُوا

تری چشمِ خُوش کی پناہ میں کِسی خواب زوار کی راہ میں
مِرے غم کا چاند ٹھر گیا کہ تھارات بھر کا تھکا ہُوا

ہے یہ مُختصر، رہِ عشق پر، نہیں آپ ہم، رہے ہم سَفر
تو لو کِس لیے یہ مباحثہ، کہاں! کون! کیسے جُدا ہُوا

کِسی دل کُشا سی پُکار سے اُسی ایک بادِ بہار سے
کہیں برگ برگ نمو مِلی، کہیں زخم زخم ہَرا ہُوا

ترے شہرِ عدل سے آج کیا سبھی درد مند چلے گئے
نہیں کاغذی کوئی پیر ہن، نہیں ہاتھ کوئی اُٹھا ہُوا

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

پہلو سے اُٹھ کے آپ کُچھ ایسی اَدا سے کل گئے
بُجھ گیا شعلہ نوا، تاروں کے پُھول جَل گئے

حشر کے دن پہ جا پڑا، تیرا مِرا معاملہ
یعنی ادق مقام تھے، اچّھا ہُوا کہ ٹل گئے

زد پہ کوئی ہدف نہ تھا، تانی ہوئی کماں نہ تھی
ترکشِ جاں کے تیر اپنی ہی سمت چَل گئے

آئینہ ماہ و سال میں ہم تجھے جوڑتے رہے
آنکھوں میں دُھند بھر گئی، عکس بدل بدل گئے

ہم نے ترے خیال میں ڈھونڈا ترے جمال کو
لفظوں کی دیکھ بھال میں معنی کہیں نکل گئے

---

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

☆

جاہ کی خواہش بے فیض پہ مرنے والے
کسی اِنسان کی عزّت نہیں کرنے والے

وہی اب شہر کی نظروں میں شناور ٹھہرے
لبِ دریا جو کھڑے تھے کئی ڈر نے والے

کِس قدر خواب ابھی شعر بنانے ہیں، ہمیں
کِتنے خاکوں میں ابھی رنگ بھرنے والے!

وقت پر زور نہیں، عُمر چلی جاتی ہے
سینکڑوں کام پڑے ہیں ابھی کرنے والے

بُھول ہوگی تو اُسے دِل سے کریں گے تسلیم
ہم نہیں دوش کِسی اور پہ دھرنے والے

دیکھ لے آنکھ اُٹھا کر ہمیں اسے سیلِ ہوس
نہیں اِس شہر کے سب لوگ بِکھرنے والے

پیار بٹنے سے کبھی ختم نہ ہوگا امجدؔ
دل کے دریا تو نہیں ہوتے اُترنے والے

☆

باغِ جہاں سے صُورت شبنم چلے گئے
کیا کیا کُلاہ و مَسند و پرچم چلے گئے

ہم تک خُود اپنی گُھوم کے آنے لگی صَدا
کیا سب نوائے درد کے محرم چلے گئے؟

اُن کا حساب کون دے اے ربِّ نطق و صَورت ؟
جو حرف، نا شنیدہ و مبہم چلے گئے

تُم نے نگاہ پھیر کے دیکھا بس ایک پَل
اُس ایک پَل میں کتنے ہی موسم چلے گئے

عالم وُہی ہے آج بھی، لیکن جو دیکھے !
جتنے تھے لوگ اُتنے ہی عالم چلے گئے

روشن اُسی طرح سے اہلِ ہُنر کی خاک
ساغر کے ساتھ ساتھ کئی جم، چلے گئے

جاگا نہ نخلِ دارِ وفا پر کوئی چراغ
امجؔد تو سر کو شمع کیے، ہم، چلے گئے

☆

دِل ترے غم کی بارگاہ میں ہے
جیسے قیدی حضورِ شاہ میں ہے

شہر والوں کو کُچھ خبر، ہی نہیں
کیسا سیلاب آج راہ میں ہے

ہے تعلق تو ایک سادہ لفظ
پھیر جو بھی ہے وہ نباہ میں ہے

حادثہ ہو چکا کہ ہونا ہے!
بِھیڑ کیسی یہ شاہراہ میں ہے !

سر میں بھی ہو یہ لازمی تو نہیں !
جو فضیلت کِسی کُلاہ میں ہے !

دیکھنے میں تو ایک ہے دریا
سطح پر وہ نہیں جو تھاہ میں ہے

ہم کِسی تیسرے کی منزل ہیں
دل کِسی دُوسرے کی راہ میں ہے

(ق)

رُوح درویش تو ہے لنگر میں
اور بدن اُس کا خانقاہ میں ہے

http://www.hallagulla.com/urdu/

فیض وہ ہے جو خلق کو پُہنچے
کب یہ پتّھر کی بارگاہ میں ہے!

اُس کو رنگِ جہاں سے کیا ڈرنا
جو تری چشم پناہ میں ہے

(ق)

وہ سیاہی تو رات میں بھی نہیں
جو مِرے نامۂ سیاہ میں ہے

جیسے دُکّانِ شیشہ گر میں بیل
وقت، یوں دل کی کار گاہ میں ہے

گرد بادِ وفا کی منزل ہی
دامنِ دشتِ بے پناہ میں ہے

نارسا بخت کا گِلہ کیسا !
جب سفر ہی تمام راہ میں ہے

درد وہ مضمحل پرندہ ہے
جس کا گھر ہی دلِ تباہ میں ہے

کب سے میں نے پلک نہیں جھپکی !
کوئی امجدؔ مِری نگاہ میں ہے !

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

ہے محبت کا سِلسلہ کچھ اور
درد کُچھ اور ہے دَوا کُچھ اور!

غم کا صحرا عجیب صحرا ہے
جتنا کاٹا یہ بڑھ گیا کُچھ اور

کیسی قسمت ہے آنکھ والوں کی!
ہر تماشے میں دیکھنا کُچھ اور

عُمر ساری تضاد میں گزری
ہونا کُچھ اور، سوچنا کُچھ اور

بھیڑ میں آنسوؤں کی سُن نہ سکا
تم نے شاید کہا تو تھا کچھ اور !

کم نہیں وصل سے فراق ترا
اِس زیاں میں ہے فائدہ کُچھ اور

دل کِسی شے پہ مُطمئن ہی نہیں
مانگتا ہے یہ اژدہا، کُچھ اور

تیرے غم میں حسابِ عُمر رواں
جتنا جوڑا، بِکھر گیا کُچھ اور

وصل کی رات کاٹنے والے
ہے شبِ غم کا ذائقہ کُچھ اور

ہر طرف بھیڑ تھی طبیبوں کی
روگ بڑھتا چلا گیا کُچھ اور

کٹ گئے دھار پہ زمانے کی
ہم سے امجدؔ نہ ہوسکا کُچھ اور

☆

اِک نام کی اُڑتی خُوشبو میں اِک خواب سفر میں رہتا ہے
اِک بستی آنکھیں ملتی ہے، اِک شہر نظر میں رہتا ہے

کیا اہلِ ہُنر، کیا اہلِ شَرف، سب ٹکڑے، ردّی کاغذ کے
اِس دَور میں ہے وہ شخص بڑا جو روز خبر میں رہا ہے

پانی میں روز بہاتا ہے اِک شخص دیئے اُمیّدوں کے
اور اگلے دن تک پھر ان کے ہمراہ بھنور میں رہتا ہے

اِک خواب ہُنر کی آہٹ سے کیا آگ لہُو میں جلتی ہے
کیا لہر سی دل میں چلتی ہے! کیا نشّہ سر میں رہتا ہے

جو پیڑ پہ لِکھی جاتی ہے، جو گیلی ریت سے بنتا ہے
کون اُس تحریر کا وارث ہے! کون ایسے گھر میں رہتا ہے!

ہر شام، سُلگتی آنکھوں کو، دیوار میں چُن کر جاتی ہے
ہر خواب، شکستہ ہونے تک، زنجیر سحر میں رہتا ہے!

یہ شہر کتھا بھی ہے امجدؔ اِک قِصّہ سوتے جا گتے کا!
ہم دیکھیں جس کردار کو بھی جادُو کے اثر میں رہتا ہے

☆

محبت کا ثمر ملتا نہیں ہے
یہ سکّہ اب کہیں چلتا نہیں ہے

ہمیں کیا جو سخن دُنیا میں گُونجا
جسے سُنتا تھا وہ سُنتا نہیں ہے

ہم اہلِ دل، سرِ بازار دُنیا
کھڑے ہیں، راستہ ملتا نہیں

سفر جاری اگر ہے رہنماؤ!
تو پھر کیوں فاصلہ گھٹتا نہیں ہے؟

تم اپنے باد باں کھولو نہ کھولو
سمندر تو کبھی رُکتا نہیں ہے!

ہَری رہتی ہے کشتِ دل ہمیشہ
کِسی رُت میں اِسے چھِنتا نہیں ہے

سحر سے شام ہونے آگئی ہے
کوئی درد آشنا ملتا نہیں ہے

ہمارا دل ہے یوں قصرِ جہاں میں
وہ پتّھر، جو کہیں لگتا نہیں ہے

ہوائے شامِ غم بو جھل ہے اِتنی
چراغِ آرزو جلتا نہیں ہے

زمانہ آپ ہی بدلے تو بدلے
کِسی کا زور تو چلتا نہیں ہے

نہیں امجدؔ کوئی قیمت وفا کی
یہ سودا اَب یہاں بِکتا نہیں ہے

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

اِک سراب سِیمیا میں رہ گئے
لوگ جو بیم و رجا میں رہ گئے

کِس شبِ نغمہ کی ہیں یہ یاد گار!
چند نوحے جو ہَوا میں رہ گئے

پی لیے کُچھ اشک پاسِ عشق نے
کچھ فشارِ التجا میں رہ گئے

کھو گئے کُچھ اشک پاسِ عشق نے
کچھ فشارِ التجا میں رہ گئے

کھو گئے کُچھ حرف و شتِ ضبط میں
کُچھ غبارِ مُدّعا میں رہ گئے

چند جستوں کا یہ سارا کھیل ہے
رہ گئے، جو ابتدا میں، رہ گئے

سبز سایہ دار پیڑوں کی طرح
رفتگاں، دشتِ وفا میں رہ گئے

حاصلِ عُمرِ رواں، وہ وقت، جو
ہم تری آب و ہَوا میں رہ گئے

http://www.hallagulla.com/urdu/

ہم ہیں امجدؔ اُن حقائق کی طرح
جو بیانِ واقعہ میں رہ گئے

☆

www.HallaGulla.com

دستک کِسی کی ہے کہ گماں دیکھنے تو دے!
دروازہ ہم کو تیز ہَوا، کھولنے تو دے!

اپنے لہو کی تال پہ خواہش کے مور کو،
اے دشتِ احتیاط! کبھی ناچنے تو دے

سَودا ہے عُمر بھر کا، کوئی کھیل تو نہیں
اے چشمِ یار، مجھ کو ذرا سوچنے تو دے!

اُس حرفِ " کُن " کی ایک امانت ہے میرے پاس
لیکن یہ کائنات مجھے بولنے تودے!

شاید کِسی لکیر میں لِکّھا ہوا میرا نام
اے دوست اپنا ہاتھ مجھے دیکھنے تو دے

Virtual Home for Real People

یہ سات آسمان کبھی مختصر تو ہوں
یہ گُھومتی زمین کہیں ٹھیرنے تو دے!

کیسے کِسی کی یاد کا چہرہ بناؤں میں!
امجدؔ وہ کوئی نقش کبھی بُھولنے تودے

☆

عشق ایسا عجیب دریا ہے
جو بِنا ساحلوں کے بہتا ہے

ہیں غنیمت یہ چار لمحے
پھر نہ ہم ہیں، نہ یہ تماشا ہے

زندگی اِک دُکان کھلونوں کی
وقت، بگڑا ہوا سا بچّہ ہے

اے سرابوں میں گُھومنے والے!
دل کے اندر بھی ایک رستہ ہے

اِس بھری کائنات کے ہوتے
آدمی، کِسی قدر، اکیلا ہے!!

آئنے میں جو عکس ہے امجدؔ
کیوں کِسی دُوسرے کا لگتا ہے!

☆

جو زخم تُونے دیئے تھے وہ بھرتے جاتے ہیں
چڑھے ہُوئے تھے جو دریا، اُترتے جاتے ہیں

سمیٹ لے مجھے بانہوں میں اے فراق کی رات
فلک پہ دیکھ، ستارے بکھر تے جاتے ہیں

یہ اہلِ شہرِ وفا عجب بہار پرست
سروں کے پُھول فصیلوں پہ دھرتے جاتے ہیں

نہیں ہے اور تو کُچھ بھی ہمارے ہاتھوں میں
سوائے عرضِ تمنّا، سو کرتے جاتے ہیں

عجیب لوگ ہیں یہ اہلِ انتظار کو جو
خُود اپنی آگ میں جل کر سنور تے جاتے ہیں

نجانے کون سی بستی کے ہیں یہ باشندے!
نظر اُٹھاتے نہیں اور گزرتے جاتے ہیں

یہ آج شہر پہ اُتری ہے کِس بلا کی رات
چراغ اپنی لَوؤں سے مُکر تے جاتے ہیں

درخت شام کو لگتے ہیں شہر سے امجدؔ
کہ شاخ شاخ پرندے اُترتے جاتے ہیں

☆

سب ہیں بِکنے والے ہاتھ
کیا تیرے، کیا میرے ہاتھ

لہُو نہ مُخبر ہو جائے
دیکھو اپنے اپنے ہاتھ

بول فنا کے لمحے، بول
منزل ہے اَب کِتنے ہاتھ!

رُکے نہیں اورع جُھکے نہیں
سچّی باتیں لِکھتے ہاتھ

رنگوں کی آواز سُنی
دیکھے باتیں کرتے ہاتھ!

(ق)

کِس سے مِل کر جُھوما دل
کِس کو چُھو کر مہکے ہاتھ

پَوریں، جگنو ہو جائیں
کُنجِ بدن میں بھٹکے ہاتھ

http://www.hallagulla.com/urdu/

(ق)

اہلِ ہُنر نے دیکھو تو!
کِس کِس بھاؤ بیچے ہاتھ

مفلس کی بیٹی، قانون
چوروں کیھیں لمبے ہاتھ

کِس سے ہیں انصاف طلب!
سمٹی چیخیں، پھیلے ہاتھ

ہاتھوں ہاتھ نِکل جائیں
نقلی ہاتھ نِکل جائیں

چھین جھپٹ کا موسم ہے
کون لگے گا، کس کے ہاتھ

(ق)

گھر کی خاطر گھر سے دُور
تھک گئے اینٹیں چُنتے ہاتھ

ریگِ رواں کا رِزق ہُوئے
صحرا صحرا، کِتنے ہاتھ

http://www.hallagulla.com/urdu/

پیٹ جہنم بھرنے کو
جنّت چھوڑ کے نکلے ہاتھ

اَنت امانت مِٹّی کی
کیا مہنگے، کیا سستے ہاتھ

امجدؔ ہاتھ سے چُھوٹا پَل
کب آتا ہے مُڑ کے ہاتھ

☆

ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ، دیکھ تو آئیں
چلو اُس شہر کو اِک بار پھر سے، دیکھ تو آئیں

بہت دن سے سمندر کی ہَوا گُم سُم سی آتی ہے
نہ ہوں طوفان کے رُخ پر سفینے، دیکھ تو آئیں

کسی دن آرزوؤں کے کھنڈر میں جھانک کر ہم بھی
درد دیوار پر کیا کیا ہیں جالے، دیکھ تو آئیں

ہَوا میں ڈولتی خوشبو، پتہ ہی بتادے گی
چلو رستوں پہ تھوڑی، دُور چل کے، دیکھ تو آئیں

ہمارا نام سُنتے ہی کِسی مہ وِش کی آنکھوں میں
چمک اُٹھتے ہی کیا اب بھی ستارے! دیکھ تو آئیں

بہت دُھندلا سہی شیشے سرِ بزمِ وفا امجدؔ
مگر اک بار وہ گُم گشتہ چہرے، دیکھ تو آئیں

☆

بدن سے اٹھتی تھی اُس کے خوشبو، صبا کے لہجے میں بولتا تھا
یہ میری آنکھیں تھیں اُس کا بستر، وہ میرے خوابوں میں جاگتا تھا

حیا سے پلکیں جُھکی ہُوئی تھیں، ہَوا کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں
وہ میرے سینے میں سر چُھپائے، نجانے کیا بات سوچتا تھا!

کوئی تھا چشمِ کرم کا طالب، کسی پہ شوقِ وصال غالب
سوال پھیلے تھے چار جانب، بس ایک میں تھا جو چُپ کھڑا تھا

عجیب صحبت، عجیب رُت تھی، خموش بیٹھے ہوئے تھے دونوں
میں اُس کی آواز سُن رہا تھا، ہو میری آواز سُن رہا تھا

بہار آئی تو تتلیوں کے پَروں میں رنگوں کے خواب جاگے
اور ایک بھنورا کلی کلی کے لبوں کو رہ رہ کے چُومتا تھا

وہ اور ہوں گے کہ جن کو امجدؔ نئے مناظر کی چاہ ہوگی
میں اُس کے چہرے کو دیکھتا ہوں، اُس کے چہرے کو دیکھتا ہوں!

☆

یہ کون آج مِری آنکھ کے حصار میں ہے
مُجھے لگا کہ زمیں میرے اختیار میں ہے

چراغِ رنگِ نَوا، اب کہیں سے روشن ہو
سکوتِ شامِ سفر، کب سے انتظار میں ہے

کُچھ اِس طرح ہے تری بزم میں دل، جیسے
چراغِ شامِ خزاں، جشنِ نو بہار میں ہے

مِری حیات کے سارے سفر پہ بھاری ہے
وہ ایک پَل جو تری چشمِ اعتبار میں ہے

جو اُٹھ رہا ہے کسی بے نشان صحرا میں
نشانِ منزلِ ہستی اُسی غبار میں ہے

ہماری کشتئ دل میں بھی اب نہیں وہ زور
تمھارے حُسن کا دریا بھی اب اُتار میں ہے

کبھی ہے دُھوپ کبھی ابرِخُوش نما امؔجد
عجب طرح کا تلّون مزاجِ یار میں ہے

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

کوئی موسم ہو دل میں ہے، تمھاری یاد کا موسم
کہ بدلہ ہی نہیں جاناں، تمھارے بعد کا موسم

نہیں تو آزما کر دیکھ لو، کیسے بدلتا ہے
تمھارے مُسکرانے سے دلِ ناشاد کا موسم

صدا تیشے سے جو نکلی، دلِ شیریں سے اُٹھی تھی
چمن خسرو کا تھا لیکن ' رہا فرہاد کا موسم

پرندوں کی زباں بدلی ' کہیں سے ڈھونڈلے تُو بھی
نئی طرزِ فغاں اے دل کہ ہے ایجاد کا موسم

رُتوں کا قاعدہ ہے وقت پر یہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رُک گیا فریاد کا موسم!

کہیں سے اُس حسیں آواز کی خوشبُو پکارے گی
تو اُس کے ساتھ بدلے گا دلِ برباد کا موسم

قفس کے بام و دَر میں روشنی سی آئی جاتی ہے
چمن میں آگیا شاید لبِ آزاد کا موسم

مِرے شہرِ پریشاں مَیں تری بے چاند راتوں میں
بہت ہی یاد کرتا ہوں تری بُنیاد کا موسم

نہ کوئی غم خزاں کا ہے 'نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجدؔ کسی کی یاد کا موسم

☆

کہیں سنگ میں بھی ہے روشنی کہیں آگ میں بھی دُھواں نہیں
یہ عجیب شہرِ طلسم ہے! کہیں آدمی کا نشاں نہیں

نہ ہی اِس زمیں کے نشیب میں نہ ہی آسماں کے فراز پر
کٹی عُمر اُس کو تلاشتے، جو کہیں نہیں پہ کہاں نہیں؟

یہ جو زندگانی کا کھیل ہے، غم و انبساط کا میل ہے
اُسے قدر کیا ہو بہار کی! کبھی دیکھیں جس نے خزاں نہیں

وہ جو کٹ گرے پہ نہ جُھک سکے' جو نہ مقتلوں سے بھی رُک سکے
کئی ایسا سر نہیں دوش پر، کِسی مُنہ میں ایسی زباں نہیں

جو تھے اشک میں نے وہ پی لیے، لبِ خشک و سوختہ سی لیے
مِرے زخم پھر بھی عیاں رہے، مِرا درد پھر بھی نہاں نہیں

نہیں اس کو عِشق سے واسطہ وہ ہے اور ہی کوئی راستہ
اگر اِس میں دِل کا لہو نہیں اگر اِس میں جاں کا زیاں نہیں

☆

لبوں پہ پُھول کِھلتے ہیں کِسی کے نام سے پہلے
دِلوں کے دیپ جلتے ہیں، چراغِ شام سے پہلے

کبھی منظر بدلنے پر بھی قِصّہ چل نہیں پاتا
کہانی ختم ہوئی ہے کبھی انجام سے پہلے

یہی تارے تمھاری آنکھ کی چلمن میں رہتے تھے
یہی سُورج نکلتا تھا تُمھارے بام سے، پہلے

دِلوں کی جگمگاتی بستیاں تا راج کرتے ہیں،
یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے، پہلے

ہوئی ہے شام جنگل میں پرندے لوٹتے ہوں گے
اب اُن کو کِس طرح روکیں، نواحِ دام سے پہلے

یہ سارے رنگ مُردہ تھے تمھاری شکل بننے تک
یہ سارے حرف مہمل تھے تمھارے نام سے پہلے

ہُوا ہے وہ اگر مُنصف تو امجؔد احتیاطاً ہم
سزا تسلیم کرتے ہیں کسی الزام سے پہلے

☆

خزاں کی دُھند میں لپٹے ہوئے ہیں
شجر مجبوریاں پہنے ہوئے ہیں

یہ کیسی فصلِ گُل آئی چمن میں
پرندے خوف سے سہمے ہوئے ہیں

ہواؤں میں عجب سی بے کلی ہے
دِلوں کے بادباں سمٹے ہُوئے ہیں

ہمارے خواب ہیں مکڑی کے جالے
ہم اپنے آپ میں اُلجھے ہُوئے ہیں

دہکتے، گنگناتے، موسموں کے
لہو میں ذائقے پھیلے ہُوئے ہیں

مری صُورت، زمیں کے سارے منظر
رے دیدار کو ترسے ہُوئے ہیں

مثالِ نقشِ پا، حیران تیرے!
ہَوا کی راہ میں بیٹھے ہُوئے ہیں

نگاہوں سے کہو، ہم کو سمیٹیں
مِری جاں، ہم بہت بکھرے ہوئے ہیں

http://www.hallagulla.com/urdu/

ادھوری خواہشوں کا غم نہ کرنا
کہ سارے خواب کب پُورے ہُوئے ہیں!

سمندر، آسماں اور سانس میرا
تری آواز پر ٹھہرے ہوئے ہیں

ہر اِک رستے پہ کہتی ہیں یہ آنکھیں
یہ منظر تو کہیں دیکھے ہوئے ہیں!

ستارے آسماں کے، دیکھ امجدؔ
کسی کی آنکھ میں اُترے ہُوئے ہیں

☆

اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں
پھر بھی ہم مُسکرائے جاتے ہیں

دشتِ بے سائباں میں، ہم تیری
یاد کے سائے سائے جاتے ہیں

کوئی سُنتا نہیں کسی کی بات
اپنی اپنی سُنائے جاتے ہیں

قصرِ شاہی سے کب رُکے وہ سوال !
جو سڑک پر اُٹھائے جاتے ہیں

ایسی جُھکتی ہیں مہرباں آنکھیں
جیسے بادل سے چھائے جاتے ہیں

نہ سہی، زور گر ہَوا پہ نہیں
ہم دیا تو جلائے جاتے ہیں

راستہ صاف ہو نہ ہو لیکن
ہم تو پتھر ہٹائے جاتے ہیں

ہم سُناتے ہیں حال دل پنا
اور وہ مُسکرائے جاتے ہیں

پھیلتی جارہی ہے تنہائی
شہر میں لوگ آئے جاتے ہیں

پردے میں ایک مُسکراہٹ کے
کتنے آنسو چھپائے جاتے ہیں

کون آیا ہے رُو برو امجدؔ
آئینے جگمگائے جاتے ہیں

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

وہ دمکتی ہوئی لَو کہانی ہوئی وہ چمک دار شعلہ، فسانہ ہُوا
وہ جو اُلجھا تھا وحشی ہَوا سے کبھی، اُس دِیے کو بُجھے تو زمانہ ہُوا

ایک خوشبو سی پھیلی ہے چاروں طرف اُس کے امکان کی اُس کے اعلان کی
رابطہ پھر بھی اُس حسنِ بے نام سے، جس کا جتنا ہوا، غائبانہ ہُوا

باغ میں پھُول اُس روز جو بھی کھِلا اُس کے بالوں میں سجنے کو بے چین تھا
جو ستارا بھی اُس رات روشن ہُوا، اُس کی آنکھوں کی جانب روانہ ہُوا

کہکشاں سے پرے، آسماں سے پرے، رہگزارِ زمان و مکاں سے پرے
مجھ کو ہر حال میں ڈھونڈنا تھا اُسے، یہ زمین کا سفر تو بہانہ ہُوا

اب تو اُس کے دِنوں میں بہت دُور تک، آسماں ہیں نئے اور نئی دُھوپ ہے
اب کہاں یاد ہوگی اُسے رات وہ جس کو گزرے ہوئے اِک زمانہ ہُوا

موسمِ وصل میں خُوب ساماں ہوئے، ہم جو فصلِ بہاراں کے مہماں ہوئے
گھاس قالین کی طرح بچھتی گئی، سر بہ ابرِ رواں، شامیانہ ہُوا

اب تو امجد جُدائی کے اُس موڑ تک دَرد کی دُھند ہے اور کُچھ بھی نہیں
جانِ من، اب وہ دن لوٹنے کے نہیں، چھوڑیئے اب وہ قصّہ پرانا ہُوا

———

☆

کِسی کی دُھن میں جینا ہے، کسی کے ڈر میں رہنا ہے
بتا اے زِندگی کب تک اِسی چکّر میں رہنا ہے

دھنک بُنیاد تھی جن کی وہ بام و دَر نہ بن پائے
تذبذب نام ہے جس کا ہمیں اُس گھر میں رہنا ہے

تمنّا اور حسرت میں ہے فرق اظہار کا، یعنی
جو شعلہ جل نہیں سکتا اُسے پتھر میں رہنا ہے

ترے باغِ توجّہ کی فضا میں زندگی کرنا
رمِ خوشبو میں چلنا ہے گلِ منظر میں رہنا ہے

کہانی ایک ہے لیکن، جُداء ہیں واقعے اپنے
تمہیں محشر اُٹھانا ہے ہمیں محشر میں رہنا ہے

تمنّا نے ہمیں پایا، تغافل اُن کو راس آیا
کہ ہر احساس کو امجدؔ کِسی پیکر میں رہنا ہے

☆

ایک احساسِ دِل کُشا سے ہی
کِھل اُٹھا دِل تری صدا سے ہی

مدّعا، حرفِ نارسائی کو
مِل گیا عرضِ مدّعا سے ہی

شاخ در شاخ زندگی جاگی
موسمِ سبز کی ہَوا سے ہی

کِس قدر سلسلے نِکل آئے
لرزشِ چشمِ نیم وا سے ہی

پُھول سے، رُت سے، باغباں سے نہیں،
اپنا شکوہ تو ہے صبا سے ہی

رسم یہ حق پہ جان دینے کی
ہم نے سیکھی ہے کربلا سے ہی

خود جیئو، دُوسروں کو جینے دو
اپنی عادت ہے یہ سدا سے ہی

ہُنر و مرتبہ نہیں مخصوص
جُبّہ و خلعت و قبا سے ہی

http://www.hallagulla.com/urdu/

کتنے ہی بے جہت نہ کیوں ہوجائیں!
اپنا رِشتہ تو ہے خُدا سے ہی

سینکڑوں بار مِل چکے ہوتے
آپ ملتے اگر دُعا سے ہی!

دَرد کی آبرو نہیں رہتی
نیّتِ حرفِ التجا سے ہی

وہ دورا ہا بھی آگیا امجدؔ
جس کا دھڑ کا ابتدا سے ہی

☆

ہم تھے، ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہ تھا
ایسا حسین دن کہیں دیکھا سُنا نہ تھا

آنکھوں میں اُس کی تَیر رہے تھے حیا کے رنگ
پلکیں اُٹھا کے میری طرف دیکھتا نہ تھا

کُچھ ایسے اُس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

ہاتھوں میں دیر تتک کوئی خُوشبو بسی رہی
دروازہ چمن تھا وہ بندِ قبا نہ تھا

اُس کے توانگ انگ میں جلنے لگے دِیے
جادُو ہے میرے ہاتھ میں مجھ کو پتا نہ تھا

اُس کے بدن کی لَو سے تھی کمرے میں روشنی
کھڑکی میں چاند، طاق میں کوئی دِیا نہ تھا

کل رات وہ نگار ہُوا ایسا مُلتفت
عکسوں کے درمیان، کوئی آئنہ نہ تھا

سانسوں میں تھے گلاب تو ہونٹوں پہ چاندنی
ان منظروں سے میں تو کبھی آشنا نہ تھا

رویا کچھ اس طرح مِرے شانے سے لگ کے وہ
ایسے لگا کہ جیسے کبھی بے وفا نہ تھا

ہے عِشق ایک روگ، محبّت عذاب ہے
اِک روز یہ خراب کریں گے، کہا نہ تھا!

امجدؔ وہاں پہ حد کوئی رہتی بھی کِس طرح
رُکنے کو کہہ رہا تھا مگر روکتا نہ تھا

☆

قاصد جو تھا بہار کا نا معتبر ہُوا
گلشن میں بندوبست برنگِ دِگر ہُوا

خواہش جو شاخِ حرف پہ چٹکی، بکھر گئی
آنسو جو دِل میں بند رہا، وہ گُہر ہُوا

اِک منحرف گواہ کی صُورت، چراغِ شام
اُس کی گلی میں رات مراہم سفر ہوا

آواز کیا کہ شکل بھی پہچانتا نہیں
غافل ہمارے حال سے وہ اِس قدر ہوا

عُمرِ رواں کے رخت میں ایسا نہیں کوئی
جو پَل تُمہاری یاد سے باہر، بسر ہُوا

خوشبو تھی جو خیال میں، رزقِ اَلم ہُوئی
جو رنگِ اعتبار تھا، گردِ سفر ہُوا

دل کی گلی میں حدِّنظر تک تھی روشنی
کرنیں سفیر، چاند ترا نامہ بر ہُوا

تارے مِرے وکیل تھے، خوشبو تِری گواہ
کل شب عجب معاملہ، پیشِ نظر ہُوا

امجدؔ اگر وہ دورِ جنوں جاچُکا، تو پھر
لہجے میں کیوں یہ فرق کسی نام پر ہُوا!

☆

ویرانہ وجود میں چلنا پڑا ہمیں
اپنے لہو کی آگ مین جلنا پڑا ہمیں

منزل بہت ہی دُور تھی، رستے تھے اجنبی
تاروں کے ساتھ ساتھ نکلنا پڑا ہمیں

سایا مثال آئے تھے اُس کی گلی میں ہم
ڈھلنے لگی جو شام تو ڈھلنا پڑا ہمیں

اپنے کہے سے وہ جو ہوا منحرف، تو پھر
اپنا لکھا ہُوا بھی بدلنا پڑا ہمیں

محرابِ جاں کی شمعیں بچانے کے واسطے
ہر رات کنجِ غم میں پگھلنا پڑا ہمیں

ہم چڑھتے سُورجوں کو سلامی نہ دے سکے
سَو دوپہر کی دھوپ میں جلنا پڑا ہمیں

تھا ابتدا سے علم کہ ہے راستہ غلط
اور قافلے کے ساتھ بھی چلنا پڑا ہمیں

شانے پہ اِس اَدا سے رکھا پھر کسی نے ہاتھ
دل مانتا نہ تھا پہ بہلنا پڑا ہمیں

امجدؔ کسی طرف بھی سہارا نہ تھا کوئی
جب گرے تو خود ہی سنبھلنا پڑا ہمیں

☆

سرِ طاقِ جاں نہ چراغ ہے پسِ بامِ شب نہ سحر کوئی
عجب ایک عرصۂ درد ہے، نہ گمان ہے نہ خبر کوئی

نہیں اب تو کوئی ملال بھی کسی واپسی کا خیال بھی
غمِ بے کسی نے مٹادیا مرے دل میں تھا بھی اگر کوئی

تجھے کیا خبر ہے کہ رات بھر تجھے دیکھ پانے کو اِک نظر
رہا ساتھ چاند کے منتظر تری کھڑکیوں سے اُدھر کوئی

سرِ شاخِ جاں ترے نام کا عجب ایک تازہ گلاب تھا
جسے آندھیوں سے خطر نہ تھا جسے تھا خزاں کا نہ ڈر کوئی

تری بے رُخی کے دیار میں، گھنی تیرگی کے حصار میں
جلے کس طرح سے چراغِ جاں! کرے کس طرف کو سفر کوئی!

کٹے وقت چاہے عذاب میں کِسی خواب میں یا سراب میں
جو نظر سے دُور نکل گیا اُسے یاد کرتا ہے ہر کوئی

سرِ بزم جتنے چراغ تھے وہ تمام رمز شناس تھے
تری چشمِ خوش کے لحاظ سے نہیں بولتا تھا مگر کوئی

☆

شام بُجھتی، چراغ جلتا رہا
قافلہ، زندگی کا چلتا رہا

شاد تھا رنجِ رہگزر میں کوئی!
کوئی منزل پہ ہاتھ ملتا رہا

دھوپ تھی جس نگر میں، کم نہ ہوئی
سایہ آفتاب، ڈھلتا رہا

بُجھ گئے تھے، دیے بھی، تارے بھی
اِک مرا خواب تھا کہ جلتا رہا

آئینے بھی نہ روک پائے اُسے
وقت کُچھ اِس طرح سے چلتا رہا

بات کا رُخ کبھی، کبھی پہلو
ہجر کی شام میں بدلتا رہا

☆

ہر پَل دھیان میں بسنے والے لوگ افسانے ہوجاتے ہیں
آنکھیں بوڑھی ہوجاتی ہیں خواب پرانے ہوجاتے ہیں

ساری بات تعلق والی جذبوں کی سچّائی تک ہے
مَیل دلوں میں آجائے تو گھر ویرانے ہو جاتے ہیں

منظر منظر کِھل اُٹھتی ہے پیراہن کی قوسِ قزح
موسم تیرے ہنس پڑنے سے اور سہانے ہوجاتے ہیں

جھونپڑیوں میں ہر اِک تلخی پیدا ہوتے مِل جاتی ہے
اِسی لیے تو وقت سے پہلے طفل سیانے ہوجاتے ہیں

موسمِ عشق کی آہٹ سے ہی ہر اِک چیز بدل جاتی ہے
راتیں پاگل کردیتی ہیں دِن دیوانے ہو جاتے ہیں

دُنیا کے اِس شور نے امجدؔ کیا کیا ہم سے چھین لیا ہے
خود سے بات کیے بھی اب تو کئی زمانے ہوجاتے ہیں

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

نہیں اب جہاں پہ نشان بھی
یہاں لوگ بھی تھے مکان بھی

مری آرزو میں جیئے گا وہ
مجھے کب تھا ایسا گمان بھی!

تری بے رُخی کے فشار سے
کبھی مِل سکے گی امان بھی؟

اسی خاکداں کے حصار میں
مری خواہشوں کا جہان بھی

مری گمر ہی کے غبار میں
مِری منزلوں کے نشان بھی

عجب اُس کا رنگِ جمال ہے
کہ چمک اُٹھا ہے مکان بھی

عجب اُس حسین کا خیال ہے
کہ مہکِ رہا ہے گمان بھی

اِسی آسمان کی چھت تلے
مِرا آشیاں بھی، اُڑان بھی

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

ترے اِک اشارے کے منتظر
یہ زمین بھی یہ زمان بھی

تری چشمِ خوش کی پناہ میں
مِرے خواب بھی، مِرے مان بھی

میں جہاں گیا مرے ساتھ تھی
مِری عُمر بھر کی تھکان بھی

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

☆

کہیں بے کنار سے رتجگے، کہیں زرنگار سے خواب دے!
ترا کیا اُصول ہے زندگی؟ مجھے کون دے!

جو بچھا سکوں ترے واسطے، جو سجا سکیں ترے راستے،
مری دسترس میں ستارے رکھ، مری مُٹھیوں کو گلاب دے

یہ جو خواہشوں کا پرند ہے، اسے موسموں سے غرض نہیں
یہ اُڑے گا اپنی ہی موج، اِسے آب دے کہ سراب دے!

تجھے چُھو لیا تو بھڑک اُٹھے مرے جسم و جاں میں چراغ سے
اِسی آگ میں مجھے راکھ کر، اسی شعلگی کو شباب دے

کبھی یوں بھی ہو ترے رُو برو، میں نظر مِلا کے یہ کہہ سکوں
" مری حسرتوں کو شمار کر، مری خواہشوں کا حساب دے! "

تری اِک نگاہ کے فیض سے مری کشتِ حرف چمک اُٹھے
مِرا لفظ لفظ ہو کہکشاں مجھے ایک ایسی کتاب دے

☆

ممکن نہیں تھا جو وہ ارادہ نہیں، کیا
ہم نے تجھے بُھلانے کا وعدہ نہیں کیا

لہجے میں اُس کے رنگ تھا کم اعتماد کا
ہم نے بھی اعتبار زیادہ نہیں کیا

تھے مصلحت کی راہ میں سائے بہت گھنے
پر دل نے اختیار وہ جادہ نہیں کیا

جھولی میں ہم نے بھر لیے فاقے سمیٹ کر
دامن کسی کے آگے کشادہ نہیں کیا

تھے، خاکِ پائے اہلِ محبت، مگر کبھی
سجدہ، بہ پیشِ تاج و لبادہ نہیں کیا

حرمت شناسِ درد تھے، سو ہم نے عُمر بھر
امجدؔ، حدیثِ جاں کا اعادہ نہیں کیا

———

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

بھنور میں کھو گئے ایک ایک کرکے ڈُوبنے والے
سرِ ساحل کھڑے تھے سب تماشا دیکھنے والے

خدا کا رِزق تو ہر گز زمیں پر کم نہیں یارو!
مگر یہ کاٹنے والے! مگر یہ بانٹنے والے!

کہاں یہ عشق کا سنگِ گراں ہر اِک سے اُٹھتا ہے !
بہت سے لوگ تھے یوں تو یہ پتّھر چُومنے والے

وفا کی راہ مقتل سے گزرتی ہے تو بِسم اللہ '
نہیں پَسپائی سے واقف تمھارے چاہنے والے

اَزل سے ظُلم دیکھے جارہی ہیں، دیکھتی آنکھیں
اَزل سے سوچ میں ڈوبے ہیں امجدؔ سوچنے والے

☆

کوئی ہجر تھا نہ وصال تھا مِرے سامنے
مِری آرزوؤں کا جال تھا مِرے سامنے

میں گِرا ہوں کِتنی ہی مرتبہ پر رُکا نہیں
مگر ایک تیرا خیال تھا مِرے سامنے

ک،ہی آنکھ مین نہ تھی روشنی، کسی خواب کی
عجب ایک شہرِ ملال تھا مِرے سامنے

لیے انگ انگ میں پیاس سی، سرِ شام وہ
مِری خواہشوں کی مثال تھا مِرے سامنے

مُجھے رات اپنی نگاہ پہ بھی یقین نہ تھا
کوئی معجزوں سا کمال تھا مِرے سامنے

سرِ بزم جب کِسی آئنے پہ نظر پڑی
وہی ایک عکسِ جمال تھا مِرے سامنے

وہی ایک چُپ کا غبار تھا پسِ چشمِ نَم
وہی ایک تشنہ سوال تھا مِرے سامنے!

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

جہاں کشتی رُکی میری کنارا اور تھا کوئی
جِسے میں دوست سمجھا تھا ستارا اور تھا کوئی

فلک کی بالکونی مین خُدا خاموش بیٹھا تھا
تو کیا اِن گرنے والوں کا سہارا اور تھا کوئی !

بُجھی آنکھوں کے دامن میں جمی تھی دُھول برسوں کی
وہ چہرا اب جو دیکھا ہے دوبارا، اور تھا کوئی

بہت عادل سہی مُنصِف، مگر انصاف کیسے ہو!
گواہی اور ہے، قاتل ہمارا، اور تھا کوئی!

ہَوا کی سمت دیکھی اور کشتی ڈال دی ہم نے
کُھلا آکر سمندر میں اشارا اور تھا کوئی

فضا مہکی، چمن جا گا، اچانک کھل اُٹھے تارے
کِسی کے مُسکراتے ہی نظارا اور تھا کوئی

وہی مانوس لہجہ تھا، وہی آواز تھی امجؔد
مگر جو مڑ کے دیکھا تو پکارا اور تھا کوئی

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

حد سے حد، حدِّ گماں تک کوئی جاسکتا ہے
ڈھونڈنے اُس کو کہاں تک کوئی جاسکتا ہے!

کہکشاں کون سی، اُس حُسن کے حلقے میں نہیں!
ہاں چلا جائے، جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

کسی مانوس سے لہجے کا اِشارا مِل جائے
معجزہ ہائے بیاں تک کوئی جاسکتا ہے

کشتیِ شوق ہے خطرے کے نشاں سے آگے
اور خطرے کے نشاں تک کوئی جاسکتا ہے

پھیلتے جاتے ہیں ہر سمت وہ اُڑتے گیسو
رات کے ساتھ کہاں تک کوئی جاسکتا ہے

مرتبہ میرا یہی ہے کہ زمیں زاد ہُوں میں
سو وہاں ہوں کہ جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

راستے عِشق کے آسان نہیں ہیں، امجؔد
ہاں مگر جاں کے زیاں تک کوئی جا سکتا ہے

☆

زیرِ لب یہ جو تبسّم کا دِیا رکّھا ہے
ہے کوئی بات جِسے تم نے چھپا رکّھا ہے

چند بے ربط سے صفحوں میں، کِتابِ جاں کے
اِک نِشانی کی طرح عہدِ وفا رکّھا ہے

ایک ہی شکل نظر آتی ہے، جاگے، سوئے
تم نے جادُو سا کوئی مُجھ پہ چلا رکّھا ہے

یہ جو اِک خواب ہے آنکھوں میں نہفتہ ہت پوچھ
کِس طرح ہم نے زمانے سے بچا رکّھا ہے!

کیسے خُوشبو کو بِکھر جانے سے روکے کوئی!
رزقِ غنچہ اسی گٹھڑی میں بندھا رکھا ہے

کب سے احباب جِسے حلقہ کیے بیٹھے تھے
وہ چراغ آج سرِ راہِ ہَوا، رکھا ہے

دن میں سائے کی طرح ساتھ رہا، لشکرِ گم
رات نے اور ہی طوفان اُٹھا رکھا ہے

یاد بھی آتا نہیں اب کہ گِلے تھے کیا کیا
سب کو اُس آنکھ نے باتوں میں لگا رکّھا ہے

http://www.hallagulla.com/urdu/

دل میں خُوشبو کی طرح پھرتی ہیں یادیں، امجدؔ
ہم نے اس دشت کو گُلزار بنا رکھا ہے

☆

ایک دن اِس طرح بھی ہونا ہے
رنگ کو روشنی میں کھونا ہے

جاگنا ہے غبار میں، ہم کو
خاک کی تیر گی میں سونا ہے

کتنی راتوں کو کر گیا جل تھل
ایک آنسو ابھی جو رونا ہے

عُمر کی قیدِ بامشقّت میں
جِسم کا بوجھ ہم کو ڈھونا ہے

وَقت اور بخت کے تعلّق میں
ایک بچّہ ہے اِک کھلونا ہے

تیری آنکھوں کے کُنجِ خوشبو میں
ہم کو بھی ایک خواب بونا ہے

اے مری چشمِ تر، بتا تو سہی
کون سا داغ ہے جو دھونا ہے!

☆

تُو نہیں، تیرا استعار نہیں
آسماں پر کوئی ستارا نہیں

وہ مِرے سامنے سے گُزرا تھا
پھر بھی میں چُپ رہا، پُکارا نہیں

وہ نہیں مِلتا ایک بار ہمیں
اور یہ زندگی دوبارا نہیں

ہر سمندر کا ایک ساحل ہے
ہجر کی رات کا کنارا نہیں

ہوسکے تو نِگاہ کر لینا
تم پہ کُچھ زور تو ہمارا نہیں

ناؤ اُلٹی تو یہ ہُوا معلُوم
زندگی موج ہے، کنارا نہیں!

☆

مرنے کا ترے غم میں اِرادہ بھی نہیں ہے
ہے عِشق مگر اِتنا زیادہ بھی نہیں ہے

ہے یُوں کہ عبارت کی زباں اور ہے کوئی
کاغذ مِری تقدیر کا سادا بھی نہیں ہے

کیوں دیکھتے رہتے ہیں ستاروں کی طرف ہم!
جب اُن سے ملاقات کا وعدہ بھی نہیں ہے!

کیوں راہ کے منظر میں اُلجھ جاتی ہیں آنکھیں!
جب دل میں کوئی اور ارادہ بھی نہیں ہے!

کیوں اُس کی طرف دیکھ کے پاؤں نہیں اُٹھتے
ہو شخص حسیں اِتنا زیادہ بھی نہیں ہے

کِس موڑ پہ لے آیا ہمیں ہجرِ مُسلسل!
تاحدِّ نگہ وصل کا وعدہ بھی نہیں ہے

پتّھر کی طرح سَرد ہے کیوں آنکھ کسی کی!
امجدؔ جو بچھڑنے کا ارادہ بھی نہیں ہے

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

دُور تلک ویرانہ ہے
کب تک چلتے جانا ہے!

آئینے کے ہاتھوں میں
مقتل کا پروانہ ہے

جانے والو، یاد رہے
شام ڈھلے گھر آنا ہے

فرق ہے کُچھ کرداروں میں
باقی کھیل پرانا ہے

سچّی باتیں کون کرے
کون یہاں دیوانہ ہے!

تجھ سا دُور جا دیکھنے کو
سارا عالم چھانا ہے

مٹّی بھی ہے، سونا بھی
دل بھی عجب خزانہ ہے

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

مقتل میں بھی اہلِ جنوں ہیں کیسے غزل خواں، دیکھو تو!
ہم پہ پتّھر پھینکنے والو، اپنے گریباں، دیکھو تو!

ہم بھی اُڑائیں خاکِ بیاباں، دَشت سے تم گُزر و تو سہی
ہم بھی دکھائیں چاکِ گریباں، لیکن جاناں، دیکھو تو!

اے تعبیریں کرنے والو، ہستی مانا خواب سہی
اس کی رات میں جاگو تو، یہ خوابِ پریشاں دیکھو تو!

آج ستارے گُم صُم ہیں کیوں، چاند ہے کیوں سَودائی سا
آئینے سے بات کرو، اِس بھید کا عنواں دیکھو تو!

کِس کے حُسن کی بستی ہے یہ! کِس کے رُوپ کا میلہ ہے!
آنکھ اُٹھا اے حُسنِ زلیخا، یُوسف کنعاں، دیکھو تو!

جو بھی علاجِ درد کرو، میں حاضر ہوں، منظور مجھے
لیکن اِک دب امجؔد جی، وہ چہرۂ تاباں، دیکھو تو!

☆

کِس رات کی آنکھوں میں پیمانِ سحر ہوگا !
یہ خواب جو نپل ہے، کِس رُت میں شجر ہوگا!

آنچل کی ہَوا رکھنا، لَو اس کی بچا رکھنا
یہ شمع جِدھر ہوگی، پروانہ اُدھر ہوگا

جب رات کے پردے سے پھر رات نِکل آئے
اُس وقت کِدھر جائے، جو اہلِ نظر ہوگا

تاریخ کے چکّر میں وہ موڑ نہیں آتا
جب شادکیں ہوں گے، آباد نگر ہوگا

بُجھتے ہُوئے تاروں کی، جھلمل بھی غنیمت ہے
اِس ٹھری ہُوئی شب میں کُچھ وہم سَفر ہوگا

افکار پہ پہرا ہے، قانون یہ ٹھرا ہے
جو صاحب عزّت ہے وہ شہر بدر ہوگا

محسوس یہ ہوتا ہے، ہر جَلتا ہُوا تارا
گُزرے ہُوئے وقتوں میں اِک زخم ہُنر ہوگا!

سہمے ہُوئے پنچھی کی آواز بتاتی ہے!
اُس کا بھی یہیں کوئی، جَلتا ہُوا گھر ہوگا

☆

کون سی چیز دل کے بَس میں نہیں
دل مگر اپنی دسترس میں نہیں

یہ تو ہم ہیں، جو خار و خَس میں ہیں
منزلِ گُل تو خار و خَس میں نہیں!

کب سے آنکھیں تلاشتی ہیں اُسے
ایک دن، جو کسی برس میں نہیں

جسم کِتنی بڑی حقیقت ہو!
دل کی تسکیں مگر ہوس میں نہیں

کامراں، عاشقی کی منزل میں
ہے وہی دل جو پیش و پس میں نہیں

دیکھ لی جنتری زمانے کی
وصل کا دن کِسی برس میں نہیں

(ق)

نارسائی کی دُھند کے اُس پار
عشق میں کیا ہے ' جو ہَوس میں نہیں!

لذّتِ پَر کشادگی کے سوا!
باغ میں کیا ہے جو قفس میں نہیں!

☆

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجؔد ہم نے بچتے دیکھا کم

تاریکی کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کا
سُورج کی بس ایک کِرن سے گُھٹ جاتا ہے دَم

رنگوں کو کلیوں میں جینا کون سِکھاتا ہے!
شبنم کیسے رُکنا سیکھی! تِتلی کیسے رَم!

آنکھوں میں یہ پلنے والے خواب نہ بجھنے پائیں '
دل کے چاند چراغ کی دیکھو، لَو نہ ہو مدّھم

ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی اِنساں
بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہوجاتی ہیں نم!

☆

مِلے کیسے صدیوں کی پیاس اور پانی، ذرا پھر سے کہنا
بڑی دِلرُبا ہے یہ ساری کہانی، ذرا پھر سے کہنا

کہاں سے چلا تھا جُدائی کا سایا، نہیں دیکھ پایا
کہ رستے میں تھی آنسوؤں کی روانی، ذرا پھر سے کہنا

ہَوا یہ خبر تُو سناتی رہے اور مَیں سُنتا رہوں
بدلنے کو ہے اَب یہ موسم خزانی، ذرا پھر سے کہنا

مُکر جانے والا کبھی زندگی میں، خُوشی پھر نہ جائے!
یُونہی ختم کرلیں، چلو یہ کہانی، ذرا پھر سے کہنا

سَمے کے سمندر! کہا تُونے جو بھی، سُنا، پر نہ سمجھے
جوانی کی ندّی، میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہنا

☆

گزرے ہیں ترے بعد بھی کچھ لوگ اِدھر سے
لیکن تری خوشبو نہ گئی، راہ گزر سے

کیوں ڈوبتی، بجھتی ہوئی آنکھوں میں ہے روشن
راتوں کو شکایت ہے تو اتنی ہے سحر سے!

لرزا تھا بدن اُس کا مرے ہاتھ سے چُھو کر
دیکھا تھا مجھے اُس نے عجب مست نظر سے

کیا ٹھان کے نکلا تھا، کہاں آ کے پڑا ہے!
پوچھے تو کوئی اس دلِ شرمندہ سفر سے

آیا ہے بہت دیر میں وہ شخص، پر اُس کو
جذبات کی اِس بھیڑ میں دیکھو ں میں کدھر سے

ہم رزقِ گزر گاہ تو خاشاک تھے، لیکن!
وہ لوگ، جو نکلے تھے ہوا دیکھ کے گھر سے!

ایسا تو نہیں، میری طرح سردِ لبِ جُو
قدموں پہ کھڑا ہو کسی اُفتاد کے ڈر سے

دن تھے کہ ہمیں شہرِ بدن تک کی خبر تھی
اور اب نہیں آگاہ تری خیر خبر سے

امجدؔ نہ قدم روک کہ وہ دُور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گردِ سفر سے

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

دریا کی ہَوا تیز تھی، کشتی تھی پرانی
روکا تو بہت، دل نے مگر ایک نہ مانی

میں بھیگتی آنکھوں سے اُسے کیسے ہٹاؤں
مشکل ہے بہت ابر میں دیوار اُٹھائی

نکلا تھا تجھے ڈھونڈنے اک ہجر کا تارا
پھر اُس کے تعاقب میں گئی، ساری جوانی

کہنے کو نئی بات کوئی ہو تو سنائیں
سو بار زمانے نے سنی ہے یہ کہانی!

یہ پُل ہے یہاں پُھول کہاں، پچھلے برس کے
ہے دن تو وہی دوست، مگر اور ہے پانی

کس طرح مجھے ہوتا گماں، ترکِ وفا کا
آواز میں ٹھراؤ تھا، لہجے میں روانی

اب میں اُسے قاتل کہوں امجؔد کہ مسیحا
کیا زخمِ ہنر چھوڑ گیا، اپنی نشانی!

☆

تری زد سے نکلنا چاہتا ہے
یہ دریا رُخ بدلنا چاہتا ہے

وہ سپنا، جس کی صورت ہی نہیں ہے
مری آنکھوں میں پلنا چاہتا ہے

دلوں کی ماندگی پہ کیا تعجب!
کہ سُورج بھی تو ڈھلنا چاہتا ہے

نشست درد بدلی ہے تو اب دل
ذرا پہلو بدلنا چاہتا ہے

ہَوا ہے بند اور شعلہ وفا کا
بہت ہی تیز جلنا چاہتا ہے

یہ دل اِس گرد بادِ زندگی میں
بس اِک لمحہ سنبھلنا چاہتا ہے

مجھے بھی سامنا ہے کر بلا کا
مرا سر بھی اُچھلنا چاہتا ہے

نہیں ہیں ترجمانِ غم ' یہ آنسو
یہ پانی اب اُبلنا چاہتا ہے

گزشتہ صحبتوں کا ایک لشکر
مرے ہمراہ چلنا چاہتا ہے

اُن آنکھوں کی ادا کہتی ہے امجدؔ
کوئی پتّھر پگھلنا چاہتا ہے

---

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

☆

چھیڑیں گے وہی قصّۂ غم اور طرح سے
لائیں گے تجھے راہ پہ ہم اور طرح سے

سجدے میں جبیں، سینے میں پندارِ خدائی!
اب آئے ہیں کعبے میں صنم اور طرح سے

ہوتا ہے گماں ان پہ کسی دستِ طلب کا
اب کھولے ہیں یاروں نے علم اور طرح سے

ہے کام مساواتِ محمد ﷺ کو مٹانا
کرتا ہے عرب اور، عجم اور طرح سے

ہم سوچتے رہتے ہیں عطا اور طرح کی
دیتا ہے ترا دستِ کرم اور طرح سے

مرتے تو شہیدانِ محبّت بھی ہیں امجدؔ
جاتے ہیں مگر سوئے عدم اور طرح سے

---

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

☆

چہرے پہ مرے زُلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو، برس جاؤ کسی دن

رازوں کی طرح اُترو مرے دل میں کسی شب
دستک پہ مرے ہاتھ کی کُھل جاؤ، کسی دن

پیڑوں کی طرحسن کی بارش میں نہالوں
بادل کی طرح جُھوم کے گِھر آؤ کسی دن

خوشبو کی طرح گزرو مرے دل کی گلی سے
پُھولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن

پھر ہاتھ کو خیرات ملے بندِ قبا کی
پھر ہاتھ کو خیرات ملے بندِ قبا کی

گزریں جو مرے گھر سے تو رُک جائیں ستارے
اِس طرح مری رات کو چمکاؤ کسی دن

میں اپنی ہر اک سانس اُسی رات کو دے دُوں
سر رکھ کے مرے سینے پہ سو جاؤ، کسی دن

☆

کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے
کہیں آنکھیں، کہیں چہرا نہیں ہے

یہاں سے کیوں کوئی بیگانہ گزرے
یہ میرے خواب ہیں، رستہ نہیں ہے

جہاں پر تھے تری پلکوں کے سائے
وہاں اب کوئی بھی سایا نہیں ہے

زمانہ دیکھتا ہے ہر تماشہ
یہ لڑکا کھیل سے تھکتا نہیں ہے

ہزاروں شہر ہیں ہمراہ اس کے
مسافر دشت میں تنہا نہیں ہے

یہ کیسے خواب سے جاگی ہیں آنکھیں
کسی منظر پہ دل جمتا نہیں ہے

جو دیکھو تو ہر اک جانب ، سمندر
مگر پینے کو اک قطرہ نہیں ہے

مثالِ چوبِ نم خوردہ، یہ سینہ
سُلگتا ہے، مگر جلتا نہیں ہے

خُدا کی ہے یہی پہچان ، شاید
کہ کوئی اور اُس جیسا نہیں ہے

☆

کہاں آ کے رُکنے تھے راستے ! کہاں موڑ تھا ! اُسے بُھول جا
وہ جو مل گیا اُسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اُسے بُھول جا

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دلِ بے خبر مری بات سُن ، اُسے بُھول جا، اُسے بُھول جا

میں تو گُم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس، تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی مرے کان میں، میرے ساتھ آ ، اُسے بُھول جا

کِسی آنکھ میں نہیں اشکِ غم ، ترے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بُھلا دیا، تُو بھی مُسکرا، اُسے بُھول جا

کہیں چاکِ جاں کا رفو، کسی آستیں پہ لہو نہیں
کہ شہیدِ راہِ ملال کا نہیں خوں بہا، اُسے بُھول جا

کیوں اَٹا ہوا ہے غبار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
وہ جو درج تھا ترے بخت میں، سو وہ ہو گیا ، اُسے بُھول جا

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دلِ منتظر تو یہ کس لیے، ترا جاگنا، اُسے بُھول جا

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ، اس پہ یقین نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل ، سرِ آئنہ، اُسے بُھول جا

جا بساطِ جاں ہی اُلٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اُسے روکنے سے حصول کیا، اُسے مت بُلا، اُسے بُھول جا

تو یہ کس لیے شبِ ہجر کے اُسے ہر ستارے میں دیکھنا
وہ فلک کہ جس پہ ملے تھے ہم، کوئی اور تھا، اُسے بُھول جا

تجھے چاند بن کے مِلا تھا جو، ترے ساحلوں پہ کِھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا، سو اُتر گیا، اُسے بُھول جا

☆

اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
جس پر تیرا نام لکھا ہے اپس تارے کو ڈھونڈوں گا

تم بھی ہر شب دیا جلا کر پلکوں کی دہلیز پہ رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمھارے شہر کی جانب بھیجوں گا

ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
پانی کی ہر سطر پہ میں کچھ دل کی باتیں لکّھوں گا

جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھیگے تھے
تُم بھی اُس کو چُھو کے گُزرنا، میں بھی اُس سے لپٹوں گا

" خواب مُسافر لمحوں کے ہیں' ساتھ کہاں تک جائیں گے"
تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے ' میں بھی اب کُچھ سوچوں گا

بادل اوڑھ کے گُزروں گا تیرے گھر کے آنگن سے
قوسِ قزح کے سب رنگوں میں تجھکو بھیگا دیکھوں گا

رات گئے جب چاند ستارے لُکن میٹی کھیلیں گیے
آدھی نیند کا سپنا بن کر میں بھی تم کو چُھولوں گا

بے موسم بارش کی صُورت ، دیر تلک اور دُور تلک
تیرے دیارِ حُسن پہ میں بھی رِکن مِن رِکن مِن برسوں گا

شرم سے دوہرا ہو جائے گا کان پڑا وہ بُندا بھی
بادِصبا کے لہجے میں اِک بات میں ایسی پُوچھوں گا

صفحہ صفحہ ایک کتابِ حُسن سی کُھلتی جائے گی
او ر اُسی کی لو میں پھر میں تُم کو اَز بر کر لُوں گا

وقت کے اِک کنکر نے جس کو عکسوں میں تقسیم کیا
آبِ رواں میں کیسے امجؔد اب وہ چہرا جوڑوں گا!

☆

بانجھ اِرادہ اور کوئی!
جُھوٹا وعدہ اور کوئی!

ہم جیسا کیا دیکھا ہے!
تم نے سادہ اور کوئی

دل میں سارا کھوٹ ہی کھوٹ
تن پہ لبادہ اور کوئی

دیر و حَرم تو چھا لیے
دیکھیں جادہ، اورکوئی!

دل میں اب کیوں رہتا ہے!
تم سے زیادہ اور کوئی!

نکلے تھے ہم اپنے گھر سے
کرکے ارادہ اور کوئی

آخر کِس اُمّید پہ مانگیں
امجدؔ وعدہ اور کوئی!

☆

شہد کہیں گے سَم کو بھی
جینا تو ہے ہم کو بھی !

تجھ بِن جلتے دیکھا ہے
پھُولوں کے موسم کو بھی

بازاروں میں لے آئے
لوگ تو دل کے غم کو بھی!

مُہلت آنکھ جھپکنے کی
منظر کو بھی، ہم کو بھی

صدیوں پیچھے بھاگے گا
ٹھہرا جو اِک دَم کو بھی

قاصد کر کے دیکھیں گے
اب کے چشمِ نم کو بھی

کون یہ پیاسا گزرا ہے؟
توڑ کے جامِ جم کو بھی

مولا _ تیری دُنیا میں
چین ملے گا ہم کو بھی !

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

امجؔد اُونچا رکھیں گے
جلے ہُوئے پرچم کو بھی

———

☆

وہ جو اُوپر ہے بیٹھا ہُوا، اور ہے
میری بستی کا شاید خُدا ، اور ہے!

وصل کی شب تو چمکے تارے بہت
ہجر کی شام کا سلسلہ اور ہے

شہر میں جو اُڑی وہ خبر، اور تھی
جس سے گُزرے تھے ہم ، واقعہ اور ہے

کہہ رہا ہُوں مُسلسل سَفر کس لیے؟
اُس کی بستی کا تو راستہ اور ہے

خُود کو لگتے ہیں کیوں، اجنبی ، اجنبی!
عکس بدلا ہے یا آئنہ اور ہے

ماند پڑتے ہُوئے منظروں کی قسم!
واپسی کے سَفر کا مزا اور ہے

دردمندِ وفا، کس طرح سے رُکے
اس نگر کی تو آب و ہوا اور ہے

اپنے تاروں سے کہنا ، چمکتے رہیں!
میری آنکھوں میں اِک رتجگاہ اور ہے

اَب تو ہے راکھ کی ایک مُٹّھی ، یہ دل
جو ہَوا سے لڑا تھا دِیا اور ہے !

---
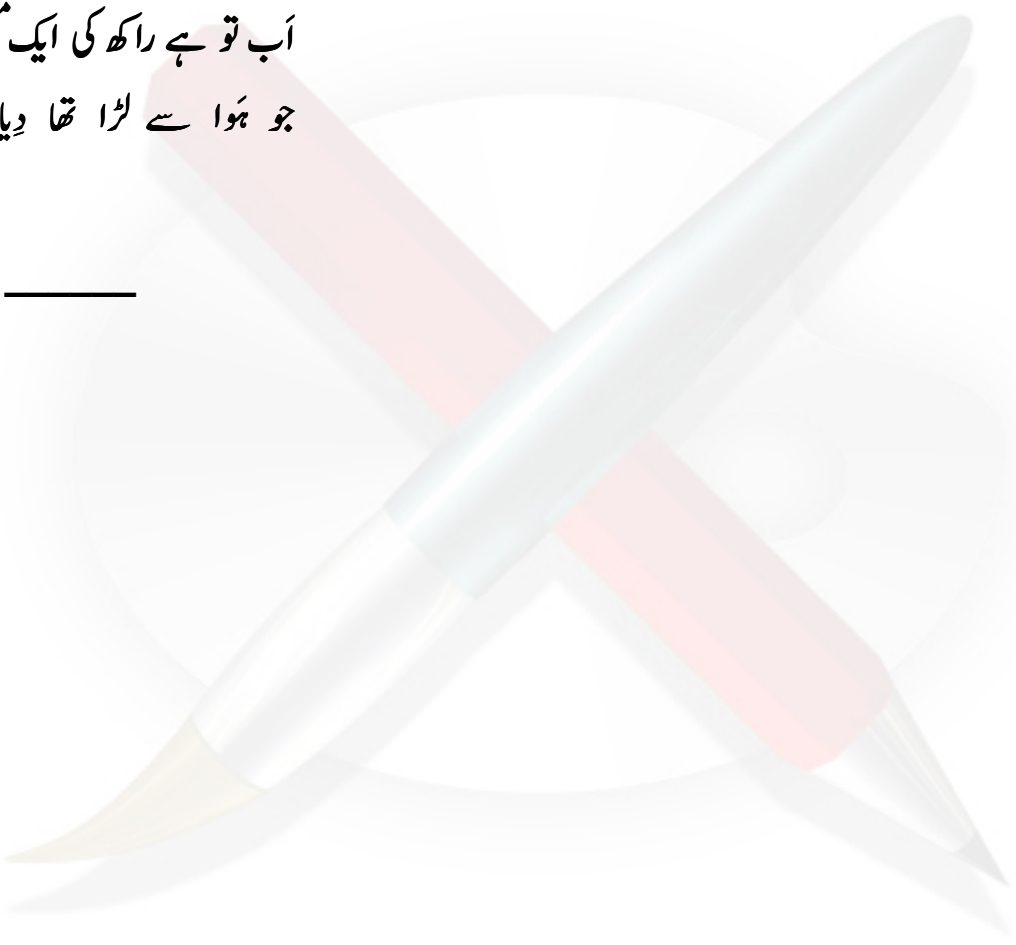
www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

☆

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، فُرصت کِتنی ہے
پھر بھی تیرے دیوانوں کی شُہرت کتنی ہے!

سُورج گھر سے نِکل چُکا تھا کِرنیں تیز کیے
شبنم گُل سے پُوچھ رہی تھی " مہلت کتنی ہے! "

بے مقصد سب لوگ مُسلسل بولتے رہتے ہیں
شہر میں دیکھو سنّاٹے کی دہشت کِتنی ہے!

لفظ تو سب کے اِک جیسے ہیں، کیسے بات کُھلے؟
دُنیا داری کتنی ہے اور چاہت کِتنی ہے!

سپنے بیچنے آ تو گئے ہو ، لیکن دیکھ تو لو
دُنیا کے بازار میں ان کی قیمت کِتنی ہے!

دیکھ غزالِ رم خُوردہ کی پھیلی آنکھوں میں
ہم کیسے بتلائیں دل میں وحشت کتنی ہے!

ایک ادھورا وعدہ اُس کا ، ایک شکستہ دل،
لُٹ بھی گئے تو شہرِ وفا کی دولت کِتنی ہے!

میں ساحل ہُوں امجدؔ اور وہ دریا جیسا ہے
کِتنی دُوری ہے دونوں میں، قُربت کتنی ہے!

☆

شمعِ غزل کی لَو بن جائے ، ایسا مصرعہ ہو تو کہو
اِک اِک حرتف میں سوچ کی خُوشبو دل کا اُجالا ہو تو کہو

رازِ محبت کہنے والے لوگ تو لاکھو ں ملتے ہیں
رازِ مھبت رکھنے والا، ہم سادکھا ہو تو کہو!

کون گواہی دے گا اُٹھ کر جُھوٹوں کی اس بستی میں
سچ کی قیمت سے سکنے کا تم میں یار ا ہو تو کہو!

ویسے تو ہر شخص کے دل میں ایک کہانی ہوتی ہے
ہجر کا لاوا ، غم کا سلیقہ، درد کا لہجہ ہو تو کہو

امجؔد صاحب آپ نے بھی تو دُنیا گھرم کے دیکھی ہے
ایسی آنکھیں ہیں تو بتاؤ! ایسا چہرا ہو تو کہو !

☆

حضورِ یار میں حرف التجا کے رکھے تھے
چراغ سامنے جیسے ہَوا کے رکھے تھے

بس ایک اشک ِ ندامت نے صاف کر ڈالے
وہ سب حساب جو ہم نے اُٹھا کے رکھے تھے

http://www.hallagulla.com/urdu/

سمومِ وقت نے لہجے کو زخم زخم کیا
وگر نہ ہم نے قرینے صَبا کے رکھے تھے

تمھی نے پاؤں نہ رکھا وگر نہ وصل کی شب
زمیں پہ ہم نے ستارے بچھا کے رکھے تھے !

بکھر رہے تھے سو ہم نے اُٹھا لیے خُود ہی
گلاب جو تری خاطر سجا کے رکھے تھے

ہَوا کے پہلے ہی جھو نکے سے ہا ر مان گئے
وہی چراغ جو ہم نے بچا کے رکھے تھے

مٹا سکی نہ انھیں روز و شب کی بارش بھی
دلوں پہ نقش جو رنگِ حنا کے رکھے تھے

حصول ِ منزل ِ دُنیا کُچھ ایسا کام نہ تھا
مگر جو راہ میں پتّھر اَنا کے رکھے تھے!

☆

آگ لگی تھی سینہ سینہ ، ہر شعلہ جوا لا تھا
اب کے شہر میں روشنیوں کا منظر دیکھنے والا تھا!

دروازوں پر پڑے ہُوئے تھے ڈھیر شکستہ خوابوں کے
دالا نو ں میں نفرت کے آسیب نے ڈیرا ڈالا تھا

گلیوں گلیوں بھٹک رہا تھا ایک سُنہرا خواب ' جسے
میرے بڑوں نے اپنی لاکھوں نیند یں بیچ کے پالا تھا

اپنی اپنی کشتی لے کر یوں دریامیں کُود پڑے
جیسے صرف جہاز ہی اس طوفان میں ڈوبنے والا تھا

امجد یہ تقدیر تھی اُس کی یا قُدرت کا کھیل!
گرا جہاں پر رات کا پنچھی ، تھوڑی دُور اُجالا تھا

☆

بِھیڑ میں اِک اجنبی کا سامنا اچّھا لگا
سب سے چُھپ کر وہ کِسی کا دیکھنا اچھا لگا

سُرمئی آنکھوں کے نیچے پُھول سے کِھلنے لگے
کہتے کہتے کُچھ کسی کا سوچنا ، اچّھا لگا

بات تو کُچھ بھی نہیں تھیں لیکن اس کا ایک دَم
ہاتھ کو ہونٹوں پہ رکھ کر روکنا اچّھا لگا

چائے میں چینی ملانا اُس گھڑی بھایا بہت
زیرِ لب وہ مسکراتا " شکریہ " اچھا لگا

دِل میں کِتنے عہد باندھے تھے بُھلانے کے اُسے
وہ مِلا تو سب ارادے توڑنا اچّھا لگا

بے ارادہ لمس کی وہ سنسنی پیاری لگی
کم توجّہ آنکھ کا وہ دیکھنا اچّھا لگا!

نیم شب کی خاموشی میں، بھیگتی سڑکوں پہ کل
تیری یادوں کے جَلو میں گُھومنا اچّھا لگا

اُس عدوئے جاں کو امجدؔ میں بُرا کیسے کہوں!
جب بھی آیا سامنے وہ بے وفا، اچّھا لگا

☆

ایک آرزو ہُوئی جاتی ہے شُہرت ہم کو
خُود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فُرصت ہم کو

روشنی کا یہ مُسافر ہے، رہِ جاں کا نہیں !
اپنے سائے سے بھی ہونے لگی وحشت ہم کو

آنکھ اب کِس سے تحیّر کا تماشا مانگے!
اپنے ہونے پہ بھی ہوتی نہیں حیرت ہم کو!

اب کے اُمیّد کے شعلے سے بھی آنکھیں نہ جلیں
جانے کس موڑ پہ لے آئی محبت ہم کو

کون سی رُت ہے زمانے میں ، ہمیں کیا معلُوم
اپنے دامن میں لیے پھرتی ہے حسرت ہم کو

زخم یہ وصل کے مرہم سے بھی شاید نہ بھرے
ہجر میں ایسی ملی اب کے مُسافت ہم کو

داغِ عصیاں تو کِسی طور نہ چُھپتے امجدؔ
ڈھانپ لیتی نہ اگر چادرِ رحمت ہم کو

———

☆

شہر اُجڑا ہو تو آباد کروں!
جو نہ بُھولے اُسے کیا یہاد کروں!

ساری چیزیں ہی بدل کر رہ جائیں
اِک ہُنر ایسا بھی ایجاد کروں

میرے لفظوں سے نِکل جائے اثر
کوئی خواہش جو ترے بعد کروں

بھیک لعنت ہے! ملے یا نہ ملے
کیوں میں رُسوائیِ فریاد رکروں!

کوئی اُس آنکھ پہ شاید اُترے!
روز اِک خواب کو آزاد کروں

یہ تو ہے کھیل کا حِصّہ امجدؔ
کس لیے شکوۂ بے داد کروں

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

جو اُتر کے زینۂ شام سے، تری چشمِ خُوش میں سما گئے
وُہی جَلتے بجھتے چراغ ،مرے بام و دَر کو سجا گئے

یہ جو عاشقی کا ہے سلسلہ، ہے یہ اصل میں کوئی معجزہ
کہ جو لفظ میرے گُماں میں تھے، وہ تری زبان پہ آگئے !

وہ جو گیت تم نے سُنا نہیں، مِری عُمر بھر کا ریاض تھا
مرے درد کی تھی وہ داستاں ، جِسے تم ہنسی میں اُڑا گئے

وہ چراغِ جاں، کبھی جس کی لَو ، نہ کسی ہَوا سے نِگوں ہوئی
تری بے وفائی کے وسو سے ، اُسے چُپکے چُپکے بُجھا گئے

وہ تھا چاند شامِ وسال کا ، کہ تھا رُوپ تیرے جمال کا
مری روح سے مِری آنکھ تک، کِسی روشنی میں نہا گئے

یہ جو بند گانِ نیاز ہیں، یہ تمام ہیں وہی لشکر ی !
جنھیں زندگی نے اماں نہ دی، تو ترے حضور میں آگئے

تری بے رُخی کے دیار میں، میں ہَوا کے ساتھ ہَوا، ہُوا
ترے آئینے کی تلاش میں ، مِرے خواب چہرا گنوا گئے

ترے وسوسوں کے فشار میں ، ترا شہر ِ رنگ اُجڑ گیا
مری خواہشوں کے غُبار میں، مرے ماہ وسالِ وفا گئے!

وہ عجیب پُھول سے لفظ تھے، ترے ہونٹ جن سے مہک اُٹھے
مِرے دشتِ خواب میں دُور تک، کوئی باغ جیسے لگا گئے

مِری عُمر سے نہ سمٹ سکے، مِرے دل میں اتنے سوال تھے
ترے پاس جتنے جواب تھے، تری اِک نگاہ میں آ گئے

☆

شکستہ لاکھ ہو نیّا کسی کی
نہیں سُنتا مگر دریا کسی کی

ضروری کیوں ہے زخمِ بے وفائی
گُزرتی کیوں نہیں، تنہا کِسی کی !

کِسی کے ساتھ سایا تک نہیں ہے
کِسی کے ساتھ ہے دُنیا کسی کی

میں آنکھوں میں سجائے پھر رہا ہوں
نشانی ہے مِرا صحرا کسی کی

پرانے میلے کپڑوں میں امجدؔ
بڑھی کُچھ اور بھی شوبھا کسی کی

☆

غبارِ دشتِ طلب میں ہیں رفتگاں کیا کیا
چمک رہے ہیں اندھیرے میں استخواں کیا کیا

دِکھا کے ہم کو ہمارا ہی قاش قاش بدن
دلاسے دیتے ہیں دیکھوں تو قاتلاں کیا کیا

گھٹی دلوں کی محبت تو شہر بڑھنے لگا
مِٹے جو گھر تو ہَویدا ہُوئے مکاں کیا کیا

پلٹ کے دیکھاتو اپنے نشانِ پا بھی نہ تھے
ہمارے ساتھ سفر میں تھے ہمرِ ہاں کیا کیا

ہلاکِ نالۂ شبنم، ذرا نظر تو اُٹھا
نمود کرتے ہیں عالم میں گُل رُخاں کیا کیا

کہیں ہے چاند سوالی، کہیں گدا خُورشید
تُمھارے در پر کھڑے ہیں یہ سائلاں کیا کیا

بچھڑکے تجھ سے نہ جی پائے ، مُختصر یہ ہے
اس کی ایک بات سے نِکلی ہے داستاں کیا کیا

ہے پر سکوں سمندر مگر سُنو تو سہی
لبِ خموش سے کہتے ہیں باد باں کیا کیا

کسی کا رختِ مُسافت تمام دُھوپ ہی دُھوپ
کسی کے سر پہ کشیدہ ہیں سائباں کیا کیا

نکل ہی جائے گی اِک دِن مدار سے یہ زمیں
[اگر چہ پہرے پہ بیٹھے ہیں آسماں کیا کیا

فنا کی چال کے آگے کِسی کی کُچھ نہ چلی
بساطِ دہر سے اُٹھے حساب داں کیا کیا

کِسے خبر ہے کہ امجدؔ بہار آنے تک
خزاں نے چاٹ لیے ہوں گے گُلستاں کیا کیا

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

پسپا ہُوئی سپاہ تو پرچم بھی ہم ہی تھے
حیرت کی بات یہ ہے کہ برہم بھی ہم ہی تھے

گرنے لگے جو سُوکھ کے پتّے تو یہ کُھلا!
گلشن تھے ہم جو آپ تو موسم بھی ہم ہی تھے

ہم ہی تھے تیرے وصل سے محروم عُمر بھر
لیکن تیرے جمال کے محرم بھی ہم ہی تھے

منزل کی بے رُخی کے گِلہ مند تھے ہمیں
ہر راستے میں سنگِ مجسّم بھی ہم ہی تھے

اپنی ہی آستیں میں تھا خنجر چُھپا ہُوا
امجدؔ ہر ایک زخم کا مرہم بھی ہم ہی تھے

☆

کب سے ہم لوگ اِس بھنور میں ہیں!
اپنے گھر میں ہیں یا سَفر میں ہیں!

یُوں تو اُڑنے کو آسماں ہیں بہت
ہم ہی آشوبِ بال و پر میں ہیں

زندگی کے تمام تر رَستے
موت ہی کے عظیم ڈر میں ہیں

اِتنے خدشے نہیں ہیں رستوں میں
جس قدر خواہشِ سَفر میں ہیں

سیپ اور جو ہری کے سب رشتے
شعر اور شعر کے ہُنر میں ہیں

سائیہ راحتِ شجر سے نِکل
کُچھ اُڑ انیں جو بال و پَر میں ہیں؟

عکس بے نقش ہوگئے امجؔد
لوگ پھر آئنوں کے ڈر میں ہیں

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

(نذرِ مصحفی)

جب بھی آنکھوں میں ترے وصل کا لمحہ چمکا
چشمِ بے آب کی دہلیز پہ دریا چمکا

فصلِ گُل آئی، کُھلے باغ میں خُوشبو کے علم
عکس کے ساحل پہ ترے نام کا تارا چمکا

عکس بے نقش ہُوئے آئینے دُھند لانے لگے
درد کا چاند سرِ بام تمنّا چمکا

پیرہن میں بھی ترا حُسن نہ تھا برق سے کم
جب کُھلے بندِ قبا اور ہی نقشا چمکا

رُوح کی آنکھیں چکا چوند ہُوئی جاتی ہیں
کِس کی آہٹ کا مِرے کان میں نغمہ چمکا

رنگ آزاد ہُوئے گُل کی گرہ کُھلتے ہی
ایک لمحے میں عجب باغ کا چہرا چمکا

دِل کی دیوار پہ اُڑتے رہے ملبُوس کے رنگ
دیر تک اِن میں تری یاد کا سایا چمکا

لہریں اُٹھ اُٹھ کے مگر اس کا بدن چُومتی تھیں
وہ جو دریا پہ گیا خُوب ہی دریا چمکا

یوں تو ہر رات چمکتے ہیں ستارے لیکن
وصل کی رات بہت صبح کا تارا چمکا

ہجر پنپا نہ ترا وصل ہمیں راس آیا
کسی میدان میں تارا نہ ہمارا چمکا

جیسے بارش سے دُھلے صحنِ گلستاں امجدؔ
آنکھ جب خشک ہُوئی اور بھی چہرہ چمکا

☆

سائے ڈھلنے ، چراغ جلنے لگے
لوگ اپنے گھروں کو چلنے لگے

اِتنی پُر پیچ ہے بھنور کی گِرہ
جیسے نفرت دِلوں میں پلنے لگے

دُور ہونے لگی جرس کی صدا
کارواں، راستے بدلنے لگے

اُس کے لہجے میں برف تھی لیکن
چُھو کے دیکھا تو ہاتھ جلنے لگے

راہ گُم کردہ طائروں کی طرح
پھر ستارے سفر پہ چلنے لگے

پھر نگاہوں سے کٹ گئیں آنکھیں
عکس پھر آئنے بدلنے لگے

اُس کے بندِ قبا کے جادُو سے
سانپ سے اُنگلیون میں چلنے لگے

☆

پردے میں اُس بدن کے چُھپیں راز کس طرح!
خُوشبو نہ ہوگی پُھول کی غمّاز کس طرح!

طرزِ کلام اُن کا ہُوا طرزِ خاص و عام
بدلیں گے اَب وہ بات کا انداز کِس طرح

بدلا جو اُس کی آنکھ کا انداز تو کُھلا!
کرتے ہیں رنگ پُھول سے پرواز کِس طرح

(ق)

آنکھوں میں کیسے تن گئی دیوار بے حِسی
سینو ں میں گُھٹ کے رہ گئی آواز کِس طرح

وہ حق پرست کیسے ہُوئے مصلحت پرست ؟
نغموں سے بے لباس ہُوئے ساز کِس طرح!

آنکھوں میں موم ڈال کے بیٹھیں گے کب تلک
آئینوں سے چھپائیں گے یہ راز کِس طرح !

اُس کی نظر میں عکسِ تعلّق کہیں نہیں
امجدؔ، حدیثِ شوق ہو آغاز کِس طرح!

☆

اپنے ہونے کی تب و تاب سے باہر نہ ہُوئے
ہم ہیں وہ سیپ جو آزادۂ گو ہر نہ ہُوئے

حرفِ بے صَورت کی مانند رہے، _ _ دُنیا میں
دشتِ امکاں میں کِھلے نقشِ مصوّر نہ ہُوئے

پُھول کے رنگ سرِشاخ ِ خزاں بھی چمکے
قیدئِ رسمِ چمن ، خاک کے جوہر نہ ہُوئے

تھک کے گرتے بھی نہیں ، گھر کو پلٹتے بھی نہیں
نجمِ افلاک ہُوئے، آس کے طائر نہ ہُوئے

اس کی گلیوں میں رہے گردِ سَفر کی صُورت
سنگِ منزل نہ بنے، راہ کا پتّھر نہ ہُوئے

اپنی ناکام اُمیدوں کے خم پیچ میں گُم
ابرِ کم آب تھے ہم ، رزق ِ سمندر نہ ہُوئے

☆

لہُو کے پُھول سرِ شاخِ انتظار کِھلے
یہ کِس بہار کے غنچے ، پسِ بہار کِھلے!

دِلوں سے گردِ مُسافت دُھلی تو آنکھوں میں
گُلِ وصال کِھلے اور بے شمار کِھلے

خود اپنے سامنے بے بس ہے قوّتِ تخلیق
کہ موجِ رنگ تو پتّھر کے آر پار کِھلے

ہے جو بھی پُھول وہ فردِ حساب جیسا ہے
گئی رُتوں میں جو بوئے تھے اَب کی بار کِھلے

http://www.hallagulla.com/urdu/

ہَوا کُچھ ایسی چلی ہے سوادِ ہجر اں میں
خزاں کے صحن میں جیسے گُلِ بہار کِھلے

☆

لہُو میں تیرتے پھرتے ملال سے کُچھ ہیں
کبھی سُنو تو دِلوں میں سوال سے کُچھ ہیں[

میں خُود بھی ڈوب رہا ہُوں ہر اک ستارے میں
کہ یہ چراغ مرِے حسبِ حال سے کُچھ ہیں

غمِ فراق سے اِک پَل نظر نہیں ہٹتی
اس آئینے میں ترے خدو خال سے کُچھ ہیں

اِک اور مَوج کہ اے سیلِ اشتباہ ابھی
ہماری کشتِ یقیں میں خیال سے کُچھ ہیں

ترے فراق کی صدیاں ، ترے وصال کے پَل
شمارِ عُمر میں یہ ماہ وسال سے کُچھ ہیں

☆

پلکوں کی دہلیز پہ چمکا ایک ستارا تھا
ساحل کی اُس بھیڑ میں جانے کون ہمارا تھا!

کہساروں کی گُونج کی صُورت پھیل گیا ہے وہ
میں نے اپنے آپ میں چُھپ کر جسے پُکارا تھا

سر سے گزرتی ہر اِک مَوج کو ایسے دیکھتے ہیں
جیسے اِس گرد ابِ فنا میں یہی سہارا تھا!

ہجر کی شب وہ نیلی آنکھیں اور بھی نیلی تھیں
جیسے اُس نے اپنے سرسے بوجھ اُتار ا تھا

جِس کی جھلملتا میں تم نے، مُجھ کو قتل کیا
پَت جھڑ کی اُس رات وہ سب سے روشن تارا تھا

ترکِ وفا کے بعد مِلا تو، جب معلوم ہُوا
اِس میں کتِنے رنگ تھے اس کے، کون ہمارا تھا

کون کہاں پر جُھوٹا نکلا! کیا بتلاتے ہم
دُنیا کی تفریح تھی اس میں، ہمیں خسارا تھا

جو منزل بھی راہ میں آئی، ہمیں خسارا تھا
وہ اُس کی تعبیر نہ تھی جو خواب ہمارا تھا

یہ کیسی آواز ہے جس کی زندہ گونج ہُوں میں
صبحِ ازل میں کِسی نے امجدؔ مُجھے پکارا تھا

☆

تارا تارا اُتر رہی ہے رات سمندر میں
جیسے ڈُوبنے والوں کے ہوں ہاتھ سمندر میں

ساحل پر تو سب کے ہونگے اپنے اپنے لوگ
رہ جائے گی کشتی کی ہر بات سمندر میں

ایک نظر دیکھا تھا اُس نے، آگے یاد نہیں
کُھل جاتی ہے دریا کی اوقات سمندر میں

میں ساحل سے لَوٹ آیا تھا، کشتی چلنے پر
پگھل چکی تھی لیکن میری ذات سمندر میں

کاٹ رہا ہُوں ایسے امجد یہ ہستی کی رہ
بے پتواری ناؤ پہ جیسے رات سمندر میں

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

لرزش نگر میں ، لہجے میں لُکنت عجیب تھی
اس اوّلیں وصال کی وحت عجیب تھی

روشن ہُوئی اُسی سے، اُسی سے بِکھر گئی
شبنم کو آفتاب سے نسبت عجیب تھی

آنسو دیئے پر آنکھ کو رونے کی خُو نہ دی
اے بادشاہِ غم، یہ عنایت عجیب تھی

کھڑکی میں آکے چاند نے جھپکی نہیں پلک
کل شب مِرے مکان میں صحبت عجیب تھی

اِک پَل تو جیسے سارا بدن سنسنا اُٹھا
اِس سر سری نگاہ میں دعوت عجیب تھی

ساحل پہ تھے تو ریت کا جادُو تھا ہر طرف
کشتی چلی تو سحر کی دہشت عجیب تھی

دل میں نہ رہ سکے، جو کہیں تو کہی نہ جائے
امجد شکستِ دل کی حکایت عجیب تھی

☆

دشتِ دل میں سراب تازہ ہیں
بُجھ چُکی آنکھ ، خواب تازہ ہیں

داستانِ شکستِ دل ہے وُہی
ایک دو چار باب تازہ ہیں

کوئی موسم ہو دل گلستان میں
آرزو کے گُلاب تازہ ہیں

دوستی کی زباں ہُوئی متروک
نفرتوں کے نصاب تازہ ہیں

آگہی کے ، ہماری آنکھوں پر
جس قدر ہیں عذاب ، تازہ ہیں

زخم در زخم دل کے کھاتے میں
دوستوں کے حساب تازہ ہیں

سر پہ بوڑھی زمین کے امجد
اَب کے یہ آفتاب تازہ ہیں

———

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

جو سرِ دار آ نہیں سکتا
قرضِ ہستی چکا نہیں سکتا

" آج " جس آئینے میں دُھندلا ہو
عکس کل کا دِکھا نہیں سکتا

(ق)

لہر ایسی چلی ہے بستی میں
کوئی بھی سر اُٹھا نہیں سکتا

ضبط سے یوں چِپّخ رہے ہونٹ
آدمی مُسکرا نہیں سکتا

زخمِ بے حُرمتی کی کیفیت
کوئی ہونٹوں پہ لا نہیں سکتا

اِتنی گہری ہُوئی ہے تاریکی
آدمی راہ پا نہیں سکتا

رات کے اِس حصار میں، مَیں تو
صُبح کے گیت گا نہیں سکتا

کِس قدر خواب ہیں نگاہوں میں
جن کو لفظوں میں لا نہیں سکتا

تم نہ دیکھو تُمھارا دین ایمان
میں تو نظریں چُرا نہیں سکتا

دِل سمندر بھی ہو اگر امجؔد
پیاس غم کی بُجھا نہیں سکتا

☆

اُس نے آہستہ سے جب پُکارا مجھے
جُھک کے تکنے لگا ہر ستارا مجھے

تیرا غم ، اِس فشارِ شب و روز میں
ہونے دیتا نہیں بے سہارا مجھے

ہر ستارے کی بجھتی ہُوئی روشنی
میرے ہونے کا ہے استعارا مجھے

اے خُدا ، کوئی ایسا بھی ہے معجزہ
جو کہ مجھ پر کرے آشکار ا مجھے

کوئی سُورج نہیں ، کوئی تارا نہیں
تُونے کس جھٹپٹے میں اُتار ا مجھے!

عکسِ امروز میں ، نقشِ دیروز میں
اِک اشارا تجھے ، اِک اشارا مجھے

ہیں اَزل تا اَبد ٹوٹتے آئینے
آگہی نے کہاں لا کے مارا مجھے

☆

لہُو میں رنگ لہرانے لگے ہیں
زمانے خُود کو دُہرانے لگے ہیں

پَروں میں لے کے بے حاصل اُڑانیں
پرندے لَوٹ کر آنے لگے ہیں

کہاں ہے قافلہ بادِ صبا کا !
دِلوں کے پُھول مُر جھانے لگے ہیں

کُھلے جو ہم نشینوں کے گریباں
خُود اپنے زخم افسانے لگے ہیں

کُچھ ایسا درد تھا بانگِ جر س میں
سَفر سے قبل پچھتانے لگے ہیں

کُچھ ایسی بے یقینی تھی فضا میں
جو اپنے تھے وہ بیگانے لگے ہیں

ہَوا کا رنگ نیلا ہو رہا ہے
چمن میں سانپ لہرانے لگے ہیں

فلک کے کھیت میں کھلتے ستارے
زمیں پر آگ برسانے لگے ہیں

لبِ زنجیر ہے تعبیر جن کی
وہ سپنے پھر نظر آنے لگے ہیں

کُھلا ہے رات کا تاریک جنگل
اور اندھے راہ دکھلانے لگے ہیں

چمن کی باڑ تھی جن کا ٹھکانہ
دلِ شبنم کو دھڑکانے لگے ہیں

بچانے آئے تھے دیوار ـ ـ ـ لیکن
عمارت ہی کو اب ڈھانے لگے ہیں

خدا کا گھر تمھی سمجھو ، تو سمجھو
ہمیں تو یہ صنم خانے لگے ہیں

☆

اگر چہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا

کُچھ ایسی برف تھی اُس کی نظر میں!
گُزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا

تُمھی نے کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچّھا نہیں تھا

کُھلی آنکھوں سے ساری عُمر دیکھا
اِک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

میں اُس کی انجمن میں تھا اکیلا
کسی نے بھی مُجھے دیکھا نہیں تھا

سحر کے وقت کیسے چھو ڑ جاتا !
تُمھاری یاد تھی ، سپنا نہیں تھا

کھڑی تھی رات کھڑکی کے سرہانے
دریچے میں وہ چاند اُترا نہیں تھا

دِلو ں میں گرنے والے اشک چُنتا
کہیں اِک جو ہری ایسا نہیں تھا

کُچھ ایسی دُھوپ تھی اُن کے سروں پر
خدا جیسے غریبوں کا ، نہیں تھا

ابھی حرفوں میں رنگ آتے کہاں سے!
ابھی میں نے اُسے لکھا نہیں تھا

تھی پُوری شکل اُس کی یاد مُجھ کو
مگر میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا

برہنہ خواب تھے سُورج کے نیچے
کِسی اُمید کا پَردا نہیں تھا

ہے امجدؔ آج تک وہ شخص دِل میں
کہ جو اُس وقت بھی میرا نہیں تھا

☆

جو آنسو دل میں گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے
بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے

کتابوں میں لکھے جاتے ہیں دُنیا بھر کے افسانے
مگر جن میں حقیقت ہو کتابوں میں نہیں رہتے

بہار آئے تو ہر اک پُھول پر اک ساتھ آتی ہے
ہوا جن کا مقدّر ہو وہ شاخوں میں نہیں رہتے

لیے پھرتے ہیں کُچھ احباب ایسے مُضطرب سجدے
جہاں دربار مِل جائے جبینوں میں نہیں رہتے

مہک اور تتلیوں کا نام بھونرے سے جُدا کیوں ہے
کہ یہ بھی تو خزاں آنے پہ پُھولوں میں نہیں رہتے

———

☆

کبھی تو دل تمنّاؤں کے اس گرداب سے نکلے
ہُنر بھی کُچھ ہمارے دیدۂ بے خواب سے نکلے!

ستارے ٹوٹ کر جیسے خلاؤں میں بِکھر جائیں !
ہمارے نام بھی ایسے دِلِ احباب سے نکلے

چمن میں گُل بکھر نے پر بھی خُوشبو چھوڑ جاتے ہیں !
زمیں کی انجمن سے جو اُٹھے آداب سے نکلے

ابھی تک ان کے بام و دَر پہ اُمیدیں لرزتی ہیں
یہ کِن شہروں کے نقشے وادیٔ سیلاب سے نکلے

محبّت کا سخن وہ ہے دشتِ سنگ میں کہیے
تو اِس کی بازگشتِ غم دلِ مہتاب سے نکلے

نہ ٹھرا ایک بھی امجدؔ مِری آنکھوں کے ساحل پر
ہزاروں کا رواں اس رہگزارِ آب سے نکلے

☆

کبھی رقصِ شامِ بہار میں اُسے دیکھتے
کبھی خواہشوں کے غبار میں اُسے دیکھتے

مگر ایک نجمِ سحر نما، کہیں جاگتا ،
ترے ہجر کی شبِ تار میں اُسے دیکھتے

وہ تھا ایک علس گریز پا، سو نہیں رُکا
کئی عُمر دشت و دیار میں اُسے دیکھتے

وہ جو بزم میں رہا بے خبر ، کوئی اور تھا
شبِ وصل میرے کنار میں اُسے دیکھتے

جو اِزل کی لوح پہ نقش تھا ، وہی عکس تھا
کبھی آپ قریۂ دار میں اُسے دیکھتے

وہ جو کائنات کا نُور تھا ، نہیں دُور تھا
مگر اپنے قُرب و جوار میں اُسے دیکھتے

یہی اب جو ہے یہاں نغمہ خواں، یہی خُوش بیاں
کِسی شام کُوئے نگار میں اُسے دیکھتے

☆

کسی کی آنکھ میں خُود کو تلاش کرنا ہے
پھر اِس کے بعد ہمیں آئنوں سے ڈرنا ہے

فلک کی بند گلی کے فقیر ہیں تارے !
کہ گُھوم پھر کے یہیں سے انھیں گزرنا ہے

جو زندگی تھی مری جان ! تیرے ساتھ گئی
بس اب تو عُمر کے نقشے میں وقت بھر نا ہے

جو تم چلو تو ابھی دو قدم میں کٹ جائے
جو فاصلہ مجھے صدیوں میں پار کر نا ہے

تو کیوں نہ آج یہیں پر قیام ہوجائے
کہ شب قریب ہے ، آخر کہیں ٹھرنا ہے

وہ میرا سیلِ طلب ہو کہ تیری رعنائی
چڑھا ہے جو بھی سمندر ، اُسے اُترنا ہے

سحر ہُوئی تو ستاروں نے مُو ند لیں آنکھیں
وہ کیا کریں کہ جنھیں انتظار کرنا ہے

یہ خواب ہے کہ حقیقت ، خبر نہیں امجؔد
مگر ہے جینا یہیں پر ، یہیں پہ مرنا ہے

☆

زندگانی ، جاو دانی بھی نہیں
لیکن اس کا کوئی ثانی بھی نہیں

ہے سوا نیزے پہ سُورج کا علَم
تیرے غم کی سائبانی بھی نہیں

منزلیں ہی منزلیں ہیں ہر طرف
راستے کی اِک نشانی بھی نہیں

آئنے کی آنکھ میں اَب کے برس
کوئی عکسِ مہربانی بھی نہیں

آنکھ بھی اپنی سراب آلود ہے
اور اِس دریا میں پانی بھی نہیں

جُز تحیّر ، گر د بادِ زیست میں
کوئی منظر غیر فانی بھی نہیں

درد کو دلکش بنائیں کس طرح !
داستانِ غم ، کہانی بھی نہیں

یولُٹا ہے گلشن وہم و گُماں
کوئی خارِ بد گمانی بھی نہیں

☆

زندگی درد بھی ، دَوا بھی تھی
ہم سفر بھی، گریز پا بھی تھی

کُچھ تو تھے دوست بھی وفا دشمن
کُچھ مری آنکھ میں حیا بھی تھی

دن کا اپنا بھی شور تھا لیکن
شب کی آواز بے صدا بھی تھی

عشق نے ہم کو غیب دان کیا
یہی تحفہ ، یہی سزا بھی تھی

گرد بادِ وفا سے پہلے تک
سر پہ خیمہ بھی تھا رِدا بھی تھی

ماں کی آنکھیں چراغ تھیں جس میں
میرے ہمراہ وہ دُعا بھی تھی

کُچھ تو تھی رہگزر میں شمعِ طلب
اور کُچھ تیز وہ ہَوا بھی تھی

بے وفا تو وہ خیر تھا امجدؔ
لیکن اُس میں کہیں وفا بھی تھی!

☆

آنکھوں سے اِک خواب گُزرنے والا ہے
کھڑکی سے مہتاب گُزرنے والا ہے

صدیوں کے ان خواب گزیدہ شہروں سے
مہرِ عالم تاب گُزرنے والا ہے

جادُوگر کی قید میں تجھے جب شہزادے
قصّے کا وہ باب گُزرنے والا ہے

(ق)

سنّاٹے کی دہشت بڑھتی جاتی ہے
بستی سے سیلاب گُزرنے والا ہے

دریاؤں میں ریت اُڑے گی صحرا کی
صحرا سے گِرداب گُزرنے والا ہے

مولا جانے کب دیکھیں گے، آنکھوں سے
جو موسم شاداب گُزرنے والا ہے

ہستی امجدؔ دیوانے کا خواب سہی
اب تو یہ بھی خواب گُزرنے والا ہے

———

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

☆

وہ بادِ شام تھا، اُس کو گزر ہی جانا تھا
گُلِ اُمید کِھلا تھا، بکھر ہی جانا تھا

زمیں کا رِزق ہُوئے وصل و انتظار کے رنگ
پسِ بہار ہی نشّہ اُتر ہی جانا تھا

ہر اک سفر کی حدود پر تھاایک اور سفر
تُمھارا ساتھ نہ ملتا تو مر ہی جانا تھا

وہ ایسے ناز سے گزرا کہ میں بُلا نہ سکا
یہ اور بات مجھے بھی اُدھر ہی جانا تھا

سفر کی اوّلیں شب میں گریز کر جاتا
اُسے یہ ہاتھ اگر چھوڑ کر ہی جانا تھا

وفا کے باب میں لفظوں کے سلسلے تھے بہت
کہیں کِسی کو مِری جاں، مُکر ہی جاتا تھا

اُفق کے ہاتھ پہ تاروں کا خُون تھا امجدؔ
مَیں کو رچشم اسے بھی سحر ہی جانا تھا

۱۹۷۷ء

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

☆

(نذرِ اقبال)

ہجوم صید میں دیکھا گِھرا ہُوا صیاد
بدل رہا ہے نیا رُوپ عالمِ ایجاد

تُمھاری میری محبت بحال کیسے ہو!
تغیرات پہ قائم ہے وقت کی بنیاد

جب اپنی آنکھ کا دیکھا نہ معتبر ٹھرے
کہاں سے لائیں خیالوں کے واسطے اُسناد

وہ کیا گھڑی تھی، کہاں پر ملے تھے ہم دونوں
وہ چل دیا تو مُجھے دیر تک نہ آیا یاد

مِرا بدن تھا گھنے جنگلوں کی تاریکی
تری طلب نے کیا ہے یہ خاکداں آباد

میں اپنے ہست کی تنہائیوں میں روتا ہُوں
یہ مُسکراتا ہُوا شخص ہے مِرا ہمزاد

جو بستیاں تھیں اُنھیں تو مٹا چکے امجدؔ
نجانے اب یہ خرابے کرے گا کون آباد !

۱۹۷۷ء

☆

کہنے کو میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں
امجدؔ مگر وہ شخص مجھے بُھولتا نہیں

ڈرتا ہُوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے
مَیں جاگ تو رہا ہُوں مگر جاگتا نہیں

آشفتگی سے اُس کی اُسے بے وفا نہ جان
عادت کی بات اور ہے دِل کا بُرا نہیں

صاحب ِ نظر سے کرتا ہے پتّھر بھی گُفتگو
ناجنس کے حضور زباں کھولتا نہیں

تنہا اُداس چاند کو سمجھو نہ بے خبر
ہر بات سُن رہا ہے مگر بولتا نہیں

خاموش رتجگوں کا دُھواں تھا چہار سُو
نِکلا کب آفتاب مُجھے تو پتا نہیں!

امجدؔ وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں مگر
اُن میں کوئی بھی عکس مِرے نام کا نہیں

۱۹۷۷ء

☆

نعرہ نہیں تو نالہ ہی کوئی بُلند ہو
اے ساکنانِ شہرِ ستمگار کُچھ کہو

کٹتی ہے کِس طرح سے شبِ تارِ بے حسی
کرتے ہو بند کِس طرح سُورج کی آنکھ کو !

سہمے ہُوئے ہیں اپنی ہی خاموشیوں سے لوگ
مُردہ نہیں یہ شہر مگر تُم صدا تو دو!

کیوں ہاتھ باندھے بیٹھے رہو مُجرموں کی مثل
دستِ ستم شعار سے تلوار چھین لو

امجدؔ یہ رَ تجگے ہیں سز ا خوابِ مَست کی
تاروں کے سائبان تلے جاگتے رہو

۱۹۷۷ء

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

کِسی کی آنکھ جو پُر نم نہیں ہے
نہ سمجھو یہ کہ اُس کو غم نہیں ہے

سوادِ درد میں تنہا کھڑا ہُوں!
پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے

سمجھ میں کُچھ نہیں آتا کِسی کی !
اگرچہ گُفتگو مُبہم نہیں ہے

سُلگتا کیوں نہیں تاریک جنگل!
طلب کی لَو اگر مدّھم نہیں ہے

یہ بستی ہے ستم پروردگاں کی
یہاں کوئی کِسی سے کم نہیں ہے

کِنارا دُوسرا دریا کا جیسے
وہ ساتھی ہے مگر محرم نہیں ہے

دِلوں کی روشنی بُجھنے نہ دینا
وجودِ تیرگی محکم نہیں ہے

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہُوں
کوئی اس زخم کا مرہم نہیں ہے

http://www.hallagulla.com/urdu/

جو کوئی سُن سکے امجدؔ تو دُنیا
بجز اِک بازگشت غم نہیں ہے

۱۹۷۷ء

☆

تلاشِ منزلِ جاناں تو اِک بہانہ تھا
تمام عُمر میں اپنی طرف روانہ تھا

میں تیری دُھن میں رواں تھا مجھے پتہ نہ چلا
غبارِ راہ میں شامل غمِ زمانہ تھا

مَیں اُس کو حشر میں کس نام سے صدا دیتا
کہ میرا اُس کا تعارف تو غائبانہ تھا

عجب کشش تھی سمند ر کی سبز آنکھوں میں
ہر ایک چشمہ اُسی کی طرف روانہ تھا

وہی نہیں تو ورق کِس لیے سیاہ کریں
سخن تو عرضِ تمنّا کا اِک بہانہ تھا

سمندِ شوق تھا امجد رواں دواں جب تک
قدم کے نیچے ستاروں کا شامیانہ تھا

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

بستیوں میں اک صدائے بے صدا رہ جائے گی
بام و دَر پہ نقش تحریر ہوا رہ جائے گی

آنسوؤں کا رِزق ہوں گی بے نتیجہ چاہتیں
خُشک ہونٹوں پر لرزتی اِک دُعا رہ جائے گی

رُو برو منظر نہ ہوں تو آئینے کِس کام کے
ہم نہیں ہوں گے تو دُنیا گردِ پا رہ جائے گی

خواب کے نشّے میں جُھکتی جائے گی چشمِ قمر
رات کی آنکھوں میں پھیلی التجا رہ جائے گی

بے ثمر پیروں کو چُومیں گے صبا کے سبز لب
دیکھ لینا، یہ خزاں بے دست و پارہ جائے گی!

۱۹۷۶ء

☆

تم سے بچھڑ کر پہروں سوچتا رہتا ہُوں
اَب میں کیوں اور کِس کی خاطر زندہ ہُوں

اے خاموش خلا کے مالک تیری قسم
بزمِ جہاں میں تجھ سے زیادہ تنہا ہُوں

جیتی جاگتی دُنیا کے ہنگاموں میں
یوُ لگتا ہے جیسے میں اِک سایا ہُوں

کھویا ہے وہ جیسے ہاتھ لکیروں میں
ایسے اپنے ہاتھ کو تکتا رہتا ہُوں

ریزہ ریزہ ٹوٹ چُکا ہُوں اند رسے
گھر سے باہر گردن تان کے چلتا ہُوں

جانے جس کا نام ہے امجدؔ ، کون ہے وہ
سچ پُوچھو تو میں اِک جُھوٹا چہرہ ہُوں

۱۹۷۶ء

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

دل کے دریا کو کِسی روز اُتر جانا ہے
اِتنا بے سمت نہ چل ، لَوٹ کے گھر جانا ہے

اُس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اسے، اصل میں مر جانا

بول اے شامِ سفر، رنگ رہائی کیا ہے،
دِل کو رُکنا ہے کہ تاروں کو ٹھہر جانا ہے!

کون اُبھرتے ہُوئے مہتاب کا رستہ روکے
اس کو ہر طور سُوئے دشتِ سحر جانا ہے

میں کِھلا ہُوں تو اِسی خاک میں مِلنا ہے مُجھے
وہ تو خُوشبو ہے، اسے اگلے نگر جانا ہے

وہ ترے حُسن کا جادو ہو کہ میرا غمِ دل
ہر مُسافر کو کسی گھاٹ اُتر جانا ہے

۱۹۷۵ء

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

دِل میں لاوا اُبل رہا ہے کیا؟
کوئی کُہسار جل رہا ہے کیا ؟

خوابِ فردا! زمیں پہ ظاہر ہو
میری آنکھوں میں پَل رہا ہے کیا

چشمِ شبنم _ سفیرِ غنچہ بن
یُوں ہَوا بَن کے چل رہا ہے کیا !

آشریکِ غمِ خُدائی ہو
اپنی وحدت میں گل رہا ہے کیا!

اِتنے آسودہ کیوں ہیں اہلِ سفر
سرے سے طُوفان ٹل رہا ہے کیا؟

کِس لیے بد حواس ہیں تارے
کوئی سُورج نِکل رہا ہے کیا؟

کیوں ہَوا اس قدر رُکی سی ہے
کوئی طوفان پَل رہا ہے کیا؟

کاٹ کر پھینک رے انھیں امجدؔ
ایسے ہاتھوں کو مل رہا ہے کیا!

☆

اب کے سَفر ہی اور تھا ، اور ہی کُچھ سراب تھے
دشتِ طلب میں جابجا ، سنگِ گرانِ خواب تھے

حشر کے دن غلغہ ، شہر کے بام و دَرمیں تھا
نِکلے ہُوئے سوال تھے، اُگلے ہُوئے جواب تھے

اب کے برس بہا رکی ، رُت بھی تھی اِنتظارکی
لہجوں میں سیلِ درد تھا، آنکھوں میں اضطراب تھے

خوابوں کے چاند ڈھل گئے تاروں کے دم نِکل گئے
پُھولوں کے ہاتھ جل گئے، کیسے یہ آفتاب تھے!

سیل کی رہگزر ہُوئے ، ہونٹ نہ پھر بھی تر ہُوئے
کیسی عجیب پیا س تھی، کیسے عجب سحاب تھے!

عُمر اسی تضاد میں، رزقِ غبار ہوگئی
جسم تھا اور عذاب تھے، آنکھیں تھیں اور خواب تھے

صُبح ہُوئی تو شہر کے ، شور میں یوں بِکھر گئے
جیسے وہ آدمی نہ تھے، نقش و نگارِ آب تھے

آنکھوں میں خُون بھر گئے ، رستوں میں ہی بِکھر گئے
آنے سے قبل مرگئے، ایسے بھی انقلاب تھے

ساتھ وہ ایک رات کا ، چشمِ زون کی بات تھا
پھر نہ وہ التفات تھا ، پھر نہ وہ اجتناب تھے

ربط کی بات اور ہے، ضبط کی بات اور ہے
یہ جو فشارِ خاک ہے، اِس میں کبھی گلاب تھے

اَبر برس کے کُھل گئے، جی کے غُبار دُھل گئے
آنکھ میں رُونما ہُوئے ، شہر جو زیرِ آب تھے

درد کی رہگزار میں، چلتے تو کِس خمار میں
چشم کہ بے نگاہ تھی، ہونٹ کہ بے خطاب تھے

۱۹۷۵ء

☆

شبِ فراق کی خُوشبُو غروبِ شام میں تھی
زمین دنگ ، ستاروں کے از دحام میں تھی

ہمیں خود اپنے تجسّس سے ہیں گِلے کیا کیا
ہو بات اُس میں نہیں تھی جو اُس کے نام میں تھی

تجھے تلاشنا جیسے اُفق کو چُھونا تھا !
وہی سَفر میں تھی حالت کہ جو قیام میں تھی

http://www.hallagulla.com/urdu/

نگاہِ خاص جو ہوتی تو دیکھتا کوئی
وہ ایک بات جو تیری نِگاہ عام میں تھی

تمام رنگ اُڑے جارہے تھے اُس کی طرف
عجب طرح کی کشش آفتابِ شام میں تھی

چمک رہا تھا ہَواؤں کی آستیں پہ لہُو،
اِدھر زمین بہاروں کے اہستمام میں تھی

یہ کِس نے لوٹ لیے قافلے ستاروں کے
سحر کی تیغ تو امجدؔ ابھی نیام میں تھی

۱۹۷۵ء

☆

کِس قدر زخم زخم چہرا ہے
چاند بھی آدمی سا لگتا ہے

اِس کے دل میں بھی چور ہے شاید !
وہ بھی نظریں جُھکا کے گُزرا ہے

اِس طرف میں ہُوں، اُس طرف تُم ہو
بیچ میں زندگی کا میلا ہے

http://www.hallagulla.com/urdu/

زر کی افراط ہوگئی ہے بہت
ہر گھڑی دِل کا بھاؤ گرتا ہے

جیسے سچ مُچ اُسے بہت غم ہو
اِس طرح اُس نے حال پُوچھا ہے

اِس قدر مہربان ہے دُنیا
زندہ رہنا عذاب لگتا ہے

تم نے اچّھا کیا جو لَوٹ آئے
بارشوں کے سَفر میں کھطرہ ہے

(ق)

اِس قدر قرض ہے محبّت کا
سوچتا ہُوں تو ہول اُٹھتا ہے

عشق کے واجبات کیسے دُوں!
تم نے کیا میرے پاس چھوڑا ہے

اتنے مصروف ہوگئے ہیں ہم
وقت ٹھرا ہُوا سا لگتا ہے

آرزو ، ماورائے وقت نہیں
مِل بھی جاؤ اگر ، تو اَب کیا ہے!

کٹ کے نخلِ فلک سے اے امجدؔ
تارا کِھلتا ہے یا بکھرتا ہے؟

۱۹۷۵ء

☆

گُزر گیا جو زمانہ اُسے بُھلا ہی دو
جو نقش بن نہیں سکتا اُسے مِٹا ہی دو

کُھلے گا ترکِ تعلق کے بعد بابِ فنا
یہ ایک آخری پردہ بھی اَب اُٹھا ہی دو

رُکی رُکی سی ہَوا ہے تھکا تھکا ہے چاند
وفا کے دشت میں حیراں کھڑے ہیں راہی دو

گُزر رہا ہے جو لمحہ اسے امر کر لیں
میں اپنے خُون سے لکھتا ہُوں، تم گواہی دو

کسی طرح سے تغافل کا بابِ شک تو کُھلے
نہیں میں پیار کے قابل تو کُچھ سزا ہی دو

میں کائنات کو غم سے نجات دے دُوں گا
مِری گرفت میں اِک دِن اگر تباہی دو

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

رواں دواں ہے سفر، پیش و پس نہیں معلوم
قفس میں رہتے ہیں، حدِّ قفس نہیں معلوم

ملوں تو تابہ اَبد اس کو چُومنا چاہوں
کہاں بچھڑتے ہیں عشق و ہوس، نہیں معلوم

سکوتِ شام میں زنجیر سی چھنکتی ہے
یہ سانس ہے کہ صدائے جرس، نہیں معلُوم

نشاطِ وصل کا لمحہ عجیب لمحہ تھا
کہاں رہا ہُوں میں اِتنے برس، نہیں معلوم

زمیں کی قید میں مَیں ہُوں، یہ میری قید میں ہے
کہاں پہ گھر ہے، کہاں ہے قفس، نہیں معلُوم!

زمیں کے رنگ تھے جتنے، فنا پذیر ہُوئے
جلی ہے کِس لیے شمعِ نفس، نہیں معلُوم

ٹپک رہا ہے سماعت میں کُچھ نہ کُچھ امجؔد
غمِ حیات کا سَم ہے کہ رس، نہیں معلوم

۱۹۷۴ء

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

وہی ہے درد کا عالم اُسے بُھلا کر بھی
مِرے قریب ہی نِکلا وہ دُور جاکر بھی

پیئے ہیں سات سمندر مگر وُہی ہے پیاس
نگاہ بھرتی نہیں ہے کسی کو پاکر بھی

الگ الگ سہی دُنیا کا اور دوست کاغم
کبھی یُونہی ذرا دیکھو انھیں مِلا کر بھی

عجیب قحط پڑااَب کے سال اشکوں کا
کہ آنکھ تر نہ ہُوئی خُون میں نہا کر بھی

ہر ایک شے تری رحمت کے گیت گاتی ہے
اگر ہے سچ تو کبھی اے مِرے خُدا، کر بھی

فنا کا عکس ہے شبنم میں، گُل کا عکس نہیں
نِگاہ کر کبھی اِس آئینے میں آکر بھی

زمیں کا سانس رُکا ہے ترے اشارے پر
کبھی تو دیکھ اِدھر اِک نظر اُٹھا کر بھی

بگولے رقص کو اُٹھے، ہَوا نے تالی دی
سکون مل نہ سکا بستیوں سے جاکر بھی

ہر ایک قید کی کوئی اخیر ہے امجدؔ
نفس کو خاک کے جادُو سے اَب رِہا، کر بھی!

۱۹۷۴ء

☆

رُتوں کے ساتھ دِلوں کی وہ حالتیں بھی گئیں
ہَوا کے سَنگ ہَوا کی امانتیں بھی گئیں

ترے کہے ہُوئے لفظوں کی راکھ کیا چھیڑیں
ہمارے اپنے قلم کی صداقتیں بھی گئیں

جو آئے جی میں پُکارو مُجھے، مگر ہے یُوں
کہ اُس کے ساتھ ہی اُس کی محبتیں بھی گئیں

عجیب موڑ پہ ٹھرا ہے قافلہ دِل کا
سکون ڈھونڈنے نکلے تھے وحشتیں بھی گئیں

یہ کیسی نیند میں ڈوبے ہیں آدمی امجدؔ
کہ ہار تھک کے گھروں سے قیامتیں بھی گئیں

---

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

چُپکے چُپکے ہی اثر کرتا ہے
عِشق کینسر کی طرح بڑھتا ہے

رات کے پچھلے پہر تاروں میں
ایک ہنگامہ مچا رہتا ہے

گھر سے بھاگے ہُوئے بچّے کی طرح
دل سرِ شہرِ وفا تنہا ہے

خواب میں جس سے پریشان تھے ہم
آنکھ کھولی تو وہی نقشہ ہے

ق

کون سُنتا ہے کِسی کی پِیتا
سب کے ماتھوں پہ یہی قصّہ ہے

کوئی ڈرتا ہے بھری محفل میں
کوئی تنہائی میں ہنس پڑتا ہے

یہی جنّت ہے یہی ہے دوزخ
اور دیکھو تو یہی دُنیا ہے

سب کی قِسمت میں فنا ہے جب تک
آسمانوں پہ کوئی زندہ ہے

وہ خُدا ہے تو زمیں پر آئے
حشر کا دن تو یہاں برپا ہے

سانس رو کے ہُوئے بیٹھو امجدؔ
وقت دُشمن کی طرح چلتا ہے

۱۹۷۴ء

☆

نہ آسماں سے نہ دُشمن کے زور و زَر سے ہُوا
یہ معجزہ تو مِرے دَستِ بے ہُنر سے ہُوا

قدم اُٹھا ہے تو پاؤں تلے زمیں ہی نہیں
سفر کا رنج ہمیں خواہشِ سفر سے ہُوا

میں بھیگ بھیگ گیا آرزو کی بارش میں
وہ عکس عکس میں تقسیم چشمِ تر سے ہُوا

سیا ہی شب کی نہ چہروں پہ آگہی ہو کہیں
سحر کا خوف ہمیں آئنوں کے ڈر سے ہُوا

کوئی چلے تو زمیں ساتھ ساتھ چلتی ہے
یہ راز ہم پہ عیاں گردِ رہگزر سے ہُوا

ترے بدن کی مہک ہی نہ تھی تو کیا رُکتے
گُزر ہمارا کئی بار یوُں تو گھر سے ہُوا

کہاں پہ سُوئے تھے امجد کہاں کُھلیں آنکھیں
گُماں قفس کا ہمیں اپنے بام و دَر سے ہُوا

۱۹۷۴ء

☆

جو دوست ہی نہ رہا، اُس سے اب گِلہ کیا ہے!
مِرے خُدا! یہ محبت کا سِلسلہ کیا ہے!

چلو تو سیل کی صُورت نظر جُھکا کے چلو
بلند و پست جو دیکھے وہ حوصلہ کیا ہے!

صدائے نِکہتِ غنچہ! کہیں قیام تو کر
پتہ چلے تو سہی کُچھ معاملہ کیا ہے!

کِرن کِرن اُسے ڈُھونڈا، صَدف صَدف دیکھا
اگر ہے سعیِ مُسلسل کا کُچھ صِلہ، کیا ہے؟

وہ شخص جا بھی چُکا ہے، بہار ہو بھی چکی
مگر یہ پھُول سرِ شاخِ دِل، کِھلا کیا ہے!

۱۹۷۴ء

☆

سانسوں میں اشتعال سا آیا ہُوا تو ہے
موسم شبِ وصال سا آیا ہُوا تو ہے

بیٹھے بٹھائے سُرخ ہُوئے کان کِس لیے!
دل میں کوئی خیال سا آیا ہُوا تو ہے

لکھتے ہیں آستینِ ہَوا پر کہانیاں
ہاتھوں میں یہ کمال سا آیا ہُوا تو ہے

کاخِ بلند بام کو شاید خبر نہیں
بُنیاد میں زوال سا آیا ہُوا تو ہے

ڈرتا ہوں آسمان کا جادُو نہ ٹوٹ جائے
لَب تک کوئی سوال سا آیا ہُوا تو ہے

امجد جُدائیوں کی یہ تمہید تو نہیں
لہجوں میں پھر ملال سا آیا ہُوا تو ہے

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

نکل کے حلقۂ شام و سحر سے جائیں کہیں
زمیں کے ساتھ نہ مل جائیں یہ بلائیں کہیں!

سفر کی رات ہے پچھلی کہانیاں نہ کہو!
رُتوں کے ساتھ پلٹتی ہیں کب ہَوائیں کہیں!

فضا میں تیرتے رہتے ہیں نقش سے کیا کیا!
مُجھے تلاش نہ کرتی ہوں یہ بلائیں کہیں!

ہَوا ہے تیز، چراغِ وفا کا ذِکر تو کیا
طنابیں خیمۂ جاں کی نہ ٹوٹ جائیں کہیں!

میں اوس بن کے گُلِ حرف پر چمکتا ہُوں
نکلنے والا ہے سُورج، مُجھے چُھپائیں کہیں!

مرے وُجود پہ اُتری ہیں لفظ کی صُورت
بھٹک رہی تھیں خلاؤں میں یہ صدائیں کہیں

ہَوا کا لمس ہے پاؤں میں بیڑیوں کی طرح
شفق کی آنچ سے آنکھیں پگھل نہ جائیں کہیں!

رُکا ہُوا ہے ستاروں کا کارواں امجدؔ
چراغ اپنے لہُو سے ہی اَب جلائیں کہیں

۱۹۷۳ء

☆

بام و دَر سے ہی بات کی جائے
رائیگاں کیوں یہ رات کی جائے!

پیاس پھر بَستیوں میں اُتری ہے
گفتگوئے فُرات کی جائے

پتّھروں سے خطاب کیا کیجئے
آدمی ہوں تو بات کی جائے

یا تو ترتیب دیں سِتاروں کو
ختم یا کائنات کی جائے

آسماں دھم سے آگرے نیچے
خاک اگر بے صفات کی جائے

صبح کی آس ہے تو شام کا غم
جیسے زنداں میں رات کی جائے

توڑدیں جال چاند تاروں کا
کوئی شکلِ نجات کی جائے

دسترس کے حصار سے آگے
سیرِ نا ممکنات کی جائے

خاک کو خاک ہی میں مِلنا ہے
کیوں خلاؤں کی بات کی جائے

مُٹّھیاں کُھل رہی ہیں غُنچوں کی
کُچھ سبیلِ ثبات کی جائے

خاک کا سحر ٹوٹتا ہو جب
کیا بھری کائنات کی جائے!

۱۹۷۳

☆

آنکھوں میں باز دید کا اَرمان رہ گیا
کیا چاند تھا کہ ہالۂ حرمان رہ گیا

خالی گھروں میں جس طرح آسیب سانس لے
دل میں کسی کا سائیہ پیمان رہ گیا

منظر جو دل پسند تھے، آگے نِکل گئے
رستوں میں ایک دیدۂ حیران رہ گیا

آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے مُسافر گزر گئے
چسپاں فیصلِ شہر پہ اعلان رہ گیا

http://www.hallagulla.com/urdu/

زنجیرِ درد ٹُوٹ گئی ہے، پہ قید ہُوں
ہاتھوں میں ایک حلقۂ پیمان رہ گیا

ساحل کے ساتھ ساتھ چلا جارہا تھا چاند
پہنچا جو پانیوں میں تو حیران رہ گیا

آئی بہار، باغ کی مٹّی ہری ہُوئی
امجدؔ مگر وہ پیڑ کہ ویران رہ گیا

۱۹۷۳ء

☆

میں بے نَواہوں، صاحبِ عزّت بنا مجھے
اے ارضِ پاک، اپنی جبیں پر سجا مجھے

جس پر رقم ہیں نقشِ کفِ پائے رفتگاں
اے عہدِ نا تمام، وہ رستہ دِکھا مُجھے

میں حَرف حَرف لوحِ زمانہ پہ دَرج ہُوں
مَیں کیا ہُوں! میرے ہونے کا مطلب سکھا مُجھے

یا مُجھ کو اپنا چہرۂ منزل نما دِکھا
یا قید صبح و شام سے کر دے رِہا مجھے

میں موجِ شوقِ خام تھا لیکن ترے طفیل
دریا بھی اپنے سامنے قطرہ لگا مجھے

۱۹۷۲ء

☆

ہر شخص کی خُون رنگ قبا ہے کہ نہیں ہے!
یہ قتل گہہِ اہلِ وفا ہے کہ نہیں ہے!

محروم جواب آتی ہے فریاد فلک سے
ان ظُلم نصیبوں کا خُدا ہے کہ نہیں ہے!

اے قریہ بے خوابِ تمنا کے مکینو
اس راہ کا اُس کو بھی پتا ہے کہ نہیں ہے!

اِک ریت کا دریا سا اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
صحرائے محبّت کا سِرا ہے کہ نہیں ہے!

آنکھوں کے لیے خواب ہیں شبنم کے لیے پُھول
ہر چیز یہاں رشتہ بپا ہے کہ نہیں ہے!

اِک نسل کی تعزیر سہیں دُوسری نسلیں
اے منصبِ برحق، یہ ہُوا ہے کہ نہیں ہے!

بے رنگ ہُوئے جاتے ہیں آنکھوں کے جزیرے
طوفان کی یہ آب و ہوا ہے کہ نہیں ہے!

امجدؔ جو رُکا اس کی صدا پر، نہ چلا پھر
انسان کا دل کوہِ ندا ہے کہ نہیں ہے!

۱۹۷۲ء

☆

یہ دشتِ ہجر، یہ وحشت، یہ شام کے سائے
خُدا یہ وقت تری آنکھ کو نہ دکھلائے!

اُسی کے نام سے لفظوں میں چاند اُترے ہیں
وہ ایک شخص کہ دیکھوں تو آنکھ بھر آئے

جو کھو چُکے ہیں اُنھیں ڈھونڈنا تو ممکن ہے
جو جا چکے ہیں اُنھیں کوئی کِس طرح لائے!

کلی سے میں نے گُلِ تر جسے بنایا تھا
رُتیں بدلتی ہیں کیسے، مجھے ہی سمجھائے

جو بے چراغ گھروں کو چراغ دیتا ہے
اُسے کہو کہ مِرے شہر کی طرف آئے

یہ اضطرابِ مسلسل عذاب ہے امجدؔ
مِرا نہیں تو کِسی اور ہی کا ہو جائے!

۱۹۷۲ء

☆

چاند کے ساتھ کئی درد پُرانے نکلے
کتنے غم تھے جو ترے غم کے بہانے نکلے

فصلِ گُل آئی، پھر اک بار اسیرانِ وفا
اپنے ہی خُون کے دریا میں نہانے نکلے

ہجر کی چوٹ عجب سنگ شکن ہوتی ہے
دل کی بے فیض زمینوں سے خزانے نکلے

عُمر گُزری ہے شبِ تار میں آنکھیں مَلتے
کِس اُفق سے مِرا خُورشید نہ جانے نکلے!

کُوئے قاتل میں چلے جیسے شہیدوں کا جلوس
خواب یوں بھیگتی آنکھوں کو سجانے نکلے

دِل نے اِک اینٹ سے تعمیر کیا تاج محل
تُو نے اِک بات کہی، لاکھ فسانے نکلے

www.HallaGulla.com Virtual Home for Real People

دشتِ تنہائی ہجراں میں کھڑا سوچتا ہوں
ہائے کیا لوگ مِرا ساتھ نبھانے نکلے

میں امجدؔ اِسے بے واسطہ دیکھا ہی نہیں
وہ تو خُوشبو میں بھی آہٹ کے بہانے نکلے

۱۹۷۲ء

☆

ترکِ اُلفت کا بہانہ چاہے
وہ مُجھے چھوڑ کے جانا چاہے

آس کی خواب خیالی دیکھو
آگ پانی میں لگانا چاہے

کُچھ نہیں اور تغافل ہی سہی
آرزو کوئی ٹھکانہ چاہے

وقت دیوار بنا بیٹھا ہے
وہ اگر لَوٹ بھی آنا چاہے

کوئی آہٹ تھی نہ سایا تھا
دل تو رُکنے کا بہانہ چاہے

میں وہ رستے کی سرائے ہُوں جِسے
ہر کوئی چھوڑ کے جانا چاہے

دیکھنا دِل کی اذّیت طلبی
پھر اُسی شہر کو جانا چاہے

۱۹۷۰ء

☆

خزاں کے پُھول کی صُورت بکھر گیا کوئی
تجھے خبر نہ ہُوئی اور مرگیا کوئی

دروں دریچوں میں خلقت دکھائی دیتی ہے
نواحِ سنگ میں آشفتہ سَر گیا کوئی

ہَوا نہ تھا پہ ہَواؤں سا بے خبر تھا وہ
مُجھے بٹھا کے سرِ رہ گُزر ، گیا کوئی

گریز میں وہ توجّہ کا رنگ کیسا تھا
اِس اِک سوال سے دامن کو بھر گیا کوئی

اسے گُماں ہی نہ تھا جیسے میرے ہونے کا
مِرے قریب سے یُوں بے خبر گیا کوئی

http://www.hallagulla.com/urdu/

غمِ حیات کے رستے عجیب تھے امجدؔ
کس نے رُک کے نہ دیکھا، کدھر گیا کوئی

۱۹۷۰ء

☆

یہی بہت ہے کہ دل اس کو ڈھونڈ لایا ہے
کسی کے ساتھ سہی، وہ نظر تو آیا ہے

کروں شکایتیں، تکتا رہوں کہ پیار کروں!
گئی بہار کی صُورت وہ لَوٹ آیا ہے

وہ سامنے تھا مگر یہ یقیں نہ آتا تھا
وہ آپ ہے کہ مِری خواہشوں کا سایا ہے!

عذاب دھوپ کے کیسے ہیں، بارشیں کیا ہیں!
فصیلِ جسم گری جب تو ہوش آیا ہے

میں کیا کروں گا اگر وہ نہ مِل سکا امجدؔ
ابھی ابھی مِرے دل میں خیال آیا ہے

۱۹۷۰ء

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

پُھول کو رنگ ستارے کو ضیا کِس نے دی!
اے غمِ دل، ترے ہونٹوں کو نوا کِس نے دی!

جی اُسے دیکھ کے کیوں آج بھرا آتا ہے
شعلۂ عرضِ تمنّا کو ہَوا کِس نے دی!

دِل کے دریا میں گھا جو بھی، وہیں ڈُوب گیا
یہ مگر دھیان کی گلیوں سے صَدا کِس نے دی!

اپنی ہی شکل ہے، جس سمت نظر پڑتی ہے
شہرِ آئینہ میں آنکھوں کو سزا کِس نے دی!

ہُو بہُو اس کی ہی آواز لگی ہے! دیکھو
وادیٔ سنگ میں امجدؔ یہ نِدا کس نے دی!

☆

اوروں کا تھا بیان تو موجِ صدا رہے
خُود عُمر بھر اسیرِ لبِ مُدّعا رہے

مثلِ حباب بحرِ غمِ حادثات میں
ہم زیرِ بارِ منّتِ آب و ہَوا رہے

میں اُس سے اپنی بات کا مانگوں اگر جواب
لہروں کا پیچ و خم وہ کھڑا دیکھتا رہا

ق

گُلشن میں تھے تو رونقِ رنگ چمن بنے
جنگل میں ہم امانتِ بادِ صبا رہے

سُرخی بنے تو خُون شہیداں کا رنگ تھے
روشن ہُوئے تو مشعلِ راہِ وفا رہے

اُبھرے تو ہر بھنور کا جگر چاک کر گئے
ٹھہرے تو موج موج کو اپنا بنا رہے

امجؔد درِ نگار پہ دستک ہی دیجیے
اب بے کراں سکوت میں کُچھ غلغلہ رہے

☆

گفتگو میں یک بیک تبدیلی آواز کیا!
خامشی میری ہے میرے درد کی غماز کیا؟

دشت میں سیلاب ہے اور شہر ہیں تشنہ دہن
دوستوں، دیدہ درد، اِس بات میں ہے راز کیا؟

http://www.hallagulla.com/urdu/

آدمی کیا، اَب تو چلتے ہیں در و دیوار بھی
بَھا گیا شہروں کو تیری چال کا اندازہ کیا؟

اِس جہانِ کو روگر میں خاک ہے عرضِ ہُنر
کیا دلِ اُلفت چشیدہ، رنگ کیا، آواز کیا؟

یہ زمینیں بے ثمر ہیں، راستے بے نُور ہیں
کیا ہَوا موسمِ گُل اور چشمِ باز کیا؟

جس طرف چاہو، چلو امجدؔ، ہَوائے شوق میں
کاروانِ بے جہت کے واسطے آغاز کیا!

۱۹۶۹ء

☆

عشّاق نہ پتھر نہ گدا کوئی نہیں ہے
اب شہر میں سایوں کے سوا کوئی نہیں ہے

بچھڑے ہُوئے لوگوں کا پتہ کون بتائے
رستوں میں بجز بادِ بلا کوئی نہیں ہے

میں اپنی محبت میں گرفتار ہُوا ہُوں
اِس درد کی قسمت میں دَوا کوئی نہیں ہے

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

بے بار چلا اب کے برس موسمِ گُل بھی
اُس پھول کے کِھلنے کی اَدا کوئی نہیں ہے

ہر آنکھ میں افسوس نے جالے سے تنے ہیں
ماحول کے جا دُو سے رہا کوئی نہیں ہے

امجدؔ یہ مِرا دل ہے کہ صحرائے بلا ہے
مدّت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں ہے

۱۹۶۹ء

☆

ہم ہی آغازِ محبّت میں تھے، اَنجان بہت
ورنہ نکلے تھے ترے وصل کے عُنوان بہت

آئنہ خانۂ حیرت ہے کہ آسیب ہے وہ
آنکھ میں رہ کے بھی کرتا ہے پریشان بہت

دل بھی کیا چیز ہے اَب پا کے اُسے سوچتا ہے
کیا اِسی واسطے چھانے تھے بیا بان بہت

اے غمِ عشق، مِری آنکھ کو پتّھر کردے
ہیں مِرے سر پہ ترے اور بھی احسان بہت

فاصلے راہِ تعلق کے مٹیں گے کیوں کر
حسن پابندِ اَنا، عِشق تن آسان بہت

اس کو بھی لگ ہی گئی شہرِ محبت کی ہَوا
وہ بھی امجؔد ہے کئی دن سے پریشان بہت

☆

خواب نگر ہے آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہُوں
اُس کو اپنی جانب آتے دیکھ رہا ہُوں

کس کی آہٹ قریہ قریہ پھیل رہی ہے
دیواروں کے رنگ بدلتے دیکھ رہا ہُوں

کون مِرے جادو سے بچ کر جاسکتا ہے!
آئینہ ہُوں، سب کے چہرے دیکھ رہا ہُوں

دروازے پر تیز ہَواؤں کا پہرا ہے
گھر کے اندر چُپ کے سائے دیکھ رہا ہُوں

جیسے میرا چہرہ میرے دُشمن کا ہو
آئینے میں خُود کو ایسے دیکھ رہا ہُوں

منظر منظر ویرانی نے جال تنے ہیں
گلشن گلشن بِکھرے پتّے دیکھ رہا ہُوں

منزل منزل ہَول میں ڈُوبی آوازیں ہیں
رستہ رستہ خوف کے پہرے دیکھ رہا ہُوں

شہرِ سنگدلاں میں امجدؔ ہر رستے پر
آوازوں کے پتّھر چلتے دیکھ رہا ہُوں

۱۹۶۹ء

☆

(نذرِ غالب)

دیکھتا رہتا ہُوں مَیں جو کُچھ پریشانی کرے
فیصلے جب دل کے ہوں تو کیا ہُنر دانی کرے!

آنکھ میں منظر کا جالا، کان میں گردِ صَدا
دشت کا ماحول پیدا خانہ ویرانی کرے

آرزو خُود اپنے خُوں سے انجمن پرواز ہے
دل بھر قیمت فروغِ جلوۂ سامانی کرے

ایک تو اس کی نگاہوں نے کیا بے دست و پا
اس پہ مشکل کہ اپنا دل بھی من مانی کرے

سامنے آیا ہے تو میرے رگ وپے میں اُتر

میں تو آئینہ نہیں جو صرف حیرانی کرے

کیا کہوں امجدؔ ہوائے ضطراب دید کو
دشتِ دل کو ایک پَل میں شنبمستانی کرے

www.HallaGulla.com

☆

ہر قدم گریزاں تھا، ہر نظر میں وحشت تھی
مصلحت پرستوں کی رہبری قیامت تھی

منزل تمنّا تک کون ساتھ دیتا ہے!
گردِ سعیِ لا حاصل ہر سفر کی قِسمت تھی

آپ ہی بگڑتا تھا، آپ من بھی جاتا تھا
اس گریز پہلو کی یہ عجیب عادت تھی

اُس نے حال پُوچھا تو یاد ہی نہ آتا تھا
کِس کو کِس سے شکوہ تھا، کس سے کیا شکایت تھی!

Virtual Home for Real People

دشت میں ہَواؤں کی بے رُخی نے مارا ہے
شہر میں زمانے کی پُوچھ گچھ سے وحشت تھی

یُوں تو دن دہاڑے بھی لوگ لُوٹ لیتے ہیں
لیکن اُن نِگاہوں کی اور ہی سیاست تھی

ہجر کا زمانہ بھی کیا غضب زمانہ تھا
آنکھ میں سمندر تھا، دھیان میں وہ صُورت تھی

۱۹۶۹ء

☆

کون سی منزل پہ لے آئی اکائی ذات کی
ٹوٹ جاؤں گا اگر میں نے کسی سے بات کی

ٹوٹتی کلیوں کے ماتم میں ہَوا روتی رہی
پُھول کے چہرے پہ لکھی ہے کہانی رات کی

ڈس گئیں میرے بدن کو رینگتی تنہائیاں
کھا گئیں اس کو بلائیں گردشِ حالات کی

بند ہے آنکھوں میں منظر اس کے جاتے وقت کا
نقش ہے تصویر دل پر کپکپاتے ہاتھ کی

خامشی گویا ہُوئی، منظر زبانیں بن گئے
کب مُجھے کُچھ ہوش تھا کب اُس نے کوئی بات کی!

۱۹۶۸ء

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

☆

دامِ خُوشبُو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی اُلجھن میں پڑا ہے کب سے

اے کڑی چُپ کے در و بام سجانے والے!
منتظر کوئی سرِ کوہ ندا ہے کب سے

چاند بھی میری طرح حُسن شناسا نِکلا
اُس کی دیوار پہ حیران کھڑا کب سے

بات کرتا ہُوں تو لفظوں سے مہک آتی ہے
کوئی انفاس کے پردے میں چُھپا ہے کب سے

شعبدہ بازئ آئینۂ احساس نہ پُوچھ
حیرتِ چشم وہی شوخ قبا ہے کب سے

دیکھیئے خُون کی برسات کہاں ہوتی ہے!
شہر پر چھائی ہُوئی سُرخ گھٹا ہے کب سے

کور چشموں کے لیے آئنہ خانہ معلوم!
ورنہ ہر ذرّہ تر عکس نما ہے کب سے

کھوج میں کِس کی بھر شہر لگا ہے امجدؔ
ڈھونڈتی کِس کو سرِ دشت ہَوا ہے کب سے!

۱۹۶۸ء

http://www.hallagulla.com/urdu/

☆

رات میں اس کشمکش میں ایک پَل سویا نہیں
کل میں جب جانے لگا تو اُس نے کیوں روکا نہیں

یوں اگر سوچوں تو اِک اِک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرہ کہ پھر بھی آنکھ میں بنتا نہیں

کیوں اُڑاتی پھر رہی ہے در بدر مُجھکو ہَوا
میں اگر اِک شاخ سے ٹوٹا ہُوا پتّا نہیں!

درد کا رستہ ہے یا ہے ساعتِ روزِ حساب
سینکروں لوگوں کو روکا ایک بھی ٹھرا نہیں

شبنمی آنکھوں کے جگنو، کانپتے ہونٹوں کے پھُول
ایک لمحہ تھا جو امجدؔ آج تک گُزرا نہیں

۱۹۶۶ء

☆

بند تھا دروازہ بھی اور گھر میں بھی تنہا تھا میں
تُونے کُچھ مُجھ سے کہا یا آپ ہی بولا تھا میں؟

یاد ہے اب تک مجھے وہ بد حواسی کا سماں
تیرے پہلے خط کو گھنٹوں چُومتا رہتا تھا میں

http://www.hallagulla.com/urdu/

میری اُنگلی پر ہیں اب تک میرے دانتوں کے نشاں
خواب ہی لگتا ہے پھر بھی جس جگہ بیٹھا تھا میں

راستوں میں تیرگی کی یہ فراوانی نہ تھی
اس سے پہلے بھی تمھارے شہر میں آیا تھا میں

آج امجدؔ خواب ہے میرے لیے جس کا خیال
کل اُسی کا ہاتھ تھامے گھومتا پھرتا تھا میں

☆

سکوں محال ہے امجدؔ وفا کے رستے میں
کبھی چراغ جلے ہیں ہَوا کے رستے میں ؟

نجانے اَب کے برس کھیتیوں پہ کیا گُزرے!
کئی پہاڑ کھڑے ہیں گھٹا کے رستے میں

قدم قدم پہ قدم لڑ کھڑائے جاتے ہیں
بُتوں کے ڈھیر لگے ہیں خُدا کے رستے میں

جہانِ نو کو شعُورِ مُسافرت دیں گے
ہم اپنے خُون سے شمعیں جلا کے رستے میں

دیارِ اہلِ محبّت میں کِس دی آواز
ہزار ساز بجے ہیں صدا کے رستے میں

سوائے دردِ محبت، بجُز غبار سَفر
کوئی رفیق نہ پایا وفا کے رستے میں

۱۹۶۶ء

☆

میں اَزل کی شاخ سے ٹوٹا ہُوا
پھر رہا ہُوں آج تک بھٹکا ہُوا

دیکھتا رہتا ہے مُجھ کو رات دِن
کوئی اپنے تخت پر بیٹھا ہُوا

چاند تارے دُور پیچھے رہ گئے
میں کہاں پر آگیا اُڑتا ہُوا

بند کھڑکی سے ہَوا آتی رہی
ایک شیشہ تھا کہیں ٹوٹا ہُوا

کھڑکیوں میں، کاغذوں میں، میز پر
سارے کمرے میں ہے وہ پَھیلا ہُوا

اپنے ماضی کا سمندر چھانیئے
اِک خزانہ ہے یہاں ڈوبا ہُوا

http://www.hallagulla.com/urdu/

دوستوں نے کُچھ سبق ایسے دیئے
اپنے سائے سے بھی ہُوں سہا ہُوا

کِس کی آہٹ آتے آتے رُک گئی
کس نے میرا سانس ہے روکا ہُوا؟

۱۹۶۵ء

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

http://www.pakistanconnections.com/ebooks

سپنے کیسے باتیں کریں

(شاعری)

امجد اسلام امجدؔ

امجد اسلام امجد

پیش لفظ

''آنکھوں میں ترے سپنے'' اور ''سپنے بات نہیں کرتے'' کے بعد گیتوں کا تیسرا مجموعہ ''سپنے کیسے بات کریں'' نذر قارئین ہے۔ تینوں مجموعوں کے ناموں میں لفظ سپنے کی تکرار پتہ نہیں آپ کو کیسی لگے مجھے تو اچھی لگ رہی ہے کہ گیت کی نزاکت غنائیت جذباتی وفور اور احساس کی ترنگ سب کا ایک اندرونی ربط اور تعلق سپنوں اور خوابوں کے ساتھ ایسا ہے کہ میرا جی اس استعارے کو بار دوہرانے کو چاہتا ہے۔

اس مجموعے میں بھی حسب سابق چند موضوعاتی گیت شامل ہیں لیکن اس بار ان کی تعداد نسبتاً کم ہے جب کہ پنجابی گیت صرف ایک ہی ہے۔ پہلے دونوں مجموعوں کے ایک سے زیادہ بار چھپنے کی وجہ سے اس بات پر تو میرا یقین راسخ ہو گیا ہے کہ ان گیتوں کے قارئین کی ایک معقول تعداد معاشرے میں موجود ہے لیکن یہ ابھی تک طے نہیں ہو پایا کہ گیت کے لئے زبان کا کون سا روپ زیادہ پسندیدہ ہے۔

سو میں نے حسب ضرورت تینوں ہی انداز برتے اور استعمال کئے ہیں میرا خیال ہے کہ ان سب کے باہمی اشتراک اور انٹر ایکشن سے ہی جدید اردو گیت کا کوئی نیا اور واضح اسلوب متعین ہو گا۔

میں نے ان گیتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے پہلے حصے میں عمومی گیت ہیں اور دوسرے حصے میں وہ گیت ہیں جو کسی باقاعدہ موضوع کے حوالے سے لکھے گئے ہیں' میری کوشش یہی رہی ہے کہ ان گیتوں کو بھی ''موضوعیت'' کا اس حد تک تابع نہ بنایا جائے کہ یہ گیت سے زیادہ اصلاحی وضاحتی لیکچر یا نعرہ بن جائیں میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں اس کا آخری فیصلہ بہرحال آپ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

پاگل ہوئی ہے شام

پاگل ہوئی ہے شام
سن کر یہ کس کا نام
لمحے ٹھہر گئے ہیں
رنگوں سے بھر گئے ہیں
خالی تھے جو دریچے
سونے تھے جتنے بام
پاگل ہوئی ہے شام

اک شعلہ زار حسن کے عکس جمال سے
آنکھیں جھپک جھپک سی گئیں روشنی کے بیچ
چہرے چمک چمک اٹھے اس کے خیال سے!

پاگل ہوئی ہے شام
سن کر یہ کس کا نام

جو بندگان عشق ہیں ان کا خدا ہے حسن
جس سے ملی نگاہ اسے چپ سی لگ گئی
پانی میں جس سے آگ لگے وہ بلا ہے حسن

پاگل ہوئی ہے شام
سن کر یہ کس کا نام

کھلنے پہ آئے پھول تو کھلتے چلے گئے
اس ماہتاب حسن کے آنے کی دیر تھی
تارے مرے نصیب کے ملتے چلے گئے

سن کر یہ کس کا نام!
پاگل ہوئی ہے شام

آؤ کہیں چلیں

خوشبو کا ہاتھ تھام کے آیا ہے در پہ کون!
سن کر صدا بہار کی رہتا ہے گھر پہ کون
آؤ کہیں چلیں

ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے آؤ کہیں چلیں
آؤ کہیں چلیں!

سود و زیان دہر کے قصوں کو بھول کر
موسم کی وصل تان پہ لہرائیں جھوم کر
قربت کے گل چنیں
آؤ کہیں چلیں

موج صبا کے کان میں شبنم نے کیا کہا!
گاتی پھرے ہے شام کے ساحل پہ کیا ہوا!
اس کی صدا سنیں
آؤ کہیں چلیں

ہر پل پھسلتی ریت کی صورت ہے ہاتھ میں

عمریں شہید ہوتی ہیں چھوٹی سی بات میں
خوشیاں سمیٹ لیں
آ ؤ کہیں چلیں
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے آ ؤ کہیں چلیں
آ ؤ کہیں چلیں

جب آنکھیں بات کریں

جب آنکھیں بات کریں
سارے لفظ کتابوں والے بے معنی ہو جائیں
موسم اپنا رستہ بھولیں' آوازیں کھو جائیں
دن کو رات کریں
جب آنکھیں بات کریں

دنیا پیچھے ہٹ جاتی ہے رستہ دینے کو
وقت کا دریا رک جاتا ہے سن گن لینے کو
ایسی گھات کریں
جب آنکھیں بات کریں

سناٹے کے خالی پن کو رنگوں سے بھر دیں
خوشبو کے لہجے میں بولیں' دیوانہ کر دیں
اور ہاتھوں ہاتھ کریں
جب آنکھیں بات کریں

◆◆◆

تاروں کے رتھ پہ چاند

تاروں کے رتھ پہ چاند چلا شام آ گئی
آنگن سے لے کے روح تک جلنے لگے دیئے
کیسی حسیں خبر یہ مرے نام آ گئی

اہل وفا کے پاؤں کی زنجیر کھل گئی
اک ابر اعتبار سے ہر چیز ڈھل گئی
تقدیر آپ چل کے سر بام آ گئی
کیسی حسیں خبریہ مرے نام آ گئی

شبنم نے جھک کے پھول کے کانوں میں کچھ کہا
موج صبا کو جیسے کوئی کھیل مل گیا
پردے میں تھی جو بات سر عام آ گئی
کیسی حسیں خبر یہ مرے نام آ گئی

شعلہ سا ایک شخص جو لگتا ہے دور سے
چھونے سے اس کو ہاتھ میں جگنو مچل اٹھے
چھوٹی سی ایک بھول مرے کام آ گئی
کیسی حسیں خبر یہ مرے نام آ گئی
تاروں کے رتھ پہ چاند چلا شام آ گئی

◆◆◆

بھولی ہوئی اک یاد

بھوئی ہوئی اک یاد
دھیان میں آئی ہے
کتنے دنوں کے بعد
بھولی ہوئی اک یاد

اک اڑتی خوشبو میں
دو نین نشیلے تھے
کاجل کے جادو میں
ہر الجھن سے آزاد
بھولی ہوئی اک یاد
دھیان میں آئی ہے
کتنے دنوں کے بعد

اک دستہ پھولوں کا
پھیلا ہے دور تلک
روشن اور آباد
بھولی ہوئی اک یاد
دھیان میں آئی ہے

کتنے دنوں کے بعد
عمروں کے وعدے تھے
کیا روشن قسمیں تھیں!
کیا شوخ ارادے تھے
جو پل میں ہوئے برباد
بھول ہوئی ایک یاد
دھیان میں آئی ہے
کتنے دنوں کے بعد

◆◆◆

راتوں سی زلفوں میں

راتوں سی زلفوں میں صبحوں سا چہرا
لگا جس پہ رہتا ہے آنکھوں کا پہرا

اور آنکھوں میں کاجل ہے، کاجل میں جانے ہے کیا!
میری نگاہوں میں بس تو ہی تو ہے ترے دل میں جانے ہے کیا!

مے کے سمندر میں بہتے یہ لمحے
کہیں جا کے رکتے تو ہوں گے
ہو کیسا بھی بے آب وصحرا، یہ بادل
کبھی اس پہ جھکتے تو ہوں گے

رستوں میں ہے منزل میں جانے ہے کیا
میری نگاہوں میں بس تو ہی تو ہے ترے دل میں جانے ہے کیا

کہیں ہے وہ خوشبو کہیں ہے وہ سایا
کہیں پھول کی پنکھڑی ہے
جو لہرا کے اٹھے تو لگتا ہے ایسے
قیامت سی سر پہ کھڑی ہے

عجب رنگ محفل ہے پائل میں جانے ہے کیا
میری نگاہوں میں بس تو ہی تو ہے' ترے دل میں جانے ہے کیا!

◆◆◆

خواب سہانے

خواب سہانے ہو جاتے ہیں
غم بیگانے ہو جاتے ہیں
راتیں پاگل کر دیتی ہیں
دن دیوانے ہوجاتے ہیں

ہر اک چیز بدل جاتی ہے عشق کا موسم آتے ہی
آہٹ خوشبو بن جاتی ہے ایک اشارہ پاتے ہی

بن جاتا ہے شمع کوئی
کچھ پروانے ہو جاتے ہیں
خواب سہانے ہو جاتے ہیں

سارا کام محبت والا دل کا دل سے ہوتا ہے
شبنم سے سورج کا رشتہ پل دو پل کا ہوتا ہے

اک لمحے کی اوٹ میں اوجھل
لاکھ زمانے ہو جاتے ہیں
خواب سہانے ہوجاتے ہیں

پیار کا دن وہ دن ہے ساجن جس کی کوئی رات نہیں
پیار کے پہلے بول سے سندر جگ میں کوئی بات نہیں

کھوٹ کہیں پر آ جائے تو
دل ویرانے ہو جاتے ہیں!
غم بے گانے ہو جاتے ہیں
راتیں پاگل کر دیتی ہیں
دن دیوانے ہو جاتے ہیں

◆◆◆

میں تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں

میں تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں
دھیان کی سیڑھیوں پہ ساری رات
لے کے ہاتھوں میں تیرے درد کا ہاتھ
چپکے چپکے بکھرتا رہتا ہوں
میں تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں
طاق سے گرتے آئینے کی طرح
اک چھنا کے سے ٹوٹتا ہے دل
خاک سے ریزہ ریزہ چن چن کر
خود کو پھر سے سمیٹتا ہے دل
ڈوبتے ٹوٹتے ستاروں میں
کوئی پیغام پڑھتا رہتا ہوں
میں تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں
روشنی سی کوئی فضا میں تھی
میں یہ سمجھا کہ تم چلے آئے
چاند نکلا تو دل کی وادی میں
کیسے کیسے خیال لہرائے
جب وہ خوشبو کہیں نہیں ملتی
اپنے سائے سے لڑتا رہتا ہوں

میں تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں
دھیان کی سیڑھیوں پہ ساری رات
میں تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں

◆◆◆

تنہا تنہا دل ہے

تنہا تنہا دل ہے
تاروں کی جھل مل ہے
ہر سو تیری یادیں
دور کہیں ساحل ہے

چاروں جانب پھیل رہی ہے خاموشی کی گونج
نیلی اور بے مہر فضا میں دل ہے تنہا گونج

وقت بہت مشکل ہے
تنہا تنہا دل ہے
تاروں کی جھلمل ہے

تم آؤ تو پھر سے مہکیں بن میں سرخ گلاب
رستوں کو آباد کرے وہ خوشبو جیسا خواب

جو میری منزل ہے
تنہا تنہا دل ہے
تاروں کی جھلمل ہے

ہر سو تیری یادیں
دور کہیں ساحل ہے

◆◆◆

وقت گزر جاتا ہے

وقت گزر جاتا ہے
رستہ رستہ بکھری
آنکھیں رہ جاتی ہیں
وقت گذر جاتا ہے
شمع گھل جاتی ہے' خواہش رل جاتی ہے
پیار ترازو میں
ایک نظر بدلے' دنیا تل جاتی ہے
مٹی میں الجھی
یادیں رہ جاتی ہیں
سیلاب اتر جاتا ہے
وقت گذر جاتا ہے
سنگت بیلوں کی پیار کے کھیلوں کی
لوگ بدلنے سے
اک آن نہیں گھٹتی یہ رونق میلوں کی
تنہا تنہا بجھتی
شمعیں رہ جاتی ہیں
اور شعلہ مر جاتا ہے
وقت گذر جاتا ہے۔

◆◆◆

سن کے موسم کی دھن

سن کے موسم کی دھن شام پاگل ہوئی
ہونٹ پیاسے ہوئے، آنکھ بے کل ہوئی
کیسی الجھن بنی، کیسی مشکل ہوئی
سن کے موسم کی دھن شام پاگل ہوئی

رات ہی رات میں، بات ہی بات میں
پھول سے ہاتھ میں، چاند سوغات میں
حسن کی گھات میں اک ملاقات میں
جگنوؤں کے دیئے جل اٹھے رات میں
سانس بوجھل ہوئی شام پاگل ہوئی
سن کے موسم کی دھن شام پاگل ہوئی
ہونٹ پیاسے ہوئے آنکھ بے کل ہوئی

جاگی سرگوشیاں، خود فراموشیاں
پھیلتی کہکشاں چاندنی کا دھواں
راستے گلفشاں، آرزو نوجواں
دل میں چلنے لگیں کیسی یہ آندھیاں
کیسی ہل چل ہوئی شام پاگل ہوئی
سن کے موسم کی دھن شام پاگل ہوئی

◆◆◆

کیسے کہہ دیں تجھے الوداع

کیسے کہہ دیں تجھے الواداع
یہ ستاروں بھرا آسماں یہ زمیں
چاند سے بھی حسیں
یہ فضا یہ گھٹا' گنگناتی ہوا
کہہ رہے ہیں' نہ جا
کیسے کہہ دیں تجھے الوداع

تتلیوں کے پروں پر دھنک رنگ ہیں
جتنے پنچھی ہیں اتنے ہی آہنگ ہیں

رک کے سن تو ذرا
خوشبوؤں کی صدا
کیسے کہہ دیں تجھے الوداع!

رات خاموش ہے بولتا ہے سماں
ایک ہی خواب ہے' چار جانب رواں

پھول ہی پھول ہیں

راستہ   راستہ

کیسے   کہہ   دیں   تجھے   الوداع

◆◆◆

خوشبو تو پتہ لے جائے گی

خوشبو تو پتہ لے جائے گی
خدشوں کو ہوا شبنم کو ضیا
پھولوں کو صبا لے جائے گی
خوشبو تو پتہ لے جائے گی

تم لاکھ چھپو پردوں میں رہو
نیندوں میں بسو خوابوں میں بہو
خاموش رہو اور کچھ نہ کہو
ہر سنگ ہٹا، ہر رنگ مٹا
ہر روگ گرا، لے جائے گی
خوشبو تو پتہ لے جائے گی

اے یار تری محفل کی طرف
رنگوں سے بھرے محمل کی طرف
ساحل کی طرف منزل کی طرف
چوڑی کی کھنک گجرے کی مہک
ہاتھوں کی حنا، لے جائے گی
خوشبو تو پتہ لے جائے گی

یہ خواب نگر، گلرنگ فضا
یہ صوت و صدا، یہ رنگ و غنا
یہ چارہ گری، یہ دست دعا
یہ حسن ترا، یہ عشق مرا
ہر چیز ہوا لے جائے گی
خوشبو تو پتہ لے جائے گی

◆◆◆

یونہی چلتے ہوئے

یونہی چلتے ہوئے راستوں میں کئی
ہم سفر جو ملے اور بچھڑتے گئے
نہ کبھی میں نے پھر مڑ کے دیکھا انہیں اور نہ سوچا کبھی
وہ کہاں کھو گئے
جو گئے' سو گئے
پھر یہ کیسے ہوا

یونہی اک اجنبی' دل میں اترا نظر میں سما سا گیا
اور دھنک رنگ جذبے سجا سا گیا!
جیسے بادل کوئی بے ارادہ یونہی
میری چھت پہ رکا اور برسے بنا' اس پہ ٹھہرا رہا
کیا تماشا ہوا' سامنے تھی ندی
اور کوئی تشنہ لب اس کو تکتا گیا اور پیاسا رہا۔
یونہی چلتے ہوئے
ایک لمحے میں سمٹے گی یہ داستاں
کس کو معلوم تھا؟
تم ملو گے مجھے اس طرح بے گماں
کس کو معلوم تھا!

کس کو معلوم تھا!

کس کو معلوم تھا

سادہ سے اک چہرے پر

سادہ سے اک چہرے پر کیا جادوگری آنکھیں ہیں
جو دیکھے ان کا ہو جائے
جو ڈوبے وہ تھاہ نہ پائے
کتنے سپنے جاگ رہے ہیں
ان پلکوں کے سائے سائے!
شمع سحری چارہ گری' نامہ بری آنکھیں ہیں
سادہ سے اک چہرے پر کیا جادوگری آنکھیں ہیں

انجانی' پہچانی بھی
اپنی اور بیگانی بھی
ایک ہی منظر کا حصہ ہیں
عکس بھی اور حیرانی بھی!
ساحل جیسی لگتی ہیں وہ اور بھنور سی آنکھیں ہیں
سادہ سے اک چہرے پر کیا جادوگری آنکھیں ہیں

◆◆◆

عشق کی پیشی بھگتن کارن

عشق کی پیشی بھگتن کارن نیناں کیے وکیل
نہ کوئی ساتھ گواہی اپنے نہ کوئی پاس دلیل
جو بھی ہو انجام اور ساجن، جو بھی ہو انجام
چھوڑ دی ہم نے جیون تختی لکھ کر تیرا نام

او ساجن جو بھی ہو انجام
اب جو بھی ہو انجام

رانجھن یار کو دیکھ کے جائیں ہیریں رستہ بھول
تتلی کی رہ بھنورے دیکھیں، خوشبو ڈھونڈے پھول

ہم کو تجھ سے کام او ساجن
ہم کو تجھ سے کام
اب جو بھی ہو انجام او ساجن
جو بھی ہو انجام!
تیری آنکھ سے گر جائیں تو سارے خواب! سراب
قسمت ایک پہیلی جس کا تیرے نین جواب

تجھ سے ہر انعام او ساجن
تجھ سے ہر انعام
چھوڑ دی ہم نے جیون تختی لکھ کر تیرا نام
اب جو بھی ہوا انجام

◆◆◆

آنکھوں میں جاگے ہیں

آنکھوں میں جاگے ہیں کیا سپنے رنگوں کے
پھر پاس بلاتے ہیں، کچھ موسم ان دیکھے

دل ہاتھ سے نکلا جائے
اس تیز ہوا میں تو
ہم سے نہ سنبھلا جائے

سانسوں میں میلے ہیں بے چین امنگوں کے
پھر پاس بلاتے ہیں کچھ موسم ان دیکھے
آنکھوں میں جاگے ہیں، کیا سپنے رنگوں کے!

مانا کہ کہانی ہے
ایسے نہ گنوا اس کو
بس ایک جوانی ہے

اے یار ہمیں دے دے دکھ اپنی آنکھوں کے
پھر پاس بلاتے ہیں کچھ موسم ان دیکھے
آنکھوں میں جاگے ہیں، کیا سپنے رنگوں کے

کیوں بیچ پڑے تیجا
آپس کی باتوں میں
کیا کام ہے دنیا کا!

یہ کھیل ہے الفت کا، یہ روپ ہیں جذبوں کے
پھر پاس بلاتے ہیں کچھ موسم ان دیکھے
آنکھوں میں جاگے ہیں، کیا سپنے رنگوں کے!

◆◆◆

آنکھوں آنکھوں میں ہوئی بات

آنکھوں آنکھوں میں ہوئی بات کی خوشبو جو چلی
جانے کب صبح ہوئی جانے کب رات ڈھلی

اس نے کانوں میں مرا نام لیا' آہستہ
روح میں جیسے کوئی پھول کھلا آہستہ
سینکڑوں رنگ سجی دل کی ایک ایک گلی
آنکھوں آنکھوں میں ہوئی بات کی خوشبو جو چلی
جانے کب صبح ہوئی جانے کب رات ڈھلی

چاند نے جھک کے' ستاروں نے پلٹ کر دیکھا
شام نے رات کے گھونگھٹ کو الٹ کر دیکھا
روشنی دل میں ہوئی' آنکھ میں شمع جلی
آنکھوں آنکھوں میں ہوئی بات کی خوشبو جو چلی
جانے کب صبح ہوئی' جانے کب رات ڈھلی!

ہونٹ سیراب ہوئے پیاس کا موسم بدلا
دیکھتے دیکھتے احساس کا عالم بدلا
لمس کی دھوپ سے جاگی کسی خواہش کی کلی

آنکھوں آنکھوں میں ہوئی بات کی خوشبو جو چلی
جانے کب صبح ہوئی جانے کب رات ڈھلی

◆◆◆

مرے چارہ گر

مرے چارہ گر
مرے درد کی تجھے کیا خبر!
تو مرے سفر کا شریک ہے
نہیں ہم سفر
مرے چارہ گر مرے چارہ گر
تیرے ہاتھ سے مرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے اسے کاٹتے
مرا سارا وقت نکل گیا
نہیں جس پہ کوئی نشان پا
مرے سامنے ہے وہ رہگذر
مرے چارہ گر
مرے درد کی تجھے کیا خبر!
یہ جو ریگ دشت فراق ہے
مرے راستوں میں بچھی ہوئی
کسی موڑ پر یہ رکے کہیں
یہ جو رات ہے مرے چار سو

مگر اس کی کوئی سحر نہیں!
نہ ہی چھاؤں ہے نہ ثمر کوئی
میں نے چھان دیکھا شجر شجر
مرے چارہ گر
مرے درد کی تجھے کیا خبر!

ابھی سوچ لے

ابھی سوچ لے
ہاں ابھی سوچ لے
جتنے خدشے مرے ساتھ چلنے میں ہیں
جتنے خطرے محبت کے رستے میں ہیں
سب کو خاطر میں لا سب کو پہچان لے
ہاں ابھی سوچ لے!
وقت کے لے بدلتے ہوئے ساز میں
زندگی کے سفر کی تگ و تاز میں
جانے یہ مرحلہ پھر ملے نہ ملے
بیت جائے جو لمحہ پلٹتا نہیں
لوٹنے کا یہاں کوئی رستہ نہیں
پھر نہ کرنا کبھی کوئی شکوے گلے
ہاں ابھی وقت ہے
ہاں ابھی سوچ لے

◆◆◆

گوری چلو ساتھ چلیں

گوری چلو ساتھ چلیں
جیون کا رستہ ہے دھوپ چھاؤں
ہم ہیں مسافر تیرا ہے گاؤں
گوری چلو ساتھ چلیں
گوری چلو ساتھ چلیں
تیری گلی میں آئے تھے ہم تو
درشن کے پیاسے
اک ہی جھلک سے بھر دے ہمارے
نینوں کے کاسے
جاتے ہیں تیرے کوئے وفا سے
گوری چلو ساتھ چلیں

بستا رہے تیرا شہر جوانی
سپنوں کا موسم
چلتی رہے تیری آشا کہانی
ایسے ہی ہر دم
ہوتی رہے تیرے آنگن میں رم جھم
گوری چلو ساتھ چلیں

◆◆◆

میرا پیا گھر آیا

لعل نی، میرا پیا گھر آیا، لعل نی
میرا پیا گھر آیا، مجھے اپنا بنایا میرا جیا لہرایا
جاگ اٹھے میرے بھاگ نی
میرا پیا گھر آیا

خوشبو بساؤں کبھی مہندی لگاؤں
پھولوں سے سارے گھر کو سجاؤں
نذریں اتاروں کبھی نذریں چڑھاؤں
یہ عشق ہے کیسی آگ نی
میرا پیا گھر آیا جاگ اٹھے میرے بھاگ نی

آ لے دوالے جا کے بانٹوں مٹھائی
آنگن میں خوشیوں کی بارات آئی
تارے ہنسے، چاندنی مسکرائی
رنگ ہوئے سب راگ نی
میرا پیا گھر آیا جاگ اٹھے میرے بھاگ نی

چوڑی ہنسے کبھی کنگنا بجے ہے

دھرتی پہ پاؤں نہ میرا پڑے ہے
چپکے سے کانوں میں کوئی کہے ہے
کہتا ہے کیا' سن کاگ نی
میرا پیا گھر آیا' جاگ اٹھے میرے بھاگ نی
میرا پیا گھر آیا۔
لعل نی. . . . .
میرا پیا گھر آیا مجھے اپنا بنایا
جاگ اٹھے مرے بھاگ نی
میرا پیا گھر آیا

◆◆◆

آجاو جان جاں

آجاو جان جاں
میرے دل کا جہاں
مانگے تیری خبر
ڈھونڈے تیرا نشاں
لاگی تم سے من کی لگن
لگن لاگی تم سے من کی لگن

گلی گلی کھوے
دل تجھے ڈھونڈے
تیرے بن ترسیں نینں
لگن لاگی تم سے من کی لگن
تیرا تجھ کو سوچتے کیا لاگت ہے مور
مورا مجھ میں کچھ نا ہیں جو ہووت سو تور
تیرے بن مورا من
جیسے بن میں ہرن
جیسے پگلی پون
لاگی تم سے من کی لگن
لگن لاگی تم سے من کی لگن

تیری پلکوں کے سائے تلے

تیری پلکوں کے سائے تلے
خواب جاگے تو جگنو سجے
رنگ مہکے تو خوشبو بنے
تو ہی توُ تو او ساجنا
تو ہی تو تو او ساجنا!
بادل بنوں اور اڑتا پھروں میں
تاروں سے تیری باتیں کروں میں
یوں ہوں تیرے مرے سلسلے
خواب جاگے تو جگنو سجے
رنگ مہکے تو خوشبو بنے
تو ہی توُ تو او ساجنا
باتوں سے تیری خوشبو جو آئے
آنکھوں میں خوشیوں کے میلے لگائے
اور مٹنے لگیں فاصلے
خواب جاگے تو جگنو سجے
رنگ مہکے تو خوشبو بنے
تو ہی توُ تو اوساجنا
تو ہی تو تو او ساجنا

◆◆◆

نیناں ترے مستی بھرے

نیناں ترے مستی بھرے جادو جگانے لگے

جذبے مچلتے ہیں

رنگوں میں ڈھلتے ہیں۔ نیندیں چرانے لگے

نیناں ترے مستی بھرے جادو جگانے لگے

دیکھا یہ تو نے کیسی نظر سے دل ہاتھ آتا نہیں

کرتا ہے باتیں دنیا جہاں کی اپنی سناتا نہیں

نظریں ملاتا نہیں

سانسیں الجھتی ہیں

امیدیں کھلتی ہیں۔ غم مسکرانے لگے

نیناں ترے مستی بھرے جادو جگانے لگے

شبنم نے پھولوں سے کیا بات کہہ دی' موسم سہانا ہوا

آہٹ جو تیری رستوں میں جاگی پاگل زمانہ ہوا

دل بھی دِوانہ ہوا

خوشبو کے گہنے جو

پھولوں نے پہنے تو بھنورے بھی گانے لگے

نیناں ترے مستی بھرے جادو جگانے لگے!

◆◆◆

مستی میں قلندر کی

مستی میں قلندر کی حیدر کا ہے جلوہ شامل
درویش کی ہر ہو میں حق اللہ کا نعرہ شامل
حق اللہ برحق اللہ' لاریب اللہ' بے شک اللہ

یہی ورد دعا دم ہے اک وجد کا عالم ہے
پرنور اجالے ہیں' خوشبو کے حوالے ہیں
''صورت نہ پرستم من' بت خانہ شکستم من
ہر عکس کے جلوے میں' یہ کس کا ہے چہرہ شامل
مستی میں قلندر کی حیدر کا ہے جلوہ شامل!

آواز کے رستے میں پرواز کے رستے میں
امید کا ساحل ہے' ہر خواب کی منزل ہے
اے طائر لا ہوتی اے عشق جفا پیشہ
جائیں تو کہاں جائیں ہم لوگ وفا پیشہ

محبوب کی بستی میں ہے کعبے کا نقشہ شامل
مستی میں قلندر کی حیدر کا ہے جلوہ شامل
سبحان تری قدرت' ہے چاروں طرف رحمت

کس ذکر کی مستی ہے، ہر چیز مہکتی ہے
اے ہمت مردانہ اک نعرۂ مستانہ
وہ ذکر حقیقت ہے ہر بات ہے افسانہ

ہر چیز کا مالک ہے، ہر چیز میں اللہ شامل
مستی میں قلندر کی حیدر کا ہے جلوہ شامل
درویش کی ہر ہو میں حق اللہ کا نعرہ شامل

◆◆◆

مرا خواب گنگنائے

مرا خواب گنگنائے مرا گیت لوٹ آئے
کسی شام ایک خوشبو مرے راستے سجائے
یہ جو چار سو تہی ہیں
انہی چلمنوں کے پیچھے کوئی چاند مسکرائے
مرا خواب گنگنائے
کسی آشنا گلی سے صبا ب جو ہو کے آئی
نہ کوئی خبر خوشی کی نہ کوئی پیام لائی
تھیں قدم قدم سے لپٹیں
کسی بے خبر کی یادیں، کسی آرزو کے سائے
مرا خواب مسکرائے
وہ جو کھو گیا زمانہ اسے ڈھونڈنا ہے مشکل
کہ جو تیر چل چکا ہوا سے روکنا ہے مشکل
وہی چند بیتے لمحے
میں جہاں جہاں گیا ہوں مرے ساتھ ساتھ آئے
مرا خواب مسکرائے مرا گیت لوٹ آئے
کسی شام ایک خوشبو مرے راستے سجائے

دیکھا سارا جہاں

دیکھا سارا جہاں تم ملو گے کہاں!
ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تو گم ہو گیا
اور تم ہو گیا
میں بھی تم ہو گیا
اس دھوئیں سے ادھر، اس دھند لکے کے پار
تتلیاں ہیں بہت، پھول ہیں بے شمار
بات کرتا ہے مٹی سے ابر رواں
دیکھا سارا جہاں، تم ملو گے کہاں!
آتے جاتے ہوئے، موسموں نے کہا
تم یہیں آؤ گے دھڑکنوں نے کہا
اور پھر دیر تک صرف میں تھا وہاں
دیکھا سارا جہاں، تم ملو گے کہاں
جس گھڑی دور مغرب میں سورج ڈھلا
ہر طرف ایک رنگوں کا میلہ لگا
اور خوشبو بنی روشنی کا نشاں
دیکھا سارا جہاں
تم ملو گے کہاں
ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تو گم ہو گیا

اور تم ہو گیا

میں بھی تم ہو گیا

پنچھی سا جیا مورا

پنچھی سا جیا مورا، پیا پیا چہکے
کلیوں میں ہلچل بھنورے ہیں بے کل
برسے بدروا اُترے ہے کاجل
آنکھوں میں جاگی سپنوں کی جھلمل
ان میں بھی آؤ کبھی دیکھو بجن رہ کے
پنچھی سا جیا مورا، پیا پیا چہکے
راتیں ہیں پگلی سی دن ہیں دوانے
پائل ستائے مجھے آنے بہانے
دیکھیں نہ لوگ کہیں اپنے بیگانے
تیرے ملن کو چلی سکھیوں کا طعن کہہ کے
پنچھی سا جیا مورا پیا پیا چہکے

گاؤ ہواؤ گاؤ

گاؤ ہواؤ گاؤ
کلیوں کو دو رنگ سہانے
پھولوں کو مہکاؤ
گاؤ ہواؤ گاؤ

الجھو ناگن سی زلفوں سے ہونٹوں کو چھولو
اس کے کانوں میں چپکے سے میرا حال کہو
منظر منظر روشن کردو گلی گلی چمکاؤ

گاؤ ہواؤ گاؤ
کلیوں کو دو رنگ سہانے
پھولوں کو مہکاؤ
گاؤ ہوا ؤ گاؤ

میری راتیں دکھ سے بوجھل میرے دن ویران
جب سے اس نے رستہ بدلا آنکھیں ہیں سنسان
میرے دل کو آشائیں دو نین جوت جگاؤ

دیس دیس میں پھرتی ہو تم
اس کو ڈھونڈ کے لاؤ
کلیوں کو دو رنگ سہانے
پھولوں کو مہکاؤ
جاؤ ہوا ؤ جاؤ

◆◆◆

تو میرا چت چور

تو میرا چت چور
او ساجن تو میرا چت چور
سدھ بدھ کھو کر
کملی ہو کر
دیکھوں تیری اور
او ساجن تو میرا چت چور

کیا کیا دھڑکا جی کو لاگے
پیار میں اب کیا ہوگا آگے
سورج پیچھے شبنم بھاگے
بن سیڑھی' بن ڈور
او ساجن! تو میرا چت چور
آنکھ کو پڑ گئی مشکل کیسی!
دھیان میں ایک ہی صورت رہتی
تن میں جاگی خوشبو کیسی
بن میں ناچے مور
او ساجن! تو میرا چت چور
تو میرا چت چور

◆◆◆

وارثان سحر

وارثان سحر

آؤ دیکھیں ذرا آ ؤ سوچیں ذرا

رات سے رات تک کے سفر میں کہاں

اپنے دن کھو گئے

وہ جو چاروں طرف پھول ہی پھول تھے

ریت کیوں ہو گئے!

بے ہنر کیوں ہوئے طالبان ہنر

وارثان سحر

سامنے ہے کھڑی فیصلے کی گھڑی

جانچیۓ، پرکھیۓ دیکھیۓ بھالیے

راستے منزلوں میں بدل جائیں گے

روشنی کے سفر کی بنا ڈالئے

آنے والے زمانوں پہ رکھے نظر

وارثان سحر

واپسی موسموں کا مقدر تو ہے

جو سماں بیت جائے پلٹتا نہیں

بے چلے کوئی منزل ملی ہے کے

صرف خواہش سے کچھ بھی بدلتا نہیں!

روشنی میں کریں روشنی کا سفر

وارثان سحر

آؤ دیکھیں ذرا آؤ سوچیں ذرا

ایسا نہیں کوئی دن

ایسا نہیں کوئی دن ایسی نہیں کوئی شام
اے پاک وطن تیرا
ہر ذرہ مقدس ہے ہر لمحہ ہے اک انعام

نہ ایسا کوئی موسم نہ ایسا کوئی گلشن
نہ ایسی کوئی خوشبو نہ ایسا کوئی آنگن
نہ پھول کوئی ایسا نہ خواب کوئی ایسا
نہ ایسی دعا کوئی نہ ایسا کوئی پیغام
ایسا نہیں کوئی دن ایسی نہیں کوئی شام
اے پاک وطن تیرا
ہر ذرہ مقدس ہے ہر لمحہ ہے اک انعام

آواز کے دامن میں، نہ ایسی صدا کوئی
الفاظ کی جھلمل میں، نہ ایسی ضیا کوئی
نہ کوئی زمیں ایسی، نہ کوئی حسیں ایسا
نہ ایسا کوئی تحفہ نہ ایسا کوئی اکرام
ایسا نہیں کوئی دن ایسی نہیں کوئی شام
اے پاک وطن تیرا
ہر ذرہ مقدس ہے ہر لمحہ ہے اک انعام

◆◆◆

بچوں کا گیت

اکڑ دکڑ بمبا بو
اسی نوے پورا سو
ایک سے لے کر سو کے اندر
سارے ہندسے آ جاتے ہیں
جتنے بھی اعداد ہیں سارے
اپنی منزل پا جاتے ہیں آ ؤ انہیں گن کر دیکھو اکڑ دکڑ بمبا بو
اسی نوے پورا سو
ضرب، جمع تقسیم کے کلئے
یا کوئی تفریقی گنجھل
عرض بلد یا طول بلد ہو
بستی بستی ساحل ساحل
ان کو ناپو دیکھو پرکھو
اکڑ دکڑ بمبا بو
اسی نوے پورا سو
دادا جی ہیں ساٹھ برس کے
منی پونے دو کی ہے
لندن سے لاہور ہے کتنا
کتنے میل کراچی ہے!

سب کے بارے میں جانو

اگر دکھ پہنچا ہو

اسی نوے پورا سو

بچوں کا گیت

پیاری سی اک بچی جس کا زبیدہ ہے نام
پھولوں جیسے ہاتھ میں اس کے
موتی جیسے دانت کرنوں جیسا لہجہ اس کا
خوشبو جیسی بات
ہنستی ہے تو چلتے چلتے رک جاتی ہے شام
پیاری سی اک بچی جس کا زبیدہ ہے نام
ڈیڑھ برس کی عمر ہے اس کی
گڑیا جیسا قد
خالہ ماموں پھپھو چاچو
سب ہیں خدمت مند
آدھے آدھے جملے اس کے پورا ہے پیغام
پیاری سی اک بچی جس کا زبیدہ ہے نام
دادا' دادی' نانا' نانی
سب کے دل کا چین
ماں پاپا کی جان ہیں اس کے
باتیں کرتے نین
اتری ہے وہ گھر میں جیسے اللہ کا انعام
پیاری سی اک بچی جس کا زبیدہ ہے نام

◆◆◆

خود انحصاری کا گیت

جو اپنے آپ پہ ہم انحصار کر لیں گی
ہر امتحان کے دریا کو پار کر لیں گے
خدا کے فضل سے اہل وطن کی ہمت سے
زیاں کو سود خزاں کو بہار کر لیں گے
جو اپنے آپ پہ ہم انحصار کر لیں گے
کشاں کشاں چلی آئے گی اس پہ خود منزل
جو راہ اہل وفا اختیار کر لیں گے
جو اپنے آپ پہ ہم انحصار کر لیں
وطن کی خاک کو سرمہ بنا کے آنکھوں کا
ہر ایک راہ کو منزل شعار کر لیں گی
جو اپنے آپ پہ ہم انحصار کر لیں گے
ہر امتحان کے دریا کو پار کر لیں گے

◆◆◆

خصوصی بچوں کے لیے ایک گیت

تھکی تھکی خالی آنکھوں کو خواب اک دیتے جائیں
دکھ سے بوجھل ان کاندھوں کا کچھ تو بوجھ گھٹائیں
تھکی تھکی خالی آنکھوں کو خواب اک دیتے جائیں
رات سیہ اور تیز ہوا ہے، اور سفر ہے عمروں کا
ایک دیا بجھنے سے روکیں، ایک چراغ جلائیں
تھکی تھکی خالی آنکھوں کو خواب اک دیتے جائیں
دکھ سے بوجھل ان کاندھوں کا کچھ تو بوجھ گھٹائیں
بس اک بول تسلی والا، ایک نظر سی الفت کی
بجھتے چہرے روشن کر دیں، راکھ میں پھول کھلائیں
تھکی تھکی خالی آنکھوں کو خواب اک دیتے جائیں۔
دکھ سے بوجھل ان کاندھوں کا کچھ تو بوجھ گھٹائیں

◆◆◆

خودانحصاری کا گیت

اپنی زمیں پر، اپنے سہارے جینے کے دن آئے ہیں
آسماں پر ساتھ ہمارے ابر کرم کے سائے ہیں

توڑ کے ہر کشکول گدائی
چھوڑ کے رسم زخم نمائی
قوم یہ اس منزل پر آئی

جس پر وقت نے رستہ رستہ پھول ہی پھول سجائے ہیں
اپنی زمیں پر اپنے سہارے جینے کے دن آئے ہیں

نصف صدی کے سپنے جاگے
ہر اک منظر اپنا لاگے

لب بستہ سی کھڑی ہے دنیا، حیرت میں ہمسائے ہیں
اپنی زمیں پر اپنے سہارے جینے کے دن آئے ہیں
جذبوں کی یلغار مبارک
رشتوں کی مہکار مبارک
سب کو سو سو بار مبارک

نئی صدی کے روشن لمحے یہی سندیسے لائے ہیں
اپنی زمیں پر اپنے سہارے جینے کے دن آئے ہیں
آسماں پر ساتھ ہمارے ابر کرم کے سائے ہیں

◆◆◆

اسلامی کانفرنس کا خصوصی گیت

آئینوں میں یہ جتنے چہرے ہیں
عکس تیرے ہیں، عکس میرے ہیں
اتنے پتھر اگر بہم ہو جائیں!
رفعت کوہ آسمان لگے
اتنے ذرے اگر ہوں جمع کہیں!
وسعت دشت بے نشاں لگے
اتنے تارے اگر چمکتے ہوں!
ظرف خورشید اک چراغ لگے
اتنے غنچے اگر مہکتے ہوں!
موسم زرد بے سراغ لگے
نیل سے تابہ کا شغر دیکھو
ایک ہی روشنی کے گھیرے ہیں
سب مسافر ہیں ایک رستے کے
ایک منزل پہ سب کو جانا ہے
اپنی اپنی حدوں میں رہتے ہوئے
اک نیا دائرہ بنانا ہے
روشنی جو حرا سے پھوٹی تھی
اس میں رہنا ہے، جگمگانا ہے

مسجد سے اٹھنے والی خوشبو کا
پھر سے اب منتظر زمانہ ہے
تارا تارا بکھرتے جائیں گے
جتنے سائے ہیں' جو اندھیرے ہیں
آئنوں میں یہ جتنے چہرے ہیں
عکس تیرے ہیں عکس میرے ہیں

◆◆◆

ورلڈکپ کا گیت

ہرے ہرے
دوہرائیں
چلو اک بار وہی کردار کہ دنیا جھوم اٹھے
دکھلائیں
چلو اک باڑ وہی معیار کہ دنیا جھوم اٹھے
دنیا کو دکھانا ہے
ہاں جان لڑا کر یہ
اعزاز بچانا ہے
دوہرائیں
چلو اک بار وہی کردار کہ دنیا جھوم اٹھے
دکھلائیں
چلو اک باڑ وہی معیار کہ دنیا جھوم اٹھے
ایسا کام کریں کہ جس میں قوم کی عزت ہو
اللہ اور نبی ﷺ کی ہم پر خاص عنائت ہو
یہی اقرار کریں سب یار
دوہرائیں
چلو اک باڑ وہی کردار کہ دنیا جھوم اٹھے
دکھائیں
چلو اک بار وہی معیار کہ دنیا جھوم اٹھے

◆◆◆

قومی گیت

اک امن کا دریا ہے اک پیار کا دھارا ہے
یہ سبز حسیں پرچم، ہمیں جان سے پیارا ہے

بہنوں کی امیدوں کا، ماؤں کی دعاؤں کا
ہمراہ ہمارے ہے اک سیل شعاعوں کا
سورج سے سوا روشن یہ چاند ستارا ہے
اک امن کا دریا ہے اک پیار کا دھارا ہے
یہ سبز حسیں پرچم ہمیں جان سے پیارا ہے

خوشبو میں بسائیں گے پھولوں سے سجا دیں گے
پرچم کی حفاظت میں ہم جان لڑا دیں گے
ہر شخص کے ہونٹوں پر اب ایک ہی نعرہ ہے
یہ سبز حسیں پرچم ہمیں جان سے پیارا ہے
اک امن کا دریا ہے اک پیار کا دھارا ہے

◆◆◆

خواندگی کا گیت

اے خدا اے خدا
روشنی ہو عطا
علم کی روشنی جس سے پیدا ہوئی
ہر کوئی روشنی
تو نے جو کچھ دیا
علم ہو تو کریں شکر اس کا ادا
اے خدا اے خدا

سب سے پہلی وحی
آپ کو جو ملی
اس کا عنوان بھی ایک ہی لفظ تھا اور وہ تھا ''پڑھو''
رب کا پیغام ہے سب کے ہی نام ہے علم حاصل کرو
علم ہے راہبر علم ہے رہنما
اے خدا اے خدا
روشنی ہو عطا
میرے رب نے کہا علم کے واسطے
اس زمیں پر جہاں تک بھی جانا پڑے
تم نہ ہرگز رکو

علم ہے زندگی علم ہے آگہی
سو بسو روشنی جا بجا روشنی
اے خدا روشنی اے خدا روشنی
روشنی روشنی روشنی روشنی

خواندگی دا گیت

اماں میتوں بستہ دے دے
ویلے میتوں رستہ دے دے
میں جاناں اسکول او سجنو میں جانا اسکول

کھرا تے کھوٹا سمجھن لئی
وڈا چھوٹا سمجھن لئی
اپنے حق نوں جانن لئی
اپنے فرض پچھانن لئی
میں جانا اسکول اور سجنو میں جانا اسکول
ویلے میتوں رستہ دے دے
اماں میتو بستہ دے دے

علم بنا ایہ جینا کجھ نا
ہنسنا کھانا پینا کجھ ناں
گھراں تے فصلاں دی شادابی
علم خزانے دی ہے چابی
میں جانا اسکول دے سجنو میں جانا اسکول
میں جانا اسکول نی سیو میں جانا اسکول

اماں میتھوں بستہ دے دے
ویلے میتھوں رستہ دے دے

◆◆◆

آزادی فلسطین کا گیت

یروشلم یروشلم

تری ہی سمت جائے گا اٹھے گا جو بھی اب قدم
لکھے گا خون گرم سے ترا ہی نام ہر قلم
مریں گے تیرے واسطے ترے لئے جئیں گے ہم

یروشلم یروشلم

پکارتے ہیں ہر گھڑی ترے جلے ہوئے چمن
ہمارے جسم و جاں میں ہے تیری ہی آگ شعلہ زن
تری ہوا سے اڑ گئی ہماری خوشبوئے بدن
ہیں آج تیری خاک پر غنیم کے سیہ قدم

یروشلم یروشلم

قسم خدا پاک کی ہے جب تلک بدن میں جاں
ہم اپنے خون سے لکھیں گے حریت کی داستاں
ہے اہل دل کا قافلہ تری طرف رواں دواں
یروشلم، تری قسم، جھکیں گے اب نہ یہ علم

یروشلم یروشلم

◆◆◆

ٹی وی سیریل "زمانہ" کے لئے

حال میں اپنے رہے
موج میں اپنی بہے
وقت سے کون کہے یار ذرا آہستہ

اپنی ہی دھن میں چلے
اپنے دل کی نہ کہے
دوسرے کی نہ سنے
اور خاموش رہے
وقت سے کون کہے' یار ذرا آہستہ

عمر کی لمبی ڈگر
اور تا حد نظر
کسی انہونی کا ڈر
ہست اور نیست کے مابین اگر
خواب کا پل نہ رہے
کچھ نہ رہے
وقت سے کون کہے یار ذرا آہستہ!

◆◆◆

اردو، پنجابی گیت

میں پتر پاکستان دا یہ دھرتی میری ماں
(ایدا ناں، میری جاں، میری جاں، ایدا ناں)
اور اپنی اس پہچان پہ میں لکھ لکھ شکر کراں

میرا لاچہ لشکاں ماردا
میری اجرک رنگ بھری
یہ لیوا میری جان ہے
اور مستی خیبر کی

دھڑکن سب کی ایک ہے اور سب کی ایک زباں
میں پتر پاکستان دا، یہ دھرتی میری ماں

میں چاکر شاہ لطیف دا
مرا مرشد بلھے شاہ
باہو کی ہر ہو میں نکلے
اک رحمانی راہ

جام درک تے میاں محمدؒ سچل شاہ حسین
غلام فرید سائیں کے ڈیرے برکت سکھ تے چین
گنج بخش کے فیض سے روشن بستی کھیت گراں

میں پتر پاکستان دا یہ دھرتی میری ماں
اور اپنی اس پہچان پہ میں لکھ لکھ شکر کراں

◆◆◆

کشمیر کے لیے خصوصی گیت

کشمیر یہ کہتا ہے
سب دیکھتی ہے، پھر بھی
سب جانتی ہے، پھر بھی
کس سوچ میں دنیا ہے!
کشمیر یہ کہتا ہے

اب خون کی سرخی ہے ہر پھول کے چہرے پر
بکھری ہوئی چیخیں ہیں، ٹوٹے ہوئے سہرے پر
اک ظلم کا سایا ہے، اک آگ کا دریا ہے
ہر شے پہ جو حاوی ہے، ہر راہ میں بہتا ہے

کشمیر یہ کہتا ہے
کس سوچ میں دنیا ہے

جو آنکھ بھی روشن ہو وہ آنکھ بجھا دی جائے
برباد کیا جائے اور راکھ اڑا دی جائے
ہر صبح ہے زندانی، ہر شام پہ پہرا ہے
اب رسم یہ جاری ہے قانون یہ ٹھہرا ہے

کشمیر یہ کہتا ہے
کس سوچ میں دنیا ہے!

◆◆◆

سپنے بات نہیں کرتے

امجد اسلام امجد

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سپنوں کی باتیں

"سپنے بات نہیں کرتے" میرے گیتوں کا دوسرا مجموعہ ہے پہلے مجموعے "آنکھوں میں تیرے سپنے" اور اس حالیہ کتاب کے عنوانات میں "سپنے" کا لفظ اگر مشترک ہے تو یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ "گیت" کی صنف کا بنیادی جوہر انسانوں کے خواب ہی تو ہیں ممکن ہے کسی محقق یا ناقد کو اس سے اختلاف ہو لیکن اختلاف تو لوگ مسلمات پر بھی کیا کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے نزدیک گیتوں میں پایا جانے والا دکھ' اداسی' احساس مجبوری و دوری اور ناسٹیلجیا بھی اصل میں خوابوں ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔

"آنکھوں میں تیرے سپنے" کی اشاعت کے وقت مجھے قطعا" اندازہ نہیں تھا کہ گیتوں کی قارئین کی سطح پر عمومی بے توجہی اور ان کی کتابی شکل میں تقریبا" غیر موجودگی کے باوجود انہیں اس قدر پسند کیاجائے گا کہ ایک ہی برس میں اس کا ایڈیشن ختم ہو جائے گا اور غالبا" یہی وہ حوصلہ افزائی ہے جس نے مجھے اس دوسرے مجموعے پر کام کرنے کے لئے اکسایا اور تیار کیا۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے گیت کا موسیقی اور گائیگی سے ایک ایسا تعلق ہے کہ تینوں کو علیحدہ علیحدہ کرکے دیکھنا بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے سو ان گیتوں کے ضمن میں بھی یہ بات زیر نظر رکھنا ہوگی کہ ان میں سے بیشتر گیت ٹی وی اور ریڈیو کے مختلف پروگراموں کے لئے لکھے گئے ہیں ان میں آپ کو ایک خاصی بڑی تعداد ایسے گیتوں کی ملے گی جو بچوں کے مختلف پروگراموں کے لئے لکھے گئے ہیں اسی طرح کچھ گیت مختلف قومی دنوں یا واقعات کے حوالے سے بھی ہیں لیکن کتاب کا غالب حصہ بہرحال انہی گیتوں پر
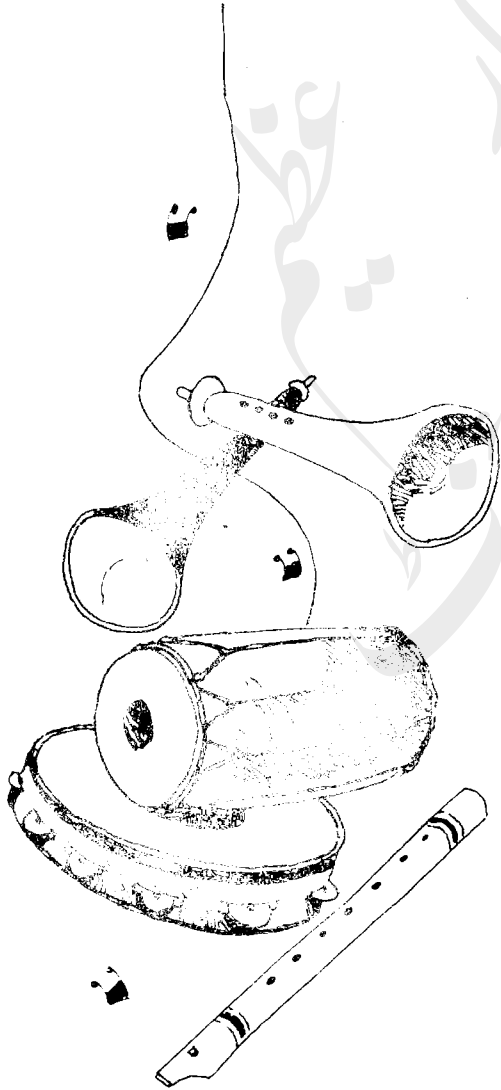
مشتمل ہے جن کا تعلق میرے اور آپ کے خوابوں اور سپنوں سے ہے بہت دنو
سے میں اس کوشش میں ہوں کہ گیت کے مروجہ اسلوب اور تکنیک سے ہٹ
کچھ تجربات کئے جائیں مثلاً" یورپی گیتوں کے انداز میں ایسے گیت بھی لکھے جائی
جن میں ایک مسلسل کہانی یا واقعہ یا صورت حال ہو اور تکنیکی طور پر بھی استھا
اور انترے کی بندشوں سے ہٹ کر لائنوں کو اس انداز میں ترتیب دیا جائے
بات سے بات نکلتی چلی جائے اور کسی موڑ پر رکاوٹ کا احساس نہ ہو نمونے
طور پر اس انداز کے دو گیت "یاد" اور "آنکھیں" کے زیر عنوان اس کتاب
شامل کئے گئے اور ارادہ ہے کہ اس طرح کے کچھ اور گیت بھی لکھوں کیونکہ
گیت" کی صنف میں یقیناً" ابھی بے شمار تجربات کی گنجائش ہے اس کتاب کے نا
اور میرے عزیز دوست چودھری نیاز نے حسب معمول اس کتاب کو صوری اعتب
سے خوشنما بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کتاب
اکثر گیت پسند آئیں گے اور یوں مجھے اس صنف میں لکھتے رہنے کے لئے تحریک م
رہے گی۔

امجد اسلام امجد

22 ممتاز سٹریٹ گڑھی شاہو - لاہور

11 جولائی 1994ء

گیت

آنکھیں

کیسے اتروں پار!
بادل بادل تیری آنکھیں' دریا دریا خواب
کیسے اتروں پار
چاروں جانب پھیل رہی ہے کاجل کی آواز
میرے دل کی ویرانی کو اس کی سندرتا سے بھر دے
مجھ پر اپنی پلکیں کر دے
آ جا مجھ کو پاگل کر دے
سندر آنکھوں والی نار!
کیسے اتروں پار!

ارض و سما کے رنگ محل میں جتنے منظر ممکن ہیں
تیری آنکھیں ان میں ایسے جاگ رہی ہیں

جیسے دریاؤں کے سپنے
جن کی ہر تعبیر کے اندر اِک سمندر بہتا ہے
آتا جاتا ہراک موسم
تیری آنکھیں دیکھتا ہے تو کہتا ہے
"رک جانا تقدیر نہیں پر آگے کیسے جاؤں
ان آنکھوں میں ڈوب سکوں تو کوئی رستہ پاؤں"

اے سندر متواری آنکھوں والی ناری — سن
اپنی آنکھیں موند کے مجھ سے سپنے میرے لے لے
ان جھیلوں کے اندر کیا ہے' اس کا بھید بتا
اے سندر' متوالی آنکھوں' کجلے نینوں والی
تیرے روپ ہزار
بس اتنا بتلا دے مجھ کو
کیسے اتروں پار
بادل بادل آنکھیں تیری دریا دریا خواب
کیسے اتروں پار' بتا میں کیسے اتروں پار!

❁❁❁

گیت

اک خواب سفر میں رہتا ہے
اک نام کی اڑتی خوشبو میں
اک راہ گذر کے جادو میں
اک خواب سفر میں رہتا ہے

دل کون ہوا کا پنچھی ہے پرواز سے جو تھکتا ہی نہیں
یہ کیسی رت کا بادل ہے جو ایک جگہ رکتا ہی نہیں
اک بستی آنکھیں ملتی ہے
اک شہر نظر میں رہتا ہے
اک خواب سفر میں رہتا ہے

کیا آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں کیا چہرے رزق خاک ہوئے!
وہ پھول تھے کیا کیا جذبوں کے جو مِل کر ارضِ پاک ہوئے
اک لطف و کرم کا سایا سا
اب شام و سحر میں رہتا ہے
اک خواب سفر میں. رہتا ہے

✿✿✿

دوسرا آسماں
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں جہاں در جہاں
دوسرا آسماں -----------
ہے کہاں؟ ہے کہاں؟
دوسرا آسماں!

بے اماں پھر رہے ہیں ولاسے کئی
ساحلوں پہ بھی رہتے ہیں پیاسے کئی
اک یقین کے عقب میں ہیں لاکھوں گماں
دوسرا آسماں ------------

پھول کی آنکھ میں بھید شبنم کا ہے
زندگی ڈھیر سا ایک ریشم کا ہے
کھولتے کھولتے تھک گئی انگلیاں
دو سرا آسماں ----------

کوئی منزل ہے اپنی نہ کوئی ہدف
دھوپ سی وسوسوں کی ہے چاروں طرف
دور تک کوئی بادل نہ ہے سائباں
دو سرا آسماں ----------
ہے کہاں؟ ہے کہاں؟
دو سرا آسماں ----------

✿✿✿

گیت

دن ہے شاد مرادوں والا رات ستاروں والی ہے
ہاتھ میں لے کر ہاتھ او ساتھی
اک دوجے کے ساتھ او ساتھی
جھومیں مہکیں ناچیں گائیں
آنگن آنگن رنگ بکھرائیں
صحراؤں کی ریت میں ساتھی
ارمانوں کے کھیت میں ساتھی
کیسی یہ ہریالی ہے!
دن ہے شاد مرادوں والا رات ستاروں والی ہے

سُر سے سُر جو مل جاتے ہیں
پھول دلوں کے کھل جاتے ہیں
گیت ہوا پر لکھتے جانا
دیپ جلا کر رکھتے جانا
مانا شب تاریک ہے ساتھی
صبح بہت نزدیک ہے ساتھی
اور بڑی متوالی ہے
دن ہے شاد مرادوں والا رات ستاروں والی ہے

رستہ رستہ یاد کھڑی ہے
دوری کی زنجیر پڑی ہے
تاگا تاگا بنتے ہاتھ
تھک گئے سپنے چنتے ہاتھ
دل میں گر امید ہے ساتھی
ہر موسم اک عید ہے ساتھی
مایوسی تو گالی ہے
دن ہے شاد مرادوں والا، رات ستاروں والی ہے

٭٭٭

رنگوں کی پوشاک ہوا نے موسم کو پہنائی ہے
صبح، سنہرے خوابوں کی تعبیریں لے کر آئی ہے
روشن سرخ گلابوں والی
رستہ رستہ آہٹ آہٹ
امیدوں اور خوابوں والی
ایک انوکھی خوشبو جیسے سانسوں میں لہرائی ہے
اجلے خواب دکھانے والی
گلشن گلشن، شبنم شبنم
پھولوں کو مہکانے والی
رات ستاروں کی سیڑھی سے زینہ زینہ آئی ہے

جگنو رستوں کو چمکائیں
تتلی نے جو بات کہی وہ
رنگ ہتھیلی پر لکھ جائیں
دیکھو رُت یہ بھاگوں والی کیا سندیسہ لائی ہے
رنگوں کی پوشاک ہوا نے موسم کو پہنائی ہے

❁❁❁

گیت

یہ ہوا، یہ جدائی کی قاتل ہوا
راستہ راستہ
پوچھتی ہے پتہ
ایک دیکھے ہوئے اجنبی شخص کا
یہ ہوا۔ یہ جدائی کی قاتل ہوا

وصل کے خواب کا تیر ہے بے ہدف
درد ہے صف بہ صف
اور چاروں طرف
دھند کا ایک جنگل ہے پھیلا ہوا

یہ ہوا، یہ جدائی کی قاتل ہوا
پوچھتی ہے پتہ
جانے کس شخص کا

یہ جو کہرے میں لپٹی ہوئی سانس ہے
یہ کوئی پھانس ہے
یا تری آس ہے
کون جانے کہاں ڈور کا ہے سرا
یہ ہوا، یہ جدائی کی قاتل ہوا

❁❁❁

[یاد]

اس موسم میں جتنے پھول کھلیں گے
ان میں میری یاد کی خوشبو ہر سُو روشن ہوگی
پتّہ پتّہ بھولے بسرے رنگوں کی تصویر بناتا گذرے گا
یاد جگاتا گذرے گا

اس موسم میں ----
اس موسم میں جتنے تارے آسمان پہ ظاہر ہوں گے
ان میں تیری یاد کا پیکر منظر منظر عریاں ہوگا
تیری جھل مل یاد کا چہرہ
روپ دکھاتا گذرے گا
اس موسم میں ----

اس موسم میں دل دنیا میں جو بھی آہٹ ہو گی
اس میں تیری یاد کا سایا گیت کی صورت ڈھل جائے گا
شبنم سے آواز ملا کر کلیاں اس کو دوہرائیں گی
تیری یاد کی سُن گُن لینے چاند مرے گھر آئے گا
آنکھیں پھول بچھائیں گی

اپنی یاد کی خوشبو مجھ کو دان کرو
اور اپنے دل میں آنے دو
یا میری جھولی کو بھر دو
یا مجھ کو مر جانے دو
اس موسم میں ----

❁❁❁

شام کی انگلی تھام کے نکلی بھولی یاد کوئی

آسمان پر چاند ہے تنہا اور زمیں پر میں
اور کہیں ہے دنیا میری اور کہیں پر میں
اک بے نام اداسی چاروں جانب پھیل رہی
شام کی انگلی تھام کے نکلی، بھولی یاد کوئی

تارے ایسے لرز رہے ہیں جیسے ہوں آنسو
جانے کس کی کھوج میں نکلی آوارہ خوشبو
ساری دنیا چھوڑ کے میرے دل میں آن بسی
شام کی انگلی تھام کے نکلی، بھولی یاد کوئی

شبنم شبنم عکس ہیں جس کے، چہرہ کس کا ہے
دل کی جو دیوار پہ اترا، سایا کس کا ہے
آئینوں کی بھیڑ میں کس کی صورت بھول گئی
شام کی انگلی تھام کے نکلی، بھولی یاد کوئی

✿✿✿

دل کا گھر بھی کیسا گھر ہے
آنے والے سو دروازے، جانے والا کوئی نہیں
روپ ہے یا بہروپ نگر ہے
دل کا گھر بھی کیسا گھر ہے!

پیار کی خوشبو، ایسی خوشبو، باندھے سے ناں رک پائے
ایسا ہے یہ پھول وفا کا، پتھر میں بھی کھل جائے

روشن ہر اک راہ گذر ہے
موسم موسم رنگ سفر ہے
دل کا گھر بھی کیسا گھر ہے

شام سمے جب وقت اور دریا ٹھہرے ٹھہرے لگتے ہیں
دن بھر کی پرواز سے تھک کر پنچھی مڑنے لگتے ہیں

رستہ رستہ رات کا ڈر ہے
آنکھوں میں اک خواب نگر ہے
دل کا گھر بھی کیسا گھر ہے!

ہر الجھن اور شکوے کی بنیاد کوئی تو ہوتی
درد مسافت کی آخر میعاد کوئی تو ہوتی
جیسے ہر اک شب کی سحر ہے
جیسے پانی بیچ بھنور ہے

آنے والے سو دروازے جانے والا کوئی
دل کا گھر بھی کیسا گھر ہے!

❁❁❁

کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے
جدھر چاہے یہ باگیں زندگی کی موڑ سکتی ہے

محبت روک سکتی ہے کسی گرتے ستارے کو
کسی جلتے شرارے کو، فنا کے استعارے کو
یہ چکنا چور آئینے کی کرچیں جوڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے

محبت پر کسی بھی رسم کا پہرا نہیں چلتا
کسی آمر، کسی سلطان کا سکّہ نہیں چلتا
یہ ہر زندان کی اندھی سلاخیں توڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے

یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جا۔
کسی رستے میں رستہ پوچھتی' تقدیر مل جا۔
سمے کے تیز دھارے کو یہ پیچھے چھوڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے

❁❁❁

اتنے خواب کہاں رکھوں گا
آنکھوں کے بازار میں تو اب تِل دھرنے کی جگہ نہیں
میں اتنے خواب کہاں رکھوں گا

ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے
پیروں میں خوشبو کی جھانجھر
شام کا تارا پھر آیا ہے
امیدوں کی دنیا لے کر
اس کا نام گماں رکھوں گا
اتنے خواب کہاں رکھوں گا

آہٹ آہٹ دستک دستک
پھیلے گی جھنکار وفا کی
تتلی تتلی، کوئل کوئل
بکھرے گی مہکار صبا کی
تجھ کو ساتھ جہاں رکھوں گا
آنکھوں کے بازار میں تو اب
تل دھرنے کی جگہ نہیں میں
اتنے خواب کہاں رکھوں گا

❁ ❁ ❁

دیکھو اب کے یہ کیسی بسنت رت آئی

کیسے کیسے یہ پھول کھلے
کیسے بچھڑے ہوئے دل ملے

دیکھو اب کے یہ کیسی بسنت رت آئی

رنگ مہکے جو سنکی ہوا
وقت تھم تھم کے چلنے لگا
جھُوم کے کھل اٹھی ہے کلی
جھُک کے موسم نے کچھ تو کہا

دیکھو اب کے یہ کیسی بسنت رت آئی

مسکرانے لگا ہے چمن
گنگنانے لگے ہیں بدن
خواب آنکھوں میں چلنے لگے
زرد ہونے لگے پیرہن

دیکھو اب کے یہ کیسی بسنت رت آئی

اے ہجر بھری شب
اے ہجر بھری شب
آ تو ہی میرے سینے سے لگ جا کہ مٹے غم
آ کچھ تو گھٹے غم
آ چُوم لوں آنکھیں تری، رخسار ترے، لب
اے ہجر بھری شب

دیکھ آج تمناؤں کی بے سمت ہوائیں
دلِ شرمندہ نظر کو
بھر لے کے چلی ہیں وہی بے رخت ہوائیں
اسی جادو کے نگر کو
آنکھوں میں لئے آس، ملے کون؟ کہاں! کب!
اے ہجر بھری شب

سنکے گی کہاں سبز ہوا کوئے وفا کی
ہاتھوں میں لئے پھول
خوشبو میں ملی یاد جو اک دستِ حنا کی
کیا کیا نہ گئے بھول
کچھ برسے ہوئے ابر ہیں کچھ ترسے ہوئے لب
اے ہجر بھری شب
اے ہجر بھری شب

❁❁❁

ایسا گلاب جیسا دن
ایسی غزل جیسی شام
آئے نہ آئے پھر کبھی
لمحوں کی اس ریت پر، لکھے رہیں نہ رہیں
جگمگاتے ہوئے دو نام

کسی کو نہیں یہ پتہ کسی کو نہیں یہ
جیون کی یہ رہ گذر
آتی ہے کس اور سے، جاتی ہے کون نگر
سارے سفر میں نہیں
رکنے کا کوئی مقام

ڈالی ڈالی پہ پھول کھلے اور آنکھوں میں اتری بہار
کس کا ہمیں ہے انتظار'
کس نے صبا کو دے دیا ایسا حسیں اختیار
شبنم سے بھرنے لگے
جتنے خالی تھے کلیوں کے جام
ایسا گلاب جیسا دن
ایسی غزل جیسی شام
آئے نہ آئے پھر کبھی

❁ ❁ ❁

سرِ شام آنکھ میں جل اٹھے کئی دیپ سے
ترے نام سے
مرے چاند تُو بھی طلوع ہو کسی بام سے
مرے نام سے!

میں نے لکھ دیا
ترے نام کا میں نے حرف حرف
کفِ دستِ باد پہ لکھ دیا
وہ جو پھول تھا
مری زندگی کی کتاب میں
میں نے تری یاد پہ رکھ دیا
وہ جو بات تھی کوئی ان کہی اسے کہہ دیا
میں نے شام سے
سرِ شام آنکھ میں جل اٹھے کئی دیپ سے
ترے نام سے

کسی آگ میں
وہ جو سوز تھا ترے ہجر کا
مرے جسم و جاں کو جلا گیا
کسی راگ میں
وہ جو زہر تھا کسی لہر کا
مری روح تک میں سما گیا
مجھے چار سُو سے غرض نہیں، مجھے کام ہے
اسی کام سے
مرے چاند تُو بھی طلوع ہو کسی بام سے
مرے نام سے
سرِ شام آنکھ میں جل اٹھے کئی دیپ سے
ترے نام سے

✿✿✿

میں نے ----
کچھ لفظ لکھے ہیں لہروں پر
جب دریا تیرے شہر سے گذرے، پڑھ لینا

میں نے ----
اک بات کہی ہے خوشبو سے
جب موسم تیرے صحن سے گزرے، سُن لینا

جب چاند تری کھڑکی میں رکے اور تارے جھلمل کرتے ہوں،
کانوں میں ہوا کچھ کہہ کے چلے آنگن میں خواب اترتے ہوں،
اس وقت جو باتیں دل میں ہوں وہ ساری باتیں کر دینا
میں نے ---- کچھ لفظ لکھے ہیں لہروں پر
جب دریا تیرے شہر سے گزرے، سن لینا

چہرے پہ لئے اک آس کبھی کچھ پیاسی راتیں گزریں گی!
ہاں روکنا ان کو آنکھوں میں جو خالی راتیں گزریں گی!
اور اپنے سانس کی خوشبو سے وہ ساری راتیں بھر دینا
اس وقت جو باتیں دل میں ہوں وہ ساری باتیں کر دینا
میں نے ---- ۔
کچھ لفظ لکھے ہیں لہروں پر
جب دریا تیرے شہر سے گزرے' پڑھ لینا

❁❁❁

میں نے تیرا نام چُنا
دنیا کے بازار سے ساجن میں نے تیرا نام چنا
میں نے تیرا نام چنا
چیزوں کے انبار سے ساجن میں نے تیرا نام چنا
میں نے تیرا نام چنا

چہروں کے انبوہ میں میں نے ایک نظر جب دیکھا تجھ کو
پھر دوبارہ تجھ کو دیکھا
اس کے بعد سے اب تک میں نے اور نہیں کچھ دیکھا ساجن
اور نہیں کچھ دیکھا میں نے
کام بہت تھے کرنے والے میں نے بس یہ کام چنا
میں نے تیرا نام چنا

لمحہ لمحہ کات کے ساجن میں نے تیرے خواب بُنے

میں نے تیرے خواب بنے اور

اس کے بعد سے اب تک میں نے اور نہیں کچھ کاتا ساجن

اور نہیں کچھ کاتا میں نے

ایک یہی پہناوا میں نے اب تو صبح و شام چُنا

میں نے تیرا نام چُنا

❁❁❁
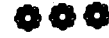
. بھی حرف لکھوں میں ساجن نام ترا بن جائے

، کی جو بھی کھڑکی کھولوں تیری خوشبو آئے

یوں لگتا ہے اک دن مجھ کو پاگل کر دے گا

پیار ترے کا سایہ جینا مشکل کر دے گا

ں موسم سے بات کروں وہ تیرے گیت سنائے

آنکھوں کے اطراف میں جیسے اک دھنک سی اتری ہے

ہاتھوں کی ہر پَور میں اک مانوس مہک سی اتری ہے

ل کو جب غور سے دیکھوں تیرے نقش بنائے

آنکھ مری ہے پیاسی مٹی، تُو ہے گھ
ایسے اِس کو جل تھل کر دے ناچ اٹھے
وقت مجھے یہ منظر دے دے اور وہیں رک جائے
جو بھی حرف لکھوں میں ساجن نام ترا بن جائے

❁❁❁

میرے دل میں اک تصویر ہے تُو
جو ساری عمر کا حاصل ہیں
اُن خوابوں کی تعبیر ہے تُو
میرے دل میں اک تصویر ہے تُو

مرے سامنے دنیا کھڑی رہی
میں تیری دُھن میں پڑی رہی
میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا نہیں
میرا اور کسی سے ناتہ نہیں
میری منزل تُو تقدیر ہے تو

مری دنیا تیری چاہت ہے
مری دھڑکن تیری آہٹ ہے
دل دے کر جس کو پایا ہے
جسے میں نے آپ بنایا ہے
وہی مالا، سی زنجیر ہے تو

یوں من میں چاہ بسی تیری
میری دنیا ایک ہنسی تیری
ترے بِن جینا دشنام ہوا
ہر غم کی دوا ترا نام ہوا
دل روگی ہے اکسیر ہے تو
مرے دل میں اک تصویر ہے تُو

✿✿✿

جیون کی اس راہ گزر پر
خوشبو کے اس پھول سفر پر
ہم کو، تم کو، سب کو ہی بس چلتے جانا ہے
چلتے جانا ہے اور آگے بڑھتے جانا ہے
سپنے بُنتے، کانٹے چُنتے، بڑھتے جانا ہے
چلتے جانا ہے

اپنا اپنا کام لگن سے سارے کرتے جائیں
لمحوں کی دیوار پر اک اک شمع دھرتے جائیں
روشنیوں سے گلیاں، کوچے، آنگن بھرتے جائیں
خوشیوں کا انمول خزانہ مل کر پانا ہے
چلتے جانا ہے

اپنے اپنے حصے کا ہم منظر صاف کریں
اپنے اندر کو مہکائیں باہر صاف کریں
آنگن آنگن بکھرا کُوڑا مل کر صاف کریں
یہ اک ایسا گیت ہے جس کو سب نے گانا ہے
چلتے جانا ہے

✿✿✿

تیرے نام کی خوشبو لے کر آئے شام
دل میں اُترے اور وہیں رک جائے شام

تارا تارا کتنے چہرے جاگ اٹھے
آنگن آنگن کتنے دیپ جلائے شام

ہولے ہولے جھیل میں تیریں نیل کنول
خود مہکے اور ہم کو بھی مہکائے شام

جس کی انگلی تھام کے نکلیں ہم دونوں
ایسا بھی اک چاند کہیں سے لائے شام

بادل بادل زلف کسی کی کھلتی جائے
اور کٹے پھر اس کے سائے سائے شام

خوشبو کی آواز میں چھپ کے نکلے
تاروں کی پوشاک پہن کر آئے

تیرے نام کی خوشبو لے کر آئے شام
دل میں اترے اور وہیں رک جائے شام

❁❁❁

خوشبو تیرا نام
تیرے نام سے خوشبو لے کر مہکا میرا نام
خوشبو تیرا نام

اس خوشبو کو اوڑھ کے نکلی
رنگوں کی دیوار کا پہرا
تارا تارا توڑ کے نکلی۔
کیسی روشن شام
خوشبو تیرا نام

شبنم شبنم لہراتے ہیں
جتنے بھی ہیں رنگ دھنک کے

روپ ترے میں ڈھل جاتے ہیں، بجتا ہے اک بام
خوشبو تیرا نام

ریشم ریشم سپنے بُن کر
نیند سے آنکھیں بھر جاتی ہیں
مچتا ہے اک آہٹ سن کر، تاروں میں کہرام
خوشبو تیرا نام

❁❁❁

(مرکزی خیال "جام درک" سے ماخوذ)

کیا صبح اور کیا شام سجن
لوں ہر دم تیرا نام سجن

دربار میں کنگھی کرتے ہوئے، جب دیکھا پہلی بار تجھے
اک پل کے لئے تو بھول گیا، دربار ہی کیا گھر بار مجھے
پھر دل میں مچا کہرام سجن
لوں ہر دم تیرا نام سجن

وہ ہونٹ گلابی پھولوں سے۔ اور ان پہ وہ ہلکا دنداسہ
وہ ناک ہلالی خنجر سی۔ وہ روپ چمکتے موتی سا

رہے روشن تیرا بام سجن
لوں ہر دم تیرا نام سجن

باغوں میں پرندے گاتے ہیں، وہ گیت ہیں تیرے جوبن کے
غم دل کے سارے دور ہوئے، جب چاند پکارا چلمن سے
آنکھوں میں ڈھلی پھر شام سجن
لوں ہر دم تیرا نام سجن

❁❁❁

(مرکزی خیال جام درک کے کلام سے ماخوذ)

پھولوں سے بھری ڈالی کی طرح
تن جھوم کے میرا لہرایا
کانوں میں پڑی بالی کی طرح

کل رات جو بجلی چمکی تھی
اک صورت آنکھ میں دمکی تھی
اک چاند زمیں پر اترا تھا
اس رخ پہ پڑی جالی کی طرح

بادل جو امنڈ کر آیا تھا
پیغام کسی کا لایا تھا
تو راجہ ہے میں پرجا ہوں
میں گلشن تُو مالی کی طرح

تیری چاہت اب ایمان ہوئی
میرے دل کی غم پُرسان ہوئی
اب تُو ہی رکھنا لاج سجن
کہیں پیار نہ ہو گالی کی طرح
پھولوں سے بھری ڈالی کی طرح

❁❁❁

(مرکزی خیال جام دُرک کے اشعار سے ماخوذ)

سپنے میں کل دیکھی میں نے اک البیلی صورت
چاندی کی اک مُورت

ایسا روپ انوکھا اس کا چندا کو شرمائے
مورنی جیسی گردن اس کی دل میں بستی جائے
سکھیوں کی اس بھیڑ میں سب سے روشن اس کا روپ
چاندنی اس کے سر پر جیسے سایہ کرتی جائے
سپنے میں کل دیکھی میں نے اک البیلی صُورت
چاندی کی اک مُورت

اس کے مُکھ پر آنکھیں جیسے تاروں کے دو پھول
ٹھہری ٹھہری گہری گہری قاتل پر، مقتول
شامِ شفق سی سرخ وہ اس کی مخمل کی پاپوش

میرے دل سے لاکھوں دل تھے' ان قدموں کی دھول
سپنے میں کل دیکھی میں نے اک البیلی صورت
چاندی کی اک مورت

ہائے وہ اس کا رکھنا اپنے ہونٹوں پر وہ ہاتھ
پردیسی کو مار ہی ڈالا ایک اشارے ساتھ
بنجر تھی جو آس کی کھیتی جاگی اور لہرائی
ایک نشانی اسکی پا کر مچل اٹھے جذبات
سپنے میں کل دیکھی میں نے اک البیلی صورت

چاندی کی اک مُورت

✿✿✿

(مرکزی خیال بلوچی شاعر جام ورک کے اشعار سے ماخوذ)

اے بادل
اے میرے یار کے نامہ بر
اللہ اور نبیؐ کی اس کے
رحمت ہو تجھ پر
اے بادل اے میرے یار کے نامہ بر

بجلی جیسا چمک گیا وہ میری آنکھوں میں
اس کی زلفوں کی خوشبو ہے میری سانسوں میں
اس کے غم میں جلتا ہوں میں جیسے ایک شجر
اے بادل اے میرے یار کے نامہ بر

تیروں جیسے حکم ہیں اس کے میرا تن ہے ڈھال
یاروں کی سختی بھی عاشق ہنس کر دیں گے ٹال
کیسے اس کو اتنا دیکھوں آنکھیں جائیں بھر
اے بادل اے میرے یار کے نامہ بر

✿✿✿

(مرکزی خیال بلوچی شاعر مست توکلی کی نظم سے ماخوذ)

بے سَمت مسافت میں جب اُس کی گلی آئی
اک، جانی ہوئی خوشبو بے ساختہ لہرائی

شِکرے سے کہا میں نے ہاں اس کی خبر لانا
اے برق صفت پنچھی للہ ذرا جانا
وہ یار ہمارا بھی ہے تجھ سا ہی ہر جائی

جانے ہے کہاں یارو دم ساز مری شمو
سنتی ہی نہیں کوئی آواز میری شمو
میں اس کی محبت میں ہو جاؤں نہ سودائی

یوں تو مرے رستے میں کتنے ہی حسیں آئے
اس دل میں مگر کیسے کوئی اور مکیں آئے
جو دل ہو زمانے میں بس تیرا تمنائی

❁❁❁

تجھے کون گلی جانا ہے!
- اے دل اے مسافر دل
تجھے کون گلی جانا ہے!

کسی گھاٹ پہ اترے گا
کس آنکھ میں ٹھہرے گا
کس اُور روانہ ہے
اے دل اے مسافر دل

اک عمر کی صحبت میں دم ساز نہیں کُھلتا
آواز کے صحرا میں کچھ راز نہیں کُھلتا
اپنا کہ بیگانہ ہے
اے دل اے مسافر دل

جو صبح نہ ہوتی ہو وہ رات نہیں کوئی
جو ختم نہ ہو جائے وہ بات نہیں کوئی
یہ رسمِ زمانہ ہے
اے دل اے مسافر دل
تجھے کون گلی جانا ہے!

❁❁❁

خوشبو سے بھری، تاروں سے بجی
پھر رات چلی آنکھوں میں لئے کچھ وعدے سے

بادل کی پھر اوٹ کئے مہتاب چلا
تارا تارا ایک انوکھا خواب چلا
پھولوں سے سنی، شبنم نے کہی
اک بات صبا کے کانوں میں پھر دھیرے سے
پھر رات چلی آنکھوں میں لئے کچھ وعدے سے

جھیل سی ان آنکھوں کا پانی گہرا تھا
چاند کسی آواز کو سننے ٹھہرا تھا
تاروں کی ہنسی، رستوں میں کھلی
اور لفظوں میں پھر جان پڑی اک لہجے سے
پھر رات چلی آنکھوں میں لئے کچھ وعدے سے

❁❁❁

دنیا میں محبت کے ہم گیت بُنیں آؤ
کچھ پھول چُنیں آؤ

مل جل کے چلو بوئیں وہ بیج تمنا کے
سکھ جن سے نمو پائیں ہر آنکھ میں فردا کے
ہر سانس میں خوشبو کی آواز سنیں، آؤ
کچھ پھول چنیں آؤ
جو شہد سے میٹھا ہو وہ رنگِ سخن سیکھیں
شبنم کا سفر دیکھیں، تاروں کا چلن سیکھیں
ہر شاخ سے خوشیوں کے کچھ خواب چنیں آؤ
کچھ پھول چنیں آؤ
دنیا میں محبت کے ہم گیت بُنیں آؤ

❁❁❁

دو بھید بھری آنکھیں
اک خواب کی چلمن سے ہر رات مجھے دیکھیں
دو بھید بھری آنکھیں

ہر صبح کو چڑیوں کی چہکار میں ڈھل جائیں
پھولوں کی قبا پہنیں، شبنم میں بدل جائیں
ہر شام ہواؤں سے احوال مرا پوچھیں
دو بھید بھری آنکھیں

کرتی ہیں عجب باتیں کاجل کی زباں سے یہ
دل لیتی چلی جائیں انداز بیاں سے یہ

بچوں کی طرح سوئیں، کلیوں کی طرح جاگیں
دو بھید بھری آنکھیں

اک خواب کی چلمن سے ہر رات مجھے دیکھیں
دو بھید بھری آنکھیں

❁❁❁

موسم رنگ بدل جائیں
رستے دور نکل جائیں
تم نہ بدلنا - ساتھ ہی چلنا جب تک جیون جوت جلے

تیرے ہی سنگ رہنا ہے
دکھ سکھ مل کر سہنا ہے
تم سے پیارے، تم سے ہی
جو بھی سننا، کہنا ہے
ہم سے سننا، ہم سے کہنا، جب تک ساتھی رات چلے
تم نہ بدلنا، ساتھ ہی چلنا، جب تک جیون جوت جلے

زلف گھٹا بن جانے دو
اس بادل کو چھانے دو
تم جو میرے ساتھ چلے
دل کو دھوم مچانے دو

پنچھی چہکیں، رستے مہکیں، غم کا سورج ہاتھ ملے
تم نہ بدلنا، ساتھ ہی چلنا، جب تک جیون جوت جلے

وصل اور ہجر اضافی ہے
ایک نظر ہی کافی ہے
دنیا ساری غم ہی غم ہے۔
تیرا نام تلافی ہے
چمکیں تارے، ساتھ ہمارے، مل جاؤ جو شام ڈھلے
تم نہ بدلنا۔ ساتھ ہی چلنا جب تک جیون جوت جلے

❁❁❁

ہوا آہستہ چلتی ہے
تری کھڑکی سے گذرے تو ہوا آہستہ چلتی ہے
شفق کی نبض، تاروں کی ضیا، آہستہ چلتی ہے
ہوا آہستہ چلتی ہے۔

تجھے خوابِ جوانی میں اگر مدہوش پاتی ہے
دھنک کی اوڑھنی پہنے، مہک کا مورچھل لے کر
ترے چہرے پہ بکھری زلف دھیرے سے ہٹاتی ہے
تُو گلشن میں اگر آئے صبا، آہستہ چلتی ہے
ہوا آہستہ چلتی ہے۔

یہی وہ رات ہے جو لاکھ کہنے پر نہیں رکتی
ستارے ٹوٹتے جاتے ہیں کچھ کہنے کی کوشش میں

یہ ان کی بات سننے کے لئے پل بھر نہیں رکتی
تری فرقت میں آتی ہے تو کیا آہستہ چلتی ہے
ہوا آہستہ چلتی ہے

حضوری کی تمنا میں پڑے رہتے ہیں گلیوں میں
کئی خوابوں کی اکثر دیر سے شنوائی ہوتی ہے
خزاں کے رنگ جیسے ڈولتے رہتے ہیں کلیوں میں
غریبِ شہر کی جیسے دعا آہستہ چلتی ہے
ہوا آہستہ چلتی ہے

❁❁❁

تو چلو یوں کریں
بھول جائیں جو کچھ بھی ہوا، جس طرح بھی ہوا
تم بھی کچھ نہ کہو — ہم بھی کچھ نہ کہیں
تو چلو یوں کریں۔

چاندنی کو ستاروں کی اقلیم میں پھیلتے دیکھ کر
کھڑکیوں سے اُدھر موسموں کو گزرتے ہوئے دیکھ کر
جیسے ان سے کوئی آشنائی نہیں
اس طرح سے رہیں
تو چلو یوں کریں۔

گردبادِ زماں سے کوئی راستہ پار جاتا نہیں
خواہشوں کے سوا منتظر آنکھ میں کچھ بھی آتا نہیں
اپنے ہی آپ سے اک کہانی کہیں'
آپ ہی پھر سنیں
تو چلو یوں کریں۔

❁❁❁

کتنے خواب سجے ہوں گے
کتنے پھول کھلے ہوں گے
جب تم میرے شہر کی گلیوں سے گذرو گے
گذرو گے نا - گذرو گے نا - گذرو گے نا!

دل میں چاند اتر آئے گا
موسم اور نکھر جائے گا
شام کا پہلا تارہ' سارے
گھر کو روشن کر جائے گا
جب تم میرے شہر کی گلیوں سے گزرو گے
گذرو گے نا - گزرو گے نا - گزرو گے نا!

راہیں روشن ہو جائیں گی
اک دوجے میں کھو جائیں گی
بن جائے گی خوشبو زینہ
پلکیں چلمن ہو جائیں گی
جب تم میرے شہر کی گلیوں سے گزرو گے
گذرو گے نا! گذرو گے نا! گذرو گے نا!

❁❁❁

ندیا گائے
چپکے چپکے دھیرے دھیرے
ساحل سے کچھ کہتی جائے، بہتی جائے۔

آنگن میں کیوں ڈھیر لگا ہے کلیوں کا!
خوشبو رستہ بھول گئی کیا گلیوں کا!
دل ہی دل میں سوچے ہے کیا تیز ہوا
پُوچھو تو خاموش رہے اور چلتی جائے
ندیا گائے۔

کتنی بھی تاریک ہو چاہے غم کی شام
تارا تارا روشن ہو گا تیرا نام
بھُولے بِسرے خواب سجا کر آنکھوں میں
رات ہمارے کانوں میں کچھ کہتی جائے'
ندیا گائے۔

❁❁❁

آنکھوں میں لئے کچھ خواب جلے تاروں کے دیئے
اور رات کسی خوشبو سے بجی

چپکے سے کہیں اک پھول کھلا
اک شمَع جلی! اک زخم سِلا

اور دل نے کئی اقرار کسی کے یاد کئے
پھر بات کوئی بِن بات بنی
اور رات کسی خوشبو سے بجی

وہ ساتھ چلا تو رُت بدلی
پھر چمک اٹھی ہر شے گدلی
پھر دو آنکھیں بیدار ہوئیں اک دنیا سنگ لئے
اور شام کئی رنگوں میں ڈھلی
اور رات کسی خوشبو سے سجی

✿✿✿

سُن ری پوَن سُن رات کہے کیا
کانوں میں چپکے سے بات کہے کیا

پھولوں کے کِھلنے سے
تیرے میرے مِلنے سے
اُتری ہے کیسی زمیں پر بہار

آنکھوں میں جاگ اٹھے سپنے پیا
سپنے پیا، تیرے سپنے پیا
سُن ری پوَن سُن رات کہے کیا

بادل میں چھپ چھپ کے تارے چلے
تارے چلے تیرے دوارے چلے
سُن ری پوَن سُن رات کہے کیا

باتوں ہی باتوں میں دل کھو گیا
تیرا ہو گیا رے پیا تیرا ہو گیا
سُن ری پوَن سُن رات کہے کیا
کانوں میں چپکے سے بات کہے کیا

❁❁❁

دل کیسے اُسے بھولے
جس نام کی خوشبو سے سانسوں میں پڑیں جُھولے
دل کیسے اسے بھُولے

ہے آنکھ عجب اس کی دل لیتی چلی جائے
لہرا کے دھنک اس کے آنچل میں اُتر آئے
آواز میں شعلہ وہ آکاش کو جو چُھولے
دل کیسے اسے بھُولے

بازار میں دنیا کے تجھ سا نہ حسیں دیکھا
ہم نے تجھے دیکھا تو کچھ اور نہیں دیکھا
جو تجھ کو پسند آئے اے جان وفا، تُو لے
دل کیسے اسے بھُولے۔

❁❁❁

قومی گیت

ستارے آسماں کو چھوڑ کے آئیں جو تم دیکھو
گذرتے پانیوں پر عکس رک جائیں جو تم دیکھو

چمن میں پھول کھل جائیں تمہارے آنکھ ملنے سے
ہوا کے بخت جاگ اٹھیں تمہارے ساتھ چلنے سے
کِھلے خوشبو، نظر میں رنگ لہرائیں جو تم دیکھو

ابد تک ایک دشتِ بے نتیجہ ہے جو میں دیکھوں
ہراک منظر کے پیچھے ایک دھوکہ ہے جو میں دیکھوں
زمین و آسماں یکسر بدل جائیں جو تم دیکھو
ستارے آسماں کو چھوڑ کے آئیں جو تم دیکھو

●●●

سبز ہلالی پرچم

لہرایا وہ سبز ہلالی پرچم

رُوپ ہے جس کا سب سے نیارا - ہنستا چاند اور روشن تارا

دھوم ہے جس کی عالم عالم

سبز ہلالی پرچم

لہرایا - وہ سبز ہلالی پرچم

جذبوں کی اس بھیڑ میں ایسی اور امنگ نہ کوئی

قوسِ قزح کے رنگ محل میں ایسا رنگ نہ کوئی

چین کا سپنا، امن کا موسم

دھوم ہے جس کی عالم عالم

سبز ہلالی پرچم

خوشبوؤں، آوازوں، رنگوں، خوابوں کا ہے جہان
دنیا کی اس بے رنگی میں یہ اپنی پہچان
یہ روشن تو روشن ہیں ہم
دھوم ہے جس کی عالم عالم
سبز ہلالی پرچم
لہرایا - وہ سبز ہلالی پرچم

✿✿✿

بُجھنے لگا جو ایک تو اِک اور جل اٹھا
ہم نے ستارا وار کیا طے یہ راستہ

چہرے تھے گَرد گَرد تو آنکھیں لہو لہو
اک بے کنار آگ سی پھیلی تھی چار سُو
کِھلنا تھا جس گلاب کو وہ پھر بھی کِھل گیا

ارضِ وطن کی دید سا مرہم نہیں کوئی
اس قائدِ بہار سا پرچم نہیں کوئی
آنکھوں میں ایک باغ سا کھلتا چلا گیا

اُس ربّ دو جہان کی — زندہ عطا ہے یہ
یعنی رسولِؐ پاک کی روشن دعا ہے یہ
یہ ارضِ پاک اصل میں تحفہ ہے آپ کا

ہم نے ستارا وار کیا طے یہ راستہ
بُجھنے لگا جو ایک تو اک اور جل اٹھا

✿✿✿

پاکستان پاکستان
تیری اور میری پہچان
پاکستان پاکستان

سپنا چودہ صدیوں کا، بستی بستی مہکے گا
ہے یہ اللہ کا احسان
پاکستان پاکستان

چمکے اسکا روشن چاند، کبھی پڑے نہ تارا ماند
سب کی آنکھوں کا ارمان
پاکستان پاکستان

اس کی مانگ سجاتے جائیں' ایک ہی دُھن میں گاتے جائیں
بچے بوڑھے اور جوان
پاکستان پاکستان

حق داروں کو حق ملیں گے' ہر آنگن میں پھول کھلیں گے
ہے یہ قائد کا اعلان
پاکستان پاکستان

✿✿✿

اے ارضِ وطن' اے ارضِ وطن' اے ارضِ وطن' اے ارضِ وطن
شاداب رہیں اور پھولیں پھلیں یہ شہر ترے' یہ دشت و دمن
آباد رہے' دل شاد رہے' یہ بزمِ طرب یہ رنگِ چمن
خوشبو سے بھرے' پھولوں سے سجے' یہ ارض اماں یہ ارض وطن
اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن

یہ کھیت ہری فصلوں سے بھریں یہ پیڑلدیں میووں سے سدا
یہ ابر کرم جھرنوں سے چلے ندی ندی' دریا دریا
سورج کی ضیاء' ہر گھر کا یونہی' آباد کرے کونا کونا
چمکاتی رہے چہروں کو یونہی رنگوں سے سجی یہ چاند کرن
اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن

اے ارضِ وطن رستہ رستہ تاروں سے تری ہم مانگ بھریں
جتنا بھی جئیں ہم تیرے لئے خوشیوں کے جتن کرتے ہی رہیں
جو شام سیہ سے جم کے لڑیں جو تیز ہوا سے بجھ نہ سکیں
کچھ ایسے دیئے، ہم رکھتے چلیں، بستی بستی، آنگن آنگن
اے ارض وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ و

❁❁❁

اک تیرا اک میرا ہاتھ
مل جائیں تو ہو جائے گی
ساری دنیا ساتھ
اک تیرا اک میرا ہاتھ

ساری آنکھیں مل کر اپنی اک ہی سپنا دیکھیں
ہر چہرے کے عکس میں روشن اپنا چہرا دیکھیں
گاتا دن ہو ہنستی رات
اک تیرا اک میرا ہاتھ

ہر اک آفت ٹل سکتی ہے جو ہم ایک رہیں
اک دوجے کے دکھ سکھ بانٹیں مل کر ساتھ چلیں
رنگوں کی برسے برسات
اک تیرا اک میرا ہاتھ

جتنے رنگ ہیں ارض وطن کے ان کی اک پہچان
یک رنگی کی سندرتا کا نام ہے پاکستان
پاک وطن کی کیا ہی بات
اک تیرا اک میرا ہاتھ
مل جائیں تو ہو جائے گی
ساری دنیا ساتھ

❀❀❀

اے میرے کشمیر۔ اے ارضِ دِلگیر
اپنے لہو سے تو نے لکھی جو روشن تحریر
بدلے گی اک روز اسی سے دنیا کی تقدیر
اے میرے کشمیر۔ اے ارضِ دِلگیر

آزادی کے متوالوں کے تجھ پر لاکھ سلام
ظلم کی گہری کالی شب میں سورج تیرا نام
تو نے جہدِ حق کو دیا ہے ایسا ایک مقام
جس کی نہیں نظیر۔ اے میرے کشمیر

لہو اگلتی وادی سے گر تیل نکل آتا
پل بھر میں ان اہل حشم کا رُوپ بدل جاتا
تیرا دکھ اک تیر کی صورت ان پر چل جاتا
اٹھتے جاگ ضمیر۔ اے میرے کشمیر

تیرے لہو سے روشن ہے اب شمعِ وفا کی لَو
تُو نے نئے عنوان دیئے ہیں صبر اور ہمت کو
اللہ اور نبیؐ کی تجھ پر خاص عنائت ہو
ٹُوٹے ہر زنجیر - اے میرے کشمیر - اے ارضِ دلگیر

❁❁❁

جب تک اپنے خواب ہیں زندہ تعبیریں بھی زندہ ہیں
جب تک روح کے رنگ سلامت تصویریں بھی زندہ ہیں
چاند اور تارے والا پرچم
تیری میری خوشیاں لے کر
لہرائے گا عالم عالم
سینوں میں ایمان ہے تازہ اور جذبے پائندہ ہیں
جب تک اپنے خواب ہیں زندہ
تعبیریں بھی زندہ ہیں

مٹی میں تاثیر بہت ہے
سانجھ سفر کے رستے رستے
چاہت کی تنویر بہت ہے

آنے والے کل کے منتظر تابندہ تابندہ ہیں
جب تک اپنے خواب ہیں زندہ
تعبیریں بھی زندہ ہیں

گلشن گلشن مہکے گا ۔
ڈالی ڈالی آس کا پنچھی
موسم موسم چہکے گا
ہم اور تم ہیں حال اور ماضی ہم تم ہی آئندہ ہیں
جب تک اپنے خواب ہیں زندہ تعبیریں بھی زندہ ہیں

✿✿✿

آئی بہار پھول نے خوشبو سے کچھ کہا
چلنے لگی ہوا

لرزاں تھی ایک دھند سی خوابوں کے آس پاس
پھیلے ہوئے تھے آنکھ میں منظر اداس اداس
تم مسکرائے شہر کا موسم بدل گیا
آئی بہار پھول نے خوشبو سے کچھ کہا
چلنے لگی ہوا

ہونے لگے لباس گلوں کے بدن پہ تنگ
رکنے لگے فضاؤں میں قوس قزح کے رنگ
تانے ہیں پھر بہار نے خیمے سے جا بجا
آئی بہار پھول نے خوشبو سے کچھ کہا
چلنے لگی ہوا

بھنورے کلی کلی کا بدن چومنے لگے
کوئل نے کی پکار، شجر جھومنے لگے
جانے صبا کے کان میں شبنم نے کیا کیا
آئی بہار پھول نے خوشبو سے کچھ کہا
چلنے لگی ہوا

❁❁❁

چادر ہے ماں کی ارضِ وطن یہ نہ بھولنا
اے تازہ واردانِ چمن یہ نہ بھولنا

کتنی کروڑ آنکھوں نے دیکھا تھا اس کا خواب
کتنے لہو کی آگ سے لکھا گیا یہ باب
کتنے پہاڑ کاٹے تو نکلی یہ موجِ آب
کیا کیا کیے تھے ہم نے جتن، یہ نہ بھولنا
اے تازہ واردانِ چمن یہ نہ بھولنا

ہجرت رسول پاکؐ کی سنت تھی، ہم نے کی
مشکل بہت اگرچہ مسافت تھی، ہم نے کی
جتنی بھی اختیار میں ہمت تھی، ہم نے کی
رستوں میں ہر طرف تھی تھکن، یہ نہ بھولنا
اے تازہ واردانِ چمن، یہ نہ بھولنا

❁❁❁

چھ ستمبر آیا۔ کیا کیا یادیں لایا!
یہ دن اپنی عزت، عظمت، ہمّت کا سرمایا!
چھ ستمبر آیا

اس کی اک آواز سے جاگا سارا پاکستان
گلیاں، کوچے، شہر اور گاؤں دریا، ریگستان
ایک ہی پل میں ہو گئے سارے یک دل اور یک جان
شمعِ آزادی کو اس نے پھر سے آن جلایا
چھ ستمبر آیا۔

پاک وطن کی مٹی ہم کو اپنی جان سے پیاری
اس کی خاطر اپنے بڑوں نے کیا کیا نذر اتاری!
ایک انوکھی خواہش سے مہکا دی کیاری کیاری
دنیا کی ہر دھوپ کو روکے اس کی ٹھنڈی چھایا
چھ ستمبر آیا۔

✿✿✿

ہم ہی تو ہیں پاکستان
چاند ستارے والا پرچم اپنی ہے پہچان
ہم ہی تو ہیں پاکستان

ماں کے آنچل جیسی اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں
پھولوں جیسے شہر ہیں اس کے گیتوں جیسے گاؤں
اس پر اپنی جاں قربان

پھول کھلیں جب سارے مل کر بن جائے گلزار
سانجھے ہیں سب دکھ سکھ اپنے سانجھے اپنے پیار
تیری عزت میری شان

روشن روشن راتیں اس کی نکھرے نکھرے دن
اپنی کچھ پہچان نہیں ہے جگ میں اس کے بِن
اس کے دم سے اپنا مان
ہم ہی تو ہیں پاکستان

❁❁❁

مٹی میں غذا ہے کہیں پانی میں غذا ہے
قدرت کی عنائت کا، ہر اک رنگ جدا ہے

انسان کی خاطر ہی بنا کھیل یہ سارا
بیجوں میں ثمر، شہد کو کلیوں میں نکھارا
پانی میں کئی طرح کی خوراک بنائی
سبزے میں کئی رنگ کا پھر رزق اتارا
یوں ہی تو نہیں باغ کی یہ نشوونما ہے
مٹی میں غذا ہے کہیں پانی میں غذا ہے

ہے جسم کی طاقت کے لئے جو بھی
ہر چیز ہمارے لئے موجود ہے
مچھلی میں پروٹین تو سبزی میں
ہے دودھ بنا دوستو ہر بات
گنّے میں شکر، دال کی خصلت میں مزا ہے
مٹی میں غذا ہے کہیں پانی میں غذا ہے

❁❁❁

بچوں کے گیت
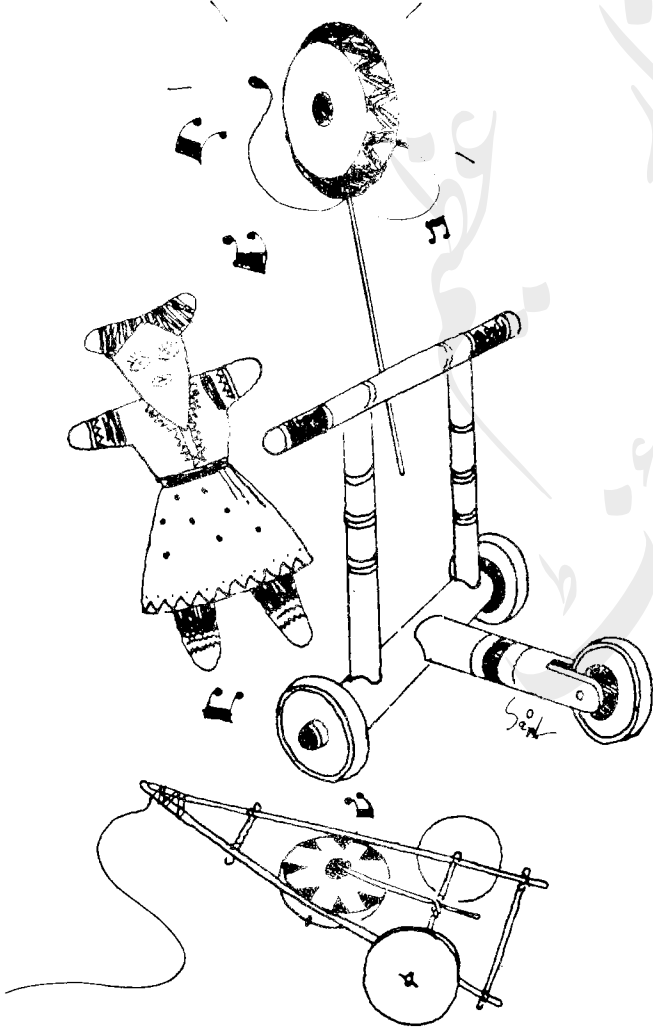
دیس دیس میں پلنے والے پیارے پیارے بچو
آنے والا کل ہے تمہارا
اب تک تو حق دار نے پایا مشکل سے انصاف
تم مت کرنا ظلم گوارا
آنے والا کل ہے تمہارا

نگر نگر کو اپنی روح کی آگ سے روشن کر دو
دنیا کی مایوس نگاہیں امیدوں سے بھر دو
مستقبل کی راہ سے چن لو سب انگارے، بچو
دیس دیس میں پلنے والے پیارے پیارے بچو

پیارے بچو تم سے ہو گا اک ایسا آغاز
سیکھے گی یہ دنیا جس سے جینے کا انداز
جتنے دکھ سکھ ہیں اس جگ میں بانٹ لو سارے، بچو
دیس دیس میں پلنے والے پیارے پیارے بچو

آنے والے کل میں ہو گے تم اس باغ کے مالی
دیکھو اب نہ رہنے پائے ایک بھی ٹہنی خالی
تم ہی ہو تقدیر جہاں کے روشن تارے بچو
دیس دیس میں پلنے والے پیارے پیارے بچو

❁❁❁

آنگن آنگن تارے
پھوٹ رہے ہیں چہرہ چہرہ
روشنیوں کے دھارے
آنگن آنگن تارے

جس رستے سے ہو کر گزریں پھول کھلاتے جائیں
وقت کی اس دیوار پہ اپنے خواب سجاتے جائیں
دنیا سے ہر غم کو مٹا دیں
مل جل کر ہم سارے
آنگن آنگن تارے

تینوں ہیں استاد ہمارے مسجد، گھر، اسکول
قربانی اور الفت والا سیکھیں ایک اصول
ان سب کے ہم ساتھی ہوں گے
جو ہیں درد کے مارے
آنگن آنگن تارے

❁❁❁

خوشبو چلتی رہتی ہے
روشنی جلتی رہتی ہے
ہر اک رات کے پیچھے دن ہے
تارا تارا، لمحہ لمحہ
ظلمت ڈھلتی رہتی ہے
خوشبو چلتی رہتی ہے

مل جائے تقدیر سے جو بھی اس راحت پر شکر کرو
مشکل کوئی پڑ جائے تو سہ جاؤ اور صبر کرو
دنیا کا دستور یہی ہے
رنگ بدلتی رہتی ہے
خوشبو چلتی رہتی ہے

بادِ خزاں کی سرزوری سے فصلِ بہاراں رکتی نہیں
سچائی کی روشن گردن کٹ جاتی ہے، جھکتی نہیں
موت کی چلتی آندھی میں بھی
زندگی پلتی رہتی ہے
روشنی جلتی رہتی ہے
خوشبو چلتی رہتی ہے

✿✿✿

مزاحیہ گیت

پہلے یہ ڈانواں پھر ڈول ہو گئی
اچھی بھلی چلی جا رہی تھی زندگی
آپ آئے اول جلول ہو گئی

ہاتھی کو بڑا کیا بڑا ہو گیا
جنگل کو ہرا کیا ہرا ہو گیا
دنیا کو گول کیا گول ہو گئی

جو بھی ہم نے بات کہی ٹالتے رہے
کبھی ہمیں دیکھا، کبھی بھالتے رہے
ہم سے بھی ٹال مٹول ہو گئی

آتی ہے، پٹھان بھائی، آتا نہیں ہے
یعنی روٹی کھاتی ہے وہ کھاتا نہیں ہے
کرنا تھا مخول پہ مخول ہو گئی

کہتی ہے جیون پھلواری
دو باتوں میں بات ہے ساری
ایک ہی شاخ کے پھل ہیں دونوں
غم ہو یا خوشیوں کا میلہ
آتے ہیں یہ باری باری
دو باتوں میں بات ہے ساری

خوشی ملے تو شکر کرو اور غم آئے تو صبر
چمکے ناہیں دھوپ ہمیشہ' سدا رہے نہ ابر
آتے ہیں یہ باری باری
دو باتوں میں بات ہے ساری

چاول کو پنجاب نے جو چوَل کر دیا
پاس آ بیٹھنے کو کوَل کر دیا
پوچھو نہیں کیسی رگ مروِل ہو گئی

پوری نہیں کبھی کہیں ناپ
کیروسین آئل کے ملاپ
زندگی ہماری پٹرول ہو
پہلے یہ ڈانواں پھر ڈول

❁❁❁

فصلِ گُل ہو یا ہو پت جھڑ اصلی چیز ہے دُکھ
ہر اک رات کے پیچھے دن ہے دکھ کے پیچھے سُکھ

آتے ہیں یہ باری باری
دو باتوں میں بات ہے ساری

✿✿✿

موتی جیسے دانت
چمکیں جب اک ساتھ تو کتنے اچھے لگتے ہیں

ایک تبسم سے، مِل جاتے ہیں دل
مسکاتی ہے آنکھ، کِھل جاتے ہیں دل
لائیں دن اور رات
خوشیوں کی بارات تو کتنے اچھے لگتے ہیں

برتیں ٹوتھ برش یا آپ کریں مسواک
ہر شب سونے سے، پہلے منہ ہو پاک
بچے جب یہ بات
سمجھیں اک سوغات تو کتنے اچھے لگتے ہیں

دانت اگر ہوں صاف اچھے اور مضبوط
عمر اور صحت بھی ان سے ہے مشروط

روشن ہوں لمحات
جب ہاتھ میں لے کر ہاتھ تو کتنے اچھے لگتے ہیں

❁❁❁
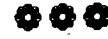
آتے جاتے دِن — کیا کہتے ہیں سُن
عِلم کے چاند چراغ سے ساتھی
جیون کے اس باغ سے ساتھی
ساری کلیاں چُن
آتے جاتے دِن — کیا کہتے ہیں سن

آدھا ہے ایمان صفائی
جس نے عادت یہ اپنائی
اس کا روشن نام ہے ساتھی
سب سے بھلا یہ کام ہے ساتھی
سب سے اچھا گُن

اچھی آنکھیں اچھے خواب
ساز ہے دنیا، دل مِضراب
چاروں جانب پیار ہو ساتھی
ہر اک راہ بہار ہو ساتھی
دل میں ہو جو دُھن
آتے جاتے دِن — کیا کہتے ہیں سُن

❁❁❁

پھول کھلے ہیں ڈالی ڈالی
رُت آئی ہے خوشیوں والی
مل کر خوب بجائیں تالی
کہ ہو گئی سنچری لو ہو گئی سنچری
سب سے اچھے سب سے پیارے آنگن آنگن تارے کی لو
یہ ہو گئی سنچری کہ ہو گئی سنچری
شاوا شاوا بلے بلے بک اپ بک اپ ویل ڈن ویل ڈن
کہ ہو گئی سنچری لو ہو گئی سنچری

"آنگن آنگن تارے" نے جو دھنک سجائی گیتوں کی
سُر سنگیت کی شمع جلا کر بزم جمائی گیتوں کی
اس نے کیا کیا رنگ نکھارے
سب سے اچھے سب سے پیارے آنگن آنگن تارے کی لو
یہ ہو گئی سنچری کہ ہو گئی سنچری
شاوا شاوا بلے بلے بک اپ بک اپ ویل ڈن ویل ڈن

کیسے کیسے گیت بُنے اور کیا کیا راگ سنائے
سو ہفتوں میں کیسے کیسے پیارے رنگ دکھائے
سر میں کیا کیا چاند اتارے
سب سے اچھے سب سے پیارے آنگن آنگن تارے کی لو
یہ ہو گئی سنچری کہ ہو گئی سنچری
شاوا شاوا بلے بلے بک اپ بک اپ ویل ڈن ویل ڈن
کہ ہو گئی سنچری - لو ہو گئی سنچری

❁❁❁

اک بار جو کھو جائے وہ وقت نہیں ملتا
جو پھول بکھر جائے وہ مڑ کے نہیں کھلتا

جو وقت ملا ہم کو اللہ کی امانت ہے
اک خواب کا چہرا ہے تعبیر کی صورت ہے
گر حکم نہ ہو اس کا پتّہ بھی نہیں ہلتا
اک بار جو کھو جائے وہ وقت نہیں ملتا

موقعے کا بس اک ٹانکا نو ٹانکے بچاتا ہے
ادھڑے ہوئے دامن کو پھٹنے سے بچاتا ہے
تاخیر جو ہو جائے پھر یونہی نہیں سِلتا
اک بار جو کھو جائے وہ وقت نہیں ملتا

توقیر کرو اس کی جو لمحہ میسر ہے
جو وقت پہ ہو جائے بس کام وہ بہتر ہے
ہاتھوں سے پھسل جائے جو بخت نہیں ما
اک بار جو کھو جائے وہ وقت نہیں ما

❁❁❁

لا لا لا لا لا لا لا - وکی، قاسم، علی رضا - لا لا لا لا
دل میں لے کر چوکے چھکے - کرکٹ کے میدان میں پہنچے
افضل اور عثمان بھی آئے - ذی شان اور سلمان بھی آئے
اپنے اپنے ساتھی چن کے - ٹاس کی خاطر کیپٹن نکلے
ٹیموں میں پھر میچ پڑا - لا لا لا لا لا لا لا

وکی بالنگ کرنے نکلا۔ لمبا سا اسٹارٹ تھا اس کا
قاسم نے جب بیٹ گھمایا - پہلے بال پہ چوکا مارا
اگلی گیند پہ کیچ جو اچھلا - ذی شان نے بھاگ کے پکڑا
پھر تو آیا خوب مزا - لا لا لا لا لا لا لا
پھر تو ڈھیروں رنز بنے۔ چوکے چھکے خوب لگے
کھیل کا ہر پل رنگ نیا - وکٹ اڑی تو کیچ گرا
رن آؤٹ جو ہوا اویس - چھڑ گئی آپس میں یہ بحث
آؤٹ وہ آخر تھا، نہ تھا - لا لا لا لا لا لا لا

❁❁❁

الف سے ابو الف سے امی
ب سے بہن اور بھائی
پ سے اپنا پیارا پیارا پیارا پاکستان

اس کے رستے باغوں جیسے
جگنو، چاند، چراغوں جیسے
خوشبو خوشبو موسم سارے، بھرے پرے کھلیان
پ سے اپنا پیارا پیارا پیارا پاکستان

شہد سے میٹھا نام ہے اس کا
روشن ہر اک بام ہے اس کا
ایک لڑی کے موتی ہیں سب بچے پیر جوان
پ سے اپنا پیارا پیارا پیارا پاکستان

❁❁❁

ایک تھا ملا نصرالدین
کرتا تھا باتیں نمکین
کام تھا اس کا احمق بننا
سیدھی بات کو الٹا کرنا
کھانے پینے کا شوقین
ایک تھا ملا نصرالدین
اس سے ہیں منسوب لطیفے
مزے مزے کے ڈھیروں قصے
خوشیوں کی تھا ایک مشین
ایک تھا ملا نصرالدین

ایک گدھا تھا اس کے پاس
ایک گدھی تھی جس کی ساس
اور بچے تھے اس کے تین
ایک تھا ملا نصرالدین

❁❁❁

ون ٹو تھری فور
سب نے مل کر ڈالا شور
پکنک پر ہم جائیں گے
کھیلیں کودیں گائیں گے
جنگل میں دیکھیں گے مور
ون ٹو تھری فور۔

فور فائیو سکس اینڈ سیون
پاک وطن ہے اپنا گلشن
اس کے پیارے پھول ہیں ہم
یہ عامل، معمول ہیں ہم
مہکا مہکا روشن روشن
فور فائیو سکس اینڈ سیون۔

سیون ایٹ نائن ٹین
لے کر اپنا اپنا پین
ایم سے لکھو تم ملتان
ڈی سے ڈیرہ غازی خان
ای سے ایگ اور ایچ سے ہین
سیون ایٹ نائن ٹین

✿✿✿

مجھے اپنے جینے کا حق چاہیے
زمیں، جس پہ میرے قدم ٹک سکیں
اور تاروں بھرا کچھ فلک چاہیے
مجھے اپنے جینے کا حق چاہیے

نعمتیں جو میرے رب نے دھرتی کو دیں
صاف پانی، ہوا، بارشیں، چاندنی
یہ تو ہر ابنِ آدم کی جاگیر ہیں
یہ ہماری تمہاری، کسی کی، نہیں
مجھ کو تعلیم، صحت اور امید کی
سات رنگوں بھری اک دھنک چاہیے
مجھے اپنے جینے کا حق چاہیے

نہ ہوا صاف ہے، نہ فضا صاف ہے
وہ جو آبِ بقا تھا وہ نا صاف ہے
زمین ہو، سمندر ہو، یا آسماں
اک ذرا سوچئے اب کہ کیا صاف ہے!
موت سے پُر خطر ہے یہ آلودگی
دوستو دل میں تھوڑی کسک چاہئے
مجھے اپنے جینے کا حق چاہئے

✿✿✿

ہم ہیں پھولوں کے رکھوالے
رنگوں کی توقیر کے وارث
خوشبو کے متوالے
ہم ہیں پھولوں کے رکھوالے

سیدھی راہ پر چلتے جائیں چاہے جتنی لمبی ہو
بس اس چیز کو اپنا جانیں جو محنت سے جیتی ہو
کام کریں سب کرموں والے
ہم ہیں پھولوں کے رکھوالے

جیون کی ہر راہ گذر سے کانٹے چُنتے جائیں
آنکھوں آنکھوں سانجھ سفر کے سپنے بُنتے جائیں

نکھریں چاروں اور اُجالے
ہم ہیں خوشبو کے متوالے

❁❁❁

آیا ننجا ٹرٹل آیا
ہر بچے کے دل کو بھایا
بھول گئے سب ہاتھی گھوڑے
ایسا اس نے رنگ جمایا
آیا ننجا ٹرٹل آیا

فلموں میں ہے اس کا چرچا
وڈیو گیم میں شہرہ اس کا
کارٹون میں سب پر چھایا
آیا ننجا ٹرٹل آیا

جب سے پایا ہے گڈو نے
جتنے بھی تھے کھیل کھلونے
سب سے اس کا دل اکتایا
آیا ننجا ٹرٹل آیا

✿✿✿

پنجابی گیت

سوہنا پاکستان

جُگ جُگ جیوے روشن تھیوے

ہور ودھائے شان

مرا سوہنا پاکستان

سونے ورگی مٹی اس دی چاندی ورگا پانی

غیر بہاراں نالوں چنگی ایس دی رُت خزانی

ساڈے لئی تے پاک وطن دی

دھرتی اے اسمان

جگ جگ جیوے روشن تھیوے

سوہنا پاکستان

رَل مِل کے جے کٹن لگئے کٹ جاندے نیں دکھ
آ جا مل کے بوئیے سجنا آون والے سکھ
ہک نال ہک ملا کے چلئے
بن جایئے چٹان
جگ جگ جیوے روشن تھیوے
سوہنا پاکستان

❁ ❁ ❁

میں واری واری جاں
وسدے رہن ہمیشہ تیرے، بیلے، کھیت گراں
میں واری واری جاں
ڈالی ڈالی پھل پئے مہکن
تیری سبز ہوا اچ لہکن
ارماناں دے پنچھی چہکن
ماں دی گودی وانگوں لگے
تیری ٹھنڈی چھاں
میں واری واری جاں

نوکی منگن چن تے تارے
مینوں ہر اک شے توں پیارے
تیرے روشن برج منارے
میرے دل دے ورقے ورقے لکھیا تیرا ناں
میں واری واری جاں

✿✿✿

اساں قول نبھانا اے
گہنا جندڑی دا
تیرے ناویں لانا اے

ہر بھیت نوں کھولے گا
اے پیار دا جادو تے
سر چڑھ کے بولے گا

ہر رنگ اچ پیارا اے
سوہنا سبھناں توں
ساڈا چن تے تارا اے

اک پیر نہ ڈولے گا
واج تے وطناں دی
ساڈا لُوں لُوں بولے گا

✿✿✿

ساری کھیڈ زبان دی اے
ویلے نوں پرچان دی اے
بندے اوتھے کیہہ کرسن
جتھے ہر شے جنس دکان دی اے
ساری کھیڈ زبان دی اے
نیت جے نہ سچّی ہووے فیر کاہدے اشنام
لکھتاں پڑھتاں کس کاری جد دل وچ نئیں احترام
چڑھدے سورج نوں ہر بندہ نیوں نیوں کرے سلام
ہن - ایہو رسم جہان دی اے
ساری کھیڈ زبان دی اے

اکھاں جے کر ساتھ نہ دیون جُھوٹھے سب اقرار
ردّی دے مُل وکدے یارو وعدے وچ بزار

لفظاں دی اک کھیڈ محبت، اک افسانہ پیار
جھوٹھوں سچ بنان دی اے
ساری کھیڈ زبان دی اے

کاں وی چِٹا ہو سکدا اے کالا ہو جائے دِن
ست ویاں دا سو کر دیندی زورا ور دی گِن
بھادوں دا اوہ مینہ بن جاوے ہووے جے کن من
گل ساری رولا پان دی اے
ساری کھیڈ زبان دی اے

شہر در شہر
سفرنامہ
امجد اسلام امجد
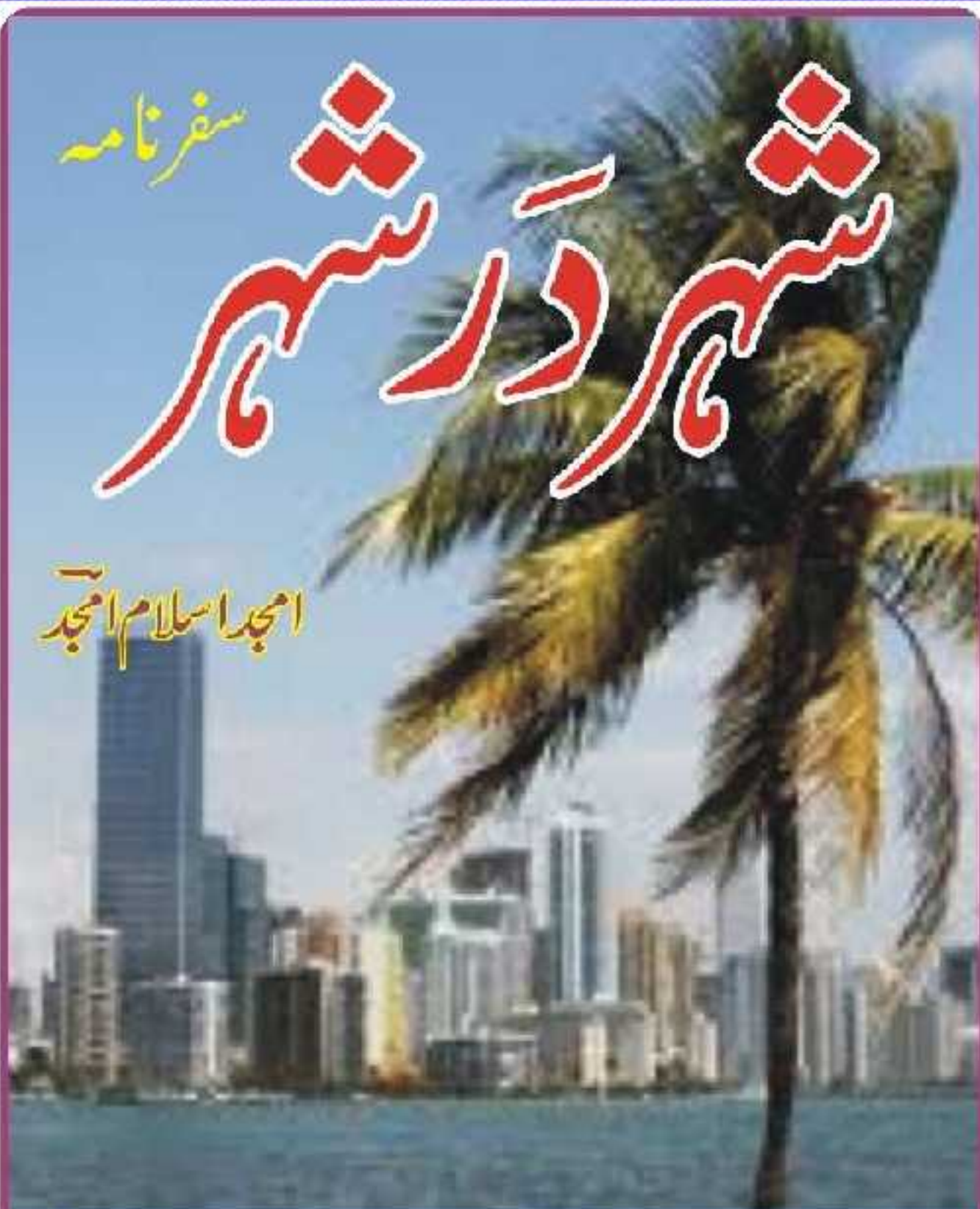
شہر در شہر

سفرنامہ

امجد اسلام امجد

سامان سفر

برسوں پہلے جب کلیم الدین احمد نے اردو غزل کو ''نیم وحشی صنف سخن'' کہا تو ادب اردو کے حلقوں میں کم اور ایم اے اردو کی کلاسوں میں اس کا بہت چرچا ہوا تھا۔ اب سے اٹھارہ برس پہلے جب میں اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے اردو کی کلاس میں داخل ہوا تھا تو یہ جملہ کم و بیش ہر نقاد کے یہاں کسی نہ کسی رنگ میں سنائی دے رہا تھا۔ موجودہ طالب علموں سے گزشتہ دنوں بات چیت کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ اس کی بازگشت ابھی تک فضا میں تیر رہی ہے۔ اس حوالے سے ''مشاعرے'' کے ادارے پر غور کیا جائے تو یہ کچھ کچھ ''چڑیا گھر'' کے قریب نکلے گا کہ اس میں قدم قدم پر اس وحشت کے شکار اپنی اپنی بولیاں بولتے نظر آتے ہیں۔ میر تقی میر سے ایک شعر موسوم ہے جس سے کچھ محققین کو اختلاف ہے۔

شعر یوں ہے:

شکست و ریخت نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

اب یہ شعر میر کا ہے یا نہیں اس سے مجھے یا آپ کو غرض نہیں کہ شعر بہر حال اچھا ہے اور اچھے شعر کے سلسلے میں شعر دیکھنا چاہیے۔ شاعر کی رجسٹریاں نہیں چیک کرنا چاہئیں۔ ہاں اس کے دوسرے مصرعے میں ترمیم کی گنجائش ہے یعنی اگر یہ یوں ہو ''مشاعرہ تو دل ناتواں نے خوب کیا'' تو اس بظاہر بے ضرر سے مصرعے میں تلازمات کا ایک جہاں آباد ہو جائے گا' مثلاً یہی دیکھئے کہ وطن عزیز سے بارہ ہزار میل دور منفی ۲۵ درجے سنٹی گریڈ درجہ حرارت میں' ایک طویل و عریض برفستان میں دو تین سو شریف خواتین و حضرات ''واہ واہ' سبحان اللہ' مکرر ارشاد اور پھر عطا فرمائیے گا'' کا شور مچا رہے ہیں اور ہم لوگ انہیں دے غزلوں پہ غزلیں سناتے چلے جا رہے ہیں۔ اس عالم میں جمیل الدین عالی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی' امجد صاحب! یہ آپ کے کلیم الدین احمد قسم کے صاحبان کچھ بھی کہہ لیں' یہ سالی غزل ہے بڑی سخت جان چیز۔ نہ یہ خود مرے گی نہ اردو کو مرنے دے گی۔''

اس پر مجھے یاد آیا کہ تین برس قبل ایوان غالب' دہلی میں ہم چند پاکستانی شعراء کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا انتظام کیا گیا تھا جو

بعد میں مشاعرے میں تبدیل ہوگیا۔ وہاں کلیم الدین احمد بھی موجود تھے (انہیں غالباً انہی دنوں پدم شری یا کوئی اور اسی نوع کا بڑا اعزاز ملا تھا) اور خوب بڑھ چڑھ کر داد دے رہے تھے۔ اب یہ اعجاز غزل کا تھا یا مشاعرے کا' اس کا فیصلہ مشکل ہے۔

تو ہوا یوں کہ یہ مشاعرے ہمیں کھینچ کر شمالی امریکہ کے پانچ ہفتے کے ایک ''مشاعراتی دورے'' پر لے گئے۔ اس دوران میں ہم نے کینیڈا کے چھ اور امریکہ کے تین شہروں میں مشاعرے پڑھے اور ہر جگہ سامعین نے ہمیں لیموں کی طرح نچوڑ کر سنا۔ ہم کل چار لوگ تھے۔ پاکستان سے میرے علاوہ جمیل الدین عالی اور پروین شاکر اور ہندوستان سے علی سردار جعفری۔ ہم سب کو تقریباً آدھ آدھ گھنٹے فی کس پڑھنا پڑتا تھا اور چونکہ مشاعروں میں پڑھنے والی چیزیں ہر شاعر کے پاس چند ہی ہوتی ہیں اس لیے پروگرام کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے ہم چاروں کو ایک دوسرے کا تقریباً سارا مشاعراتی کلام زبانی یاد ہوگیا تھا۔

لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ سب کچھ تھا کیا' اور کیسے شروع ہوا۔ گزشتہ تین چار برس سے شعراء کی کچھ ٹولیاں بیرون پاکستان مشاعروں میں خاصی کثرت سے آجا رہی ہیں۔ خود میرے اپنے پاسپورٹ پر لگی ہوئی دونوں غیر ملکی مہروں کا تعلق مشاعروں سے ہے۔ انبالہ کے راجندر ملہوترا فیم ''شام بہار'' اور پھر اس کے بعد متحدہ عرب امارات کے مشاعرے۔ یہ دونوں سفر چونکہ لگ بھگ ایک ایک ہفتے کے دورانیے کے تھے۔ اس لیے ان میں انگریزی والے Suffer کی کیفیت پیدا نہ ہوسکی۔ گھر والی اور بال بچوں نے بھی یہ ''چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں'' سمجھ کر اس صورت حال سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ مگر اب جو امریکہ اور کینیڈا سے مشاعروں کی دعوت آئی تو ساتھ مسائل کا ایک انبار لائی۔ فاصلوں کی طوالت' محکمے سے چھٹی' گھر سے اتنی دوری' مجوزہ ٹی وی سیریل ''وقت'' کے سلسلے میں التواء کا بندوبست' اسٹیج ڈرامے ''کس کو کہہ رہے ہو'' کے ضمن میں آرٹ کونسل سے ڈیٹ لینے اور متعلقہ آرٹسٹوں سے بات چیت کا مسئلہ' امروز میں ہفتہ وار کالم ''چشم تماشا'' کی باقاعدگی کو قائم رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ گزشتہ برسوں میں جو گروپ امریکہ اور کینیڈا کی طرف گیا تھا وہ کوئی اچھی خبریں لے کر نہیں آئے بلکہ کچھ احباب تو باقاعدہ روتے ہوئے آئے تھے کہ سفر کی کثرت اور مشاعروں کی افراط نے ان کا بھرکس نکال دیا ہے۔ ایک دو حضرات ایسے بھی ملے جو سنجیدگی سے شاعری ترک کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

کراچی کے دوستوں سے تو اس سلسلے میں اتنا رابطہ نہیں رہا مگر لاہور اور راولپنڈی سے جو بھی گیا حیران و پریشان سا آیا۔ برادرم منیر نیازی چونکہ پہلے سے حیران واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی حالت سراسیمگی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ البتہ ایک کشور ناہید تھیں جو جیسی خوش خوش گئی تھیں اس سے زیادہ خوش خوش واپس آئیں۔ سو یہ تو کشور کا کمال ہے کہ وہ ہر مقام پر ہنس سکتی ہیں۔

آغاز سفر سے کوئی دو تین ماہ قبل برادرم عزیز و بزرگ جمیل الدین عالی سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ ٹورنٹو سے اشفاق حسین کا خط آیا ہے۔ آپ کا پتا پوچھا ہے اور ساتھ ہی یہ دریافت کیا ہے کہ کیا آپ نومبر میں ایک مہینے کے لیے کینیڈا آ سکتے ہیں۔ میں نے اسے ایک رسمی قسم کا استفسار سمجھا کیونکہ ایسے پروگراموں کی اطلاع سال میں کئی مرتبہ ملتی اور بچھڑتی رہتی ہے۔ میں نے سرسری سے انداز میں اپنا این سی او دیا مگر ساتھ ہی ان خدشات کا اظہار بھی کیا جو گزشتہ رہروان شوق مشاعرہ کو پیش بلکہ درپیش آ چکے تھے۔ عالی بولے" ارے بھائی' میں تو خود ان تجربات سے گزرا ہوں بلکہ دوبار کا'' کینیڈا گزیدہ'' ہوں۔ مگر اب حالات کچھ اور ہیں۔ ان لوگوں نے بھی اپنے تجربات سے سیکھا ہے اور ہم نے بھی۔ چنانچہ اب کے سفر میں وہ '' خرکاری'' نہیں ہوگی اور مشاعرے بھی پہلے کی نسبت بہت کم رکھے جا رہے ہیں۔ کل نو مشاعرے ہیں۔ ہر ہفتے اور اتوار کو مشاعرے ہوں گے اور باقی کے پانچ دن گھومنے پھرنے اور آرام کرنے کے لیے چھوڑے جا رہے ہیں۔

میں نے کہا' جناب آپ تو مجھ سے کم و بیش میری عمر جتنے سینئر مشاعرہ باز ہیں' آپ کو تو پتا ہے منتظمین مشاعرہ کے کھانے اور دکھانے کے دانت علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ آپ نے ان کے بارے میں غالب کا وہ شعر نہیں سنا۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

عالی نے شعر کے اس نئے محل استعمال کی داد دی اور بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے اس واقعے کا ذکر دوستوں اور گھر والوں سے بھی نہیں کیا کیونکہ اس وقت نہ میری نیت تھی اور نہ اس پروگرام کے صورت پذیر ہونے کا یقین۔ مگر جب ایک رات گیارہ بجے کے قریب کراچی سے عالی صاحب کا فون آیا کہ اشفاق کے سسر اعجاز بزمی صاحب میرا ٹکٹ لے کر آگئے ہیں اور ۱۳ نومبر کو روانگی ہے تو چند لمحے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ مستقبل قریب کی بے شمار مصروفیات سوالیہ نشان بن کر میرے سامنے قطاریں باندھنے لگیں۔ عالی پروگرام کی تفصیلات بتانے لگے مگر میرا ذہن انہی چکروں میں الجھا ہوا تھا کہ عالی صاحب کو کس طرح بتاؤں کہ میرا اتنے لمبے عرصے کے لیے گھر سے نکلنا ممکن نہیں۔ وہ منتظمین تک میری معذرت پہنچا دیں۔ مگر جب عالی نے یہ کہا کہ میں نے آپ کی رضامندی کی اطلاع انہیں پہنچا دی تھی اور آپ کو لانا انہوں نے میرے ذمے لگا دیا ہے تو میرے لیے بات کرنا مشکل ہوگیا۔ اسلام آباد کی ملاقات میں رواداری میں کی گئی بات کمٹ منٹ بن جائے گی' اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا' بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں پہلے تول' پھر بول۔

فون رکھنے کے بعد میں نے فردوس کو آواز دی جو دوسرے کمرے میں بچوں کے یونیفارم پریس کر رہی تھی۔ پہلے تو وہ میری بات کو مذاق سمجھی مگر جب اسے یقین ہو گیا کہ میں سنجیدہ ہوں اور عالی صاحب میرے حوالے سے وعدہ بھی کر چکے ہیں تو وہ بھی پریشان ہو گئی اور کچھ ایسے مسئلے پیش کئے جو مسائل کی فہرست میں پہلے سے شامل نہیں تھے۔ میں نے حوصلہ ہار دیا کہ ان حالات میں سوائے معذرت کے میرے پاس کوئی چارہ نہیں لیکن اگلے روز جس جس دوست سے بات کی اس نے بہت جھاڑ پلائی کہ عقل کرو ایسا موقع روز روز نہیں ملتا۔ اتنی لمبی مفت سیر یل رہی ہے' دنیا دیکھو گے' تمہارے علم' تجربے اور مشاہدے میں اضافہ ہوگا' تمہاری ذات اور تحریریں نئے امکانات سے آگاہ ہوں گی اور پتا نہیں کیا کیا ہوگا۔

دنیا دیکھنے کا چور تو ہر شخص کی طرح میرے دل میں بھی بیٹھا تھا چنانچہ اب میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اگر اس دعوت کو قبول کر لیا جائے تو مسائل کیسے حل ہوں گے۔ اس ضمن میں مختلف بزرگوں اور مشاہیر کے اقوال نے بے حد مدد دی جن میں سفر کے فضائل کے ساتھ ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ دنیا کے کام دریا کے پانی کی طرح ہمہ دم رواں دواں رہتے ہیں اور کسی شخص کے رکنے یا ادھر ادھر ہو جانے سے زندگی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ اگلے دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں نے متعلقہ مسائل اور ان کے ممکنہ حلوں کی ضرب' جمع' تقسیم کی اور رات کو عالی صاحب سے فون پر پتا کیا کہ سفر کے لیے مجھے کیا کیا تیاریاں کرنی چاہئیں۔

عالی نے پوچھا۔ ''آپ نے زیادہ سے زیادہ کتنی سردی دیکھی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اپنے لاہور میں دسمبر جنوری خاصے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ ہمارے غلط انعام میں قلفی اور دلی کے روزمرے میں قلفی جم جاتی ہے۔''

عالی کی مسکراہٹ ٹیلیفون پر آئی۔ بولے ''برف باری کے سلسلے میں آپ کا کتنا تجربہ ہے؟''

میں نے بتایا کہ دو تین بار مری کی برفباری دیکھی ہے۔ عالی نے پوچھا ''کیسی لگی؟''

''دیکھنے میں اچھی' بھگتنے میں تکلیف دہ۔ ہڈیوں میں سردی گھسنے لگتی ہے۔''

عالی نے کہا۔ ''کینیڈا میں ان دنوں نارمل درجہ حرارت چھ سے تیس درجے منفی سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔''

''اتنا تو ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے۔ میں نے کئی بار ٹی وی پر دیکھا اور سنا ہے۔''

''بھائی میرے آپ نے فارن ہائیٹ میں سنا ہوگا۔''

مجھے اپنی غلطی کا احساس تو ہو گیا مگر میں نے ڈھیٹ بن کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''بہت فرق پڑتا ہے بھائی....... جتنے زیادہ سے زیادہ گرم کپڑے رکھ سکو رکھ لینا۔ہم اونی بنیان کے اوپر دو سویٹریں خالص کشمیری پشمینے کی ان پر گرم کوٹ اور اس کے اوپر ایک اوورکوٹ پہنتے ہیں جو خصوصی طور پر سائبریا کی برفستانی ہواؤں کے لیے بنایا گیا ہے مگر اس کے باوجود سردی مسلسل مزاج پوچھتی رہتی ہے۔''

میں نے اپنی عمر کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''وہ تو ٹھیک ہے عالی صاحب' مگر آخر لوگ وہاں رہتے بستے اور کام بھی تو کرتے ہیں۔سردی برحق مگر یہ آپ کچھ زیادہ مبالغے سے کام نہیں لے رہے؟''

''دیکھو بھائی' ہمارا کام آپ کو سمجھانا تھا' سو سمجھائے دے رہے ہیں۔آگے آپ کی مرضی ہے۔ویسے احتیاطاً کسی سے پوچھ لیجیے گا کہ منفی درجہ حرارت کیا ہوتا ہے؟''

عالی صاحب کے لہجے کی سنجیدگی اور میری حجت سے پیدا ہونے والے کبیدگی نے فون کی اس گفتگو کا درجہ حرارت بھی خاصا گرا دیا تھا چنانچہ میں نے زبردستی ہنستے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے' میں اپنے سارے گرم کپڑے رکھ لیتا ہوں۔اوورکوٹ نہیں ہے' یہاں سے خرید تو بہت مہنگا پڑے گا' وہیں سے لے لوں گا۔کوالٹی بھی اچھی مل جائے گی۔''

''مگر وہاں تک پہنچیں گے کیسے؟''

اب میں سچ مچ ڈرا۔باقی دنیا کے جغرافئے کے بارے میں بھی اپنی معلومات خاصی متنازعہ فیہ ہیں مگر کینیڈا کے بارے میں' خصوصاً اس کے موسم کے بارے میں تو میں سچ مچ بہت کم جانتا تھا۔سو اس وقت تو میں نے عالی صاحب سے وعدے وعید کر لیے کہ نیچے پہننے والے گرم پاجامے (Long John) اونی جرابیں اور برف میں چلنے والے خصوصی جوتے ساتھ لے کر آؤں گا۔لیکن دل میں کچھ کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی کہ اگر وہاں اتنی ہی زیادہ سردی ہے تو کس حکیم نے کہا ہے کہ وہاں ضرور جاؤ۔بیوی سے بات کی مگر اس کا جغرافیہ مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہے چنانچہ اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کینیڈا میں اتنی زیادہ سردی کیوں' کیسے اور کب سے ہے۔

کوئی دو دن بعد دوپہر میں پروین شاکر کا فون آیا۔آواز میں کچھ عجیب طرح کی دہشت اور بھراہٹ تھی۔سلام دعا کے بعد فوراً بولی۔''امجد بھائی! یہ عالی تو وہاں کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتا رہے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ خواہر عزیزی بھی سردی اور برف کی متعلقہ تفاصیل سے آگاہ ہو چکی ہیں لیکن لہجے میں سرسری پن قائم رکھتے ہوئے

پوچھا۔ ''کیوں' کیا ہوا؟''

کہنے لگی ''میرے تو دو بکس صرف گرم کپڑوں سے بھر گئے ہیں۔ اونی استر والے دو جوتے آرڈر دے کر بنوا چکی ہوں۔ جانوروں کی کھال کے بنے ہوئے دستانے' ٹوپی اور گلے میں ڈالنے والا مظلر نما بھی خریدا ہے مگر عالی صاحب اب بھی مطمئن نہیں۔ آخر ایسی بھی کیا قیامت ہو گی وہاں؟''

میں نے گول مول سا جواب دیا۔

''ہاں بھئی! میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر اب عالی صاحب کہہ رہے ہیں تو....... تمہیں پتا ہے وہ ساری دنیا بار بار گھومے ہوئے ہیں اور دو دفعہ کینیڈا بھی جا چکے ہیں۔ اگرچہ ان کی ہدایت میں ضرورت سے زیادہ احتیاط محسوس ہوتی ہے مگر چونکہ .... تو لہٰذا....... تم یوں کرو کہ البتہ....... جیسا وہ کہتے ہیں ویسا ہی کرو۔''

میرے اس لہٰذا' گویا اور البتہ سے پروین کا پہلے سے بیٹھا ہوا حوصلہ مزید بیٹھ گیا۔ کہنے لگی ''میرے تو ڈیپارٹمنٹل امتحان کا چکر پھنسا ہوا ہے' شاید میں جا ہی نہ سکوں۔''

میں نے خود نروس ہونے کے باوجود اسے حوصلہ دیا اور سمجھایا۔ ''عالی صاحب دراصل اس احتیاط میں اپنی عمر کو بھی شامل کر رہے ہیں۔ وہ مجھ سے اٹھارہ سال اور تم سے چھبیس سال بڑے ہیں' اس کو بھی تو حساب میں جمع کرو۔''

اب پتا نہیں یہ میری ان باتوں کا اثر تھا یا پروین کی اپنی قوت خود اعتمادی کہ گفتگو کے اختتام تک وہ کینیڈا کی سردی کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں تھی۔

۱۲ نومبر کو میں باکمال لوگوں کی لاجواب پرواز کے مزے لیتا ہوا نصف گھنٹہ تاخیر سے کراچی ائیر پورٹ پر اترا تو عزیزی محمد اشرف' جو طالب علمی کے دنوں میں محمد اشرف شاہین ہوا کرتا تھا اور طلباء کی ترقی پسند اور انقلابی جماعت کا لیڈر ہونے کے باوجود پانچ وقت کا نمازی تھا' ائیر پورٹ پر میرا منتظر تھا۔ اورینٹل کالج کے شعبہ اردو سے الائیڈ بینک کے زونل چیف اور اے وی پی ہونے اور اس کے بعد کوڈک فلم والوں کی پاکستان میں پہلی لیبارٹری کا انچارج ہونے تک اٹھارہ برسوں کی شب و روز محنت کا بہت معمولی سا اثر اس کے بالوں کے رنگ پر نظر آتا تھا لیکن اس کا دبلا پتلا جسم اور بچوں جیسا چہرہ دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عمر کی چالیس بہاریں دیکھ چکا ہے۔ اس نے بتایا کہ گھر جانے سے پہلے کچھ دیر ہمیں انٹر فلو ایڈورٹائزنگ کے دفتر میں رکنا ہے کیونکہ وہاں ان کی لیبارٹری کی اشتہاری فلم تیار ہوئی ہے جسے دیکھنے اور پاس کرنے کے لیے پروگریسو ٹیڈرز کے مالکان صدیق اور ادریس صاحبان بھی آ

رہے ہیں اور مجھے اس موقعے پر خاص طور سے مدعو کیا گیا ہے۔ انٹر فلو کے طاہر خاں سے بھی میری پہلے کی سلام دعا ہے اور صدیق اور ادریس برادران سے بھی ایک رشتہ محبت استوار تھا چنانچہ تیس سیکنڈ کی اشتہاری فلم دیکھنے کی یہ محفل تین چار گھنٹے تک جمی رہی۔

اگلی صبح میں پروگرام کے مطابق ٹھیک دس بجے عالی صاحب کے دفتر پہنچ گیا جہاں اسلامیہ کالج کے دنوں کے دوست افسانہ نگار عباس رضوی سے ملاقات ہوئی جو عالی صاحب کے سیکرٹری پی آر او کا کام کر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ عالی صاحب کا فون آیا تھا' وہ پہنچنے ہی والے ہیں۔ عباس رضوی عالی صاحب کے بتائے ہوئے تقریباً بتیس مختلف کاموں کی انجام دہی میں مصروف تھا۔ چنانچہ اسے پریشانی سے بچانے کے لیے میں نے اخبارات منگوا لئے اور ایسی دلجمعی سے انہیں پڑھنا شروع کیا جیسے آج اخباروں میں سچ مچ کوئی خبر آ گئی ہو۔

عالی آئے تو میں اخباروں کی پرنٹ لائن تک دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ مجھ سے تاخیر کی معذرت کے دوران انہوں نے اتنے ٹیلیفون کئے اور اپنے پی اے اور عباس رضوی کو اتنے بے شمار کام لکھوائے کہ معذرت کا جملہ تقریباً ایک گھنٹے میں مکمل ہوا۔

عالی صاحب کی لغت میں دو جملے مجھے بہت پسند آئے۔ جہاں ہم عام طور پر ''وغیرہ وغیرہ'' کہنا چاہتے ہیں وہاں عالی صاحب ''تو چل میں چل'' کہتے ہیں۔ مثلاً

''جگر صاحب کا ترنم ایک مخصوص انداز کا تھا۔ اس کے بعد ہم نے اور زہرہ (نگار) نے اسے پکڑا اور پھر تو چل میں چل۔''

ان کا دوسرا محبوب تاثریہ جملہ یا لفظ ''چپڑ قنات'' ہے۔

''بھئی اللہ بخشے فلاں بزرگ بڑے چپڑ قنات شاعر تھے۔''

''ایسا چپڑ قنات قسم کا کھانا خدا پھر کبھی نہ کھلائے۔''

عالی بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے ہی نہیں ان کے بھیدی بھی ہیں۔ ادیبوں کی سیاست وغیرہ کا جتنا تجربہ انہیں ہے شاید ہی کسی اور زندہ ادیب کو ہو۔ تجربے اور عمر میں بھی ہم سے بہت بڑے ہیں۔ چنانچہ سفر کے سلسلے میں وہ مجھے اور پروین کو بچوں کی طرح ہدایات دے رہے تھے۔ میں تو ان کا مزاج دان ہونے کی وجہ سے ان کی اس وقت کی گھبراہٹ اور ہم دونوں کے بارے میں محافظت اور رہنمائی کے جذبے کو سمجھ رہا تھا مگر پروین جو اپنی جگہ پر بہت لیے دیے رہنے والی خاتون ہے' خاصی جز بز ہو رہی تھی خصوصاً جب پاسپورٹ گھر چھوڑ آنے پر عالی صاحب نے اسے جھاڑ پلائی تو وہ سخت پریشان ہو گئی۔ صورت حال خاصی گھمبیر تھی کیونکہ پاسپورٹ کے بغیر ہمیں پیرس کا ویزا نہیں مل سکتا تھا اور قونصلیٹ کے ویزا آفس کے بند ہونے میں

صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ اگر ہم پاسپورٹ پروین کے گھر سے لینے جاتے تو قونصلیٹ کا وقت ختم ہو جاتا۔ بہر حال ہم نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور کسی نہ کسی طرح پیرس کا ویزا لینے میں کامیاب ہو گئے۔

واپس پہنچے تو عالی ابھی تک اپنے سفر کی فہرستوں میں الجھے ہوئے تھے اور اپنے بریف کیس کو بار بار کھول اور بند کر رہے تھے (جس کا کوئی واضح مطلب آخر تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا) کہ ان کے دفتر کے ساتھ امجد علی صاحب کمرے میں آئے۔ چونکہ عالی صاحب کو مدت سے جانتے تھے اس لیے ان پر ان کی پریشانی کا کوئی اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا بلکہ الٹا وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ عالی صاحب نے ان کے ذمے بھی چار چھ کام لگائے جس پر امجد علی صاحب نے مسکراتے ہوئے یقین دہانی کرائی کہ سب کام ہو جائیں گے' آپ تسلی سے تشریف لے جائیں اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے عالی کے بارے میں بزبان انگریزی یہ جملہ کہا۔

Not to know him is a tragedy, but to know him is a greater tragedy.

(عالی سے متعارف نہ ہونا ایک المیہ ہے مگر ان سے متعارف ہونا اس سے بڑا المیہ ہے)

عالی سے میرا تعارف کئی برس پرانا ہے لیکن سفر کے ان پانچ ہفتوں میں ان کو قریب سے جاننے کا موقع ملا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجموعی طور پر عالی بہت ہی اچھے انسان ہیں اور امجد علی صاحب کے جملے کا آخری حصہ محض تفنن طبع کے طور پر تھا۔ ویسے وہ خود بھی حقیقت کے بجائے رعایت لفظی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایسا ہی مظاہرہ ایک جگہ آسکر وائلڈ نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

Some people are wise and others are otherwise.

سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور Tension کی وجہ سے پیٹ میں چوہے گشت کر رہے تھے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اب ہمیں اپنے اپنے گھروں کو چلنا چاہیے۔ کچھ کھا پی کر آرام کر لیں کیونکہ آگے لمبا سفر ہے۔ عالی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں دو تین ہنکارے بھرے' دانتوں پر انگلی پھیری اور ہمارے اداکار بھائی طلعت حسین کی طرح لمبے لمبے وقفے لیتے ہوئے بتایا کہ ہمارے لنچ کا انتظام موجود ہے اور ساتھ ہی اپنے مربیانہ طنز کے ساتھ کہا۔

''بھئی آپ دونوں بڑے لوگ ہیں' ملک کے مشہور ڈرامہ نگار' شاعر اور دانشور ہیں۔ یہ خاتون بھی حکومت پاکستان کی اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود بہت بڑی شاعرہ ہیں اس لیے اگر اس لنچ کو خاطر خواہ نہ پائیں تو فدوی کو معاف فرمائیں کیونکہ ہم یہی کچھ کھاتے اور کھلاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''عالی صاحب! اس کھانے کا تعلق ہمارے اوصاف حمیدہ سے کیوں قائم کیا جارہا ہے؟''
بولے'' بھئی تم جدید نسل کے لوگ ہو' ہمیں دل سے مانتے وانتے تو نہیں اس لیے ذرا تم لوگوں سے احتیاط ملحوظ رکھ کر بات کرتے ہیں۔''

شروع شروع میں عالی صاحب کا یہ انداز پروین کو بہت کھلتا تھا چنانچہ اس نے اپنی ناراضگی کا اظہار اس طرح کیا کہ کباب کا تھوڑا سا ٹکڑا کھا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا حالانکہ مجھے یقین ہے اس وقت اسے معقول بھوک لگی ہوئی تھی۔ عالی صاحب اپنے جملے اور اس کے ردعمل سے بے خبر پھر سے اپنے پی اے اور عباس رضوی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور ان سے ان تمام کاموں کے بارے میں فائنل رپورٹ لے رہے تھے جن کا سلسلہ نہ معلوم کتنے دنوں سے جاری تھا۔ مختلف جگہوں پر ٹیلکس کے ذریعے پیغامات پہنچانے تھے' کتابیں جمع کرنی تھیں' کتابت کا کام تھا' انجمن اردو کے مسائل تھے' بینکنگ کونسل کی طرف سے اشتہاری فلموں کی تیاری کا مسئلہ تھا۔ سفر کے لیے بکس کی خریداری تھی' بینک سے متعلق اعلیٰ سطح پر کچھ تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ ان کا تذکرہ چل رہا تھا۔ مختلف ٹیلیفون نمبر ڈھونڈے جا رہے تھے۔ کلام کے مسودے اور مطبوعہ کلام کے مسائل درپیش تھے۔ گزشتہ دنوں ڈیفنس کے علاقے میں پانی آ جانے کی وجہ سے گھر کے سامان کی جو متاثرہ چیزیں تھیں ان کی مرمت اور صفائی کے ضمن میں مختلف ہدایات تھیں اور انہی کے درمیان وقفے وقفے سے ہمیں سفر کے سلسلے میں آخری ہدایات دینے کا سلسلہ جاری تھا کہ امیگریشن والوں سے کیا بات کرنی ہے اور کس طرح کرنی ہے۔

جب میں عالی صاحب کے دفتر سے اشرف کے گھر کی طرف چلا تو مجھے پورا یقین تھا کہ عالی ائیر پورٹ پر نہیں پہنچ سکیں گے کیونکہ ان کے مذکورہ مسائل کے پھیلاؤ کو سمیٹنا الہ دین کے جن کی بساط سے بھی باہر تھا لیکن وہ ہم دونوں سے پہلے ائیر پورٹ پر موجود تھے اور طیبہ بھابھی کو بتا رہے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں انہیں کیا کیا کام کس طرح سے کرنے سے ہیں لیکن یہاں ان کی آواز میں وہ استحکام اور زور نہ تھا جس کا مظاہرہ ہم نے دفتر میں دیکھا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔

مجھے چھوڑنے کے لیے اشرف کے ساتھ ساتھ اختر شاہ المعروف اختر حسین جعفری کسٹم والا بھی آیا تھا۔ چونکہ ہمارے شاعر دوست اختر حسین جعفری '' آئینہ خانہ'' والے بھی ایکسائز اور کسٹم کے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہم نے ان دونوں میں تمیز اور تفریق کے لیے '' کسٹم والے'' اور '' آئینہ خانے والے'' کی شناخت مقرر کی ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں دوستوں میں نوکری کے علاوہ اگر کوئی قدر مشترک ہے تو وہ ہماری دوستی ہے۔ اس فرق سے مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔

دوسوداگر دوستوں نے ایک ساتھ گھوڑے خریدے۔ شام کے وقت ایک سرائے میں اترے اور گھوڑوں کو تھان پر باندھ دیا۔ کھانا کھا کر سونے لگے تو ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''بہتر ہے ہم گھوڑوں پر نشانیاں لگا دیں تا کہ صبح ہمیں اپنا اپنا گھوڑا پہچاننے میں دقت نہ ہو۔''

دوسرے نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی نرے بدھو ہو' دونوں کو نشانیاں لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اپنے گھوڑے کی دم کاٹ دو' دم والا گھوڑا میرا بغیر کے تمہارا۔''

ایسے ہی کیا گیا مگر جب صبح اٹھ کر دیکھا تو کسی ستم ظریف نے دوسرے گھوڑے کی دم بھی کاٹ دی تھی۔ اب تو دونوں پریشان ہوئے۔ اگلی رات فیصلہ ہوا کہ ایک گھوڑے کا کان کاٹ دیا جائے تا کہ پہچان میں دقت نہ ہو۔ لیکن اگلی صبح دونوں دوست یہ دیکھ کر پریشان ہوئے کہ کسی نے دوسرے گھوڑے کا کان بھی کاٹ دیا تھا۔

دونوں دوست پریشان کھڑے تھے' اچانک ایک نے چٹکی بجا کر کہا۔ ''اس مسئلے کا ایک حل میری سمجھ میں آیا ہے۔''

''وہ کیا؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''ایسے کرتے ہیں' کالا گھوڑا تم لے لو' سفید میں لے لیتا ہوں۔''

ائیر پورٹ پر پروین کے میاں (ڈاکٹر نصیر) صاحب اسے چھوڑنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ حسب معمول بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ یہاں پروین کی کسٹم افسری کام آئی اور وہیں کھڑے کھڑے ہمارے سارے کام ہو گئے۔ سامان مانٹریال تک براہ راست بک ہو گیا۔ امیگریشن کے فارم وغیرہ بھرے گئے اور ائیر فرانس کے عملے سے بہتر سیٹوں کے لیے بات چیت بھی ہو گئی۔ عالی صاحب نے اپنے مخصوص برانڈ کے سگریٹوں کے دو کارٹن منگوائے اور ایک ایک میرے اور پروین کے سامان میں اس احتیاط سے رکھوایا کہ کہیں کینیڈا کے کسٹم والے زیادہ سگریٹوں پر اعتراض نہ کریں۔ عالی کی یہ احتیاطیں دیکھ کر میں نے کہا۔ ''عالی صاحب! آپ کو تو انجمن احتیاط پسند مصنفین کا صدر ہونا چاہیے تھا۔''

ائیر فرانس کی فلائٹ رات سوا بارہ بجے کی تھی یعنی اصولی طور پر ہمیں اگلے دن میں سفر کرنا تھا۔ چلتے چلتے طیبہ بھابھی نے مجھے روکا اور عالی صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''لو بھئی اب میرا میاں تمہارے حوالے ہے' اس کا خیال رکھنا۔ واپسی پر میں نے تم سے پوری رپورٹ لینی ہے۔''

میں نے عالی کی طرف دیکھا۔ بولے'' کوئی نئی بات نہیں' میاں چالیس برس سے یہ اسی طرح ہماری جاسوسی کر رہی ہیں۔ ہم

بوڑھے ہو گئے ہیں مگران کے وسوسے کم نہیں ہوئے۔انہیں اب بھی شبہ ہے کہ ذرا موقع ملا اور ہم نے کسی میم سے نکاح ثانی پڑھوا لینا ہے۔''

طیبہ بھابھی مسکرائیں اور بولیں۔''تم نے کوئی کم کوشش نہیں کی میاں' میں روک کر نہ رکھتی تو اب تک پتا نہیں تم کیا کیا کر چکے ہوتے۔''

میاں بیوی کی اس مزیدار نوک جھونک کو دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ محبت اور رفاقت کا گھنا اور سرسبز پیڑ وقت کے طوفانوں کو کتنی آسانی سے روک لیتا ہے۔

ائیر فرانس کے جمبو جیٹ طیارے میں ہم تینوں کے علاوہ رنگ و نسل کے صرف دو مسافر تھے اور ان میں سے ایک میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ملکوں کے باشندے نقوش کے اعتبار سے اتنی گہری مماثلت رکھتے ہیں کہ ان کی قومیت کا کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا۔میں نے اپنے ہم نشیں کی طرف چور آنکھوں سے دیکھا جو انگریزی کا ایک ناول انتہائی خضوع و خشوع سے پڑھ رہا تھا۔اس کا تعلق چین' جاپان' انڈونیشیا' کوریا' ویت نام اور اسی طرح کے کسی بھی ملک سے ہو سکتا تھا۔

فرانس کے حسن اور لطافت کے قصوں سے ادب اور فنون لطیفہ کے میدان بھرے پڑے ہیں۔لیکن جہاں تک ہماری نظر جا سکی کوئی ایسا چہرہ نظر نہ آیا جو ہماری نظر کو روک لیتا۔میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ہم تینوں کی سیٹیں الگ الگ تھیں۔پروین اپنی سیٹ میں سمٹی ہوئی ان دو سفید فام ادھیڑ عمر لوگوں کو تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جو اس کے دائیں بائیں بیٹھے ارغوانی شراب سے شغل فرما رہے تھے۔مجھے خیال آیا کہ اگر یہاں پروین کی جگہ برادرم منیر نیازی ہوتا تو وہ ''ام الخبائث'' کی اس افراط کو کس نظر سے دیکھتا۔

عالی صاحب اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی میم سے ہمہ تن محو گفتگو تھے۔بڑی بی کو بھی شاید مدت کے بعد کوئی سامع ملا تھا' اس لیے وہ بہت چہک چہک کر بول رہی تھیں۔میں نے دوبارہ اپنے ہم نشیں پر نظر ڈالی' وہ ابھی تک صفحہ ۱۱۰ پر رکا ہوا تھا۔

یکا یک جہاز میں روشنی سی ہو گئی۔میں نے چونک کر دیکھا۔دھاری دار مردانہ قمیض' سکرٹ اور کوٹ میں ملبوس ایک چمکتی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہ کسی مسافر سے بات کر رہی تھی۔فرانس کے روایتی حسن اور نزاکت کی زندہ تصویر۔میں نے عالی کی طرف دیکھا۔وہ بھی اپنی بڑی بی کو بھول کر ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔مجھے ایک دم عطاء الحق قاسمی کا وہ جملہ یاد آیا جو اس نے پی آئی اے کی ایک فلائٹ کے دوران ائیر ہوسٹس کو دیکھ کر کہا تھا۔

''ایک بات ہے یار! اسلام کہیں اور آیا ہے یا نہیں اس کا تو مجھے پتہ نہیں البتہ پی آئی اے میں ضرور آ گیا ہے۔ دیکھو نا! انہوں نے چن کر ایسا عملہ رکھا ہے جسے دیکھ کر دل میں کوئی برا خیال آ ہی نہیں سکتا۔''

اپنے اخروٹی بال جھلاتی اور مسکراہٹوں کے خوان لٹاتی ہوئی وہ مختلف مسافروں کو چھوٹے چھوٹے ڈبے سے تھمارہی تھی۔ چند لمحوں میں وہ ہماری سیٹوں تک پہنچ گئی۔ میرے ساتھ والے گورے مسافر نے پیکٹ لیتے ہوئے ''میغسی'' کہا۔ عالی صاحب نے مجھے بتایا کہ فرنچ میں شکریہ کہنے کے لیے ''میغسی'' بولتے ہیں اور یہ آواز غ اور گ کے درمیان کہیں ہوتی ہے۔ میں نے بھی حوصلہ کر کے اس قتالہ کو ''میغسی'' کہا۔ اب پتا نہیں یہ میرے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے تھا یا میرے تلفظ میں کوئی ایسی بات تھی اس نے جواب میں مجھے فرنچ کے دو تین جملے کہے اور آخر میں ایک ''میغسی'' بھی جڑ دیا۔ میں نے پریشان سا ہو کر اس کی طرف دیکھا اور انگریزی میں بتایا کہ میں فرنچ نہیں جانتا۔ اس پر اس نے کم و بیش میرے ہی جیسی نیم انگریزی میں بتایا کہ اس کی فرانسیسی کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہے اور اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں بلا تکلف اسے بتاؤں۔ غالباً اس قسم کی صورت حال میں مرحوم ساحر لدھیانوی کو یہ اشتباہ ہوا تھا کہ

یہ تبسم یہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

اس کے دیے ہوئے پلاسٹک کے چھوٹے سے بیگ کو کھولا تو اس میں سے کپڑے کے جوتے' روشنی سے بچنے اور سونے کے لیے آنکھوں پر باندھنے والی پٹی' ٹوتھ برش' سیفٹی ریزر' شیونگ کریم اور ٹوتھ پیسٹ برآمد ہوئے۔ میں نے اپنے برابر والے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں کتاب کی بجائے کسی اور طرف تھیں۔ وہ اس عفیفہ کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے بس چلے تو اتار کر کلیجے میں رکھ لے۔ اس پر مجھے ایک شخص کا قصہ یاد آیا جو کام کی تلاش میں پہلی بار لندن جا رہا تھا۔ یار دوستوں کی گفتگو' انگریزی فلموں اور اپنی سوچوں کی وجہ سے اس کے ذہن پر ''میمیں'' کچھ اس طرح سوار تھیں کہ لندن کے قریب پہنچ کر جب اس کے ساتھی نے اس کا کندھا ہلا کر کہا کہ لندن آ گیا ہے تو وہ غنودگی کے عالم میں ہڑ بڑا کر جاگا اور چاروں طرف دیکھ کر بولا۔

''لندن آ گیا اے....... میماں کتھے نیں؟''

میرے ہم نشیں کے منہ سے کچھ بے معنی سی آوازیں نکلیں اور اس کا داہنا ہاتھ دو تین مرتبہ عجیب سے انداز میں اٹھا مگر کسی بت نیم خواب کی انگڑائی کی طرح راستے میں ہی کہیں رہ گیا۔ مجھے شبہ سا ہوا کہ بھائی صاحب انگریزی میں ''پیدل'' ہیں اور اس وقت ابلاغ کے مسئلے میں گرفتار ہیں۔ اپنے شبے کی تصدیق کے لیے میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ جواب میں اس کے چہرے پر ایک

بدحواس سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہیں چپک کر رہ گئی۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''یہ ائیر ہوسٹس بڑی بے پرواہ ہوتی ہیں' آپ غالباً اسے بلانا چاہ رہے تھے۔''

اس پر اس نے اتنے زور اور تکرار سے Yes, Yes کہا کہ اردگرد کے مسافر چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

میں نے کہا۔ وہ واپس آ رہی ہے' جو بھی کہنا ہے کہو' پھر ان کہا رہ جائے گا۔''

اس کے منہ سے پھر اسی قسم کی بے معنی آوازیں نکلیں اور اس کا ہاتھ ہلنا شروع ہو گیا۔ اب مجھے پتا چلا کہ ہاتھ کی حرکات سے دراصل وہ لفظوں کا کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ عفیفہ کڑی کمان کے تیر کی طرح اس کی طرف دیکھے بغیر آگے نکل گئی۔ اس عزیز نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا' میں نے کہا۔

''ہمارے ایک شاعر مرزا غالب نے اس موقعے کے لیے ایک شعر کہہ رکھا ہے۔ انگریزی ترجمے کے بعد اس میں کچھ رہ تو نہیں جائے گا' پھر بھی تم احتیاطاً سن لو۔'' اس کے بعد میں نے اسے ترجمے کے ساتھ غالب کا یہ شعر سنایا۔

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

دامن کھینچنے کی بات اس کے دل کو لگی۔ وہ کانوں تک سرخ ہو گیا اور نظریں جھکا کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''کہیں برا نہ مان جائے۔''

اب میں محتاط ہو گیا کیونکہ وہ عزیز اردو شاعری کو سنجیدگی سے بر سر عمل لانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے بات بدلنے کے لیے اس کا اتا پتہ پوچھا۔ وہ پتا نہیں کب کا بھرا ہوا بیٹھا تھا' اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس نے پیدائش سے لے کر اب تک اپنی ساری زندگی کے اہم واقعات مجھے سنائے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ بی ایس سی کرنے کے بعد محکمہ جنگلات میں افسر لگا ہوا ہے اور اب ایک کورس کرنے کے لیے دو سال کے وظیفے پر سویڈن جا رہا ہے۔ یہ اس کا پہلا ہوائی سفر ہے۔ اس کی ایک بیوی اور ایک ہی بچہ ہے۔ (جن کی تصویریں مجھے اس نے ثبوت کے طور پر ساتھ ہی دکھا دیں) اسے زیادہ انگریزی نہیں آتی۔ وہ مجھ سے قلمی دوستی کا خواہش مند ہے اور یہ کہ اسے بہت دیر سے پیاس لگی ہوئی ہے مگر ائیر ہوسٹس اس کی بات نہیں سنتی اور اگر سنتی ہے تو سمجھتی نہیں۔

میں نے کہا۔'' اس میں اس بیچاری کا اتنا قصور نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں اور مجھے بھی پتہ نہیں چلا کہ دونوں بار تم نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی یا محض ورزش کر رہے تھے۔'' اس پر وہ عزیز حسب سابق ایک نروس سے انداز میں مسکرانا شروع ہوا اور

مسکراتا ہی چلا گیا۔

میں نے اس کی مسکراہٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تو تمہیں پینے کے لیے کچھ چاہیے؟''

اس پر اس نے پہلے تو زور زور سے یس یس کہا اور پھر ایک دم کچھ سوچ کر رکا اور نو نو کی گردان شروع کر دی۔

میں نے کہا۔ ''بھائی ایک بات پر قائم رہو ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں پیاس لگی ہے مگر میں پیوں گا نہیں۔''

انگریزی میں اس کا جملہ کچھ یوں تھا......

I am thirsty, but no, I won't drink

میں اس کی بات سمجھ گیا مگر محض مزا لینے کے لیے بولا۔ ''سویڈن میں تو بہت سردی ہوتی ہے۔ وہاں کیا کرو گے؟ وہاں تو پیئے بغیر گزارا مشکل ہے۔''

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ادھر ادھر دیکھ کر رازداری سے بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں کبھی کبھی پی لیتا ہوں مگر یہاں نہیں پیوں گا کیونکہ ابھی مجھے دو تین جہاز بدلنے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''لو تم یہ میرے والا اورنج جوس پیو میں اور منگوا لیتا ہوں۔''

اس نے کچھ دیر سوچا اور غالباً اس نتیجے پر پہنچا کہ ایئر ہوسٹس سے بات کرنے کی نسبت میرا احسان اٹھا لینا بہتر ہوگا۔ جوس پینے کے بعد اس نے پھر مسکرانا شروع کر دیا۔

میں نے مڑ کر پروین کی طرف دیکھا۔ وہ اس اثناء میں اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے منکر نکیروں سے کچھ مذاکرات کر چکی تھی کیونکہ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ کی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور پروین کونے والی سیٹ پر ائیر فرانس والوں کی سفید اونی چادر میں لپٹی ہوئی تقریباً سو رہی تھی۔ میں نے عالی صاحب کی طرف دیکھا' ان کی آنکھیں بند تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا جس سے وقفے وقفے کے بعد ہنکارے نشر ہو رہے تھے۔ ان کی ہم نشیں شیمپین کا گلاس سامنے رکھ کر اندیشہ ہائے دور دراز میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور سوچا کہ اس کے ''آرائش خم کا کل'' کے دن کیسے ہوں گے مگر دیر تک غور کرنے کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

میرا ہم سفر ابھی تک صفحہ ۱۱۰ پر رکا ہوا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔ اب اس کی مسکراہٹ میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی مگر میں نے جھلاہٹ کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا پڑھ رہے ہو؟''

اس نے جواب دینے کی بجائے مسکراتے ہوئے کتاب کا ٹائٹل میرے سامنے کر دیا۔ کوئی فضول سا جاسوسی ناول تھا۔ میں نے

محض بات کرنے کے لیے پوچھا۔ ''کیسا ہے؟''

بولا ''پتا نہیں......'' پھر میری حیرت کو دیکھ کر وضاحت کی کہ اصل میں وہ یہ کتاب اپنی انگریزی بہتر بنانے کے لیے پڑھ رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''انگریزی کے سلسلے میں تو شاید یہ کتاب تمہاری کوئی خاص مدد نہ کر سکے۔''

کہنے لگا۔ ''نہیں میں مشکل لفظوں پر نشان لگاتا جا رہا ہوں' یہاں شرم کی وجہ سے ڈکشنری نہیں کھول رہا۔''

اس کی یہ بات سن کر میرا ذہن انگریزی اور ہمارے جیسے ملکوں کے لیے اس کی ضرورت اور اہمیت کی طرف چلا گیا۔ اس جدید اور تیزی سے ترقی کرتی ہوئی دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحصیل کس قدر ضروری ہے اور ہمارے پاس اس تک رسائی کے لیے انگریزی کے سوا کوئی راستہ نہیں مگر ہم نے ۳۷ برس سے اس اہم مسئلے کو بے کار بحثوں کا موضوع بنا رکھا ہے۔ اردو کے لیے شاید ہم دل سے کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے مگر اس عمل میں انگریزی کا بستر بھی گول کر دیا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے مڈل اور میٹرک میں انگریزی لکھنے' پڑھنے اور بولنے کی جو استطاعت بہم پہنچائی تھی ہمارا موجودہ نظام تعلیم بی اے پاس طالب علم میں بھی اتنی صلاحیت نہیں پیدا کر سکتا۔ ملک کی تعلیم حاصل کرنے والی آبادی کا ۹۰ فیصد اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرتا ہے اور جدید علوم کے دروازے پر پہنچ کر ''منہ تکا ہی کرے جس تس کا'' کی مثال سراسیمہ سا ہو کر رک جاتا ہے۔ نہ اسے اردو آتی ہے نہ انگریزی اور نہ کوئی اور مضمون۔

میں نے قدرے ہمدردی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اب کے مجھے اس کی مسکراہٹ زیادہ بری نہیں لگی۔ اس کی اس مسکراہٹ میں تیسری دنیا کے پڑھنے لکھنے والوں کی مخصوص بے بسی اور حیرانی تھی۔ وہ اس جم غفیر کا ایک تنہا مسافر تھا جو ایک ایسی دوڑ میں شریک تھا جہاں ہرنوں کا مقابلہ کچھوؤں سے کرایا جا رہا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے مگر اس سے پہلے کہ میں مغربی سامراج اور جمہوری اور اشتراکی غنڈہ گردی کے بارے میں مزید کچھ سوچتا وہ پھر آ گئی۔ اب کے وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے آتش کا یہ شعر یاد آ گیا۔

صیاد نے تسلی بلبل کے واسطے
کنج قفس میں حوض بھرا ہے گلاب کا

کھانے کی مقدار اور شکل و صورت خاصی معقول تھی۔ مگر اب مشکل یہ آ پڑی تھی کہ کہیں اس میں سور صاحب شامل نہ ہوں۔ میں نے ایک ایک چیز کو چیک کرنا شروع کر دیا۔ سلاد' مکھن' پنیر' چٹنی' روٹی' سویٹ ڈش اور کراکری کو نکالنے کے بعد دو چیزیں بچ گئی

تھیں۔ایک تو کچھ سینڈوچ نما چیز تھی اور دوسری طرف چاولوں اور ابلی ہوئی سبزیوں کے درمیان پڑا ہوا ایک سفید سا گوشت کا ٹکڑا تھا جو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کو کانٹے سے ایک طرف کرتے ہوئے اپنے ہم سفر سے کہا۔ میرا خیال ہے تم بھی سور نہیں کھاتے ہو گے؟''

اس نے ایک بار پھر پہلے زور زور سے یس یس اور پھر نو نو کہا اور پھر دونوں کی وضاحت یوں کی کہ وہ بھی میری طرح مسلمان ہے اور سور نہیں کھاتا۔اب میں نے سینڈوچ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سور کے گوشت کے بارے میں میری معلومات اتنی تھیں کہ یہ سفید سفید ہوتا ہے۔ایک بار میں نے اسے ابوظہبی کے ایک ہوٹل میں دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اسے نوش جان کرنے والے سب کے سب غیر ملکی نہیں تھے۔سینڈوچ میں جہاں اور بہت کچھ تھا وہاں سفید رنگ کا ایک قتلہ سا بھی تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ پنیر ہے۔ہم سفر سے چونکہ تصدیق یا تردید حاصل کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے میں نے اس فتنہ قیامت کے مڑنے کا انتظار کیا اور بتایا کہ میں مذہبی وجوہ کی بنا پر سور نہیں کھا سکتا اس لیے وہ میری رہنمائی کرے کہ اس کھانے میں سور کہاں کہاں ہے؟

اس نے دل میں سور جگا دینے والی مسکراہٹ ساتھ بتایا کہ اس کھانے میں سور کہیں بھی نہیں ہے۔ میں نے سفید ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا۔اس نے کہا کہ یہ ٹرکی ہے۔سینڈوچ والے قتلے کا پتا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پنیر ہی تھا۔ میں ''مغیبی'' کہہ کر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے ہی لگا تھا کہ وہ بولی۔''سور تو اس کھانے میں نہیں ہے لیکن جن دونوں چیزوں کا تم نے پوچھا ہے ان کی تیاری میں سور کی چربی ضرور استعمال ہوئی ہے۔''

میرا ہاتھ وہی رکے کا رکا رہ گیا۔ بڑی دلسوزی اور اپنائیت سے بولی۔''مجھے افسوس ہے کہ اس وقت ہم آپ کو کچھ اور پیش نہیں کر سکتے۔اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لیے کچھ آملیٹ وغیرہ بنا سکتی ہوں۔''

اس نے یہ بات کچھ اس ادا سے کہی کہ مجھے بے اختیار برادر عزیز مستنصر حسین تارڑ یاد آ گیا۔ میں نے سوچا' ہم خواہ مخواہ اس عزیز کی باتوں پر شک کرتے رہے۔ یہاں تو واقعی ایک رنگین داستان محبت کا آغاز ہوا چاہتا ہے مگر اس سے پیشتر کہ میں اس سے آئندہ ملاقات کے وقت اور مقام کے بارے میں کچھ بات کرتا وہ مجھ سے پچھلی سیٹ والے ایک مسافر پر تقریباً جھکتے ہوئے بولی۔''آپ کے لیے گرم دودھ میں ابھی لا رہی ہوں۔''

اس کے اس ہرجائی پن کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ ''اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی'' اور مغیبی کہہ کر اسے ہدایت کی کہ ٹرے اٹھا لو میرا اس وقت کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا اور ہو سکے تو مجھے ایک گلاس اورنج جوس اور لا دو۔اس نے بتایا کہ

ٹرے وہ واپسی پر اٹھائے گی البتہ اورنج جوس جتنا چاہو ابھی مل سکتا ہے۔ اورنج جوس پینے کے بعد میں نے اپنے ہم سفر پر نظر ڈالی جو اپنے ٹرے کی طرف مسلسل تذبذب نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے میرا شانہ ہلایا اور بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا۔ ''یہ سور کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟''

اس پر میں نے اسے احمد ندیم قاسمی کا سنایا ہوا ایک واقعہ سنایا جو کچھ یوں ہے کہ ۱۹۵۶ء میں پاکستانی اخباروں کے ایڈیٹروں کا ایک وفد چین گیا جس کی قیادت صوبہ سرحد کے مرحوم لیڈر خان غلام محمد لونڈ خور کر رہے تھے۔ قاسمی صاحب بتاتے ہیں کہ چینی کھانوں کے ساتھ بھی حرام حلال اور سور کا مسئلہ لگا ہوا تھا اور اگرچہ سب لوگ کھانے میں بے حد احتیاط کرتے تھے مگر ایک دن غلطی سے لونڈ خور سور کا ایک ٹکڑا کھا گئے۔ جب انہیں اپنی غلطی کا پتہ چلا تو ان کی حالت خراب ہو گئی۔ متلی ابکائیاں اور الٹیاں شروع ہو گئیں۔ گلے میں انگلیاں مار مار کر انہوں نے معدہ خالی کیا اور تین دن تک بستر پر پڑے رہے۔ ندیم صاحب کا کہنا ہے کہ میں اور فیض صاحب تیسرے دن ان کے پاس بیٹھے تھے' ان کی طبیعت چونکہ سنبھل چکی تھی اس لیے ہم لوگوں نے شرارتاً پوچھا۔

''خان صاحب' جو ہوا سو ہوا مگر یہ بتائیں کہ تھا کیسا؟''

لونڈ خور نے اپنے مخصوص سرحدی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خنزیر کا بچہ' تھا بہت مزیدار''

اب انگریزی زبان میں اسے یہ سمجھانا کہ ''خنزیر کا بچہ'' ہمارے صوبہ سرحد کی طرف گالی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے' اپنی جگہ پر ایک الگ مسئلہ بن گیا جیسے اگر لفظ ''سالے'' کا انگریزی میں ترجمہ کر کے کسی کو Brother-in-law کہا جائے تو یہ گالی سے زیادہ خیر سگالی کا اظہار نظر آئے گا۔ خیر میں نے کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا دیا کہ خان غلام محمد لونڈ خور کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے بے خیالی کے انداز میں ٹرے کی مختلف چیزوں کو پلٹ کر دیکھا۔ غالباً اسے بہت زیادہ بھوک لگی تھی۔ پھر ٹرکی کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ''یہ ٹرکی کیا ہوتا ہے' کوئی ٹرکش ڈش ہے کیا؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں' یہ ایک پرندہ ہے جو امریکہ میں بہت کثرت سے پایا جاتا ہے۔''

بولا ''حلال ہے؟''

میں نے کہا ''گوشت تو اس کا حلال ہے البتہ اس کا ذبیحہ ہونا مشکوک ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔''

کہنے لگا ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں تو اس طرح کی ہر چیز پر بسم اللہ پڑھ کر شروع کر جاتا ہوں۔ زندہ رہنے کے لیے اتنی لچک تو رکھنی چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں تک تو میں تم سے متفق ہوں مگر یہ سور کی چربی کچھ.......؟''

اس پر وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اسے آسانی مہیا کرنے کے لیے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں اور چادر منہ پر لے کر سونے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سچ مچ اونگھ آ گئی۔ کچھ دیر بعد میری آنکھ کھلی تو اس کی ٹرے غائب تھی البتہ کتاب اور اس کا صفحہ نمبر ۱۱۰ اپنی جگہ پر موجود تھے۔

حلال اور حرام کے اس چکر پر مجھے دلدار پرویز بھٹی یاد آ گیا۔ بھٹی ایک بہت اچھا دوست اور ٹی وی اور اسٹیج کا مشہور کمپیئر تو ہے مگر اس کا اصل کمال آوازوں کی نقالی ہے۔ مختلف لوگوں کی آوازوں، بولنے کے انداز اور مخصوص حرکات کی جتنی خوبصورت اور مکمل نقل وہ اتارتا ہے بہت کم لوگ اس معیار کو پہنچتے ہیں۔ ایک دفعہ اس نے دوستوں کی محفل میں ایک بہت مشہور مولانا کی نقل اتار کر سنائی جس میں حرام اور حلال کے اس مسئلے کو ایک بہت ہی انوکھے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ میں اس کی تفصیل بیان کرتا مگر وہ جو شاعر نے کہا کہ

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

تو ظاہر ہے اس نے یہ بات یونہی تو نہیں کہی تھی۔

پیرس

ہمارا پیرس پہنچنے کا وقت صبح سات بجے تھا جبکہ میری گھڑی ساڑھے نو بجا رہی تھی۔ ہم نے سوچا ہم خواہ مخواہ اپنے پی آئی اے والوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں جب کہ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ عین اسی وقت ائیر ہوسٹس کی پہلے فرنچ میں اور پھر انگریزی میں آواز آئی کہ ہم پیرس کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ وہاں درجہ حرارت ۴ درجے سنٹی گریڈ کا ہوگا اور پیرس کے ٹائم کے مطابق ہم وہاں سات بجے لینڈ کریں گے۔ میں نے مڑ کر پروین کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایک دم یاد آیا کہ دوبئی کی ایک فلائٹ پر بھی ٹائم زون کا یہ مسئلہ پیدا ہوا تھا اس لیے میں نے فوراً بڑے پر اعتماد اور تجربہ کار مسافر کی طرح سرسری انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ٹائم ڈفرنس ہے۔''

پروین نے بھی جواب میں اسی قسم کے اعتماد سے سر ہلایا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ ٹھیک پتا اس کو بھی نہیں ہے۔

پیرس کے ہوائی اڈے کی وسعت اور مصروفیت کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' تو اس کا پتا وہاں پہنچ کر چلا۔ جہاز نیچے اترنا شروع ہوا اور اس عمل میں ایک طرف کو جھکا تو عالی والی سائیڈ کی کھڑکی سے چند لمحوں کے لیے نیچے کا منظر نظر آیا۔ حد نظر تک جہاز ہی جہاز تھے۔ یوں لگا جیسے ہوائی جہازوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں اقبال کا ایک بھولا بھٹکا اور بہت کم معروف شعر ذہن میں گونج گیا۔

فضا میں تیرتے پھرتے ہیں تیرے طیارے
مرا جہاز ہے محروم بادباں' پھر کیا

اور اس کے ساتھ ہی تیرہ برس قبل لکھی ہوئی اپنی ایک نظم ''جدائی کی پانچویں سالگرہ'' کی کچھ لائنیں جیسے مجسم سوال بن کر سامنے کھڑی ہو گئیں۔ زمان و مکان کے رشتے بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں جو لمحہ تلوار کی طرح سر پر لٹکتا ہے گزرتے ہوئے مہ و سال کی دھند میں کیا چور سا بن کر آنکھ مچولی کرتا ہے اور وہ مقام جہاں سے پاؤں اٹھ کے نہیں دیتا تھا' بعض اوقات یوں گزر جاتے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ یوں تو اس فضا سے روزانہ کئی سو طیارے گزرتے ہیں اور پھر ان کے اس سفر کا ریکارڈ صرف کاغذوں میں رہ جاتا ہے مگر وہ ایک جہاز جو اٹھارہ برس پہلے ایک اداس شام میں یہاں سے گزرا تھا اپنے ساتھ کیا کیا کچھ لے گیا تھا۔ نظم کی لائنیں ایک

ایک کر کے دھیان کے افق پر ستاروں کی طرح ٹوٹنے لگیں۔

جی میں ہے آج کی شب اس کے لیے جاگ کے کاٹی جائے

وہ جو آنکھوں سے پرے

اجنبی دیس کی گمنام ہواؤں میں کہیں بیٹھی ہے

کیا محبت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ میں

اس کے چہرے کے خدوخال میں لا کر دیکھوں

سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں اس کی جبیں کیسی تھی!

ہونٹ کیسے تھے؟ بدن کیسا تھا؟ آنکھیں کیا تھیں؟

بس یہی یاد ہے، وہ جیسی نظر آتی تھی

اس سے کہیں اچھی تھی

(یہ مہ و سال کا طوفان بہت ظالم ہے

وہ اگر پاس بھی ہوتی تو کسے علم ہے، کیسی ہوتی!)

جب کبھی کوئی جہاز

غم کی بے چین ہواؤں سے گزرتا ہے تو دل

شام فرقت کے تصور سے لرز اٹھتا ہے

شام فرقت جو حقیقت ہے مگر خواب نما لگتی ہے

چاند جب ابر کے ٹکڑوں میں سفر کرتا ہے

تو یوں لگتا ہے

میں بھی ایک ابر کا ٹکڑا ہوں جسے تیرا وصال

ایک لمحے کی رفاقت میں ملا

اے مرے گزرے ہوئے چاند' مجھے تیرا وصال

تیرا ایک لمحہ وصال

دائمی ہجر کے اندوہ مسلسل کے عوض بار نہیں

اے مجھے ابر کے ٹکڑے کی طرح چھوڑ کے جانے والے

تیرے بخشے ہوئے لمحے کے عوض

کیا مجھے دینا پڑا' اس سے سروکار نہیں

میرے دل پر ایک اداسی سی چھانے لگی۔ میں نے سوچا کیا ہر جذبے کی قیمت بس یہی ہے کہ وہ گزرے ہوئے لمحوں کے خس و خاشاک میں ایک بے نام تنکے کی طرح گم ہو جائے؟ اور اگر یہی ہے تو پھر سچ کیا ہے؟ وہ جذبہ جو زمان و مکان کے اس آشوب میں سدا دمکنے والا ہے' کہاں ہے؟ کہاں سے آئے گا؟ کہیں ہے بھی یا نہیں؟

کیسی عجیب بات ہے ہم جن چیزوں کو صدق دل سے سچ جانتے اور مانتے ہیں' سمے کی دیمک ہماری آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ انہیں بھی کھاتی چلی جاتی ہے اور ہم تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں۔ وقت خدا ہے یا اس کا روپ! اتنی طاقت اور کسی میں تو ممکن نہیں۔

پیرس کے ہوائی اڈے پر عالی صاحب کے بنک سے گاڑی متوقع تھی۔ سامان چونکہ مانٹریال تک بک ہو چکا تھا اس لیے ہم بہت جلد ائیر پورٹ سے باہر نکل آئے۔ موسم سرد مگر خوشگوار تھا۔ معلوم ہوا کہ ہم چارلس ڈی گال ائیر پورٹ پر اترے ہیں اور یہاں سے پیرس شہر تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ یعنی یوں سمجھئے کہ ہمیں لاہور جانا تھا مگر گوجرانوالہ اتار دیا گیا۔ بنک کے ایک نوجوان اہل کار ذاکر موٹر لیے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چھ برس سے یہاں ہیں اور پیرس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔

عالی صاحب اس کیفے کی باتیں کر رہے تھے جہاں سارتر بیٹھ کر کافی پیا کرتا تھا اور یہ سمجھا رہے تھے کہ ہم لوگوں کے پاس گھومنے پھرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے ہیں اس لیے ہمیں بہت سی چیزوں کو ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھنا ہوگا۔

میں نے کہا' اس طرح کے دیکھنے کو اقبال نے ''می نگرم و می روم'' کہا ہے جس کا پنجابی ترجمہ ہمارے ایک دوست نے ''ویکھدے جاؤ تے لنگھدے جاؤ'' کا ہے۔ پروین نے کہا ''یہ تو اسی طرح کا دیکھنا ہوا جیسے امریکن ٹورسٹ دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ڈائری پر کسی جگہ کے قابل ذکر مقامات کی فہرست بنائی اور پھر ٹورسٹ بس کی کھڑکی سے دیکھ کر اس پر ٹک کا نشان لگا دیا۔''

ذاکر نے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر دریافت کیا ''اگر آپ پسند کریں تو ہم پہلے عنایت صاحب کی طرف چلیں، وہ ناشتے پر آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ عنایت صاحب پیرس میں بنک کے انچارج ہیں اور انہوں نے ہی یہ گاڑی بھجوائی ہے۔ ہم نے عالی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کیونکہ ناشتے کا مطلب کم از کم ایک گھنٹے کا نقصان تھا جو موجودہ حالات میں بہت زیادہ تھا۔

عالی نے پیرس کی سڑکوں اور قابل دید مقامات کے بارے میں ذاکر سے ایک طویل گفتگو کی جس کا ماحصل یہ نکلا کہ ہم شانزا لیزے سے ہوتے ہوئے آئفل ٹاور، مجسمہ آزادی اور موماخت کا چکر لگا کر عنایت صاحب کی طرف جائیں گے۔ ان کا فلیٹ دریائے سین کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ یوں دریائے سین بھی نمٹ جائے گا۔

اس پر مجھے وہ امریکن ٹورسٹ یاد آیا جس نے ٹیکسی کی کھڑکی سے جھانک کر دریائے سین کو دیکھا تھا اور ڈرائیور سے کہا تھا۔

OK, Seen. Now Let's have a look on the stupid tower.

میں نے یہ واقعہ اپنے ساتھیوں کو سنایا تو وہ بہت ہنسے اور اس کے بعد سے جب بھی ہم نے کسی چیز کو جلدی جلدی میں دیکھا' یہ جملہ ہمارا کوڈ ورڈ بن گیا۔ ہم میں سے کوئی ایک کہتا سین اور باقی دونوں جواب دیتے سین۔ اس سین پر مجھے اپنے ایک سابق وزیر صاحب بہت یاد آ رہے ہیں۔ ''مشہور ہے کہ جب وزارت کے پہلے دن ان کے سامنے فائلوں کا ڈھیر لگایا گیا تو وہ گھبرا گئے اور اپنے سیکرٹری سے پوچھنے لگے کہ ان کا میں کیا کروں؟

سیکرٹری نے کہا۔ ''سرکار سارا کام تو نیچے کے افسران کرتے ہیں۔ آپ ان پر صرف سین (Seen) لکھ کر دستخط کر دیا کیجیے۔ جہاں کوئی آرڈر وغیرہ لکھوانا ہوگا وہ میں آپ کو بتا دیا کروں گا۔'' شام کو فائلیں وزیر صاحب کے دفتر سے واپس پہنچیں تو سب پر اردو میں ''س'' لکھا ہوا تھا۔''

معلوم یہ ہوا کہ اس وقت ہم جس سڑک پر رواں دواں ہیں' پیرس کی سرکلر روڈ ہے جو شہر کے گرداگرد ایک دائرے کی شکل میں چلتی ہے یعنی اگر ہم اس سڑک پر بغیر مڑے چلتے چلے جائیں تو واپس اسی مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔

دائرے کا یہ سفر انسانوں اور تہذیبوں کے اندر بھی ہوتا ہے مگر وہاں یہ اتنا منظم اور مربوط نہیں ہوتا۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے اور اس بحث کے اندر کئی ضمنی مباحث بھی ہیں۔ اس لیے فی الوقت اس پر مٹی ڈالتے ہیں۔ مٹی ڈالنے پر مجھے سعادت حسن منٹو یاد آ رہے ہیں۔ سنا ہے کہ منٹو کا شعر کا خانہ خاصا خالی تھا اور وہ شاعروں اور شاعری کو کوئی خاص لفٹ نہیں دیتے البتہ غالب کے سلسلے میں ان کے

دل میں ایک نرم گوشہ تھا مگر شعر انہیں اس کے بعد یاد نہیں رہتے تھے۔ قاسمی صاحب سے روایت ہے کہ بات کرتے کرتے منٹو جب غالب کے کسی شعر کا حوالہ دینا چاہتے تھے اور شعر یاد نہیں آتا تھا تو کچھ یوں بات کرتے تھے۔

''ارے بھئی احمد ندیم قاسمی وہ کیا شعر ہے تمہارے اس مرزا غالب کا.......

کیسا کمال کا شعر ہے .... بھئی وہ جس میں آتا ہے کہ .... واہ واہ کیا غضب کا شعر ہے .... ارے بھئی وہ .... جس میں وہ کہتا ہے کہ.......

کچھ ''خندہ ہائے گل'' .... اور پتا نہیں کیا....... آخر میں کچھ شراب وغیرہ کا تذکرہ ہے .... کیا تھا....... چلو مٹی پاؤ۔''

اتنی لمبی تمہید اور تعریف کے بعد یہ ''چلو مٹی پاؤ'' منٹو ہی کہہ سکتے ہیں۔

ذاکر نے بتایا کہ تقریباً ہر پانچ میل کے بعد اس سڑک سے شہر کے اندر ایک سڑک جاتی ہے جو شہر کی سڑکوں کے اندرونی نیٹ ورک سے مل جاتی ہے چنانچہ آپ کو شہر کے جس حصے میں بھی جانا ہو اس کے قریب سے Exit لے لیں اور پہنچ جائیں لیکن اگر آپ اپنی مطلوبہ Exit کسی طرح نہ لے سکیں تو سمجھ لیجئے کہ پندرہ بیس میل کا چکر پڑ گیا۔

رفتم کہ خار از پاکشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

میں نے سوچا یہ پیرس تو شہر تو کسی مورخ کا ڈیزائن کیا ہوا لگتا ہے۔ تاریخ میں بھی تو ایک غلط موڑ صدیوں کا فرق ڈال دیتا ہے۔

باہر سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ موٹر کے شیشوں پر کہرا سا جمنا شروع ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران پیرس کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ تعمیر نو کی وجہ سے شہر میں جدید عمارتوں کی افراط ہے لیکن قدیم طرز تعمیر کی حامل عمارتیں ایک مخصوص سحر کی حامل ہیں۔ شانزالیزے پر پہنچے تو وہی ہوا جو اکثر بہت زیادہ توقعات کے بعد کسی چیز کو پہلی نظر دیکھنے پر ہوتا ہے۔ ایک چوڑی سی سڑک جس کے دائیں بائیں تین تین چار چار منزلہ عمارتیں جن کے گراؤنڈ فلورز پر دکانیں، ہوٹل، دفاتر اور شاپنگ سٹور .... مگر یہ سب کچھ تو اپنے لاہور کی شاہراہ قائداعظم اور کراچی کی بندر روڈ اور الفی پر بھی اسی طرح ہے۔ لوگ بھی خال خال دکھائی دے رہے تھے۔ عالی نے شاید ہمارے چہروں سے ہماری مایوسی پڑھ لی تھی، بولے۔ ''بھئی اس سڑک کا حسن دیکھنا ہے تو یہاں شام کو آؤ اور موسم بہار میں آؤ۔ اس شہر کے کلچر سے شناسائی پیدا کرو، اس کی ہوا میں گھومو پھر یہ اپنا آپ تم پر منکشف کرے

گا۔شانزالیزے اتنی جلدی کسی بات سے نہیں کرتی' اس سے مکالمے کے لیے تمہیں اس کے عشوے اور غمزے اٹھانے پڑیں گے۔''

میں نے کہا'' عالی جی' اگر عشوے اور غمزے اٹھانے کے بعد بعد آشنائی سڑک سے ہی ہونی ہے تو اس سے بہتر نہیں کہ آدمی کوئی اور کام کرلے کیونکہ بقول اقبال'' سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا''

عالی صاحب جھنجھلا کر بولے۔'' بھئی معاف کیجئے گا امجد صاحب' آپ میں اگر حس جمال کی اتنی ہی کمی ہے جس کا مجھے اندازہ نہیں تھا تو کم ازکم بیچارے اقبال پر تو رحم کیجئے۔اس نے یہ مصرعہ جو آپ نے نہایت بے موقع پڑھا ہے' شانزالیزے کے لیے نہیں کہا تھا۔''

پروین بولی'' دراصل اس سڑک کے بارے میں اس قدر سنا اور پڑھا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ انوکھا سا' غیر معمولی سا تصور تھا کہ پتا نہیں کیسی ہوگی مگر یہ تو بالکل عام سی سڑک ہے۔اس پر اس کے سپیلنگ بھی عجیب سے ہیں۔''

اب عالی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا' بولے۔'' بھئی معاف کرنا' بڑے بدذوق لوگ ہو تم....... شانزالیزے صرف ایک سڑک نہیں یہ ایک تہذیب' ایک تاریخ ہے اور تہذیب اور تاریخ کا پتا یوں موٹر میں بیٹھ کر طائرانہ نظر ڈالنے سے نہیں چلتا۔''

موٹر میں خاموشی چھاگئی جسے چند لمحوں کے بعد ذاکر نے توڑا۔وہ عالی سے پوچھ رہا تھا کہ پہلے آئفل ٹاور دیکھیں یا مومانخت کا چکر لگالیں۔عالی نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔

'' بھئی ان صاحبان سے پوچھ لو ہوسکتا ہے انہیں مومانخت سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو اور یہ وہاں پہنچ کر مجھ سے پوچھیں کہ اگرچہ یورپ کی ساری بڑی آرٹ کی تحریکیں یہاں سے چلی ہیں اور دنیا بھر کے بڑے بڑے مصور یہاں بیٹھ کر پینٹ کرتے رہے ہیں اور یہ کہ یہ جگہ مصوروں کے لیے خواب کی حیثیت رکھتی ہے مگر یہاں تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا' یہ تو ایک عام سا' فضول سا' چوک سا ہے۔''

اس عام سا' فضول سا' چوک سا' میں'' سا'' کی جو کثرت تھی اس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوگیا کہ شانزالیزے کے حضور میں ہم نے جو گستاخی کی ہے اس کا تکدر عالی کے دل ودماغ پر ابھی تک چھایا ہوا ہے چنانچہ میں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

'' عالی صاحب یہ مومانخت یا موں مانخت گویا بڑی توپ جگہ ہے۔آپ تو یہاں بھی آچکے ہیں' ہمیں کچھ اس کے بارے میں بتایئے؟''

عالی اس بھرے میں آگئے اور انہوں نے موں مانخت کی تاریخ پر روشنی ڈالنی شروع کی۔میں نے پروین کی طرف دیکھا۔اس

نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ''ویل ڈن'' کہا۔
اب ہم شہر کے قدیم حصے میں تھے۔ سڑکیں کہیں کہیں خاصی تنگ تھیں۔ اسی طرح کی ایک تنگ سڑک پر چلتے چلتے ہم ایک بڑے سے گرجے کے سامنے پہنچے جس کے نام اور تاریخی اہمیت پر اگرچہ عالی نے خاصی روشنی ڈالی تھی مگر اس وقت مجھے اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں آ رہا سوائے اس کے کہ اس کے بائیں پہلو سے جو راستہ جاتا تھا وہ اس علاقے میں نکلتا تھا جسے موں مارتخ کہتے ہیں۔
ذاکر کیمرہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس گرجے کی سیڑھیوں پر تصویر بنوائیں' یہ پیرس کی ایک اچھی یادگار ہوگی۔ ہم پوز بنا کر کھڑے ہوگئے۔ ذاکر نے کیمرہ ایڈجسٹ کرنا شروع کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ شٹر دباتا' پتہ نہیں کس طرف سے چار پانچ لڑکے ہاتھوں میں اخبار لیے ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے حلیوں میں غربت اور بدمعاشی اس طرح مل جل گئے تھے کہ ان کا اصل چہرہ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ عالی نے چلا کر ہمیں خبردار کیا۔ ''جیبیں بچاؤ' یہ جیب کترے ہیں۔''
میں نے ایک ہاتھ جیب پر رکھ کر دوسرے سے ان کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ انگریزی ملی فرانسیسی میں کچھ کہہ رہے تھے جس میں سوائے ''موسیو'' اور ''نیوز پیپر'' کے اور کوئی لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ عالی نے انہیں جھڑک کر پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور بتایا کہ ہمیں اخبار نہیں چاہیے۔ مگر ان نوجوانوں کی حرکات و سکنات میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ کچھ فاصلے پر لوگ گرجے میں آ جا رہے تھے مگر کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ عالی نے ''پولیس پولیس'' کہہ کر ہوا میں چند آوازیں دیں۔ جس پر وہ لڑکے ہمیں چھوڑ کر ذاکر کی طرف متوجہ ہوگئے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ عالی نے کہا۔ چلو چلو' یہاں سے جلدی نکل چلو۔
میں نے سوچا' یہ عالی صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلا ان چار پانچ غریب غرباء سے لڑکوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس طرح کے دس دس بارہ بارہ سال کے لڑکے تو ہمارے یہاں بھی بسوں کے اڈوں پر سامان وغیرہ اٹھانے کے لیے مسافروں پر یونہی حملہ آور ہوتے ہیں۔ میں عالی کی پولیس پولیس کی آوزوں پر دل ہی دل میں ہنستا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ عالی نے بتایا کہ پیرس میں یورپ کے مختلف غریب ممالک اور لبنان اور فلپائن وغیرہ سے مہاجرین آتے رہتے ہیں اور ان کی نوجوان نسل اپنی تفریح اور منشیات کے حصول کی خاطر معمولی سی رقم کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ میں ان کے اس خدشے کی تردید میں کچھ کہنے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ ذاکر تیز تیز چلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' رنگ پیلا پڑا ہوا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا بٹوا تھا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں چھ سال سے ہوں' پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

ہم نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے بتایا کہ ان چار پانچ لڑکوں نے اسے گھیر کر اخبار بیچنے کی کوشش کی۔ اس نے احتیاط کے طور پر کیمرہ وغیرہ سنبھالنے کی کوشش کی' اس اثناء میں پتا نہیں کس طرح انہوں نے اس کا بٹوا نکال لیا۔

''بٹوا......؟'' میں نے حیرت سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بٹوے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں' یہ دیکھئے۔''

''مگر یہ تو آپ کے پاس ہے۔'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔ اس پر اس نے بتایا کہ ان لوگوں نے بٹوے سے رقم نکال کر بٹوا اس کی طرف اچھال دیا اور خود بھاگ گئے۔

''تم نے انہیں پکڑا کیوں نہیں؟ ہمیں کیوں آواز نہیں دی؟''

''آپ کو میں کیا آواز دیتا...... دومنٹ میں تو یہ سارا واقعہ ہوا ہے اور اگر میں ان سے لڑنے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ اس طرح کی وارداتیں یہاں روز ہوتی ہیں اور میں تو اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ پرس مجھے واپس مل گیا کیونکہ میرے ساتھ کارڈ اور کاغذات اسی میں ہیں۔''

اب مجھے عالی صاحب کی پولیس پولیس کی صدا کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ میں نے سوچا' اچھا ہی ہوا جو میں نے عالی صاحب کی اس احتیاطی تدبیر پر اپنی تنقید کا اظہار نہیں کیا ورنہ ہاتھوں ہاتھ بے عزتی ہو جاتی۔ اور دل میں سوچا کہ یہ واقعی چل کر اپنے دوست احمد نسیم کو سناؤں گا جو آج کل لاہور شہر کا کوتوال (SSP) لگا ہوا ہے اور کہوں گا بھائی تمہارے ''پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی'' والے نعرے پر میں نے جو جملے کسے تھے وہ واپس لیتا ہوں کہ خدا کی اس زمین پر سلامتی ہمارے یہاں ہی نہیں کہیں بھی نہیں ہے۔

ذاکر کے بٹوے میں زیادہ رقم نہیں تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق ڈھائی تین سو فرانک تھے مگر اس واقعے نے طبیعت کچھ بد مزہ سی کر دی۔ سرزمین فرنگ پر ہمارا پہلا تجربہ جیب کٹنے کا تھا۔ میں نے سوچا تین صدیوں تک ان ملکوں نے ہمیں لوٹ لوٹ کر کھایا ہے اب ان کے کھانے کے دانت گر چکے ہیں مگر ہماری جیبیں اب بھی ان کی دسترس سے محفوظ نہیں۔ پھر خیال آیا کہ کچھ بھی ہو یہ جیب کترے اپنے سیاسی پیشروؤں سے بہر حال بہتر ہیں کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم انہوں نے بٹوا ہی واپس کر دیا ہے۔

بٹوے میں پڑے ہوئے ذاکر کے مختلف کریڈٹ کارڈ' ڈرائیونگ لائسنس' ملازمت اور رہائش ویزا کے کاغذات وغیرہ جیب کتروں کے کسی کام کے نہیں تھے۔ مگر ان کے بغیر وہ بے پناہ مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جس طرح آدمی موت کو دیکھ کر بخار پر راضی ہو جاتا ہے اسی طرح ذاکر نے بھی اس نقصان کو صبر شکر کے ساتھ برداشت کر لیا مگر وہ جو یورپ والوں نے مشرق کا بٹوا چرا رکھا

ہے اس کا کوئی اتا پتا نہیں مل رہا' اگر کسی بھائی کو خبر ہو تو اطلاع دے اور اگر چور صاحبان خود پڑھیں اور اسے واپس کر دیں تو ان کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس بٹوے میں جتنی رقم تھی وہ بے شک اسے اپنے پاس رکھ لیں مگر اس میں جو ہماری تہذیب' ثقافت' تاریخ' قومی شعور اور عزت نفس کے کریڈٹ کارڈز تھے' انہیں ضرور لوٹا دیں۔'' ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا''

سرزمین فرنگ پر پاؤں دھرتے ہی اس واردات کی وجہ سے جو ذہنی دھچکا ہم لوگوں کو لگا اس کا تاثر گویا پوری فضا میں پھیل گیا تھا۔ سردی' بارش' کہر' زیادہ زیادہ کپڑوں میں لپٹے ہوئے کم کم لوگ اور دس دس گھنٹے کی فلائٹ کی تھکن نے مل جل کر ماحول میں ایک عجیب سی بے کیفی پیدا کر دی تھی۔ مو ماخت ظاہری وضع قطع کے اعتبار سے ایک احاطہ سا تھا جس کے چاروں طرف مختلف دکانیں تھیں جن میں مصوری کے فن سے متعلق اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ اکثر دکانیں اس وقت بند تھیں اور ان کے بند دروازوں کے سامنے فٹ پاتھ پر مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے مصور چھابڑی والوں کی طرح اپنی اپنی تصویروں کے خوانچے لگائے بیٹھے تھے۔ عالی نے بتایا کہ یہ لوگ سکیچ ڈرائنگ میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اور چند منٹوں میں آپ کی تصویر آپ کو سامنے بٹھا کر بنا دیتے ہیں اور انہی لوگوں میں سے دنیا کے بعض بہت نامور مصور بھی ہوئے ہیں۔ عالی نے یہ بھی بتایا کہ اس جگہ پر آنا اور اپنا مقام بنانا مصور کا خواب سمجھا جاتا ہے اور یوں یہ بہت مہنگی جگہ بھی ہے۔

ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نما عورت خاصی دیر سے ہماری طرف نگراں تھی۔ پروین کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے ایک بڑی کشادہ سی مسکراہٹ ہم چاروں کی طرف کچھ یوں پھینکی جیسے کہہ رہی ہو۔

To whom it may concern

پروین نے اس کی مسکراہٹ واپس کرنے کی کوشش شروع کی ہی تھی کہ وہ عفیفہ اپنی فرانسیسی یا کچھ اور ملی انگریزی سمیت اس پر گویا ٹوٹ ہی پڑی۔ دونوں میں کچھ دیر مذاکرات ہوتے رہے پھر پروین ہماری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے لہجے میں اس کی ایکسائیٹ منٹ ہویدا تھی' بولی۔ ''یہ بہت بڑی فنکارہ ہے' دس منٹ اور بیس امریکی ڈالرز کے عوض یہ میری تصویر بنانے کو تیار ہے۔''

عالی نے کہا۔ ''بی بی' شوق سے تصویر بنواؤ مگر یہاں سودے بازی بھی ہوتی ہے۔ اگر تم اپنے لہجے کی ایکسائیٹ منٹ اور اس کی فنی صلاحیتوں سے مرعوبیت کا اظہار تھوڑا سا کم کر لو تو میرا خیال ہے تمہارا یہی کام دس ڈالر میں ہو جائے گا۔''

ہم نے یہ بات چیت اردو میں کی تھی چنانچہ اس دوران میں وہ مصورہ ''حافظ جی'' کی طرح ہماری طرف دیکھتی رہی۔ اس ''حافظ جی'' کی تفصیل یہ ہے کہ پنجابی میں قرآن مجید حفظ کرنے والے افراد کے علاوہ نابینا لوگوں کو بھی حافظ جی کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ اس

طرح کے ایک حافظ جی شہر کی ایک گلی سے گزر رہے تھے جہاں دو عورتیں لفظوں کی جنگ میں مصروف تھیں اور ایک دوسرے پر مختلف بددعاؤں' گالیوں اور طعنوں کے تیر و نشتر چلا رہی تھیں' مثلاً ''اللہ کرے تو بیوہ ہو جائے' تجھے لاکڑا کا کڑا نکلے' تجھے ٹی بی ہو جائے' تیرا خاوند چھوڑ دے'' وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران میں ایک عورت کی نظر حافظ جی پر پڑی تو اس نے کہا۔ ''اللہ کرے تیرا بیاہ حافظ جی سے ہو جائے۔''

اس پر دوسری عورت نے جوابی حملہ کیا ''میرا بیاہ کیوں ہو' تیرا کیوں نہ ہو۔'' اس کے بعد وہ دوسرے کوسنوں کی طرف متوجہ ہو گئیں مگر حافظ جی گلی کے درمیان بت بن کر کھڑے ہو گئے۔ عورتوں کا جوش وخروش ذرا کم ہوتو حافظ جی نے اپنی لاٹھی زمین پر ماری اور کہا۔ ''بی بیو! حافظ جی کے لیے کیا حکم ہے' کھڑے رہیں کہ چلے جائیں؟''

میں نے اس بی بی کو بتانے کی کوشش کی کہ بیس امریکی ڈالر ہمارے معاشیات اور منصوبہ بندی کے اعلیٰ ماہرین کی شبانہ روز کوششوں کی وجہ سے ہمارے تین سو روپوں کے برابر ہوتے ہیں اور یہ کہ تین سو روپے ایک عام پاکستانی آرٹسٹ ایک ہفتے میں بھی نہیں کما پاتا۔ اس بی بی نے تیسری دنیا کی اس اپیل کو ایک کان سے سنا اور دوسرے سے اڑا دیا۔ اس پر میں نے گاہکوں کا مخصوص داؤ استعمال کیا اور یہ کہہ کر بات ختم کرنے کا تاثر دیا کہ ہم دس ڈالر دے سکتے ہیں۔ سودا منظور ہے تو بسم اللہ' نہیں تو تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی چنانچہ اس نے مجھے کندھے سے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' آ جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''تصویر میں نہیں' یہ خاتون بنوائے گی۔''

اس نے اس پر وہی ہاتھ پروین کے کندھے پر رکھ دیا اور ایسی نظر سے اس کا جائزہ لیا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''چلو یہ بھی کیا بری ہے۔''

پروین اس بی بی کے ساتھ اس اسٹوڈیو کی طرف روانہ ہوئی جو کہیں قریب ہی تھا اور ہم تینوں ایک کیفے میں بیٹھ گئے جس کی کافی کے بارے میں عالی صاحب نے بتایا تھا کہ اسے پینا گویا پیرس کی ایک اعلیٰ تہذیبی روایت کو نبھانا تھا۔ انہوں نے اس کیفے کی تاریخی اہمیت کے بارے میں اور بہت سی باتیں بھی بتائی تھیں جو اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہیں۔ کیفے دیکھنے میں عام سا تھا' زیادہ بھیڑ بھی نہیں تھی۔ ہم ایک ایسے کونے میں بیٹھے جہاں سے ہمیں باہر کا منظر اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں بیٹھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پروین کو ہمیں ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔ کیفے کے اندر کا ماحول کچھ کچھ اپنے پاک ٹی ہاؤس جیسا تھا۔ وہ تین بیرے بڑی بے نیازی سے آ جا رہے تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا شخص انتہائی خضوع وخشوع سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ ہمارے ساتھ والی میز پر دو مصور نما آدمی خاموش بیٹھے ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جا رہے تھے۔ دائیں کونے والی میز پر ایک بوڑھا آدمی حلقہ ارباب ذوق کے خالد

محمود لڈو کے انداز میں کسی اجنبی زبان میں زور زور سے کچھ بول رہا تھا۔ اس کے سامعین اس کے دلائل سے کم اور جوش سے زیادہ مرعوب دکھائی دے رہے تھے۔ ایک گیا گزرا سا جوڑا انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ میں نے عالی سے کہا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ محبت نہیں بلکہ اس وجہ سے پکڑ رکھا ہے کہیں دوسرا بھاگ نہ جائے۔''

عالی نے مسکرا کر میرے خیال کی داد دی اور اپنے مخصوص انداز میں دو چار ہنکارے بھر کر دانتوں پر انگلی پھیری۔ میں نے کہا۔

''ان بیرا حضرات کو متوجہ کس طرح کیا جاتا ہے؟''

عالی بولے۔ ''دراصل یہاں لوگ ایک کپ کافی منگوا کر گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں اس لیے بیرے بھی جلدی نہیں کرتے۔ آج کل آف سیزن ہے ورنہ یہاں بیٹھنے تو کیا کھڑے ہونے کے لیے جگہ بھی نہیں ملتی مگر روایت کا احترام اتنا ہے کہ اس وقت بھی ایک کپ کافی کے ساتھ جب تک چاہے بیٹھے رہیے کوئی آپ کو اٹھنے کے لیے نہیں کہے گا۔''

''مگر اس سے تو ہوٹل والوں کا بہت نقصان ہوتا ہوگا۔''

''ہوا کرے انہی روایات کا نام تو پیرس ہے۔''

اس دوران ایک بھولا بھٹکا بیرا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہمارے اردگرد ڈولنے لگا۔ عالی نے اسے بلیک کافی اور پنیر کا آرڈر دیا۔ وہ الہ دین کے جن کی طرح پلک جھپکنے میں دونوں چیزیں لے آیا۔ میں اس کی پھرتی پر عش عش کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ نگاہ پیالیوں پر پڑی۔ ہمارے یہاں بعض چینی ہوٹلوں قہوے کے لیے ایسی چھوٹی چھوٹی پیالیاں رکھی جاتی ہیں جن کی کل اوقات دو گھونٹ سے زیادہ نہیں ہوتی مگر یہ پیالیاں تو ان کی بھی خالہ جان تھیں جن کی تہہ میں کوئی ڈارک براؤن قسم کی چیز پڑی ہوئی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اپنے قلعہ گوجر سنگھ والے ڈاکٹر ظہیر کی دوائی کی خوراک اس سے بڑی ہوتی ہے۔ میں نے عالی کی طرف دیکھا' انہوں نے حسب معمول اس کے تاریخی خواص اور تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالی جس کا ماحصل یہ تھا کہ مقدار پر نہیں معیار پر نظر رکھو۔

میں نے کافی کے حساب سے چینی کی دو کیوب اس میں ڈالیں اور ایک گھونٹ بھرا مگر اس ایک گھونٹ نے میرے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ زندگی میں بری بھلی بہتری قسم کی کافی پینے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ پتا نہیں کیا چیز تھی کہ گھونٹ حلق سے نیچے اترنا عذاب ہو گیا۔ اس پر وہ بے نیاز قسم کا بیرا سر پر آ کھڑا ہو گیا اور یوں دیکھنے لگا جیسے اپنے کمال فن کافی سازی کی تعریف سننا چاہتا ہو۔ میں نے بڑی دقت سے اس کالے کڑوے اور بدمزہ گھونٹ کو گلے سے نیچے اتارا اور گلے کو مسلتے ہوئے کہا۔

''اب پتا چلا ہے کہ یہاں لوگ ایک کپ کافی سامنے رکھ کر گھنٹوں کیوں بیٹھے رہتے ہیں۔''

عالی نے اپنا مخصوص ہنکارا بھرا اور مسکرا کر کہا۔ ''اب آپ کو یہ اندازہ بھی ہو گیا ہو گا کہ ان پیالیوں میں کافی کی مقدار کم کیوں رکھی جاتی ہے۔''

ہماری اس جملہ بازی سے ذاکر کی طبیعت بھی قدرے بحال ہوئی' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے پکاسو نے یہی کافی پی کر تجریدی مصوری کا آغاز کیا تھا۔''

بیرا ہماری اس گفتگو کو شاید اپنی کافی کے لیے تعریفی ریمارکس سمجھ رہا تھا کیونکہ اس نے خالص فرانسیسی انداز میں بڑی خوشدلی سے مسکراتے ہوئے ہمیں بتایا کہ ہم چاہیں تو انہی پیسوں میں ایک بار اور اتنی ہی کافی پی سکتے ہیں۔ میں نے بڑے مربیانہ انداز میں اس کی پیش کش کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اس کی کافی بہت اچھی ہے مگر ہم لوگ صبح کے وقت زیادہ کافی نہیں پیتے۔ عالی نے میری بے بسی کا مزا لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کافی نوش جان کیجئے کیونکہ کپ میں کافی چھوڑنا یہاں کے آداب کے خلاف ہے۔''

میں نے کہا۔ ''عالی صاحب! ہم اپنے وطن میں کون سے اتنے آداب پرست ہیں جو ان کے آداب کی پابندی کریں گے۔ آپ کو سقراط بننے کا چاؤ ہے تو شوق سے زہر مار کیجئے' بندہ بے ادب ہی بھلا۔'' ہماری یہ نوک جھونک جاری تھی کہ پروین کیفے میں داخل ہوئی۔ اس کی ناک سردی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے اسکیچ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے ایک جھرجھری لی اور کہا۔ ''جلدی سے مجھے کافی پلوایئے' توبہ توبہ بہت سردی ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں اسے کافی کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرتا' ذاکر نے بیرے کو ایک اور کافی لانے کا کہہ دیا۔ میں بھی یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ کہیں کافی کی اتنی مخالفت سے ''پینڈو'' ہی نہ اسٹیبلش ہو جاؤں۔ پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ انگریزی زبان وادب کی طالبہ ہونے کی وجہ سے یورپ کی تہذیبی روایات سے پروین کی دلچسپی بہت زیادہ ہے اور وہ محض اس روایت کا حصہ بننے کے لیے چھوٹی موٹی تکلیفیں ہنس کر برداشت کر سکتی ہے۔ کافی آئی' پروین نے ایک گھونٹ بھرا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ گویا میرے والے گھونٹ کا ''ایکشن ری پلے'' تھا۔ اس نے کافی کی کڑواہٹ کم کرنے کے لیے چینی کے دو اور کیوب پیالی میں ڈالے' انہیں اچھی طرح ہلا کر دوسرا گھونٹ بھرا اور پھر پیالی ایک طرف سرکا دی۔ میں نے مزا لینے کی خاطر بڑے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کیوں' مزا نہیں آیا؟''

بولی ''کچھ عجیب سا ذائقہ ہے۔''

''یہ ذائقہ کافی کا نہیں' پیرس کی تہذیب کا ہے۔''

"ہائے نہیں' پیرس کی تہذیب تو بہت اچھی ہے۔ اتنا حسن یورپ تو کیا دنیا کی کسی اور تہذیب میں نہیں۔"

میں نے کہا۔"اگر پیرس کی باقی تہذیبی روایات بھی اس کافی جیسی ہیں تو ہماری طرف سے "استغنی مرا بہ حسرت ویاس" ہی سمجھو۔"

بیرا برتن اٹھانے آیا تو پیالیوں میں بچی ہوئی کافی دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو گیا۔ پروین نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اگر حفیظ جونپوری اس وقت یہاں ہوتے تو ان کا مشہور شعر کچھ یوں ہوتا۔

پی لو دو گھونٹ کہ کافی کی رہے بات حفیظ
صاف انکار سے خاطر شکنی ہوتی ہے

اب ہم پروین کے سکیچ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سکیچ برا نہیں تھا۔ دس ڈالر میں تو بالکل ہی برا نہیں تھا مگر اس میں موں ماخت والی بات نہیں تھی۔ پروین نے بتایا کہ مصورہ نے فرانسیسی زبان میں اپنے دستخطوں کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ تصویر موں ماخت میں بنائی گئی ہے۔ تاریخ بھی درج ہے۔

میں نے کہا۔"بس یہی اس تصویر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسے بھی اس کافی کی طرح سمجھو' ذائقہ جیسا بھی ہے مگر اس میں پیرس کی تاریخ اور تہذیب گھلی ہوئی ہے۔ اگر کوئی تصویر کے معیار پر اعتراض کرے تو اسے موں ماخت کا حوالہ چپ کرا دے گا۔"

کیفے سے نکلتے ہوئے میں نے انہیں ایک مشاعرے کا واقعہ سنایا جو کچھ یوں ہے .... مشاعروں زوروں پر تھا۔ مرحوم عبدالحمید عدم غزل پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب نشے میں جھومتے جھامتے ہال میں داخل ہوئے اور بلند آواز میں کہنے لگے۔"بند کرو یہ بکواس' عدم صاحب کو بلاؤ۔ ہم عدم صاحب کو سننا چاہتے ہیں۔"

کسی شخص نے انہیں بتایا کہ آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ عدم صاحب ہی کلام سنا رہے ہیں۔ اس پر ان صاحب نے ایک لمبی سی واہ کی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بولے۔"عدم صاحب ہیں تو واہ' واہ' واہ' واہ....... سبحان اللہ' مکرر ارشاد۔"

موں ماخت سے واپسی پر آئفل ٹاور کے سائے میں چند منٹ رکے۔ صبح صبح کا وقت' بارش اور نومبر کی سردی' اس پر ذاکر کی جیب کٹنے کے واقعے اور موں ماخت کی عبرت ناک کافی نے طبیعت کچھ ایسی بدمزہ کر دی تھی کہ موٹر سے باہر نکلنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس التواء کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عنایت صاحب ناشتے پر ہمارے منتظر تھے اور اصولاً اس وقت تک ہمارے بارے میں ان کی تشویش زوروں پر ہونی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ جو کچھ دیکھنا ہے انہیں چار گھنٹوں میں دیکھنا ہے۔ روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد۔

عنایت صاحب کا خوبصورت اپارٹمنٹ اپنی وضع قطع' سلیقے اور لوکیشن کے اعتبار سے خاصا مہنگا نظر آتا تھا۔ لفٹ کے ذریعے تئیس منزلیں پلک جھپکتے میں گزر گئیں۔ دریائے سین کی طرف کھلنے والی بڑی کھڑکی سے میں نے اردگرد کی عمارتوں کو دیکھا اور پھر نیچے نگاہ ڈالی۔ پتا نہیں کہاں سے یگانہ کا ایک مصرعہ دھیان کی سکرین پر روشن ہوا اور پھر وہیں جلنے بجھنے لگا۔

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا

ماچس کی ڈبیوں جیسی عمارتیں اور ان کے درمیان بہت سے بونے اور ڈنکیاں (Dinkey Cars) سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا مشہور زمانے دریائے سین جس کے ایک پل کے قریب مجسمہ آزادی عمارتوں کی بلندی اور انسانوں کی پستی کو اپنی پتھریلی آنکھوں سے دیکھے چلا جا رہا تھ۔ عالی نے بتایا کہ واپسی پر ان کا ارادہ تین چار دن پیرس رکنے کا ہے اور وہ یہ سارا عرصہ اسی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر گزارنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''یعنی آپ سین کو پوری طرح seen کرنے کے چکر میں ہیں۔'' پروین نے اپنی نیند بھری آنکھیں بڑی مشکلوں سے کھولتے ہوئے عالی کے خیال کی تائید کی اور کہا کہ اس منظر کو وہ بھی تین دن تک بغیر تھکے دیکھ سکتی ہے۔

عنایت پچاس پچپن برس کے دبلے پتلے' پرخلوص اور پھرتیلے ''نوجوان'' تھے۔ موصوف نے شادی کا تکلف نہیں فرمایا تھا اور ان کے خیالات اور زندگی کے حالات سن کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا یہ فیصلہ کچھ اتنا غلط بھی نہ تھا۔ افسوس کہ اس موضوع کے حوالے سے جتنے لطائف ہم نے آپس میں Exchange

کئے' ان میں سے ایک بھی قابل اشاعت نہیں۔

سین کے دوسرے کنارے پر واقع عمارتوں کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عنایت صاحب نے بتایا کہ اس علاقے میں ان مشہور زمانہ خواتین کے محلات اور مکانات ہوا کرتے تھے جنہیں عرف عام میں ''مادام'' کہا جاتا ہے۔ ان وسیع القلب خواتین میں سے کچھ انتہائی ادیب اور فنکار نواز واقع ہوئی تھیں۔ جس طرح ہر غیر معمولی دولت مند کے پیچھے کسی نہ کسی جرم کا ہاتھ ہوتا ہے اسی طرح بیشتر غیر معمولی فنکاروں کے پیچھے کوئی نہ کوئی مادام ہوا کرتی تھی۔ عنایت صاحب کے اس رواں تبصرے پر عالی جی نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری اور کہا'' کتنے اچھے زمانے تھے وہ''

مادام کے ذکر پر کئی الحاقی مضامین بھی گفتگو کا حصہ بن گئے۔ پروین چند منٹ آرام کے لیے ساتھ والے کمرے میں جا چکی تھی اس لیے ہماری گفتگو بڑی تیزی سے مردانہ اور پھر مردانہ تر ہوتی چلی گئی۔ سینہ بہ سینہ چلنے والے ان واقعات میں سے ایک جو سب سے

کم ضرر ہے، عقل مند قارئین کے لیے بطور اشارہ پیش کرتا ہوں۔

انقلاب فرانس کے دنوں میں ایک مادام ''ح'' کے حسن و جمال اور مہمان نوازی کا بہت شہرہ تھا مگر ان سے ملاقات کی فیس ان بھلے وقتوں میں بھی پانچ سو فرانک تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہزاروں عشاق ان کا نام سن کر ٹھنڈی آہیں بھرتے اور اپنی کم ظرف جیبوں کا ماتم کر کے رہ جاتے تھے۔ انہی دنوں اس نواح میں ایک فوجی بٹالین اتری۔ مادام ''ح'' کی شہرت اس کے جوانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ ساٹھ فرانک ماہانہ تنخواہ میں مادام کے بارے میں سوچنا دیوانے کے خواب سے کم نہ تھا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے سو اس مسئلے کا حل بھی ایک بزرجمہر نے نکال لیا۔ طے یہ پایا کہ ڈھائی سو جوان دو فرانک فی کس کے حساب سے چندہ دیں۔ اس کے بعد لاٹری نکالی جائے اور جس خوش نصیب کا قرعہ نکل آئے وہ مادام سے ملاقات کی سعادت حاصل کرے۔

خوش نصیب جوان جب پانچ سو فرانک کی تھیلی لے کر مادام کے در دولت پر حاضر ہوا تو مادام اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس مفلس سپاہی کے پاس اتنی بڑی رقم کیسے ہو سکتی ہے؟ تھوڑی سی جرح کے بعد جوان نے رقم کا راز اگل دیا۔ مادام یہ سن کر بے حد خوش ہوئی کہ اس کے چاہنے والے اس تک پہنچنے کے لیے کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں چنانچہ اس نے جوان سے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ جوان کے جذبے سے اس قدر خوش ہوئی ہے کہ اس ملاقات کے عوض اس سے کوئی رقم وصول نہیں کرے گی۔ جوان کی باچھیں کھل گئیں۔ مادام کی صحبت اور پانچ سو فرانک یعنی چوپڑی اور دو دو۔ مگر روانگی کے وقت اس کی حیرت اور پریشانی کی حد نہ رہی جب مادام نے دو فرانک اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نہ ''تم'' سے کوئی پیسہ نہیں لوں گی۔''

یعنی زور کس پر ہوا ''تم'' پر۔

عنایت صاحب کا دفتر شانزالیزے پر تھا۔ وہاں ہمارے سڑکوں کی طرح بڑے بڑے بورڈ لگانے کا رواج نہیں تھا۔ عمارتوں اور بورڈوں کے انداز، سائز اور رنگ مخصوص علاقوں میں مخصوص طرح کے تھے۔ نیشنل بنک اور پی آئی اے کے دفاتر ایک ہی عمارت کے ایک ہی فلور پر ایک دوسرے کی بغل میں واقع تھے۔ پی آئی اے پیرس کے منیجر عطاء اللہ بڑے خوش نما اور خوش گفتار آدمی تھے۔ معلوم ہوا کہ موصوف ۵۰-۱۹۴۹ء میں حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے حلقے سے متعلق مختلف لوگوں کی خیر خبر پوچھتے رہے اور اس دوران میں عالی صاحب نے فون پر تقریباً تین چار ملکوں میں اپنے بینکر دوستوں کو بینکنگ کے میدان میں ہونے والی ان تبدیلیوں سے آگاہ کیا جو ان کی روانگی سے چند گھنٹے پہلے رونما ہوئی تھی۔

ترقیوں اور تبادلوں کی ان خبروں کے ہجوم میں پروین اور میں تنہا ہو گئے۔ نیند اور تھکن سے برا حال تھا مگر دو گھنٹے بعد اگلی فلائٹ

تھی سوچا گنا بھی ضروری تھا۔ ہم نے پیرس کے ویو کارڈز منگوائے اور جلدی جلدی گھر والوں کو اپنی اب تک کی خیریت کی اطلاع لکھ کر عطاء اللہ صاحب کے سپرد کئے کہ انہیں پوسٹ کروادیں۔ عنایت صاحب کو ہم سے آدھ گھنٹہ بعد والی کسی فلائٹ پر فرینکفرٹ جانا تھا اوران کا اصرار تھا کہ ہم لنچ ان کے ساتھ کریں۔ بڑی مشکلوں سے انہیں قائل کیا کہ جہاز کی خوراک اور آپ کے بھرپور ناشتے کے بعد اب کسی لنچ کی گنجائش نہیں۔ عالی کا اصرار تھا کہ چاہے چند منٹ کے لیے سہی' ہمیں پیرس کی مشہور زمانہ آرٹ گیلری ''لوور'' کا (جسے بے تکلفی سے ''لو'' بھی کہا جاتا ہے) ایک چکر ضرور لگانا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ لیونارڈو کی بنائی ہوئی اصلی ''مونالیزا'' داخلی دروازے سے صرف تین منٹ کے فاصلے پر ہے اور اس قدر قریب آ کر اسے نہ دیکھنا ایک ایسا جرم قبیح ہے جسے اہل ذوق' معاشرہ' دیکھنے سننے والے اور ہماری آئندہ نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

عالی صاحب کے اس ڈرانے دھمکانے کا مجھ سے زیادہ پروین پر اثر ہوا اور اس نے فلائٹ مس کرنے کا چانس لیتے ہوئے اعلان کیا کہ ''لوور'' ضرور جانا چاہیے۔ دفتر سے نکلے تو بارش بدستور جاری تھی۔ میں نے کہا۔ ''لوور اتنی بڑی تاریخی اور اہم جگہ ہے کہ اسے چند منٹوں کے لیے دیکھنا اس کی توہین ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم واپسی پر پیرس رکیں اور لو کو جی بھر کے دیکھیں مگر افسوس میرے اس انتہائی سنہرے مشورے پر کسی نے کان نہ دھرا اور ہمارا قافلہ لو کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک جگہ گاڑی رکی۔ عالی نے انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ لوور کا مرکزی دروازہ سامنے ہے اور ڈاکر کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں جلدی سے ایک چکر لگوالائے۔ پروین نے حیرت سے کہا۔ ''اور آپ......

آپ نہیں چلیں گے۔''

''میرا یہ کئی بار کا دیکھا ہوا ہے۔ تم لوگ پہلی بار آئے ہو تم جاؤ۔ میں یہیں گاڑی میں کچھ دیر آرام کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''عالی صاحب! اس وقت مجھے ایک ایسا شعر یاد آ رہا ہے جو میں نے اپنی طالب علمی کے دنوں میں نظیر صدیقی کی کتاب ''تاثرات وتعصبات'' کے ایک مضمون میں پڑھا تھا۔ مضمون میں کیا تھا یہ تو مجھے یاد نہیں البتہ وہ شعر آپ کے اس وقت کے طرز عمل پر انتہائی فٹ بیٹھ رہا ہے۔''

عالی بولے۔ ''خیر آپ وہ شعر مجھے اتنی لمبی تمہید کے بغیر بھی سنا سکتے تھے۔ ویسے صاحب میں داد دیتا ہوں آپ کے مطالعے کی۔ کیا کیا چیزیں آپ نے پڑھ رکھی ہیں۔ بہت فرصت ہوتی تھی کیا آپ کو ان دنوں میں؟''

میں نے ان کا طنز انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''غالباً یہ شعر اجتبیٰ رضوی مرحوم کا ہے۔

آگ لگا کے شہر میں' فتنے جگا کے دہر میں
جا کے الگ کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ "ہم نہیں"

ذاکر نے موٹر کی ڈکی سے دو عدد چھتریاں برآمد کیں۔ میں نے بڑی شولری سے کام لیتے ہوئے ایک چھتری کھول کر پروین کو تھمائی اور دوسری اپنے لیے کھولنے کی کوشش شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد اس کوشش میں ذاکر بھی شریک ہو گیا مگر پتا نہیں اس کا (یعنی چھتری کا) کوئی سپرنگ ڈھیلا تھا یا پش بٹن میں کوئی خرابی تھی' چھتری نے اپنی لاج کا گھونگھٹ کھول کر نہیں دیا۔ پروین اس اثناء میں کافی آگے جا چکی تھی۔ میں نے ذاکر سے کہا۔

"بھائی جتنا بھیگنا تھا بھیگ چکے' اب حوصلہ کر کے ننگے سر ہی نکل چلو۔"

کہنے کو تو میں "ننگے سر" کہہ گیا مگر ایک دم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے جلدی سے ذاکر کی طرف دیکھا۔ اب پتا نہیں یہ اس کی شرافت اور سعادت مندی تھی یا عقل اور حس مزاح کی کمی کہ اسے میرے "فارغ البال" سر اور ننگے سر میں موجود رعایتیں نظر نہیں آئیں۔ میں نے سوچا اگر یہ جملہ میں نے عطاء الحق قاسمی کے سامنے یا لاہور میں اپنے دوستوں کی کسی بھی محفل میں کہا ہوتا تو میرا کیا حشر ہوتا۔

بارش میں چلتے ہوئے پتا نہیں کیوں کیوں مجھے اپنا بچپن کا دوست شیخ رضا مہدی عرف جوجی یاد آ گیا۔ اس کا سر بھی میری طرح بالوں سے تقریباً ہاتھ دھو چکا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ "یار' یہ قدرت نے ہمارے بال اڑا کر ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"کوئی بات نہیں یار جوجی شیخ....... اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"فرق کیوں نہیں پڑتا یار۔ صبح سویرے جب میں دانت صاف کرنے کے لیے باتھ روم میں بیسن کے آگے کھڑا ہوتا ہوں اور سامنے لگے ہوئے شیشے میں اپنی صورت دیکھتا ہوں تو خود میرا اپنا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ دوسروں سے ہم کیا توقع کر سکتے ہیں۔"

سردی اور بارش کے باوجود لو کے اندر خاصی رونق تھی۔ ہم نے جلدی جلدی ٹکٹ لیے اور رہنمائی کے لیے بورڈ پڑھتے ہوئے اس ہال میں پہنچے جہاں "مونالیزا" رکھی ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ مونالیزا کے درجنوں پرنٹس دیکھنے کے باوجود آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس تصویر' عورت یا اس کی مسکراہٹ میں کون سی ایسی خاص بات ہے جو اسے فن کی دنیا میں اتنا بڑا مقام دیا جاتا ہے۔ خیال تھا کہ شاید اصلی مونالیزا سے کوئی نظریاتی اختلاف تھا کیونکہ اس نے اس پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی البتہ پروین بہت انہماک سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ حوصلہ کر کے اس پینٹنگ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں مگر یہ

سوچ کر چپ ہو رہا کہ خواہ مخواہ اپنی کورذوقی اور فن ناشناسی کا ڈھنڈورا پیٹنے سے کیا فائدہ! میں نے بھی مونالیزا کو دو تین منٹ تک انتہائی عاشقانہ انداز میں دیکھا اور منہ سے اسی طرح کے ''اوہ' اوہ' مائی گاڈ - Fantasic - Fabulous" "Marvellous" قسم کے الفاظ ادا کئے جن کا اظہار ارد گرد کھڑے ہوئے تمام لوگ کر رہے تھے۔ خیال آیا کہ صائب نے کیا اچھا شعر کہا ہے۔

صائب دو چیزیں می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

تحسین ناشناساں کے اس شور میں پروین کی خاموش داد ''سکوت سخن شناس'' تھی یا کچھ اور' اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم نے جلدی جلدی ایک ملحقہ ہال کا چکر لگایا اور پھر بھاگم بھاگ عالی صاحب کے پاس پہنچے جو کوئی تین درجن ویو کارڈ سامنے رکھے دھڑا دھڑ لکھتے جا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر قلم روکے بغیر بولے۔

''اگر راستے میں کہیں ٹریفک جام مل گیا تو اس فلائٹ کو مس ہی سمجھو۔''

موں ماخت سے چارلس ڈی گال ائیر پورٹ تک کا سفر کچھ ایسا تھا کہ اپنی جی ٹی روڈ کے ویگن اور بس ڈرائیور یاد آ گئے۔ ''وقت کم تھا اور مقابلہ سخت'' چنانچہ ذاکر نے گاڑی کچھ یوں چلائی جیسے پسماندہ قومیں تاریخ کی دوڑ میں ''لیٹ'' نکالنے کی کوشش کرتی ہیں مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ شارٹ کٹ مارنے کی بھی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اور کوئی راستہ ہمیں ائیر پورٹ تک نہیں لے جا سکتا تھا۔ میرا اور پروین کا یہ پہلا بڑا سمندر پار سفر تھا' اس لیے مسلکہ فلائٹ مس کرنے کے نتائج و عواقب کے بارے میں ہم بالکل اندھیرے میں تھے سو ہماری پریشانی شدید ہونے کے باوجود کچھ ویگ (Vague) سی تھی البتہ عالی صاحب اپنے گزشتہ سفروں کے اسی نوع کے تجربے سنا سنا کر ہماری وحشت میں مسلسل اضافہ کرتے جا رہے تھے۔ ہمارا پیرس کا ویزا محدود مدت کا تھا۔ اگر ہم اس وقت تک شہر سے نکل نہ جاتے تو تھانے کچہری کی نوبت آ سکتی تھی' اگلی فلائٹ کا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارا ٹکٹ پیرس سے آگے ائیر کینیڈا کا تھا اور تھا بھی نا قابل انتقال۔ اب ائیر کینیڈا کی اگلی فلائٹ کب ہو گی اور اس پر ہمیں سیٹ مل بھی سکے گی یا نہیں؟ اسی طرح کے اندیشہ ہائے دور دراز نے ہمیں گھیر رکھا تھا۔ میں ذاکر کو تیز چلانے یعنی مزید تیز چلانے کے بارے میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ میری نظر اپنے آگے جاتے ہوئے ایک بڑے سے ٹرک پر پڑی جس پر پانچ چھ ٹوٹی پھوٹی موٹریں لدی ہوئی تھیں۔ ذاکر نے بڑی مہارت سے اسے اوورٹیک کرتے ہوئے کہا۔

''آج کل تو آف سیزن ہے۔ کرسمس کے دنوں میں تو ایک ایک دن میں درجنوں حادثے ہوتے ہیں۔ ہر دس پندرہ میل کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی گاڑی الٹی ہوئی نظر آتی ہے۔'' میں نے تھوک کے ساتھ ہی اپنا لبوں تک آیا ہوا جملہ نگلا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ہم پیرس کے نواح میں سے گزر رہے تھے۔ عالی نے ہنکارے لیتے اور دانتوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بتایا کہ دوسری جنگ عظیم میں جرمن فوجیں اسی راستے سے پیرس میں داخل ہوئی تھیں مگر ان کے اس انکشاف میں کسی نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور موٹر میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی جسے کبھی کبھی عالی جی کے ہنکارے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔

ذاکر کو اس صورت حال میں اپنے ذمہ داری کا احساس بھی تھا اور تیز رفتاری پر پکڑے جانے کا خوف بھی۔ اس تذبذب کی وجہ سے بعض اوقات وہ ایک دم رفتار کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور بعض اوقات یکدم بہت خطرناک تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ہر دو صورتوں میں ہمارے پاس ''تک تک دیدم دم نہ کشیدم'' کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر ایک بہت بڑے ٹرک کے قریب سے گزرے جس پر نو بالکل نئی موٹریں لدی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اس ٹرک کو دیکھ کر مجھے وہ کوئلوں والا ٹرک یاد آ گیا جس سے ہم بلوچستان کی ایک سنسان سڑک پر ٹکرائے تھے۔

ہوا یوں کہ ۱۹۸۱ء میں جشن سبی کے موقعے پر ایک مشاعرے میں جانا کا اتفاق ہوا۔ مرحوم سید عابد علی عابد کے داماد اور معروف شاعرہ شبنم شکیل کے میاں شکیل احمد کوئٹہ میں حکومت بلوچستان کے سیکرٹری فنانس تھے۔ انہوں نے اپنے گھر پر ہماری دعوت کی۔ وہاں ان کے ایک دوست بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بے حد اصرار کے بعد ہمیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ صبح ہم سرکاری گاڑی کی بجائے ان کی ذاتی موٹر میں سفر کریں گے تاکہ راستے میں گپ شپ رہے۔ شکیل اور شبنم نے بھی ان کا ساتھ دیا اور یوں ہم ان کی نئی نکور موٹر میں بیٹھ کر سبی کی طرف روانہ ہوئے۔ بخاری صاحب عجیب سرشاری کا عالم میں تھے۔ پرانے فلمی گانے چل رہے تھے اور ہر گانے پر داد دینے کے لیے وہ بار بار مڑ کر مجھ سے عطاء سے گفتگو کرتے تھے۔ اگرچہ سڑک صاف تھی اور بہت کم ٹریفک آ جا رہی تھی لیکن ان کے اس بار بار مڑنے سے ہم اندر سے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ ضمیر صاحب نے تو ایک دو بار اشاروں اشاروں میں انہیں کہا بھی کہ وہ اپنا دھیان سامنے رکھیں مگر بخاری صاحب کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھے۔ ''اب میرا کون سہارا'' چل رہا تھا۔ بخاری صاحب نے ایک پہاڑی موڑ کاٹتے ہوئے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور پتا نہیں کیا کہا۔ میری اور عطاء کی نظر ایک دم سامنے پڑی' تنگ پہاڑی سڑک پر ایک ٹرک موڑ سے چند گز کے فاصلے پر سڑک کے عین درمیان کھڑا تھا اور ہمارا ڈرائیور سرے سے اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ عطاء کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی۔ ''بخاری صاحب!''

اب پتا نہیں یہ اس چیخ کا اثر تھا یا کچھ اور بخاری صاحب کے سر اور پاؤں نے ایک ساتھ حرکت کی' بریک اور ٹکر کی ملی جلی آواز آئی اور ہماری موٹر ٹرک کے ساتھ ہم آغوش ہو گئی۔ چند لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے...... دراصل اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی جیسے بہت سے رنگ لہرائیں اور پھر ایک سفید سی بے رنگی میں تحلیل ہو جائیں۔ میں بخاری صاحب کے پیچھے والی نشست پر تھا۔ جب میرے حواس قابو میں آئے تو میں نے دیکھا کہ ضمیر صاحب دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھے ہیں۔ بخاری صاحب سٹیرنگ پر جھکے ہوئے ہیں اور میرے ساتھ والی نشست پر عطاء ایسے بیٹھا ہے جیسے کسی پتنگ باز کی آخری پتنگ بھی کٹ گئی ہو۔ پتا نہیں کدھر کدھر سے پانچ سات لوگ نکل آئے اور ہماری موٹر کے گرد جمع ہو گئے۔ باہر نکل کے دیکھا تو گاڑی کا اگلا حصہ بہت بری طرح متاثر ہوا تھا۔ داہنی یعنی ڈرائیور والی سائڈ تو بالکل ہی تباہ ہو گئی تھی کیونکہ ٹکر سے بچنے کی کوشش میں یہی حصہ براہ راست ٹرک سے ٹکرایا تھا۔ میں نے پوری صورت حال کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بخاری صاحب کی غفلت ہی اصل میں ہمارے بچاؤ کا سبب بنی تھی۔ اگر وہ چند ثانئے پہلے ٹرک کو کاٹ کر سائڈ سے نکلنے کی کوشش کرتے تو اس وقت تک ہم سب فنا فی اللہ ہو چکے ہوتے کیونکہ ٹرک کے بعد صرف چار فٹ سڑک بچی تھی اور اس کے بعد کوئی سوفٹ گہری کھائی تھی۔

تقدیر کے اس عجیب و غریب اتفاق پر حیران ہونے کے بعد ہم نے اپنی چوٹوں کا جائزہ لیا۔ حادثے کی شدت کے حساب سے ہماری چوٹیں بہت معمولی نوعیت کی تھیں۔ ضمیر صاحب کا سر شاید ونڈ سکرین سے یا چھت سے ٹکرایا تھا۔ وہ ابھی تک بکے بکے سے تھے۔ بقیہ تینوں اپنے پاؤں پر کھڑے تھے اور کل جسمانی نقصان چند خراشوں اور رگڑوں سے زیادہ نہ تھا۔ چند گھنٹے بعد میڈیکل ایڈ ملنے پر جب ضمیر جعفری صاحب پوری طرح حواس میں آ گئے تو انہوں نے بخاری صاحب کی ڈرائیونگ پر ایسا مزیدار تبصرہ کیا کہ وہ خطرناک حادثہ ایک دلچسپ واقعہ بن کر رہ گیا جس کے متعلق سوچ کر آج بھی ہنسی آ جاتی ہے۔ کہنے لگے۔

''بخاری صاحب! ہم نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ سکندر اعظم نے ہندوستان سے اپنا واپسی کا سفر اسی درہ بولان کے راستے سے کیا تھا مگر قبلہ' آپ کی تیز رفتاری تو اس کی فوجوں کو بھی شرمندہ ہو گئی ہے۔''

میں ابھی ذاکر اور بخاری صاحب میں مماثلتیں ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ موٹر ایک دھچکے سے رکی اور ذاکر نے بتایا کہ ہم ائیر کینیڈا کے اڈے پر پہنچ گئے ہیں' آپ اتریں۔ میں موٹر کھڑی کر کے آتا ہوں۔ ہم نے وقت کی تنگی کے پیش نظر اسے وہیں سے خدا حافظ کہنا چاہا مگر پھر خیال آیا اگر واقعی فلائیٹ مس ہو گئی تو شاید ہمیں موٹر کی پھر ضرورت پڑے۔ چنانچہ میں' پروین اور عالی صاحب کو اس گفت و شنید میں چھوڑ کر اور ان کی ٹکٹیں لے کر ائیر کینیڈا کے کاؤنٹر کی طرف بھاگا۔ ہماری فلائیٹ کے کاؤنٹر کے سامنے چار پانچ لوگ

کھڑے تھے اور ایک خاصی گئی گزری سی عفیفہ انتہائی بیزاری سے انہیں بورڈنگ کارڈ دے رہی تھی۔ ایئر فرانس سے ایئر کینیڈا کا فرق صاف ظاہر تھا۔ اس اثناء میں پروین اور عالی صاحب بھی میرے ساتھ لائن میں لگ گ ء تھے اور ہمارے بعد کوئی نہیں تھا۔ فلائیٹ کی رخصتی میں کل پندرہ منٹ تھے لیکن اس بی بی کے اندازو اطوار سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جہاز چلنے میں ابھی ایک دو دن کا وقت ہے۔ خدا خدا کر کے ہماری باری آئی مگر اس سے پہلے کہ وہ ٹکٹ میرے ہاتھ سے لیتی' فون کا بزر بجا اور اس نے ریسیور اٹھا کر فرانسیسی میں کسی سے بات شروع کی۔ اب پتا نہیں وہ بات ہی لمبی کر رہی تھی یا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کئی صدیوں کے بعد اس نے فون رکھا' ہم تینوں پر ایک مشتبہ سی نظر ڈالی اور ہمارے پاسپورٹ طلب کئے۔ عالی کے دو تین پاسپورٹ ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اس نے عالی کی تصویر کی طرف دیکھا' پھر ہم تینوں پر نظر ڈالی اور پروین کی طرف انگلی کر کے بولی۔

Is this your Passport?

کوئی اور وقت ہوتا تو پروین شاید اس طرح کے اشتباہ پر بہت زیادہ برا مانتی مگر وہ یہ جملہ پی گئی اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

No, this is Mr. Aali's Passport.

اب کے اس عفیفہ نے وہی مشتبہ نظر مجھ پر ڈالی مگر میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا تا کہ وہ عالی کو اچھی طرح دیکھ لے حالانکہ عالی کے پھیلاؤ کے پیش نظر اس کی ضرورت نہ تھی۔ گھڑی کی سوئی کے ساتھ ساتھ ہماری پریشانی بھی بڑھ رہی تھی مگر وہ ستمگر ایک پتھریلی اور برفیلی نظر کے ساتھ ہمارے پاسپورٹوں کو گھورے جا رہی تھی۔ عالی نے اپنا سائبیرین کوٹ کاؤنٹر پر رکھا اور اسے بتایا کہ ہمارے جہاز کی روانگی میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ اب پتا نہیں' یہ عالی کے کوٹ کا رعب تھا یا انگریزی کا' اس نے ہمارے پاسپورٹ کاؤنٹر پر رکھ دیے اور بورڈنگ کارڈ ٹائپ کرنے لگی۔ فون کا بزر پھر بجا۔ اس نے جلدی جلدی فرانسیسی میں کچھ کہا' بورڈنگ کارڈ میرے ہاتھ پر رکھا اور کسی انگریزی نما زبان میں کہا۔

''جلدی کریں' جہاز ٹیک آف کے لیے تیار ہے۔''

وہ تو غنیمت تھا کہ کاؤنٹر سے جہاز تک کا فاصلہ بہت کم تھا۔ بس ایک گلی سی درمیان میں پڑتی تھی۔ ہوائی ٹریفک میں اضافے کے ساتھ ساتھ مسافروں کی سہولت کے لیے وقت اور فاصلے کے پیش نظر بڑے بڑے ہوائی اڈوں پر مختلف ہوائی کمپنیوں کے اپنے اپنے ٹرمنل بنا دیے گئے ہیں اور یوں ایک ہوائی اڈے کے اندر درجنوں چھوٹے چھوٹے ہوائی اڈے ہیں۔ آپ جس ایئر لائن پر سفر کر

رہے ہیں اس کے مخصوص دروازے سے ایئر پورٹ میں داخل ہوں' باقی کی سب چیزیں (جہاز سمیت) آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ خودکار سیڑھی نما کاریڈور ہوائی کمپنی کے ڈیپارچر لاؤنج سے سیدھا آپ کو جہاز کے اندر لے جاتا ہے۔ ہم افتاں وخیزاں جہاز کے دروازے پر پہنچے تو جہاز کا پورا عملہ جیسے ہمارے استقبال کے لیے جمع تھا۔ کاؤنٹر والی کی ایک ہم صورت' مگر نسبتاً خوش مزاج ہمشیرہ نے ہمیں مسکرا کر خوش آمدید کہا اور بتایا کہ اسے ہمارے بارے میں اطلاع دی جا چکی ہے اور ہمارے لیے کوشر میل کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ میں نے اور پروین نے حیرت سے پہلے اس کی طرف اور پھر عالی صاحب کی دیکھا۔ عالی نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں' یہ بتا رہی ہے کہ ہمارے لیے ذبیحہ گوشت کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ غالباً اشفاق نے ہمارے ٹکٹ کے ساتھ انسٹرکشن لکھوا دی ہوگی۔"

اس بار ہماری سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ تقریباً پانچ گھنٹے ہمیں سمندر کے اوپر پرواز کرنا تھا۔ میں نے ایک نظر جہاز پر ڈالی۔ خاصا درجہ دوم قسم کا جہاز تھا۔ میں نے کہا۔ "عالی صاحب! مجھے یہ جہاز کچھ زیادہ قابل اعتبار دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے تو اپنے پی آئی اے کے جہاز بہتر ہیں۔ یہ تو فوکر فرینڈشپ کا بڑا بھائی لگتا ہے۔"

پروین نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سوال کیا۔ "لیکن ہماری پی آئی اے کا نام کہیں نظر نہیں آیا' ایئر کینیڈا اسے تو وہ بڑی ہی کمپنی ہوگی۔"

عالی نے کہا۔ "بی بی' یہ یورپ ہے اور یہاں سے ہم امریکہ جا رہے ہیں۔ یہ اور ہی دنیا ہے۔ ہمارے باکمال لوگوں کی لاجواب پرواز مل ملا کر بیس پچیس جہازوں پر مشتمل ہے جبکہ صرف کینیڈا والوں کے تقریباً پانچ سو جہاز سروس میں رہتے ہیں اور اس طرح کی درجنوں کمپنیاں اس علاقے میں تیتروں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں۔"

پی آئی اے کی کوتاہ دامنی کا سن کر پتا نہیں کیوں شرمندگی سی ہونے لگی چنانچہ میں نے ہوائی سفر سے متعلق لطیفے سنانے شروع کر دیے۔ تیسرے لطیفے پر جہاز نے ٹیک آف کیا اور پانچویں پر ہمارے آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گرگ باراں دیدہ نے ہمیں اس طرح سے گھور کر دیکھا جیسے اسے گوروں کی اس دنیا میں رنگ دار نسل کی ہنسی پسند نہ آئی ہو۔

میں نے جواب میں گورے بابے کی طرف ایک دوستانہ مسکراہٹ پھینکی مگر اس کی بیزاری اور خشونت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ پائی۔ میرے دل میں پتا نہیں کیوں کچھ انتقامی قسم کے جذبات پیدا ہو گئے۔ میں نے سوچا ہمارے اردگرد سیٹوں پر لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ آخر اس "بابے" نے ہماری ہی طرف کیوں دیکھا ہے؟ اگلا لطیفہ میں نے آواز کا والیوم مزید بلند کر کے سنایا اور اس کا آخری حصہ اور پنچ لائن انگریزی میں سنائے تاکہ باباجی کو معلوم ہو کہ ہمارے اور ان کے ٹکٹ کی قیمت ایک جتنی ہے اور یہ کہ لطیفے میں مغرب

کی تہذیب کا مضحکہ اڑا کر اسے شرمندہ ہونے کا موقع دیا جائے۔ اب سوچتا ہوں تو وہ حرکت بڑی بچگانہ سی لگتی ہے۔ مگر شاید یہی بچگانہ حرکتیں انسانی فطرت اور کردار کا اصل حسن ہیں۔ میں نے اس وقت جو لطیفہ سنایا وہ اگرچہ پرانا تھا مگر اس فرانسیسی بابے کے حوالے سے ہمارے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا اس لیے مزا دے گیا۔

ایک بار دو فرانسیسی نواب دریا کے کنارے سیر آب کا مزا لے رہے تھے۔ سامنے سے دو خواتین نظر آئیں۔ ایک نواب نے مسکراتے ہوئے دوسرے کو آنکھ ماری اور کہا۔ ''وہ دیکھو میری بیوی اور محبوبہ ایک ساتھ آ رہی ہیں۔''

''کمال ہے کیسی عجیب بات ہے؟ میں بھی تمہیں یہی کہنے والا تھا۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

ایک تو میری آواز دانستہ طور پر بلند تھی اس پر اس بابے کے کان بھی ہمارے طرف تھے اس نے ایک غصیلی نگاہ مجھ پر ڈالی مگر میں اس اثناء دوسرا حملہ شروع کر چکا تھا۔

پرانے وقتوں میں انگریزوں کی ایک محفل میں ''واٹرلو'' کی فتح کا جشن منایا جا رہا تھا۔ نپولین بونا پارٹ پر اپنی برتری اور فتح کے اظہار کے لیے مختلف لوگ باری باری بھنے ہوئے سالم مرغ ہاتھوں میں تھام کر اٹھتے اور مرغے کو دونوں ہاتھوں سے چیرتے ہوئے نعرہ لگاتے۔

"Bone-Apart"

یوں وہ نپولین بونا پارٹ کے نام سے بون اپارٹ کی رعایت لفظی کا فائدہ اٹھاتے۔ جواب میں حاضرین محفل تالیاں بجا کر ان کو داد دیتے تھے۔ آخر میں ایک بڈھے سے ریٹائرڈ انگریز کی باری آ گئی جو اس وقت تک گلے گلے وہسکی میں ڈوب چکا تھا۔ موصوف اپنی جگہ سے لہراتے اور لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے مرغے کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اسے اپنے چہرے کے سامنے لائے مگر نشے کے زور میں یہ بھول گئے کہ اب انہیں کیا کہنا ہے چند لمحے سوچتے رہے پھر مرغے کو چیرتے ہوئے بولے۔ نپولین!!!

یا تو یہ لطیفہ اس بابے کی سمجھ میں نہیں آیا تھا یا وہ نپولین کے مخالفین میں سے تھا۔ اور یا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں جان بوجھ کر اس طرح کے لطیفے سنا رہا ہوں کیونکہ اس نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ یہ مسکراہٹ گویا صلح کی سفید جھنڈی تھی کیونکہ اس کے بعد اس نے اپنا دھیان سامنے کی طرف کر لیا اور سفر کے آخر تک پلٹ کر نہیں دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد فلم شروع ہو گئی۔ ڈسٹن ہوفمین میرا پسندیدہ اداکار ہے اور اس کی فلم کی تعریف بھی خاصی سن رکھی تھی اس لیے اگلے دو گھنٹے فلم دیکھنے میں گزارے۔ یہ ایک ایسے اداکار کی داستان تھی جو غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا مگر اس پیشے سے متعلق ٹھیکیدار

اسے خاطر میں نہیں لاتے تھے اور یوں وہ ایک ناکام اور مفلوک الحال اداکار کی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک دن وہ ایک خاتون کا بہروپ بھر کر ایک ٹی وی سیریل میں سکرین ٹیسٹ کے لیے پہنچ جاتا ہے اور اس رول کے لیے منتخب ہو جاتا ہے۔ اس کا کردار ناظرین میں مقبول ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اسے مستقل طور پر وہ بہروپ اپنانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے کہانی میں بہت مزید ارسچوئشنز پیدا ہوتی ہیں یہاں تک کہ اس سیریل کی ہیروئین' جس سے ڈسٹن عام زندگی میں محبت کرتا ہے' اسے اپنی سہیلی سمجھ کر اس کے سامنے لباس تبدیل کرتی ہے اور اس کے ساتھ بیڈ میں سو جاتی ہے مگر وہ اسے بتا نہیں سکتا کہ وہ کون ہے۔ جب اس کے بہروپ کا راز کھلتا ہے تو سارا زمانہ اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا قائل ہو جاتا ہے۔ وہ خاتون اس دھوکہ دہی کے انکشاف پر پہلے تو سخت ناراض ہوتی ہے مگر معاملے کی حقیقت جان کر اسے معاف کر دیتی ہے۔ فلم کی کہانی' پلاٹ اور تکنیکی سائیڈ پر کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مگر ڈسٹن ہوفمین نے جس خوبصورتی اور جزئیات نگاری کے ساتھ عورت کا کردار ادا کیا وہ اپنی جگہ پر اداکاری کا ایک معجزہ تھا۔ اس کا چلنا پھرنا' اٹھنا بیٹھنا' بولنا' شرمانا' لڑنا جھگڑنا' آواز' انداز' لباس' ہر چیز کمال فن کا شاہکار تھی۔ ہمارے یہاں بھی فلموں اور اسٹیج پر کبھی کبھی مرد اداکار زنانہ رول ادا کرتے ہیں مگر........

فلم ختم ہوئی تو میں نے اپنے ہم سفروں پر نگاہ ڈالی۔ دائیں یعنی پروین والے محاذ پر مکمل خاموشی تھی مگر بائیں طرف سے عالی کے خراٹے ایک مشینی تسلسل کے ساتھ جاری تھے۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر جہاز کے عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ وہاں کھڑکی کے ساتھ ایک سیٹ خالی تھی۔ وقت گزارنے کے لیے میں وہاں بیٹھ گیا اور باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف ایک عجیب سی سفیدی تھی جیسے ہم روئی کے گالوں پر پرواز کر رہے ہوں۔ جہاز چونکہ بہت زیادہ بلندی پر اڑ رہا تھا اس لیے بادلوں اور سمندر کے رنگ آپس میں گھل مل گئے تھے اور کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ جو سفیدی چادر نظر آ رہی ہے۔ یہ اصل میں کیا ہے۔ میں نے سوچا' یہ عمر رواں کا سفر بھی تو ایسا ہی ایک دھندلکا سا ہے۔ اپنا ایک شعر یاد آ گیا۔

زمیں کی قید میں' میں ہوں' یہ میری قید میں ہے
کہاں پہ گھر ہے' کہاں ہے قفس؟ نہیں معلوم!

اس اتنی بڑی کائنات میں یہ جہاز کس قدر معمولی اور بے وقت چیز ہے۔ یہ چار پانچ سو دو ٹنگے جاندار جو اس میں بیٹھے ہیں' اس کائنات کے تناظر میں حشرات الارض سے لاکھوں گنا چھوٹے اور بے وقعت ہیں مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مکمل کائنات ہے اور ان میں سے ہر ایک کے شعور میں اس کائنات کا اپنا ایک جداگانہ عکس ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ جس میں

میں اس وقت بیٹھا ہوں، یہ کس مکان اور زمان میں چل رہا ہے، چل بھی رہا ہے یا نہیں!

اس بنیادی سوال کی فلسفیانہ گھمبیرتا میں ایک دم مجھے اپنی بیٹی روشین کا وہ معصومانہ جملہ یاد آیا جو اس نے اپنے پہلے ہوائی سفر کے دوران کہا تھا۔ اس کی عمر اس وقت تین برس تھی۔ جہاز لاہور سے کراچی جا رہا تھا۔ جب اس کی اڑان میں ہمواری آئی تو کچھ دیر وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھتی رہی پھر بڑے تشویش آمیز لہجے میں بولی۔ ''پاپا! یہ جہاز چلتا کیوں نہیں ہے۔''

نیوٹن کے حرکت اور رفتار کے کلئے پڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے آئندہ چند برسوں میں اسے اس سوال کا جواب مل جائے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس اس سوال کا جواب اب بھی نہیں ہے۔

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلوم!

اس وقت میرا جی بے حد چاہ رہا تھا کہ کائنات کی اس وسعت، ہمہ گیریت اور پراسراریت پر کسی ایسے شخص سے بات کروں جس کی دلیل دماغ میں اٹھنے والے سوالوں کے اس طوفان کو کسی ساحل سے ہمکنار کردے مگر اس وقت میں خدا کی اتنی بڑی کائنات اور جہاز کے پانچ سو مسافروں میں اکیلا آدمی تھا...... اکیلا اور تنہا!

یکدم جہاز کو جھٹکا سا لگا اور دور نیچے مجھے سمندر کی ایک جھلک دکھائی دی۔ آسمان اور سمندر دونوں میری کمزوری ہیں۔ ان کی دہشت اور پہنائی میں اپنے ہونے کا احساس ہمیشہ مجھے ایک عجیب نشاط آمیز الجھن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مجھ سے پہلے کتنے لوگوں نے یہ باتیں سوچی ہوں گی اور میرے بعد نجانے کتنی مخلوق خدا اس تذبذب کی گزرگاہ میں خیمہ زن ہوگی۔ غالب نے جو ہر آدمی کو 'بجائے خود اک محشر خیال'' کہا تھا تو وہ محض شاعرانہ ترنگ نہیں تھی۔ کیسی عجیب بات ہے، ہر آدمی ایک ہی ''خیال'' سوچتا ہے مگر خیال پھر بھی نئے کا نیا رہتا ہے۔ یہ آدمی ہیں جو پرانے ہوتے ہیں اور مٹتے رہتے ہیں۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ اس کی رہ گزر پھر بھی

◆◆◆

مونٹریال ۔ ا

جہاز کے مونٹریال کی فضا میں پہنچنے کا اعلان ہوا تو جیسے ''جان تازہ جہان میں آئی'' سیٹیں سیدھی ہونے لگیں۔ بوڑھی میموں نے اپنے بیگ کھولنے شروع کیے اور'' آرائش خم کاکل'' میں مصروف ہو گئیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کو دیکھ کر'' اندیشہ ہائے دور و دراز'' کی جگہ کچھ اور قسم کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ جہاز ایک طرف کو جھکا اور کئی ہاتھوں سے آئینے' لپ اسٹکیں اور ہیر برش گر پڑے۔ بہت سی خجالت آمیز مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور منزل کے قرب کی گرمی سے جہاز کے اندر کا درجہ حرارت ایک دم بڑھ سا گیا۔

کراچی سے چلے ہوئے ہمیں تقریباً پچیس گھنٹے ہو چکے تھے مگر جہاز والوں کی اناؤنسمنٹ کے مطابق ہم ابھی تک تیرہ تاریخ میں تھے۔ پیرس سے مونٹریال تک چار گھنٹے مزید حساب کتاب کی نذر ہو گئے تھے' یعنی اب کل ملا کر ہم نو گھنٹے کہیں گم کر چکے تھے۔ چند برس پہلے میں نے ایک غزل کہی تھی جس میں دو شعر وقت کے الٹ پھیر کے حوالے سے تھے مگر اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن ان کا یہ پہلو بھی سامنے آئے گا۔

گزر گیا جو زمانہ اسے بھلا ہی دو
جو نقش بن نہیں سکتا' اسے مٹا ہی دو
گزر رہا ہے جو لمحہ اسے امر کر لیں
میں اپنے خون سے لکھتا ہوں' تم گواہی دو

مونٹریال میں متوقع سردی اور عالی صاحب کی ہدایات کے پیش نظر ہم نے خاصے گرم کپڑے لاد رکھے تھے مگر ائیر پورٹ کے شیشوں سے باہر کے منظر میں غیر معمولی سردی کا کوئی تاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اوورکوٹ کے بٹن بند نہیں کئے اور اور سامان کی ٹرالی پکڑ کر باہر کی طرف چلنا شروع کیا۔ عالی صاحب حسب معمول اپنے بریف کیس کو بغیر کسی وجہ کے کھولنے اور بند کرنے میں مصروف تھے۔ جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو بیرونی دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ عالی صاحب تقریباً چیخنے کے انداز میں بولے۔

'' اے بھائی! اے بھائی امجد صاحب' خدا کا خوف کرو۔ یہ کوٹ کے بٹن بند کرو اور مفلر لپیٹو۔'' اگرچہ اردو کی یہ بات چیت وہاں کسی کے پلے نہ پڑ سکتی تھی مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سب لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔'' کچھ نہیں

ہوتا' عالی صاحب! کوئی خاص سردی نہیں ہے۔ وہ دیکھئے لوگ ایک کوٹ میں پھر رہے ہیں۔''

''وہ یہاں کے رہنے والے ہیں بھائی' تم گرم ملک سے آرہے ہو اور گزشتہ پچیس گھنٹوں سے ایک معتدل درجہ حرارت میں سفر کر رہے ہو' آپ کو اندازہ نہیں کہ یہ فوری ایکسپوژر آپ کو کن کن مسائل میں مبتلا کرسکتا ہے۔''

میرا پھر جی چاہا کہ میں عالی صاحب کو ان کی اور اپنی عمر کے بیس برسوں کا فرق بتاؤں مگر ان کے لہجے میں ایسی محبت اور اپنائیت تھی کہ میں نے محض ان کی تشویش رفع کرنے کے لیے ان کی تمام ہدایات مان لیں۔ مجھ سے فارغ ہو کر وہ پروین کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ اس دوران میں احتیاطی تدابیر کے طور پر اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹ چکی تھیں۔ عالی نے اس کی طرف دیکھ کر اطمینان آمیز انداز میں سر ہلایا اور کہا۔ ''میاں تم سے تو یہ خاتون ہی زیادہ عقلمند ہے حالانکہ مجھے تمہاری نسبت ان سے ایسی بات کی توقع بہت کم تھی۔''

پروین شاید بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے اس مشروط تعریف کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ہم ایئر پورٹ سے باہر نکل آئے جہاں ہمارے بنیادی میزبان اردو انٹرنیشنل کے اشفاق حسین اپنے ساتھیوں سمیت ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اشفاق ٹورنٹو میں قیام پذیر ہے اور اس پروگرام کی تمام تر تفصیلات اور تیاری اسی نوجوان کی مساعی کا نتیجہ تھیں۔

اشفاق سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۶ء میں کراچی آرٹس کونسل میں ہوئی تھی جہاں وہ پروگرام آفیسر تھا اور ان دنوں اس کا نام اشفاق شفق زیدی ہوا کرتا تھا۔ ان آٹھ برسوں میں اس کی شکل وصورت میں سر کے بالوں میں معمولی سی کمی کے علاوہ کوئی واضح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پروین کی نظر بھی غالباً سب سے پہلے اشفاق کے بالوں پر پڑی کیونکہ اس نے اسے دیکھتے ہی میرے کان میں کہا۔ ''ارے یہ اشفاق کو کیا ہوا؟'' یہ تو آپ کا ہم زلف بنتا جارہا ہے۔''

اس کے بعد معانقوں اور مصافحوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پچیس گھنٹے کے سفر کی تھکن کے بعد دماغ کچھ ایسا سن سا ہو رہا تھا کہ کوئی بات ٹھیک سے پہلے نہیں پڑ رہی تھی۔ اشفاق کے تعارف کروانے کے دوران میں نے بہتیری کوشش کی کہ Who is Who کی نشاندہی کرسکوں مگر جسمانی سستی' اشفاق کی تیز گفتاری اور مصافحوں کی کثرت نے ہر چیز گڈمڈ کردی تھی۔ ان مصافحوں پر مجھے اپنے عزیز دوست' ڈرامہ نگار' اداکار اور ریڈیو کے پروڈیوسر جمیل ملک کے دفتر کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے مگر اس سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ اس جمیل ملک کا ہمارے راولپنڈی کے بزرگ شاعر جمیل ملک سے کوئی تعلق نہیں' یہ اور بات ہے ریڈیو والے جمیل ملک کو شاعر جمیل ملک کی غزلوں کی داد اکثر ملتی رہتی ہے اور وہ اس داد کو انتہائی مروت اور احسان مندی کے ساتھ وصول بھی کرتا ہے۔ شاعر جمیل

ملک اس طرح کی صورت حال میں کیا کرتے ہیں' اس کا پتا نہیں۔ تو وہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ جمیل ملک کے ریڈیو اسٹیشن والے کمرے میں ہاؤس فل تھا۔ کوئی بارہ تیرہ کے قریب دوست جمع تھے جس کی وجہ سے کرسیاں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہی تھیں اور گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا۔ ایسے میں ایک دیہاتی سافنکار اپنے دس بارہ سال کے بیٹے کے ساتھ اندر آیا اور باری باری سب سے ہاتھ ملانے لگا۔ اس کے اس عمل کی وجہ سے کمرے میں ایک افراتفری سی مچ گئی مگر کرسیوں کے اوپر سے اور میز کے نیچے سے کسی نہ کسی اس شیر مرد نے کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں سے ہاتھ ملا ہی لیا۔ اس کے بعد وہ جمیل ملک کی طرف اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے متوجہ ہوا مگر کچھ سوچ کر ایک دم رکا اور مڑ کر اپنے بیٹے سے کہنے لگا۔ ''مصافحہ کراوئے۔''

اب بیٹے نے وہی مشق دہرانا شروع کی اور کرسیوں اور ٹانگوں سے بچتا بچاتا' الجھتا' گرتا اور سنبھلتا ہوا بالآخر تمام حاضرین سے ہاتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں جمیل ملک اور اس لوک فنکار کے مذاکرات ختم ہو گئے تھے چنانچہ اب اس نے واپسی مصافحے شروع کیے۔ اس مضحکہ خیز صورت حال میں ہم سب' جو اپنے تئیں بڑے ''مذاقیے اور مخولیے'' بنتے تھے' بے بسی کی تصویر بن چکے تھے۔ خدا خدا کر کے اس کے مصافحے ختم ہوئے مگر ابھی ہمارے اطمینان کا سانس خارج بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر اس آدمی نے خشونت بھری نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''مصافحہ کراوئے''

معلوم ہوا کہ سب سے پہلے ہم آفاق حیدر صاحب کی طرف جائیں گے جہاں چائے پینے کے بعد تھوڑی دیر آرام کریں گے' اس کے بعد کھانا ہو گا' محفل جمے گی' مقامی ریڈیو کے لیے ہمارے انٹرویو ریکارڈ کیے جائیں گے اور کچھ لوکل صحافی ہم سے مختلف ادبی مسائل پر بات چیت کریں گے۔ میں نے اور پروین نے رحم طلب نظروں سے عالی صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی اپنی حالت بھی خاصی خراب ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہمیں آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی کہ وہ ابھی ان بلاؤں کو ٹالنے یا کم کرنے کے لیے کچھ اقدام کرتے ہیں۔

مجھے اور عالی کو شبیر صدیقی کی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ پروگرام یہ بنا کہ شبیر ہمیں آفاق حیدر صاحب کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد ہمارا سامان اپنے گھر پہنچا دیں گے کیونکہ ہم دونوں کو انہی کے ہاں قیام کرنا تھا۔

ائیر پورٹ سے نکلے تو نکلتے ہی چلے گئے کیونکہ ہمارے میزبانوں کے گھر ائیر پورٹ سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر تھے۔ زندگی میں پہلے بھی کئی بار ایک دو راتیں مسلسل جاگنے کا اتفاق ہوا ہے مگر جیسی تھکن' سستی اور بوجھل پن اس وقت محسوس ہو رہا تھا وہ میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ ہمارا میزبان ہم سے باتیں کرنا چاہ رہا

ہے مگر نیند تھی کہ صفیں باندھے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میں شبیر کی باتوں کے ''ہوں ہاں'' میں جواب دیتا رہا اور اس دوران میں غالباً کئی بار ایک ایک دو دو منٹ کے لیے سویا بھی کیونکہ گفتگو کا سرا میرے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے عالی سے اپنی کیفیت بیان کی تو بولے۔

''اسی کو Jet Lag کہتے ہیں۔ یہ کیفیت ابھی کافی دیر رہے گی اور جب تک آپ ایک بھرپور نیند نہیں لیں گے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔''

موٹر اب رہائشی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے یک منزلہ گھروں میں لکڑی کا وافر استعمال تھا۔ ہر مکان کے آگے چھوٹا سا ڈھلوان نما ٹکڑا تھا جس پر غالباً گھاس ہو گی مگر اس وقت ان پر برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سڑک صاف تھی مگر کناروں پر برف کی ڈھیریاں میر حسن کی مثنوی والے مولسری کے پھولوں کی یاد دلا رہی تھیں۔

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے بھول
پڑے ہیں ہر طرف مولسریوں کے پھول

آفاق حیدر کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پروین ہم سے پہلے نہ صرف پہنچ چکی ہے بلکہ بیڈ روم میں جا کر اس نے دروازہ بھی بند کر لیا ہے اور یہ تاکید کی ہے کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے وہ سونا چاہتی ہے۔ عالی نے شکایتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''بھئی آپ اپنی خواہر عزیزی کو سمجھائیں' یہ لوگ ہمارے استقبال کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ تھکن اپنی جگہ مگر دنیا داری بھی تو نبھانی پڑتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''عالی جی' اسے کچھ دیر آرام کر لینے دیں۔ وہ تو بیچاری یوں بھی نازک اور دھان پان سی ہے۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ مجھے لوگوں کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے۔''

آفاق حیدر سے تعارف ہوا۔ موصوف انڈین سول سروس میں تھے' لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں اور عرصہ بارہ سال سے مونٹریال میں یہاں کے ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ آفاق صاحب دبلے پتلے سے کم گو قسم کے آدمی تھے۔ شروع میں تو ان کی کم گوئی کو ان کی سول سروس کا تحفہ سمجھتا رہا مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ اس میں ان کے گریڈ سے زیادہ ان کی طبیعت کا دخل ہے۔ بیگم آفاق لکھنؤ گئی ہوئی تھیں۔ ان کی واپسی ایک ہفتے تک متوقع تھی۔ آفاق صاحب نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اپنے برصغیر کی طرح یہاں کے مرد لوگ چائے روٹی کے لیے عورتوں کے محتاج نہیں ہوتے کیونکہ یہ سب کام انہیں سیکھنے پڑتے ہیں۔ چائے کی میز پر اشیائے خوردو

نوش کی افراط دیکھ کر ہمیں آفاق کے سگھڑ پن کا اندازہ ہوا۔ میں نے کہا۔ ''اگر یہ سب کچھ آپ نے خود تیار کیا ہے تو آپ کی بیگم کو مبارکباد دینی چاہیے۔ ماشاءاللہ آپ تو امور خانہ داری میں سگھڑ بیبیوں کو بھی مات کرتے ہیں۔''

جی تو چاہ رہا تھا کہ ان سے سلائی کڑھائی اور کشیدہ کاری کے بارے میں بھی دریافت کرتا مگر پہلی ملاقات کی جھجک اور وجود میں اترتی ہوئی تھکن آڑے آگئی۔

ابھی ہم لوگ چائے کی میز پر ہی تھے کہ کچھ اور لوگ آ گئے۔ غالباً انہیں فون پر ہمارے آنے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ مصافحوں کا ایک اور دور چلا' مسکراہٹوں کے تبادلے ہوئے اور مختلف النوع قسم کے سوالات کا سلسلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے شبیر صدیقی کا جس نے غالباً ہماری حالت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ ابھی اس کے ساتھ چلیں' کچھ دیر آرام کریں اور پھر نہا دھو کر اور فریش ہو کر کھانے کے وقت یہاں پہنچ جائیں۔ حاضرین محفل نے ہماری طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ اس طرح ہمارا جانا اخلاقی اعتبار سے کچھ ایسا مستحسن نہیں مگر صورت حال ایسی تھی کہ اگر اخلاق کا دامن تھامے رکھتے تو ہوش کا دامن ہاتھوں سے نکل جانے کا ڈر تھا۔

شبیر کے گھر پر اس کی فرانسیسی نژاد نو مسلم کینیڈین بیوی فرانسین فائزہ صدیقی ہماری منتظر تھی۔ فرانسین اس کا خاندانی' فائزہ اسلامی اور صدیقی ازدواجی نام تھا۔ خوش مزاجی اس خاتون کے چہرے پر جلی حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی دلچسپ اردو میں ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہمارے کمرے اوپر کی منزل میں تھے۔ اس نے ہمیں ان کے بارے میں یوں اطلاع دی۔ (افسوس کہ لہجہ نقل نہیں ہو سکتا)

''آپ کے کمرے اوپر تیار ہیں آپ سب سے پہلے آرام کرنا پسند کریں گے یا کچھ پینا ہے؟ چائے بھی تیار ہے اور کافی بھی' جوس بھی مل سکتا ہے۔''

ہم نے آرام کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تو فائزہ نے روئے سخن اپنے شوہر کی طرف موڑا۔ ''آپ کچھ پئیں گے میاں صاحب؟''

ایک میم کے منہ سے ''میاں صاحب'' کے الفاظ نے کچھ ایسا مزا دیا کہ چند لمحوں کے لیے میری تھکن جیسے غائب سی ہو گئی۔ میں نے پہلی بار شبیر کے گھر کا غور سے جائزہ لیا۔ خوبصورت' صاف ستھرا' آرام دہ اور محبت کی خوشبو سے مہکتا ہوا یہ گھر اپنے اندر اپنائیت کی ایک عجیب سی مہک لیے ہوئے تھا۔ ہر چیز میں ایک ''نکھ'' سا تھا اور میزبانوں کے رویے میں ایسا گہرا خلوص تھا جو صرف اچھی روحوں سے مخصوص ہے۔

کھانے کا وقت آٹھ بجے تھا اور اس وقت پونے سات ہو رہے تھے۔ عالی نے کہا۔ ''مجھے آپ کی تھکن کا اندازہ ہے مگر اپنے بیس سالہ غیر ملکی سفروں کے تجربے کی بنیاد پر میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس وقت سونے کی کوشش نہ کریں کیونکہ اس صورت میں آپ آفاق کے کھانے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔''

اس متوقع صورت حال کا کچھ کچھ اندازہ مجھے بھی تھا چنانچہ ہم نے تیز اور گرم کافی سے اپنی سستی کو بھگانے کا پروگرام بنایا اور منہ ہاتھ دھو کر شبیر کے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ گئے۔ فائزہ کافی بنانے میں مصروف ہو گئی اور شبیر کیمرہ لے آیا۔ گرم گرم کافی' فوٹو گرافی اور فرانسین کی اردو اور پنجابی کی خوشگواری میں سوا گھنٹہ گویا پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ ویسے وقت کے یوں بے وقت گزر جانے پر سب سے اچھا تبصرہ ایک سردار جی کا ہے۔

دو سردار جی ریلوے اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کی مطلوبہ ٹرین چار گھنٹے لیٹ ہے۔ ایک نے کہا۔ ''چلو واپس چلتے ہیں' پھر آ جائیں گے۔'' اس پر دوسرے نے کہا۔

''چھوڑ و یار' چار گھنٹے کا کیا ہے؟ گپ شپ کرتے ہیں' پانچ منٹ میں گزر جائیں گے۔''

آفاق حیدر کے گھر دوبارہ پہنچے تو وہاں جیسے میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی تیس کے قریب احباب جمع تھے۔ پروین کا پتا کرایا مگر اس نے اٹھنے سے صاف انکار کر دیا۔ عالی صاحب اس بات پر بہت جھلائے مگر میں نے انہیں ایک بار پھر پروین کے خاتون ہونے' دھان پان ہونے اور تھکا ہوا ہونے کا حوالہ دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

کھانے کے بعد ریڈیو انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ انٹرویو کرنے والے صاحب کا تعلق ادب اور ریڈیو کے علاوہ ہر چیز سے تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں ان کے کھانے کے دوران کی جانے والی گفتگو سے ہی ہو گیا تھا مگر اب جو انہوں نے انٹرویو شروع کیا تو ہمیں ان کی معلومات اور صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوا۔ موصوف کو کینیڈا میں آباد ہوئے تقریباً بیس برس ہو چکے تھے اور وطن کے حالات' ادب' فنون لطیفہ اور معاشرتی تبدیلیوں کے بارے میں ان کی بے خبری کی عمر بھی تقریباً اسی قدر تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو ادب و فن پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ یہ رٹا رٹایا جملہ ضرور بولتے ہیں کہ فنکار اور مفلسی لازم و ملزوم ہیں اور یہ کہ اعلیٰ فن کی تخلیق کے لیے فنکار کا برے حال اور بانکے دیہاڑے ہونا ضروری ہے چنانچہ انہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز جس جملے سے کیا وہ کچھ یوں تھا۔

''میں آپ کو مونٹریال میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب شاعر لوگ ہوائی جہازوں پر سفر کرنے لگے ہیں اور انہیں اتنی دور دور بلایا جاتا ہے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟''

میرے تو جیسے سر میں لگی اور تلووں میں بجھی۔ میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں' اصل میں آپ احباب جب سے تلاش معاش کے لیے وطن سے نکلے ہیں اور روٹی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان علاقوں میں آباد ہوئے ہیں تو آپ کے اندر تہذیبی پیاس نے فنکاروں کے اس طرح کے دوروں کو ممکن بنا دیا ہے۔"

میرا جملہ شاید میری مسکراہٹ کے باوجود زیادہ تیز تھا کیونکہ اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی جس کے دوران ٹیپ چلنے اور عالی جی کے ہنکاروں کے سوا کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔

آفاق حیدر نے اپنی سول سروس کی ٹریننگ کو کام میں لاتے ہوئے ایک گول مول سی تقریر کی جس کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ انٹرویو کرنے والے صاحب کے جملے کا مطلب وہ نہیں تھا جو ہم سمجھے ہیں بلکہ وہ لفظ کے غلط انتخاب کی وجہ سے وہ کچھ کہہ گئے ہیں جو وہ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ ہمارا ارادہ بھی محاذ آرائی کا نہ تھا اس لیے میں نے ایک خوش دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کی وضاحت کو قبول کر لیا۔ لیکن ابھی مسکراہٹ میرے چہرے پر ہی تھی کہ وہ صاحب بولے' کہنے لگے۔

"آفاق صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا اشارہ آپ لوگوں کی طرف نہیں تھا' آپ تو ہمارے معزز مہمان ہیں۔ میں تو شاعروں کی بات کر رہا ہوں۔"

اب معلوم ہوا کہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" کا اصل مطلب کیا ہے۔

عالی کو ایک جھرجھری سی آئی۔ انہوں نے جلدی جلدی انگلی دانتوں پر پھیری اور ان صاحب سے براہ راست سوال کیا۔ "آپ کو پتا ہے ہم لوگ کون ہیں اور یہاں کس لیے آئے ہیں؟"

"جی کیوں نہیں؟ آپ ماشاء اللہ اتنے مشہور شعراء حضرات ہیں اور شمالی امریکہ میں مشاعرے پڑھنے آئے ہیں۔" وہ صاحب بولے۔

"تو پھر کن شاعروں کی بات کر رہے ہیں؟"

عالی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اول تو وہ بحث میں شامل نہیں ہوتے لیکن اگر ہو جائیں تو پھر کسی قسم کی رورعایت نہیں کرتے چنانچہ جوں جوں وہ صاحب اپنی بات کی وضاحت اور اپنے دفاع میں دلیلیں دیتے توں توں عالی کے حملوں کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس عذر گناہ پر مجھے ریڈیو اسٹیشن لاہور کا ایک واقعہ بہت یاد آیا کیونکہ اس میں بھی عذر گناہ ایسا ہی بدتر از گناہ تھا۔

پاکستان ٹائمز لاہور کے حمید شیخ مرحوم روزانہ رات کو ریڈیو سے خبروں پر انگریزی میں تبصرہ کیا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ

مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے پہنچتے' ڈیوٹی افسر سے اپنے سکرپٹ کا مسودہ لیتے اور اسے Live Broadcast کرا دیتے۔ ایک دن وہ پہنچے تو ڈیوٹی افسر نیا تھا اور چپڑاسی پر اپنی افسری کا رعب جھاڑ رہا تھا۔ اس نے اشارے سے حمید شیخ کو ایک طرف بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر چپڑاسی کو ڈانٹنے لگا۔ پروگرام شروع ہونے میں دو منٹ رہتے تھے' حمید شیخ نے کہا۔

''دیکھنا بھائی' یہاں میرا اسکرپٹ ہوگا۔''

ڈیوٹی افسر نے ایک خشونت بھری نگاہ حمید شیخ پر ڈالی اور سرزنش کے انداز میں بولا۔ ''آپ سے کہا ہے وہاں تشریف رکھیں' میں فارغ نہیں بیٹھا ہوا' ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔''

حمید شیخ مرحوم بڑا خوش شکل اور طرح دار آدمی تھا۔ اس کی شخصیت میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کا رکھ رکھاؤ تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''بھئی میرے پاس وقت کم بہت کم ہے' آپ مہربانی کر کے.......''

ڈیوٹی افسر نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔ ''وقت کم ہے تو پھر کسی اور وقت آجایئے گا۔''

حمید شیخ یہ سن کر وہاں سے اٹھا اور سیدھا گھر چلا آیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اسٹیشن ڈائریکٹر کو فون کیا اور سارا واقعہ سنایا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر نے اسی وقت دفتر پہنچ کر ڈیوٹی افسر کو لائن حاضر کر دیا۔

ڈیوٹی افسر نے بتایا کہ حمید شیخ نامی ٹیلنٹ اپنا سکرپٹ پڑھنے ریڈیو اسٹیشن نہیں پہنچا تھا چنانچہ اس نے تبصرے کی جگہ سازینہ چلا کر وقت پورا کر لیا ہے اور اس کی تحریری رپورٹ بھی لکھ دی ہے۔ جواب میں اس اس کے ساتھ جو ہوئی اس کا لب لباب یہ تھا کہ صرف حمید شیخ کی معافی ہی اس کی نوکری بچا سکتی ہے کیونکہ ریڈیو کو اس کی سروسز کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

دوستوں نے سمجھایا کہ فوراً جاؤ اور حمید شیخ کے پاؤں پڑ جاؤ۔ وہ شریف آدمی ہے' ضرور معاف کر دے گا۔ ان کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسٹیشن ڈائریکٹر کو حمید شیخ کا فون آیا۔ اس نے تقریباً رونے والی آواز میں کہا۔ ''بھائی میں نے تمہارے اس افسر کو معاف کیا۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ بس تم اسے کسی طرح فوراً واپس بلا لو۔ اس سے کہو میرا پیچھا چھوڑ دے۔''

''کیوں' کیا ہوا؟'' اسٹیشن ڈائریکٹر نے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے؟'' حمید شیخ نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا یہ افسر مجھ سے کہہ رہا ہے دراصل سارا دن مختلف قسم کے میوزیشن' ریڈیو میں کام کرنے کے شوقین اور میراثی لوگ آتے رہتے ہیں جن کو نہ عقل ہے نہ موت۔ سوائے ڈیوٹی روم میں بیٹھ کر بک بک کرنے کے انہیں اور کوئی کام نہیں۔ وہ سمجھا کہ میں بھی.......''

وہ صاحب عالی جی کے مغلیہ جملوں سے بچنے کے لیے بار بار پینترے بدل رہے تھے مگر کچھ بات بن نہیں رہی تھی۔ قریب تھا کہ انٹرویو اسی مباحثے کی نذر ہو جاتا کہ علی سردار جعفری کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ہم سے دو گھنٹے پہلی والی فلائٹ سے براستہ لندن' بمبئی سے یہاں پہنچے تھے اور آتے ہی سو گئے تھے۔ ان کے آنے پر ریکارڈنگ روک دی گئی اور تعارف وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی وجہ سے گفتگو کا رخ بدل گیا اور انٹرویور صاحب کا گناہ اور عذر گناہ آئی گئی بات ہو گئے۔

علی سردار جعفری سے یہ میری پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ ۱۹۷۷ء میں وہ اور جگن ناتھ آزاد اقبال کانگریس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ بہت سے ریٹائرڈ اور از کار رفتہ قسم کے ترقی پسندوں کے جلو میں وہ نئی نسل کے جوشیلے انقلابیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے انداز میں ایک مخصوص خاکسارانہ سی رعونت تھی اور وہ لوگوں سے ایسے مشینی انداز میں ہاتھ ملا رہے تھے کہ ان کا جملہ کہیں ٹوٹتا نہ تھا اور نہ ہی ان کی آنکھوں یا چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی پیدا ہوتی تھی۔ مجھے ان کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ چنانچہ میں دو منٹ کے بعد چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا تھا۔ ظاہر ہے انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا۔

پہلی ملاقات کی اس سرد مہری کی یاد شاید میرے لاشعور میں کہیں موجود تھی۔ چنانچہ میں نے ہاتھ ملاتے وقت کسی قسم کی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جعفری صاحب نے مخصوص انداز میں اپنے لمبے لمبے سفید بالوں میں ہاتھ پھیرا اور بڑی محبت سے مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ارے بھائی' آپ تو بہت نوجوان آدمی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا آپ کوئی مولانا وغیرہ قسم کے آدمی ہوں گے۔ اوپر سے آپ نے اپنے نام کے ساتھ بھی اسلام لگا رکھا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جعفری صاحب! میری عمر چالیس برس ہے' لیکن اگر اس کے باوجود میں آپ کو نوجوان نظر آ رہا ہوں تو اس کا کریڈٹ مجھ سے زیادہ آپ کے حسن نظر کو جاتا ہے۔''

''اور عمر کو بھی'' عالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ آپ کی پیدائش سے پہلے یہ دو کتابیں لکھنے کے علاوہ تین دفعہ جیل کاٹ چکے تھے۔''

معلوم ہوا کہ چند دن بعد جعفری صاحب کی بہترویں سالگرہ آ رہی ہے۔ جس کے سلسلے میں ان کے ساتھ ٹورنٹو میں ایک خصوصی شام کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

جعفری صاحب سے یہ ملاقات اس تعلق کا ایک خوبصورت آغاز تھی جو بعد کے پانچ ہفتوں میں مزید محکم' دیرپا اور حسین تر ہوتا چلا گیا اور جو اب ایک مستقل ادبی دوستی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ آدمی کی اصلیت کا پتا اس کے ساتھ جیل کاٹ کر یا

سفر کرنے سے ہی چل سکتا ہے۔علی سردار جعفری کا نام اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔گزشتہ چند برسوں سے وہ ہندوستان کی حکمران جماعت کے ساتھی سمجھے جاتے ہیں اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مرکزی تنظیم نے ان کی بنیادی رکنیت بھی ختم کر دی ہے مگر اب بھی ''روس نواز کمیونسٹ'' اور ''ترقی پسند'' کے لیبل ان کے نام کا حصہ سمجھے جاتے ہیں اور ترقی پسند ادب خصوصاً تنقید کے حوالے سے وہ اس وقت زندہ لوگوں میں سب سے زیادہ بزرگ اور سینئر ہیں۔

جعفری صاحب نے آتے ہی گفتگو کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور یوں ہمیں ان صاحب کے سوالات سے نجات مل گئی جو اوور سمارٹ بننے کے چکر میں نکو بن رہے تھے۔

جعفری صاحب کسی سنجیدہ ادبی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔تمام حاضرین بڑے ادب' احترام اور دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابلاغ کا پرندہ ان کے سروں سے اوپر سے گزرتا جا رہا ہے۔مجھے مولانا حالی کی ایک بڑی دلچسپ اور غیر معروف نظم یاد آئی جس میں انہوں نے ایک انگریز افسر کی تقریر کا نقشہ کھینچا ہے۔

اب بزم سفیران دول کے سخن آرا
ہر خرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے
اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

قصور نہ جعفری صاحب کا تھا اور نہ ان چاروں کا۔سارا فساد اس تہذیبی خلا کا تھا جسے زمانی اور مکانی فاصلوں نے دھند کی طرح چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔وطن سے دس سے بیس برس تک کی جدائی اور دس ہزار میل کی دوری میں رہنے والے یہ لوگ زیادہ تر یا تو سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے یا کاروبار کے سلسلے میں یہاں مقیم تھے۔ادب' ادیب اور شاعری ان کا مسئلہ نہیں تھے۔یہ چیزیں انفرادی سے زیادہ ان کی اجتماعی ذات کا تہذیبی استعارہ تھیں اور بس۔یہ لوگ یہاں شعر و ادب کے ماہر اور نقاد کے طور پر نہیں بلکہ صرف اپنی اور اپنے لفظوں کی زبان سننے کے لیے آئے تھے۔ڈالروں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر تھکے ہوئے ان مسافروں کو کسی ایسے درخت کی تلاش تھی جس کی چھاؤں میں ان کے دکھوں پر مرہم رکھ دے۔میں نے ان صاحب کی طرف دیکھا جنہوں نے انٹرویو کا آغاز کیا تھا۔وہ بیچارے شرمندہ سے ہو کر سر جھکائے بیٹھے تھے۔میں نے محسوس کیا کہ انہیں ان کی معصومانہ غلطی کی اتنی زیادہ سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ لوگ پہلی ملاقات میں مخاطب کو فوراً متاثر کرنے کے لیے ایسی باتیں کر جاتے ہیں

جن کے بارے میں انہیں خود بھی پتا نہیں ہوتا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب سے روایت ہے کہ ایک بار انہوں نے اپنے گاؤں کے کسی شخص کے بیٹے کی ملازمت کے سلسلے میں کہیں سفارش کی۔ لڑکے کو نوکری مل گئی۔ اس کے باپ نے قاسمی صاحب کو شکریے کا خط لکھا' اس کا پہلا جملہ کچھ یوں تھا۔

''آپ کی مہربانیوں اور ریشہ دوانیوں سے برخوردار چراغ علی کو نوکری مل گئی ہے۔''

اگلے دن امریکہ کی ریاست فلوریڈا کے شہر میامی میں مشاعرہ تھا۔ میامی سے اس وقت ہماری واقفیت اس کے ساحلوں تک تھی جن کا ذکر سن سن کر کان پک گئے تھے اور جس کے مختلف مناظر انگریزی فلموں میں دیکھ دیکھ کر کئی دوستوں نے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کر لی تھیں۔ میامی کے ساتھ میامی بیچ کا تصور کچھ ایسے ہی لازم و ملزوم تھا جیسے محمد طفیل کے نام کے ساتھ ''نقوش''

◆◆◆

میامی

روانگی صبح نو بجے تھی۔ اصولاً ہمیں آٹھ بجے ایئر پورٹ پر ہونا چاہیے تھا مگر ہمارے میزبان ہمیں آٹھ بجے مزید ناشتے کے لیے مجبور کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ اس وقت ٹریفک کم ہوتی ہے اور ہم زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں ہوائی اڈے کے اندر ہوں گے۔ یہ پندرہ منٹ پھیل کر تین گنا ہو گئے۔ پونے نو بجے ہم ایئر کینیڈا کے کاؤنٹر پر پہنچے جو اس وقت بھائیں بھائیں کر رہا تھا مگر ہماری توقع کے برخلاف کاؤنٹر والی اجنبی چہار شیزہ کے برف آلود چہرے پر ہمارے اس قدر دیر سے آنے کا کوئی تکدر دکھائی نہ دیا۔ (شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کا اوریجنل چہرہ ہی ماشاء اللہ خاصا مکدر تھا) اس نے بڑے مشینی انداز میں بورڈنگ کارڈ ہمارے حوالے کئے اور انگشت شہادت سے اشارہ کر کے بتایا کہ کسٹم کے لیے اس طرف جاؤ۔

چار مسافر‘ چھ بکسے اور چار ہینڈ بیگ۔ چودہ کے چودہ نگ کسٹم کے کاؤنٹر پر جس سراسیمگی اور حواس باختگی کے عالم میں پہنچے اس کا فطری ردعمل ہوا ہوا جو ہونا چاہیے تھا‘ یعنی کسٹم افسر نے پہلے تو مشکوک انداز میں ہم چاروں کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پھر ہمارے پاسپورٹوں کا یوں مطالعہ کرنے لگا جیسے کچھ دیر بعد اس کا اسی سے امتحان ہو۔ سب سے زیادہ حیرت اسے عالی اور جعفری صاحب کے دبیز پاسپورٹوں پر تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دو الگ الگ ملکوں کے باشندے‘ جو خود کو شاعر کہتے ہیں‘ ایک ساتھ کس طرح اور کس نیت سے سفر کر رہے ہیں۔

نو بجنے میں پانچ منٹ پر اس نے جان چھوڑی۔ ہم نے اپنے گیٹ نمبر کا اتا پتا معلوم کرنا چاہا۔ اس نے بڑی شستہ انگریزی میں بتایا کہ امیگریشن کی منزل سے گزر لو باقی راستہ وہ خود بتا دیں گے۔

’’امیگریشن؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔ ’’امیگریشن تو ہمارا امریکہ میں ہو گا۔‘‘

کسٹم والے نے بڑے پروفیسرانہ انداز میں بتایا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے انتہائی قریبی اور دوستانہ تعلقات کے پیش نظر امریکہ جانے والوں کی امیگریشن کی Formality یہیں پوری کر لی جاتی ہے۔ ہم اپنا سامان کسٹم والے کے دین ایمان پر چھوڑ کر امیگریشن والے کی طرف بھاگے۔ اس نے متعلقہ فارم اس طرح ہماری طرف بڑھائے جیسے زبان حال سے کہہ رہا ہو۔

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

دو منٹ سے بھی کم عرصے میں ہم نے فارم بھر لیے مگر اس سے قبل کہ انہیں امیگریشن والے کے حضور پیش کرتے اور جہاز کی طرف دوڑ کی لگاتے (کیونکہ میری گھڑی کے مطابق فلائٹ کے اور ہمارے درمیان ابھی ایک منٹ باقی تھا) ایک لمبے چوڑے گورے نے جو وردی میں ملبوس تھا اور جس کے ہاتھ میں واکی ٹاکی تھا' بڑی خوشدلی سے مسکراتے ہوئے' ہمیں اطلاع دی کہ ہمارا جہاز پرواز کر چکا ہے۔

اب کیا ہوگا۔ گزشتہ میزبان ہمیں چھوڑ کر اپنے اپنے کاموں کو سدھار چکے تھے۔ میامی ایئر پورٹ پر آئندہ میزبان ہمارے منتظر ہوں گے۔ وہاں ہماری بجائے جب صرف ہمارا سامان پہنچے گا تو ان پر کیا بیتے گی۔ اگر کوئی دوسری فلائیٹ نہ ملی تو ان بیچاروں کا مشاعرہ الٹ جائے گا۔ اس موقعے پر عالی جی کا طویل سفری تجربہ کام آیا۔ انہوں نے فوراً کمان سنبھالی اور ہمیں حکم دیا کہ ادھر آرام سے بیٹھ جاؤ اور سب سے پہلے یہ فرض کر لو کہ جو زیادہ سے زیادہ نقصان ہو سکتا تھا وہ ہو چکا ہے' اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ Total Loss میں سے ہم کیا کچھ اور کس طرح بچا سکتے ہیں۔

صلاح مشورے کے بعد ہم ایئر کینیڈا کے کاؤنٹر پر پہنچے اور اس برفانی تاثرات والی چہار دوشیزہ کو اپنی روداد غم اس کی انگریزی میں سنائی اور درخواست کی کہ وہ ہمیں آج شام سے پہلے کسی طرح میامی پہنچا دے۔ اس نے آدھی بات سن کر ہماری ٹکٹوں پر ایک جگہ انگلی رکھی اور بتایا کہ یہ ٹکٹ Non-transferable ہے اور اس ٹکٹ کے ساتھ ہم صرف ایئر کینیڈا پر ہی سفر کر سکتے ہیں اور ایئر کینیڈا کی اگلی فلائٹ پرسوں صبح ہے۔ عالی نے اسے پہلے مشاعرے اور پھر شاعر کی اہمیت سے آگاہ کیا مگر اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ عالی نے کہا۔ ''کوئی ایسا طریقہ بتاؤ جس سے ہم آج شام تک میامی پہنچ سکیں۔ اتنا بڑا شہر ہے' کوئی نہ کوئی فلائٹ تو وہاں جاتی ہوگی۔'' جس پر اس ٹارزن کی بیٹی نے بڑی بیزاری سے انٹر کام پر فرانسیسی میں کسی سے بات کی اور ہمیں مژدہ سنایا کہ اگر ہم تین سو ڈالر فی کس ادا کرنے پر تیار ہوں تو وہ ہمیں دو گھنٹے بعد کی ایک Connected فلائیٹ پر بھجوا سکتی ہے۔

تین سو ڈالر فی کس! ہم نے فوراً دوبئی جانے والے پینڈوؤں کی طرح ڈالروں کو روپوں سے ضرب دی اور اس کے بعد حاصل ضرب کے تحیر میں گم ہو گئے۔ پروین نے رائے دی کہ موجود صورت حال میں منتظمین مشاعرہ اپنی عزت اور فروخت شدہ ٹکٹوں کی رقم بچانے کے لیے اس نقصان کو پورا کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ عالی اور علی سردار جعفری نے اپنے نصف صدی کے مشاعراتی تجربوں کی روشنی میں اس امکان کو ''گماں کا ممکن'' قرار دیا مگر اس بات سے اتفاق کیا کہ اس چانس کو نہ لینے سے لینا بہتر ہوگا۔ اب ڈالر پول ہونے شروع ہوئے۔ قریب تھا کہ ہم بارہ سو ڈالر اس راہن بڈ کی خالہ کو دے کر نئی ٹکٹیں لے لیتے' عالی صاحب نے میرے کندھے پر

ہاتھ رکھا اور کہا۔"آؤ ذرا اس ایسٹرن والی سے مذاکرات کر کے دیکھیں۔"

اب پتا نہیں یہ خیال ان کے دماغ میں ائیر لائن کا بورڈ دیکھ کر آیا تھا یا اس کے کاؤنٹر پر کھڑی براڈ مسکراہٹ والی سانولی سلونی مگر خطرناک حد تک پر کشش لڑکی اس کا محرک بنی تھی۔ ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے جلدی سے فون اس طرح بند کیا جیسے ہمارے یہاں ریسپشنسٹ لڑکیاں افسر یا مالک کو دیکھ کر اپنی ذاتی کال ختم کرتی ہیں۔ اس نے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے اور آگے کی طرف جھک کر کچھ اس طرح سے "ہیلو" کہا کہ یکدم بجلی سی چمک گئی۔

Can I help You? .... اس نے دوبارہ فضا میں رس گھولا۔

عالی کی گرفت میرے کندھے پر سخت ہوگئی۔ اس کا قد جنوبی ایشیا کی عام لڑکیوں کی طرح زیادہ لمبا نہ تھا مگر یہ مشابہت یہیں تک محدود تھی کیونکہ اس کی باقی ڈرائنگ جین مینسفیلڈ کا ہو بہو چربہ تھی۔ میں نے اس کی گردن سے اوپر دیکھتے ہوئے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اور پوچھا کہ اس کی ائیر لائن اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کر سکتی ہے؟

عالی نے بڑے آکسفورڈین لہجے اور وکٹورین انداز میں جھکتے ہوئے کہا۔

As a matter of fact, we want to give you some business.

اس نے "بزنس" پر چونک کر عالی جی کی طرف دیکھا اور پھر ان کے ہاتھ سے ٹکٹیں لے کر کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے کیبن میں چلی گئی۔ اس کے مڑنے اور چلنے میں کچھ ایسی بات تھی کہ بے ساختہ چچا غالب کا شعر ذہن میں کوندسا گیا۔

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

میں نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا' جعفری صاحب غالباً پروین کو بتا رہے تھے کہ مختلف موقعوں پر پروازیں مس کرنے پر انہیں کس کس صورت سے گزرنا پڑا تھا کیونکہ اس کے چہرے کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد وہ نیک دل اور چالاک بدن حسینہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہماری ٹکٹیں لہراتی ہوئی کیبن سے باہر آئی اور ہمیں اطلاع دی کہ ایک فلائیٹ کا انتظام ہو گیا ہے مگر پہلے ہمیں اٹلانٹا جانا ہوگا' وہاں سے ہمیں ایک اور جہاز میامی لے جائے گا اور اس سارے عمل میں آٹھ گھنٹے لگیں گے جبکہ ہماری ڈائریکٹ فلائیٹ تین گھنٹے کی تھی۔

میں نے سوالیہ انداز میں عالی کی طرف دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔"کوئی بات نہیں عالی جی! انہی کے جہاز پر چلتے ہیں۔"

عالی نے بھی اسی طرح سرگوشی میں جواب دیا۔ ''یہ گراؤنڈ سٹاف ہے بھئی اس نے یہیں رہنا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر بھی عالی جی' آخر جمالیات بھی کوئی چیز ہے' یہ نہ سہی جہاز پر اس جیسی تو ہوں گی۔''

عالی نے ایک اتفاق کرنے والا ہنکارا بھرا اور مزید وکٹورین انداز میں زیادہ سے زیادہ جھکتے ہوئے اس سے پوچھا کہ ان ٹکٹوں کے عوض ہمیں کتنے ڈالر ادا کرنے ہوں گے؟

No Money ...... اس نے نسیم بہار کے سے لہجے میں کہا۔ ''ہم نے آپ کو انہی ٹکٹوں پر ایڈجسٹ کر دیا ہے۔ باقی رہا ائیر لائن کا معاملہ' وہ ہمارا دفتر خود طے کر لے گا۔''

چند لمحے تو ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا' کم وبیش یہی حالت پروین پروین اور جعفری صاحب کی ہوئی۔ ہم سب نے اس حسینہ کا باجماعت شکریہ ادا کیا اور اسے بتایا کہ ایسٹرن والوں کی یہ مشرق پروری ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس کے بعد ہم نے ایک غصہ بھری نظر ائیر کینیڈا والی کنگ سائز اگلو پر ڈالی اور مشرق کے روشن مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے ایسٹرن والوں کے لاؤنج میں داخل ہو گئے جہاں جہاز ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

عالی نے فوراً شبیر صدیقی کے دفتر فون کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور تاکید کہ میامی والوں سے فون پر رابطہ کر کے انہیں پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع دے دے۔ مجھے اور پروین کو اس معاملے کے یوں سلجھ جانے کی خوشی تو تھی مگر ہمیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ کوئی انتہائی غیر معمولی اور تقریباً ناممکن واقعہ ہوگا۔ یہ تو بعد میں عالی صاحب اور جعفری نے بتایا کہ اس نوع کے محدود اور پابند ٹکٹ پر کسی دوسری کمپنی کا ہمیں اپنے جہاز پر بٹھا لینا معجزے سے کم نہیں۔ عالی اس کا کریڈٹ یوں لے رہے تھے کہ انہوں نے ایسٹرن والی لڑکی کو جو بزنس دینے کا سبز باغ دکھایا تھا یہ ساری کرامت اس کی ہے جبکہ ہم اس کے محرکات تیسری دنیا کی باہمی محبت اور اشتراک وغیرہ کو بھی کچھ نمبر دینے کے حق میں تھے۔

''اٹلانٹا'' ائیر پورٹ کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ دنیا کے چند بڑے اور مصروف ترین ہوائی اڈوں میں سے ہے۔ عالی ائیر کینیڈا کی فلائٹ مس ہونے میں ''شایئہ خوبیِ تقدیر'' دیکھ رہے تھے کہ اسی بہانے ہمیں اٹلانٹا کا ہوائی اڈہ دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اٹلانٹا ائیر پورٹ واقعی بہت زبردست تھا لیکن اگر یہ ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی ہمیں اچھا لگتا کیونکہ پردیس میں مزید غریب الوطن ہونے سے کوئی بھی چیز بدتر نہیں ہو سکتی۔

اٹلانٹا ائیر پورٹ پر جہاز بدلنے کے دوران جب میں اور عالی باتھ روم کی تلاش میں Gentlemen کے نشان والا دروازہ

ڈھونڈتے ہوئے بھٹک رہے تھے تو عالی نے دو مزیدار باتیں کیں۔ ان میں سے ایک چونکہ قابل اشاعت نہیں ہے اس لیے دوسری سے پہلی کا قیاس کر لیجیے۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں امریکی فوجی انگلستان کے مختلف شہروں میں بھی دندناتے پھرتے تھے۔ ان کی کھلی ڈلی طبیعت' بد زبانی کی حد تک بے تکلف زبان اور انداز و اطوار انگلستان کی روایتی تہذیب کے پرستاروں کے لیے بہت تکلیف دہ تھی اور وہ اپنی بیزاری کا مختلف طریقوں سے اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک لائبریری کے پرسکون ماحول میں ایک امریکی فوجی بوٹوں کے ساتھ شور مچاتا ہوا داخل ہوا اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر لائبریرین لڑکی سے انتہائی بلند آواز میں بولا۔ ''ڈارلنگ' میں پیشاب کرنا چاہتا ہوں' باتھ روم کہاں ہے؟''

لڑکی نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا' پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سامنے والے دروازے سے دائیں ہاتھ مڑ جاؤ۔ کوریڈور کے آخر میں ایک دروازے پر تمہیں Gentlemen لکھا ہوا نظر آئے گا' تم اس کی پرواہ نہ کرنا' سیدھے اندر چلے جانا۔''

ادبی حلقوں میں گروپ بندی کوئی نئی چیز نہیں مگر ادب پسند حلقوں میں اس کا جو روپ اس سفر کے دوران دکھائی دیا وہ اپنی جگہ پر ایک انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ ادیبوں اور فنکاروں پر اپنے قبضے اور اختیار کا اظہار اکثر منتظمین تقاریب کرتے رہتے ہیں اور ایک حد تک ان کا یہ رویہ قابل فہم بھی ہے کہ جو لوگ اپنا وقت' محنت اور پیسہ خرچ کر کے کوئی تقریب منعقد کرتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا نام نمایاں ہو اور ان کی چودھراہٹ کو تسلیم کیا جائے۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ ہم لوگ کسی شہر میں مشاعرے وغیرہ پر گئے ہیں جہاں ہمارے کچھ ادیب' شاعر دوست مقیم ہیں' انہیں ہمارے آنے کی اطلاع بھی ہے اور ہماری بھی خواہش ہے کہ ان سے ضرور ملا جائے مگر سوئے اتفاق سے ان لوگوں کے منتظمین سے تعلقات کچھ ''خط کشیدہ'' ہیں چنانچہ آپ لاکھ کوشش کریں منتظمین ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ وہ آپ سے ملنے آ سکتے ہیں اور نہ ہی آپ ان تک پہنچ سکتے ہیں۔

اس تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ عالی نے ہمیں اٹلانٹا سے میامی تک کی پرواز کے دوران بتایا کہ انہیں میامی سے شوکت مرزا اور حامد صدیقی کے علیحدہ علیحدہ فون ملے ہیں۔ دونوں انہیں اپنے ہاں قیام کے لیے کہہ رہے ہیں مگر دونوں کا آپس میں کچھ کاروباری تنازعہ ہے جس کی وجہ سے شوکت مرزا کے اس ''مشاعرے'' میں حامد صدیقی شامل نہیں۔ عالی صاحب کا مسئلہ اس سارے جھگڑے میں وضع داری کا تھا کہ ان کے تعلقات دونوں پارٹیوں سے ہیں۔ گزشتہ بار وہ حامد صدیقی کے مہمان تھے اور اس نے ان کی بہت آؤ

بھگت کی تھی۔ اب اگر وہ شوکت مرزا کی طرف قیام کریں تو حامد صدیقی کو گلہ ہوگا اور گر حامد کی طرف ٹھہریں تو یہ اصولی اعتبار سے غلط بات ہے کیونکہ ہمارا اصل میزبان اس بار شوکت مرزا ہے۔

میں نے کہا۔" عالی صاحب! میزبانوں کے اس نوع کے مسائل تو چلتے ہی رہتے ہیں کچھ اپنے سامان کی بھی فکر کیجئے جو پتا نہیں اس وقت کہاں ہوگا اور یہ بھی سوچئے کہ اگر وہ نہ ملا تو ہم کیا کریں گے۔"

میری اس بات سے شوکت مرزا اور حامد صدیقی اپنے اختلافات سمیت پس پردہ چلے گئے اور ہر آدمی سفر میں گمشدہ سامان کے بارے میں اپنے تجربات سنانے لگا۔ انہی اندوہناک اور ہمت شکن واقعات کے دوران جہاز نے میامی ایئر پورٹ پر اپنے پہیئے لگائے۔ خودکار کاریڈور جہاز کے دروازے کے ساتھ بغل گیر ہوا اور ہم لوگ اپنے ٹورنٹو والے بھاری لباس اور کوٹوں کو سمیٹتے ہوئے باہر نکلے مگر ایئر پورٹ اور اس کے شیشوں سے باہر جتنے لوگوں پر نظر پڑی سب آدھی آستینوں اور کھلے گلوں والی قمیضیں پہنے پھر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ میامی شہر کم وبیش کراچی کے طول بلد عرض بلد وغیرہ وغیرہ پر واقع ہے اور یوں یہاں موسم بھی کراچی جیسا ہے۔ میں نے اپنے جغرافیہ اور معلومات عامہ کی کمی کو چھپاتے ہوئے بڑے سرسری انداز میں میامی کے موسم پر تبصرہ کیا اور ریاست فلوریڈا کے بارے میں بھی اس قسم کی گفتگو کی جیسی ہمارے وزیروں کی تقریریں ہوتی ہیں کہ سکاوٹ ریلی' تعلیم بالغاں' ثقافتی میلے اور امور خارجہ پر چند لفظوں کے الٹ پھیر کے بعد ایک ہی تقریر ٹھوک دیتے ہیں۔

شعر ہوتے ہیں میر کے' ناصر
لفظ کچھ دائیں بائیں کرتا ہے

ایئر پورٹ پر شوکت مرزا' ان کی بیگم نگار' فرحت ظفر' حامد صدیقی اور ان کی بیگم مینا استقبال کے لیے موجود تھے۔ معانقوں' مصافحوں اور آداب تسلیمات کے بعد گمشدہ سامان کی ڈھنڈیا پڑی۔ ایئر کینیڈا کافی فاصلے پر تھی۔ خاصا لمبا چکر کاٹ کر وہاں پہنچے۔ ایک بہت موٹی تازی خاتون جو اپنے وردی کے کوٹ سے چھلکی پڑ رہی تھی' ہمیں اپنے اسٹور ہاؤس میں لے گئی جہاں ہمارے سامان کے بکسے ایک قطار میں رکھے تھے۔ اتنی آسانی سے اس مسئلے کے حل ہو جانے نے کچھ اینٹی کلائمکس کی صورت پیدا کر دی تھی چنانچہ ہم نے میزبانوں سے ان کے شہر اور موسم کے بارے میں گفتگو شروع کر دی کہ ایسے موقعوں کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے۔

معلوم ہوا کہ کیوبا میامی سے صرف ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے اور سمندری ساحل کے حوالے سے دیکھا جائے تو میامی کے عین نیچے واقع ہے اسی لیے یہاں مشہور ہے کہ آدمی اگر میامی سے جمپ مارے تو سیدھا کیوبا میں جا گرتا ہے مگر امریکی لوگ یہ حرکت محض

اس لیے نہیں کرتے کہ فی الحال انہیں فیڈرل کا ستر و اور اس کے سوشلزم دونوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کیپ کینیڈی اور کینیڈی سپیس سنٹر وغیرہ بھی اسی کے نواح میں واقع ہیں۔ یوں دفاعی اعتبار سے میامی بڑا اہم شہر ہے۔

میں نے کہا۔ ''عالی جی وہ میامی بیچ وغیرہ کیا محض پروپیگنڈا تھا؟''

''وہ بھی ہے۔'' عالی کے بولنے سے پہلے فرحت ظفر نے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آج کل موسم مناسب نہیں پھر بھی آپ کو اس کا نمونہ کل دکھائیں گے۔''

راستے میں ہمیں پروگرام سے آگاہ کیا گیا۔ عالی کا خدشہ صحیح تھا کیونکہ سارا پروگرام شوکت مرزا اور اس کے گروپ کے گرد گھومتا تھا' حامد صدیقی محض عالی اور دیگر مہمانوں سے ذاتی تعلق کی بنا پر وہاں موجود تھا۔ رات کا کھانا فرحت ظفر کے گھر تھا اور اگرچہ رات تقریباً ہو چکی تھی مگر ہم سفر کی تھکن اور لباس کی تبدیلی کے پیش نظر پہلے ان جگہوں پر جانا چاہتے تھے جہاں ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ پروین اور عالی تو شوکت مرزا کے گھر قیام کریں گے جبکہ میرے اور جعفری صاحب کے لیے شوکت مرزا کے ایک پڑوسی ابراہیم الدین صاحب کے گھر بندوبست کیا گیا ہے جن کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔

ابراہیم الدین میامی کے ایک ہائی سکول میں مائیکرو بیالوجی پڑھاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں انہوں نے کالج اور یونیورسٹی میں بھی پڑھایا ہے مگر یہاں سکول میں پڑھانا اس سے زیادہ محنت اور وقت طلب ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ابراہیم صاحب بھی حیدر آبادیوں کی طرح ''ق'' کو ''خ'' بولتے ہیں۔ ایک بار جو انہوں نے قید با مشقت کو ''خید با مشخت'' کہا تو پتا نہیں کیوں مجھے آمنہ ابوالحسن یاد آ گئیں۔

دلی ایک تقریب میں ہمارے تعارف کے دوران وہ عطاء الحق قاسمی کو بار بار خاسمی صاحب کہہ کر بلاتی تھیں۔ عطاء نے یہ واقعہ بڑے دلچسپ انداز میں ایک کالم میں لکھ دیا۔ پچھلے برس جب وہ پھر دلی گیا تو آمنہ بہن نے بڑے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ نے کیا لکھ دیا خاسمی صاحب کہ میں آپ کو خاسمی صاحب کہہ کر بلاتی ہوں۔ میں نے تو آپ کو ہمیشہ خاسمی صاحب ہی کہا ہے۔''

فرحت ظفر کے ہاں کھانے پر پچیس تیس خواتین و حضرات جمع تھے اور لطف کی بات یہ ہے مردوں اور عورتوں کے نہ صرف بیٹھنے کا انتظام الگ الگ تھا بلکہ کھانے پر بھی مردوں کو پہلے دعوت دی گئی۔ بالکل اپنے لاہور کی شادیوں کا سا سماں تھا۔ کھانے میں اچھی نسل کے پاکستانی اچار' چٹنی اور رائتے روایتی دیسی لوازمات کے ساتھ افراط سے موجود تھے۔ ہم نے خاتون خانہ کو اتنے زیادہ تکلف اور تیاری پر داد دینا چاہی مگر انہوں نے بڑی سادگی اور سچائی سے بتا دیا کہ کسی فرد واحد کے لیے یہاں اتنے اور ایسے کھانے تیار کرنے

ممکن نہیں چنانچہ میز پر موجود بہت سی ڈشیں مہمان اپنے اپنے گھروں سے بنا کر لائے ہیں کہ یہی طریقہ رائج الوقت ہے۔

میامی کا مشاعرہ ہمارے اس مشاعراتی دورے کی پہلی باقاعدہ تقریب تھی۔ ہم چاروں کے علاوہ صرف تین شاعر اور تھے یعنی لوکل اور مہاجر ملا کر کل نفری سات تھی۔ سامعین سوا اور ڈیڑھ سو کے درمیان تھے۔ تین چار ویڈیو کیمرے ان پر مستزاد تھے۔ علی سردار جعفری کو میں نے پہلی بار سنا۔ ان کی نظمیں ترقی پسندی اور رومانویت کے بین بین چلتی تھیں۔ اکہتر برس کی عمر میں اتنی طویل نظمیں زبانی سنانا بڑے کمال کی بات تھی۔ میں ان کے حافظہ سے اتنا متاثر ہوا کہ میرا دھیان ان کی نظموں کی طرف سے ہٹ گیا' یہ اور بات ہے کہ آگے چل کر وہ نظمیں ہم تینوں کو بھی یاد ہوگئیں کیونکہ جعفری صاحب نے کم و بیش وہی نظمیں بعد کے ہر مشاعرے میں بھی سنائیں۔ غالباً ساتویں مشاعرے کے بعد پروین نے کسی موقعے پر کہا تھا۔

''ہمیں ایک مہینے میں جعفری صاحب کا کلام یاد ہو گیا ہے' ان کی تو نصف صدی انہی کو پڑھتے گزری ہے۔''

اس میں زیادہ قصور جعفری صاحب کا بھی نہیں کیونکہ شاعروں کے پاس مشاعروں میں پڑھنے والا کلام ہمیشہ محدود ہوتا ہے اور وہ مشاعروں میں ایک دوسرے سے بار بار کی سنی ہوئی چیزیں سن سن کر واقعی تھک جاتے ہیں۔ اس تھکن پر مجھے مشہور لوک فنکار عالم لوہار سے منسوب ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ مرحوم عالم لوہار کئی کئی گھنٹے مسلسل گایا کرتے تھے۔ بعض اوقات رات کو شروع ہوتے اور اگر مجمع گرمجوشی اور موسیقی پسند ہوتا تو صبح بھی ہو جاتی تھی۔ اچھی محفل دیکھ کر عالم صاحب کبھی کبھی فرضی فرمائشیں بھی پوری کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً کسی گیت سے پہلے یہ اعلان کرتے کہ چک فلاں' تحصیل فلاں' موضع فلاں کے زمیندار چوہدری فلاں فلاں صاحب کی فرمائش ہے کہ میں فلاں گیت سناؤں۔ اب کس کے پاس اتنا وقت اور موقع ہوتا تھا کہ وہ اس فرمائش کی تصدیق کرے' سو یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ ایک بار بات بڑھ گئی اور عالم صاحب نے محسوس کیا کہ ان کا طبلے والا تھک کر گرنے لگا ہے اور اشاروں اشاشاروں میں انہیں بس کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے اسے نفسیاتی داؤ مارا اور اعلان کیا کہ میں نے زندگی بھر بڑے بڑے جلسوں' میلوں اور درباروں میں گایا ہے اور بڑے بڑے چوہدریوں' جاگیرداروں اور راجوں مہاراجوں کی فرمائشیں پوری کی ہیں' مگر آج میں اپنے اس پرانے ساتھی طبلے والے استاد کی فرمائش پر فلاں گیت آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ اس پر اس طبلے والے نے طبلہ ایک طرف رکھا اور مائیکروفون پر جا کر روتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''لو بھئی میری ماں مرے اگر میں نے اس کو کوئی فرمائش کی ہو۔''

سو ہم سب نے وہاں ایک دوسرے کی فرمائشوں پر اپنا اپنا کلام بلاغت نظام سنایا اور صائب کے شعر پر سر دھنتے ہوئے رات دو

بجے اپنی قیام گاہوں پر واپس پہنچے۔ صبح اٹھے' معلوم ہوا بیگم ابراہیم الدین اپنی ملازمت پر جا چکی ہیں۔ ابراہیم صاحب نے ناشتہ تیار کیا۔ ان کا مکان بہت خوبصورت تھا۔ چار کنال کے رقبے پر چار بیڈ روم کا یہ سجا سجایا گھر انہوں نے قسطوں پر بیاسی ہزار ڈالر میں خریدا تھا جبکہ لاہور' کراچی اور اسلام آباد میں چار کنال زمین ہی بیس لاکھ سے کم میں نہیں ملتی۔ سامنے والے مکان میں فون کیا تو پتا چلا کہ عالی ہمارا انتظار کر رہے ہیں جب کہ پروین' شوکت کی بیوی کے ساتھ کہیں گئی ہیں۔ عالی صاحب پورے امریکہ میں Collect کالوں کے ذریعے اپنی آمد اور پروگرام کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ Collect کال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ دو ہزار ٹیلیفون کریں اور فی ٹیلیفون دو دو گھنٹے تک Long Distance کال ملائے رکھیں میزبان برا نہیں مانتا کیونکہ اس کا بل اس کے بجائے کال ریسیو کرنے والے کو پڑتا ہے۔ عالی نے بتایا کہ یہاں یہ بھی سہولت ہے کہ آپ کسی بھی نمبر سے کہیں بھی فون کریں مگر آپریٹر کو یہ بتا دیں کہ اس کا بل فلاں نمبر کے اکاؤنٹ میں ڈال دیا جائے تو اس کا فوراً انتظام ہو جاتا ہے۔ ٹیلیفون کے نظام کے بارے میں اور بہت سی باتوں کا بھی پتہ چلا مگر جب ہمارا ذہن وطن عزیز میں فون لگوانے' اسے ٹھیک اور چالو رکھوانے اور اس کے بل متعلقہ مسائل کی طرف گیا تو ہمیں آنکھوں دیکھی باتیں بھی جھوٹ محسوس ہونے لگیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ شکاگو سے عرفان اور افتخار نسیم ٹورنٹو فون کر کے میامی کا نمبر لیں' پھر میامی میں شوکت مرزا سے بات کر کے ابراہیم الدین کے نمبر پر مجھ سے بات کریں اور اس سارے عمل میں کل چار منٹ خرچ ہوں۔

شوکت مرزا کے گھر پہنچے تو نگار اور پروین واپس آ چکی تھیں۔ نگار کچن میں تھی اور اس کا لباس اس تبدیلی کی کہانی سنا رہا تھا جس سے گزرے بغیر مشرق کے آدمی کا مغرب کے معاشرے میں گزارا ممکن نہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ دو دن بعد پروین کے بیٹے مراد عرف گیتو کی پانچویں سالگرہ ہے اور وہ دونوں خواتین اس انتظام میں مصروف تھیں کہ کسی ایجنسی کے ذریعے اسے بیس نومبر کو اپنی سالگرہ کے دن مبارکباد کے پھول پہنچ جائیں۔ بیس نومبر احمد ندیم قاسمی کا بھی یوم پیدائش ہے۔ روحانی اور فکری باپ اور نسبی بیٹے کی سالگرہوں کا یہ اشتراک بہت دلچسپ اور غیر معمولی ہے۔ میں پروین سے اس کے بارے میں بات کر رہا تھا مگر وہ جیسے میری بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ ایک دم وہ اٹھی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے حیرت سے نگار کی طرف دیکھا' اس نے بتایا کہ صبح پروین نے فون پر گیتو سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ سکول جا چکا تھا۔ بس اس وقت سے وہ بات بے بات روئے جا رہی ہے۔

واقعی ماں کا روپ عورت کا بہترین روپ ہے۔

عالی صاحب کے ٹیلیفون کا سلسلہ اس قدر زور و شور سے جاری تھا کہ دخل در مواصلات کا لمحہ پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے نفسیاتی داؤ مارا اور پروین کی پریشانی کا حوالہ دے کر عالی صاحب سے اپیل کی کہ وہ چونکہ بڑے ہیں اس لیے پروین کو سمجھائیں اور اسے حوصلہ دیں۔ عالی نے میری ساری تقریر بڑے غور سے سنی اور دوبارہ فون کا نمبر گھماتے ہوئے بولے۔

''اسے رو لینے دو' جی کا غبار ہلکا ہو جائے گا اور باقیماندہ سفر کے لیے اس کی ٹریننگ بھی ہو جائے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''ارے بھئی' مطلب یہ کہ شروع شروع میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ آج رو لے گی تو باقی کے چار ہفتے بہتر طریقے سے گزر جائیں گے۔''

اس وقت عالی کی یہ بات اور انداز بے نیازی خاصے ظالمانہ محسوس ہوئے لیکن چند دن بعد جب خود مجھ پر ''گھر کی یاد'' کا حملہ ہوا تو پتا چلا کہ عالی کچھ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہے تھے۔

کچھ نگار کی مدد سے اور کچھ ذاتی کوششوں سے پروین کو اس کے گوشہ اشک ریزی سے نکالا۔ اس دوران میں پھول بھیجنے والی ایجنسی کا فون بھی آ گیا۔ اس نے امید ظاہر کی تھی کہ ۲۰ نومبر کو کسی وقت پھول گیتو کو مل جائیں گے۔ طے یہ پایا کہ شہر کا ایک چکر لگایا جائے' پکچر کارڈ خریدے جائیں اور چھوٹی موٹی شاپنگ کے بعد مشہور زمانہ میامی بیچ کا نظارہ کیا جائے۔ پروگرام کے اول حصے سے عالی صاحب اور دوسرے حصے سے پروین نے عدم شمولیت کا عذر پیش کیا۔ عالی اس دوران میں مزید ٹیلیفون کرنا چاہتے تھے جبکہ پروین میامی بیچ پر مجھے اور علی سردار جعفری صاحب کو فری ٹائم دینا چاہتی تھی تاکہ ہم اس کی موجودگی کے احساس سے آزاد ہو کر بیچ کی جملہ تفصیلات سے آگاہ ہو سکیں۔ اس کی یہ بات عقل کی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے دل کی بھی تھی لیکن اسے یکدم تسلیم کر لینے کا مطلب آئندہ کے لیے ایک مستقل جملے بازی کا محاذ کھلوانا تھا اس لیے میں نے فوراً پروین کی بات کاٹی۔

''ارے نہیں بھئی' ایسی کیا بات ہے! تم بھی چلو۔ ہمیں کون سا وہاں جا کر نہانا یا سن باتھ لینا ہے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایک چکر لگا لیں گے۔ کیوں جعفری صاحب؟''

جعفری صاحب نے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں پروین کا مشورہ صحیح ہے۔''

میامی کی سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا۔ فرحت ظفر نے بتایا کہ آج ہفتہ ہے اور چھٹی کی صبح کی وجہ سے ٹریفک کم ہے لیکن شام کے وقت حالات مختلف ہوں گے۔ ایک سٹور سے جعفری صاحب کے لیے نمکین بادام اور مونگ پھلی خریدی گئی جس کا استعمال تو شام کے

ساتھ متعلق تھا مگر ہم لوگوں نے ان پیکٹوں پر اتنے شب خون مارے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ان کی حالت مفتوحہ ممالک جیسی ہو گئی۔

راستے میں ایک جگہ شوکت نے گاڑی روک کر ایک عمارت دکھائی اور ہم سے ''کسوٹی کسوٹی'' کھیلنے لگا کہ بتایئے یہ کون سی عمارت ہے۔ اشارے یہ دیے کہ اس کا تعلق ایک ایسے کھیل سے ہے جسے وحشیانہ بھی کہا جاتا ہے' اس کے علاوہ اس کا تعلق ایک ایسے کھلاڑی سے ہے جو مسلمان ہونے کے باوجود عالمی شہرت کا حامل ہے اور یہ کہ اس عمارت کا تعلق اس کے شاندار کیریئر کی ابتدا کے ساتھ ہے۔

امریکہ کے حوالے سے مسلمان کھلاڑی اور وحشیانہ کھیل کی نشانیاں کافی تھیں۔ شوکت مرزا نے بتایا کہ محمد علی کلے نے ۱۹۶۴ء میں سونی لسٹن سے ہیوی ویٹ باکسنگ کا عالمی اعزاز جیتنے کے لیے اسی جمنیزیم میں تیاری کی تھی اور اسی مقابلے کے بعد اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تھا۔ میں نے سوچا' ایک طرف محمد علی ہے جو عظمت کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد اپنا رشتہ ایک ایسے گروہ کے ساتھ قائم کرتا ہے جو امریکی معاشرے میں سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور جس کی وجہ سے یہودی لابی جو امریکہ کی پس پردہ حکمران ہے' اس کی زندگی کو بے حد مشکل بنا سکتی ہے اور دوسری طرف ہم لوگ ہیں جنہوں نے اس مذہب کو ایک مسلمان معاشرے کی موجودگی میں مختلف مفادات کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور اس کی آڑ میں طرح طرح کے کاروبار چلا رہے ہیں۔ وہ پیغام جو پوری کائنات کے لیے باعث رحمت اور رہنمائی تھا اسے ہم نے دعاؤں اور خانقاہوں تک محدود کر کے اپاہج اور مفلوج بنا دیا ہے۔

یہ امت روایات میں کھو گئی
عجم کی خرافات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

حکیم الامت نے یہ بات آج سے پچاس برس پہلے کہی تھی' ہمارا کمال یہ ہے کہ ہم نے نصف صدی میں اس صورت حال کو اس طرح سنبھال کر چمکا کے رکھا ہے جیسے یہ کوئی انعامی شیلڈ ہو۔ ''اردو کی آخری کتاب'' میں ابن انشاء مرحوم نے جیومیٹری کی شکل ''دائرہ'' کی وضاحت کرتے ہوئے کیا نوکیلی بات کی ہے۔

''ایک دائرہ اسلام کا بھی ہوتا ہے پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا جاتا تھا آج کل خارج کرتے ہیں۔''

محمد علی کلے کے حوالے سے بات کا رخ باکسنگ سے اسلام اور دنیا میں مسلمانوں کی حالت اور کردار کی طرف پھر گیا۔ پتا نہیں

کہاں سے ایک بھولا بھٹکا واقعہ میرے دھیان کے افق پر ابھر آیا۔
لاہور کے انارکلی بازار میں میرے دوست محمود احمد قریشی المعروف چیئرمین اور اختر حسین عرف استاد کی گھڑیوں کی دکان Big Ben ہم سب دوستوں کا اڈہ ہے۔ دن میں ایک بار دوستوں کے گروپ میں سے ہر شخص وہاں کا چکر ضرور لگاتا ہے۔ ایک دن ساری پنڈال چوکڑی جمع تھی کہ دکان کے دروازے سے ایک شخص باقاعدہ ناچتا ہوا اندر آیا اور کچھ دیر بھنگڑا ڈالنے کے بعد گویا ہوا کہ کل تک اس کا نام جوزف مسیح تھا اور وہ لاء کالج میں جمعدار کا کام کرتا تھا مگر اس نے اسلام قبول کر کے اپنا نام محمد یوسف رکھ لیا ہے اور نوکری چھوڑ دی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہہ سکتے اس نے بڑے رقت آمیز انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔
''برادران اسلام! اب میں تم میں سے ایک ہوں' سو میری مدد تمہارا فرض ہے۔ میری مدد کرو۔ یہ دیکھو میرا قبول اسلام کا اعلان اخبار میں بھی چھپا ہے۔''
محمود قریشی نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ سے مصافحہ کیا اور کہا۔
''بہتر ہے بھائی کہ تم دوبارہ عیسائی ہو جاؤ کیونکہ کل تم کام کر کے حق حلال کی روزی کھا رہے تھے' ادھر مسلمان ہوئے ہو ادھر مانگنا شروع کر دیا ہے۔ مانگنے والے تو ہمارے پاس پہلے ہی بہت ہیں۔''
اس واقعے کو سن کر بالکل داستان والا منظر رونما ہوا یعنی پہلے تو سب لوگ ہنسے اور پھر ایک دم سوچ میں پڑ گئے۔ باقیوں کا تو مجھے علم نہیں البتہ میں آج بھی اس سوچ سے باہر نہیں آ سکا۔
اس کے بعد ایک تھیٹر ہال کے قریب سے گزرے۔ معلوم ہوا کہ کل سے یہاں انتھونی کوئین کا ڈراما شروع ہونے والا ہے۔ میری ذاتی رائے میں انتھونی کوئین اس وقت دنیا کا سب سے بڑا زندہ اداکار ہے۔ میں نے اس کی پاکستان میں ریلیز ہونے والی تقریباً ہر فلم دیکھی ہے بلکہ نہ ریلیز ہونے والی The Message اور Omer Mukhtar بھی وی سی آر کی مہربانی سے دیکھ لی ہیں۔ ہر فلم میں وہ اپنی اداکاری کا ایک ایسا نقش چھوڑ جاتا ہے کہ فلم بھول جاتی ہے مگر اس کا رول' جملے اور انداز یاد رہتے ہیں۔ خاص طور پر 25th Hour نامی فلم کے آخری سین میں اس کی وہ مسکراہٹ تو مجھے بھولتی ہی نہیں جب فوٹوگرافر ایک ایسے بچے کو اس کی گود میں دیتا ہے جو اس کا بیٹا کہلانے کے باوجود اس کا بیٹا نہیں ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے' Smile- اس ایک مسکراہٹ میں انسانیت کے کیسے کیسے المیوں کا کرب اس نے سمیٹا تھا۔
پردیس میں بھوک پیاس نہ بھی ہو تب بھی میزبان وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ کھانے پینے پر اصرار کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح

کی ایک صورت حال میں شوکت مرزا اور فرحت ظفر ہمیں Denney's نامی ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ معلوم ہوا کہ Soft Drinks بھی بار والے حصے میں ہی سرو کیے جاتے ہیں۔ بار کے نام پر پروین کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے کہا کہ یہاں بیٹھنے سے بہتر ہے کہ ہم کہیں کھڑے کھڑے کوک وغیرہ پی لیں مگر چونکہ جعفری صاحب کے کان بھی کھڑے ہو چکے تھے اس لیے انہوں نے اپنی بزرگی کا ویٹو استعمال کیا اور ہم سب کو لے کر سیدھے بار کے کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ ایک خوبصورت کاؤنٹر اور اس سے بھی زیادہ خوبصورت رنگا رنگ بوتلوں کے درمیان ایک سولہ سترہ برس کی لڑکی اکیلی ناچ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ناچنے کو تھرکنے میں تبدیل کیا اور سب کو مشترکہ آنکھ مار کر بولی۔ ''کیا پیو گے؟''

ظاہر ہے یہ ''کیا پیو گے؟'' اس نے انگریزی میں پوچھا تھا جسے میں بیان کی ہمواری پیش نظر اردو میں بیان کر رہا ہوں۔ اس وضاحت کا یوں خیال آیا کہ جب ہم کرکٹ کے کھلاڑی ہوا کرتے تھے تو ایک دفعہ ہمیں سابق ٹیسٹ کرکٹر نذر محمد (مدثر نذر کے والد) کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے اپنی ذاتی اور کھلاڑیانہ زندگی کے بہت سے واقعات سنائے مگر ایک واقعہ ایسا تھا کہ آج تک ان کی چھیڑ بنا ہوا ہے۔ کہنے لگے۔

۱۹۵۱ء میں پاکستان انگلش کے ساتھ ولایت کے دورے پر تھا۔ وہاں ایک میچ کا پروگرام تبدیل ہوگیا۔ گلوسٹر شائر کے بجائے ہم واروک شائر کے ساتھ میچ کھیل رہے تھے۔ میں نے کوئی سو ناٹ آوٹ کیا ہوا تھا۔ شہاب میرے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ٹی ٹائم پر ہم پویلین میں واپس آئے تو ٹام گریونی وہاں آیا ہوا تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ ہمارا میچ تبدیل ہوگیا ہے چنانچہ ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگا۔
''ہیلو نذر ہیلو شہاب! اوئے تسی کتھے؟''

یہ ''اوئے تسی کتھے؟'' اردو کا ''ارے تم کہاں؟'' ہوتا ہے۔ آج تک ہم لوگ نذر صاحب سے یہ پوچھا کرتے ہیں کہ گریونی نے ایسی اچھی پنجابی کہاں سے سیکھی تھی۔

خیر ہم نے اس رقاصہ دلنواز کو اپنا مسئلہ بتایا کہ ہمیں کوئی ایسی چیز دو جس میں الکوحل نہ ہو کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ اس پر اس نے تیزی سے چند مشروبات کے نام لیے اور اس دوران میں بیئر کا ایک مگ یہ کہہ کر نوش جان کیا کہ اس کی عقل داڑھ اگ رہی ہے اور چونکہ بیئر سے درد میں کمی واقع ہوتی ہے اس لیے وہ صبح سے ہر دس منٹ بعد بیئر کا ایک مگ پی رہی ہے۔

جعفری صاحب کی رگ شرارت پھڑکی۔ اپنے مصنوعی دانتوں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں کیونکہ میری بھی عقل داڑھ اگ رہی ہے۔''

فرحت اور شوکت کے مشورے سے میرے اور پروین کے لیے Pina Clauda نامی مشروب منتخب کیا گیا جو پائن ایپل اور کوکونٹ یعنی اناناس اور ناریل کا مرکب تھا۔ ہم سب ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے اور اس تتلی کی بچی کو دیکھنے لگے جس کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ مشروبات کی تیاری کے دوران وہ ہماری طرف دیکھ دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹیں درجنوں کے حساب سے نچھاور کر رہی تھی اور کم و بیش اسی حساب سے آنکھیں بھی مارتی جا رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے فرحت ظفر کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا سوال سمجھتے ہوئے وضاحت کی کہ حسینان فرنگ کے اس نوع کے اشاروں سے تازہ واردان بساط ہوائے میامی کو گمراہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تبسم اور یہ تکلم ان کی عادت بھی ہے اور ماحول کا تقاضا بھی۔ شوکت مرزا نے جیسے ڈھارس بندھانے کے لیے میرے ہاتھ پر تھپکی دی اور کہا۔

''اتنا مایوس ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہاں زیادہ لڑکیاں جتنی بے تکلف نظر آتی ہیں عام طور پر اس سے زیادہ ہوتی ہیں۔''

''پینا کلاڈا'' ہمارے سامنے رکھتے وقت اس کا شوق رقص کم نہیں ہوا تھا چنانچہ کچھ حصہ چھلک کر میرے ہاتھ پر گر گیا مگر اس سے پیشتر کہ میں کسی ردعمل کا اظہار کرتا اس نے پلک جھپکتے میں نیپکن سے میرا ہاتھ اور میز صاف کیے اور پھر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کچھ اس طرح سے معذرت کے کلمات کہے کہ اگر دیکھنے والوں کی آنکھوں کا خیال نہ ہوتا تو میں خود سارا مگ اٹھا کر اپنے اوپر انڈیل لیتا۔

پینا کلاڈا بہت خوش ذائقہ لیکن بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ آدھا مگ پینے کے بعد ہماری رفتار سست پڑ گئی۔ اسی اثناء میں پروین میز سے مینو کارڈ اٹھا کر پڑھنے لگی۔ یک دم اس نے چیخ سی ماری' میرے ہاتھ سے مگ چھین کر اس نے ایک طرف رکھا اور کارڈ میری طرف بڑھا کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔ ''یہ ذرا دیکھئے' امجد بھائی! یہ کیا لکھا ہے؟''

میں نے مینو کارڈ پر لکھے ہوئے بے شمار اجنبی لفظوں پر نظر دوڑائی۔ پروین نے ایک سطر پر انگلی رکھی' لکھا تھا۔

Pina Clauda, with Rum

رم کے ذکر پر جعفری صاحب چونکے اور مسکرا کر کہنے لگے۔ ''گھبراؤ نہیں' رم میں نشہ زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ تو بیئر کی طرح ہوتی ہے' بہت کم الکوحل ہوتی ہے اس میں۔''

بے خیالی میں شراب پی جانے کے تصور نے پروین کو اس قدر حیران اور سراسیمہ کر دیا تھا کہ جعفری صاحب کے لہجے کی شرارت اور میزبانوں کی پرلطف مسکراہٹوں کو بھی نوٹ نہ کر سکی۔ میں نے اس کی پریشانی کو مزید ہوا دینے کے لیے کہا۔ ''تم نے علامہ

صاحب کا Rum والا شعر نہیں سنا؟ انہوں نے تو اسے فلسفے کا حصہ بنا دیا تھا۔"

"کون سا؟" پروین نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے بھئی وہی........ "بانگ درا" میں جو ہے۔"

زندگی انسان کی دم کے سوا کچھ بھی نہیں

دم ہوا کی موج ہے رم کے سوا کچھ بھی نہیں

"رم" کے اس محل استعمال پر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ کاؤنٹر کے پیچھے تھرکنے والی صاحبہ عقل داڑھ نے خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا قہقہہ بھی اس میں شامل کر دیا۔ پروین مزید پریشان ہو کر بولی۔

"آپ ہنسے جا رہے ہیں اور میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ آپ کو اندازہ بھی ہے یہ کتنی غلط بات ہو گئی ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ اور افسوس تو مجھے امجد بھائی آپ پر ہے۔ آپ کو پتا تھا کہ اس میں رم ملی ہوئی ہے اس کے باوجود آپ نے.......؟"

پروین کی آواز کی پریشانی اور غصہ اب گلوگیرگی میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ ہمارے میزبانوں نے اس سلسلے میں پہلے احتیاطی تدبیر کر لی تھی اور یہ مشروب جو ہم نے پیا ہے کہ اس میں رم کی بجائے ملک شیک ڈلوایا گیا تھا۔ اب اگر یہاں کے دودھ میں بھی نشہ ہو تو اس کی ضمانت میں نہیں دے سکتا۔ فرحت ظفر اور شوکت مرزا نے میری بات کی پرزور تائید کی۔ پروین نے ہماری وضاحت بظاہر تسلیم کر لی' اس کے چہرے کی کشیدگی بھی ختم ہو گئی مگر اس کے باوجود اس نے اپنے مگ کو دوبارہ ہاتھ نہیں لگایا' جو اب بھی نصف کے قریب بھرا ہوا تھا۔

جعفری صاحب نے اس بار کا موازنہ روس اور مشرقی یورپ کے کچھ ممالک کے شراب خانوں سے کیا تھا اور کچھ ایسی شرابوں کے نام لیے جس کا ذکر ہم نے کتابوں میں بھی نہیں پڑھا تھا۔ وہ کھانے کے ساتھ پی جانے والی ایک روسی شراب "کونیک" کے خاص طور پر دلدادہ تھے کہ روس کی سردی کا اس سے بہتر توڑ ان کے نزدیک اور کوئی نہ تھا۔ ان کی باتوں میں "ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال" جیسی کیفیت تھی چنانچہ بل ادا کرنے کے بعد ہم سب تقریباً لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے۔ میرے لڑکھڑانے کی وجہ سے وہ بھاری بوٹ بھی تھے جو میں نے عالی صاحب کے لیکچروں سے متاثر ہو کر خریدے تھے اور جنھیں پہن کر میامی کی گرمی میں میں خود کو خاصا احمق محسوس کر رہا تھا۔ ہوا یوں کہ اٹھتے وقت میرا بوٹ میز کے پائے سے ٹکرا گیا۔ میں نے سنبھلنے کے لیے جعفری صاحب کا سہارا لینا چاہا مگر وہ پہلے سے کسی سہارے کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ ہم دونوں گرتے گرتے بچے۔ ہماری اس افتادگی کا اثر باقی لوگوں پر بھی پڑا

مگر خیریت ہوئی کہ میز پر پڑے ہوئے شیشے کے برتن زمین پر نہیں گرے۔ ہم سب تو سنبھل کر دروازے کی طرف چل پڑے مگر پروین اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔

ہم نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے شمار شبہات کی پر چھائیاں سی تیر رہی تھیں۔ بڑے جاسوسانہ انداز میں مجھے غور سے دیکھ کر بولی۔ ''سچ بتایئے اس پینا کلاڈا میں رم تھی یا نہیں؟''

''ارے بابا' تمھیں بتایا تو ہے کہ فرحت ظفر نے اس میں رم کی جگہ ملک شیک ڈلوایا تھا۔''

''تو پھر....... ''اس نے شرلاک ہومز کی طرح سوال کیا۔ ''یہ آپ کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ کیسی ہے؟''

''ارے بھئی وہ تو میرا پاؤں....... اچھا تم ایسا کرو کہ اس ٹارزن کی بچی سے خود پوچھ لو۔''

اس اثناء میں وہ ٹارزن کی بچی قلانچیں بھرتی ہوئی خود ہی ہمارے قریب آ چکی تھی۔ میں نے کہا۔ ''مہربانی کر کے اس خاتون کو یہ بتا دو کہ تم نے پینا کلاڈا میں رم کی جگہ دودھ ملایا تھا۔''

''آپ نہیں بولیں' مجھے پوچھنے دیں۔''

اب مجھے اندازہ ہوا کہ اندر سے وہ ہماری رم نوشی کے بارے میں ابھی تک کس قدر ڈانواں ڈول اور متذبذب تھی۔ خدا خدا کر کے اسے یقین ہوا کہ وہ نادانستگی میں بھی شراب نوشی کی مرتکب نہیں ہوئی لیکن اس ذہنی کشاکش نے غالباً اسے بہت تھکا دیا تھا کیونکہ اصرار کر کے شوکت مرزا کے گھر اتر گئی اور ہمیں میامی بیچ کی خوشگوار سیر کی دعا دے کر رخصت کر دیا۔

مجھے اپنے لیے ایک شولڈر بیگ خریدنا تھا۔ چنانچہ فرحت ظفر ہمیں اپنے ایک واقف کار سندھی ہندوستانی ہنس کے بہت بڑے سٹور پر لے گئے جہاں جیبی بٹوے سے لے کر سالم بندے اغوا کرنے والے سائز تک کے چمڑے اور ریکسین کے ان گنت بیگ' اٹیچی کیس اور بکسے موجود تھے۔

ہنس بڑے دکاندارانہ تپاک سے ملا اور جب اسے یہ بتایا گیا کہ ہم پاکستان اور بھارت کے مشہور کوی ہیں تو اس کی تواضع میں مزید شدت آ گئی۔ اس کے اہل کاروں نے میرے سامنے بیگوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ میں نے انکھیوں سے اور بہانے بہانے سے قیمتیں پڑھنے کی کوشش کی۔ سب کے سب چالیس سے لے کر ستر ڈالر کی رینج میں تھے۔ میں نے فوراً ڈالروں کو روپوں سے ضرب دی' حاصل ضرب خاصی کاری ضربیں تھیں کیونکہ لاہور میں انارکلی بازار سے جو بیگ چالیس پچاس روپے میں با آسانی مل جاتا ہے اس کی قیمت وہاں چھ سو روپے سے کم نہ تھی۔ کوالٹی بھی کوئی ایسی مرعوب کن نہ تھی۔ اب آدمی خود کس کس کو بتائے کہ یہ امریکہ کا 'امریکہ

سے خریدا ہوا مال ہے۔

فرحت ظفر اس دوران میں ہنس کو یقین دلا چکے تھے کہ اس کی دکان میں آج بہت تاریخی قسم کی شخصیات نے قدم رنجہ فرمایا ہے' چنانچہ ایک طرف تو جی یہ چاہتا تھا کہ قیمتوں کی زیادتی کا اعلان کر کے اجازت لے لیں مگر دوسری طرف یہ بھی خیال تھا کہ دکاندار کیا سوچے گا' اتنی بڑی شخصیات چالیس پچاس ڈالر کا سن کر پریشان ہوگئی ہیں؟ مجبوراً میں نے سیاستدانوں کے سے انداز میں ایک گول مول بیان داغا۔

''چمڑا غالباً بہت مہنگا ہے' اصل میں مجھے تو کوئی ایسا بیگ چاہیے تھا جو میں سفر میں استعمال کرتا اور پھر چاہے یہیں چھوڑ جاتا۔ میرا مطلب تھا کوئی عام سا بیگ.......''

''اچھا اچھا'' ہنس نے گجراتی سندھیوں کے مخصوص انداز میں کہا۔ ''اس طرح کا بھی ایک پیس ہے میرے پاس۔'' اس نے اپنے اہل کار کو گجراتی میں اپنے مجوزہ بیگ کی کچھ نشانیاں بتائیں جن کے جواب میں وہ پیراشوٹ کا ایک نہایت معمولی سا بیگ اٹھا لایا۔ ہنس نے بتایا کہ یہ اس کے سٹور کا سب سے سستا مگر انتہائی مضبوط بیگ ہے اور ان تمام شرائط پر پورا اترتا ہے جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا تھا۔

سو میں نے بیس ڈالر میں وہ بیگ شرمو شرمی خرید لیا جس کے شاید اپنے ملک میں اس سے دس گنا کم پیسے بھی ادا نہ کرنے پڑتے۔ اس کے علاوہ ہنس کی اس خصوصی توجہ پر شکریہ جدا ادا کرنا پڑا۔ پتا نہیں کیوں اس سودے سے میرا دھیان غریب اور امیر ملکوں میں ہونے والے تجارتی اور امدادی معاہدوں کی طرف چلا گیا۔ وہاں بھی تو ہم ایک کی چیز دس میں خریدتے ہیں اور ممنون احسان اس پر مستزاد ہوتے ہیں۔

میامی بیچ کے بارے میں یا تو ہمیں گمراہ کیا گیا تھا یا ہماری wishful thinking ضرورت سے بہت زیادہ تھی۔ معلوم ہوا کہ ہم اس سیزن سے تقریباً دو مہینے پہلے آگئے ہیں جب اس علاقے میں ہر لباس پر ننگے وجود کو ترجیح دی جاتی ہے۔

میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

بیچ کے ساتھ ساتھ سڑک کے بائیں طرف قطار اندر قطار بہت سے ہوٹل تھے مگر سب کے برآمدوں اور بالکونیوں میں ریٹائرڈ خواتین وحضرات ہمیں ان نظروں سے دیکھ رہے تھے جن سے ہم خود اس بیچ کا نظارہ کرنے آئے تھے۔ بڑھاپا ویسے تو اپنی جگہ پر ایک لعنت ہے مگر امریکی معاشرے میں یہ بہت ہی زیادہ لعنتی ہوجاتا ہے۔ شور شرابے' ہما ہمی اور جوان خون کے رگ وپے میں

دھومیں مچانے والے اس معاشرہ میں عمر رسیدہ لوگوں کے لیے صرف تنہائی باقی بچتی ہے۔تیس پینتیس سال کی درمیانہ اور نچلے درجے کی ملازمتیں کرنے اور ایک ایک کر کے ڈالر جوڑنے کے بعد یہ بیبیاں اور بابے جب دنیا کو دیکھنے کے لیے نکلتے ہیں تو خود تماشا بن جاتے ہیں۔بڈھی میمیں رنگ برنگے کپڑے پہنے' سرخی پاؤڈر لگائے' فیشنی عینکوں کے ساتھ سڑکوں پر نکلتی ہیں تو سوائے بیگ چھیننے والے لفنگے لڑکوں کے کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔بال بچے اور خاندان' برادری اور کنبہ داری' ساس اور دادی نانی کے رشتے کرسمس کارڈوں تک محدود رہ جاتے ہیں اور یہ لوگ بے شمار باتوں کو دلوں میں لیے شہر شہر اور ملک ملک پھرتے ہیں کہ کوئی سننے والا ملے لیکن گھنٹوں ہوٹلوں اور ہوسٹلوں کی بے مہر لابیوں' بالکونیوں اور لانوں میں آرام کرسیوں پر لیٹے لیٹے ان کے جسموں کا رعشہ بڑھتا رہتا ہے اور کوئی سننے والا کان نصیب نہیں ہوتا۔رستے میں یا سستے کرائے والی ٹورسٹ بسوں میں ایک دوسرے کو ہیلو ہیلو کرنے اور یہ یقین دلانے کے علاوہ کہ ''تم ابھی اپنی عمر سے بہت کم دکھائی دیتے ہو۔'' یہ آپس میں بھی گفتگو نہیں کر پاتے۔اور گفتگو کریں بھی تو کیا؟ کسی کہانی میں کوئی تنوع تو ہو۔''

امریکہ میں لوگ پیٹ کی بھوک سے نہیں مرتے لیکن انسانی جذبوں کا وہاں شدید قحط ہے اور اس قحط کے اصل شکار اور ہدف وہاں کے بوڑھے لوگوں ہیں۔مسائل پیدا کرنے والے اس عظیم صنعتی پلانٹ میں' جس کا نام امریکی معاشرہ ہے' یہ لوگ وہ جلا ہوا ایندھن ہیں جسے اس معاشرے نے ان کی اپنی ذات کی تنہائیوں کے ڈسپوزل بیگز میں بند کر کے دروازے پر رکھ دیا ہے' اس وقت تک کے لیے جب موت کی گاڑی کارپوریشن کے ٹرک کی طرح انہیں اپنی آغوش میں بھر کر نہ لے جائے۔

امریکی معاشرے کے اس افادہ پرستانہ (Utility Oriented) نظام کا یہ پہلو ایسا ہے کہ اس کی بے مثال مادی ترقی کے باوجود ایک بہت بڑے تہذیبی خلا کی نشاندہی کر رہا ہے۔ہمارے جیسے پسماندہ اور کم ترقی یافتہ ملکوں کے سماجی ڈھانچوں میں بھی مختلف النوع تہذیبی بحران موجود ہیں مگر شاید اپنے اجتماعی زوال کی وجہ سے وہ اتنے نمایاں نہیں ہوتے۔پتا نہیں وہ نظام کب اور کہاں سے جنم لے گا جو خدائی کے بجائے خلق خدا کا پرچم بردار ہوگا۔میں نے میامی کے ساحل کی رونق اور اس کی سیر کے لیے آئے ہوئے ان ریٹائرڈ بوڑھوں اور بوڑھیوں کی تنہائی پر اپنے ساتھیوں سے تبادلہ خیال کرنے کی کوشش کی مگر شاید میری اس فضول قسم کی جذباتیت سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے سوچا۔

ٹھیک ہی تو ہے۔اس طرح کے وقتی جذباتی ابال چند لمحوں کے مہمان ہوتے ہیں۔پانی کے بلبلوں کی طرح یہ بے نام اور بے شکل

خیالات نہ اب سے تھوڑی دیر پہلے میرے ذہن میں تھے اور نہ شاید کچھ دیر بعد ہوں گے۔ اگر دنیا کے مقدر نے کبھی تبدیل ہونا ہے تو اس کے لیے ان لمحاتی جذباتی کیفیتوں کی نہیں بلکہ ایک نئے زندہ انسان پرست معاشرتی نظام کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا نظام جو تمام دنیا کے ہر رنگ و نسل اور عمر کے انسانوں کو اپنے اندر سمیٹنے اور انہیں زندہ رکھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

موٹر سے اترتے وقت شوکت مرزا نے لکڑی کی وہ ٹرے مجھے دی جس کے وسط میں ریاست فلوریڈا کا نقشہ بنا ہوا تھا اور جو اس تاجر ہنس نے مجھے تحفتاً پیش کی تھی۔ میں نے بے خیالی سے اسے الٹا کر دیکھا تو اس کے پیچھے Made in Taiwan کی مہر لگی ہوئی تھی۔

یہ کمال بھی امریکی معاشرے کے صنعتی نظام کا ہے کہ اپنی تہذیبی تحفے بھی وہ ان علاقوں میں بناتے ہیں جہاں لیبر اور پروڈکشن کاسٹ سستی پڑتی ہے۔

شوکت مرزا کے ڈائننگ ٹیبل پر عالی جی ابھی تک ٹیلیفون سے دست و گریبان ہو رہے تھے۔ اب یہ محض اتفاق تھا یا واقعی وہ گزشتہ چھ گھنٹوں سے ٹیلیفون کیے جا رہے تھے' یہ ایک سربستہ راز ہے۔

میامی کے قیام کا ذکر اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک اس میں ''ش'' صاحب کا ذکر خیر نہ کیا جائے۔ ''ش'' صاحب گزشتہ کئی برسوں سے امریکہ میں مقیم تھے۔ درجنوں تعلیمی کورس شروع کر کے ادھورے چھوڑ چکے تھے۔ مہمان نوازی اور تپاک میں ضرورت سے بہت زیادہ گرمجوش تھے۔ ایک بار ہمارے رہبر بنے تو منزل مقصود سے بیس میل دور خود بھی گھومتے رہے اور پیچھے آنے والی کاروں کو بھی گمراہ کرتے رہے۔ جب تقریباً ایک گھنٹے کی خواری کے بعد پیچھے چلنے والی ایک کار نے صحیح راستے کی نشاندہی کی تو اس کے ڈرائیور پر آئندہ کئی گھنٹے تک ناراض ہوتے رہے کہ اس نے معزز مہمانوں کا اتنا قیمتی وقت کیوں خراب کیا اور پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ہم غلط راستے پر جا رہے ہیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ معزز مہمانوں کے لیے جمع کا صیغہ انہوں نے محض از راہ تکلف اور احتیاطاً استعمال کیا تھا۔ اصل میں ان کا مقصد پروین شاکر کی مہمانداری تھا۔ یہاں مجھے پروین کی ذہانت اور نظر شناسی کی بھی داد دینی پڑے گی کہ اس نے ''ش'' صاحب کو دیکھنے کے چند منٹ بعد ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہ آدمی اپنے آپ کو بہت بڑا فلرٹ سمجھتا ہے اور عنقریب اس کا عملی مظاہرہ کرنے والا ہے۔

پروین نے اس کو مسلسل عدم توجہ کی بے حد ماردی مگر وہ بھی کسی اسپیشل ہڈی کا بنا ہوا تھا کیونکہ میامی کے قیام کے دو دنوں میں وہ سائے کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ رہا۔ آخر میں تو ہم سب با جماعت اس کو ہوٹ کرنے لگ گئے تھے مگر اس کے باوجود اس شیر کے بچے

نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی اداؤں کے تیر مسلسل پھینکتا رہا۔ اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی آواز تھی۔ تیز کرخت اور مکینکل قسم کی آواز جس کے بارے میں واشنگٹن کے لیے روانگی کے وقت عالی نے ایک یادگار جملہ کہا۔ رخصتی معانقہ کرتے ہوئے بولے۔

''آپ کی آواز کمال کی ہے ''ش'' صاحب' جب آپ بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ٹائپ کر رہے ہیں۔''

◆◆◆

واشنگٹن

ہماری فلائٹ براستہ نیویارک تھی مگر نیویارک سے ہمارا تعلق صرف ''لگارڈیا'' ائیرپورٹ پر جہاز بدلنے تک تھا سو ہوائی جہاز کی کھڑکی سے جتنا نیویارک نظر آسکا دیکھ لیا۔ باقی کے بارے میں اسی انداز میں انشاءاللہ کہا جس کا مظاہرہ ایک عرب شیخ نے کیا تھا۔ تفصیل پھر کبھی سہی۔ واشنگٹن کا ہوائی اڈہ توقع کے برخلاف کچھ ''اینویں'' سا نکلا۔ سامان بھی اتنی دیر سے آیا کہ اپنے کراچی کی یاد تازہ ہوگئی۔ نیشنل بنک کے یوسف چوہان اور علی گڑھ اولڈ بوائز کے نمائندے طفیل صاحب ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ یوسف صاحب اپنی ذاتی حیثیت میں عالی صاحب کے لیے آئے تھے یعنی اگر وہ نہ آتے تو ہمارا سارا سامان اور چار عدد مسافر ایک ہی موٹر میں سفر کرتے جبکہ حالت یہ تھی کہ اس سارے پھیلاؤ کے سمیٹنے میں دو موٹریں بھی کم پڑتی تھیں۔ یہ میزبانوں کی کم سلیقگی کا پہلا مظاہرہ تھا۔

یوسف چوہان اور طفیل صاحب میں بحث جاری تھی کہ مشاعرے سے پہلے کہ تین گھنٹوں کا مصرف کیا ہونا چاہیے۔ طفیل صاحب بضد تھے کہ منتظمین کی طرف سے انہیں یہ ڈیوٹی دی گئی ہے کہ وہ ہم سب کو لے کر سلمان کاظمی صاحب کے گھر پہنچیں جہاں چائے کا انتظام کیا گیا ہے اور وہاں سے ہمیں مشاعرہ گاہ میں لے جایا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ سلمان کاظمی صاحب کا گھر ائیرپورٹ سے چالیس میل شمال کی طرف ہے اور مشاعرہ گاہ وہاں سے چالیس میل جنوب کی جانب واقع ہے یعنی ہمیں آئندہ تین گھنٹوں میں ایک سو بیس کا مزید سفر بھی کرنا ہوگا۔ یوسف چوہان نے ہماری تھکن اور اس پروگرام کی غیر معقولیت کے بہت واسطے دیے مگر طفیل صاحب چونکہ علی گڑھ کے اولڈ بوائز تھے اس لیے آخری فتح انہی کی ہوئی۔

راستہ بہت خوبصورت تھا مگر سفر کی تھکن، رات کا متوقع جگراتا اور میزبانوں کی ہٹ دھرمی اور بدانتظامی کا تخلیق کردہ یہ سو سوا سو میل کا بے معنی چکر آپس میں کچھ ایسے گھل مل گئے کہ بقول غالب ''سایۂ گل افعی نظر آتا ہے مجھے''

مغربی شہروں کے Down towns اور مضافات میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا۔ جس طرف بھی جائیں ایک جیسے گھر اور ایک ہی آبادیاں ہیں۔ سلیمان کاظمی کا گھر کولمبیا میں تھا اور مشاعرہ ورجینیا میں۔ ان دونوں کے درمیان یا ان سے سوا Annan Dale، بالٹی موز میرین لینڈ اور Falls Church کے علاقے تھے اور وہیں کہیں واشنگٹن ڈی سی بھی تھا جو ہماری منزل مقصود

تھی۔ اسی طرح منازل مقصود پر شفیق الرحمٰن کا ایک جملہ وہاں بار بار یاد آیا کہ حاتم دونوں کی مسافت دو گھنٹوں میں طے کرتا ہوا بالآخر اپنی منزل مقصود پر پہنچا اور اس بات کا پتا اسے یوں چلا کہ شہر پناہ کے باہر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ ''مقصود منزل''

سلمان کاظمی کے گھر پر چائے کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ بھی موجود تھے۔ شماریات کے ماہر ہندوستانی مسلمان' معقول کھاتے پیتے اور معقول سے زیادہ اونچے لمبے' خوش رو اور خوش لباس آدمی تھے۔ کسی حادثے کی وجہ سے ایک ٹانگ پر چوٹ کھائے بلکہ لگائے ہوئے تھے۔ اس قدر نستعلیق تھے کہ بہت دیر تک میں ان کی اس چوٹ کو ان تکلفات کا حصہ سمجھتا رہا جن کا وہ بطور میزبان مظاہرہ کر رہے تھے۔ گفتگو بہت دھیمے لہجے میں اور خاصے طویل وقفوں کے ساتھ کرتے تھے۔

عالی اور جعفری صاحب اپنی عمر سنیارٹی اور تھکن کی آڑ لے کر بالائی منزل کے کمروں میں لیٹ چکے تھے۔ چند لمحوں بعد پروین بھی گھر کی خواتین سے کچھ سازش کرنے کے بعد غائب ہوگئی اور یوں مجھ اکیلے کو نہ صرف تمام میزبانوں سے گفتگو کرنا پڑی بلکہ پورے گروپ کی طرف سے خیر سگالی کے طور پر اس قدر مسکرانا بھی پڑا کہ جبڑے دکھنے لگے۔

معلوم ہوا کہ آج کی تقریب Two in one ہے' یعنی مشاعرے سے پہلے سرسید اور علی گڑھ تحریک کے حوالے سے ایک اور نشست ہوگی جس میں علی سردار جعفری بھی تقریر کریں گے۔ جب ہم لوگ ہال میں داخل ہوئے تو وہ کھچا کھچ سے کچھ ہی کم بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف شیروانیوں کی بہار تھی اور اسٹیج سے محاورے اس بے تکلفی کے ساتھ پھینکے جا رہے تھے کہ دیار فرنگ کا یہ گوشہ اچھا خاصا لکھنو سنائی دے رہا تھا۔ کوئی چھ سو سیٹوں کا انتہائی معقول ہال تھا۔ کرسیاں' پردے' سامان آرائش' ساؤنڈ' لائٹس۔ غرض کہ ہر چیز انتہائی اعلیٰ معیار کی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ وہاں کے ایک عام سے سکول کا آڈیٹوریم ہے (اللہ اللہ) منتظمین نے یہ تو بتایا کہ جلدی کی وجہ سے کوئی بہتر آڈیٹوریم نہیں مل سکا' البتہ یہ پتا نہ چل سکا کہ جلدی کس بات کی تھی؟

جعفری صاحب نے سرسید کے حوالے سے ایک طویل لیکن بڑی موثر تقریر کی۔ اگر اس کے بعد وہ یہی تقریر چند معمولی ترامیم کے ساتھ مختلف جلسوں میں دیگر حوالوں سے نہ کرتے تو میں یقیناً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔ مشاعرہ شروع ہوا اور ہمیں اسٹیج پر بیٹھ کر تمام حاضرین کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس قدر شناسا چہرے نظر آئے کہ زمان و مکان کے تصورات گڈمڈ ہونا شروع ہو گئے۔ ریڈیو پاکستان کے اظہار کاظمی اور ان کی فنکار بیگم شاہدہ کاظمی' جمیل ملک اور اسد نذیر کی مشہور ریڈیائی تکون کا تیسرا زاویہ افضل رحمان' عارف وقار کی بہن عابدہ وقار اور اس کی والدہ اور ان سب سے بڑھ کر اپنا طرحدار دوست شاعر احمد فراز۔

فراز اپنے مخصوص سرحدی تپاک کے ساتھ گلے ملا لیکن اس کے جملوں کی بے ربطی سے میں نے اندازہ کیا کہ معاملات حدودِ عقل

وہوش کے آخری سری تک پہنچ چکے ہیں۔ مقامی شاعرہ اور ریڈیو پروگرام کی انچارج تزئین حنا نے نظامت کے فرائض سنبھالے۔ شمالی امریکہ کے مختلف شہروں سے آٹھ دس کے قریب شاعر تشریف لائے تھے۔ مشاعرے کے دوران کاغذی گلاسوں میں ہمیں چائے اور کافی پیش کی گئی جس کہ فراز اور کچھ اور دوست مخصوص مشروبات سے شغل فرماتے رہے۔ فراز کے پاکستان سے جانے کی خبر' سیر و سیاحت اور تبادلے رکوانے کی ناکام کوشش کے مرحلوں سے گزر کر اب ان حوالوں سے ہم تک پہنچ رہی تھی جو خاصے مشکوک اور متنازعہ فیہ تھے۔

فراز کی شاعری کی بے پناہ قوت اور خوبصورتی سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کی سیاسی بصیرت اور ذاتی کردار ہمیشہ سے بحث طلب رہے ہیں۔ مغرب سے آنے والی خبروں اور دوستوں کی وساطت سے یہ تو معلوم ہوتا رہا تھا کہ وہ اپنی خود ساختہ جلاوطنی کو اشتہار بنا کر شہر شہر پھرتا اور حکومت کو گالیاں دے کر داد سمیٹتا اور انقلابی کہلاتا ہے۔ مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ بھی فہمیدہ ریاض کی طرح پاکستان کی حکومت اور ریاست کے فرق کو فراموش کر چکا ہے۔

فوج اور فوجی حکومت سے اس کی بوجوہ ناراضگی بجا اور اس پر احتجاج اور تنقید کا حق بھی اسے یقیناً ملنا چاہیے لیکن ایک ایسے مجمعے کے سامنے' جس میں نوے فیصد ہندوستانی سامعین ہوں' اپنے وطن اور اہل وطن پر آوازے کس کر ان لوگوں سے داد سخن لینا جو پاکستان کی تباہی پر خوش ہوتے ہیں ہرگز ہرگز کوئی مستحسن بات نہیں۔ اس نے پہلے جو نظم سنائی اس کے مخاطب پاکستان کے اہل قلم تھے جنہیں اس نے برا بھلا کہنے کے بعد اپنے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دی تھی۔ اس سارے عمل میں اس نے اپنا مقام دنیا کے عظیم دانشوروں اور انقلابی شاعروں کی صف میں متعین کیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سپین کا لورکا' چلی کا پابلو نرودا' ترکی کا ناظم حکمت' فلسطین کا محمود درویش' چین کا ماؤزے تنگ' ویت نام کا ہوچی منہ اور کیوبا کا فیڈل کاسترو سب کے سب اس کے انقلابی لشکر کے سپاہیوں میں شامل ہیں۔ سب شاعر مختلف انداز میں تعلّی کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر اس رات فراز سچ مچ فراز تھا۔

حاضرین کی بے پناہ داد اور اصرار پر اس نے دوسری نظم ''محاصرہ'' سنائی۔ یوں دیکھا جائے تو اس کی دونوں نظموں میں سے بہت سی صحیح باتیں اور عمدہ لائنیں تھیں۔ لیکن اپنے گھر کی گندی لینن کو ایک تماش بین پبلک کے سامنے دھو کر اس نے اسٹیج پر جو کثافت پیدا کر دی تھی اس کا لازمی تقاضا تھا کہ ہم میں سے کوئی اس کی باتوں کا جواب دیتا۔ عالی صاحب ہمارے دل کی بات پڑھ کر کھڑے ہوئے اور پاکستان کے حوالے سے اپنی غیر مشروط محبت اور وفاداری کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے اپنا مشہور گیت ''جیوے جیوے پاکستان'' اپنے مخصوص ترنم میں پڑھنا شروع کیا۔ سامعین میں پاکستانیوں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے گیت کورس نہ بن پایا مگر اتنا

ضرور ہوا کہ فراز کی پیدا کردہ کشیدگی میں کسی حد تک کمی واقع ہوگئی۔

مشاعرے کے پہلے دور کے خاتمے پر چائے کا وقفہ ہوا تو میں نے احمد فراز کو پکڑ لیا اور واضح الفاظ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ وہ بار بار مجھے گلے لگا کر الٹی سیدھی وضاحتیں پیش کرتا رہا۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ بہادری یہ نہیں کہ آدمی جن عوام کی محبت کے گیت گائے خود ان کو مصائب کے دریا میں چھوڑ کر پار اتر جائے اور آتے جاتے مسافروں کے ہاتھ حمایتی بیان اور خیر سگالی کی نیک خواہشات بھجواتا رہے۔ اگر اسے وطن اور اہل وطن سے اتنی ہی محبت ہے تو وہ پاکستان میں رہ کر ان کے دکھ درد میں شامل ہو اور یوں اپنے وطن کو جگ ہنسائی کا نشانہ نہ بنائے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ تم یہی باتیں وہاں رہ کر کرو تو سارا ملک تمہاری عزت کرے جیسی کہ حبیب جالب کی ہوتی ہے لیکن ان لوگوں کے ہاتھوں کھلونا نہ بنو جنہیں پاکستان کی آزادی' سالمیت اور سرحدوں کے وجود سے ہی الجھن ہوتی ہے۔ اتنے میں کچھ لوگ ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے اس مسئلے کو علمی اور فلسفیانہ دلائل کے ساتھ عالمی تناظر میں رکھ کر فراز کے موقف کی حمایت کرنے کی کوشش کی لیکن شاید اس وقت تک فراز کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا کیونکہ اس نے خود ہی ان کی بات کاٹنا شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر چند لمحوں کے اندر اندر وہ سب لوگ کھسک کر ادھر ادھر ہو گئے۔

مشاعرہ رات کے دو بجے ختم ہوا۔ عابدہ وقار اور اس کی والدہ نے منتظمین سے بات کر کے مجھے اپنے گھر لے جانے کا انتظام کر لیا تھا۔ چنانچہ ہم مشاعرہ گاہ سے نکل کر ان کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جو وہاں سے بیس میل دور تھا۔ راستے میں ایک اطالین ریسٹورنٹ میں پیٹ کی پوجا کی۔ عابدہ کی ناک فلو کے حملے کی ابتدائی علامات کا منظر نامہ بنی ہوئی تھی مگر وہ جوش مہمانداری میں پاسبان عقل کو دل سے دور تر رکھنے پر مصر تھی۔ چنانچہ ہم لوگ صبح تک مشترکہ دلچسپی کے موضوعات اور بھولے بسرے دوستوں کی باتیں کرتے رہے۔ عابدہ نے بتایا کہ اس نے اپنے امریکن شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور اب اپنے چار سالہ بچے اور والدہ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ سکول میں پڑھاتی ہے' تنخواہ معقول ہے' گزارہ ہو رہا ہے۔

عابدہ وقار کی ذہانت اور اردو ادب سے متعلق اس کی قابلیت کا میں اس وقت سے معترف ہوں جب وہ اورینٹل کالج میں پڑھا کرتی تھی اور ابھی اس نے ایم اے میں پنجاب یونیورسٹی کا ریکارڈ بھی نہیں توڑا تھا۔ اس کی طلاق کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ زیادہ تفصیل اس لیے نہیں پوچھی کہ اس ذکر سے بہر حال اس کو تکلیف ہوگی۔ جاتے ہوئے وہ مجھ کو ایک چھپا ہوا اشتہار نما کاغذ یہ کہہ کر دے گئی کہ جب کبھی اس پر اداسی وغیرہ کا دورہ پڑتا ہے وہ ان چند لائنوں کو پڑھتی ہے اور جیسے اس کے اندر روشنی کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ میں نے اس عبارت کو اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی مگر مزا نہیں آیا' چنانچہ اصلی حالت میں نذر قارئین کرتا ہوں۔ عنوان یہ

ہے:

EVERY BODY, SOME BODY, ANY BODY, NO BODY

تحریر کچھ یوں ہے:

Once upon a time, there were four people named Everybody, Somebody, Anybody and Nobody. There was an important job to be done and Everybody was sure that Somebody would do it. Anybody could have done it but Nobody did it. Somebody got angry about that because it was Everybody's job. Everybody thought Anybody could do it, but Nobody realized that Everybody did not do it. It ended by Everybody blaming Somebody when actually Nobody could accuse anybody.

صبح آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر ماحول اور محل وقوع کا جائزہ لینا چاہا تو ہر طرف ایک جھٹپٹے کا سا عالم تھا۔ بارش غالباً خاصی دیر سے ہو رہی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں بھیگے ہوئے خزاں زدہ درختوں کی اداسی اور نہائے ہوئے سبزے کی طراوت خوشی اور غمی کا ایک عجیب سنگم پیش کر رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت گھر اپنے اپنے مکینوں کی الجھنوں' خوابوں' خوشیوں اور مجبوریوں کو چھپائے جیسے بے تعلق سے کھڑے تھے۔ منیر نیازی کا ایک شعر کہیں سے بھٹکتا ہوا دھیان میں آ نکلا۔

مثال سنگ کھڑا ہے اسی حسیں کی طرح
مکاں کی شکل بھی دیکھو دل مکیں کی طرح

دروازہ آہستہ سے کھلا' عابدہ کی امی نے جھانک کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے اندر آ گئیں۔ کہنے لگیں۔ ''صبح سے تیسری مرتبہ تمہارے لیے بیڈ ٹی بنائی ہے۔ جگایا اس خیال سے نہیں کہ رات بھر کے تھکے ہوئے ہو اور پتا نہیں بیڈ ٹی لیتے بھی ہو یا نہیں' خواہ مخواہ تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔''

میں نے کہا۔ '' آنٹی! بیڈ ٹی کا تو میں واقعی عادی نہیں کیونکہ دانت برش کیے بغیر کچھ کھانے پینے کے تصور سے ہی مجھے الجھن ہوتی ہے البتہ اگر آپ مجھے جگا دیتیں تو شاید میں واشنگٹن کی اس خوبصورت صبح کو زیادہ وقت اور توجہ کے ساتھ دیکھ سکتا۔''

''اس طرح کی صبح تو یہاں سال میں آٹھ مہینے ہوتی ہے بیٹا' مگر ہائے وہ لاہور کی صبحیں.......''

آنٹی کی آواز بھرا گئی اور میں سوچ میں پڑ گیا' کیا واقعی لاہور شہر کے نام اور آب و ہوا میں کوئی خاص بات ہے یا دوسرے شہروں کے مکینوں کی طرح یہ بھی اپنے باشندوں کے ناسٹلجیا کا ایک روٹین استعارہ ہے؟

اتنے میں عابدہ کا چار سالہ گورا چٹا اور صحت مند بچہ سفید ململ کے کرتے اور پاجامے میں انگریزی بولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ معلوم ہوا کہ رات اسے افضل الرحمٰن کے گھر چھوڑ دیا گیا تھا جہاں سے صبح صبح اسے عابدہ لے کر آئی تھی۔ میں نے اس سے فرینک ہونے کی کوشش کی مگر وہ غالباً اس بن بلائے اجنبی انکل کو فوری لفٹ دینے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے کسی اعلیٰ بزنس ایگزیکٹو کی طرح مجھ سے رسمی سا ہاتھ ملایا اور پھر اپنی نانی سے یوں باتیں کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

Mr. You can go.

میں نے اسے بچوں کے کچھ آزمودہ ٹرک دکھا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ شروع شروع میں تو اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی مگر پھر اسے کوئی بات پسند آ گئی' چھلانگ مار کر بستر پر آیا اور میری گود میں بیٹھ کر بولا۔

Can you do it again uncle?

اس نے ایک دم میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور میں ایک پل میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ میرا تین سالہ بیٹا علی بھی صبح جاگنے کے بعد اسی طرح میرے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے اور مسکرا کر کسی ایسی چیز کی فرمائش کرتا ہے جس کا ذکر گزشتہ دن یا رات میں کسی وقت ہوا تھا۔ وہ کون سی قوت ہے جو بچوں کے ذہنوں میں ان باتوں کو محفوظ اور تازہ رکھتی ہے جنہیں ہم اپنے بوٹوں سے جھڑنے والی گرد کی طرح بھول جاتے ہیں؟ علی ذیشان کی یاد سے یادوں کا ایک ارژنگ کھل گیا۔ مجھے ایک ایک کر کے اپنے سب پیارے اور عزیز یاد آنے لگے۔ واشنگٹن کی سڑکوں اور درختوں پر پڑنے والی بارش میرے دل میں ہونے لگی اور گھروں کی چھتوں پر ٹھہری ہوئی اداسی جیسے رینگ کر اس اجنبی کمرے میں در آئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

عابدہ کا گھر یوں تو چھوٹا سا تھا مگر تین افراد کے اس کنبے کے لیے خاصا بڑا تھا۔ آنٹی نے بتایا کہ Basement کے کمرے میں انہوں نے دو غیر ملکی طالب علموں کو کرائے پر دے رکھے ہیں جن میں سے ایک پاکستانی اور ایک چینی ہے۔ اگر میں پاکستان میں ہوتا تو کہتا کہ اس چینی کی عمر بہت لمبی ہوگی کیونکہ ادھر آنٹی نے اس کا نام لیا ادھر وہ مسکراتا اور کورنش بجالاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

چارلی کہنے کو تو چینی تھا تھا پتا چلا کہ اس کے والدین پچیس برس پہلے فارموسا عرف تائیوان سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ چارلی کی عمر بقول اس کے بتیس برس تھی لیکن اگر وہ اپنی عمر بیس یا پچاس برس بھی بتاتا کہ میرے پاس نہ ماننے کے لیے کوئی دلیل یا عذر نہ تھا کیونکہ اللہ نے ان لوگوں کی شکلیں ہی عجیب ''عمر چور'' بنائی ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ چینی زبان پڑھ اور بول سکتا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ پڑھنے اور بولنے کی حد تک اس کا جواب اثبات

میں ہے البتہ لکھنے کے سلسلے میں وہ خاصا کمزور ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اس نے یہ بتائی کہ امریکہ میں رہتے ہوئے لکھنے کی مشق کا کوئی موزوں ذریعہ اس کے پاس نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ میری طرح ادیب یا شاعر نہیں ہے۔ میں اپنے بکس سے وہ چینی رسالے نکال کر لے آیا جن میں میرے چینی دوست اور مترجم لوشوئی لین نے میرے ٹی وی ڈرامے ''وارث'' کا چینی زبان میں خلاصہ شائع کروایا ہے۔ چار قسطوں پر محیط اس ترجمے کے آغاز میں اس نے میرے بارے میں ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔ میں چاہتا تھا کوئی مجھے اس کا ترجمہ کر کے یہ تو بتادے کہ اس نے لکھا کیا ہے؟ چارلی نے قدرے اٹک اٹک کر مجھے اس عبارت کا ترجمہ سنایا۔ یہ ایک سیدھا سادا سا تعارفی نوٹ تھا جس میں ''وارث'' اور میری دیگر تحریروں کے بارے میں قارئین کو معلومات دی گئی تھیں۔ یہ فرمائش کرنے کے بعد مجھے منیر نیازی کا ایک جملہ بہت یاد آیا۔

منیر نیازی کی کسی کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ ایک بہت بڑے شاعر صدارت کر رہے تھے جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ منیر اپنی سیماب صفات طبیعت اور بار بار پیشاب کرنے کی عادت کی وجہ سے تقریب کے دوران کئی مرتبہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور ہال سے باہر گیا۔ ایک مرتبہ جب وہ اسی طرح کے جزوی ''واک آؤٹ'' کے بعد ہال میں داخل ہوا تو صاحب صدر کی صدارتی تقریر شروع ہو چکی تھی۔ منیر اپنی کرسی کی طرف جاتے ہوئے چند لمحے میرے پاس رکا اور رازداری سے پوچھنے لگا۔

''اس نے میرے خلاف تو کچھ نہیں کہا؟''

اس دوران میں عابدہ بھی اونی مفلر میں سر لپیٹے' ناک پر ٹشو پیپر رکھے کمرے میں آچکی تھی۔ میں نے اسے چارلی سے اپنے بارے میں لکھی ہوئی تحریر کا ترجمہ سننے کی غایت اور منیر نیازی کے اس جملے کا پس منظر بتایا تو وہ بہت ہنسی کیونکہ وہ بھی میری طرح منیر کی محض مداح ہی نہیں دوست بھی ہے۔

دوپہر کا کھانا افضل رحمان کی طرف تھا۔ افضل ریڈیو پاکستان کی طرف سے ڈیپوٹیشن پر دو برس کے لیے وائس آف امریکہ کی اردو سروس میں آیا ہوا تھا۔ ملاقات چونکہ کئی مہینوں کے وقفے سے ہوئی تھی اس لیے پہلے دو گھنٹے تو دوستوں کی خیر خبر' تازہ واقعات اور نئے لطیفوں کی نذر ہو گئے۔ ایک لطیفہ تو بہت ہی غضب کا تھا۔

دو یہودی ایک پارک میں ملے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ایک گویا ہوا۔

''میں آج کل بہت پریشان ہوں مائیکل' کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ تمہیں پتہ ہے میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میں نے ساری زندگی اس کی پرورش' دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں لگا دی ہے مگر پچھلے دنوں اس نے یہ بتا کر میرا سکھ چین چھین لیا ہے کہ وہ یہودی

مذہب چھوڑ کر عیسائی ہو گیا ہے۔"

مائیکل نے اس اندوہناک واقعے پر افسوس کا اظہار کیا۔ پھر اتنے ہی غمزدہ انداز میں بولا۔

"بات یہ ہے کو ہن' میرے دوست! کہ گزشتہ برس میں بھی اسی طرح کی اذیت سے گزر چکا ہوں۔ میرا بھی اکلوتا بیٹا اپنے ماں باپ کا مذہب چھوڑ کر عیسائی ہو گیا ہے اور تب سے اب تک میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔"

دونوں دوست کچھ دیر دل گرفتگی کے عالم میں بیٹھے رہے' پھر دونوں نے مشورہ کیا کہ اس مسئلے کے حل کے لیے اپنے مذہبی پیشوا یعنی ربی سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ ربی نے ان کی بپتا سنی اور سوچ میں پڑ گیا' پھر ادھر ادھر دیکھ کر بڑی رازداری سے کہنے لگا۔

"یہ مسئلہ چھیڑ کر تم نے میرے سوئے ہوئے زخم جگا دیے ہیں۔ من وعن یہی ہاتھ چند برس پہلے میرا بیٹا بھی میرے ساتھ کر چکا ہے۔ میں تو اس دکھ کو اس لیے اپنے اندر چھپا کر بیٹھا ہوا تھا کہ میں تمہارا مذہبی راہنما ہوا اور میرے بیٹے کی یہ حرکت پوری قوم کے مورال پر برا اثر ڈال سکتی ہے۔"

تھوڑی دیر دونوں گم سم رہے' پھر ربی نے کہا۔ "اب یہ مسئلہ انسانی اوقات سے باہر ہو چکا ہے' بہتر ہے ہم خدا کے حضور سجدہ ریز ہوں اور اس کو اپنا دکھ سنائیں۔ اب وہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

تینوں گھٹنوں کے بل جھک کر دعا مانگنے لگے۔ دعا کے اختتام پر غیب سے ایک آواز آئی۔ "مجھے کیا سناتے ہو' میرے بچو' میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میرے تو اپنے بیٹے نے میرے ساتھ یہی کیا ہے۔"

افضل رحمان کے گھر سے دیگر ہمرہان قافلہ درد کا پتا کیا' معلوم ہوا پروین ترئین حنا کی طرف ٹھہری ہوئی ہے۔ عالی' یوسف چوہان کی طرف ہیں اور جعفری صاحب ڈاکٹر عبداللہ کی طرف رات رک کر صبح کی فلائیٹ سے اپنے بیٹے سے ملنے شکاگو جا چکے ہیں۔ وائس آف امریکہ والے انٹرویو کرنا چاہتے تھے مگر کوئی ایسا پروگرام نہیں بن رہا تھا جس میں سب کے سب بیک وقت جمع ہو سکے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ عالی اور میں شام چھ بجے انٹرویو ریکارڈ کروا دیں۔ گویا ہم ان کے نزدیک بھاگتے بھوت کی لنگوٹی تھے۔

براڈکاسٹنگ ہاؤس کے باہر ایک مقررہ مقام پر عالی صاحب ایک شاندار مرسڈیز کے قریب چھتری تانے کھڑے تھے۔ ان کے قریب ایک لمبا تڑنگا سمارٹ سا ادھیڑ عمر گورا' فوجی قسم کی وردی پہنے آدھا بارش میں اور آدھا ایک شیڈ کے سائے میں کھڑا تھا۔ جرنیلوں جیسے حلیے والے اس شخص نے بڑے تپاک سے ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے "ہائے ہائے" کہا۔ عالی نے شاید اس خیال سے کہ کہیں ہم لوگ زیادہ مرعوب ہو کر اسے سیلوٹ ہی نہ مارنے لگ جائیں' اردو میں بتایا کہ یہ اس کرائے کی گاڑی کا

ڈرائیور ہے جو یوسف چوہان نے ان کے لیے ہائر کی ہے۔ میں نے ایک نظر اس چمکتی ہوئی گاڑی پر ڈالی اور پھر اس جرنیل نما شوفر کی طرف دیکھا اور اپنے شہر کی ٹیکسی کاروں اور ان کے موٹے موٹے بدمعاش صورت ڈرائیوروں کو دھیان میں لایا جن کے ساتھ سفر میں ہر وقت جان اور مال کا خطرہ رہتا ہے۔ شوفر نے گاڑی کی ڈکی سے ایک اور چھتری نکالی اور اسے عابدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں افضل کو اور مجھے مخاطب کیا کہ افسوس اس وقت کوئی اور چھتری موجود نہیں ورنہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔

دو چھتریوں کی آڑ میں ہم چار افراد بارش کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے وی او اے کی عمارت میں داخل ہوئے۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر نام' پتے اور آمد کی غرض و غایت لکھوانے کے بعد لفٹ کے ذریعے اردو شعبے میں پہنچے تو پہلی بار امریکہ اپنا اپنا سا لگا۔ بالکل اپنے لاہور ریڈیو اسٹیشن کا سا ماحول تھا۔ ویسی ہی اداسی اور بے ترتیبی' ٹیپوں کے انبار' پرانے اخبارات اور رسالے اور دیکھی بھالی دیسی شکلیں۔ افضل رحمان نے جلدی جلدی ریکارڈنگ کے لیے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام کیا جہاں باری باری میرا اور عالی کا رمی قسم کا انٹرویو ہوا۔ یہ انٹرویو اسی طرح کے چھوٹے پروفیشنل کیسٹ ریکارڈر پر ریکارڈ کیا گیا جسے ہمارے ہاں عموماً صحافی حضرات استعمال کرتے ہیں۔ وی او اے کے بڑے نام میں اردو سروس کے چھوٹے درشن دیکھ کر دکھ بھی ہوا۔ ندیم صاحب کا کیا اچھا شعر ہے۔

بے وقار آزادی' ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھتے ہیں' بیڑیاں ہیں پاؤں میں

انٹرویو کے بعد عالی کی ایک امریکن دوست کی بیٹی اور اس کے شیرف شوہر سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ یہ دونوں گزشتہ رات مشاعرے میں آئے تھے اور اردو کا ایک لفظ نہ سمجھنے کے باوجود آخر تک بیٹھے رہے تھے۔ لڑکی کا نام سوزین تھا' عمر چوبیس پچیس برس تھی۔ نقش و نگار اور دیگر احوال اچھے خاصے تھے۔ لیکن اس کے شوہر کی موجودگی میں دھیان کو زیادہ آوارہ پھرانے کی گنجائش نہ تھی۔ شوہر کا پورا نام پتا نہیں کیا تھا' مجھ سے اس کا تعارف ''جم'' کہہ کر کرایا گیا۔ وہ واشنگٹن کے کسی علاقے کا شیرف تھا۔ اونچا لمبا' ہٹا کٹا (ہٹا کم اور کٹا زیادہ)' بات بات پر ہنسنے والا امریکن۔ بیوی کے مقابلے میں شاید کم پڑھا لکھا یا اس سے زیادہ سمجھدار تھا کیونکہ جب عالی حسب عادت کسی پیچیدہ بین الاقوامی مسئلے پر بات کرتے تو وہ آنکھیں مٹکا کر میری اور عابدہ کی طرف دیکھتا اور کوئی ہلکی پھلکی بات شروع کر دیتا۔ سوزین کا کچھ تعلق ری پبلکن پارٹی کی کسی ذیلی تنظیم سے بھی تھا جس کی نوعیت واضح نہ ہو سکی لیکن اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ عالی نے بتایا کہ اس کی ماں دنیا کی گیارہ زبانیں جانتی ہے جبکہ سوزین فی الحال صرف اٹالین' فرنچ اور Spanish پر دسترس حاصل کر سکی ہے۔ کرۂ ارض پر انسان کے مستقبل اور اس کی سماجی انحطاط کی عمرانی وجوہات قسم کے

کسی مسئلے پر عالی اورسوزین بڑے عالمانہ انداز میں بحث کر رہے تھے کہ پتانہیں کیسے سوزین کے بھائی کی شادی کی بات چل نکلی۔ عالی نے سوزین سے اس کی بھابھی کے بارے میں پوچھا۔سوزین نے ناک چڑھا کر ''دفع'' کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور اپنی بھابھی کے بارے میں جورائے دی اس کا اردو میں مفہوم کم وبیش کچھ یوں تھا۔

''دفع کریں جی اسے' کوئی عورت ہے وہ۔الو بنا کے رکھا ہوا ہے میرے بھائی کو۔ٹھیک ہی کہتے تھے ہمارے بزرگ' جنوب (امریکہ کا جنوبی حصہ) کی عورتیں پھوہڑ اور بدسلیقہ ہوتی ہیں۔نہ منہ نہ متھا' جن پہاڑوں لتھا۔''

مجھے محسوس ہوا جیسے اندرون موچی دروازہ کی کوئی پروین' نسرین' خالدہ قسم کی لڑکی اپنی بھابھی کے بارے میں اظہار خیال کر رہی ہے۔

سوزین کے انداز گفتگو کی اس اچانک تبدیلی سے ایک لمحے کے لیے ہم سب لوگ ہکے بکے سے ہو کر رہ گئے۔نند بھاوج کی اس امریکی کہانی میں ہو بہو وہی کردار تھے جو وطن عزیز میں اس رشتے کے حوالے سے دکھائی دیتے ہیں۔کیسی عجیب بات ہے' انسان نی دنیا کو براعظموں' نسلوں' رنگوں' نظریوں اور سرحدوں میں تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے تو کر دیا ہے لیکن جذبوں کی سطح پر (ماحول کی جزوی تبدیلیوں سے قطع نظر) وہ آج بھی کم وبیش ایک ہی انداز میں سوچتا اور ری ایکٹ کرتا ہے۔

سوزین شاید ہماری معنی خیز مسکراہٹوں سے کچھ کھٹک سی گئی تھی۔چنانچہ اس نے اس بھابھی کے ذکر پر لعنت بھیجتے ہوئے میرے ایک اور اورنج جوس کا آرڈر دیا اور ہمیں اپنی ماں کے بارے میں بتانے لگی جو اس کے خیال میں ایک بہت غیر معمولی اور ونڈر فل عورت تھی۔عالی چونکہ پہلے ہی سے اس رائے کے حق میں تھے اس لیے میری اور جم کی کوششوں کے باوجود اختلاف کی گنجائش بلکہ نیلام گھر والے طارق عزیز کے لفظوں میں ''امکان'' پیدا نہ ہو سکا۔

''چارلیز'' سے اٹھتے اٹھتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔عالی کھانے کے لیے کہیں مدعو تھے اور ہم سب کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کا اس طرح ہمیں چھوڑ کر چلے جانا قطعاً خلاف آداب نہیں کیونکہ یہ ملاقات اتنے ہی وقت کے لیے قرار پائی تھی۔عالی اپنے جرنیل نما شوفر کے ساتھ اور سوزین جم کے ساتھ رخصت ہوئے تو میں اور عابدہ بھی بھیگتے ہوئے موٹر تک پہنچے جو چارلیز سے تقریباً ایک فرلانگ دور پارک کی گئی تھی۔بارش اور سردی ہڈیوں میں اترتے جا رہے تھے اور عابدہ کا فلو اندر سے باہر آ چکا تھا چنانچہ میں نے خواہش کے باوجود واشنگٹن کی سیر سے متعلق عابدہ کا پر اصرار مشورہ ٹھکرا دیا کہ اس سے اس کی طبیعت کے مزید بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

اگلی صبح پچھلے دن کا ایکشن ری پلے تھا۔ بارش اگرچہ ہلکی اور غیر مسلسل تھی مگر سردی کی وجہ سے بستر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ٹیلیفون پر ساتھیوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ طے پایا کہ تزئین حنا کے یہاں سب لوگ جمع ہو جائیں' وہیں کھانا کھایا جائے اور گپ کی جائے مگر اب مسئلہ یہ آ پڑا کہ میں وہاں پہنچوں کیسے! عابدہ بیچاری نے اگرچہ میرے لیے خاص طور پر اپنے سکول سے چھٹی لی ہوئی تھی مگر اتنے تیز بخار میں اس سے اتنی لمبی ڈرائیونگ کرانا انتہائی غیر اخلاقی اور ان شولرس عمل تھا۔ میں نے پروین کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنی کامن سینس کو بڑی مشکل سے بروئے کار لاتے ہوئے مشورہ دیا کہ اس ضمن میں ہمیں اپنے باضابطہ میزبانوں کو تکلیف دینی چاہیے کیونکہ بطور مہمان ہمیں تو اس کا حق بھی پہنچتا ہے۔

میزبانوں میں سے ڈاکٹر عبداللہ کے علاوہ جمیل صاحب کا فون نمبر بھی ہمیں دیا گیا تھا مگر ہم نے ڈاکٹر عبداللہ کو ہی زحمت دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ نئے میزبان کے ساتھ سارے تکلفات پھر شروع سے برتنے پڑتے جب کہ ہم اس عمل سے ناکوں ناک آ چکے تھے۔ یوں جمیل صاحب کو دیکھے پرکھے بغیر ڈاکٹر عبداللہ کے حق میں فیصلہ دینے پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔

ایک نوآموز شاعر اپنے دو غزلیں لے کر استاد کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ شام کے مشاعرے میں اسے غزل سرا ہوان ہے اس لیے استاد صاحب دونوں میں سے بہتر غزل کی نشاندہی کر دیں۔ استاد نے پہلی غزل پڑھی اور کاغذ شاگرد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "برخوردار دوسری پڑھ دینا۔"

راستے میں ڈاکٹر عبداللہ سے ہندوستانی مسلمانوں' اردو شاعری اور دوطرفہ تعلقات' روسی اور امریکی سامراج اور احمد فراز کے رویے کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ فراز پر آنے والا میرا غصہ اب آہستہ آہستہ افسوس میں تبدیل ہو رہا تھا کہ اتنا اچھا شاعر اور برسوں کا دوست یوں دربدر خوار ہو رہا ہے اور اپنی ناسمجھی کی وجہ سے ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے جو اس کے نام اور شہرت کی آڑ لے کر اپنے قد بلند کرنے کی فکر میں ہیں۔ میں نے پھر اپنے اس خیال کا اعادہ کیا کہ فراز کی بیشتر باتیں صحیح ہیں مگر اس کے اظہار کے طریقے اور پلیٹ فارم غلط ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چونکہ بنیادی طور پر ادب اور سیاست کا آدمی نہ تھا اس لیے اس نے اس مسئلے پر زیادہ گفتگو نہیں کی' صرف اتنا کہا کہ فراز صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بہت سی لمبی لمبی سڑکوں سے گزر کر جب ہم تزئین حنا کے گھر پہنچے تو تین بج رہے تھے۔ چنانچہ کھانا کھانے کے دوران ہم نے جلدی جلدی ایک دوسرے سے نوٹس ایکسچینج کیے۔ فراز کے رویے سے وہ بھی بہت کبیدہ خاطر تھی۔ کھانے کے دوران تزئین کے میاں طیب صاحب بھی آ گئے۔ موصوف کا آج ایک نئی ملازمت پر پہلا دن تھا۔ معلوم ہوا کہ امریکہ میں ملازمت چھوڑنا یا نئی ملازمت

حاصل کرنا عام سی بات ہے۔طیب بڑے سمارٹ اور تیز طرار آدمی تھے اور اپنی وضع قطع' لباس کی تراش خراش اور انداز و اطوار سے تزئین کی نسبت زیادہ جوان اور کم عمر دکھائی دیتے تھے۔تزئین کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ طالب علمی کے دنوں میں معقول سے زیادہ حد تک اچھی مقررہ رہ چکی ہے اور سیٹلائیٹ کالج راولپنڈی میں وہ اردو کی معروف نقاد جمیلہ شاہین کی بہت چہیتی شاگرد ہوا کرتی تھی۔

طیب اور تزئین مل کر مقامی ریڈیو اسٹیشن سے ہر ہفتے دو گھنٹے کا اردو پروگرام پیش کرتے ہیں۔انہوں نے ہمیں اس کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور اپنا چھوٹا سا گھریلو ریکارڈنگ روم بھی دکھایا جس میں رکھی ہوئی چند ٹیپیں ان کا کل سرمایہ پروگرام تھیں۔ یہ پروگرام اگرچہ کمرشل تھا لیکن پاکستانی کمیونٹی کی عدم دلچسپی اور سفارت خانے اور ریڈیو پاکستان کی بے مروتی کی وجہ سے مختلف النوع قسم کے مسائل سے دوچار تھا۔اب یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے پاکستان سے باہر ہر وہ آدمی دوچار ہے جس کے پیٹ میں وطن سے محبت کا مروڑ اٹھتا رہتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ اس طرح کے کام کاروباری سطح پر ذاتی مفادات کے لیے بھی کرتے ہیں لیکن اگر اس سے پاکستان کا امیج بنتا یا اس کا تعارف ہوتا ہے تو میرے نزدیک ان کی مدد میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ہمارے سفارت خانے قومی ذرائع ابلاغ اور طیب' تزئین جیسے لوگوں کے درمیان پل کا کردار ادا کر کے کوئی با قاعدہ اور قابل عمل طریق کار نہایت آسانی سے وضع کر سکتے ہیں۔

میں نے انہیں بتایا کہ ''بیوروکریسی'' کے بنائے ہوئے اصول وقوانین کے وہی تنہا شکار نہیں میں خود بھی اس کی تنگ غلط انداز کا مارا ہوا ہوں۔میرے ٹی وی سیریل ''وارث'' اور ''سمندر'' نیویارک کے چینل نمبر ۴۷ پر عرصہ ڈیڑھ سال سے مسلسل دکھائے جا رہے ہیں۔پروگرام چلانے والوں کا بیان ہے کہ وہ ان پروگراموں کے لیے پاکستان ٹیلیویژن کارپوریشن کو ادائیگی کرتے ہیں جبکہ ٹی وی کے متعلقہ افسران پہلے تو ان پروگراموں کے چلنے سے ہی باخبر نہیں تھے۔اور اب یہ کہتے ہیں کہ وہ صرف ریکارڈنگ چارجز لے کر ۴۷ چینل والوں کو پروگراموں کی کاپیاں بنا کر دیتے ہیں اور یوں پروگراموں کے مصنفین اور فنکاروں کے حصے میں ٹھینگے اور خالی جیب کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔

طیب نے کاپی رائٹ کی بین الاقوامی حیثیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی اور اس ضمن میں مغربی ملکوں کے مصنفین کی مثالیں دیں جن کی تحریروں کی رائلٹیاں لاکھوں ڈالر سالانہ تک پہنچتی ہیں۔مغربی جرمنی کے شاعر اور ڈرامہ نگار گنٹر گراس کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ سال میں ایک ڈرامہ لکھتا ہے اور دو بار خصوصی پروگراموں میں اپنی شاعری سناتا ہے اور ان تین پروگراموں کی کمائی پر ملک

کے مہنگے ترین علاقے میں اعلیٰ ترین معیار کی زندگی بسر کرتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارے یہاں لکھنے اور شعر کہنے والے کے لے بھوکا ننگا' کمزور اور برے حال بانکے دیہاڑے ہونا ضروری ہے تا کہ اہل تمول اس کی سرپرستی کر سکیں اور اس کے کندھے پر شفقت کا ہاتھ رکھ کر اپنے مخیر اور اہل ذوق ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ اس سلسلے میں ان کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ اعلیٰ ادب ہمیشہ غربت اور تنگ دستی میں تخلیق پاتا ہے۔ اور تو اور ان کی دیکھا دیکھی خود لکھنے والوں کی سوچ کا انداز بھی یہی ہو گیا ہے۔ وہ ہر وقت ایک طرح کی خود رحمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ سکھ کے لیے گیت تو بہت لکھتے ہیں لیکن اپنے کسی ساتھی کو سکھ میں دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں نے انہیں اردو کے ایک بہت مشہور ادیب کا قصہ سنایا جنہوں نے اپنے جیتنے ہی ایک نامور ادیب کے بارے میں مجھے بڑی حاسدانہ رازداری کے ساتھ بتایا تھا۔

''آپ کو پتا ہے' فلاں صاحب روزانہ صبح ناشتے میں پورا ایک سیب کھاتے ہیں۔''

رات کا کھانا یکے از میزبان نسیم صاحب کے گھر پر تھا۔ نسیم صاحب پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے شاید اسی لیے مہمانوں میں زیادہ تعداد ڈاکٹروں ہی کی تھی۔ احمد فراز آیا تو اس کے ساتھ اس کے مقامی میزبان بھی تھے۔ اس جوڑے نے آتے ہی فوجی حکومت کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور پاکستانی عوام کے حقوق اور زبوں حالی کے بارے میں یوں بیانات جاری کرنا شروع کئے جیسے ان کے علاوہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگ فوج کے پٹھو' عوام دشمن اور سامراج کے آلہ کار تھے۔ انہوں نے امریکی پریس اور مختلف عالمی اداروں کے حوالے سے مختلف طرح کے فیکٹس اور فگرز کے ڈھیر لگا دیئے اور بتایا کہ پاکستان کی تباہی میں اب بس کچھ گھنٹوں ہی کی دیر ہے۔

اجنبی جگہ اور نامانوس لوگوں کی موجودگی میں ایسی ''مفروضاتی'' اور ''سوڈو انقلابی دانشوری'' کی بحث میں پڑ کر میں بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جب میرے طرح دینے کے باوجود ان کے اعتراضات اور طنزیہ اشارات کی شدت کم نہ ہوئی تو میں نے فراز کی طرف دیکھا جو گزشتہ شب کی تلخی کو دور کرنے کے لیے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اس نے شرمندہ سا ہو کر بات بدلنے کی کوشش کی مگر تیروں کی بوچھاڑ میں کمی کی بجائے مزید شدت آ گئی۔ ایک خاتون نے بتایا کہ امریکی رسالے کے سروے کے مطابق دنیا کے دس کرپٹ ترین جرنیلوں میں دو جرنیل پاکستان سے ہیں۔ ایک کا ذریعہ آمدنی ہیروئین کی سمگلنگ ہے اور دوسرے کا دفاعی سامان کی خریداری۔

میں نے کہا۔ ''ممکن ہے آپ کی معلومات درست ہوں مگر یہ تو بتایئے اگر بقول آپ کے پاکستان کے تمام شاعر' ادیب' صحافی اور

سیاست دان حکومت کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں اور اس کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں تو اس ملک کی تقدیر کیسے بدلے گی اور اسے کون بدلے گا؟ آپ جیسے حریت پسند دانشوروں کو تو ڈالر کمانے سے فرصت نہیں ملتی۔ آپ کے بال بچے امریکی شہری ہیں' ان کا بھی آپ کی طرح پاکستان کے بغیر گزارہ ہو جائے گا مگر وہ غریب عوام' جن کے دکھ میں روزانہ پندرہ بیس منٹ کھانا کھانے سے پہلے یا بعد آپ منہ سے جھاگ نکالتے ہیں' ان کے لیے آپ نے کیا کیا ہے؟ وہ تو اگر چاہیں بھی تو آپ کی طرح گرین کارڈ لے کر آپ جیسی بڑی بڑی نوکریوں پر نہیں آسکتے کیونکہ ان کے پاس وہ تعلیم اور ہنر نہیں جس کی امریکہ کو ضرورت ہے۔ امریکی نظام نے آپ کو نہیں آپ کی تعلیم کو خریدا ہے کیونکہ یہ معاشرہ بنیادی طور پر ''بکاؤ مال'' کا معاشرہ ہے۔ آپ اپنے جسموں اور روحوں کا سودا کرنے کے بعد کس منہ سے کسی اور کو ''بکنے'' کا طعنہ دے سکتے ہیں؟ پاکستانی معاشرے کی خرابیاں اپنی جگہ مگر وہاں کے لوگ حب وطن میں کسی سے پیچھے نہیں اور یہ ان کی حب وطن ہی ہے جس کی آڑ لے کر کوئی حکومت اپنے آپ کو ''ریاست'' کا درجہ دے کر اس عظیم اور مقدس جذبے کا استحصال کرتی ہے۔ آپ خدارا پاکستان کا ذکر اس طرح نہ کریں جیسے یہ آپ کی مادر وطن نہیں بلکہ یو این او کا ایک ممبر ملک ہے جس کی حالت پر آپ کرکٹ میچ کی طرح تبصرہ کرتے ہیں۔''

اس گفتگو میں ایک سمارٹ سے خوش رو نوجوان نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ بحث کا طوفان تھما تو معلوم ہوا کہ وہ یہاں کا بہت مشہور اور متمول ڈینٹسٹ ہے۔ سرگودھا کا رہنے والا ہے اور نثار چوہدری اس کا نام ہے۔ کھانے کے دوران ایک کونے میں لے جا کر اس نے مجھے بہت داد دی اور کہا کہ آپ نے بہت کچھ کیا' میں بھی ان کی اس طرح کی باتیں سن سن کر بہت تنگ آیا ہوا تھا۔ حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ فراز نے اس گفتگو میں خلاف توقع نہ صرف بہت کم حصہ لیا بلکہ زیادہ تر ہماری ہاں میں ہاں ملائی۔

تحریر و تقریر کی پابندیوں کا ذکر ہوا تو بات پاکستان کی صورت حال سے نکلتی ہوئی پوری دنیا پر محیط ہو گئی۔ ڈاکٹر نثار نے بڑی خوبصورت بات کی کہ بلاشبہ پاکستان میں صورت حال بہت خراب اور تشویشناک ہے اور سیاسی و سماجی حقوق مختلف حیلوں اور حوالوں سے ضبط ہونے کے قریب قریب ہیں مگر یہ المیہ تنہا پاکستان کا نہیں بلکہ تیسری دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں کا ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو خود پہلی اور دوسری دنیا بھی اس لعنت سے پاک نہیں۔ اسے مختلف ملکوں اور خطوں کے ساتھ ساتھ عالمی انسانی برادری کے حوالے سے بھی دیکھنا چاہیے۔ روسو نے جو یہ کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر وہ ہر جگہ زنجیروں میں ہے تو یہ بات آج بھی تقریباً ہر معاشرے پر صادق نظر آتی ہے۔ کہیں غلامی' غربت' غیر ملکی جارحیت اور فرسودہ تصورات کی زنجیریں ہیں تو کہیں نام نہاد آزادی' سرمایہ داری' نظریہ پرستی اور انسان کو کموڈیٹی میں تبدیل کر دینے والے نظام کی زنجیریں ابن آدم کو بے دست و پا کیے ہوئے ہیں۔ غریب اور ترقی

پذیر ملک تو بے شمار اندرونی تضادات اور بیرونی دباؤ کے شکار ہوتے ہی ہیں مگر امریکہ اور روس کی آزادی تحریر وتقریر کو کس کھاتے میں ڈالیں گے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ امریکہ میں یہودی پریس اور لابی کی مخالفت میں بول اور لکھ کر کوئی امریکی شخص یا ادارہ اقتدار اعلیٰ میں شریک نہیں ہوسکتا اور کیا یہ بھی ایک حقیقت نہیں کہ روس میں سچ وہی ہے جسے روسی کمیونسٹ پارٹی کی آشیر باد حاصل ہو۔

ڈاکٹر نثار نے ایک لطیفہ بھی سنایا جس پر اس وقت تو میں بھی سب کے ساتھ ہنسا لیکن بعد میں سوچا کہ یہ لطیفہ کم اور انسان کی عالمگیر بے بسی کا استعارہ زیادہ ہے۔

سٹالن کی موت کے بعد روسی وزیر اعظم خروشیف ایک جلسے میں اس کی پالیسیوں کے خلاف تقریر کر رہا تھا۔ کسی نے ہجوم میں سے چٹ بھیجی کہ آپ تو خود اس کی حکومت میں شامل تھے' اس وقت کیوں اختلاف یا احتجاج نہیں کیا' آپ اس وقت کیا کر رہے تھے؟

خروشیف نے چٹ پڑھی اور سامعین سے کہا کہ جس کسی نے یہ چٹ بھیجی ہے وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے۔ یہ اعلان اس نے تین مرتبہ کیا مگر کوئی شخص کھڑا نہ ہوا۔ اس پر خروشیف نے وہ چٹ پھاڑ کر پھینکی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اس وقت یہی کر رہا تھا۔''

◆◆◆

ٹورنٹو۔ا

جس ایئر پورٹ سے ہمیں اگلی صبح بلکہ علی الصبح فلائیٹ لینی تھی اس کا جغرافیائی محل وقوع ہم تینوں مسافروں کے مسافر خانوں سے نہ صرف تیس تیس چالیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا بلکہ سب کو آنا بھی مختلف سمتوں سے تھا۔ منتظمین نے پہلی بار ایک صحیح فیصلہ کیا اور وہ یہ کہ ہم سب آج کی رات اپنے چوتھے میزبان ڈاکٹر نثار چوہدری کے گھر پر گزاریں کیونکہ وہ ایئر پورٹ کے راستے میں پڑتا ہے اور اس میں ہم سب کے سمانے کی گنجائش بھی ہے۔ نثار چوہدری کے اہل خانہ پاکستان گئے ہوئے تھے اور ایک بار پھر عارضی طور پر چھڑے چھانٹ جیسی زندگی گزار رہے تھے۔

ڈاکٹر نثار کا گھر امریکہ میں ڈاکٹروں کی خوشحالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں بھی بے شمار ہسپتالوں اور طبی سہولتوں کے باوجود لوگ پرائیویٹ علاج کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں ایک دانت نکلوانے پر جو خرچ آتا ہے اس سے ہمارے یہاں ایک لڑکی بیاہی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر نثار نے ایک خالص پنجابی میزبان کی طرح مدارات کا ایک گرمجوشانہ اور طویل سلسلہ شروع کر دیا اور رات کے ایک بجے' باوجود ہمارے انکار اور احتجاج کے' میز پر کافی' چائے' جوس' سنیکس' آملیٹ اور پتا نہیں کس کس چیز کا ڈھیر لگا دیا۔ جس پھرتی اور خوش سلیقگی سے وہ کچن میں کام کر رہا تھا اسے دیکھ کر عالی نے کہا۔ ''بھئی آپ جیسا شوہر تو نصیبوں سے ملتا ہے۔ اگر میں عورت ہوتا تو فوراً آپ سے شادی کر لیتا۔''

ڈاکٹر نثار بھی انسانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو بقول عطاء الحق قاسمی جملہ ضائع نہیں کرتے بندہ ضائع کر دیتے ہیں۔ فوراً بولا'' آپ کی داد اور تعریف کا بہت بہت شکریہ' اللہ کا شکر ہے کہ آپ عورت نہیں ہیں۔''

عالی ایک اچھے سپورٹس مین جملے باز کی طرح اس جملے پر پھڑک اٹھے۔ انہوں نے فوری طور پر اپنا سونے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور میز پر پاؤں پھیلا کر بولے۔ ''آپ سے تو صاحب گپ ہو گی۔''

سو یہ گپ ہوئی اور خوب ہوئی۔ ڈاکٹر نثار اپنے لاہور کے زمانہ طالب علمی میں یونین لیڈر قسم کی چیز تھا اس لیے اس کے حوالے سے کئی بھولے بسرے نام اور واقعات یاد کئے گئے۔ دوران گفتگو عالی نے نثار کی عمدہ اردو کی تعریف کی تو اس نے ایک بڑا مزیدار لطیفہ سنایا کہ بعض اوقات جملے میں محاورے کا استعمال کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ مثلاً ایک انگریزی محاورے "To kill two birds

"with one stone" کا اردو متبادل ''ایک تیر سے دو شکار کرنا'' ہے۔ اسے ایک ڈاکٹر صاحب نے کیسے استعمال کیا۔

ایک بہت بڑے اسپیشلسٹ سے ملاقات کا وقت لینے کے لیے کئی کئی ہفتے انتظار کرنا پڑتا تھا لیکن ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب بغیر اپوائنٹ منٹ کے ایک مریض کے گھر پہنچ گئے۔ مریض بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔'' آپ نے بہت عنایت کی جو تشریف لائے مگر مجھے تو آپ نے غالباً آئندہ مہینے کا ٹائم دیا ہوا ہے۔''

ڈاکٹر مسکرایا اور بولا'' دراصل ہوا یہ کہ تمہارے ساتھ والے بلاک میں آج میری ایک اپوائنٹ منٹ تھی' وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ متعلقہ مریض پچھلے ہفتے فوت ہو چکا ہے۔ میں نے کہا' کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کرتے چلیں۔''

ڈاکٹروں کے لطیفوں کی بات چلی تو مجھے ڈینٹسٹ سے متعلق لطیفہ یاد آگیا سو میں نے جوابی کارروائی کے طور پر فوراً داغ دیا۔

ایک سردار جی دانت نکلوانے کے لیے دندان ساز کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ لگانا چاہا تو سردار جی اڑ گئے کہ ٹیکہ نہیں لگواؤں گا کوئی اور ترکیب کرو۔ خاصی بحث وتمحیص کے بعد طے پایا کہ سردار جی کو وہسکی پلائی جائے تاکہ نشے کی وجہ سے دانت نکالے جانے کی تکلیف محسوس نہ ہو۔ سردار جی نے پینا شروع کی اور آہستہ آہستہ آدھی بوتل پی گئے۔ ڈاکٹر کی قوت برداشت جواب دینا شروع ہو گئی۔ اس نے کہا'' کیا خیال ہے سردار جی اب نکال لوں دانت؟''

سردار جی نے چند لمحے لہرانے کے بعد بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں اور کرپان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔'' اب تم میرے دانت کو ہاتھ تو لگا کر دکھاؤ۔''

ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر نثار کے بچوں کی تصویریں لگی تھیں۔ پروین کو پھر گیتو یاد آنے لگا۔ نثار کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ فوراً فون اٹھا کر لے آیا اور اصرار کرنے لگا کہ آپ سب لوگ ابھی اپنے اپنے گھروں میں بات کریں۔ واشنگٹن میں رات کے دو اور پاکستان میں غالباً صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہمارے گریز پر اس نے ہم سب کے گھروں کے نمبر لیے اور باری باری سب کو ملا کر بات کرادی۔ گھروں میں بات کرنے سے محفل کا رنگ بدل گیا اور گفتگو میں ایک نامعلوم سی اداسی تیرنے لگی چنانچہ ہم سب اپنے اپنے کمروں میں کچھ دیر سونے کے لیے چلے گئے۔

صبح چھ بجے ڈاکٹر نثار نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ ہمیں سات بجے تک گھر سے نکل جانا چاہیے ورنہ جہاز مس ہونے کا خطرہ ہے۔ ہاتھ منہ دھو کر نیچے آیا تو ناشتہ تیار تھا اور ڈاکٹر نثار ایک ماہر باورچی کی طرح اسے آخری ٹچ دے رہا تھا۔ سامان اور سواریوں کی تعداد اور مقدار کے پیش نظر نثار نے اپنے ایک پاکستانی ہمسائے کو فون کر کے بلوایا تھا تاکہ یہ قافلہ دو کاروں میں آرام کے ساتھ سفر کر

سکے۔

یہ پاکستانی ہمسائے ایبٹ روڈ لاہور کی خلیفہ فیملی کے چشم و چراغ اختر سعید جعفری تھے جو یہاں بزنس کے سلسلے میں مقیم تھے۔ اس حسن اتفاق پر زمان و مکان ایک بار پھر گڈ مڈ ہونے لگے۔

بالٹی مور کا ہوائی اڈہ چیخ چیخ کر اپنے مضافاتی ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ وطن عزیز میں فیصل آباد' سکھر' نواب شاہ وغیرہ کے ہوائی اڈے بھی بالکل ایسے ہی ہیں۔ سرتا پا بی کلاس' ایئرلائن Piedmont تھی۔ جہاز اگرچہ بوئنگ تھا مگر اس سارے ماحول میں اس کی شکل فوکر فرینڈشپ جیسی ہو رہی تھی۔ ہم چند منٹ لیٹ تھے مگر ہوائی کمپنی کے عملے نے بڑے شہروں جیسی کنکریٹ ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ایسی خندہ پیشانی سے ہماری تاخیر کو ہنس کر ٹالا کہ باعث تاخیر بیان کرنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔

میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک امریکن لڑکا' جس کی عمر تقریباً اٹھارہ برس تھی' کانوں پر ہیڈ فون لگائے' آنکھیں بند کئے نیم دراز تھا۔ میں بہت حیران ہوا کہ اتنی مختصر فلائیٹ میں اور بی کلاس ایئر لائن ہونے کے باوجود انہوں نے مسافروں کو ہیڈ فون دے رکھے ہیں مگر اس حیرت کی عمر چند لمحوں سے زیادہ نہیں تھی کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں' ہیڈ فون اتارا' پاؤں میں رکھے ہوئے بیگ میں سے ایک ٹرانسسٹر نکالا اور کیسٹ بدل کر دوبارہ ہیڈ فون لگا لیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس وقت وطن عزیز کے وہ سائیکل والے بہت یاد آئے جو ہینڈل کے ساتھ ٹرانسسٹر باندھ کر سفر کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی موسیقی کی دعوت عام دیتے ہیں جب کہ یہ فرنگی برخوردار اپنے ملکی کردار کی طرح اجارہ دار دکھائی دیتا تھا۔

ایئر ہوسٹس جوس لے کر آئی تو وہ اس وقت بھی آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ تیسری آواز پر اور دوسری بار شانہ ہلانے کے بعد چونکا اور پہلی بار میری طرف متوجہ ہوا۔ یہ جان کر کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور شعبہ تعلیم سے تعلق رکھتا ہوں' اس نے ٹرانسسٹر بند کیا اور ہیڈ فون اتار کر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا نام سارے تھا اور وہ نیویارک اپنے والدین کے پاس Thinks Giving کی تقریبات کے سلسلے میں جا رہا تھا۔ ورجینیا یونیورسٹی کے اس میڈیکل کے طالب علم کی صورت میں' میں نے پہلی بار امریکی نوجوان کا وہ روپ دیکھا جو ان کی قومی ترقی کی بنیاد ہے۔ سارے انیس برس کی عمر میں اپنے تعلیمی میدان میں مہارت اور اعلیٰ صلاحیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا' اہل دنیا اور اپنے عصر کے بارے میں جو معلومات رکھتا تھا وہ بلاشبہ حیرت انگیز اور ہمارے کارپردازان تعلیم و تہذیب کے لیے لمحہ فکریہ تھیں۔ اس نے مجھ سے پاکستان اور پاکستان سے متعلق بین الاقوامی معاملات پر بے شمار سوالات کئے۔ اس کے لہجے اور انداز میں ایک ایسی طالب عالمانہ سچائی اور کشش تھی کہ مجھے اس سے باتیں کرنے میں سچ مچ مزا آنے لگا۔

اپنے ملک کے تہذیبی' تمدنی' سائنسی' معاشرتی اور معاشی بحرانوں اور انحطاط کا ذکر کرتے کرتے اور انہیں تسلیم کرتے کرتے تھک گیا تو تنگ آ کر میں نے اس پر وہی حملہ کیا جو ہم مشرق والے خصوصاً مسلمان اہل مغرب کے روحانی خلا کے حوالے سے کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''یہ درست ہے سارے کہ ہمارا معاشرہ کئی لحاظ سے پسماندہ اور زوال پذیر ہے مگر ہمارے پاس مذہب ایک ایسی قوت ہے جس کا متبادل تم مغرب والوں کے پاس نہیں اور جس کی وجہ سے تم لوگ روحانی کرب اور بحران میں مبتلا ہو۔ نیویارک کی سڑکوں پر آج بھی انسان' انسان کے شر سے محفوظ نہیں۔''

اس نے میری بات بہت غور سے سنی اور کہنے لگا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں' واقعی نیویارک میں ایسے علاقے ہیں جہاں آپ باحفاظت آ جا نہیں سکتے کیونکہ بدمعاش لوگ ذرا سی رقم کے لیے گولی مار دیتے ہیں' بلکہ یہ بھی ہے کہ ایسے علاقے میں جانا پڑ جائے تو ہم تھوڑی بہت رقم ضرور ساتھ رکھتے ہیں تا کہ کہیں رقم نہ ملنے پر ناراض ہو کر کوئی بدمعاش گولی نہ مار دے۔ اس مسئلے نے ہمیں واقعی بہت پریشان کر رکھا ہے۔''

میں شاید نفسیاتی طور پر اس کی طرف سے بحث اور دفاع اور جوابی الزام کی توقع کر رہا تھا لیکن اس کے اس اقرار اور لہجے کی سادگی نے مجھے لاجواب سا کر دیا۔ میرے ذہن میں اپنے اخبارات کی وہ سرخیاں گھوم گئیں جن میں روزانہ قتل' ڈاکے' اغواء' چوری' آبروریزی اور ظلم وشقاوت کی ایسی ایسی داستانیں سنائی جاتی ہیں کہ انسانیت کے وجود پر سے اعتبار اٹھنے لگتا ہے۔ کاش مجھ میں بھی اتنی اخلاقی جرات ہوتی کہ میں اس کے سامنے اپنے روحانی اقدار اور تقدس کے نام لیوا معاشرے کی ان گھناؤنی حقیقتوں کو تسلیم کر سکتا۔ امریکی معاشرے کی تمام تر نام نہاد بے راہرویوں میں پلتا ہوا یہ نوجوان' جو ایک نیم مذہبی اور سماجی تقریبات میں شرکت کے لیے اپنے گھر جا رہا تھا اور جس کی گفتگو میں اعتماد' سچائی اور بے ساختگی تھی' میرے سامنے ایک سوال بن کر کھڑا ہو گیا۔ کیا ہمارے معاشرے میں بھی اس عمر کے لڑکے اس طرح سے سوچتے پڑھتے اور بی ہیو کرتے ہیں؟

سارے تو نیویارک کے لگارڈیا ائیر پورٹ پر ہاتھ ملا کر اور ان معلومات کا شکریہ ادا کر کے جو میں نے اسے پاکستان کے بارے میں دی تھیں' چلا گیا مگر میں بہت دیر تک اس مخمصے میں مبتلا رہا کہ جو علم اس نے مجھے عطا کیا ہے وہ اس کے ایک غیر معمولی ذہین اور ذمہ دار طالب علم ہونے کی وجہ سے تھا یا یہ اس معاشرے کا اجتماعی عکس ہے جس نے امریکہ کو سپر پاور بنا رکھا ہے۔

ٹورنٹو کے ہوائی اڈے پر یہ ہمارا دوسرا پھیرا تھا اس لیے اس بار ہم لوگ نسبتاً زیادہ اعتماد کے ساتھ امیگریشن کے مرحلے سے گزرے۔ گزشتہ بار کسٹم ہال میں ہمیں کسی نے چیک نہیں کیا تھا چنانچہ اب کے بھی سیدھے باہر کے دروازے کی طرف بڑھے جہاں

میزبان ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ سامان کی ٹرالی میں پروین کا وہ بکس سب سے اوپر رکھا تھا جس کے تالے واشنگٹن میں جواب دے گئے تھے اور جسے باندھنے کے لیے نائیلون کی مضبوط رسی گزوں کے حساب سے استعمال کی گئی تھی۔ ایک شرارتی سے شکل والے کسٹم آفیسر نے غور سے اس کا جائزہ لیا اور پھر بالکل ایسے انداز میں روک کر جیسے ہمارے ٹریفک کے سپاہی موٹر سائیکل والوں سے کاغذ طلب کرتے ہیں' سامان کھولنے کے لیے کہا۔ میں نے اسے باقی بکسے کھول کر دکھانے کی پیش کش کی مگر اس کی سوئی غالباً رسیوں والے بکس پر اٹک گئی تھی۔ اب پتا نہیں یہ ہماری گھبراہٹ تھی کہ یا گرہوں کی مشکل پسندی کہ رسی ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے میں نے کھینچ کھانچ کر رسیاں اتاریں اور بکس کھولا۔ اس ستم ظریف نے ایک سرسری سی نظر بکسے میں ڈالی اور مسکرا کر کہا' ٹھیک ہے جاؤ۔ اب دوسرا امتحان شروع ہوا۔ بے ترتیبی سے اتارنے کی وجہ سے نائیلون کی رسی الجھ چکی تھی اور بکس بند نہیں ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں پسینہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یوں لگا جیسے پورا کسٹم ہاؤس میری ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ عالی اس دوران میں کسٹم افسر کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پروین خود بھی اپنے ملک میں کسٹمز کی افسر ہے لیکن غالباً ان کی اس بات پر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ پروین کے چہرے پر اس وقت جو پریشانی تھی وہ اسے اس کہانی کا کوئی اور ہی کردار ثابت کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے کسٹم کا پل صراط ختم ہوا' لیکن ابھی حواس برقرار بھی نہیں ہو پائے تھے کہ لاؤنج میں انتظار کرنے والے منتظمین کے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''کیا ہوا؟''

''کیا بات تھی؟''

''کیوں روکا؟''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

بڑی مشکل سے سب پر واضح ہوا کہ یہ سارا فساد اس ولایتی صندوق کے ان درآمد شدہ تالوں کا تھا جو اپنے علاقے میں آتے ہی دغابازی پر اتر آئے تھے اور گزشتہ دو تین فلائیٹوں کے دوران تیسری دنیا کے بیشتر غلام ممالک کی طرح حق خود اختیاری مانگنا شروع ہو گئے تھے۔

اس پر کسٹم سے متعلق تجربات اور واقعات کا بیان شروع ہوا جن کا محور و مرکز انگریزی زبان تھی۔ انگریزی تسلط میں رہنے والوں

اور امریکی اثر کے علاقوں کے علاوہ دنیا کے بیشتر علاقوں میں انگریزی جاننا کسی کام نہیں آتا۔ مہذب‘ ترقی یافتہ اور بڑی قومیں انگریزی کو وہ لفٹ نہیں دیتیں جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ روس‘ چین‘ جاپان‘ مشرقی یورپ‘ لاطینی امریکہ‘ سپین‘ جرمنی اور فرانس وغیرہ میں انگریزی سے زیادہ اشاروں کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ خود امریکہ والے بھی اس انداز کی انگریزی بولتے ہیں کہ جان بن یان اور اس کے پلگرم فادرز کی ہجرت کے اسباب خلط ملط ہونے لگتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں مذہبی عصبیت‘ فرقہ واریت اور تنگ نظری سے زیادہ ''اہل زبان'' انگریزوں نے ان کی غلط انگریزی کی وجہ سے ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ امریکہ یوں بھی مہاجروں کا ملک ہے کیونکہ اس کی اصل آبادی تو اب چند Reserves تک محدود ہے۔ یا ریڈ انڈینز کی فلموں میں نظر آتی ہے‘ باقی سب کے سب یورپ کے مختلف ملکوں کے مہاجرین ہیں جو رزق‘ آزادی اور بہتر زندگی کی تلاش میں یہاں آ بسے ہیں۔ اس رنگارنگی کا مظاہرہ ان کی انگریزی میں بھی نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی جب دونوں پارٹیوں کی انگریزیاں آپس میں لڑ جائیں یعنی کسٹم آفیسر اور مسافر دونوں ''صاحب اسلوب'' ہوں تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

علی سردار جعفری نے اس ضمن میں اپنے ایک گزشتہ دورہ کینیڈا کا واقعہ سنایا جس میں ان کے ساتھ اردو کی ایک بہت مشہور اور نامور خاتون افسانہ نگار (جو کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتی ہیں) بطور شاعرہ سفر کر رہی تھیں۔ میں ان خاتون کا نام حذف کر رہا ہوں کیونکہ ایک تو وہ خاتون ہیں اور دوسرے اس لیے کہ میں خود ان کے افسانوں کا زبردست مداح ہوں سو میں ان کے نام کی جگہ ''خاتون'' کا لفظ استعمال کروں گا۔

جعفری صاحب نے بتایا کہ خاتون کی رنگت خاصی مغربی انداز کی سرخ و سفید ہے‘ فرانسیسی انداز کی لمبی ناک ہے‘ اس پر انہوں نے فیشن ایبل دھوپ کی عینک اور فر والا اونی کوٹ پہن رکھے تھے اور بالوں کو بھی ڈائی کر کے سرخی مائل کیا ہوا تھا۔ اب یہ حلیہ عام طور پر یورپ کی ان خواتین کا ہوتا ہے جو دنیا کے قدیم ترین پیشے سے منسلک ہوتی ہیں‘ اس پر ان کی انگریزی بھی خاصی ممتاز عدفیہ تھی چنانچہ جب امیگریشن کاؤنٹر پر متعلقہ افسر نے سوال کیا کہ اگر آپ کینیڈا میں رشتہ داروں کے پاس بھی نہیں جا رہیں‘ وہاں آپ کا کاروبار بھی نہیں‘ ڈالر بھی آپ کے پاس نہیں ہیں تو پھر وہاں آپ کا گزارا کیسے ہو گا؟ اس پر خاتون نے بڑے اعتماد سے کہا۔

That will be arranged. You know, I am a Professional.

(اس کا انتظام ہو جائے گا۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میں ایک پیشہ ور ہوں)

امیگریشن والے نے چونک کر خاتون کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور پھر بڑے مشکوک انداز میں بولا۔

Sorry, Madamm, will you please explain your profession?

اب خاتون کی انگریزی ختم ہوگئی انہوں نے بہت اٹک اٹک کر کہا۔

Well you know, in my country, I mean, back home, I charge one hundred dollars per night but here i will take more.

(بات یہ ہے کہ میں اپنے ملک میں تو ایک رات کے سوڈالر لیتی ہوں مگر یہاں زیادہ لوں گی)

اس پر اس امیگریشن والے نے خاتون کے کاغذات اپنے قبضے میں کئے انہیں ایک طرف ہو کر بیٹھنے کے لیے کہا اور بتایا کہ یہ معاملہ وہ فلائیٹ نمٹانے کے بعد طے کرے گا۔

جعفری صاحب کا بیان ہے کہ ہم سب باہر کھڑے خاتون کا انتظار کر رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ نہیں آئیں تو میزبانوں کی وساطت سے ان کی اندر تلاش کرائی گئی۔ خاتون ایک کیبن میں بیٹھی زاروقطار رو رہی تھیں اور امیگریشن والا انہیں بتا رہا تھا کہ اس کے ملک میں یہ دھندہ نہیں چلے گا کیونکہ وہاں پہلے ''رسد'' کی زیادتی ہے۔ بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا گیا کہ خاتون اصل میں شاعرہ ہیں اور ان کا ''اس'' پیشے سے کوئی تعلق نہیں۔ امیگریشن والے نے سوال کیا۔ ''تو پھر یہ ایک رات کے سوڈالر کا کیا چکر ہے؟''

اب ہر آدمی نے اسے سمجھایا کہ یہ سوڈالر شعر پڑھنے کا معاوضہ ہے اور ہمارے معاشرے میں یہ ایک روایت ہے مگر اس کی سمجھ میں آخر تک یہ نہ آسکا کہ ''مشاعرہ'' کیا اور کیوں ہوتا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے کی بک بک جھک جھک کے بعد لوکل میزبانوں کی ذاتی ضمانت پر خاتون کو کلیرنس مل سکی۔

ٹورنٹو چونکہ اس مشاعراتی دورے کا ہیڈ کوارٹر تھا اس لیے یہاں پر ہمارا قیام نہ صرف طویل ترین تھا بلکہ کئی قسطوں میں بٹا ہوا تھا۔ طے یہ پایا کہ ہم اپنا اپنا میزبان وصول پالیں تاکہ آئندہ رابطے اور سفر میں آسانی رہے۔ میرے حصے میں جمال زبیری آئے۔ پروین اشفاق کے گھر ٹھہری جس کی بیوی نرجس اسے لینے آئی ہوئی تھی۔ جعفری صاحب کو بیدار بخت لے گئے اور عالی جی دو میزبانوں کے درمیان حلال ہو گئے کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی رضا کارانہ دستبرداری پر تیار نہ تھا۔ تھوڑی دیر ہم اپنے میزبانوں کو اور میزبان ہمیں دیکھتے رہے اور پھر دونوں پارٹیاں اپنی اپنی قسمت پر صبر شکر کر کے گھروں کو روانہ ہو گئیں۔

جمال زبیری ریڈیو پاکستان کے جمیل زبیری کے برادر خورد ہیں جن سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ جمیل افسانے لکھتے ہیں اور جمال شاعری کرتے ہیں۔ عابد جعفری کی موٹر میں اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ پہلے وہ سنجیدہ شاعری کرتے تھے مگر اس میدان میں حالات حوصلہ افزا نہیں تھے چنانچہ اب چند برسوں سے وہ مزاحیہ شاعری کی طرف مائل ہوئے ہیں اور چونکہ

لوگ اس پر ہنستے ہیں اس لیے ان کی ہمت دن بدن بلکہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ٹورنٹو میں وہ گزشتہ چودہ برس سے مقیم ہیں اور اللہ کا دیا سب کچھ ہے لیکن موٹر خود نہیں چلاتے۔ ایک بیٹا ہے جو پوسٹ آفس میں کام کرتا ہے جب کہ بیٹی ایک سٹور پر کام کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں پڑھائی بھی کر رہے ہیں۔ جمال صاحب بڑے خوش پوش' خوش وضع آدمی ہیں اور مجھ جیسے بلند آواز میں بولنے والے کو بھی احساس کمتری میں مبتلا کر دیتے ہیں کیونکہ ان کی سرگوشی کی پچ بھی عام طور پر نعرے سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ میں موٹر کی پچھلی سیٹ پر تھا اور وہ اگلی سیٹ پر مگر جس وسعت گلو سے وہ مجھے مخاطب کرتے تھے یقین کامل ہے کہ اگر میں عالی صاحب والی گاڑی میں ہوتا تو بھی ان کی بات سن سکتا تھا۔ آواز کی اس کڑک اور گونج سے قطع نظر جمال ایک بہت پیارے' ہمدرد اور ملنسار انسان تھے اور ان کی محبت اور مہمان نوازی ادائے فرض سے زیادہ ان کی ذاتی محبت کی آئینہ دار تھی۔

موٹر میں ہم دونوں کے علاوہ عابد جعفری اور اختر آصف بھی تھے جو شمالی امریکہ کے بہترین نوجوان اردو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ عابد دبلا پتلا' سانولا سلونا اور کھلی ڈلی طبیعت والا ہے جبکہ اختر آصف خوش رو' گورا چٹا اور دھیمے مزاج والا ہے مگر محبت کرنے میں دونوں ایک جیسے تھے جس کا بھرپور احساس مجھے آنے والے دنوں میں ہوا۔ جمال زبیری صاحب کے دیے ہوئے وقفوں کے دوران ان سے بھی ابتدائی بات چیت ہوئی۔

آج کی شام ''علی سردار جعفری'' کے نام تھی۔ یعنی ٹورنٹو والوں نے جعفری صاحب کی سترویں سالگرہ کے حوالے سے ایک خصوصی نشست کا انتظام کیا تھا۔ ہوٹل ہالیڈے ان کے ایک خوبصورت ہال میں دیواروں پر کپڑے کے بینر لگے ہوئے تھے جن پر جعفری صاحب کی مختلف ادبی خدمات کا اندراج تھا اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی باتیں خود میرے لیے بھی نئی تھیں۔ ہندوستان میں ہونے والی ادبی کارروائیوں کی خبر پاکستان میں کم کم پہنچتی ہے' کتابیں اس سے بھی کم آپاتی ہیں اور شخصیات کی محدود سی آمدورفت تو ابھی چند سال سے ہی شروع ہوئی ہے سو جعفری صاحب کے بارے میں میری ساری معلومات معقول حد تک ناقص اور آؤٹ ڈیٹڈ تھیں۔ مجھے پتا ہی نہ تھا کہ ترقی پسند تحریک کے دیگر نظریہ ساز رہنماؤں سجاد ظہیر اور کیفی اعظمی اور مخدوم محی الدین وغیرہ کی طرح علی سردار جعفری آزادی کے بعد کن کن منزلوں سے گزرے ہیں اور آج کل ان کے نظریات کیا ہیں۔ ہندوستانی ترقی پسندوں کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن' ظ انصاری' آل احمد سرور' قمر رئیس' جذبی' ساحر اور کچھ اور لوگوں کے نام بھی کان میں پڑتے رہتے ہیں مگر ان کی اور ان کے ادب کی صحیح صورت حال کا ہم عام پاکستانی ادیبوں کو کچھ ٹھیک سے اندازہ نہیں ہے البتہ ہمارے کچھ ''مقامی دوست'' اپنے ان سرحد پار دوستوں' ہم خیالوں یا دف بازوں کا تذکرہ مختلف حوالوں سے کرتے رہتے ہیں سو اس ضمن میں ہم اس بے

مثل قول کا سہارا لیتے ہیں کہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔

جعفری صاحب کی سالگرہ کی یہ تقریب ہمارے یہاں کے ادبی جلسوں سے خاصی مختلف تھی کیونکہ ہوٹل والوں نے اس تقریب کی ریزرویشن ادبی جلسے کی بجائے ایک ڈنر یک طور پر کی تھی اور تقریریں وغیر گویا ڈنر کے مختلف کورسز کا حصہ تھیں۔ شرکاء تقریب ہال میں لگی ہوئی مختلف ڈنر ٹیبلوں کے گرد بیٹھے تھے اور اسٹیج پر علی سردار جعفری کے ساتھ ہم سب مہمانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ اسٹیج سیکرٹری کرنل انور احمد تھے جو پاکستانی فوج کے ریٹائرڈ انجینئر ہیں۔ ان کی باتوں میں فوجیوں کی مخصوص بے تکلفی بھی تھی اور یہ احساس بھی کہ یہ جلسہ بہر طور ایک ادبی محفل ہے چنانچہ ہم نے ایک ٹکٹ میں دو دو مزے لیے۔ صدارت کے لیے ہمارے عزیز دوست اور مشہور نقاد محمد علی صدیقی کا نام پکارا گیا جو مختلف یونیورسٹیوں میں پاکستان کی ادبی اور ثقافتی صورت حال پر لیکچر دینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ محمد علی صدیقی آواز کے اعتبار سے جمال زبیری کی کامل ضد ہیں یعنی نعرہ بھی ماریں تو یوں لگتا ہے جیسے سرگوشی کر رہے ہیں۔ تقریب سے انور احمد، عابد جعفری، اشفاق حسین اور جمیل الدین عالی نے خطاب کیا۔ سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ اردو سے محبت کرنے والے برصغیر سے ہزاروں میل کی دوری کے باوجود اپنی ادبی روایت کی نہ صرف حفاظت اور نشوونما کر رہے ہیں بلکہ اس تعلق کو مزید گہرا اور استوار کرنے کے لیے اس طرح کی تقریبات کا اہتمام بھی کرتے رہتے ہیں۔

جعفری صاحب نے اس موقعے پر جو گفتگو کی وہ ترقی پسند تحریک کے ایک اچھے وکیل صفائی کی مدلل بحث تھی۔ جعفری صاحب تقریر کا فن جانتے ہیں اور وقت کے گزرنے اور بدلنے کے متعلقات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں، خصوصاً علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری کو غیر ترقی پسند قرار دے کر انہوں نے اردو شعری روایت کے ایک بہت طاقتور حصے کو شعری تناظر سے خارج کرنے کی جو غلطی کی اس کے بہت برے اثرات اس تحریک کے مستقبل پر پڑے۔ کھانا تقریروں کے دوران سرو کیا گیا اور اس کی واحد خوبی یہ تھی کہ اس کی وجہ سے ہمیں ایک محاورے ''اونچی دکان پھیکا پکوان'' کا صحیح مطلب معلوم ہو گیا۔

جعفری صاحب کی وضاحتی اور محمد علی صدیقی کی معلوماتی تقاریر سے ماحول ایک غیر فطری قسم کی سنجیدگی کا شکار ہو گیا اور اچھے بھلے معقول آدمی بھی سفارت کاروں کی طرح سنجیدگی سے ہر بات پر سر ہلانے لگے۔ جلسے کے اختتام پر مقامی ٹیلیویژن اور ریڈیو پروگرام والے احباب آ گئے اور ہمارے انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے بعد تصویریں اترنا شروع ہوئیں اور یوں علی سردار جعفری کی سترویں سالگرہ کا یہ جشن اپنے اختتام کو پہنچا۔ جب سب لوگ جعفری صاحب کو مبارکباد دے چکے تو میں نے ایک طرف لے جا کر

انہیں پیارے احمد ندیم قاسمی کی ساٹھویں سالگرہ کا ایک واقعہ سنایا اور کہا کہ شکر کریں آپ کو کم از کم صدر تو ایسا ملا جو برسی اور سالگرہ کا فرق جانتا ہے۔ اسلام آباد میں قاسمی صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب میں منتظمین نے ایک مرکزی وزیر کو صدارت کے لیے بلایا۔ وزیر موصوف نے اپنی فی البدیہہ تقریر میں قاسمی صاحب کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے آج ندیم صاحب کی ساٹھویں برسی کی تقریب میں شامل ہو کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی آپ لوگ ہر سال جناب احمد ندیم قاسمی کی برسی اسی دھوم دھام اور شان وشوکت سے مناتے رہیں گے۔''

علی سردار جعفری کی سترویں سالگرہ پر جعفری صاحب سمیت جتنے لوگوں نے اظہار خیال کیا سب نے کسی نہ کسی حوالے سے فیض صاحب کا ذکر ضرور کیا۔ اس وقت کسی کے سان وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اردو ادب کا یہ روشن ستارہ انہی لمحوں ٹوٹ کر وقت کے اس مدار سے رخصت ہو رہا ہے جہاں زندگی کا اعتبار سانسوں کی گنتی سے ہوتا ہے۔

صبح کے نو بجے تھے' جمال زبیری کی بیگم میری فرمائش پر ادرک والا آملیٹ بنا رہی تھی اور میں خوش ذائقہ اورنج جوس پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ان ''کافروں'' نے کھانے پینے کی چیزوں کو کس قدر ارزاں' سہل الحصول' خالص' مصفیٰ اور جاذب نظر بنا دیا ہے۔ جو لوگ ان اشیائے خورد ونوش کا کاروبار کرتے ہیں کیا ان کو بھی محض اس لیے جہنم میں ڈال دیا جائے گا کہ وہ مسلمان نہیں تھے اور ہم جو ان اشیاء میں ملاوٹ کر کے بنی نوع انسان کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں' اپنے گھروں اور ماتھوں پر ''ھذا من فضل ربی'' لکھوا کر سیدھے جنت کی اے کلاس میں اس لیے پہنچ جائیں گے کہ ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ شاید میرا ذہن مزید مائل بہ الحاد ہوتا مگر اچانک فون کی گھنٹی بجی' جمال زبیری نے فون اٹھایا اور اپنی مخصوص دور مار آواز میں اس طرح ہیلو کہا کہ میز پر رکھی ہوئی پلیٹوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ان کے منہ سے ایک چیخ نما ''نہیں.....'' نکلی۔ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ فون سننے لگے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے فون میری طرف بڑھایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''عالی جی سے بات کیجیے....... فیض صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔''

عالی نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے ان کی لندن بی بی سی آئی میں برنی صاحب سے بات ہوئی ہے' ان سے پتا چلا ہے کہ فیض صاحب کل لاہور میں وفات پا گئے ہیں۔ عالی کی آواز سے وہ دکھ اور پریشانی ہویدا تھی جس میں ہم سب برابر کے شریک تھے۔ فیض صاحب سے میری بہت زیادہ قربت یا ملاقات نہیں تھی۔ ادبی دنیا میں ہماری نسل کی عمر گزشتہ پندرہ سال پر محیط ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جس کا بیشتر حصہ فیض نے ملک سے باہر گزارا ہے' بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ فیض اردو ادب کا ایک بڑا نام تھے اور ہیں اور ان

کی شاعری گزشتہ چالیس برس میں اردو شاعری کی وقیع ترین آواز رہی ہے۔ ان کو دیکھا' سنا اور پڑھا تو پہلے بھی تھا لیکن میری ان سے باقاعدہ ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ایم اے کر کے لیکچرر ہو چکا تھا۔ غالباً فیصل آباد کا کوئی مشاعرہ تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں ہم سب شعراء جمع تھے۔ چائے اور فقرے بازی کا دور چل رہا تھا کہ فیض صاحب اندر داخل ہوئے' معانقے اور مصافحے ہوئے اور چند ہی لمحوں میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے فیض سے ہماری برسوں کی شناسائی ہے۔ دھیما' کچھ کچھ ٹوٹتا ہوا میٹھا اور خوشگوار لہجہ' چہرے پر پھیلی ہوئی ایک نرم رو مسکراہٹ اور انگلیوں میں دبا ہوا ایک طلسمی سگریٹ جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ہمیں تو ان کی شاعری کا قاری ہونا ہی تھا مگر یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ بھی ہم نوجوان شعراء کے نہ صرف ناموں سے آشنا تھے بلکہ انہیں مسلسل اور بغور پڑھتے بھی تھے۔ میری شاعری کے بارے میں انہوں نے جو محبت بھرے اور تحسین آمیز الفاظ کہے وہ آج تک میرے دل پر نقش اور میری حسین یادوں کا سرمایہ ہیں۔

۱۹۷۶ء میں وہ لاہور کے ایک دفتر میں جو وزارت ثقافت سے متعلق تھا' اس طرح کی نوکری کر رہے تھے جسے پنجابی محاورے میں ''ٹکرے لگنا'' کہتے ہیں۔ میرا دوسرا مجموعہ ''ساتواں در'' شائع ہونے والا تھا۔ ایک دن میں پیشگی اطلاع کے بغیر مسودہ لے کر ان کے پاس پہنچ گیا اور عرض کی کہ فلیپ کے لیے کچھ سطریں لکھ دیں۔ کہنے لگے۔

''بھئی لکھیں گے' ضرور لکھیں گے' کیونکہ ہم تو آپ کے قرض دار بھی ہیں۔ بھئی آپ نے وہ جو فلسطینی نظموں کے ترجمے کئے ہیں وہ تو بڑے معرکے کی چیز ہے اور یہ محمد کاظم بھی کوئی بہت باکمال آدمی ہیں' کہاں ہوتے ہیں یہ!''

اس کے بعد وہ دیر تک ان نظموں کے پس منظر اور تناظر پر ایسی گہری اور معلومات افزا باتیں کرتے رہے کہ میرے دھیان کے دریچے کھلتے چلے گئے اور مجھے صحیح معنوں میں پہلی بار پتا چلا کہ فیض صاحب کس قدر وسیع المطالعہ اور کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں۔

اگلے دن صبح ان کا فون آیا کہ رات نہ صرف انہوں نے ''ساتواں در'' کا مکمل مسودہ پڑھ لیا ہے بلکہ فلیپ بھی لکھ دیا ہے۔ میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ عام تاثر یہ تھا کہ فیض صاحب سے کوئی کام کرانے کے لیے ہفتوں بلکہ مہینوں چکر لگانے پڑتے ہیں۔ ان کی محبت اور شفقت کا یہ سلسلہ بعد کے برسوں میں بھی مسلسل جاری رہا۔ وہ جب اور جہاں بھی ملے میں نے کبھی ان کی توجہ میں کمی نہیں پائی۔

ان کی وفات کی خبر سن کر بے شمار منظر میرے ذہن میں گڈ مڈ ہونے لگے۔ چند ماہ پہلے ان کے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں اشفاق صاحب' شبنم شکیل' عطاء الحق قاسمی' ڈاکٹر سلیم اختر اور میں نے ان کا ایک بہت طویل انٹرویو لیا تھا۔ اس دن وہ بڑے اچھے موڈ میں

تھے اور انہوں نے اپنی زندگی اور شاعری کے بہت سے ایسے پہلوؤں پر بھی کھل کے گفتگو کی جو ابھی تک تشنہ یا ان چھوئے تھے۔ وہ سگریٹ اور شراب چھوڑ چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اب وہ روزانہ دودھ پیتے ہیں اور پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ پھر ایک دوست کا واقعہ سنایا جس نے جب پہلی بار انہیں جام میں دودھ ڈال کر پیتے دیکھا تو باقاعدہ سر پیٹ کر کہنے لگا تھا۔

''لعنت ہو فیض صاحب ہماری زندگی پر' یہ دن بھی ان آنکھوں نے دیکھنا تھا کہ بوتلیں کھلی پڑی ہیں اور آپ دودھ پیئے جا رہے ہیں۔''

پتا نہیں کیوں مجھے اس وقت ان کی دو مختلف نظموں کی یہ لائنیں بہت یاد آئیں۔

کہیں تو ہو گا شب ست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینہ غم دل

در کھلا پایا تو شاید اسے پھر دیکھ سکیں
بند ہو گا تو صدا دے کے چلے آئیں

یوں لگا جیسے ان دو شعروں میں فیض کی شخصیت کی ساری کومل تا سمٹ آئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد اشفاق حسین کا فون آیا اور پروین سے بات ہوئی۔ وہ دونوں بھی ابھی تک صدمے کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل نہیں پائے تھے۔ تفصیلات کا کسی کو علم نہ تھا' بس ایک دکھ کی رو تھی جس میں سب لوگ فیض کی باتیں کئے جا رہے تھے۔ اشفاق کے گھر دوپہر کی دعوت تھی' وہ کینسل کی گئی اور طے پایا کہ فوری طور پر تعزیتی اجلاس منعقد کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا بھر میں فیض کے سلسلے میں ہونے والے بے شمار تعزیتی جلسوں میں زمانی اعتبار سے ٹورنٹو کا یہ اجلاس پہلے نمبر پر تھا۔ نوٹس گو شارٹ تھا پھر بھی ٹورنٹو کے تقریباً تمام اہم ادیب اور شاعر جلسے میں موجود تھے۔ ہم سب نے تقریریں کیں۔ تقریریں کیا تھیں' یادوں کا ایک جلوس تھا جو دھیان کی وادیوں سے امڈا چلا آ رہا تھا۔

جلسے کے اختتام پر میں' اشفاق' عابد' اختر آصف اور انور خلیل شیخ بے مقصد سڑکوں پر گھومنے لگے۔ گھر جانے کو کسی کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ فیض صاحب کے نامکمل ''شہر آشوب'' کا ایک شعر پھر یاد آ گیا۔

گھر رہیے تو ویرانی دل کھانے کو آئے
بازار میں ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

تھک گئے تو کارواں تک پہنچنے کے لیے میٹرو (زیر زمین ریل) میں سوار ہو گئے۔ میٹرو اسٹیشن گویا شہر کے نیچے ایک اور شہر تھا۔

سطح زمین سے ساٹھ ستر فٹ نیچے ہوا' پانی' گیس' بجلی' ریستوران' ٹکٹ گھر' آتی جاتی ریلیں' رنگ رنگ کے مسافر اور روشنی ایسی کہ
''شب کو بھی وہاں دن کے اجالے کا سماں تھا''

عورت اور مرد کی صنفی تفریق کے احساس سے بے نیاز ''انسانوں'' کے اس ہجوم میں بہتے ہوئے ہم بھی اپنی میٹرو تک پہنچ گئے۔ دو لڑکیاں ایک مسافر کی جگہ چھوڑ کر بیٹھی تھیں۔ میں اپنے دیسی آداب کا مارا ان کے قریب جا کر اس انداز سے کھڑا ہو گیا کہ وہ دونوں سمٹ کر ایک ساتھ ہو جائیں تو میں کونے میں ٹک جاؤں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ میں نے بڑے وکٹورین انداز میں انگریزی کا شین قاف درست کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

اس پر ایک بی بی نے ایک لمحے کے لیے پلکیں اٹھائیں اور انتہائی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ Oh, Sure کہتے ہوئے دوسری طرف سمٹ گئی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جنھوں نے میری عزت رکھنے کے خیال سے نظریں نہیں ملائیں۔ میں ''ہر چہ بادا باد'' کے انداز میں ان دونوں کے درمیان بیٹھ گیا مگر یوں کہ ہندو مسلم پانی والا فرق برقرار رہے۔ کنکھیوں سے دیکھا تو دائیں طرف والی بے نیاز حسینہ ایک ایسا باتصویر رسالہ چوڑ چوپٹ کھولے پڑھ رہی تھی جس کی تصویریں خالص مردانہ دلچسپی کی تھیں اور جن کی ہمارے ملک میں کسی کے پاس موجودگی قابل دست اندازی پولیس جرائم کے زمرے میں آتی ہے۔ سامنے دیکھا تو عابد کی ایک معقول صورت ہم سفر غنودگی کے عالم میں تقریباً اس کی گود میں گرنے کے بعد ایسی اپنائیت سے مسکرا رہی تھی جیسے دونوں کے برسوں پرانے تعلقات ہوں۔ ادھر میرے ساتھ والی بی بی نے غیر شرعی تصویر والا ایک اور صفحہ پلٹا اور ادھر سامنے والی کے بال پھر عابد کے چسٹر پر بکھرنے لگے۔ اس وقت اپنا پیارا دوست اور خوبصورت لکھاری مستنصر حسین تارڑ بہت یاد آیا۔ اس کے سفرناموں میں اگرچہ اکثر لڑکیاں نہ صرف ری کنڈیشنڈ ہوتی ہیں اور کئی کئی علاقوں کے بعد جا کر کہیں وصل پر مائل ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم جیسے حاسد لوگ یقین نہیں کرتے تھے جب کہ یہاں بغیر تعارف کے معاملات کچھ سے کچھ ہوئے جا رہے تھے۔

مستنصر کے ذکر پر عزیزی یعقوب ناسک کا سنایا ہوا ایک واقعہ بھی یاد آ گیا جو میں نے وہیں بزبان اردو اپنے ساتھیوں کو سنا ڈالا۔ سب لوگ ہنس پڑے جس کا نقصان یہ ہوا کہ عابد کی ہم سفر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور میری دائیں والی نے رسالہ بند کر کے بیگ میں ڈال دیا اور حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔ یعقوب ناسک کا یہ واقعہ بھی اصل میں اسی ''حسد'' کے جذبے کا مظہر ہے جو مستنصر کے غیر ملکی معاشقوں کی افراط کی وجہ سے ادبی حلقوں میں فلو کی طرح پھیلا ہوا ہے۔

ناسک کہتا ہے کہ اپنے دل کے آپریشن کے سلسلے میں جب وہ لندن میں تھا تو ایک بار ٹیوب (لندن کی زیرزمین ریل) میں ایک

لڑکی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنا سر ناسک کے کندھے پر رکھ دیا اور خراٹے لینے لگی۔ ناسک کا بیان ہے کہ وہ سرک کر پیچھے ہٹ گیا مگر چند لمحوں بعد سر پھر اس کے کندھے پر تھا۔ جب سرکتے سرکتے سیٹ ختم ہو گئی تو ناسک نے اس لڑکی کو ہلا کر جگایا اور کہا۔

''بی بی' تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے' میرا نام یعقوب ناسک ہے' مستنصر حسین تارڑ نہیں۔''

میٹرو سے اتر کر میں نے ساتھیوں کو اپنی ہم سفر کے زیر مشاہدہ رسالے کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس شہر میں جگہ جگہ ایسے رسالے' فلمیں اور میوزک کے کیسٹ کھلے عام بکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خواتین و حضرات کی تفریح طبع کا اور بہت سا سامان بھی شوکیسوں میں سجا کر رکھا جاتا ہے۔ اپنے بیان کی تصدیق کے لیے وہ مجھے قریب ہی واقع ایک لمبی سی دکان میں لے گئے جہاں واقعی وہ سب چیزیں بے تحاشا افراط کے ساتھ موجود تھیں۔ عابد نے مشورہ دیا کہ کچھ دیر کسی نائٹ کلب میں بیٹھا جائے تاکہ مجھ تازہ وارد بساط ہوائے ٹورنٹو کی معلومات میں مزید اضافہ کیا جا سکے۔

نائٹ کلب کا ماحول اپنے لاہور کے مرحوم اسٹوڈنٹس اون چوائس ریستوران جیسا تھا' بس اتنا فرق تھا کہ وہاں پرانی ہندوستانی فلموں کے گھسے ہوئے ریکارڈ چلتے تھے اور یہاں نواں نکور زندہ ناچ گانا ہو رہا تھا۔ اسٹیج پر ناچنے والیاں تو خیر جو تھیں سو تھیں سرو کرنے والی لڑکیاں بھی ٹیکسٹائل انڈسٹری کی خاصی مخالف نظر آتی تھیں۔ ایک خاتون جس کے جسم پر کل کپڑا عاشق کے گریبان یعنی چار گرہ سے بھی کم تھا' ہماری میز کے قریب آ کر رکی اور اس سے پہلے کہ میرے حواس جمع ہوتے اپنے آتشیں وجود سمیت میرے اوپر سے ہوتی ہوئی میز پر چڑھ گئی۔ میوزک کا ڈرم میری کنپٹیوں میں بجنے لگا اور وہ ایک ایسا زندہ ناچ ناچنے لگی جس کے لیے رقص لگی جس کے لیے رقص سے آگاہ ہونا شرط نہیں ہوتا۔ یہ عابد کی شرارت تھی۔ معلوم ہوا کہ تین منٹ کے اس رقص کی قیمت پانچ کینیڈین ڈالر یعنی تقریباً ساٹھ پاکستانی روپے ہے۔ جو ڈانسر پسند آئے پانچ ڈالر دے کر اسے اپنی میز پر بلا لیجئے۔ اپنی مرضی سے وہ جو چاہے کرے البتہ اگر آپ اس کی مرضی یا رضامندی کے بغیر اسے چھونے کی کوشش کریں گے تو کلب کے ملازم ''ڈشکرے'' آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مانٹریال (کیوبک) کی نسبت ٹورنٹو (انٹاریو) والے ذرا قدامت پرست واقع ہوئے ہیں اس لیے قانوناً یہاں ڈانسر کو مکمل برہنگی کی اجازت نہیں' جانگیا نما ایک چیز اسے بہرحال پہننا پڑتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان ڈانسر لڑکیوں میں سے کئی یونیورسٹی کی طالبات بھی ہیں جو فارغ وقت میں ''محنت'' کر کے ذاتی خرچ کے لیے رقم کما رہی ہیں۔ میرے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا اور یکدم جیسے نائٹ کلب اور اس کا ماحول ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ میں نے سوچا' کیا مغرب میں عورت آزادی اور حقوق کی

طویل جنگ جیتنے کے بعد بھی اسی حالت میں ہے جس میں ہمارے یہاں کی طوائف نہ جانے کتنی صدیوں سے سانس لے رہی ہے؟

آزادی' نمائش اور تشہیر کے پردے میں مغرب نے اپنی عورت کے لیے جو ذلت اور تحقیر کا نظام بنایا ہے یہ نائٹ کلب اس کی ایک بھرپور تمثال تھا۔ پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ معاشروں میں عورتوں کے بڑے مسائل ہیں۔ آزادی نسواں' تعلیم' مردوں سے برابری' شادی' بیاہ' رسم ورواج' ذہنی' معاشی' سماجی' استحصال' مردوں کے مقابلے میں آدھی گواہی' مولانا حضرات وغیرہ وغیرہ۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بیشتر مسائل بڑے اہم' حقیقی اور فوری توجہ کے طالب ہیں لیکن اگر ان کے حل کا طریقہ وہی ہے جو مغرب کی عورت نے اختیار کیا ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ بد سے بدتر کی طرف کا سفر ہے۔ میری اس بات پر ہو سکتا ہے کچھ خواتین مجھے رجعت پسند یا مردانہ شاونزم کا مریض تصور کریں لیکن مغرب میں عورت کے مختلف روپ دیکھنے کے بعد یہ میری پر خلوص اور ایماندارانہ رائے ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے یہاں کی عورت کو اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ جانا چاہیے اور اپنے ہمہ جہت استحصال کو سر جھکا کر تسلیم کر لینا چاہیے بلکہ میری رائے یہ ہے کہ اپنے سفر کی سمت خود متعین کی جائے اور ان راستوں سے گریز کیا جائے جن پر چل کر مغرب کی عورت ایک نئے عذاب سے گزر رہی ہے۔

ہمارے معاشرے اور سماجی نظام میں عورت کے حقوق بے شک خطرے میں ہیں۔ لڑکیوں کی پیدائش' ان کی تعلیم' رشتے' جہیز' طلاق' بیوگی' ملازمت غرضیکہ زندگی کے ہر اسٹیج اور شعبے میں ہمارے یہاں کی عام عورت کو کانٹوں بھری راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ زنا' آبروریزی اور نفسیاتی دہشت گردی کا بھی معقول انتظام ہے لیکن ان سب مسائل اور مصائب کا حل اس طرح کی آزادی یقیناً نہیں جس نے مغرب کی عورت کو بیک وقت پیاز اور جوتے کھانے پر مجبور کر دیا ہے۔

میں نے ایک نظر تیز روشنیوں میں مچلتے ہوئے پارے کے اس ٹکڑے پر نظر ڈالی جو لہو گرما دینے والی موسیقی کو دو آتشہ کرنے کی لگاتار اور دھواں دھار کوشش میں مصروف تھا اور پھر اردگرد بیٹھے ہوئے تماشائیوں کے ہجوم کو دیکھا تو ایک لمحے کو تاریخ کے فاصلے سمٹ گئے۔ فراعنہ مصر کے دربار میں ناچتی ہوئی رقاصائیں' قیصر و کسریٰ کے نشاط کدے' شیخوں کے خیمے' مغلوں کے حرم' راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے ایوان' جاگیرداروں کے عشرت کدے' ہیرا منڈی کے کوٹھے اور ٹورنٹو کے یہ نائٹ کلب...... سب کے سب ایک دوسرے میں گڈمڈ سے ہو گئے۔ میرا اپنا ایک شعر ہے۔

فرق کرداروں میں ہے کچھ
باقی کھیل پرانا ہے

مگر یہاں تو یوں لگتا تھا جیسے تماشا اور تماشائی' کھیل اور کردار ازل سے وہی چلے آ رہے ہیں۔

اگلی صبح Calgary جانا تھا۔ بتایا گیا کہ کینیڈا کی سردی اور برف سے ہمارا اصل تعارف اب شروع ہونے والا ہے کیونکہ کیلگری شمال میں خاصی بلندی پر واقع ہے۔ آج کل وہاں موسم نسبتاً اچھا ہے یعنی درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے صرف پانچ چھ ڈگری سنٹی گریڈ نیچے جا رہا ہے۔ میں نے اپنے گرم کپڑوں کا جائزہ لیا اور کیلگری کے لیے سب سے زیادہ گرم کپڑے علیحدہ کر لیے۔ جمال زبیری نے ایک نظر ان کپڑوں کا اور پھر میرے جسم پر چربی کی مقدار کا جائزہ لیا اور مشورہ دیا کہ یہ کپڑے نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ یہاں کے اعتبار سے ناموزوں بھی ہیں۔ اتنے کھلے کھلے اور پارٹیوں میں پہننے والے گرم سوٹ تو وہاں کی سردی کا ایک جھٹکا عرف Blizzard بھی نہیں سہہ پائیں گے۔ ایک بار پھر عالی جی کی وہ سب Warnings یاد آئیں جو انہوں نے ہمیں پاکستان میں بار باردی تھیں اور جن کا ہم نے سیاسی بیانات کی طرح کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں نے پروین کو فون کیا کہ چلو شاپنگ سنٹر سے کیلگری کے لیے کچھ دفاعی نوعیت کا اسلحہ خرید یں۔ پروین نے جواب دیا کہ وہ ضرور چلے گی مگر کپڑے اسے نہیں خریدنے کیونکہ ان کا انتظام وہ گھر سے کر کے چلی تھی اور اس کے بکس نمبر تین میں زیادہ تر وہی سامان بند ہے جسے اسکیمو لوگ استعمال کرتے ہیں۔

اختر آصف اور جمال زبیری کے ہمراہ ہم لوگ ایک بہت بڑے شاپنگ ہال میں گئے جہاں کپڑے' سبزی' پالتو پرندے اور آئس کریم کی دکانیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں مست جوں ہاتھ گردن میں ڈال

کا منظر پیش کر رہی تھیں گروسری سٹور ایسا خوشنما اور سبزیاں اس قدر خوبصورت' دھلی دھلی اور دلکش تھیں کہ وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پروین سے پوچھا۔

''کیوں بھئی خانہ دار خاتون' وطن عزیز میں کبھی ایسی سبزیاں دیکھی ہیں؟''

''ایمان سے امجد بھائی' انہیں تو کچا کھا جانے کو جی چاہتا ہے۔''

قریب ہی ایک پالتو پرندوں کا سٹور تھا۔ چڑیاں' طوطے' رنگ دار مچھلیاں' کتے کے خوشنما پلے یا اچھی نسل کے بلونگڑے دیکھ کر پروین کو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ وہ ایسے بچگانہ اشتیاق اور Thrill کے ساتھ ان کو دیکھتی ہے کہ بے چارے جانور پریشان ہونے لگتے ہیں۔ خصوصاً چڑیوں میں تو جیسے اس کی جان ہے۔ چڑیوں کے ساتھ اسے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کی نظموں میں کوئلیں اور چڑیاں

اتنا زیادہ کیوں کوکتی اور چہچہاتی ہیں۔

اسے حسب فرمائش سبزیوں اور پرندوں کی صحبت میں چھوڑ کر اور وہیں رہنے کی تاکید کر کے ہم لوگ ریڈی میڈ کپڑوں کے ایک ایسے سٹور میں داخل ہوئے جہاں Sale-50% کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کی سیل یہاں سارا سال لگی رہتی ہے اور یہ صرف گاہکوں کو متوجہ کرنے کا ایک نفسیاتی حربہ ہے' حالانکہ گاہک اس سیل کی حقیقت کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔

میں نے پوچھا" پھر یہ حربہ کیسے ہوا؟"

زبیری بولے۔" بھائی یہی تو اس معاشرے کا کمال ہے۔ یہ خودفریبی کی وہ منزل ہے جس سے آگے شاید اور کچھ بھی نہیں۔ گاہک کو پتہ ہے کہ سارا سال رہنے والی یہ سیل صرف ایک دھوکا ہے۔ چیزوں کی قیمت مصنوعی طور پر بڑھانے کے بعد اسی اضافے کو ڈسکاؤنٹ کی شکل میں چھوڑ دیتے ہیں تاکہ گاہک اشیاء کو خوشدلی اور احساس فتح مندی کے ساتھ خریدے۔"

میں نے کہا۔" لیکن یہ کیسا راز ہے جس سے ہر شخص آشنا ہے۔ اس پر تو مجھے سکھوں کا وہ اشتہار یاد آرہا ہے جو انہوں نے اخبار میں چھپوایا تھا' جس کا مضمون کچھ یوں تھا کہ" فلاں فلاں خالصہ جماعت کا خفیہ اجلاس فلاں مقام پر کل رات آٹھ بجے منعقد ہوگا۔ تمام ممبران کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وقت مقررہ پر پہنچ جائیں۔ رازداری شرط ہے۔"

گفتگو مغربی معاشرے کی دانستہ اور باقاعدہ قسم کی خودفریبی سے چلتی ہوئی" رازداری" کے موضوع سے ٹکرائی تو ایک سدا روشن رہنے والا لطیفہ درمیان میں آگیا۔

روسی سراغ رساں ایجنسی کے جی بی کے ایک بہت نامور اور سینئر ایجنٹ کو برازیل میں حکم ملا کہ وہ پولینڈ کے فلاں فلاں گاؤں میں پہنچے اور وہاں کے مقامی ایجنٹ سمتھ سے کچھ ضروری کاغذات حاصل کرے۔ شناخت کوڈ اسے یہ بتایا گیا کہ تم اس سے پوچھو گے کہ آج کا دن بہت روشن ہے اور وہ کہے گا کہ ہاں یہ سارا ہفتہ ہی بہت اچھا رہا ہے۔

ایجنٹ ہوائی جہاز' ٹرینیں' سواریاں اور حلئے بدلتا ہوا متعلقہ گاؤں تک پہنچ گیا۔ دل میں حیران بھی تھا کہ اس سے اتنا لمبا سفر کروانے کی بجائے یہ کام کسی قریبی ایجنٹ سے کیوں نہیں کروایا گیا لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ شاید یہ معاملہ بہت اہم ہو۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ ایک بار میں داخل ہوا اور تھکے ہوئے مسافر کے انداز میں شراب طلب کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بارمین سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا اور اپنے آپ کو ایک سفری سیلز مین ظاہر کرتے ہوئے پوچھنے لگا کہ یہاں کوئی سمتھ نام کا آدمی رہتا ہے؟

بارمین نے بڑی لاپروائی سے بتایا کہ سمتھ نام کے تو اس گاؤں میں کئی آدمی ہیں۔ یہاں کے شیرف کا نام سمتھ ہے۔ ایک سمتھ

جنرل سٹور والا ہے' ایک پوسٹ آفس میں کام کرتا ہے' ایک بلیک سمتھ بھی سمتھ نام کا ہے اور تو اور خود بارمین کا اپنا نام بھی سمتھ ہے۔
اس پر ایجنٹ نے بڑے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھا اور کہا۔
''آج کا دن بہت روشن ہے۔''
بارمین نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور بڑی بے تکلفی سے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھا' اچھا...... تم سمتھ جاسوس کا پوچھ رہے ہو۔''

ایک سمارٹ سے ٹینگر ولڑکے نے میری کمر کا ماپ لیا۔ نتیجہ ۳۸ نکلا۔ میں نے بڑی حسرت سے چند برس پہلے تک ان دنوں کو یاد کیا جب میری کمر ۳۲ ہوا کرتی تھی اور ایک بار پھر وزن گھٹانے کے اس عہد کا اعادہ کیا جسے سن کر ہمیشہ میری بیوی ہنس دیا کرتی تھی۔ ایک پتلون پسند کی گئی۔ معلوم ہوا کہ لمبائی وغیرہ Adjust کرنے کے لیے پندرہ منٹ درکار ہوں گے۔ اختر آصف نے مشورہ دیا کہ امریکن پتلونوں کی سلائی اور Fitting وغیرہ اسی حساب سے کی جاتی ہے کہ پہننے والا اس کے ساتھ بیلٹ ضرور استعمال کرے سو ایک عدد بیلٹ بھی لے لیجیے۔ بیلٹیں دیکھی گئیں۔ نہایت عام اور معمولی قسم کی تھیں۔ میں نے یونہی ۳۸ انچ والی ایک بیلٹ پر ہاتھ رکھا اور قیمت کی سلپ پڑھی' ۳۲ ڈالر۔ فوراً اپنا دیسی حساب لگایا۔ سولہ ضرب بتیس۔ حاصل ضرب نکلا ۵۱۲ روپے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اس بیلٹ کی خصوصیت کیا ہے۔ کوئی بادشاہ یا جرنیل اسے استعمال کرتا رہا ہے یا کسی انعام یافتہ بل کی چمڑی اس میں استعمال ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی تاریخ' روایت یا متھ وابستہ ہے؟ پانچ سو بارہ روپے تو ہمارے یہاں بیلٹ باندھنے والے سپاہی یا چوکیداری کی ماہانہ تنخواہ ہوتی ہے۔ زبیری صاحب نے بتایا کہ چمڑے کی مصنوعات ان علاقوں میں بہت مہنگی ہیں کیونکہ یہ امپورٹ کیا جاتا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا' تمام بیلٹیں سیاہ اور براؤن چمڑے کی تھیں۔

بیلٹ خریدنے کے بارے میں میں نے فی البدیہہ کچھ دلائل دینے کی کوشش کی جو اگرچہ وزنی نہیں تھے مگر کام کر گئے۔ پتلون ملنے میں ابھی کچھ دیر تھی' سوچا پروین کو ساتھ لے لیں کیونکہ فلائٹ میں زیادہ ٹائم نہیں رہا تھا۔ اب جو پرندوں والی دکان پر پہنچے ہیں تو پروین بیگم کا دور دور تک پتا نہیں۔ سبزیوں والی دکان دیکھی۔ چند قوی ہیکل سبزیوں کو اٹھا اور ہلا جلا کر دیکھا۔ ایکوریم کے اندر اور آس پاس ڈھونڈا' بیوقوفوں کی طرح دکانوں کے درمیان کھلی جگہ پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھا مگر پروین سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ بہت پریشانی ہوئی۔ اجنبی ملک' غیر جگہ اور تنہا لڑکی' اوپر سے شاعرہ۔ جمال زبیری نے مشورہ دیا کہ اسٹور کے اندر اس نوع کی گمشدگی پر خصوصی اعلان کرایا جاتا ہے تاکہ گمشدہ' مرد' عورت یا بچہ' سٹور کی انتظامیہ سے رابطہ کرے اور یوں بچھڑے ہوئے مل جائیں مگر اس سے پہلے کہ اعلان On Air ہوتا' پروین نظر آ گئی۔ معلوم ہوا کہ موصوفہ جیولری والے حصے کی طرف چلی گئی تھیں اور وہاں مختلف

چیزوں سے اس قدر Fascinate ہوئیں کہ انہیں وقت اور ہماری تشویش کا اندازہ ہی نہیں رہا۔

مارامار کرتے اشفاق کے گھر پہنچے' ہماری تاخیر کی وجہ سے وہاں بھی Tension بڑھتے بڑھتے Panic کی حدوں کو چھونے والی تھی۔ ہمیں دیکھ کر سب نے اسی طرح کی مصنوعی خندہ پیشانی کا مظاہرہ کیا جو میزبان مہمان کے سامنے اس وقت کرتے ہیں جب مہمانوں کے بچے ان کے برتن اور قیمتی چیزیں توڑ پھوڑ رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے جملوں سے اگر "کوئی بات نہیں" "ایسا ہو جاتا ہے" "ابھی خاصا وقت ہے" "بس اب آپ جلدی سے تیار ہو جائیں" نکال دیا جائے تو باقی وہی کچھ بچتا ہے جس کی رپورٹ ایک انشورنس ایجنٹ نے اپنے افسر کو دی تھی۔ وہ قصہ کچھ یوں ہے۔

ایک انشورنس ایجنٹ سے اس کے باس نے پوچھا۔ "کہو بھئی' آج تم نے بارہ گاہکوں سے ملنا تھا...... ملے؟"

"جی ہاں' سب سے ملا" ایجنٹ نے جواب دیا۔

"کیا نتیجہ رہا؟ یعنی کیا کہا ان لوگوں نے؟"

"جو گالیاں انہوں نے دیں ان کے سمیت کہوں یا گالیاں حذف کر کے بیان کروں؟"

"گالیاں والیاں نکال کر بتاؤ بھئی" باس نے کہا۔

"پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا' جناب" جواب ملا۔

تمام اندازوں کے خلاف ہم وقت پر ائیر پورٹ پہنچ گئے اور بورڈنگ کارڈ وغیرہ لے لیے گئے تو عالی کا موڈ کچھ بحال ہوا۔ ابھی تک وہ ہماری تاخیر کے ردعمل کے طور پر ایک "خاموش احتجاج" کا رویہ اپنائے ہوئے تھے۔ اس تبدیلی میں کچھ نہ کچھ ہاتھ یقیناً ٹرانزٹ لاؤنج میں ان کی اس "ہم صوفہ" میم کا بھی تھا جو ہنستی تو اپنے ساتھی کی باتوں پر تھی لیکن گرتی بار بار عالی کے کندھے پر تھی۔ جی چاہا کہ ایسے کسی لمحے کی تصویر اتار لوں۔ کیمرہ بھی ہاتھ میں تھا مگر پھر خیال آیا کہ کراچی ائیر پورٹ پر مسز عالی یعنی طیبہ بھابھی نے کس اعتماد سے ساتھ کہا تھا۔ "لو میاں' میرا میاں تمہارے حوالے ہے۔" یہ تصویر انہوں نے دیکھ لی تو عالی کے ساتھ ساتھ ہمارا بھرم بھی جاتا رہے گا۔

جہاز میں میں نے عالی کو اپنی اس "ناکردہ" شرارت کے بارے میں بتایا تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے بالکل مناسب فیصلہ کیا برخوردار' میری بیوی تو چالیس برس سے میرے ساتھ رہ رہی ہے اور اسے میری بدمعاشیوں

سے نباہ کرنے کا بھی کم وبیش اتنا ہی طویل تجربہ ہے' البتہ آپ کی بیگم کو جو رپورٹیں میں دوں گا ان کے نتائج......''

عالی جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرائے' میں نے جلدی سے کہا۔

OK, OK, You no tell, I no tell.

بولے ''میاں' یہ کہاں کی انگریزی ہے؟''

میں نے کہا'' پیرو مرشد' اس اجمال کی تفصیل سے ایک عدد لطیفہ منتھی ہے' طبیعت ہو تو عرض کروں؟''

افریقہ کے ایک بہت دور دراز کے قبیلے میں ایک سفید فام بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ سردار نے نیزہ پکڑا اور سیدھا مقامی مشنری کے گھر پہنچ گیا۔ پادری صاحب نے بہتیرے ہاتھ پاؤں جوڑے' خدا کی قدرت کے حوالے اور اپنے نردوش ہونے کی دہائی دی مگر سردار نے ایک نہ سنی۔ اس کی ایک ہی دلیل تھی۔ ''اس علاقے میں کئی کئی سو میل کے دائرے میں تمہارے علاوہ کوئی سفید فام آدمی نہیں' لہٰذا اور کوئی اس بچے کا باپ نہیں ہو سکتا۔''

اچانک پادری کی نظر بھیڑوں کے ایک ریوڑ پر پڑی۔ اس نے سردار کو نیزہ چلانے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو' وہ سامنے بھیڑوں کا ریوڑ ہے۔ ساری بھیڑیں سفید رنگ کی ہیں' صرف ایک کالی ہے۔ آخر یہ کیسے پیدا ہو گئی؟''

سردار نے گھبرا کر پادری کی طرف دیکھا' پھر بڑے رازدارانہ انداز میں بولا۔

OK, OK, You no tell, I no tell.

پروین نے جو ہمیں بے طرح ہنستے دیکھا تو سر ہو گئی کہ مجھے بھی بتایئے کہ کس بات پر اتنا ہنسا جا رہا ہے۔ میں نے مختلف حیلوں بہانوں سے بات ٹالنے کی کوشش کی مگر بات نہیں بنی۔ میں نے امداد طلب نظروں سے عالی کی طرف دیکھا' مسوڑھوں پر انگلی پھیر کر بولے۔ You no tell, I no tell

اب تو پروین سچ مچ ناراض ہو گئی۔ میں نے حسب معمول سامان رکھنے میں اس کی مدد کرنا چاہی مگر اس نے احتجاجاً اس شولڈر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عالی کچھ دیر یہ منظر دلچسپی سے دیکھتے رہے' پھر بولے۔ ''بھئی عزیزہ' بات اصل میں یہ ہے کہ لطیفے کا Content کچھ مردانہ نوعیت کا ہے' یہ بیچارہ تمہیں سناتے ہوئے جھینپ رہا ہے۔ سنا میں بھی نہیں پاؤں گا' کہو تو لکھ کر دے دوں۔''

بات پروین کی سمجھ میں آ گئی' اس لیے وہیں ختم ہو گئی۔ دو تین ائیر ہوسٹس چیلوں کی طرح ہماری طرف لپکیں اور اطلاع دی کہ ہمارے لیے کوشیر میٹ کا انتظام ہو چکا ہے۔ جعفری صاحب نے ہم سب کی ترجمانی کرتے ہوئے نعرۂ احتجاج بلند کیا اور نسبتاً زیادہ معمر

چیل کو بتایا کہ ایئر کینیڈا کی ہر فلائیٹ میں انتہائی بدمزہ ذبیحہ دیا جاتا ہے' اس لیے یا تو اپنا ریگولر کھانا دو یا بالکل نہ دو۔ چیل نمبر ۲' جو نمبر ایک سے بدصورتی میں کچھ زیادہ اور عمر میں کچھ کم تھی' لہرا کر بولی۔ ''مگر آپ لوگوں نے تو اس کے لیے خاص انسٹرکشن لکھوائی ہوئی ہے۔''

عالی بولے۔ ''یار یہ انسٹرکشن تو اپنے تھانوں کی ایف آئی آر سے بھی بڑھ گئی ہے۔ سالی کو لاکھ واپس لیتے ہیں مگر کارروائی ختم ہی نہیں ہوتی۔''

بڑی مشکلوں سے چیلوں کے اس ہراول دستے کو سمجھایا گیا کہ ریگولر خوراک میں جتنی پورک فری چیزیں ہیں وہ ہمیں لادیں کیونکہ کوشیر ہم بہرحال نہیں کھائیں گے۔ چیلیں کچھ نارضامندی کے عالم میں ''اوکے سر'' کہہ کر آگے بڑھیں تو جعفری صاحب نے میرے کان میں کہا۔ ''یہ تو خود بھی کوشیر سے کم نہیں۔''

◆◆◆

کیلگری

اب پتا نہیں یہ موسم کا اثر تھا یا ہوائی جہاز بھی ہماری طرح باذوق تھا کیونکہ پہلی بار فلائٹ منزل مقصود پر پندرہ منٹ تاخیر سے پہنچی۔ کینیڈا کی وسعت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ چار گھنٹے کی فلائیٹ میں دو گھنٹے Time Difference تھا یعنی ہماری گھڑیوں پر تین بجے تھے اور کیلگری میں پانچ بج رہے تھے۔ ائیر پورٹ پر اقبال حیدر اور حسن ظہیر کے ساتھ ساتھ حد نظر تک پھیلی ہوئی برف ہماری منتظر تھی۔ میں نے زندگی میں اتنی برف پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

کیلگری کا علاقہ تیل کی پیداوار کے لیے بے حد مشہور ہے۔ وہاں کی معیشت کا دار و مدار بھی تیل' اس کی مصنوعات اور ریفائنریوں پر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ انٹرمیڈیٹ کی کتاب میں آفتاب حسن کا جو مضمون ''پٹرولیم'' عرصہ دس برس سے لڑکوں کا پڑھا رہے ہیں اس میں تو تیل کے لیے مسام دار چٹانوں اور ریتلی سطح زمین کو لازمی بتایا گیا ہے یہ برف میں ''کالا سونا'' کہاں سے آ گیا؟

ائیر پورٹ سے شہر جاتے وقت بے آباد سڑک کے دونوں طرف حد نظر تک برف ہی برف تھی۔ ہمارے میزبان حسن ظہیر جو خود بھی آئل کمپنی میں انجینیر تھے' ہمیں اس علاقے کے بارے میں بتا رہے تھے مگر میرا ذہن ابھی تک برف میں تیل کی پراسرار گتھی میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی کم علمی بلکہ لاعلمی چھپانے کے لیے خوب چکر دے کر باتوں باتوں میں حسن ظہیر سے یہی سوال کیا تو اس مرد شریف نے زمین کی جیالوجیکل حالتوں کے بارے میں ایک ایسا لیکچر شروع کر دیا کہ میں تو خیر سائنس میں تھا ہی کورا' عالی بھی' جو عام حالات میں کسی موضوع میں بند نہیں ہوتے ''ہاں' ہوں'' سے آگے نہ بڑھ سکے۔ حسن ظہیر کو شاید اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کی گفتگو ضرورت سے کچھ زیادہ ٹیکنیکل ہو رہی ہے چنانچہ اس نے لیکچر ادھورا چھوڑ کر ہم سے ہمارے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ مگر پتا نہیں کیسے بات ہم سے چلتی ہوئی شاعری اور پھر صحرائے نجد کا چکر کاٹتی ہوئی دوبارہ پٹرول تک پہنچ گئی۔ اب اب مجھ سے نہیں رہا گیا' میں نے فوراً صوفی تبسم مرحوم سے متعلق ایک مشہور واقعہ داغ دیا کہ اس میں پٹرول کا ذکر جس ڈھب سے آیا ہے شاید اور کہیں نہ آیا ہو۔

صوفی صاحب عالم سرور میں تانگے پر سوار ریڈیو اسٹیشن جا رہے تھے۔ واقعی لیٹ تھے یا نہیں اس کا وہم ہو گیا تھا۔ بہرحال

سنت نگر سے لکشمی چوک تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے کوئی بیس مرتبہ تانگے والے کو تیز چلانے کے لیے کہا۔ تانگے والا بھی یکے از زندہ دلان لاہور تھا، تانگے کو سیدھا ایبٹ روڈ کے چوک میں واقع پٹرول پمپ پر لے گیا اور گھوڑے کی دم اٹھا کر ششدر کھڑے پٹرول پمپ والے سے طنزاً کہا۔ ''ایہدے وچ دو گیلن پٹرول پادے، ایس بابے نوں بڑی جلدی اے۔''

حسن ظہیر کے گھر پر ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ خاتون خانہ بیگم حسن ظہیر اور پروین پہلے تو چند لمحے ایک دوسرے کو اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں جیسے ان کی ''ہتھ جوڑی'' ہونے والی ہو اور پھر ایک نعرۂ مستانہ بلند کر کے ایک دوسرے پر جھپٹ (معاف کیجیے) لپٹ پڑیں۔ حسن ظہیر اپنی مونچھوں کے سائے سائے مسکرا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کی بیگم نرجس اور پروین کراچی میں پندرہ برس ایک دوسری کی ہمسائی اور سہیلی رہی ہیں اور یہ گویا پروین کو Pleasant Surprise دینے کا منصوبہ تھا۔ تھوڑی دیر میں یہ خوشگوار حیرت ان دو خواتین تک محدود ہو کر رہ گئی کیونکہ انہوں نے اس شدت سے اپنے مشترکہ بچپن اور لڑکپن (لڑکیوں کے لیے شاید ''لڑکی پن'' لکھتے ہیں) کی حماقتوں وغیرہ کو یاد کرنا شروع کیا کہ آدھ گھنٹے تک ان کی گفتگو میں کہیں کاما یا فل اسٹاپ نہیں آیا۔

تنگ آ کر حسن ظہیر نے چلتی گفتگو میں ایک استفہامیہ (!) لڑھکا دیا۔ ''کچھ چائے وغیرہ کا انتظام ہے بیگم!''

''آپ بنا دیجیے نا حسن، پلیز دیکھیے ہم کتنے برسوں بعد ملی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی، دوبارہ نہ ٹوکنا ورنہ کھانا بھی پکانا پڑے گا۔''

فون کی گھنٹی بجی، حسن نے فون اٹھایا اور کسی صاحب کو بتایا کہ عالی صاحب، اقبال حیدر کی طرف ٹھہرے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عالی کے کوئی دور کے عزیز ہیں اور کئی دنوں سے منتظمین سے اصرار کر رہے تھے کہ عالی کو ان کی طرف ٹھہرایا جائے جب کہ منتظمین اپنے حق میزبانی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ میں نے سوچا یہ مشاعرہ بھی عجیب انسٹی ٹیوشن ہے جہاں جاتا ہے اپنی ساری اچھی بری روایتیں ساتھ لے کر جاتا ہے۔

رات کے کھانے پر اقبال حیدر کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ عالی کے مذکورہ عزیز سعید کمال نہ صرف سامان سمیت انہیں اپنی طرف لے جا چکے ہیں بلکہ اب مسلسل ٹیلیفونوں کے باوجود انہیں نیند سے جگانے میں لیت و لعل کر رہے ہیں کیونکہ انہیں اپنے مہمان عزیز کا آرام سب سے مقدم ہے۔

کسی نے آواز لگائی۔ ''بھئی انہیں کہو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

میں نے خالی ڈائننگ ٹیبل اور کھڑکی سے باہر مسلسل ہونے والی برفباری کی طرف دیکھا اور سوچا اتنے برس یہاں کے موسموں

میں رہنے کے باوجود بھی یہ لوگ اپنی چھوڑی ہوئی تہذیب کے سکہ بند Expressions سے باہر نہیں آ سکے۔ اقبال حیدر اس کڑکڑاتی ہوئی سردی میں نہ صرف محض ایک قمیص پتلون پہنے پھر رہے ہیں بلکہ ازراہ احتیاط قمیص کے تین چار بٹن بھی کھول رکھے تھے۔ میں نے پوچھا۔" بھائی آپ پاکستان میں ٹی وی سٹار تو نہیں ہوتے تھے؟"

بولے "نہیں"

" کوئی خاندانی تعلق لکھنو کے بانکوں وغیرہ سے؟"

اس بار اس کے نفی میں سر ہلانے میں ایک پرزور احتجاج بھی شامل تھا۔ میں نے کہا۔" بھائی اگر یہ دونوں باتیں نہیں تو اس عبرت ناک سردی میں یہ مظاہرہ تن سازی یا" بانکپن" کی نمائش کیوں کر رہے ہو؟ تمہیں دیکھ دیکھ کر خواہ مخواہ ہماری روح کانپ رہی ہے۔"

اقبال حیدر نے اس کے جواب میں" عادی" اور" مانوس" ہو جانے کے بعد چیزوں کی شدت میں ظہور پذیر ہونے والی محسوساتی اور نفسیاتی کمی کا حوالہ دیا مگر ان کے دلائل سے مہمانوں نے تو کیا خود ان کے گھر والوں نے بھی اتفاق نہیں کیا۔ جب انہیں حاضرین کی طرف سے اپنی دلیل کی متفقہ مخالفت کا احساس ہوا تو انہوں نے ایک اچھے سپورٹس مین کی طرح اپنی شکست کا اعتراف کیا اور قمیض کا ایک بٹن بند کر لیا۔

ہمارے بچپن میں بعض رسالوں میں ایک موٹے اور پتلے آدمی کی تصویریں ساتھ ساتھ چھپا کرتی تھیں جن کے ساتھ کسی ٹانک کا اشتہار ہوتا تھا کہ" استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد" آج کل کی یہی تصویریں" سلمنگ پارلرز" کے حوالوں سے دوبارہ دکھائی دے رہی ہیں لیکن اس صورت حال کا جو روپ ہم نے کیلگری کی یخ بستہ رات میں دیکھا وہ سب سے انوکھا اور دلچسپ تھا۔ کمرے میں پہلے عالی داخل ہوئے۔ بہت سے کپڑوں کے اوپر انہوں نے اپنا مشہور روسی اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور ان کا مجموعی پھیلاؤ دروازے کی وسعت سے وہی شکوہ کر رہا تھا جو غالب کو" ظرف تنگنائے غزل" سے تھا۔ اور ان سے دو قدم پیچھے سعید کمال تھے۔ خوش لباس، خوش نما، نفیس، شستہ اور نستعلیق مگر جسامت ایسی کہ پھونک مارو تو ولرز جائیں۔ میں نے عالی کے کان میں اپنے اس تقابلی جائزے کے بارے میں سرگوشی کی تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا۔

" مغل سلطنت کے زوال کے بہت سے اسباب ابھی تاریخ دانوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ جسمانی صحت کی کمی بھی ان میں سے ایک ہے۔"

اس پر میں نے انہیں ایک مشہور سیاسی لیڈر کی ایک تصویر یاد دلائی جس میں انہیں کسی الیکشن کے لیے کاغذات نامزدگی داخل

کرنے کے لیے جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ تصویر میں دو شخص ان کی کمر اور بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر انہیں کار سے اترنے میں سہارا دے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''یہ تصویر دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا عروج وزوال مجسم ہو گیا ہو۔''

عالی نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

میں نے کہا۔ ''ظہیر الدین بابر جب ہندوستان کا بادشاہ بنا تو وہ قلعے کی دیوار پر دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر دوڑا کرتا تھا اور ایک ہمارے آج کے رہنما ہیں جنہیں دو آدمی بغل میں ہاتھ دے کر اٹھاتے بٹھاتے ہیں۔''

اگلے روز اردو کانفرنس تھی۔ کینیڈا کے مختلف علاقوں سے دانشور اور پروفیسر حضرات آ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہم چاروں کو بھی اظہار خیال کرنا ہوگا۔ مقررین کی فہرست دیکھی تو وہ دوسری دہائی کے نصف سے آگے کی طرف رواں تھی۔ میں نے مشورہ دیا کہ اتنے زیادہ لوگ بولیں گے تو بوریت ہو جائے گی' لوگ تھک کر جمائیاں لینے لگیں گے اور بار بار کی تکرار سے کانفرنس کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ مزید رعب ڈالنے کے لیے میں نے اپنی آرٹ کونسل کی ملازمت کے تجربے کا حوالہ دیا اور بتایا کہ مقررین کی تعداد میں انقلابی نوعیت کی تخفیف انتہائی ضروری ہے۔ میری اس ساری فاضلانہ (فاضل کا ایک مطلب فالتو بھی تو ہوتا ہے) بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں تقریر سے بچ گیا۔

واپسی پر پروین نے کہا۔ ''آپ نے اپنا نام کیوں کٹوا یا' رہنے دیتے۔ جہاں انیس لوگ بولیں گے وہاں بیسویں سے کیا فرق پڑ جائے گا؟''

میں نے کہا۔ ''یہاں انیس بیس کا فرق ہی تو اصل بات ہے بابا۔ تم لوگ سب وہاں ''انگریزیاں'' جھاڑو گے اور میری انگریزی ذرا مست ملنگ قسم کی ہے۔ تلفظ تو ان علاقوں میں ہر طرح کا چل جاتا ہے مگر یہ جو انگریزی گرائمر سے میرے ذاتی اور نظریاتی اختلافات ہیں ان کو میں ''پبلک'' نہیں کرنا چاہتا۔''

بولی۔ ''چلیں ٹھیک ہے مگر آپ چونکہ اردو کے استاد اور نقاد وغیرہ وغیرہ ہیں اس لیے میری مدد کریں کیونکہ مجھے تاریخی اعتبار سے اردو شاعری' شعری رویوں اور تحریکوں وغیرہ کا مکمل علم نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ ن م راشد ترقی پسند تحریک سے متعلق تھے یا حلقہ ارباب ذوق سے؟ انتظار حسین علامت پسند ہیں یا ملامت پسند؟

آستانہ انشائیہ کی سجادہ نشینی پر جھگڑا کیوں اور کب شروع ہوا؟ اور یہ کہ اگر اس کے ''بانی'' یا ''موجد'' کا فیصلہ ہو بھی گیا تو اس سے متعلقہ اصحاب کو کیا فائدہ ہوگا کیونکہ ایسی باتیں تو بتانے کی بجائے چھپانے کی ہوتی ہیں؟

میں نے کہا۔ ''راشد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ''اردو شاعری کے جدید رویے'' جو تمہارا موضوع ہے' راشد کے ذکر کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا مگر یہ انتظار حسین اور انشائیہ بیچ میں کہاں سے آگئے؟''

''دراصل میرا خیال تھا کہ ابتدا میں پورے ادبی منظر کا ایک مختصر سا تعارف کراؤں اور اس کے بعد.......''

''ہتھ ہولا رکھو بی بی' تم سول سروس میں تو آ گئی ہو مگر ابھی تک تمہارے دماغ سے وہ ''بوئے شاہ جہانی'' نہیں گئی۔ موقع ملتے ہی لیکچر کی تیاری شروع کر دیتی ہو۔ چھ سات منٹ کا ایک مختصر سا تعارفی مضمون گھسیٹو اللہ...... اللہ....... خیر سلا۔''

''مختصر لکھنا ہی تو زیادہ مشکل ہے۔''

''اب تم زیادہ مولانا محمد علی جوہر بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم اس عہد کی سب سے ممتاز' منفرد اور مشہور شاعرہ ہو' ڈبل ڈبل ایم اے ہو۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب پر تمہاری گہری نظر ہے۔ تمہیں کون سی ڈاکٹر سید عبداللہ یا جمیل جالبی صاحب کے سامنے تقریر کرنی ہے جو اتنی تفصیلات میں جا رہی ہو؟''

''آپ کا یہ داؤ مجھ پر نہیں چلے گا۔ اقبال حیدر وغیرہ کو تو آپ نے چکر دے کر اپنی گردن چھڑا لی ہے مگر میں اس ڈرامے کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ آپ سیدھی طرح بیٹھ جائیں اور جو سوالات میں پوچھوں ان کے جواب دیتے جائیں۔''

جس تفصیل سے اس نے سوالات کئے اور نوٹس لیے اور پھر اگلا سارا دن بیٹھ کر مضمون لکھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ تعلیمی میدان میں اس کی کامیابی کا اصل راز اس کی یہی محنت اور لگن ہے۔ اس نے اپنے اندر کے طالب علم میں ''علم کی طلب'' کو ہمیشہ زندہ اور مستعد رکھا ہے۔ سعید کمال اور عالی دوپہر کے کھانے کے لیے ہمیں لینے آئے' پروین کا مضمون ابھی جاری تھا۔ عالی بولے ''فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے۔ دل یا شکم؟''

پروین بولی۔ ''میرا ووٹ دل کی طرف ہے۔''

''سوچ لو اس علاقے کی ٹراؤٹ مچھلی پوری دنیا میں مشہور ہے۔'' عالی نے لالچ دیا۔

پروین نے چند لمحے متذبذب نظروں سے اردگرد بکھرے ہوئے کاغذات کی طرف دیکھا اور پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''آج تو مضمون ہی چلے گا۔''

ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ کر نکلے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ پتا چلا کہ یہ بارش ڈرائیونگ کے لیے بہت خطرناک ہے کیونکہ اس سے پیدا ہونے والے برفانی کیچڑ پر جو "بلیک آئس" کہلاتا ہے' اگر گاڑی سکڈ کر جائے تو معاملہ دست و پا شکستن تک پہنچنے میں زیادہ تکلف نہیں کرتا۔

میں مچھلی بالکل نہیں کھاتا' اس لیے میں نے مینو کارڈ میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے لیے بیف اسٹیک منگوالی کہ اس سے کم مشکوک اور قابل قبول اور کوئی چیز اس ہوٹل میں موجود نہیں تھی اور اگر تھی تو بہر حال مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد عالی اور سعید کمال کی ٹراؤٹ بھی آ گئی۔ مچھلیوں کی اقسام سے ناواقفیت کے باوجود اتنا آئیڈیا مجھے تھا کہ ٹراؤٹ وہیل اور شارک سے بہر حال مختلف ہوتی ہوگی۔ اپنی دیسی "رہو" اور "ملی" سے اس کا مختلف ہونا بھی سمجھ میں آتا تھا کہ اگر یہ ایسی ہی گری پڑی اور عام سی مچھلی ہوتی تو لوگ اس کا ذکر اتنے اہتمام سے اپنی گفتگو اور سفرناموں میں کیوں کرتے (جیسا کہ میں اس وقت کر رہا ہوں) لیکن یہ بھی خیال نہیں تھا کہ یہ سات آٹھ انچ کی ایک چپٹی سی چیز ہوگی جسے دیکھ کر وہ سکے یاد آتے ہیں جو بچپن میں ہم ریل کی پٹڑی پر رکھ دیتے تھے اور ریل کا بوجھ انہیں پھیلا کر چپٹا کر دیتا تھا۔ عالی اور سعید کمال ٹراؤٹ کی ہسٹری اور فضائل بیان کر رہے تھے اور میں اورنج جوس کے ساتھ اس بے مزہ اور ادھ پکی اسٹیک کو نگلنے کی تگ و دو میں تھا جو یقیناً کسی ایسے لڑاکا بیل کے باقیات میں سے تھا جسے اس کی مرضی کے خلاف وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا تھا۔

کانفرنس میں مہمان خصوصی کے طور پر شہر کیلگری کی ممبر پارلیمنٹ اور اقلیتوں کے مسائل سے متعلق قومی کمیٹی کی رکن ایک خاتون کو مدعو کیا گیا تھا جس کا نام تو مجھے بھول گیا ہے مگر اس کی تقریر کا ایک جملہ میرے دل پر نقش ہے۔ اس نے کہا۔ "یہ میرے وطن اور قوم کے لیے انتہائی عزت کا مقام ہے کہ آپ نے مجھے اپنی اس کانفرنس میں شرکت کا موقع دیا۔" اس طرح کے جملے بولنا اول تو ہمارے ہاں کے وزیر اور افسران بالا ویسے ہی کسر شان سمجھتے ہیں لیکن اگر کسی وجہ سے انہیں ایسی بات کہنا پڑ جائے تو کچھ اس ادا سے کہتے ہیں کہ نظام رامپوری کا مشہور شعر ذہن میں کوند کوند جاتا ہے۔

دینا کسی کا ساغر مے یاد ہے نظام
منہ پھیر کے ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

اس بی بی نے جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کیں' جس صبر اور دلچسپی کے ساتھ چار گھنٹے تقریریں سنیں اور جس مسکراہٹ اور شدت کے ساتھ ہر مقرر کو زور زور سے تالیاں بجا کر داد دی اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ محض اپنی سرکاری ڈیوٹی کے طور پر اقلیتوں

کا ایک فنکشن ' بھگتانے '' نہیں آئی بلکہ اس اعتماد کی امین اور نمائندہ ہے جو عوام نے اپنے ووٹوں کی شکل میں اسے دیا تھا۔ تقریب کے بعد اس سے گفتگو ہوئی تو اس یقین کو مزید تقویت ملی کہ جمہوریت ایک ایسی رنگا رنگ جیلی ہے جو جس طرح کے معاشرے کے برتن میں ڈالی جائے اسی طرح کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور تو اور یہ تو مارشل لاء کے ساتھ مل کر مکسڈ ڈبلز کھیلنے پر بھی تیار ہو جاتی ہے۔

تقریریں تو اس محفل میں بہت سی ہوئیں لیکن پاکستان کے ایک سابق سفیر محمد یونس اور ہمارے بزرگ شریک سفر علی سردار جعفری کی تقریریں خاص طور سے سننے کی چیز تھیں۔ جعفری صاحب کا کمال یہ ہے کہ دنیا کوئی موضوع ہو وہ گھما پھرا کر انڈیا' نہرو اور روس براستہ ازبکستان و سمرقند کا ذکر ضرور لے آتے ہیں۔ سو یہاں بھی انہوں نے اردو کے حوالے سے اپنے تینوں محبوب حوالے دیئے اور خوب دیئے۔

محمد یونس صاحب سوئٹزرلینڈ اور چین میں پاکستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔ بڑے چست و چالاک' گلے میں سکارف' میل جول میں گرمجوشی اور تقریر میں ایک اچھے سفارتکار کی جملہ خوبیاں کہ ہر جملہ بڑا نپا تلا' پر تپاک اور نک سک سے درست مگر آخر تک پتا نہیں چل پاتا کہ موصوف اصل میں کہنا کیا چاہتے ہیں؟

تقریب کے دوران چائے کا وقفہ ہوا جس میں اپنی مدد آپ کے تحت سب نے کاغذی گلاسوں میں چائے پی۔ ایک خاتون نے جو بلاشبہ Lady of the Night تھیں' اپنی صورت سے بھی زیادہ حسین مسکراہٹ کے ساتھ جس تھرمس سے اپنے لیے بھرا ہوا چائے کا کپ میری طرف بڑھا دیا تو میں نے بھی اخلاقاً ان کا مزاج وغیرہ پوچھ لیا۔ خلاف توقع اس جدید انداز کی زنانہ شرٹ پتلون' فیشنی بالوں اور خطرناک حد تک حسین چہرے کے پیچھے سے لاہور کی اصلی تے وڈی پنجابن نکل آئی۔ اب مسئلہ چونکہ اخلاقیات اور جمالیات کی حدوں سے نکل کر شہرداری کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا اس لیے ہم دونوں ایک طرف ہو کر باتیں کرنے لگے۔ ابھی چند ہی باتیں کی تھیں کہ پروین کسی طرف سے نمودار ہوئی اور اس نے بتایا کہ چائے کا وقفہ ختم ہونے کے بعد جلسے کو دوبارہ شروع ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ میں نے حیرت سے کبھی اس کو اور کبھی ''اس'' کو دیکھا جس کے بارے میں غالب نے تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے کہا تھا۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

تقریب کے بعد واپسی پر پروین نے مختلف اشاروں کنایوں سے مجھے کارز کرنے کی کوشش کی مگر جب میں نے پروں پر پانی

نہیں پڑنے دیا تو تنگ آ کر اس نے براہ راست حملہ کر دیا۔

''امجد بھائی! وہ خاتون کون تھی؟''

''کون؟''

''وہ جسے آپ اپنا فون نمبر دے رہے تھے۔''

''وہ...... وہ تو...... بقول منیر نیازی...... یکے از مداحین......''

''کس کا کون مداح؟ میں سمجھی نہیں۔''

''ارے بھئی کچھ نہیں۔ بس وہ کچھ میری کتابوں وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ بڑی خوش ذوق بی بی تھی۔''

''صورت بھی اچھی تھی۔''

''ہاں وہ...... میں نے دراصل غور سے دیکھا نہیں۔''

''اچھا...... ابھی غور سے نہیں دیکھا؟''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''کچھ نہیں...... ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ اچھا یہ بتائیں کہ وہ اپنے راولپنڈی کے شاعر...... وہ جو بڑی مزیدار پنجابی نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ کیا نام ہے ان کا؟''

''انور مسعود''

''ہاں...... وہ کیا قطعہ پڑھا کرتے ہیں اکثر مشاعروں میں' آپ کو بھی بہت پسند ہے! وہ جس میں کچھ یوں ہے کہ دیکھیے کچھ محتاط ہی رہیے اس جاسوس زمانے سے۔''

''وہ'' میں نے کہا۔ ''یاد ہے مجھ کو' سناؤں؟''

لوگ تو رہتے ہیں ہر لمحے ٹوہ میں ایسی باتوں کے
پیار محبت کے ہیں دشمن' دل کے ایسے کالے ہیں
دیکھئے کچھ محتاط ہی رہیے اس جاسوس زمانے سے
میں بھی بچوں والی ہوں اور آپ بھی بچوں والے ہیں

اگرچہ قطعہ شروع کرتے ہی مجھے اس کی شرارت کا احساس ہو گیا تھا پھر بھی میں ڈھیٹ بن کر ''انجان بننے'' کی ایکٹنگ کرتا رہا مگر وہ کب بخشنے والی تھی، کہنے لگی۔

''باقی باتیں تو میں پاکستان پہنچ کر بھابی سے کروں گی' آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس بی بی کا بڑا بچہ سولہ برس کا ہے۔''

''نہیں!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا اس کی شادی چھ برس کی عمر میں ہوئی تھی؟''

چوری تو پکڑی ہی جا چکی تھی اس لیے میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ ''بھئی سچی بات یہ ہے کہ مجھے وہ واقعی بہت اچھی لگی تھی لیکن یقین نہیں آتا کہ....... یعنی سولہ برس کا بچہ....... گویا' بھئی بہت Maintain کیا ہے اس بی بی نے خود کو۔''

وہ بات آئی گئی ہوگئی مگر میں اب بھی سوچتا ہوں کہ ہمارے یہاں عورتیں چہروں پر تو میک اپ کے کوٹ در کوٹ کے رکھتی ہیں لیکن جسمانی صحت اور فیشن کا شعور بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔

جب سے ہم نے کیلگری کی زمین (برف) پر قدم رکھا تھا ایک لفظ بار بار سن رہے تھے Banff (بینف)۔ لکھنے میں تو اس کے درمیان N اردو کے نون کی طرح آتا ہے مگر بولنے میں نہ صرف نون غنہ ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ہلکی سی میم کی ملاوٹ بھی ہو جاتی ہے یعنی اسے ''بے نف'' کی بجائے ''بیمف'' تلفظ کیا جائے۔ ہمارے میزبانوں کے نزدیک کیلگری آ کر بیمف (Banff) نہ دیکھنا ایسے ہی تھا جیسے کوئی شخص آگرہ جائے اور تاج محل نہ دیکھے۔ معلوم ہوا کہ یہ کیلگری سے کوئی ستر میل دور ایک پرفضا پہاڑی تفریحی مقام ہے جہاں دنیا بھر سے سیاح سال کے ہر حصے میں آتے رہتے ہیں۔ میں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی برف پر نظر ڈالی اور اقبال حیدر سے پوچھا کہ پہاڑ پر تو لوگ گرمیوں میں جاتے ہیں' ہماری تو یہاں قلفی یا شاید قفلی جم رہی ہے' وہاں جا کر ہم کیا کریں گے۔ اس مرد گریباں چاک نے بڑی مشکلوں سے بند کروایا ہوا قمیض کا پانچواں بٹن دوبارہ کھولتے ہوئے بتایا کہ یہاں موسموں کا وہ تصور نہیں جو ہمارے یہاں ہے۔ یہاں موسم کا اندازہ برف کی مقدار میں کمی بیشی سے ہوتا ہے۔

اردو کانفرنس سے واپسی پر رات ڈھائی بجے کھانا کھاتے ہوئے یہ طے پایا کہ صبح Banff کا چکر لگایا جائے گا اور دس بجے یہ قافلہ روانہ ہوگا۔ کوئی ساڑھے دس بجے حسن ظہیر نے مجھے جگایا اور جمائیاں لیتے ہوئے بتایا کہ عالی صاحب Banff کے پروگرام سے بیک آؤٹ کر گئے ہیں اور اقبال حیدر اب صرف جعفری صاحب کو لے کر ہماری طرف آ رہا ہے۔ اتنے میں مسز جس حسن ظہیر نے آ کر اطلاع دی کہ پروین بیگم تین کمبل اوڑھ کر لیٹی ہوئی ہیں اور ان کا کوئی ارادہ کہیں جانے کا نہیں ہے۔ میں نے عالی جی کو فون پر اور پروین کو بالمشافہ حوصلہ دینے کی بہت کوشش کی مگر وہ دونوں تصوف کی اس منزل پر تھے جہاں دنیا کی بڑی بڑی چیزیں بہت چھوٹی

چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔

بالآخر کوئی ساڑھے بارہ بجے اقبال حیدر، ان کے بہنوئی (جن کا نام غالباً شفیق تھا) ڈاکٹر خالد سہیل، علی سردار جعفری، حسن ظہیر اور مجھ پر مشتمل یہ چھ رکنی قافلہ دو موٹروں پر عازم Banff ہوا۔ میں اور ڈاکٹر خالد سہیل، اقبال کی گاڑی میں تھے۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی مگر بے حد ہموار اور عمدہ حالت میں تھی۔ دور دور تک آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ مجھے یہاں دوبئی سے ابوظہبی تک براستہ سڑک سفر بہت یاد آیا، فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں سڑک کے دونوں طرف حدِ نگاہ تک جلی ہوئی زرد اور بھربھری زمین تھی اور یہاں برف ہی برف۔

Banff سے دو تین میل ادھر تک ایک بہت بڑی جھیل تھی جس کا سبزی مائل پانی چاروں طرف پھیلی ہوئی برف میں کسی اور ہی دنیا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہاں موٹریں روک کر فوٹو گرافی کی گئی۔ پتا نہیں کس طرح بات اردو شاعری میں ''برف'' کے ذکر تک پہنچ گئی۔ بہت سے شعر سنائے گئے مگر اتفاق رائے سے مصحفی کے اس شعر کو بہترین قرار دیا گیا۔

سوئے نجد جی کا یہ قافلہ، عجب اس کا کیا جو چلا نہیں
کہ ہوائے شدت برف ہے، ابھی قافلے کی ہوا نہیں

ڈاکٹر خالد سہیل اپنے عارف عبدالمتین صاحب کا بھتیجا نکلا۔ اس کم عمری میں اس نے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کرنے کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی نام اور مقام پیدا کیا ہے۔ اگرچہ پروین کو اس کی داڑھی اور سپورٹس گاڑی میں کئی نفسیاتی تضادات نظر آتے تھے مگر مجھے وہ ایک تخلیقی ذہن کا، اپنوں کی محبت کا ترسا ہوا ایسا نوجوان لگا، جو مشرق و مغرب کے تہذیبی بعد میں اپنی شناخت ڈھونڈ رہا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

اقبال حیدر نے گزشتہ رات مشاعرے میں بھی اچھی نظم سنائی تھی اور اس سفر کے دوران بھی اس نے چند بہت اچھے شعر سنائے۔ خالد سہیل کو میں اس سے پہلے بھی سن چکا تھا لیکن یہ شاید اس پکنک کے موڈ کا اثر تھا کہ اس نے بھی غیر معمولی طور پر اچھی غزل سنائی۔

بینف ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ ہے۔ یہاں بھی سوات، نتھیا گلی، کالام وغیرہ کی طرح ایک مرکزی بازار ہر مرض کی دوا تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ بازار اور اس کی ملحقہ چند چھوٹی سڑکوں پر جدید زندگی کی ہر سہولت اور تفریح موجود تھی۔ طے پایا کہ وقت کی کمی کے

پیش نظر سیدھا گنڈولا لفٹ کی طرف پیش قدمی کی جائے کیونکہ بارش کی وجہ سے روشنی مسلسل کم ہو رہی ہے اور ایسا نہ ہو کہ ہیف کی سیر کے بہترین حصے سے محروم رہ جائیں۔

گنڈولا لفٹ سے ملتی جلتی چیز وطن عزیز میں ''ایوبیہ'' کے مقام پر کئی برسوں سے کام کر رہی ہے مگر ہیف کی اس لفٹ اور ایوبیہ کی لفٹ میں کم و بیش وہی فرق ہے جو ایک بادبانی کشتی اور آبدوز میں ہوتا ہے۔ یہ گنڈولا لفٹ آٹھ منٹ میں آپ کو ۷۵۰۰ فٹ بلند (۲۲۸۵ میٹر) چوٹی پر پہنچا دیتی ہے جہاں ایک تین منزلہ وسیع و عریض عمارت میں ریستوران' مناظر دیکھنے کے لیے خوبصورت ٹریئیں' دوربینیں' ایک سو ساٹھ افراد کے لیے بیٹھ کر کھانے کی جگہ اور بڑی بڑی بالکونیاں بنی ہیں۔ اس عمارت کے اندر پھرتے ہوئے یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ آپ ایک برفستان میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر بیٹھے ہیں۔

عمارت کو جنگلی جانوروں سے محفوظ کرنے کے لیے مختلف حفاظتی اقدامات کئے گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے قطب شمالی تک پھیلے ہوئے وسیع برفستان میں ریچھ' لومڑ' بھیڑیئے' بکرے اور دیگر کئی اقسام کے جانور غول در غول اور تنہا تنہا بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس برف زار کے ہزار ہا میل پھیلے ہوئے لق و دق میں وہ کس طرح زندہ رہتے ہیں۔ اقبال پھر یاد آ رہے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون!

اکہتر برس کی عمر میں علی سردار جعفری صاحب کی ذہنی اور جسمانی چستی ہم سب ''نوجوانوں'' کے لیے باعث عبرت بھی تھی اور لمحہ فکریہ بھی۔ اپنے بھاری اوورکوٹ اور برف کی پھسلن کے باوجود وہ نہ صرف گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے بلکہ ان کی رفتار بھی ہم سے زیادہ تیز اور ہموار تھی۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ان کا بہت اچھا ہے اور ان کا حافظہ بھی قابل رشک ہے مگر ان کی سب سے زیادہ اچھی بات مجھے یہ لگی کہ وہ اپنے آپ کو مجلس کے مطابق Adjust کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان سے اختلاف رکھنے والے ان کی اس صلاحیت کو زندگی کے دوسرے شعبوں خصوصاً ان کی ترقی پسندی پر بھی منطبق کرتے ہیں لیکن یہ اس وقت میرا موضوع نہیں۔

کچھ تو ہم گھر سے لیٹ چلے تھے اور کچھ گنڈولا کی سیر میں زیادہ وقت لگ گیا' طے یہ پایا کہ ہیف کے قصبے کی سیر ملتوی کر دی جائے کیونکہ مشاعرے کے دونوں بنیادی منتظم یعنی اقبال حیدر اور حسن ظہیر ہمارے ساتھ اور اگرچہ وہ منہ سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے لیکن وقت کی تنگی کا احساس ان کی ہر ہر بات سے ظاہر ہو رہا تھا۔ گنڈولا لفٹ سے واپسی کے سفر میں ہم نے دیکھا تو بلندی سے پارکنگ پلیس کی برفانی سطح پر کھڑی موٹریں کھلونوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ ہم نے بچوں کی طرح شرطیں لگا کر اپنی موٹریں پہچانیں۔

موٹر ہی کے حوالے سے کسی نے ایک بڑا مزیدار لطیفہ سنایا۔

ایک خاتون نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ وہ اپنے شوہر کو قابو میں رکھے کیونکہ ان دنوں وہ ایک اور عورت کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ خلاف توقع سہیلی نے اس اطلاع کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور بات ہنس کر ٹال دی۔ کچھ دن اس عورت نے پھر سہیلی کو اطلاع دی کہ اب اس کا شوہر ایک اور عورت کے ساتھ پینگیں بڑھا رہا ہے۔ سہیلی نے اس اطلاع کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ جب تیسری مرتبہ خاتون نے اس نوع کی اطلاع دی اور سہیلی نے پروا نہیں کی تو خاتون کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا' اس نے کہا۔ ''تم کمال کی عورت ہو تمہیں اپنے خاوند کی بے راہروی کی پرواہ ہی نہیں۔ میرا شوہر اس طرح کی حرکت کرے تو میں اس کا جینا حرام کر دوں۔''

سہیلی مسکرائی اور بولی۔ ''میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں' تم فکر نہ کرو۔ کچھ نہیں ہو گا۔''

خاتون تلملائی ''ہمارا کیا ہے' بہن! خود ہی پچھتاؤ گی۔''

سہیلی نے کہا۔ ''تم نے کبھی چلتی موٹر کے پیچھے بھاگتے ہوئے کتوں کو دیکھا ہے؟''

خاتون نے کہا۔ ''کئی بار...... کیوں؟''

سہیلی نے کہا۔ ''اگر موٹر روک دی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ موٹر کے مڈگارڈ سونگھ کر چلے جاتے ہیں۔''

جعفری صاحب نے کہا۔ ''بھئی ایسی خراب ریپوٹیشن رکھنے والا شوہر ہونے سے تو بہتر ہے آدمی خودکشی کر لے۔ یعنی ایک تو کتا بنایا اس پر خصوصیت بھی کیسی چن کر نکالی ہے۔''

لطیفے اور جعفری صاحب کے برجستہ ریمارک پر ہنستے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ اقبال حیدر بہت دیر سے اپنی موٹر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں' معلوم ہوا کہ چابی نہیں لگ رہی۔ موٹر بالکل نئی تھی۔ چابی کے سوراخ میں برف جمنے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا' ڈکی کھولنے کی کوشش کی گئی مگر کسی بھی طرح تالے میں حرکت کے آثار دکھائی نہ دیئے۔ حسن ظہیر وغیرہ بھی اس بر سر عام قفل شکنی میں شامل ہو گئے مگر تالا ٹس سے مس نہ ہوا۔ اچانک میری نظر موٹر کی پچھلی سیٹ پر پڑی' وہاں کچھ زنانہ کپڑے پڑے تھے جو یقیناً اس سے پہلے وہاں نہیں تھے۔ میں نے اقبال حیدر کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ پہلے تو ایک دم خاموش ہو گیا پھر ادھر ادھر دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ سب پوچھا گیا تو کہنے لگا۔

''خدا کا شکر کریں' ہمیں اس کار کے مالک نے نہیں دیکھا ورنہ ہم سب مصیبت میں پڑ سکتے تھے......''

معلوم ہوا کہ موصوف اپنی موٹر کی بجائے اسی رنگ اور ماڈل کی کسی اور موٹر پر طبع آزمائی فرما رہے تھے۔

ہمیں اس حماقت پر دیوانہ وار ہنستے دیکھ کر قریب سے گزرتی ہوئی ایک فیملی پہلے تو حیرت سے دیکھتی رہی پھر انہوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ ان کے اس طرح خواہ مخواہ ہنسنے پر مجھے منیر نیازی کا ایک واقعہ یاد آیا۔

منیر نیازی جب کسی مشاعرے میں شعر پڑھنے کے لیے آتے ہیں تو چند لمحے مائیکروفون کے سامنے خاموش بیٹھے پلکیں جھپکتے رہتے ہیں۔ ان کی مقبولیت کی وجہ سے لوگ اس ادا کو بھی پسند کرتے ہیں اور ہوٹنگ نہیں کرتے مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ پچھلی صفوں میں کچھ شرارتی لڑکے بیٹھے تھے' وہ اس وقفہ خاموشی کو برداشت نہ کر سکے اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ منیر نے چند لمحوں ان کی ہنسی سنی پھر مائیکروفون پر جھک کر کہا۔ ''اوئے بدشکلو......

تم کس بات پر ہنس رہے ہو؟''

ہنسی کی بات چلی ہے تو اس رات کے مشاعرے میں مارے یا لگائے ہوئے کشور قریشی کے قہقہے کا ذکر بھی لازمی ہے۔ کشور قریشی جو پندرہ بیس برس پہلے کشور غنی کے نام سے کراچی یونیورسٹی کی بہترین مقرر ہوا کرتی تھی۔ ایڈمنٹن سے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ مشاعرے کے شروع میں ایک مقامی شاعر نے ایک مزاحیہ نما قطعہ پڑھا جس پر بمشکل مسکرانے کی گنجائش نکل سکتی تھی مگر کشور نے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے ایک ایسا بے ساختہ قہقہہ مارا کہ سب لوگ گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگے کہ کہیں خدا نخواستہ.......

کیلگری کے اس مشاعرے میں کشور کے اس قہقہے کے علاوہ یاد رہ جانے والی چیز دوسری صف میں بیٹھی ہوئی مشہور ہندوستانی اداکارہ دلیپ کمار کی بیوی اور پری چہرہ نسیم کی بیٹی سائرہ بانو تھی جو اگرچہ مشاعرے کے اختتام پر پشاور کے ایک معزز خاندان کی بیٹی اور لاہور کی مشہور تاجر فیملی کی بہو نکلی مگر مجھے اب بھی شبہ ہے کہ....... بہر حال ایسی غضب کی مشابہت فلموں کے ڈبل رول کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھی۔

مشاعرے کے بعد اقبال کے بہنوئی شفیق صاحب کی طرف نہاری کی دعوت تھی اور کیا صحیح دعوت تھی۔ مرچ مصالحہ کا استعمال کچھ تو خواتین خانہ کی کشادہ قلبی کا مظہر تھا' کچھ یار لوگوں نے نہاری کے چٹپٹا ہونے کی رعایت سے مستزاد کر لیا تھا۔ سوں سوں کرتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے۔ جعفری صاحب نے ایک بے ضرر سی نظر آنے والی چٹنی اپنی پلیٹ میں ڈالی اور پھر اس کے بعد انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ کہاں تو وہ اس سائرہ بانو والے معمے پر چہک رہے تھے اور کہاں یہ حال ہوا کہ سویٹ ڈش کی پوری پلیٹ کھانے کے باوجود ان کی سوں سوں ختم نہیں ہوئی۔ اب پتا چلا کہ قحط سالی کے بغیر ''یاراں فراموش کردند عشق'' کیسے ممکن ہے۔

کیلگری کے قیام کا ذکر اس بے بی سٹر کے ذکر کے بغیر ادھورا رہے گا جسے حسن اور نرجس نے مشاعرے کی رات ڈیڑھ ڈالر فی گھنٹہ معاوضے پر اپنے بچوں کے پاس چھوڑا تھا۔

یہ بے بی سٹر ان کے ہمسائے کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی جس کی عمر تو بارہ تیرہ برس تھی لیکن گزرنے والا ہر دن اس کے جسم سے مہینوں کی طرح گزر رہا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کے انداز میں ایک ایسا الہڑ پن اور اعتماد تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہو۔ آتے ہی اس نے پھرکی کی طرح گھوم کر پورے کمرے کا جائزہ لیا' کتابوں' رسالوں اور ویڈیو کیسٹوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر بڑے مطمئن انداز میں سر کی جنبش سے واضح کیا کہ "او کے' گزارا ہو جائے گا۔" اس کا چیونگم سے بھرا ہوا منہ مسلسل چل رہا تھا اور اس کا وجود بھی پارے کی طرح مسلسل مضطرب اور بے قرار تھا مگر سب سے زیادہ توجہ طلب اس کے ہاتھوں کا انداز تھا اس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کو کچھ اس طرح سے پکڑ رکھا تھا جیسے وہ کوئی بہت قیمتی اور نازک چیز ہو اور بار بار بڑے اشتیاق سے اپنے بائیں ہاتھ کی طرف کچھ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس پر قربان ہونے کا ارادہ ہو۔ معلوم ہوا کہ آج صبح کسی تقریب میں ایک پاپولر مقامی گلوکار نے اس کے مذکورہ ہاتھ پر بوسہ دیا تھا اور اب وہ اس خوشگوار تحفے کو محفوظ رکھنے کے لیے اس ہاتھ سے کسی دوسری چیز کو چھونے نہیں دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ وفور مسرت سے تمتما رہا تھا اور وہ بار بار کچھ اس فخر اور اشتیاق سے اس واقعے کو دہرا رہی تھی جیسے اسے کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ فنکار اور معاشرے کے اس گہرے اور پرجوش رشتے کی حدت کو محسوس کر کے میرا دل پگھل سا گیا۔ حسن نے پوچھا۔ "پاکستان میں آج کل کیا صورت حال ہے' کیا موسیقی کے استادوں کو اب بھی میراثی اور اہل علم وفن کو 'ارباب نشاط' کہہ کر پکارا جاتا ہے؟"

میں نے اس کا سوال باتوں میں ٹالنے کی کوشش کی کیونکہ پیاز کے ان چھلکوں کو اتارنے کی بے سود کوشش میں سوائے آنکھوں سے بہنے والی پانی کے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا اور اس لیے بھی کہ اس طرح کی بحثوں اور آنسوؤں سے مسئلے الجھا نہیں کرتے بلکہ اور الجھ جاتے ہیں۔ میں نے بات کا رخ اس بے بی سٹر بچی کے ذوق وشوق کی طرف موڑنے کی کوشش کی تو نرجس ظہیر نے پاکستان میں کسی پرانے دیکھے ہوئے ٹی وی پروگرام کا حوالہ دیا جس میں اداکار کمال نے اپنا اور ایلوس پریسلے کا موازنہ کیا تھا۔

واقعہ کچھ یوں ہے۔ اداکار کمال نے بتایا...... ایک بار کسی شاپنگ سنٹر کے باہر ایلوس پریسلے اپنی سفید رنگ کی سپورٹس کار کھڑی کر کے گیا' کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کی مداح لڑکیوں نے چوم چوم کر پوری کار پر اتنے بوسے ثبت کر دیئے تھے کہ اس کا رنگ سرخ نظر آ رہا تھا۔ ایک بار میں نے اپنی سرخ رنگ کی سپورٹس کار کراچی کی ایک سڑک زیب النساء اسٹریٹ عرف ایلفی پر کھڑی

کی' کچھ دیر بعد واپس آیا تو میرے مداحین نے کھرچ کر اس کا رنگ سفید کر دیا تھا۔

اس پر میں نے منیر نیازی کی ایک نظم کا مصرعہ سنایا کہ ''میں جس سے پیار کرتا ہوں اسی کو مار دیتا ہوں''

اس وقت تو بات بن گئی یعنی بدل گئی مگر آج بھی یہ سوال کبھی کبھی مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔

◆◆◆

وِنی پیگ

ہماری اگلی منزل وِنی پیگ (Winnepeg) تھی۔ وِنی پیگ کے بارے میں کم از کم صورت (Sound) کے حوالے سے یہ خیال کرنا کہ یہ کسی شہر کا نام ہوگا بہت مشکل بات ہے۔ پہلی دفعہ سننے پر یہ گنی پیگ قسم کی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ قریش پور پاکستان ٹیلیویژن کے بہت پرانے کمپیئر ہیں۔ شروع شروع میں جب ان کا نام ٹی وی پر آتا تھا تو اکثر لوگ اس مخمصے میں پڑ جاتے تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔ ایک صاحب تو بہت پریشان ہو کر کہہ بھی بیٹھے تھے۔ ''کیسی عجیب بات ہے' بہاولپور شہر کا نام ہے اور قریش پور آدمی کا۔''

سو وِنی پیگ کے بارے میں ہمارا فوری ردِّعمل کچھ رلا ملا سا تھا۔ جہاز میں حسب معمول کوشیر میٹ ہمارا منتظر تھا۔ پروین نے کہا۔ ''یہ کوشیر تو ہمارے ہاں کے بجلی اور فون کے بلوں جیسا ہو گیا ہے کہ ایک بار کوئی غلط اندراج ہو جائے تو پھر چل سو چل۔ جتنی بار مرضی ٹھیک کرا لو اگلے مہینے پھر اسی طرح موجود ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''اشیاء کی غلامی میں تو یہی کچھ ہوگا۔ کمپیوٹر بنایا ہے تو اب اسے بھگتو بھی۔''

کہنے لگی۔ ''زندگی میں پہلی بار اشفاق احمد کے ڈراموں کی سائنس دشمنی کی وجہ سمجھ میں آئی ہے۔'' ہم دونوں نے عالی کی طرف دیکھا جو کسی قیمت پر بھی سائنس' ٹیکنالوجی' اعداد و شمار اور علمی تحقیق کے موضوعات میں کم علمی یا مخالفت پسند نہیں کرتے تھے مگر یہ کوشیر کھانے کی مستقل بدمزگی کا کمال تھا کہ وہ کچھ بولے نہیں' ایک غیر جانبدارانہ ''ہوں'' کر کے طرح دے گئے۔

اس سفر کے دوران یہ پہلا ہوائی اڈہ تھا جہاں استقبال کے لیے آنے والوں سے عالی اور جعفری بھی نا آشنا تھے۔ جہاں یہ بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی کہ ان جیسے جہاں گردوں کے لیے ایک پورا شہر کیسے اجنبی ہو سکتا ہے وہاں یہ بھی احساس ہوا کہ اردو زبان اور اس کی شاعری دنیا کے کس کس کونے میں کیسے کیسے جلوے دکھا رہی ہے۔

کلثوم اعجاز محمدی اور ان کے میاں سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا اگرچہ موصوف بڑے پائے کے پروفیسر ہیں مگر بیگم صاحبہ کے جلو میں کچھ ایسی مسکینی اور تابعداری سے رہتے ہیں کہ ان کی سٹپنی محسوس ہوتے ہیں۔ زندگی میں ہم نے بڑے بڑے فنافی البیگم دیکھے ہیں۔ لیکن پروفیسر صاحب کا اس فیلڈ میں ایک اپنا ہی مقام تھا۔ بیگم کی ہر بات پر وہ شہید ہوتے ہوتے بچتے تھے اور کچھ ایسی گھائل نظروں سے ان کی طرف دیکھتے تھے جن سے کوئی نارمل انسان اپنی تو کیا کسی دوسرے کی بیوی کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔

حسب معمول مہمانوں کی تقسیم ان کی آمد سے قبل طے پا چکی تھی۔ میرا قرعہ شاہد نامی ایک نوجوان کے نام نکلا تھا۔ اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہو گیا کہ شاعری اور ادب وغیرہ سے اسے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہے اور وہ محض پاکستانی ہونے کے ناطے سے اس پروگرام میں حصہ لے رہا ہے چنانچہ میں نے بھی ونی پیگ شہر، وہاں کے حالات، پاکستانیوں کی تعداد اور ان کے حالات وغیرہ پر گفتگو شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ یہ کینیڈا کا فیصل آباد ٹائپ شہر ہے اور یہاں زیادہ تر پاکستانی فیکٹری ورکر ہیں۔ خود شاہد جھنگ کا رہنے والا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی محمود کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں بھائی ایف اے پاس تھے اور کم و بیش ویسی ہی نوکریاں کر رہے تھے جیسے پاکستان کے ایف اے پاس کیا کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کینیڈین ڈالر دس روپے کا ہوتا ہے جبکہ پاکستانی روپیہ پورے ایک روپے کا بھی نہیں ہوتا۔

شاہد اور اس کے بھائی کے روپ میں مجھے پہلی بار کینیڈا میں اصلی پاکستانی محنت کش نظر آئے، سیدھے سادے محنتی لوگ جو آجر اور مزدور کے الجھے ہوئے رشتوں کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے اپنے وطن سے بارہ ہزار میل دور نکل آئے تھے مگر یہ گتھیاں الجھی ہوئی دوڑ کی طرح ان کے بوٹوں کے تسموں اور چپلوں کے بکلوں کے ساتھ اٹکی ہوئی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ دونوں بھائی اپنی جھنگ کی بیک گراؤنڈ، شاہد کی شادی اور طلاق اور اپنے مستقبل کے عزائم کی وضاحت کچھ ایسے لہجے میں کر رہے تھے جیسے وہ میری بجائے یہ باتیں خود اپنے آپ کو سنا رہے ہوں۔

دونوں بھائی کھانا پکانے کے فن میں اپنی اپنی دسترس کا عملی ثبوت دینے کے لیے مجھ سے وقت مانگ رہے تھے اور چونکہ اس دوران وہ مجھے باقاعدہ طور پر ''بھائی جان'' ڈیکلیئر کر چکے تھے اس لیے مجھے انہیں یہ سمجھانے میں مزید وقت پیش آئی کہ جب تک مجھے ''اصل منتظمین'' سے پورے پروگرام کا پتہ نہیں چلتا میرے لیے کسی قسم کا وعدہ کرنا ممکن نہیں۔ محمود نے بڑے جوش سے کہا۔ ''بھائی جان آپ بس ہمیں ٹائم دے دیں، پروگرام کو چھوڑیں، وہ بنتا رہے گا۔''

اس کی اس معصوم حماقت پر مجھے یہ واقعہ یاد آیا۔

ایک دفعہ فوج میں نئے بھرتی ہونے والے جوانوں کو فٹ بال کی مشق کروائی جا رہی تھی۔ پہلا دن تھا، انسٹرکٹر نے کھلاڑیوں کو دو ٹیموں میں بانٹ کر گراؤنڈ کے وسط میں کھڑا کیا اور سمجھایا کہ ''تمہارا کام مخالف ٹیم کو کاٹتے اور اپنا رستہ بناتے ہوئے گول تک پہنچنا ہے کہ یہ اس کھیل کا بنیادی مقصد ہے۔ سمجھ گئے!'' سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک جوان بولا۔ ''شروع کرائیں سر'' انسٹرکٹر نے کہا۔ ''ابھی فٹ بال میں ہوا بھری جا رہی ہے۔ وہ آ لے تو شروع کراتے ہیں۔'' جوان بولا ''فٹ بال کو چھوڑیں جی، وہ تو آتا رہے گا، آپ

شروع کرائیں۔"

مشاعرہ ہوٹل Fort Garry کی ساتویں منزل پر تھا۔ تقریباً چار سو سیٹوں کا ہال تھا اور کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سکھ داڑھیوں اور ہندو ساڑھیوں کی بھی ایک معقول تعداد موجود تھی۔ ٹورنٹو سے اشفاق حسین اور ڈاکٹر خالد سہیل بھی آئے ہوئے تھے۔ شاعروں کو اسٹیج پر بلایا گیا تو کلثوم اعجاز محمدی کے ساتھ ایک خوش پوش اور معقول رو خاتون بھی تشریف لے آئیں۔ معلوم ہوا کہ موصوفہ لوکل شاعرہ ہیں اور ان کا نام پروین شیر ہے۔ جب تک وہ کلثوم اعجاز کے ساتھ کھڑی رہیں خاصی کم عمر اور خوش شکل تھیں۔ پروین کے ساتھ آ کر بیٹھیں تو معاملہ الٹ ہو گیا۔ انہوں نے ترنم سے اپنا کلام سنایا۔ جہاں مصرعہ وزن سے گرتا تھا تان کے ساتھ اٹھا لیتی تھیں۔ یوں ان کی غزل گر گر کر اٹھنے اور اٹھ اٹھ کر گرنے کا ایک دلچسپ منظر نامہ بن گئی مگر اس کے باوجود Lady of the Evening کا خطاب بیگم کلثوم اعجاز محمدی ہی کے پاس رہا۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے۔

مشاعرے کے آغاز میں بزم ادب ونی پیگ کے صدر خالد صاحب نے کچھ ابتدائی جملے کہے اور پھر اعلان کیا کہ اب مشاعرے کی کارروائی کو بیگم کلثوم آگے چلائیں گی۔ کلثوم بیگم نے پہلے ایک مختصر سا مضمون پڑھا جس میں اس مشاعرے کی غرض و غایت وغیرہ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی تھی' پھر کچھ شعر (جو غالباً جوش کے تھے) سنائے۔ حاضرین نے داد دی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ایک غزل سنائی۔ اس پر بھی داد دی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک نظم شروع کر دی۔ اسے مشاعرے کے ابتدائی حصے کی بے پروائی کہیے یا ہم لوگوں کی میزبان نوازی کہ ان کے ہر طرح کے شعروں پر داد دی گئی۔ ہماری دیکھا دیکھی حاضرین نے بھی بادل نخواستہ کچھ تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد ایک مقامی شاعر آئے۔ ان کے جانے کے بعد کلثوم صاحبہ نے پھر اپنے کلام بلاغت نظام سے نوازا اور پھر یہ سلسلہ روایتی زلف یار کی طرح دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ شاعروں کو بلانے کے درمیانی وقفوں کے دوران جب کلثوم اعجاز محمد اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کاپی نما ڈائری تقریباً نصف کے قریب سنا چکیں تو سامعین میں سے کسی دل جلے نے پکار کر کہا۔ "سنایئے سنایئے بی بی! آپ سناتی جایئے۔ ان مہمانوں سے تو ہم روز سنتے ہیں۔"

اس ایک جملے میں چونکہ ہال میں بیٹھے ہوئے تمام افراد (بیگم اور میاں کلثوم اعجاز کو نکال کر) کے جذبات شامل تھے چنانچہ ایسا زوردار قہقہہ پڑا کہ ہوٹل کے در و دیوار ہل گئے اور ارد گرد کے کمروں سے بہت سے لوگ یہ دیکھنے کے لیے نکل آئے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

اسی مشاعرے کا اسی قبیل کا دوسرا یادگار جملہ اشفاق حسین کا تھا۔ اشفاق بیگم کلثوم کے بالکل نزدیک بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے غالباً

ترتیب میں اپنا نام پڑھ لیا تھا چنانچہ جونہی اس سے پہلے شاعر نے اپنا کلام ختم کیا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مائک کے سامنے آ بیٹھا۔ کلثوم اعجاز نے مسکرا کر کہا۔ ''صبر کیجئے اشفاق صاحب' ابھی تو میں نے آپ کا نام بھی نہیں پکارا۔'' اس پر اشفاق نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس لیے آ گیا ہوں کہ کہیں آپ پھر اپنا کلام نہ شروع کر دیں۔''

یہ جملہ' جملہ کم اور حملہ زیادہ تھا مگر اس کی سختی اور تلخی قہقہوں کے شور میں کہیں گم ہو کر رہ گئی' یہاں تک کہ کلثوم اعجاز صاحبہ کو بھی مجبور ہو کے مسکرانا پڑا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو سامعین میں سے ایسے ایسے لوگ برآمد ہونا شروع ہوئے کہ زمان و مکان کے تصورات پھر آپس میں خلط ملط ہونے لگے' کرکٹ کے پرانے ساتھی جیلانی اور نیشنل بنک والے ارشد محمود کے بھائی سے (جس کا نام ذہن سے اتر گیا ہے) ملاقات ہوئی۔ حلقہ اس کا چھوٹا بھائی عقیل جعفر زیدی ملا جس کو میں نے بہت چھوٹا سا دیکھا تھا۔ امرتسر والے کلدیپ سنگھ کے ایک دوست خاص طور سے ملے آئے۔ کلدیپ سے میری آج تک ملاقات نہیں ہوئی صرف خط و کتابت ہے مگر اس کے دوست نے اس حوالے سے جس محبت اور خلوص کا اظہار کا ی وہ کلدیپ کی محبت کا ایک اور انداز تھا جو بہت اچھا لگا۔

سب سے دلچسپ ملاقات عامر محمود اور شاہینہ سے ہوئی۔ دونوں یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس خوبصورت جوڑے کو میں نے چند برس پہلے اسلام آباد یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ دونوں پڑھ رہے تھے لیکن تب اور اب میں فرق یہ تھا کہ اب ان کی محبت ازدواجی رشتے کے مضبوط اور خوبصورت بندھن میں بندھ چکی تھی۔ بہت خلوص اور محبت سے ملے۔ عامر برادرم طارق محمود کا چھوٹا بھائی ہے۔ طارق آج کل ملتان میں ڈپٹی کمشنر ہے مگر اب سول سروس سے زیادہ اس کی پہچان اس کے افسانوں کا مجموعہ ''سرحدہ'' ہے جس کی وجہ سے اب وہ باقاعدہ ہماری صف کا آدمی بن چکا ہے۔

طارق کی طرح عامر بھی بہت خوشگوار طبیعت کا حامل ہے۔ دونوں بھائی اگرچہ کم بولتے ہیں مگر ان کے چہروں پر ایک ایسی دوستانہ' پرخلوص' جاندار اور متوجہ قسم کی مسکراہٹ رہتی ہے کہ آپ ان سے مل کر کبھی بوریت محسوس نہیں کرتے۔ اب پتا نہیں یہ ''جمال ہم نشیں'' تھا یا کچھ اور کہ شاہینہ اور عامر کی ہر ہر بات اور انداز میں یک رنگی غالب تھی۔ انہوں نے ہمیں اگلے روز اپنے یونیورسٹی اپارٹمنٹ میں کھانے کی دعوت دی اور اپنی مسکراہٹوں کے زور پر منوا بھی لی۔

ریڈ انڈینز کے بارے میں فلمیں دیکھ دیکھ کر دل میں یہ اشتیاق تو تھا کہ کبھی ان لوگوں اور ان کی زندگی کو بالمشافہ دیکھا جائے چنانچہ جب معلوم ہوا کہ یہاں سے صرف چالیس میل کے فاصلے پر ان کی ایک Reserve (ریڈ انڈینز کی مخصوص کالونی) موجود

ہے تو عوام نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ باقی سب باتیں بعد میں اس "نواح" کی سیر سب سے پہلے۔ ریڈ انڈینز کے بارے میں یہاں کی سفید فام اور حاکم آبادی کے نظریات کم و بیش وہی تھے جو انیسویں صدی میں انگریز کے ہمارے علاقے کے بارے میں تھے۔

ہم کالے لوگ بھی Native تھے' پسماندہ' جاہل' سائنس کے کارناموں سے بے خبر' آپس میں لڑنے جھگڑنے والے' مذہبی تعصبات اور Fanaticism سے لبالب بھرے ہوئے' عیش پسند' کاہل' کام چور' انگریز بہادر کے تلوے چاٹنے والے وغیرہ وغیرہ اور ان لوگوں پر بھی کچھ اسی نوع کے الزامات تھے کہ شراب بہت پیتے ہیں' بچے بہت پیدا کرتے ہیں' جاہل' کم تعلیم یافتہ اور فرسودہ روایات والے ہیں۔ معاشرے کی Main Stream میں چلنے کے قابل نہیں اس لیے حکومت انہیں علیحدہ اور الگ تھلگ کالونیوں میں رکھتی ہے اور اس کے لیے اسے بھاری اخراجات ادا کرنے پڑتے ہیں یعنی وہی White Man's Burden آج بھی کوئی پوچھنے والا نہیں کہ آپ کے سب الزامات بجا سہی لیکن آپ کو ان کی زمینوں' جائیداد اور گھر بار پر قبضے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ ان کی پسماندگی آپ کے غاصبانہ قبضے کا جواز کس اصول کے تحت بنی ہے؟ میر جعفر اور میر صادق کی غداری اپنی جگہ' پٹے پر ریاستوں کا انتظام اور حفاظت اپنی جگہ۔ دیسی راجاؤں' نوابوں اور حکمرانوں کی عیش کوشی اپنی جگہ' ریڈ انڈین لوگوں کی کوتاہیاں اپنی جگہ' چہتر ڈالر کے عوض مین ہٹن (نیویارک) اور دو بوتل شراب کے عوض سینکڑوں ایکڑ اراضی کا احمقانہ سودا اپنی جگہ لیکن کیا کوئی یہ بھی پوچھ سکتا ہے کہ بیچنے والوں کے تو سب عیب آپ نے گنوا دیے کبھی خریدنے والوں کے ضمیر' دیانت' اخلاق اور اصولوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ دنیا کو تہذیب سکھانے والوں سے کوئی یہ بھی پوچھے کہ اس کی قیمت انہوں نے کیا کیا اور کس کس طرح وصول کی ہے اور آج بھی "امداد" کے نام پر وہ کیا کچھ نہیں کر رہے۔ لیکن یہ سب تو کہنے کی باتیں ہیں' اقبال نے کیا گہری بات کی تھی۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم گر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

سو محکوم کہیں کا بھی ہو حکومت کرنے والے اس کے گرد غفلت کا خیمہ اس طرح سے تانتے ہیں کہ اسے نہ تو سورج کے نکلنے کی خبر رہتی ہے اور نہ چاند کے ڈھلنے کی۔

معلوم ہوا کہ اصلی ریڈ انڈین تو اپنے روایتی رہن سہن کے ساتھ یہاں سے پانچ چھ سو میل اوپر ملیں گے البتہ "نمونے" کے طور پر یہ Reserve بھی گزارے لائق کام دے سکتی ہے۔ بارش کی وجہ سے سردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ہمارے میزبان خالد' طارق اور قاسم ایک ایسی ویگن لے کر آئے تھے جس کا باطن اس کے ظاہر سے اچھا تھا۔ سیٹیں بڑی کھلی کھلی اور آرام دہ تھیں اور

Heating کا بھی معقول انتظام تھا مگر بارش' دھند اور برف کی وجہ سے طبیعت پر ایک بے نام سا بوجھ پڑتا چلا جا رہا تھا۔ ویگن کے اندر کی بوجھل خاموشی اور اس کے شیشوں سے نظر آنے والے خارج کے ملگجی سناٹے میں سے اگر ویگن کے انجن کی آواز نکال دی جاتی تو باقی تقریباً اتنی آواز بچتی جتنی پروں کے بغیر بلبل۔ بقول شفیق الرحمٰن:

''بلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے یعنی اگر پر نکال دیئے جائیں تو کچھ زیادہ بلبل باقی نہیں بچتی۔''

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر اور دو دفعہ راستہ بھولنے کے بعد ویگن ایک بڑے سے کچے پکے میدان میں داخل ہوئی جس کے وسط میں سرخ اینٹوں کی ایک چھوٹی سی عمارت کے باہر تین چار ٹوٹی پھوٹی موٹریں اور ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ Apache Art کا شوروم ہے جہاں ریڈ انڈینز کی بنائی ہوئی تصویریں' مجسمے ' زیورات اور مختلف قسم کا الابلا فروخت کیا جاتا ہے۔ شوروم کے ایک حصے میں با قاعدہ آرٹ کی کلاس ہو رہی تھی۔ ایک ریڈ انڈین لڑکا ہمیں خوش آمدید کی Smiles دے رہا تھا اور پانچ چھ کینیڈین لڑکیاں بڑی مہارت اور چابکدستی سے وہ Paintings بنا رہی تھیں جنہیں ریڈ انڈین آرٹ کہہ کر ہم سے زیادہ بیوقوف سیاحوں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا تھا۔ ہمیں شوروم میں رکھی ہوئی مختلف اشیاء کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت سے آگاہ کیا گیا تو یوں معلوم ہوا جیسے یہ نوادرات وہاں ہمارے ہی انتظار میں رکھے گئے تھے۔ قریب تھا کہ ہم میں سے کچھ لوگ خریداری کے جال میں پھنس جاتے مگر خالد کی ''اندر خانے'' کی معلومات آڑے آگئیں اور ہم سب بخیر و عافیت اس عمارت سے باہر نکل آئے۔

باہر نکلے تو اسٹیشن ویگن کے قریب جان وین ٹائپ ایک بزرگ ''کاؤبوائے'' کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ لوکل چیف ہے۔ مسلسل مے نوشی کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سستی اور خمار نے ایک مستقل جگہ بنالی تھی اور ''چہرہ فروغ مے سے گلستاں'' بنتے بنتے جنگل کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے ایک مخمور نظر ہم سب پر ڈالی۔ خالد نے اس کے مقابلے کی انگریزی میں بات چیت شروع کی اور ہمارا تعارف کرایا جس پر اس ''نوجوان بابے'' نے ہمارے ساتھ ایسے پرزور مصافحے شروع کئے جیسے ہم اس کے برسوں کے بچھڑے ہوئے عزیز رشتہ دار تھے۔ پروین اس کے متوقع مصافحے سے خوفزدہ ہو کر ایک طرف ہونے کی کوشش کر رہی تھی مگر چیف نے اسے موقع نہیں دیا البتہ اس کے انداز میں فوری تبدیلی آگئی' اس نے سر سے ہیٹ اتارا' تھوڑا سا جھکا اور پھر ایسے انداز میں پروین سے ہاتھ ملایا کہ بڑے بڑے خاندانی لارڈ بھی اس پر رشک کریں۔

اس کے بعد اس نے ہمارے ساتھ تصویریں کھنچوائیں اور بہت سی باتیں کیں مگر احتیاط یہ رکھی کہ چہرے کا زاویہ اور روئے سخن دونوں پروین کی طرف رہیں۔ معلوم ہوا کہ سرکار اس طرف کی Reserves میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو وظیفہ دیتی ہے چنانچہ

یہاں کی عورتیں بچے پیدا کر کر کے تباہ ہو جاتی ہیں اور چونکہ شادی بیاہ کا بھی کوئی ایسا رواج نہیں ہے کہ بچہ ذمہ داری بن جائے لہٰذا چل سو چل۔

خالد کے چھوٹے بھائی قاسم نے واپسی میں ریڈ انڈین لوگوں کی کثرت شراب نوشی پر گفتگو کے دوران ایک بہت مزیدار لطیفہ سنایا۔

کسی پارٹی میں ایک صاحب بہت پی گئے۔ جھومتے جھامتے ایک میز پر پہنچے جہاں ان کی بیگم بڑی سوبر حالت میں اپنے سامنے رکھے جام سے چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے رہی تھی۔ آپ نے جاتے ہی اس کے گلاس پر ہاتھ رکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے۔

''بس کرو بیگم اور مت پیو....... تمہارا چہرہ پہلے ہی دھندلا دھندلا ہو رہا ہے۔''

رات کا کھانا بیگم کلثوم اعجاز محمدی کی طرف تھا۔ اشفاق اور سہیل شام کی فلائیٹ سے ٹورنٹو جا چکے تھے۔ میرا سامان شاہد کے گھر سے عقیل جعفر زیدی زبردستی اٹھا لایا تھا کہ ادھر بھی ایک رات بستا جا۔ بارش کئی گھنٹوں سے ہو رہی تھی اور جوں جوں اندھیرا بڑھ رہا تھا سڑکوں پر گاڑی کے Skid کرنے کے امکانات روشن سے روشن تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے عقیل نے بتایا کہ یہ علاقہ وٹی پیگ کا سوہو ہے' چند گھنٹے بعد ان فٹ پاتھوں اور سڑکوں کے کونوں پر ہر طرف وہ خواتین ہوں گی جن کا تعلق دنیا کے قدیم ترین پیشے سے ہے اور پھر صبح تک کاروں کے دروازے کھلتے اور بند ہوتے رہیں گے۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''اتنی آزادی اور فراوانی کے بعد بھی؟''

بولا ''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ آپ نے عرب شیخوں کے حرم نہیں دیکھے۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھے تو نہیں البتہ سنا ان کے بارے میں بہت کچھ ہے مگر یہاں تو معاملہ مختلف ہے۔ دیکھو نا' قیمتاً تو آدمی وہی چیز خریدتا ہے جو مفت میں نہیں ملتی۔''

اس پر وہ نوجوان مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''یہاں کا سسٹم بڑا عجیب ہے' اسے سمجھنے کے لیے یہاں رہنا بہت ضروری ہے اور یہ بھی مت بھولیے کہ اس شہر میں میرے اور آپ جیسے گھروں سے دور لوگ بھی دنیا کے ہر کونے سے آتے اور جاتے رہتے ہیں۔''

اس برہان قاطع کو سن کر میں خاموش ہو گیا کیونکہ اس کے بعد گفتگو کو ایک ایسے میدان میں داخل ہونا تھا جہاں فی الوقت میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن میری خاموشی بھی کسی کام نہیں آئی کیونکہ اس دوران میں ہم راستہ بھول چکے تھے اور عقیل بار بار شہر کا روڈ میپ نکال کر کسی ایسی سڑک کو تلاش کر رہی تھا جسے یہاں کہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہ یہیں تھی اور نہ کہیں۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی تگ و دو کے بعد کلثوم کا گھر ہمیں اس طرح مل گیا جیسے کولمبس کو امریکہ مل گیا تھا۔
وہاں چند لوگ اور بہت سے کھانے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کلثوم اعجاز بہت اچھی میزبان ثابت ہوئیں۔ انہوں نے مشاعرے میں ہونے والی چھیڑ چھاڑ کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا اور سارا وقت اپنی اور اپنے میاں کی باتیں کرتی رہیں۔ دونوں کی شادی غالباً قدرے تاخیر سے ہوئی تھی کیونکہ ان کے بچے ابھی بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ پتا نہیں کیوں انہیں دیکھ کر مجھے شفیق الرحمٰن کا ایک لاجواب جملہ بہت یاد آیا۔ اپنے کسی مضمون میں انہوں نے لکھا ہے۔ ''چشتی خاندان کے بچے بہت خوبصورت ہوتے ہیں مگر پھر بڑے ہو جاتے ہیں۔''
بعد میں پروین کے بیان سے اس خیال کی مزید توثیق ہوئی۔ اس نے بتایا کہ دونوں میاں بیوی انتہائی متشدد قسم کے مذہبی آدمی ہیں اور انہوں نے گھر میں ایسی فضا پیدا کر رکھی ہے کہ بچے ابھی سے ان کے سانچوں میں ڈھلنا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اس گھر کے اندر اور اس کے باہر کی دنیا میں جو عظیم سماجی اور فکری تضاد ہے اس کے دباؤ میں ان بچوں کا کیا بنے گا؟
پروین کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا محترمہ رونے کا ایک سیشن لگا چکی ہیں کیونکہ کراچی میں گیتو سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ سو رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس کا موڈ بحال کیا گیا اور ایمان کی بات یہ ہے اس مہم میں سب سے زیادہ کام کلثوم اعجاز نے دکھایا' یہ اور بات ہے کہ وہ شعوری طور پر اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔
کھانے کے دوران ہی عقیل' عالی اور جعفری صاحبان کو اپنے فلیٹ پر مدعو کر چکا تھا اور یہ غالباً اسی دعوت کا اثر تھا کہ کھانا اتنا اچھا ہونے کے باوجود دونوں نے بہت کم کھایا۔ گیارہ بجے کے قریب ہم پروین کو اللہ حافظ کہہ کر عقیل کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں سنتھال نامی ایک ''بلائے آسمانی'' سے ملاقات ہوئی جس کا باپ ڈچ اور ماں اٹالین تھی اور زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ دو آتشہ کسے کہتے ہیں۔
اگلی دوپہر عامر اور شاہینہ کے ساتھ اور شام اس ایسوسی ایشن کے ڈنر میں گزری جس کے ہم مہمان تھے۔ رسمی اور روایتی تقریروں اور اصلی گرم جوشی کی ملی جلی فضا میں کھانے اور تصویروں کے دوران جو سب سے دلچسپ منظر دیکھنے کو ملا وہ علی سردار جعفری صاحب کی مقامی شاعرہ پروین شیر پر خصوصی توجہ تھی۔ پروین کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ اصل میں مصورہ ہیں اور بڑی ٹھیک ٹھاک آرٹسٹ ہیں۔ ہمارے لیے وہ اپنی Paintings کی کچھ کیمرہ تصویریں بھی لائی تھیں جو انہوں نے ہمیں تحفتاً پیش کیں۔ جعفری صاحب

نے ان کے فن کی تعریف شروع کی جو اخلاق کا تقاضا تھی اور شاید جائز بھی لیکن آہستہ آہستہ تعریف مبالغے سے غلو اور پھر غلو سے بھی آگے رواں ہوگئی۔ ایک جملہ جو میں نے اور پروین شاکر نے بالکل واضح طور پر سنا کچھ یوں تھا۔ ''یہ جو آپ کی پینٹنگ ہے اس کا سٹائل اور Perfection وان گوگ کے بعد میں نے صرف آپ کے یہاں پائی ہے۔''

اس جملے اور اس کی ادائیگی کے پیچھے جعفری صاحب کا نصف صدی کا تجربہ تھا' چنانچہ اس کا ردعمل وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ خاتون کا چہرہ روشن' آنکھیں خمیدہ اور آواز مدھم ہوگی اور جعفری صاحب کے علاوہ پوری محفل ان کے لیے آؤٹ آف فوکس ہوگئی۔ ان کی یہ کیفیت شاید مزید رنگ پکڑتی مگر ہماری شرارت پسندی نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ بعد میں ہمیں افسوس بھی ہوا کہ ہم نے ایسی غیر کھلاڑیانہ حرکت کیوں کی۔

پروین شیرا اور ان کے میاں صاحب نے ہمیں بتایا کہ وہ بھارت کے ساتھ مل کر مشترکہ فلمسازی بھی کرتے ہیں۔ ہماری آمد سے چند دن پہلے مشہور ہدایتکار رشی کیش مکرجی اور اداکاران راج ببر' شوپوری اور زینت امان وغیرہ ان کے گھر ایک فلم ''ناممکن'' کی شوٹنگ کے سلسلے میں رہ کر گئے تھے۔

اس دعوت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایسوسی ایشن کے مختلف ممبران اپنے اپنے گھروں سے مختلف ڈشیں پکا کر لائے تھے اور چونکہ سب خواتین کی یہ خواہش تھی کہ ان کی پکائی ہوئی ڈش مہمان ضرور کھائیں چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ جونہی کوئی میزبان خاتون کسی ڈش کی طرف اشارہ کرتی ہم فوراً مصنوعی چٹخارہ لے کر کہتے۔ ''جی' جی' کھائی ہے۔ بہت مزیدار ہے۔'' اور عالی صاحب تو ایک بار رو میں یہ جملہ ایک ایسی خاتون کو بھی کہہ گئے جو ان سے آٹوگراف مانگ رہی تھی۔

کھانے کے بعد دونوں بزرگ اور پروین تو اپنے اپنے میزبانوں کے ساتھ چلے گئے اور مجھے عقیل اور خالد وغیرہ نے گھیر لیا کہ چلئے آپ کو نائٹ کلب دکھائیں۔ میں نے ہاں تو کر دی مگر مگر اس کے بعد انہوں نے مختلف طرح کے نائٹ کلبوں کی جو نوعیت بیان کی تو معلوم ہوا کہ ہر ایک پر حدود آرڈیننس لاگو ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یار کوئی شریفانہ سا....... میرا مطلب ہے کہ کم مخرب اخلاق نائٹ کلب نہیں ہے یہاں؟''

بولے۔ ''ہے تو سہی مگر ذرا زیادہ دور ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مولانا روم کا قول ہے' راہ راست برو گرچہ دوراست۔''

عقیل نے گرہ لگائی۔ ''اوکے اوکے' منظوراست''

اب جو ہم اس ''صالح'' قسم کے نائٹ کلب میں داخل ہوئے ہیں تو فلور پر دو کالے اور ایک گوری کوئی گانا نما چیز گا رہے تھے۔ اردگرد تماش بینوں کی بھیڑ تھی جن میں سے اکثر جوڑے ایک جان دو قالب کی پوزیشن میں جھوم رہے تھے اور جو نہیں جھوم رہے تھے ان کے پاس غالباً اس کے لیے بھی ٹائم نہیں تھا۔ غالب نے تو عاشق کے گریبان کے چارگرہ کپڑے کی قسمت کا ماتم کیا تھا لیکن یہاں کی ویٹرس لڑکیاں تو سرے سے لباس کے حق میں ہی نہیں تھیں۔ بہت تلاش کے بعد پتہ چلتا تھا کہ اپنے جسم کی رنگت کی ایک آدھ دھجی انہوں نے پہن ضرور رکھی ہے مگر یوں کہ ''ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔''

مصطفیٰ زیدی مرحوم کا ایک شعر ہے۔

آنکھ جھک جاتی ہے جب بند قبا کھلتے ہیں
تجھ میں اٹھتے ہوئے خورشید کی عریانی ہے

مگر اس کو کیا کہیں کہ یہاں تو قبا اور بند قبا دونوں ہی غائب ہیں!

اتفاق سے ہمیں ڈانسنگ فلور کے بالکل کنارے پر ایک خالی میز مل گئی۔ فوراً ہی وینس کا ایک مجسمہ ہماری طرف لپکا۔ خالد نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر میرے آگے رکھ دیا۔

''کون سی چلے گی؟'' اس نے بڑے رسمی انداز میں پوچھا۔

''چلے گی نہیں' چلے گا...... اورنج جوس''

''اورنج جوس اور یہاں؟'' خالد نے ایک نعرہ احتجاج بلند کیا۔ ''آپ کیسے شاعر ہیں؟''

''شاعر تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ شاعروں کے لیے شراب Compoulsary ہے۔''

''ہم نے تو آج تک یہی دیکھا اور سنا ہے۔ مگر اب آپ کہتے ہیں تو خیر...... ویسے لطل لطل میں تو کوئی حرج نہیں۔''

میں نے کہا۔ آپ اپنی شام خراب نہ کریں' ہم تو بقول غالب وہ لوگ ہیں کہ ''ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال''

وینس کا مجسمہ ہمیں اس بحث میں الجھا دیکھ کر اگلی میز کی طرف بڑھ گیا جہاں چند نوجوان' سنگر پارٹی کو انتہائی فحش اشاروں کے ذریعے داد دے رہے تھے۔ میں نے خالد سے کہا۔ ''دیکھو بھائی' میں خشک ضرور ہوں مگر زاہد خشک نہیں کی زندگی کی کوئی راتیں ایسی صحبتوں میں گزری ہیں جہاں ''پلائے جا' پلائے جا...... ساقیا پلائے جا'' کا ہنگامہ برپا تھا اور میں نے ان محفلوں کو بہت انجوائے

بھی کیا ہے۔ تماشے کا لطف اپنی جگہ مگر کبھی کبھی تماشائی ہونا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ چچا غالب تو اس کے لیے فقیروں کا بھیس تک بنا لیا کرتے تھے۔

وینس کا مجسمہ آرڈر لے کر آنکھوں سمیت پورے وجود کے ساتھ To whom it may concern قسم کی گفتگو کرتا ہوا چلا گیا تو یک لخت ساز بھی خاموش ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ اب وہ رقص ہو گا جسے ''صلائے عام'' کہا جاتا ہے۔ چند ہی لمحوں میں پورا فلور انسانی جسموں سے بھر گیا اور موسیقی کے تیز شور میں رنگ برنگی روشنیاں لہرانے لگیں۔ اعضاء کے اس مشاعرے میں اچانک دو ایسے جسم دکھائی دیے جن پر انتہائی غیر معمولی حسین چہرے غضب تھے، اتنے حسین کہ انہیں دیکھ کر ایک بار تو ہمارے ہمسائے میں بیٹھے ہوئے فحش گو نوجوانوں کی ٹولی کو بھی چپ لگ گئی۔ یگانہ کا کیا باکمال مصرعہ ہے۔

''حسن وہ حسن جسے دیکھ کے چپ لگ جائے''

وہ دیوانہ وار ناچ رہی تھیں اور ان کے ماتھوں پر آیا ہوا ہلکا ہلکا پسینہ ان کے جمال کی دوشیزگی کو مزید نکھار رہا تھا۔ مغربی سازوں میں ڈرم کی بیٹ ایسی ہوتی ہے کہ اس کا ردھم لہو میں سرسرانے لگتا ہے اور جس طرح ہمارے دیسی ڈھول کی تال پر پر بے ساختیا ر ہل جاتا ہے اس طرح اس کی بیٹ پر پاؤں قابو میں نہیں رہتے۔ ایک لمحے کے لیے میرا بھی جی چاہا کہ اٹھ کر اس انبوہ میں شامل ہو جاؤں مگر پھر اسی بے نام جھجک نے پاؤں پکڑ لیے جو بچپن میں بھی عید میلاد النبی کے جلوس میں ڈھول کی تال پر رقص کرنے کی زبردست خواہش کے پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی تھی۔ کہیں ہم نے رقص کی اس جبلی خواہش کو دبا کر کتھارسس کے ایک فطری اظہار کو کھو تو نہیں دیا؟

اگلے ہمیں دن ہمیں آٹوا (Ottwa) روانہ ہونا تھا جسے ہم اب تک ''اٹاوہ'' پڑھتے اور سمجھتے تھے لیکن ہمارے محبت کرنے والے میزبانوں نے آخری چند گھنٹوں کو بھی بے کار نہیں جانے دیا۔ صبح ہم مقامی میوزیم دیکھنے گئے جہاں کی Care Taker نے ہمیں اپنے صوبے مینی ٹوبہ کے بارے میں کتابیں، نقشے اور سیاحتی لٹریچر کے علاوہ بہت خوبصورت بیج بھی دیے۔ امریکہ کی طرح کینیڈا کی تاریخ بھی (ریڈ انڈینز کے بغیر) بہت مختصر اور بے کشش ہے لیکن یہاں کے لوگ امریکنوں کی طرح اپنے اس کامپلکس کو دور کرنے کے لیے دوسری قوموں کی تاریخ کے درپے نہیں ہیں (یا شاید انہیں اس کا موقع نہیں ملا) ونی پیگ کا شہر کینیڈا کے برفستان میں اس جگہ واقع ہے جو صدیوں سے ریڈ انڈین قبائل کی گزرگاہ رہی ہے چنانچہ اس میوزیم میں اس دور کی بہت سی یادگاریں محفوظ کر دی گئی ہیں۔

صوبہ مینی ٹوبہ کا اسمبلی ہال دیکھنے کے بعد ہم نے اس عورت کا گھر دیکھا جس سے شادی کی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد خالد کو

یہاں کی شہریت حاصل ہوئی تھی۔ یہ قیمت جسمانی طور پر بھی اتنی بھاری تھی کہ اسے بلاتکلف عورتوں کی ڈاکٹر وحید قریشی قرار دیا جاسکتا تھا۔ وہاں ہم نے چائے کے ساتھ پیزا کھایا جو اگرچہ لذیذ تھا مگر اس کھانے کا پاسنگ بھی نہ تھا جو ہمیں خالد کے بھائی طارق نے گزشتہ روز اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلایا تھا۔

◆◆◆

آٹوا

ونی پیگ سے کینیڈا کے دارالحکومت آٹوا تک کی فلائٹ رستے میں دو جگہ Thunder Bay اور Sidbury پر رکی۔ عالی نے دونوں ہوائی اڈوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور پھر مسوڑھوں پر انگلی پھیر کر اپنے مخصوص ہنکارے کے ساتھ بولے۔ ''بھائی یہ تو کچھ کچھ اپنے نواب شاہ اور میر پور خاص ٹائپ کے ہوائی اڈے ہیں۔'' سڈبری کے ہوائی اڈے پر جہاز کو رکے پندرہ منٹ ہو گئے تو عالی یہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور سیٹ سے اٹھنے کے لیے ابتدائی کارروائیاں شروع کیں۔ میں سمجھ تو گیا کہ ان کا ارادہ جہاز سے باہر جانے کا ہے لیکن تھکن اور بے آرامی کی وجہ سے طرح دے گیا۔ پروین اور جعفری صاحب سے انہیں پہلے ہی کوئی توقع نہیں تھی چنانچہ مجھ پر ایک ناراض سی شکایتی نظر ڈال کر وہ کچھ یوں اٹھے جیسے غالب کے مصرعوں میں وقت آرائش قیامت قد اٹھا کرتے ہیں اور کڑی کمان کے تیر ایسی چال کے ساتھ اپنے بھاری اوورکوٹ کو اٹھائے جہاز سے باہر نکل گئے۔ ابھی ان کے جاتے ہوئے قدموں کی دھمک فضا میں موجود تھی کہ وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس لوٹ آئے۔

''لاحول ولاقوۃ ...... کیا چیز قنات ہوائی اڈہ ہے۔ سالوں نے ویو کارڈ تک نہیں رکھے ہوئے۔ بہر حال ایک بات طے ہو گئی ہے کہ مضافات ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔''

اس پر مجھے اپنا اختر امان بہت یاد آیا کیونکہ اس کے خیال میں بھی بڑے شہروں کے ادبی استحصال کی وجہ سے مضافات کے لکھنے والوں کو آگے آنے کا موقع نہیں ملتا اور جب ہم اسے بتاتے ہیں کہ اردو کے بیشتر بڑی لکھاری مضافات ہی سے تعلق رکھتے ہیں تو وہ اسے بھی بڑے شہروں کی استحصالی دلیل قرار دیتا ہے۔

آٹوا تک کے سفر کی دوسری خاص بات وہی کوشیر کھانا تھا جو اب کم و بیش ہماری چڑ بن چکا تھا۔ پروین نے کہا۔ ''یہ کوشیر تو آپ کے ڈرامے ''یا نصیب کلینک'' والی ہری چادر ہی بن گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس پر کم از کم ہنسی تو آتی تھی' اس کوشیر نے تو ہمارا پنجابی محاورے کے مطابق ''ہاسا'' نکال دیا ہے۔''

ائیر پورٹ پر حمیرا اور سعید صاحبان کی صورت میں ایک اور جوڑا ہمارا منتظر تھا۔ ہماری آنکھوں میں ونی پیگ ائیر پورٹ کا منظر کوند سا گیا لیکن چند ہی لمحوں میں پتا چل گیا کہ یہ میاں بیوی کلثوم اعجاز محمدی اور ان کے میاں سے مختلف برانڈ کے ہیں۔ دوسری

خوشگوار تبدیلی یہ معلوم ہوئی کہ یہاں ہمیں مختلف گھروں کی بجائے ایک موٹل میں ٹھہرایا جا رہا ہے۔ Montiery Motel اس خوبصورت، سرسبز، چھوٹے اور Compact شہر کی ایک نہایت پرفضا سڑک کے کنارے واقع ہے۔ آٹوا بیوروکریٹس کا شہر ہے اور گویا ایک طرح سے اپنا اسلام آباد ہے اور اس کی فضا میں ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ ہے جس کا پرتو موٹل کے ماحول میں بھی نمایاں نظر آ رہا تھا۔

ہم چاروں کے کمرے ایک ہی بلاک میں ساتھ ساتھ واقع تھے اور ان کی اندرونی ترتیب آرائش، کلر سکیم اور فرنیچر وغیرہ میں اس قدر یکسانیت تھی کہ اگر دروازوں سے نمبر ہٹا دیے جاتے تو اپنے کمرے کی پہچان مشکل ہو جاتی۔ جعفری صاحب کا کمرہ مطبخ اور سٹور روم قرار پایا۔ حمیرا اور انصاری نے ناشتے، چائے اور کافی وغیرہ کا تمام سامان بمقدار وافر وہاں رکھ دیا تھا تا کہ ہمیں موٹل والوں کو تکلیف نہ دینی پڑے۔ رات کا کھانا فقیر سہگل صاحب کی طرف تھا۔ ہم انہیں اپنے یہاں کے سہگلوں کا بھائی بند سمجھتے تھے لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ موصوف ہندو ہیں اور اپنی فیملی سمیت یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ الیکٹرونکس کے کام میں مہارت رکھتے ہیں اور خاصے سوکھے (خوشحال) ہیں جس کا اندازہ ان کے گھر کی آرائش سے بھی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''چلئے ایک بات تو آپ میں اور ہمارے ہاں کے سہگلوں میں مشترک نکلی۔''

سہگل صاحب بڑے محبت کرنے والے اور کچھ مست ملنگ سے آدمی تھے۔ ان کی بیوی پرکاش اور بیٹی آشا بھی ان کی طرح سادی اور ہمدرد طبیعت والی تھی۔ آشا پہلی نظر میں اگرچہ بہت ''ولایتی'' نظر آتی تھی مگر جب اس نے ٹھیٹھ پنجابی میں گفتگو شروع کی تو اس کے اندر سے ایک خالص پنجابن نکل آئی جس کا دل ابھی تک ماہیے کے بولوں اور مکئی کی روٹی میں اٹکا ہوا تھا۔ وہاں اشرف صاحب سے ملاقات ہوئی جو شائستہ اکرام اللہ کے بڑے داماد ہیں۔ ان کی بیگم ناز کے بارے میں معلوم ہوا کہ آرٹسٹ ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ جب بیگم شائستہ کی بیٹی ثروت کی شادی اردن کے ولی عہد شہزادہ حسن سے ہونے والی تھی تو ہمارے اخبارات نے اس خبر کو اس قدر اچھالا تھا کہ قرون وسطیٰ کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ ولی عہد صاحب کے ہم زلف صاحب ان لوگوں میں سے جو مجلسی گفتگو کا فن جانتے ہیں اور اپنی آواز سننے کا بے حد شوق رکھتے ہیں۔ موصوف پاکستان کے سابق اور کینیڈا کے حالیہ بیوروکریٹ تھے۔ صاحبزادی کو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں تعلیم دلوا رہے تھے اور ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی ہندوستانی شہریت کا حق بھی بوجوہ محفوظ ہے۔ عالی اور جعفری صاحب سے ان کی پرانی ملاقات تھی چنانچہ وہ تینوں ایسی باتوں میں لگ گئے جن کا کم از کم تعلق تیس برس پیچھے کے واقعات سے تھا چنانچہ ہم لوگ سہگل فیملی کے ساتھ رسمی باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ گروہ بندی محفل کے اختتام تک قائم رہی۔ اشرف

صاحب نے چلتے چلتے جعفری صاحب کو اگلی صبح ناشتے پر اس طرح سے مدعو کیا جس میں ہم سب ہمنوا کے طور پر شامل تھے۔ میں نے اور پروین نے بغیر کسی منصوبے کے ایک ساتھ معذرت چاہی جس پر اشرف صاحب تو بالکل آزردہ نہ ہوئے لیکن ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔

اگلی صبح میری آنکھ فون کی گھنٹی سے کھلی۔ سردار جعفری نے بتایا کہ ان کے کمرے میں چائے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ رات ہم نے انہیں جس عالم میں چھوڑا تھا اس کے بعد ان کا اتنی صبح اٹھنا' چائے بنانا اور پھر ایسی بشاش آواز میں بولنا اکہتر برس کی عمر کے کسی شخص کے لیے واقعی قابل فخر اور غیر معمولی بات تھی۔ پی کر بہکتے تو فیض صاحب بھی نہیں تھے مگر ان میں یہ جوانوں کی سی چستی اور مستعدی شاید جوانی میں بھی نہیں تھی۔ جعفری صاحب کے کمرے میں اشفاق کا بھیجا ہوا ان کی سالگرہ کا کیک اور ڈاکٹر انور نسیم کی طرف سے بھجوائے ہوئے پھول ہم سب کے لیے ایک خوشگوار مسرت کا باعث تھے کہ ان میں ادیب برادری کے تعلق کی مٹھاس اور محبت کی خوشبو لہریں لے رہی تھی۔

فون کی گھنٹی بجی' جعفری صاحب نے فون اٹھایا' کسی سے کچھ دیر باتیں کیں اور پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا کہ لیجئے بات کریں' آپ کے چاہنے والے ہیں۔'' میں نے کچھ پریشان سا ہو کر ''ہیلو'' کہا کیونکہ اس شہر میں چاہنے والے تو دور کی بات ہے مجھے کسی جاننے والے کی بھی خبر نہیں ہے۔ دوسری طرف سے خالص پنجابی لہجے کا سلام آیا ''سلاما لیکم! میں انور نسیم بول ریاں۔''

اشفاق اور دوسرے بہت سے لوگوں سے ڈاکٹر انور نسیم کا نام سنا تھا اور یہ بھی پتا تھا کہ وہ کینیڈا میں پاکستانیوں کی مختلف انجمنوں کی فیڈریشن کے صدر ہیں اور Genetics کے سلسلے میں کوئی بڑی توپ شے ہیں جنہیں گزشتہ برس حکومت پاکستان نے خاص طور پر بلوا کر کسی اہم سائنس کمیشن کا سربراہ بھی مقرر کیا تھا مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ موصوف نہ صرف اپنے علاقے کے ہیں بلکہ مزاجا بھی اپنے قبیلے کے ہیں۔ ٹیلیفون پر سلام دعا کے بعد طے ہوا کہ وہ گیارہ بجے ہمیں لینے کے لیے آئیں گے اور آٹوا گھمائیں اور دکھائیں گے۔ ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ موصوف اتنے نامور ذہین اور تخلیقی سائنس دان ہونے کے باوجود ابھی پچاس برس کے بھی نہیں ہوئے' ماضی میں افسانہ نگاری کا شوق کرتے رہے ہیں اور آج کل بھی شاعری پڑھنے اور موسیقی سننے میں وافر وقت ضائع کرتے ہیں۔ اپنی کھلی ڈلی طبیعت اور پر خلوص مسکراہٹ والے چہرے کی وجہ سے وہ پہلی نظر میں ہمارے دوست بن گئے۔

ان کے لمبے قد کی مناسبت سے ملاقات کے پانچویں منٹ کے اختتام سے پہلے میں نے انہیں ایک لطیفہ سنایا جسے ہماری بزرگ نسل واقعے کے طور پر سنایا کرتی ہے۔

کنہیا لال کپور کا قد لمبا اور جسم چھریرا تھا۔ ایم اے انگریزی میں داخلہ لینے کے لیے وہ گورنمنٹ کالج لاہور آئے۔ پطرس انٹرویو بورڈ کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ایک نظر کپور کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر بے اختیار بولے ''مسٹر کپور'' آپ سچ مچ اتنے لمبے ہیں یا آج انٹرویو کے لیے خاص اہتمام کر کے آئے ہیں؟''

انور نسیم نے ایک پر زور قہقہہ مارا اور پھر میرے نیم فارغ البال سر کی طرف دیکھ کر شرارت آمیز انداز میں بولے۔ ''کنہیا لال کپور کا تو میں صرف ہم قد ہوں۔ آپ سے تو میرا ''ہم زلف'' کا رشتہ ہے۔''

پروین' جو ہمیشہ مجھ پر فقرہ کسنے کی تاک میں رہتی ہے' خوش ہو کر بولی۔ ''اب بولیں۔''

میں نے کہا۔ ''بھئی یہ ہم پنجابیوں کی آپس کی باتیں ہیں تم پٹنے اور بہار والے ان کو کیا سمجھو گے۔''

بولی ''کیوں! مینوں پنجابی آندی اے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بات ہے تو چلو'' چورنا لوں پنڈ کاہلی'' کا مطلب بتاؤ۔''

کہنے لگی ''یہ کاہلی کیا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا'' اول تو یہ ساؤنڈ اردو کی کالی اور کاہلی کے درمیان کی ہے اور دوسرے یہ کہ ھوتا نہیں ہوتی ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے شتابی' جلدی' عجلت پسندی وغیرہ وغیرہ۔''

بولی ''یہ ذرا مشکل ہے کوئی اور بتائیں۔''

میں نے کہا۔ ''چلو یہ بتادو کہ'' جٹ پیا جانے یا بجو پیا جانے'' کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

بولی ''اس کا مطلب ہوتا ہے اپنے کام سے کام رکھو یعنی Mind Your Own Business'' میں نے کہا۔ ''بالکل ٹھیک۔ تم اس کا مطلب یہی سمجھو اور اپنے کام سے کام رکھو۔ ہمارے مذاق تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے کیونکہ یہ بعض اوقات خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتے۔''

پروین میں یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ جملہ کہنے کے ساتھ ساتھ جملہ سہنے کا فن بھی جانتی ہے چنانچہ اس نے ایک خوش دلانہ قہقہے کے ساتھ ایک اچھے شطرنج کے کھلاڑی کی طرح مات تسلیم کر لی۔ انور نسیم اس گفتگو کے دوران ایک غیر جانبدارانہ مسکراہٹ کے ساتھ خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے رہے جو آئندہ چند دنوں میں انہیں کئی بار دہرانا پڑا۔

انور نسیم نے بتایا کہ وہ گزشتہ برس پاکستان آئے تھے اور نہوں نے کشور ناہید سے کہا بھی تھا کہ مجھے امجد اسلام امجد سے ملوادو مگر

آپ سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ میں نے شرارتاً کہا۔ ''یہ بات نہیں' اصل میں کشور کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دساور سے آئے ہوئے اچھے اچھے دانے اپنے مخصوص حلقے کے لیے رکھ لیتی ہے اور رہند کھوند (بچا کھچا) ہماری طرف بھیج دیتی ہے۔''

میری اس بات سے گفتگو کا رخ کشور کے کمالات کی طرف مڑ گیا۔ ہم تینوں نے اپنے اپنے نوٹس ایکسچینج کیے تو ان میں حیرت انگیز حد تک مماثلت نکلی۔ ایک بات کا اعتراف البتہ ہم تینوں کو کرنا پڑا کہ سرکاری پبلسٹی کے ادارے اور انقلابی نعرے کو جس طرح کشور ناہید نے شیر وشکر کیا ہے یہ اسی کا کام ہے۔

دوپہر کے کھانے پر پاکستانی سفارت خانے کے کونسلر مسیح اللہ صاحب نے مدعو کر رکھا تھا۔ موصوف پولیس سروس کے آدمی ہیں اور اپنے موسیقی والے رشید ملک صاحب کے یار عزیز۔ رشید ملک کے مضامین ''فنون'' اور ''معاصر'' میں چھپتے رہتے ہیں اور وہ ''امیر خسرو کا علم موسیقی'' جیسی اہم اور منفرد کتاب کے مصنف ہیں۔ مسیح اللہ صاحب نے رشید ملک کے بارے میں پہلا سوال کچھ یوں کیا۔ ''آج کل وہ کس کے پیچھے ہے؟''

میں نے وضاحت کی کہ میرا ملک صاحب سے تعارف صرف پانچ چھ برس پرانا ہے' اور میں نے انہیں جس عمر میں دیکھا ہے اس میں کسی کے پیچھے تو کیا آگے لگنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

مسیح اللہ نے جوابی وضاحت کی کہ ان کی مراد ملک صاحب کے علمی و تحقیقی مشاغل سے تھی کیونکہ وہ جب بھی لکھتے ہیں کسی نہ کسی بت کو گرانے کے لیے لکھتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''آج کل وہ ''طلائی تثلیث'' کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ لکھ رہے ہیں جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی اور حوالی جاتی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔''

بولے۔ ''امیر خسرو سے ایک دم ڈاکٹر وزیر آغا تک! کیا ہو گیا ہے رشید ملک کو۔''

میں نے کہا۔ ''شکر کیجیے ڈاکٹر انور سدید یہاں نہیں تھا ورنہ اگلے دو مہینے میں پندرہ مختلف ناموں سے آپ کی ہجو چھپتی (جس کی گونج بقول مصنف کے ادب کے ایوانوں میں دور دور تک سنائی دیتی اور پورے ملک میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ جاتی) اور اسی چکر میں یہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ وزیر آغا کے مقابلے میں امیر خسرو کی حیثیت طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہے۔''

مسیح اللہ حیران ہو کر بولے۔ ''بھئی ڈاکٹر وزیر آغا کا نام تو میں نے سنا ہے' ان کے مضامین بھی دیکھے ہیں مگر یہ انور سدید کون ہیں اور کیوں وزیر آغا کے مختار خاص بنے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا" انور سدید ایک نقاد تھے (اب محقق' شاعر اور انشائیہ نگار بھی ہیں) ایم اے اردو میں فرسٹ آئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے نہروں کے محکمے میں انجینیر ہیں۔ ادب کے وسیع المطالعہ طالب علم ہیں لیکن ان کے سارے علم اور مطالعے کا واحد مقصد ڈاکٹر وزیر آغا کو مشہور کرنا اور ان کے خلاف یا بارے میں لکھی جانے والی ہر تحریر کے جواب میں " ردِعمل" لکھنا ہے جو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سردار جی نے More Over کا نعرہ لگایا تھا۔"

مسیح اللہ نے ششدر ہو کر پوچھا۔" مگر کیوں' اس شریف آدمی کو اور کوئی کام نہیں؟"

میں نے کہا۔" اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ ڈاکٹر وزیر آغا جیسے عمدہ نقاد' اچھے ادیب اور نہایت نفیس اور ادب پرور شخص کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ انور سدید کے چلائے ہوئے" توپ کے گولے" پورس کے ہاتھیوں کی طرح خود انہی کی صفوں کو روندتے رہتے ہیں اور ان خواہ مخواہ کے جھگڑوں کی وجہ سے ان کا ادبی مقام بڑھنے کی بجائے گھٹ رہا ہے۔"

یہ گفتگو جاری تھی کہ کینیڈا میں ہمارے سفیر الطاف صاحب آ گئے۔ اچھے خوشگوار سے آدمی تھے اس لیے فوراً ہی گھل مل گئے۔ علی سردار جعفری نئے بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے بارے میں بات کر رہے تھے' کہنے لگے۔" راجیو تجربہ کار پائلٹ ہے' میں سمجھتا ہوں جہاز چلا لے گا۔"

" شرط یہ ہے کہ راڈار ٹھیک کام کرے۔" الطاف صاحب نے مسکرا کر کہا۔ اس جملے کے مزاح' معنی آفرینی' رعایت لفظی اور سفارتی رکھ رکھاؤ کا لطف دیر تک محفل میں خوشبو کی طرح پھیلا رہا۔

لاہور میں" ٹرکش گرل" میرے پسندیدہ ہوٹلوں میں سے ہے مگر کسی" ترکی ہوٹل" میں کھانا کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ہوٹلوں کے مینو کارڈ پڑھنا اپنی جگہ پر ایک مرحلہ ہے کیونکہ کھانوں کے ناموں سے ان کی کیفیت' کو الٹی' ذائقے بلکہ اصلیت تک کا پتا کم کم ہی چلتا ہے۔ لنچ کے لیے تین کمبی نیشن درج تھے۔ میں نے وہ نمبر لکھوا دیا کیونکہ اس کے اجزائے ترکیبی کچھ کچھ مانوس نظر آ رہے تھے۔ پروین نے ایک نمبر والا کمبی نیشن منگوایا۔ عالی جی نے ہم دونوں پر ایک رحم انگیز نگاہ ڈالی اور مسوڑھوں پر انگلی پھیر کر مخصوص انداز میں دانت کٹکٹا کر بولے۔" بھئی ترکوں کی اصل ڈش تو ان کے شیش کباب ہیں' جس نے یہ نہیں کھائے سمجھو کچھ نہیں کھایا۔"

تھوڑی دیر بعد کھانا آیا۔ عالی صاحب کی پلیٹ میں چار تکے کے پیس آئے جبکہ ہماری پلیٹوں میں انواع و اقسام کا مال مسالہ تھا جو کچھ کچھ لاہور ہلٹن کے" سات رنگ پلیٹر" سے ملتا جلتا تھا۔ ہم نے عالی جی کو چھیڑنے کے لیے سچ مچ کے مزید ار کھانے کی اس قدر

مبالغے کے ساتھ تعریف کی کہ عالی تو عالی سروکرنے والی ویٹرس تک اس قدر متاثر ہوگئی کہ جاکر منیجر کو پکڑ لائی اور اس مردشریف کے متاثر ہونے کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ کھانے کے بعد اس نے باقاعدہ ہمارے ساتھ گروپ فوٹو کھنچوائی اور شکریہ ادا کرتے کرتے تقریباً مشکور حسین یاد ہوگیا۔

طے پایا کہ قہوہ یا کافی سفیر صاحب کے دفتر میں پی جائے جو ہوٹل سے صرف دو بلاک دور تھا۔ وہاں ہم سب نے سفارت خانے کی کتاب پر دستخط کئے اور اپنے اپنے تاثرات لکھے۔

الطاف صاحب کینیڈا کے پاکستانیوں کے مختلف گروپوں کی باہمی چپقلش سے خاصے نالاں تھے۔ میں نے بتایا کہ جن جن پاکستانیوں سے ہم ملے ہیں ان کے تاثرات بھی آپ کے سفارت خانے کے طرزِ عمل کے بارے میں کوئی ایسے اچھے نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہم نے انہیں مقامی پاکستانیوں کی کچھ نمایاں شکایات سے آگاہ کیا۔ معلوم ہوا کہ دونوں طرف کی بدگمانیوں میں زیادہ قصور رابطے کی کمی کا تھا۔ میں نے کہا' شاعر نے جو' قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا'' کہا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ سرے سے ایک دوسرے کی شکل ہی نہ دیکھی جائے۔

یہاں سے بات کا رخ پاکستانی سفارت خانوں کی عمومی کارکردگی اور بیرون ملک مقیم اور مسافر پاکستانیوں کی شکایتوں کی طرف ہوگیا۔ الطاف صاحب نے اپنا موقف اور مسائل بیان کئے جن کا آخری نتیجہ وہی نکلا جو ہمیشہ اس طرح کی باتوں کا نکلا کرتا ہے۔

انور نسیم نے کہا۔'' چلئے آپ کو آٹوا کی سیر کرائیں۔'' سردار جعفری کو بھارتی سفارت خانے کی فرسٹ سیکرٹری عترت صاحب کی طرف جانا تھا اور عالی جی کے سونے کا وقت ہوگیا تھا چنانچہ آخر میں اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے میں اور پروین ہی رہ گئے۔

اسلام آباد کو کسی نے'' کنکریٹ آئی لینڈ'' کا نام دیا تھا کہ وہاں سنگ و خشت کے مختلف ڈھانچوں میں انسانوں کے بھیس میں ان کے گریڈ رہتے ہیں۔ آٹوا بھی بیوروکریٹوں کا شہر ہے لیکن اس کی فضا میں بیوروکریسی کی خوشبو تو ہے سانس روک دینے والی گھٹن نہیں۔ اسلام آباد سے آٹوا کی ایک اور مماثلت اس کا جڑواں شہر ہل (Hill) بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پنڈی اور اسلام آباد کے درمیان سڑک ہے جب کہ آٹوا اور ہل کے درمیان دریائے آٹوا بہتا ہے جس کے کنارے پرسٹی ہال کی آٹھ منزلہ خوبصورت عمارت ہے جس کے مختلف پل دونوں شہروں کے درمیان نقطہ ہائے وصال کی طرح گزرنے والوں کو مشتاق نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔

راستے میں وزیراعظم اور گورنر جنرل کے بنگلے دیکھے۔ گورنر جنرل کی رہائش گاہ کے ایک محدود حصے کو چھوڑ کر سارا گھر عوام کی آمدورفت کے لیے چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ یہ دیکھ کر ہمیں پہلے اپنا گورنر ہاؤس اور پھر مسجد نبوی کا وہ صحن یاد آیا جہاں اس کائنات کی سب

سے محترم اور قیمتی ہستی بغیر کسی محافظ اور نوبت کے بوریے پر بیٹھ پورے ملک کا نظام چلایا کرتی تھی۔

سابق وزیر اعظم ٹروڈو کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ اس وقت بھی کینیڈا کی مقبول ترین شخصیت ہے۔ فرنچ اور انگریزی بولنے والے صوبوں میں اگرچہ شدید لسانی اور سماجی تعصب ہے اور وہ کسی بھی مسئلے پر ایک دوسرے سے متفق ہونا پسند نہیں کرتے لیکن ٹروڈو کی سیاسی بصیرت' پسندیدگی اور حمایت پر ان میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ اپنے طویل دور اقتدار میں اس نے کینیڈا کے اندرونی اور بیرونی تضادات اور مسائل کو جس ہوشمندی سے حل کر کے ملک کو ترقی اور استحکام کی راہ پر ڈالا ہے ملک کا ہر طبقہ اس کا معترف اور ثنا خواں نظر آیا۔ اس دوران میں اس کی اپنی ایکٹرس بیوی سے اختلافات پیدا ہوئے جو اس نوع کی ذاتیات تک اتر آئے کہ کوئی اور ہوتا تو ہمیشہ کے لیے اپنی اور معاشرے کی نظروں سے گر جاتا مگر ٹروڈو نے اسے اپنا ''ذاتی مسئلہ کہہ کر سب کے منہ بند کر دیئے اور یوں یہ بحران اس کے سیاسی کیریئر کو چھوئے بغیر اپنی موت آپ مر گیا۔

جمہوری نظام کے حوالے سے حزب اختلاف کی جو توقیر کینیڈا میں ہے وہ اپنی جگہ پر ایک روایت بننے کی حقدار ہے۔ قومی پارلیمنٹ ہاؤس کی بلند و بالا' خوبصورت اور پروقار عمارتوں میں حکومتی پارٹی اور حزب اختلاف کو اپنے دفاتر اور دیگر ضروریات کے لیے علیحدہ علیحدہ عمارتیں دی گئی ہیں لیکن اس امر کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر وہ سہولت جو حکومتی پارٹی کی عمارت کو حاصل ہے دوسری عمارت میں بھی بالکل اسی معیار اور مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ میرے دل میں رشک سے زیادہ ایک دکھ کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے سوچا' کیا کبھی میرے ملک کو بھی اس طرح کا ماحول نصیب ہوگا یا ہمیشہ حزب اختلاف تھانوں' کچہریوں' جیلوں' نظر بندیوں اور شاہی قلعے کی کوٹھڑیوں میں ہی اپنی حیات کرتی رہے گی؟ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہر نظام کو چاہے وہ اسلام ہو' جمہوری ہو یا اشتراکی' اس کی خارجی حیثیت یا ظاہری روپ کی سطح پر نافذ کرنا چاہتے ہیں' زندگی کا وہ فلسفہ اور نقطہ نظر جو اس یک روح رواں ہوتا ہے' اس سے ہم ہمیشہ چشم پوشی کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ اس کے نفاذ سے ہمیں اپنے فکر و عمل کے ڈھانچوں کو بدلنا پڑتا ہے اور یہ وہ بھاری پتھر ہے جسے ہم صدیوں سے چوم کر چھوڑتے آ رہے ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

پارلیمنٹ کی عمارت کی سیر کے دوران میں نے پروین کی طرف جب بھی دیکھا وہ مجھے کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آئی۔ شاید اس کے ذہن میں بھی وہی سوال مچل رہے تھے جن کی آتش خاموش کے شعلے میری آنکھوں میں بے محابا جل رہے تھے۔

رات کو ٹی وی پر خبروں میں بتایا گیا کہ لاس اینجلس اولمپکس میں حصہ لینے والے کینیڈین کھلاڑیوں کے اعزاز میں جو سرکاری

دعوت ہو رہی تھی وہ کینسل کر دی گئی ہے۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ بیشتر کھلاڑی طالب علم تھے جو دور دراز کے شہروں سے ذاتی خرچ پر نہیں آسکتے تھے اور کیونکہ ان کی مقامی ایسوسی ایشنوں اور مرکزی حکومت نے سفر خرچ وغیرہ کا انتظام نہیں کیا تھا اس لیے ان لوگوں نے شمولیت سے معذرت کا اظہار کر دیا ہے۔ دھیان فوراً اپنی قومی کھلاڑیوں کی طرف گیا۔ گزشتہ چند برسوں سے کرکٹ ہاکی اور سکوائش وغیرہ کے کچھ نمایاں کھلاڑیوں کو تو گزارے لائق نوکریاں مل جاتی ہیں مگر باقی کھیلوں میں اب بھی وہ عالم ہے کہ انٹرنیشنل کھلاڑیوں کو زندہ رہنے کے لیے ٹھیلے اور چھابڑیاں لگانا پڑتی ہیں۔ مجھے اپنا سکول کا دوست محمد غزنوی بھی یاد آیا جو آج کل باکسنگ کا بین الاقوامی ریفری ہے اور جس نے ایشین اور اولمپک مقابلوں میں ایک کامیاب باکسر کی حیثیت سے دس سال تک ملک کی نمائندگی کی ہے' اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ ''تربیت کے دوران ہمیں روزانہ بیس میل دوڑایا جاتا تھا اور پھر فی کس آدھ سیر گنڈیریاں بطور ''ڈائٹ'' کھانے کو دی جاتی تھیں کہ ان سے جبڑے اور دانت مضبوط ہوتے ہیں۔''

ایک طرف کھلاڑیوں کے وقار اور حقوق کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک اعلیٰ سرکاری اعزاز کا بائیکاٹ کر سکتے ہیں اور دوسری طرف.......

اگلی صبح حمیرا اور انور سعید انصاری کے گھر ناشتے کی دعوت تھی۔ ان کا گھر ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں میاں بیوی بڑے مہذب اور محبت والے ہیں اور انسانوں کی اس ''اقلیت'' سے تعلق رکھتے ہیں جو مہمانوں کی خدمت میں سچ مچ کی ''اصلی والی'' خوشی محسوس کرتے ہیں اور جن کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ میز پر رکھا ہوا خورد ونوش کا سارا سامان گھر کے فریج کی بجائے مہمانوں کے معدوں میں منتقل ہو جائے۔ سو اور تو ہمیں وہ عجیب وغریب پھل بھی کھانا پڑا جس کا نام کیوی (وہی بوٹ پالش والا آسٹریلین نژاد) تھا اور جس کا ذائقہ ایسا تھا کہ ایک بار کھانے کے بعد زندگی بھر دوبارہ اس کی طلب نہیں ہوتی۔

گزشتہ روز پاکستانی سفارت خانے کی دعوت میں علی سردار جعفری بھی ہمارے ساتھ تھے۔ غالباً اسی لیے بھارتی سفارت خانے والوں کی طرف سے ہم سب کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا مگر مسئلہ یہ آپڑا کہ عین اسی وقت کے لیے آٹوا میں مقیم پاکستانیوں کے ایک گروپ کی طرف سے دی گئی لنچ کی دعوت نہ صرف ہمارے میزبان پروگرام میں شامل کر چکے تھے بلکہ ہماری طرف سے انہیں کنفرم بھی کر چکے تھے۔ جعفری صاحب کے اصرار کی وجہ سے مجبوراً ہمیں درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑا یعنی عالی جی ہماری نمائندگی کے لیے بھارتی سفارت خانے کی دعوت میں چلے گئے جبکہ میں اور پروین ہوٹل شاہ زان پہنچے جہاں بہت سے احباب ہمارے منتظر تھے۔

ایک ہی خاندان کے لوگوں یا بھائیوں میں بعض اوقات نقش ونگار کی خاصی مماثلت ہوتی ہے لیکن اپنے ڈاکٹر عبادت بریلوی

صاحب اور ان کے بھائیوں کی مشابہت کچھ عجیب طرح کی ہے کہ اگر چہ ان کے علیحدہ علیحدہ نقش اور Cuts
ایک دوسرے سے زیادہ نہیں ملتے لیکن مجموعی تاثر کچھ ایسا بنتا ہے کہ آپ فوراً پوچھ بیٹھتے ہیں۔ ''آپ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے.......''

''جی ہاں' میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میرا نام نصرت یار خان ہے۔''

مجھے یاد آیا کہ آج سے دو تین برس پہلے میں نے ایک اور صاحب کو دیکھ کر یہی سوال کیا تھا اور انہوں نے بھی میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے کہا تھا۔ ''جی ہاں' میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میرا نام نزہت یار خان ہے۔''

عبادت صاحب کے ذکر پر مجھے ہمیشہ ایم اے اردو کی کلاس میں سنایا ہوا ان کا وہ شعر یاد آ جاتا ہے جو وہ تقریباً ہر دوسرے لیکچر میں اپنی گول گول آنکھیں گھما کر سنایا کرتے تھے اور جسے سن کر کلاس میں بیٹھے ہوئے لڑکے لڑکیوں میں بیشتر کی نظریں الجھ الجھ جایا کرتی تھیں۔ شعر یہ تھا۔

رات ایک آج کہیں کے بٹھا تجھے تنہا
جی چاہتا ہے کہیے ''مری جان'' پر نہیں

یہ شعر' وہ کلاس' عبادت صاحب اور وہ لوگ اب کبھی یکجا نہیں ہوں گے کہ اسی کا نام زندگی ہے اور کبھی اتفاق سے ایسا ہو بھی گیا تو مجھے یقین ہے بیشتر لوگ ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں سکیں گے۔

اف' خدایا....... یہ وقت کس قدر خوفناک چیز ہے!

سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں
اس کی جبیں کیسی تھی!
ہونٹ کیسے تھے! بدن کیسا تھا! آنکھیں کیا تھیں!
بس یہی یاد ہے' وہ جیسی نظر آتی تھی
اس سے کہیں اچھی تھی
(یہ مہ و سال کا طوفان بہت ظالم ہے
وہ اگر پاس بھی ہوتی تو کسے علم ہے' کیسی ہوتی!)

یہ نظم میں نے اس کلاس سے جدا ہونے کے پانچ برس بعد لکھی تھی اور اب تو اس بات کو اٹھارہ برس سے زیادہ عرصہ ہو چلا ہے۔

اللہ اللہ

ہوٹل شاہ زان کے نیم تاریک اور اداس سے ڈائننگ ہال میں بار بار کنکھیوں سے گھڑیاں دیکھتے ہوئے میزبانوں کے ساتھ ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور اجازت طلب کی جو ذرا سے رسمی انکار کے بعد مل گی کہ یہ ایک ورکنگ ڈے تھا۔ اور تقریباً سب کے سب میزبانوں کو واپس اپنے دفتروں کو جانا تھا۔

ہمیں لندن کے لیے ویزا لینا تھا۔ آٹوا میں چونکہ برطانوی سفارت خانہ بھی تھا اور ڈاکٹر انور نسیم بھی (جو پاکستانی تنظیموں کی فیڈریشن کے صدر ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے مانے ہوئے سائنس دان بھی تھ) اس لیے فیصلہ ہوا کہ یہ کار خیر وہیں انجام دیا جائے۔ متعلقہ عمارت کے گرد دو چکر لگائے مگر پارکنگ کے لیے جگہ نہ مل سکی۔ تیسرے چکر پر انور نسیم نے گھڑی دیکھی اور ہر چہ باداباد کے انداز میں سڑک کے کنارے ہی گاڑی کھڑی کر کے ان کے Blinkers آن کر دیئے۔

''آپ لوگ اپنے پاسپورٹ مجھے دیجئے اور یہیں بیٹھئے۔ اگر کوئی پولیس والا پوچھے تو اس سے زیادہ بات نہ کیجئے گا بس یہی بتایئے کہ آپ یہاں اجنبی ہیں اور آپ کے میزبان گاڑی یہاں روک کر سفارت خانے کی عمارت میں گئے ہیں۔''

''مگر کیوں!'' پروین نے حیرانی اور گھبراہٹ کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

''وہ اس لیے خاتون! کہ ساڑھے تین بج چکے ہیں' غالباً چار بجے ویزا آفس بند ہو جائے گا۔ آج جمعہ ہے' آئندہ دو دن یہاں چھٹی ہوگی اور سوموار کی صبح آپ کی روانگی ہے' اور کوئی سوال۔

''مگر یہ پولیس والا....... وغیرہ۔''

''میں نے مجبوراً گاڑی غلط پارک کی ہے۔ ان بلنکرز کا مطلب یہ ہے کہ مجھے کسی ایمرجنسی کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا ہے جو قابل معافی جرم ہے لیکن اگر وضاحت آپ نے کی تو مجھے یقین ہے کہ کافی معقول جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔''

انور نسیم کی اس بات کو ہضم کرنا پروین کے لیے بہت مشکل تھا کیونکہ اس طرح اس کی انگریزی دانی اور کامن سینس دونوں پر حملہ ہوتا تھا مگر وہ موقعے کی نزاکت کو دیکھ کر ایسے بھولی بن گئی جیسے اس نے یہ جملہ سنا ہی نہ ہو۔

جس پھرتی' مستعدی' آسانی اور منظم طریقے سے پندرہ منٹ کے اندر اندر ہمارے پاسپورٹوں پر ویزے لگائے گئے وہ ہمارے لیے ایک بہت خوشگوار تجربہ تھا۔ مغرب کی ترقی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں ہر شخص کے وقت کی قدر کی جاتی ہے اور بغیر

کسی ٹھوس وجہ کے کسی کے کسی بھی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی۔

ویزا لگوانے کے بعد بنک آف مونٹریال پہنچے۔ تین سو ڈالر کے ٹریولر چیک متعلقہ کاؤنٹر پر دیے۔ ایک منٹ کے اندر اندر ایک بہت میٹھی مسکراہٹ میں لپٹے ہوئے تین سو چورانوے کینیڈین ڈالر میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''دو ڈالر ہم نے بنک کے سروس چارجز کے طور پر کاٹ لیے ہیں۔'' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور دل میں کہا۔ ''بی بی' تم یہ سارے کے سارے رکھ لیتیں تو بھی جائز تھا کیونکہ ہم تو ان کے مریدوں میں سے ہیں جو ایک تل کے بدلے دو دو شہر بخش دیا کرتے تھے۔''

مشاعرہ ''ہالیڈے ان'' میں تھا اور بڑا ارسٹوکریٹک قسم کا تھا۔ اسٹیج پر کسی کانفرنس کے انداز میں میز کرسیاں اور گلدان وغیرہ سجے تھے۔ شاعروں کے ناموں کی خوشنما تختیاں' علیحدہ علیحدہ مائیکروفون' پانی کے گلاس' چائے کے کپ' ایش ٹرے اور الائچیاں ان کے علاوہ تھے۔

مسعودی عرب سے آئے ہوئے قافلے کے نئے شریک تسلیم الٰہی زلفی سے ملاقات ہوئی۔ دبلے پتلے' لمبے اور پانوں بھری پر خلوص مسکراہٹ والے زلفی کا نام رسالوں میں نظر سے گزرتا رہتا تھا' معلوم ہوا کہ موصوف سعودی ائیر لائنز میں ملازم ہیں' خاندان والے تقسیم و پاک وہند سے پہلے کے سعودی عرب میں مقیم ہیں گویا اب تقریباً وہاں کے ''لوکل'' بن چکے ہیں' کراچی میں تعلیم حاصل کی اور ایوب خاور کے گہرے دوست ہیں۔ میں نے کہا۔ ''یار' تم رنگ' قد' خلوص اور محبت وغیرہ وغیرہ میں تو ایوب خاور پر گئے ہو' یہ بتاؤ کہ شاعری میں کوئی جدا راہ نکالی ہے یا وہاں بھی......؟''

مشترکہ دوست کا یہ حوالہ ہماری Instant بے تکلفی کا ذریعہ بن گیا اور مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے پہلے ہم آپس میں کچھ اتنے گھل مل گئے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ زلفی کی نشست میرے ساتھ تھی مگر وہ اپنی سیٹ پر بہت کم وقت بیٹھا اور زیادہ عرصہ شاعروں اور سامعین کی تصویریں اتارتا رہا۔ اس کے کیمرے کے رخ سے مجھے اندازہ ہوا کہ نوجوان خاصا خوش ذوق واقع ہوا ہے۔

آٹوا کے سامعین یا تو ضرورت سے زیادہ سمجھدار تھے یا اپنی ''افسریوں'' کی وجہ سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ حقیقت کچھ بھی ہو انہوں نے یہ مشاعرہ کچھ اس طرح سے سنا جیسے فٹ بال کے ایک میچ میں ایک گھنٹہ دیر سے پہنچنے والے تماشائی نے سکو پوچھا۔

''کتنے گول ہوئے؟''

''کوئی نہیں۔ ابھی تک مقابلہ صفر صفر سے برابر ہے۔''

''چلو اچھا ہے اس کا مطلب ہے میں نے کچھ مس نہیں کیا۔''

اس کے باوجود وہ ہمارے یہاں کے ان ''افسر'' سامعین سے بہتر تھے جو داد کے لیے یا تو بڑی خسروانہ ادا کے ساتھ سر ہلا کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہیں یا اچھا شعر سن کر زور سے ہنس پڑتے ہیں۔ ایک ایسے ہی ہیوی ویٹ اور افسر قسم کے صاحب صدر کو ہم نے ایک مشاعرے میں دیکھا کہ موصوف داد دینے کے لیے فضا میں ایک زوردار قہقہہ چھوڑتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ شاعر کی کمر پر زور زور سے ہاتھ بھی مارتے جاتے تھے۔ ان کی اس کارروائی کے نتیجے میں مشاعرے کے اختتام پر گیارہ شاعر نیم بیہوش اور دو مکمل بیہوش پائے گئے۔

ہمارے سفیر الطاف صاحب اور ہندوستانی سفارت خانے کے سیکرٹری عتری صاحب بھی شاعروں کے ساتھ اسٹیج پر بٹھائے گئے تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر دو حضرات نے مختصر تقریریں بھی کیں جنہیں سامعین نے ایسے ضبط و تحمل سے سنا جیسے یہ بھی مشاعرے ہی کا حصہ تھیں۔

اس مشاعرے کی ایک خاص بات ہال کے باہر کوٹ وغیرہ رکھنے والی وہ خاتون بھی تھی جو بار بار حیرت بھری آنکھوں سے ہال میں جھانکتی اور پھر کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں کندھے جھٹک کر واپس چلی جاتی تھی مگر عالی کے دوہوں کی تان اور اٹھان سن کر وہ ایسی متاثر ہوئی کہ جب انہوں نے آخر میں 'جیوے جیوے پاکستان' سنایا تو وہ بھی سب کے ساتھ ساتھ اس میں آواز ملا کر نہ صرف گانے لگی بلکہ کوٹ واپس کرتے وقت اس نے عالی سے خاص طور پر ہاتھ بھی ملایا۔ اس پر مجھے بڑے قاسمی صاحب کا سنایا ہوا ایک واقعہ بہت یاد آیا۔

احمد ندیم قاسمی راوی ہیں کہ ایک مضافاتی مشاعرے میں علاقے کے اسسٹنٹ کمشنر اور تحصیل دار وغیرہ نے پٹواریوں کے ذریعے بہت سے کسانوں کو زبردستی مشاعرہ گاہ میں لا جمع کیا تاکہ سامعین کی تعداد معقول ہو جائے۔ بیچارے سیدھے سادے ان پڑھ دیہاتی حیران و پریشان بیٹھے مشاعرہ دیکھ رہے تھے اور اپنے ''افسروں'' کے ڈر سے ''تک تک دیدم دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں منور سلطانہ لکھنوی کا نام پکارا گیا۔ انہوں نے آ کر اپنے مخصوص انداز میں ایک تان لگائی تو پہلی بار ان سامعین کی صفوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ ایک دیہاتی نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور زور سے پکارا۔ ''بی بی! اللہ تیکوں حج کرائے۔''

میں نے عالی جی کو یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے ایک مصنوعی خفگی کی نظر مجھ پر ڈالی اور بولے۔ ''آپ لوگوں نے اس فدوی کی گلے

بازی اوائل جوانی میں مشاہدہ نہیں کی ورنہ یقین کامل ہے کہ آپ لطافت ترنم کو یوں نشانہ تضحیک و باعث الزام نہ بناتے۔''

میر امن کی زبان میں گفتگو کا یہ سلسلہ کئی روز سے ہم نے جاری کر رکھا تھا چنانچہ میں نے اسی انداز میں کلاسیکی نثر کا نمونہ پیش کیا۔
''در آنحالانکہ اس ناچیز کا مقصد دشنہ ہائے الزام چلانا یا طنز خفی سے نشتر زنی کرنا نہ تھا لیکن اس کے باوجود اگر خاطر نازک پر یہ استنتاج بدیہی اثرات ناگواری چھوڑ رہا ہے تو میں اپنے الفاظ ادا کردہ بہ حسرت و یاس واپس لیتا ہوں۔''

پروین کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا اور وہ کوٹ پہنانے والی ہم تینوں کو چند لمحے حیرت بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد کندھے جھٹک کر چلی گئی۔

رات کا کھانا جو اب اگلی صبح کا کھانا ہو چکا تھا' تقریباً دو بجے شاہین کے گھر کھایا گیا۔ شاہین اردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ کسی زمانے میں شاہین غازی پوری کے نام سے لکھتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ان کا پورا نام ولی الرحمٰن شاہین ہے۔ برسوں سے آٹوا میں مقیم ہیں۔ کلام کا دوسرا مجموعہ ''بے نشان'' دو برس قبل شائع ہوا تھا اور ان دنوں اپنے کاروبار میں سیٹ ہونے کے بعد انگریزی زبان میں اردو شعر و ادب کے تراجم پر مشتمل ایک سہ ماہی مجلہ شائع کرنے کا ارادہ باندھ رہے ہیں۔ شاہین ایک سیدھے سادے' کم گو' شریف الطبع اور محبت کرنے والے صلح کل انسان ہیں مگر یہ خبر ہمارے لیے بہت حیرت اور مسرت کا باعث تھی کہ ان کا بیٹا کینیڈا کی ریسلنگ ٹیم میں اپنے مخصوص وزن میں چیمپئن کا درجہ رکھتا ہے اور بے شمار نیشنل اور انٹرنیشنل مقابلوں میں اعزازات حاصل کر چکا ہے۔ ان کی بچیوں اور بیگم نے ہمارے لیے طرح طرح کے کھانے تیار کر رکھے تھے مگر رات بہت زیادہ ہو جانے اور تھکن اور نیند کی وجہ سے کسی کی طبیعت راغب نہیں تھی سو اس وعدے پر ٹھہری کہ صبح مونٹریال جاتے ہوئے ناشتہ ان کی طرف کیا جائے گا۔ یہ ناشتہ بریک فاسٹ اور لنچ کے مکسچر کی صورت میں بطور ''برنچ'' کیا گیا اور خوب ڈٹ کر کیا گیا۔ زلفی نے پیٹ میں گرانی کا عذر کر کے ہاتھ کھینچ لیا تھا لیکن جب شاہین کے پہلوان بیٹے نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی تو اس نے کچھ سوچ کر چپ چاپ دوبارہ کھانا شروع کر دیا۔

◆◆◆

مونٹریال۔ ۲

کینیڈا کے فاصلوں اور موسم کے پیش نظر اشفاق نے سارا سفر ہوائی جہازوں پر رکھا تھا لیکن جس طرح فراوانی اور یکسانیت من و سلویٰ سے منہ پھیر دیتی ہے اس طرح ہم بھی لاہور سے آٹوا تک جہازوں اور ائیر پورٹوں کی ایک سی شکلیں دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکے تھے۔ طے یہ پایا کہ آٹوا سے مونٹریال تک بائی روڈ سفر کل دو گھنٹے کا ہے چنانچہ کم از کم اتنا کینیڈا تو قریب سے دیکھ لیا جائے۔ انور نسیم شاہین اور شاہین کے بیٹے کی موٹروں میں لد کر یہ قافلہ سوئے مونٹریال روانہ ہوا تو ہم سفری کے لیے بارش بھی ساتھ ہو لی۔ سردی' کہر اور بارش نے مل جل کر کچھ ایسا سماں باندھا کہ باہر کے مناظر "ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے" کی زندہ تصویر بن کر رہ گئے۔ بارش کے دوران ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنا بڑا تکلیف دہ تجربہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اس طرف کا وائپر شیشے کو پوری طرح صاف نہیں کرتا اور دل کو ہمہ وقت یہ وہم لگا رہتا ہے کہ ڈرائیور کو بھی سڑک اسی طرح نظر آ رہی ہے (یا نہیں آ رہی) جس طرح کہ ہمیں

آنکھ دھندلائی ہوئی تھی' شہر دھندلایا نہ تھا

بیس دن کے بعد مونٹریال واپس پہنچے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو تھی البتہ سڑکوں کے کنارے پر برف کے ڈھیر کی تہہ کچھ اور اونچی ہو چکی تھی۔ میں نے اس تبدیلی کی طرف اشارہ کیا تو کسی نے خود میرا شعر (جو میں نے گزشتہ رات کے مشاعرے میں پڑھا تھا) سنا کر مجھے چپ کروا دیا۔

کچھ ایسی برف تھی اس کی نظر میں
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا

آفاق حیدر کا گھر اس سست موج دن کا ساحل تھا چنانچہ یہ قافلہ وہیں جا کر رکا۔ آفاق حیدر کی بیگم ہندوستان سے آ چکی تھیں۔ ان لوگوں نے بڑی پر تکلف چائے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ میں نے کیک کے دوسرے ٹکڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ پروین معنی خیز انداز میں کھانسی۔ میرا ہاتھ وہیں رک گیا لیکن اس کی زبان چونکہ اسٹارٹ لے چکی تھی لہٰذا جب تک میری خوش خوراکی کا ڈھنڈورا اچھی طرح نہ پٹ گیا اسے چین نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد افتخار عارف بھی پہنچ گیا۔ وہ لندن سے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ اس کے آنے سے بیرونی مہمانوں کی تعداد چھ ہو گئی۔

افتخار عارف ٹی وی کے ذہنی آزمائش کے مشہور پروگرام ''کسوٹی'' کے حوالے سے پورے پاکستان میں ایک جانا پہچانا نام اور چہرہ تو تھا لیکن گزشتہ چند برسوں میں اس نے بطور شاعر اپنے لیے جو مقام پیدا کیا ہے اس کے حوالےسے اب وہ جدید نسل کے شعراء کی پہلی صف میں شامل ہو چکا ہے۔ شعر پڑھنے کا اس کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جس کی وجہ سے مشاعروں میں اسے بہت پسند کیا جاتا ہے لیکن ان سب اوصاف شاعری سے الگ بطور انسان وہ ایک انتہائی نفیس، ملنسار اور پسندیدہ شخصیت کا حامل ہے۔ اس کی پی آر کا دائرہ اب کراچی اور لاہور کی تنگنائے سے نکل کر تین براعظموں کے پھیلاؤ پر محیط ہے اور اگرچہ اتنے زیادہ دوست رکھنے والوں کی دوستی مشکوک ٹھہرتی ہے پھر بھی ذاتی طور پر گزشتہ دس برس میں میں نے اسے ایک اچھا دوست پایا ہے۔ وہ حسب معمول بہت جوش اور تپاک سے ملا لیکن اس کی آنکھوں کی الجھن اور بے چینی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اس کی وجہ وہاں پروین کی موجودگی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پروین جب شاعری کے میدان میں نووارد تھی اور ایف اے کی طالب کی حیثیت سے بین الکلیاتی مشاعروں میں حصہ لیا کرتی تھی تو اس وقت افتخار ایک بڑے بھائی اور سینئر کی طرح اس کے دوستوں میں پیش پیش تھا۔ پھر پروین کی ''خوشبو'' آئی اور آتے ہی پھیل گئی تو پتا نہیں کس رو میں افتخار نے مختلف احباب کو ایک خط لکھ مارا تھا جس میں ''خوشبو'' کے چار پانچ مصرعوں پر اپنا حق جتایا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مختلف رسائل میں انٹرویو دیتے ہوئے بھی اس نے اس مسئلے کو خاص طور پر اچھالا۔ پروین کا دکھ اور غصہ تو اپنی جگہ مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورت حال دونوں کے مشترکہ دوستوں کے لیے پیدا ہوگئی اور پھر ہوتی چلی گئی۔ معاملہ کچھ ایسا نازک اور جذباتی تھا کہ اگر شروع میں سنبھل جاتا تو سنبھل جاتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلوں میں پڑی ہوئی گرہیں مضبوط تر ہوتی چلی گئیں اور اگرچہ ایک وقت میں افتخار نے کچھ احباب کو بیچ میں ڈال کر وضاحت اور صلح صفائی کی کوشش بھی کی مگر اس وقت پروین نے مذاکرات سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس مسئلے پر کسی قسم کی بات کرنا اور سننا نہیں چاہتی اور نہ ہی وہ افتخار سے آئندہ بات چیت کی روادار ہے۔ سو اس شام فریقین کے درمیان جتنی برف موجود تھی اتنی شاید مونٹریال کی سڑکوں پر بھی نہیں تھی۔

افتخار کے بار بار کہنے کے باوجود میں نے اپنے آپ کو اس جھگڑے سے باہر رکھا اور افتخار کو بھی مشورہ دیا کہ اتنی بگڑی ہوئی بات ایک دم نہیں بن سکتی۔ اگر وہ سچ مچ اس مسئلے کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس جھگڑے کی بنیاد کچھ غلط فہمیوں کو قرار دیتا ہے تو اسے بالکل خاموش ہو جانا چاہیے اور اس کا ''ستارا'' وقت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ وقت بہترین منصف بھی ہے اور مرہم بھی۔

ایک بات کا البتہ دونوں نے خیال رکھا اور وہ یہ کہ اس کشیدگی کا پتا کسی اور کو نہیں چلنے دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اس عقلمندی

نے بہت سے ممکنہ ناخوشگواریوں کا راستہ روک دیا ورنہ بصورت دیگر بہت زیادہ بدمزگی بھی ہو سکتی تھی۔ یہ بات البتہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عارف جیسے ذہین' صلح کل' ذمہ دار اور محتاط شخص نے ایسا غیر محتاط بیان کیسے اور کیوں دیا تھا؟ آسکر وائلڈ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے اپنے خلاف لگائے گئے ایک الزام کو عدالت میں چیلنج کیا تھا اور اس کے بعد کیس ہار کر خود اندر ہو گیا تھا۔

میرا قیام اس بار بھی شبیر صدیقی کی طرف تھا۔ فائزہ فرانسین صدیقی نے ایسی نستعلیق اردو میں بھی مجھے خوش آمدید کہا کہ اگر مجھے اس کے کینیڈین نژاد ہونے کا علم نہ ہوتا تو میں اس کے کتھئی بالوں' نیلی آنکھوں اور چٹی چمڑی کے باوجود اسے فائزہ صدیقی لکھنوی ہی سمجھتا۔

مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو یوں لگا جیسے ''نیلام گھر'' میں آ گئے ہیں۔ چاروں طرف مختلف دکانوں اور سٹورز کے بینر اور پوسٹر نما اشتہار لگے تھے۔ مردوں' عورتوں اور بچوں کا ایک جم غفیر رنگی تقریبات کے لباسوں اور پکنک موڈ کے ساتھ مشاعرے کے آغاز کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے اس انتظار میں ہم بھی شامل ہو گئے کیونکہ تمام کے تمام منتظمین ایک کونے میں جمع ہو کر کسی نامعلوم مسئلے پر مسلسل بحث کئے جا رہے تھے۔ دوسرے کونے میں ماکولات و مشروبات کا ایک سٹال لگا ہوا تھا جس کے گرد ایک ایسی بھیڑ تھی جس مشاعرے کے اختتام تک کم نہیں ہوئی۔ اب یہ ان لوگوں کی ''سخن فہمی'' تھی یا محض اتفاق لیکن ہوا یوں کہ جب بھی کوئی شاعر کلام سنانا شروع کرتا مختلف سیٹوں سے کچھ عورتیں' مرد اور بچے اٹھتے اور سٹال پر جا کر خورد و نوش میں مصروف ہو جاتے اور آپس میں باتیں کرنے لگتے۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوؤں کے لیے یہ صورت حال بہت تکلیف دہ اور ناگوار تھی مگر منتظمین کے مسلسل اعلانات اور درخواستوں کے باوجود یہ سلسلہ نہ تو ختم ہوا اور نہ ہی اس میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ چائے کے وقفے کے دوران میں نے سب ساتھیوں کو ایک لطیفہ سنایا جس سے ان کے چہرے کے تکدر میں خاصی حد تک کمی ہو گئی۔

دلی کے ایک سینما گھر کی کینٹین پر مشہور ہندوستانی موسیقار آر ڈی برمن (جو ایس ڈی برمن کے بیٹے ہیں اور اپنی پاپ اور پر شور ماڈرن دھنوں کے لیے مشہور ہیں) کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی جس پر کینٹین کا مالک روزانہ نیا ہار ڈالتا تھا اور کینٹین کھولتے اور بند کرتے وقت اسے پرنام کرتا تھا۔ ایک دن کسی نے پوچھا کہ بھئی آخر برمن صاحب سے تمہیں اتنی عقیدت کیوں ہے؟ ملک میں ان سے بڑے اور بہتر موسیقار بھی موجود ہیں۔

کینٹین والے نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے گھر ہوں گے جی' ہمارے ان داتا اور بھگوان تو یہی اپنے آر ڈی برمن ہیں۔''

''مگر کیوں؟'' اس شخص نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''ایسی کیا خاص بات ہے ان میں؟''

''خاص بات یہ ہے کہ جناب کہ سینما میں تو فلمیں لگتی اترتی رہتی ہیں۔ عام فلم میں صرف انٹرول کے دوران لوگ میری کنٹین پر آتے اور کھاتے پیتے ہیں مگر جب آر ڈی برمن کے میوزک والی کوئی فلم لگتی ہے تو گانا شروع ہوتے ہی لوگ اٹھ اٹھ کر باہر آنا شروع کر دیتے ہیں اور میرا کاروبار چمک اٹھتا ہے تو میرے تو یہ بھگوان ہوئے ناجی۔''

جب سے مشاعروں کا یہ سلسلہ شروع ہوا تھا ایک بات بغیر کہے طے ہوگئی تھی کہ صدارت علی سردار جعفری کیا کریں گے کیونکہ وہ عمر میں ہم سب سے بزرگ ہیں مگر مونٹریال میں یہ روایت یوں ٹوٹ گئی کہ وہاں کے منتظمین صدارت کے لیے عالی کے نام کا نہ صرف اعلان کر چکے تھے بلکہ مشاعرہ گاہ میں بھی انہوں نے اس مضمون کا ایک بینر لگا رکھا تھا۔ ہم نے انہیں جعفری صاحب کی سنیارٹی کا حوالہ دے کر سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانے۔ ہم نے بھی اس خیال سے زیادہ زور نہیں دیا کہ اب مشرق کی رسمیں دیار مغرب میں کہاں تک نبھاتے جائیں۔ یہاں کس کے پاس ان باتوں کے لیے فالتو وقت ہے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ ابھی دو تین مقامی شاعروں نے پڑھا تھا کہ سردار جعفری نے طبیعت میں گھبراہٹ کا اعلان کیا' کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹیج کے عقبی حصے میں نیم دراز ہوگئے اور دس منٹ بعد انہوں نے بتایا کہ وہ مشاعرہ چھوڑ کر جا رہے ہیں تا کہ ڈاکٹر سے مشورہ اور آرام کیا جا سکے۔ ہم سب اور منتظمین نے بہت زور لگایا کہ وہ تبرکاً ہی دو تین شعر سنا دیں مگر نجانے کیوں انہوں نے کسی کی بھی بات نہ سنی اور اٹھ کر چلے گئے۔ اگرچہ میرا دماغ میرے دل کے ساتھ ہم آواز نہیں مگر دل یہی کہتا ہے کہ جعفری صاحب کی طبیعت واقعی خراب تھی اور ان کے لیے وہاں بیٹھنا ممکن نہیں تھا اور یہ کہ اس کا کوئی بھی تعلق صدارت کے مسئلے سے نہیں۔ کلاسیکی ادیب ایسے موقعوں پر اپنی بات کی وضاحت کے لیے کوئی حکایت بیان کیا کرتے تھے چنانچہ میں بھی ان کی تقلید کی کوشش کرتا ہوں۔

ایک شرابی اوورکوٹ کی اندرونی جیب میں سرخ شراب کی بوتل رکھے جھومتا جھامتا جا رہا تھا کہ ایک بس نے اس کو پیچھے سے زوردار ٹکر ماری۔ شرابی الٹ کر گرا۔ چند لمحوں بعد جب اس کے حواس ذرا قابو میں آئے تو اس نے دیکھا کہ عین بوتل والی جیب کے قریب سے کوئی سرخ رنگ کی سیال شے بہہ رہی ہے۔ شرابی نے ہاتھ سے اس سیال کو چھوا اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر دعائیہ کلمات میں بولا۔ ''اللہ کرے..... یہ میرا خون ہو۔''

مشاعرہ گاہ سے نکلے تو سردی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ''میرے پاس نہ آؤ' تیز ہوا کے جھکڑوں' برفانی کیچڑ اور سنسان سڑک پر کھڑے ہم لوگ اپنی اپنی سواریوں کا انتظار کر رہے تھے جو غالباً فاصلے پر پارک کی گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ فاصلہ زیادہ نہ ہو صرف ہمیں ایسا لگ رہا ہو۔ گھر پہنچ کر فائزہ نے محاورے والی لپک جھپک کے ساتھ کھانا گرم کیا اور آواز لگائی۔ ''آ جائیے میاں صاحب'

کھانا تیار ہے۔''

عالی فائزہ سے زیادہ اس کی اردو سے متاثر تھے اور مسکرا مسکرا کر اسے نہ صرف داد دیتے بلکہ یہ بھی بتاتے تھے کہ اہل زبان کی داد کا مطلب سند ہوتا ہے اور یہ سند وہ ہما شما کو نہیں دیا کرتے' مثلاً پنجاب والوں کو اب تک نہیں ملی۔

میں عام طور پر خاصی بلند آواز میں بولتا ہوں' محفل بے تکلف ہو تو والیوم مزید بلند ہو جاتا ہے۔ اگلی صبح ناشتے کی میز پر (جو کچن ہی کے ایک کونے میں واقع تھی) عالی' شبیر اور میں کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ کسی بات پر ہم تینوں زور سے ہنسے (میرا قہقہہ بلند تر تھا) فائزہ نے انڈوں کی ڈش میز پر رکھی اور مسکرا کر کہا۔'' آج ناشتہ انہی برتنوں میں ملے گا کیونکہ میں اس ماحول میں اپنے چینی کے برتن نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

اس پر جو قہقہہ پڑا اس کی گونج اگلے دو دن تک فضا میں رہی کیونکہ یہ جملہ ہر نئے آنے والے کو سنایا جاتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایم اے اردو کی کلاس میں ڈاکٹر وحید قریشی (جواب مقتدرہ قومی زبان کو پیارے ہو چکے ہیں) اس قدر بلند آواز میں لیکچر دیا کرتے تھے کہ بلا مبالغہ ان کی اواز تیسرے کمرے تک جاتی تھی۔ ایک دن جب ان کا لیکچر پنچم سر میں جاری تھا اور ان کی آواز کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا کر چاروں طرف گونج رہی تھی۔ سب سے اگلی لائن میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔'' کیا ہوا؟'' لڑکی نے عجیب بے بسی کے ساتھ جواب دیا۔'' سر' آواز نہیں آ رہی۔''

لیکن اس سے بھی اچھا تبصرہ شاید میرے قہقہے پر گلزار وفا چوہدری کا ہے۔ میں ان دنوں پنجاب آرٹ کونسل میں ڈپٹی ڈائریکٹری کیا کرتا تھا (جو شاہراہ قائد اعظم پر واقع تھی) اور قاسمی صاحب کے ''فنون'' کا دفتر انارکلی میں ہوا کرتا تھا۔ قاسمی صاحب راوی ہیں کہ وہ اور گلزار دفتر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ گلزار نے کہا کہ یہ امجد کے ہنسنے کی آواز ہے۔ اوپر پہنچے تو میں وہاں نہیں تھا۔ گلزار نے فوراً کہا۔'' آواز اسی کی تھی' ہو سکتا ہے وہ اپنے دفتر میں ہنسا ہو۔''

اس دن ہم نے مونٹریال کا اسٹیڈیم دیکھا جہاں ۱۹۷۶ء کے اولمپکس ہوئے تھے۔ اولمپک ویلج دیکھا اور اس پہاڑی پر گئے جہاں سے پورا مونٹریال شہر دکھائی دیتا ہے اور بے شمار تصویریں اتاریں۔ موسم میں اگرچہ بہت خنکی تھی مگر اس کے باوجود ہوا میں ایک عجیب طرح کی مستی اور کیف انگیزی تھی۔ غالباً ایسی ہی مصفیٰ' مفرح اور گدگدانے والی ہوا میں غالب یہ شعر کہا تھا۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

گھاس کے میدان کے دوسرے سرے پر دو ستارے روشن ہوئے۔ جوں جوں درمیانی فاصلہ کم ہوتا گیا ان کے رنگوں میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ سنہرے بال، نیلی آنکھیں، کڑی کمان کے تیروں جیسے تنے ہوئے جسم جن کی گلابی رنگ ملبوس کے شوخ رنگوں کی گرفت میں آنے سے انکاری ہو رہی تھی اور قد ایسے کہ بے ساختہ دھیان ''دیوان غالب'' کی سیر کرنے لگے۔

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرائش

دونوں ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے چند لمحوں رکیں اور انتہائی خوشگوار اور پر لطف مسکراہٹ میں لپیٹ کر ایک خوبصورت ''ہائے'' ہمارے درمیان اس طرح لڑھکا دی کہ لو سنبھالو۔ "To whom it may concern"

میں اس وقت خالص پاکستانی انداز کی لمبی شلوار قمیض میں شبیر کی تصویر کے لیے پوز بنائے کھڑا تھا جب کہ عالی پروین کو مونٹریال کی تاریخ پر فرانسیسی اثرات کے متعلق ایک ایسا معلومات آمیز لیکچر دے رہے تھے جس کی اسے ہرگز کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تھوڑی دور جا کر وہ دونوں پھر رک گئیں اور مڑ کر ہماری دیکھنے لگیں۔ عالی نے اپنا لیکچر ادھورا چھوڑا، ان کی طرف دیکھا، مسوڑھوں پر انگلی پھیری، مخصوص انداز میں دانت کٹکٹائے، دو تین ہنکارے بھرے اور پھر میرے قریب آ کر بڑے معنی خیز انداز میں پوچھنے لگے۔

''کیوں میاں، وہ دوسرا مصرعہ کیا ہے اس کہ .... سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ غالب کے ان چند شعروں میں سے ہے جو ایک ہی مصرعے میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اس وقت ایک اور غزل کا ایسا ہی ایک ''شعر گیر'' مصرع مجھے بھی یاد آ رہا ہے۔''

بولے۔ ''کیا؟''

عرض کیا۔ ''مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس''

کہنے لگے ''مگر اس میں تو زلف سیاہ، رخ پہ پریشان کئے بغیر بات نہیں بنتی، آپ اس کی بجائے ''اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ'' سے کام چلا لیجئے۔''

ہماری یہ ذو معنی گفتگو شاید کچھ دیر اور جاری رہتی لیکن فلیش کے ایک ہلکے سے جھماکے نے توجہ اپنی طرف کر لی۔ معلوم ہوا کہ ستارے فوٹو گرافی بھی کرتے ہیں۔

رات کا کھانا اگرچہ شبیر ہی کے گھر پر تھا مگر اس نے ہمارے اعزاز میں بہت سے احباب کو بھی بلوا لیا تھا۔ فائزہ اور اس کی مصری شاہ لاہور کی دیسی بھابی نے بہت مزیدار کھانے تیار کیے تھے جن سے اس قدر انصاف کیا گیا کہ چند ہی لمحوں میں ڈائننگ ٹیبل پانی

پت کی تیسری لڑائی کا منظر پیش کرنے لگی اور خاتون خانہ کو مفرور مرہٹوں کی تلاش میں بار بار کچن کے چکر لگانے پڑے۔

مہمانوں میں ن م راشد کے داماد راجہ فاروق حسن اور اور ان کی بیگم یاسمین راشد بھی شریک تھے۔ فاروق حسن کو میں نے تقریباً اٹھارہ برس کے بعد دیکھا تھا۔ میرے اورینٹل کالج کے زمانہ طالب علمی میں وہ غالباً گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھایا کرتے تھے اور جیلانی کامران کے ساتھ مل کر آزاد نظموں کی ایک کتاب مرتب کر رہے تھے۔ یہ تعارف یہیں تک محدود تھا اس لیے ان کے مزاج٬ عادات اور شخصیت کے بارے میں میری معلومات بھی کم و بیش اتنی ہی تھیں جتنا وہ میرے بارے میں جانتے تھے مگر یہ ادب کا راستہ ایسا ظالم ہے کہ ایک پل میں زمان و مکان کی حد بندیوں کی تہس نہس کرتا ہوا منظروں پہ شامیانے کی طرح تن جاتا ہے۔

سو اس کیس میں بھی یہی ہوا اور چند لمحوں میں ہم اس طرح گھل مل کر باتیں کرنے لگے جیسے برسوں کی دوستی ہو۔ ان کی بیگم میں راشد صاحب کی شباہت کے ساتھ ساتھ ان کی مخصوص خود پسندی اور Arrogance بھی نظر آئی۔ ممکن ہے وہ طبعاً کم آمیز اور کم گو ہوں۔

فاروق حسن نے بتایا کہ وہ یہاں کے ایک کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں اور بال بچے پالتے ہیں۔ شاعری سے ''چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے'' قسم کا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں کہ یہ کافر بھی منہ سے لگ جائے تو پھر جیتے جی چھٹتی نہیں۔ انہوں نے اپنا مجموعہ کلام مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ بعض بہت اچھی نظمیں تھیں۔ کئی اچھی نظمیں جیلانی کامران کے ہاں بھی ملتی ہیں لیکن دونوں احباب نامعلوم کیوں ادب میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جو ان سے کہیں کمتر درجے کی شاعروں کو حاصل ہو گیا ہے۔ فاروق کتابوں اور رسائل کے ذریعے اردو شعر و ادب میں ہونے والی تمام تبدیلیوں اور کارروائیوں سے باخبر تھے۔ انہوں نے منہ سے تو نہیں کہا مگر پتہ نہیں کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندر سے بہت تنہا ہیں اور اس مخصوص ثقافتی بعد کے شکار ہیں۔ جو مغرب میں ہر سوچنے والی مشرقی ذہن پر یلغار کرتا ہے۔

فاروق حسن سے ملاقات کے علاوہ اس رات کی تین اور باتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک تو شبیر کے مہمان بھٹی صاحب کا گانا جس میں ان کا شوق شعر کے وزن اور موسیقی کی لے سے بار بار باہر کو چھلک رہا تھا مگر مجال ہے جو ان کے ماتھے پر پر کوئی شکن آئی ہو یا انہوں نے حاضرین کی مسکراہٹوں کا کوئی نوٹس لیا ہو۔ ان کے اس بے محابا شوق پر مجھے عالی کا ایک شعر یاد آ گیا جو میں نے ان کے کان میں سنا دیا۔ عالی کو شعر کے برموقع اور برمحل ہونے سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ مجھے ان کا شعر یاد تھا چنانچہ اس ایک شعر نے آئندہ کئی روز تک مجھے ان کی ''بہت اچھی کتابوں'' میں رکھا۔ شعر یہ تھا۔

ہائے نو مشق ادیبوں کا وہ انداز کلام
اپنے مکتوب' ترے نام' کئی یاد آئے

بھٹی صاحب نے مہدی حسن کی ایک غزل شروع کی۔ آواز اور طرز کی حد تک تو نقل سمجھ میں آتی ہے مگر انہوں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے بھی مہدی حسن کی یاد اس طرح تازہ کی کہ ایک صاحب بے اختیار ہو کر بول اٹھے۔ ''سبحان اللہ' اتنی تکلیف تو مہدی حسن کے چہرے پر نہیں ہوتی جتنی ماشاء اللہ بھٹی صاحب کے منہ پر نظر آ رہی ہے۔''

آخر میں ''لٹھے دی چادر'' کورس کی شکل میں گایا گیا اور ایسی ایسی بے سری آواز کان میں پڑی کہ بھٹی صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے استاد بڑے غلام علی خان نظر آنے لگے۔

دوسری بات ایک صاحب کی بدحواسیاں تھیں جو اپنی فوٹو گرافی کے کمالات سے جملہ حاضرین کو آگاہ فرمانا چاہ رہے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کمرے کے سارے فرنیچر کو کم از کم بیس مرتبہ تبدیل کرنے کے بعد انہوں نے کل چار تصویریں اتاریں اور اس دوران میں کوئی چھ مرتبہ کمرے کی ساری لائٹیں آف کروائیں کہ روشنی اور سائے کے ذریعے کچھ ''خصوصی تاثرات'' پیدا کرنا چاہ رہے تھے۔ تنگ آ کر میں نے ایک پرانا لطیفہ قدرے تبدیل کر کے سنایا جس سے اٹھنے والے قہقہوں کے شور سے خدا خدا کر کے انہوں نے ہماری جان چھوڑی۔ میں نے کہا۔ ''انہی صاحب (فوٹو گرافر) جیسے ایک فوٹو گرافر نے مردے کی تصویر اتارنے کے لیے اسے اتنی بار ہلایا جلایا کہ جب تصویر کھینچتے وقت حسب عادت ''ذرا مسکرایئے'' کہا تو وہ مردہ سچ مچ مسکرانے لگا۔''

تیسری بات پروین کے پرس کی گمشدگی تھی جس میں اس کے سارے پیسوں کے ساتھ ساتھ پاسپورٹ' شمالی امریکہ کا اندرون ملک مکمل ٹکٹ اور ایئر فرانس کا واپسی ٹکٹ بھی تھا۔ ہوا یوں کہ رات ساڑھے بارہ بجے محفل کے اختتام پر پروین' کرامت مرزا اور ان کی فیملی کے ساتھ آفاق حیدر کی طرف چلی گئی کہ اس کے قیام کا انتظام وہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت پرس اس کے ہاتھ میں تھا۔ باہر برف بھی تھی اور برفباری بھی چنانچہ جب وہ منہ سر لپیٹ کر موٹر سے نکلی تو گھر کے اندر پہنچ کر اسے پرس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ باہر آدمی دوڑایا گیا۔ کرامت ابھی موٹر موڑ ہی رہے تھے چنانچہ وہیں روک کر تلاشی کا عمل شروع کیا گیا۔ ہر ممکنہ جگہ کو دو دو تین تین مرتبہ چیک کیا گیا مگر وہاں پرس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کے بعد گاڑی کے باہر' اس کے رکنے کی جگہ پر' آفاق حیدر کے دروازے تک کے سارے رستے پر' غرضیکہ ہر اس جگہ بھی تلاش کیا گیا جہاں پرس کا ہونا ناممکن تھا۔ پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ موٹروں کی ہیڈ لائٹس اور ٹارچیں جلا کر برف کے طوفان میں سب لوگ ''پرس پرس'' کرتے پھر رہے تھے۔ ٹکٹوں اور پاسپورٹ کی گمشدگی سے پیش آنے والے متوقع

مسائل پر ایسی روح فرسا گفتگو کی گئی کہ پروین دہشت اور پریشانی کے سبب آبدیدہ ہوگئی۔ رات ڈھائی بجے پولیس کو فون کیا گیا کہ نئے کاغذات کی تیاری کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر پولیس کے متعلقہ لوگ پہنچ گئے۔ رپورٹ لکھی گئی۔ اس دوران میں تقریباً ہر آدمی نے ایک بار پھر موٹر کی تلاشی لی۔ وہاں سے سارا قافلہ کوئی چار بجے کے قریب شبیر کے گھر پہنچا کہ کہیں پرس وہیں نہ رہ گیا ہو۔ ان تمام جگہوں کی جانچ پڑتال کی گئی جہاں اس شام پروین بیٹھی' رکی' اٹھی یا کھڑی ہوئی تھی۔ مہمانوں کی فہرست پر نظر ڈالی گئی۔ ان کے ماضی کے کارناموں اور چوری کرنے کی صلاحیت اور امکانات کا جائزہ لیا گیا۔ مختلف مہمانوں کے بچے اور ان کی حرکات و سکنات زیر بحث آئیں مگر اس سارے عمل میں پروین کے پاس پرس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ہم نے اسے بہت حوصلہ دیا کہ تم میں پہلی مسافر نہیں ہو جس کا سامان گم ہوا ہے اور یہ کہ مسئلے اسی لیے ہوتے ہیں کہ انہیں حل کیا جائے مگر اس کے چہرے کی پریشانی اور آواز کی لرزش صاف کہے دے رہی تھی کہ ہماری باتیں وہ سن تو شاید رہی ہے سمجھ بالکل نہیں رہی۔

بڑی مشکلوں سے اسے حوصلہ وغیرہ دے کر واپس آفاق حیدر کے گھر بھیجا گیا کہ اب سو جاؤ' صبح دیکھی جائے گی مگر سچی بات یہ ہے کہ اندر سے ہم لوگ بھی بہت پریشان تھے کیونکہ پاسپورٹ کی گمشدگی کا تعلق نہ صرف پورے پروگرام میں بدنظمی سے بلکہ پروین کی شدید پریشانی سے بھی تھا جس نے اسے حواس باختہ کر رکھا تھا۔

صبح سوا سات بجے کے قریب فائزہ نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ کرامت مرزا کا فون آیا ہے' پروین کا پرس مل گیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اسی گاڑی سے ملا ہے جس کی ان سمیت کم از کم بیس آدمی تلاشی لے چکے تھے۔ پتا نہیں کیسے وہ سیٹ کے استر سے ہوتا ہوا اس کے نچلے حصے میں ایسی جگہ چلا گیا تھا جہاں کسی کی نظر نہیں پڑ سکی۔ اب پروین کو اطلاع دینے کے لیے آفاق حیدر کی طرف فون کیا گیا۔ نمبر Engage تھا۔ دوبارہ کوشش کی گئی جو اس کے بعد آئندہ ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ بستروں سے چونکہ ہم نکل چکے تھے اس لیے وہیں بیٹھے بیٹھے ناشتہ بھی فرمایا گیا اور یہ پورے سفر کا غالباً پہلا ناشتہ تھا جو ناشتے کے صحیح اور شریفانہ وقت پر کیا گیا۔ نو بجے آفاق حیدر کے گھر سے کسی نے فون اٹھایا۔ معلوم ہوا کہ پروین کے پرس کے بارے میں انکوائریوں سے تنگ آ کر ریسیور فون سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس دوران میں کرامت مرزا بمعہ پرس وہاں پہنچ چکے تھے کیونکہ پروین کے ہنسنے کی آواز (جو عام حالات میں اس کے قریب کھڑے ہونے پر بھی نہیں آتی) صاف سنائی دے رہی تھی۔

گزشتہ دنوں میں کئی بار منتظمین کے ہجوم میں ایک چھوٹے قد کے چست و چالاک اور گورے چٹے نوجوان سے ملاقات ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ موصوف کا نام رزاق ہے' آزاد کشمیر کے علاقے باغ کے رہنے والے ہیں اور یہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں

بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ آج کل میک گل یونیورسٹی میں سیاسیات پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ آج ان کے ساتھ میک گل یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات جانے کا پروگرام تھا۔ جس کے لیے عالی چار پانچ بہت وزنی قاموسیں پاکستان سے لے کر چلے تھے۔

باہر نکلے تو برف بڑے زوروں سے پڑ رہی تھی۔ ہلکی ملگجی سی روشنی میں پورا شہر برف کا گولا بنا ہوا تھا۔ یونیورسٹی کیمپس پہنچے تو معاملہ اور زیادہ خراب ہو گیا کیونکہ اب برف کی جگہ تیز بارش نے لے لی تھی۔ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹے اور چمٹے ہوئے تیز تیز قدموں سے آجا رہے تھے اور جگہ جگہ موٹریں دو دو فٹ گہری برف میں دھنسی کھڑی تھیں۔ رزاق نے گاڑی پارک کرنے کے لیے شعبہ اسلامیات کی عمارت کے گرد پورا چکر لگایا اور بالآخر ایک ایسی جگہ ڈھونڈ ہی نکالی جہاں برف دو فٹ سے ایک آدھ انچ کم تھی۔ لیکن اس ''عظیم'' دریافت کا نقصان یہ ہوا کہ ہمیں تقریباً سو گز کھلے میں سے بھاگ کر جانا پڑا اور اس دوڑ کے دوران اندازہ ہوا کہ جسے ہم ''بے حیائی'' سمجھ رہے تھے وہ اسی طرح کے ''نظریہ ضرورت'' کا نمونہ تھی جس کے تحت ہمارے یہاں ہر دوسرے چوتھے سال مارشل لاء لگایا جاتا ہے۔

شعبہ اسلامیات کے سربراہ ڈاکٹر لٹل کا کمرہ کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا اس طرح کے پروفیسروں کا ہوا کرتا ہے۔ کتابوں سے بھری ہوئی کچھ الماریاں' ایک میز' چار پانچ کرسیاں اور ایک سفید بالوں والا سر۔ عالی اور ڈاکٹر لٹل میں چند منٹ لسانیات کے حوالے سے رسمی قسم کی نیم علمی گفتگو ہوئی۔ عالی نے اسے انجمن ترقی اردو کے کارناموں سے آگاہ کیا اور اس مرد شریف نے کتابوں کے تحفے کے لیے ہم سب کا شکریہ ادا کیا۔ یہ ساری کارروائی کوئی بیس منٹ میں ختم ہو گئی۔ ہم نے شیشوں والی بڑی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش نے دوبارہ برف سے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ ہم نے سو گز کی ''پیش قدمی'' کے بارے میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر لٹل سے مزید بات چیت کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔

پتا نہیں عربوں کا کوئی ذکر تھا یا عربی زبان کا' میں نے محض گفتگو کی غرض سے فلسطینی مزاحمتی تحریک اور اس کے عربی اور بین الاقوامی ادب پر اثرات کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔ چونکہ میرے پاس اس گفتگو کے لیے زیادہ تر مواد اپنی ترجموں کی ایک کتاب ''عکس'' کا تھا اس لیے میں نے سید محمد کاظم صاحب کے لکھے ہوئے اس کتاب کے مقدمے کے حوالے سے صیہونیت اور اس کی تاریخ پر بڑی زوردار اور پر اعتماد گفتگو شروع کر دی۔ ڈاکٹر لٹل ایک دم ہمہ تن گوش ہو گیا اور بڑے دوستانہ اور مرعوبیت کے انداز میں مسکرایا۔ مجھے اور شہ مل گئی چنانچہ میں نے یہودی ذہن اور امریکی یہودی لابی کے حوالے سے اپنے بین الملی اسلامی جذبات کا بھی بھرپور مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس دوران میں عالی نے کئی بار دانت کٹکٹائے اور ہنکارے بھرے مگر روانی تقریر میں میں نے

ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ڈاکٹر لٹل کی کشادہ مسکراہٹ سمٹ کر اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے میں پریشان سی کھڑی ہے۔ وہ بار بار کبھی بالوں میں ہاتھ پھیرتا اور کبھی اپنے کان کی لو ملتا اور اس کی گردن ''یس یس'' کی نیم مردہ آوازوں کے ساتھ بہت آہستہ آہستہ مل رہی تھی۔ میں نے اپنی اینٹی یہودی تقریر ختم کرنے اور اپنے غم و غصے کے بھرپور اظہار کے لیے گفتگو کا آخری جملہ تشکیل دینا شروع کیا۔

So You see, Dr. Little, these Jews.... they are real....

اس سے پہلے میں کوئی ''اسم صفت'' استعمال کرتا' عالی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا اور کھڑکی سے باہر پر زور برف باری کی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں اب اجازت لیں۔ برف کا زور کچھ کم ہوا ہے۔'' ڈاکٹر لٹل کو یہ آئیڈیا اتنا پسند آیا کہ وہ ہم سے پہلے ہمیں الوداع کہنے کے لیے دروازے کی طرف چل پڑا۔

کمرے سے باہر آتے ہی عالی اور پروین نے میری کھچائی شروع کر دی اور مجھے پہلی بار پتا چلا کہ میں ایک اصلی اور نسلی یہودی کے سامنے اس کی قوم کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں واقعی بہت شرمندہ ہوا لیکن جب عالی اور پروین کی ہوٹنگ زیادہ ہی بڑھنے لگی تو میں نے دفاعی پینترا بدلا اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے مجھے اس بات کا پتا نہیں کہ ڈاکٹر لٹل یہودی ہے! بھئی یہ نام تو ہوتا ہی یہودیوں کا ہے۔ میں تو اصل میں بہانے بہانے سے اپنا غصہ نکال رہا تھا۔ ذرا ان کم بختوں کو بھی تو پتا چلے کہ ہم ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔''

اس کے بعد ایک ایسے بنگالی ہوٹل میں ایسی جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا جہاں سے برف باری کا منظر بہت دور تک نظر آتا تھا۔ یہاں سے پاکستانی قونصلیٹ گئے جہاں رزاق کے سر اکنا مک منسٹر تھے۔ واپسی پر ہم نے پروین کو آفر دی کہ ہم آفاق حیدر کے گھر سے اس کا سامان اٹھا لیتے ہیں کیونکہ اس طرح ہم تینوں ایک ساتھ ائیر پورٹ پہنچ سکیں گے مگر پروین بیگم کی پٹنے والی رگ پھڑک اٹھی۔ بولی ''نہیں بھئی' ان لوگوں نے انتظام کر رکھا ہے۔ آپ چلیں' ہم پہنچ جائیں گے۔''

جہاز کے ٹیک آف میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے اور عالی کا پارہ ایک سو پندرہ ڈگری سے اوپر اوپر کی طرف جا رہا تھا جب پروین دوڑتی' بھاگتی' ہانپتی' کانپتی' افتاں و خیزاں ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی بچہ رونے کے لیے بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔ ہم میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ جہاز میں سوار ہونے اور حفاظتی بیلٹ باندھنے کے بعد پروین کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا چنانچہ اس نے خود ہی بتانا شروع کر دیا کہ اس کی تاخیر کی وجہ بلکہ وجوہات کیا تھیں۔

معلوم ہوا کہ کرامت مرزا صاحب نے (جن کے ذمہ پروین کو ائیر پورٹ پہنچانا تھا) عین وقت پر فون کر دیا کہ ان کی موٹر میں سنو ٹائر نہیں اس لیے وہ یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکیں گے۔ کوئی اور موٹر موجود نہیں تھی۔ ہم لوگ بھی ائیر پورٹ کے لیے نکل چکے تھے۔ کسی اور منتظم سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یوں مونٹریال کا قیام کم از کم پروین کی حد تک قطعاً خوشگوار نہیں تھا۔

ٹورنٹو۔ ۲

ٹورنٹو ائیر پورٹ پر انصار اپنے اپنے مہاجرین کے انتظار میں کھڑے تھے۔ میرے میزبان جمال زبیری چونکہ خود ڈرائیونگ نہیں کرتے تھے اس لیے وہ عابد جعفری کو ساتھ لائے تھے۔ راستے میں جمال صاحب نے پہلے تو اپنی مزاحیہ شاعری کی غرض وغایت' تاریخ اور پس منظر پر روشنی ڈالی اور اس کے بعد مشتے از خروارے کے طور پر کچھ کلام بھی سنایا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس وقت مولانا چراغ حسن حسرت سے منسوب ایک واقعہ بہت یاد آیا۔

مولانا حسرت کے پاس ''امروز'' کی ایڈیٹری کے دنوں میں سٹاف کا ایک آدمی کوئی فکاہیہ مضمون بغرض اشاعت لکھ کر لایا۔ حسرت صاحب نے سارا مضمون پڑھا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

''یہ کیا ہے؟....... مولانا!''

''مزاحیہ مضمون ہے جناب۔'' مصنف نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

''تو اس کے ساتھ اوپر لکھ دیجئے نا' تاکہ لوگوں کو پتہ تو چل جائے۔''

جمال صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں' ان میں سوائے اس کے کوئی خرابی نظر نہیں آئی کہ وہ اپنی مزاحیہ شاعری کو بہت سنجیدہ لیتے تھے۔

صبح ناشتے کے دوران شکاگو سے افتخار نسیم کا فون آیا۔ معلوم ہوا وہ اور عرفان صوفی بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ اس فون کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ لاس اینجلس سے لندن تک کے درمیان جو تین چار دن ابھی تک مسئلہ زیر بحث بنے ہوئے تھے ان کا فیصلہ ہو گیا۔ طے پایا کہ میں اور پروین شکاگو جائیں گے' عالی جی کچھ پرانے دوستوں سے ملنے کے لیے پٹس برگ روانہ ہوں گے اور جعفری صاحب براہ راست بمبئی کی فلائٹ پکڑیں گے۔ میں نے افتخار نسیم کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور اس کے ساتھ ہی عرفان کو بھی فون پر اطلاع دے دی کیونکہ شکاگو اس سفر کے دوران میں پہلا شہر تھا جہاں قیام وطعام اور سیر وتفریح کا انتظام ہمیں خود کرنا تھا۔

ناشتے کے بعد جمال زبیری کے ساتھ ان کے گھر کے قریب ایک مقامی سٹور پر گئے جو اپنے طول وعرض' کشادگی اور اشیاء کی فراوانی کے اعتبار سے ہمارے یہاں کی بڑی بڑی مارکیٹوں کو شرماتا تھا۔ اگرچہ ہم برف میں سے چل کر آئے تھے مگر اندر درجہ حرارت

ایسا خوشگوار تھا کہ ہم نے دو دو بار آئس کریم کھائی تھی۔

دوپہر کو آختر آصف کے ساتھ ٹورنٹو کا سٹی ہال دیکھا جو بلاشبہ فن تعمیر کا ایک انوکھا شاہکار ہے۔ یہ عمارت ایک قوس کی شکل میں بنائی گئی ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شاہی مسجد لاہور کے صحن کی طرح اس کے سامنے بھی ایک وسیع و عریض سنگی پلیٹ فارم نما میدان تھا جس کے ایک کونے میں سکیٹنگ کورٹ بنا ہوا تھا جہاں کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں پاؤں میں اسکیٹنگ شوز پہنے جیسے برف کے فرش پر اڑتے پھر رہے تھے۔ اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ان حسن کے نمونوں (Models) میں کچھ تو ایسے تھے کہ

......ارے رے رے...... ارے رے رے...... ارے رے رے......

سٹی ہال کے اردگرد کا علاقہ بہت گنجان آباد تھا لیکن ٹریفک میں سہولت کے لیے زیر زمین رستوں اور پارکنگ لاٹس کا بے حد معقول انتظام تھا۔ چنانچہ شہر کی سڑکوں کے نیچے بھی اتنا ہی ہجوم تھا جتنا ان کی سطح پر تھا۔ اردو شاعری میں موت کے ساتھ زیر زمین ہونے کے جتنے مضامین ہیں سب کے سب وہاں انگشت بدنداں نظر آتے ہیں کیونکہ یہاں ''صورتیں'' خاک میں پنہاں ہونے کی بجائے وہاں سے نمایاں ہو رہی تھیں اور اس ضمن میں وہ ''لالہ و گل'' کا بھیس بدلنے کا تکلف بھی نہیں کرتی تھیں۔ ایسے ہی ایک مقام پر' جہاں زیر زمین راستے سے لوگ نکل کر سڑک پر آ رہے تھے آتش کا ایک شعر بہت یاد آیا۔

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قارون اپنے خزانوں سمیت زیر زمین سفر کرتا ہوا کولمبس سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔

ایک بہت بڑے شاپنگ مال میں ایک طرف آٹھ دس سینما ہال بنے ہوئے تھے جنہیں عرف عام میں منی تھیٹر کہا جاتا ہے۔ ہر تھیٹر میں تقریباً دو سو سیٹیں ہوتی ہیں۔ ایک ٹکٹ خرید لیں اور اپنی پسندیدہ فلم والے تھیٹر میں بیٹھ کر مزے سے جب تک جی چاہے فلم دیکھیں کیونکہ فلم مسلسل چلتی رہتی ہے۔ اگر آپ فلم کے وسط میں آئے ہیں تو اس کے ختم ہونے پر وہیں بیٹھے رہیے' ذرا سے وقفے کے بعد فلم دوبارہ شروع ہو گی اور یوں آپ فلم کا نادیدہ حصہ اسی ٹکٹ میں دیکھ سکیں گے۔ یہاں ہم نے ایک سائنس فکشن دیکھا' نام تھا "Terminator" اس میں بتایا گیا تھا کہ ۲۰۳۹ء میں ہماری دنیا کس حال میں ہو گی۔ مستقبل سے سفر کر کے خیر و شر کی قوتیں ایک روبوٹ نما مشینی اور گوشت پوست کے انسان کی شکل میں آج کے زمانے میں آتی ہیں۔ روبوٹ' جو کہ ہر لحاظ سے ایک ناقابل تسخیر مشینی مخلوق ہے' اپنی ساخت کے اعتبار سے حقیقی انسانوں جیسا ہے جس کے پاس دماغ بھی ہے اور جس کا مشن یہ ہے کہ وہ انسانوں

کے اس عظیم انبوہ میں سے اس لڑکی کو تلاش کر کے ختم کر دے جس کے پیٹ سے وہ بچہ پیدا ہونے والا ہے جو کرہ ارض کو تباہی بچانے کا باعث ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بچہ جو مستقبل میں ایک جوان آدمی بن چکا ہے' زمین پر آتا ہے اور اس کے بعد قتل و غارت اور فلم کی لیبارٹری تکنیک کا ایک ایسا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے جو جدید ایکشن فلموں کا مخصوص انداز ہے۔ فلم کی کہانی میں Fantasy کا استعمال الف لیلوی کہانیوں سے کم نہیں تھا۔ وہاں جادوگروں کی جان طوطوں میں ہوا کرتی تھی جس پر سوائے ہیرو کے تیر کے اور کوئی تیر نہیں لگتا تھا اور یہاں ولن کمپیوٹر کے بھیس میں تھا جس کی زد سے کہانی کی ہیروئین اور ہیرو کے سوا پوری دنیا غیر محفوظ تھی۔

خیر و شر کی اس ازلی اور ابدی کشمکش میں خیر کی فتح یوں ہوئی کہ متعلقہ خاتون روبوٹ کی تمام کوششوں کے باوجود حاملہ ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ کہانی کا انجام البتہ بہت خوبصورت اور معنی خیز تھا۔ مستقبل سے آئے ہوئے دونوں کرداروں کی ہلاکت کے بعد لڑکی اپنے بہت واضح پیٹ کے ساتھ ایک دور دراز ریگستانی علاقے کے پٹرول پمپ پر دکھائی جاتی ہے جہاں پٹرول بھرنے والا میکسیکن لڑکا گرد آلود آسمان کی طرف دیکھ کر اس سے کہتا ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔ اور جواب میں لڑکی پہلے اپنی طرف اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔ ''ہاں' مجھے پتا ہے۔''

میں نے سوچا جب یہ فلم پاکستان میں ریلیز ہوگی تو لاہور کے زندہ دل تماشائیوں کے مخصوص گروہ میں سے یقیناً کوئی یہ مشہور فقرہ دہرائے گا۔ ''بس کہانی کہانی ہے' سٹوری کوئی خاص نہیں فلم کی۔''

اگلے ہی روز اختر آصف اور عابدی جعفری نے ہمیں لینے آنا تھا۔ معلوم ہوا عابد کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی اس لیے وہ ہسپتال چلا گیا ہے۔ طے یہ پایا کہ پہلے اس کی تیمارداری کی جائے۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ موصوف راستے ہی مل گئے۔ عابد کو پیٹ میں السر کی شکایت تھی جس کی وجہ سے اکثر اسے گیس کی تکلیف رہتی تھی۔ میری زوجہ بھی اس مرض کے پرانے مداحین میں سے ہے چنانچہ اس موضوع پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ کھلا یہ کہ کم از کم اس میدان میں میڈیکل سائنس ہمارے حکیموں کی ''تبخیری گولیوں'' ''چورنوں'' ''کاسوری'' اور ''کارمینا'' وغیرہ کے قدم بہ قدم چل رہی ہے۔ ایک اسی طرح کی دیسی دوائی کے نام گیس گو پر ہم بہت دیر تک ہنستے رہے کہ انگریزی کے ان دو لفظوں سے یہ ترکیب شاید صرف ہمارے یہاں ہی بن سکتی تھی۔ میڈیکل سائنس کا تذکرہ چلا تو کسی نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔

چند برس قبل ''ہارٹ اٹیک'' کے موضوع پر ایک ریسرچ شائع ہوئی جس میں اس کے ہر پہلو پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی تھی۔ ایک صاحب سے اس پر رائے مانگی گئی تو انہوں نے بہت سوچ سوچ کر جواب دیا۔ ''اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا

ہوں کہ فیٹس کے زیادہ استعمال سے ہارٹ اٹیک ہوتا ہے کم استعمال سے کینسر۔“

عابد کی طبیعت ابھی تک مکمل بحال نہیں ہوئی تھی مگر اس نے بستر میں پڑنے کی بجائے ء ہمارے ساتھ گھومنے کو ترجیح دی۔ میری فرمائش پر اس نے اپنی کچھ غزلیں سنائیں جس سے دو فائدے ہوئے یعنی ہم نے کچھ اچھے شعر سنے اور عابد کے پیٹ کا اپھارہ ختم ہو گیا۔

جمال زبیری حسب معمول اپنی بلند بھاری اور گونجیلی آواز کے ساتھ اختر آصف کو ایسے شارٹ کٹ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے جن کے بارے میں ان کی اپنی معلومات ہر لحاظ سے بے حد ناکافی اور مشکوک تھیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ راستے کے غلط ہو جانے کے احساس کے بعد بھی ان کی آواز اور لہجے میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی تھی۔ ایک غلط موڑ کٹوانے کے بعد وہ تقریباً دو میل تک اس شبے کا اظہار کرتے رہے کہ ان کا فیصلہ صحیح تھا البتہ یہ سڑک کے اردگرد کی عمارتیں کسی غلط فہمی کی وجہ سے وہاں آ گئی ہیں۔ اس ساری کولمبیست کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایٹن سٹور کے جس حصے میں ہم نے افتخار عارف اور اشفاق کو سہ پہر تین بجے ملاقات کا وقت دیا تھا وہاں ہم شام ساڑھے پانچ بجے پہنچے۔ جائے مقررہ پر آئس کریم کھانے کے دوران جمال صاحب بڑی سنجیدگی سے اشفاق اور افتخار پر غائبانہ تنقید کرتے رہے کہ ان لوگوں کو وہیں رک کر ہمارا انتظار کرنا چاہیے تھا' کو مٹمنٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

اختر آصف اس روز بہت خوش تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کا لاٹری میں انعام نکل آیا ہے جس کی مالیت چار پانچ ہزار ڈالر کے لگ بھگ ہو سکتی ہے۔ دو دن پہلے مونٹریال جاتے ہوئے اسے ڈیڑھ سو ڈالر جرمانے کے ٹکٹ ملے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس کے بارہ ڈرائیونگ پوائنٹس میں سے دس پوائنٹ کٹ گئے تھے جو ایک انتہائی خطرناک بات تھی۔ آئندہ تین برس تک اسے صرف دو پوائنٹس پر چلنا تھا کیونکہ اس کے بعد تین سال کے لیے ڈرائیونگ لائسنس معطل کر دیا جاتا ہے جس کا کم از کم امریکہ اور کینیڈا کی زندگی میں صریحاً مطلب مفلوج ہو جانا ہے۔ اختر آصف نے بتایا کہ سات برس میں یہ اس کا پہلا چالان اور پہلا ہی انعام ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ تصویر کے دونوں رخ دن میں یکے بعد دیگرے سامنے آئے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ بیگم اختر آصف کی چند ماہ پہلے Open Heart Surgery ہوئی ہے اور انعام کی یہ خبر ان کے اس ڈیپریشن کو کم کرنے کا باعث ہوئی ہے جو ٹریفک چالان کے نتیجے میں ان پر طاری تھی۔

امریکہ اور کینیڈا میں کبھی کبھار کے سلسلہ وار حادثوں کو چھوڑ کر' جن میں کسی ایک تیز رفتار کار کے اچانک رکنے کی وجہ سے پیچھے آتی ہوئی کاریں ایک دوسرے سے ٹکراتی چلی جاتی ہیں۔ ٹریفک کے حادثوں کی اوسط ہمارے یہاں کی سڑکوں سے بہت کم ہے اس کی

وجوہات اچھی کشادہ اور ہموار سڑکیں' ٹریفک سگنل' بہتر گاڑیاں اور دست رفتار ٹریفک کی عدم موجودگی بتائی جاتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ان بارہ ڈرائیونگ پوائنٹس کا ہے جو ہر لائسنس یافتہ ڈرائیور کو دیے جاتے ہیں۔ ٹریفک قانون کی ہر خلاف ورزی پر جرم کے مطابق نقد جرمانے کے ساتھ ساتھ ان میں سے کچھ پوائنٹس بھی کاٹے جاتے ہیں اور اگر یہ ختم ہو جائیں تو تین سال تک ڈرائیونگ لائسنس معطل ہو جاتا ہے۔ اب اس تیز رفتار زندگی میں موٹر ایک ایسی مجبوری نما ضرورت بن چکی ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا تمام کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے سو ہر کوئی ان پوائنٹس کو بچائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور یوں حادثات کی شرح پر ایک خودکار قسم کا کنٹرول قائم رہتا ہے۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ قانون بنانے والوں سے قانون توڑنے والے زیادہ عقلمند اور تخلیقی ذہن کے مالک ہوتے ہیں تو یہ کچھ غلط نہیں کہا جاتا۔ وہاں کے لوگوں نے اس صورت سے بچنے کے لیے طرح طرح کے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ مثلاً اختر آصف کے کیس میں اس کے وکیل نے اسے یہ مشورہ دیا کہ تم اپنا کیس مونٹریال کی بجائے ٹورنٹو کی عدالت میں منتقل کروالو اور جواز یہ بناؤ کہ تمہاری بیوی کی اتنی خطرناک سرجری ہوئی ہے اور تم اسے اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ عدالت نے یہ درخواست مان لی تو تمہارے سارے کٹے ہوئے ڈرائیونگ پوائنٹس بحال ہو جائیں کیونکہ زیادہ تر کیسوں میں دوسرے علاقے کا متعلقہ پولیس آفیسر عدالت میں پیش نہیں ہوتا اور چونکہ اس کیس میں دوسری تاریخ نہیں پڑتی اس لیے عدالت اپیل کنندہ کے حق میں یک طرفہ فیصلہ دے دیتی ہے۔

واپسی پر کچھ دیر اختر آصف کے اپارٹمنٹ میں رکے۔ مزیدار چائے پی اور ٹورنٹو ٹیلیویژن کے اس پروگرام کی ریکارڈنگ دیکھی جس میں ہم سب مہمانوں کے انٹرویو دکھائے گئے تھے۔ اختر آصف کا گھر بھی اسی کی طرح خوبصورت اور دھیمے سروں والا تھا۔

رات کا کھانا ٹورنٹو کے معروف اردو ہفت روزہ ''پاکیزہ انٹرنیشنل'' کے ایڈیٹر صبیح الدین منصوری کی طرف سے تھا۔ اس تقریب کا اہتمام انہوں نے کشمیر ہوٹل میں کیا تھا۔ وطن سے بارہ ہزار میل دور یہ نام دیکھ کر مجھے اپنا چوک برف خانے والا کشمیر ہوٹل بہت یاد آیا جو فلیمنگ روڈ اور ریلوے روڈ کے سنگم پر واقع تھا اور جس کی ایک پہچان مبارک پینٹر کا نام ہوتا تھا جس کے بڑے بڑے بورڈ مختلف جگہوں پر آویزاں تھے اور جو خود پتا نہیں کب سے اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ اب نہ وہاں ہوٹل ہے نہ وہ بورڈ اور نہ مبارک پینٹر........ اللہ اللہ!

ہوٹل کا سٹاف دو تین پاکستانی نوجوانوں پر مشتمل تھا جو آقا اور ملازم کی تمیز سے بے نیاز مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ان

میں سے ایک خوش پوش سے نوجوان نے بار بار میری طرف کچھ بہت مانوس مسکراہٹیں ارسال کیں جن کی طرف لوگوں کے ہجوم اور میل ملاقات کے شور کی وجہ سے میں توجہ نہ دے سکا۔ تقریروں اور جوابی تقریروں کے بعد جب کھانا شروع ہوا اور لوگ ایک دوسرے سے زیادہ اپنی اپنی پلیٹوں کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ میرے پاس آیا اور اسی مانوس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں آپ کا پرانے محلے دار ہوں۔''

میں نے دوبارہ غور سے اس کی طرف دیکھا' ذہن اور یادداشت پر زور دیا مگر اس سے ملتی جلتی صورت کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے غالباً میرے تاثر کو بھانپ لیا تھا' بولا ''یہ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ میں فلاں صاحب کا داماد ہوں اور میری بیوی آپ سے پڑھتی بھی رہی ہے۔''

''فلاں صاحب'' کے حوالے سے مجھے یاد آیا کہ بی اے کے دنوں میں میں اپنے کزن کے ایک دوست کی دو بیٹیوں کو کچھ دن پڑھاتا رہا تھا مگر یہ بات پورے بیس برس پرانی تھی۔ اس وقت وہ بچیاں دس دس گیارہ گیارہ برس کی تھیں اور اس کے بعد سے میں نے انہیں آج تک دیکھا بھی نہیں تھا چنانچہ ان کے شوہروں کو تو کیا اگر وہ خود میرے سامنے آجاتیں تو شاید میں انہیں بھی پہچان نہ پاتا۔ اس کے بعد وہ اپنے بارے میں بتانے لگا کہ وہ یہاں کب سے ہے' کیسے آیا اور اب اسے کیا مسائل درپیش ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے محلے سے متعلق دکانوں' لوگوں' مکانوں اور دوسری مختلف چیزوں کو یاد کرنے لگے۔ اس دوران میں نہ معلوم کب پروین ہمارے قریب آ کھڑی ہوئی اور ہماری باتیں سننے لگی۔ اچانک میری نظر اس پر پڑی' میں نے کہا۔ ''تمہیں ہماری باتیں سمجھ نہیں آئیں گی۔ یہ ٹھیٹھ لاہوری پنجابی ہے' اصلی والی۔''

پروین بولی۔ ''میں وی چھ مہینے لاہور رہی آں۔''

میں نے کہا۔ ''جس طرح میر امن کو اردو دلی کا روڑا بن کر آئی تھی اسی طرح پنجابی بھی غیروں سے بے تکلف ہونے میں وقت لیتی ہے۔''

بولی۔ ''پنجابی زبان کا تو مجھے پتا نہیں البتہ پنجابی لوگ تو اس اصول پر عمل نہیں کرتے۔''

جملہ برجستہ بھی تھا اور زوردار بھی اس لیے میں نے کھسک جانے میں اپنی عافیت سمجھی اور ماہر نفسیات ڈاکٹر ریکس سیموئل سے گفتگو کرنے لگا جو ۱۹۵۰ء میں پاکستان سے یہاں آئے تھے اور اس وقت کے لوگوں کے بارے میں مجھ سے اس طرح پوچھ رہے تھے جیسے ہم سب اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔

اس شام کی سب سے دلچسپ بات عالی کے گردے کی پتھری کا اخراج تھا جس کے بارے میں وہ کئی برسوں سے پریشان تھے اور حالیہ چیک اپ سے پہلے تک بلکہ آج صبح تک اس سے ہونے والی تکلیف بلکہ تکالیف کا ذکر بڑے پرسوز لہجے میں کر رہے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ اس پتھری کو ٹوٹ کر خارج ہوئے کئی مہینے ہو چکے ہیں۔ عالی نے کہا۔ عالی نے کہا۔ "اس خوشی میں میں دو سو ڈالر تک خرچ کرنے کو تیار ہوں مگر یہ آفر آج رات بارہ بجے تک ہے۔"

ہم نے کہا۔ "یہ تو فاؤل ہے عالی جی' کیونکہ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے ہیں اور باہر برف پڑ رہی ہے' کھانا ہم پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں۔ آپ اس مدت میں توسیع کیجئے۔" بڑی مشکلوں سے عالی نے اس مدت میں ایک دن کا اضافہ کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کل رات تک اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو پھر جرمانے میں ہماری طرف ڈالر نکلنے شروع ہو جائیں گے سو طے یہ پایا کہ اس رقم کا مصرف کل نیاگرہ آبشار کی سیر کے دوران سوچا اور عمل میں لایا جائے گا۔

آٹوا سے چلتے وقت ڈاکٹر انور نسیم نے دو عدد خالی ٹیپ مجھے اور پروین کو دیتے ہوئے فرمائش کی تھی کہ ہم اس پر ان کے لیے اپنا "کلام بلاغت نظام" ریکارڈ کر دیں تا کہ وہ بعد میں اسے سنتے اور سر دھنتے رہیں۔ اگلی صبح میں نے اپنی کتابیں کھولیں اور نظمیں غزلیں ریکارڈ کرنا شروع کیں۔ ایک گھنٹے کی اس مشقت کے بعد جب میں نیچے ڈرائنگ روم میں آیا تو بیگم زبیری کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار پائے۔ کہنے لگیں "میں دو تین بار آپ کو ناشتے کے لیے کہنے گئی تھی مگر آپ کے کمرے سے عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں سو میں پلٹ آئی۔ خیریت تو تھی؟" میں نے انور نسیم کی فرمائش کا احوال سنایا تو جمال بے طرح ہنسنے لگے' بولے۔ "بھئی ہماری بیگم صاحبہ تو بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ بار بار مجھ سے کہتی تھیں' اے میاں! ذرا پتا تو کرو' کہیں ہمارے مہمان کا دماغ تو نہیں چل گیا۔" بیگم جمال ذرا جھینپ گئیں مگر میں نے اسے حوصلہ دیا کہ اس میں آپ کا قصور نہیں۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتا۔ اب پتہ چلا کہ غالب نے "کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے" کیوں کہا تھا۔

نیاگرا کی سیر کے لیے پروگرام بننا شروع ہوا تو یکے بعد دیگرے بہت سے پارٹیاں میدان سے بھاگ گئیں۔ سردار جعفری اور عالی نے طبیعت کی خرابی کا بہانا بنایا۔ عابد جعفری' اختر آصف' جمال زبیری اور خالد سہیل بھی کسی نہ کسی وجہ سے تیار نہ ہو سکے۔ لے دے کے پروین' میں' اشفاق اور بزمی صاحب رہ گئے۔ پروین نے اشفاق کی بیگم نرجس کو ساتھ چلنے کے لیے تیار کر لیا چنانچہ بزمی صاحب بھی غائب شدگان کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

مجھے اشفاق کے ٹریول ایجنسی والے دفتر پہنچنا تھا اور جمال صاحب میرے گائیڈ تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ بس اور زیر زمین

چلنے والی سب وے ٹرین کے ذریعے سفر کیا جائے۔ چنانچہ پہلے مرحلے میں ان کے گھر کے نزدیک واقع بس سٹاپ سے بس پکڑی گئی۔ آرام دہ اور خوبصورت بس کے داخلی دروازے کے ساتھ ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے ایک خودکار قسم کا ٹکٹ کاؤنٹر سا بنایا گیا تھا جس میں مطلوبہ کرایہ ڈالنے پر ٹکٹ مل جاتا تھا۔ اس ٹکٹ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ ایک ہی ٹکٹ سے بس چھوڑ کر سب وے میں بیٹھ سکتے تھے اور پھر جہاں سے جی چاہے دوبارہ بس میں سوار ہو سکتے تھے۔ یہ سہولت غالباً اس لیے رکھی گئی تھی کہ بس اور سب وے کے روٹس میں جو فرق ہے اس کی وجہ سے مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔ اس پر مجھے وطن عزیز کی دھواں اڑاتی' شور مچاتی' کھانستی اور لڑکھڑاتی ہوئی ٹینک شکن بسیں بہت یاد آئیں جن میں سوار ہونا اور سفر کرنا زندگی میں جہنم کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ بس میں ہمارے قریب ایک سردار جی بیٹھے تھے جو بار بار ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے بات کرنے کے لیے موقع ڈھونڈ رہے ہوں مگر آفرین ہے جمال صاحب پر کہ انہوں نے اپنی گفتگو کے درمیان وقفہ نام کی کوئی چیز آنے ہی نہیں دی۔ ایک بار وہ سانس لینے کے لیے ذرا سا رکے تو میں نے سردار جی کی طرف اشارہ کر کے ایک بہت مزیدار لطیفہ جڑ دیا۔ لطیفے کے اختتام پر انہوں نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر کیے بغیر اپنا جملہ وہیں سے شروع کر دیا۔ جہاں سے میں نے کاٹا تھا۔ لطیفہ البتہ یوں تھا۔

ایک سردار صاحب ہانپتے کانپتے' پسینے میں شرابور گھر میں داخل ہوئے۔ بیوی نے پوچھا ''خیر تو ہے' آج آپ دفتر سے دو گھنٹے لیٹ آئے ہیں؟''

سردار جی نے ناراضگی سے کہا۔ ''یہ سب تمہاری مہربانیاں ہیں۔ میں نے صبح تمہیں کہا تھا کہ میری شلوار کا نالہ (ازار بند) گندا ہو رہا ہے' اسے بدل دو۔''

بیوی نے کہا۔ ''میں بھول گئی تھی مگر اس نالے کا تمہاری تاخیر اور حالت سے کیا تعلق ہے؟''

سردار جی نے سر جھٹک کر کہا۔ ''تعلق یہ ہے کہ میں دفتر سے نکل کر بس میں بیٹھا' تھوڑی دور بس چلی پھر رک گئی اور کلینر میرے قریب آ کر بلند آواز میں بولا۔ ''گندے نالے والی سواریاں اتر جائیں۔'' اب تم ہی بتاؤ میں کیا کرتا؟ مجبوراً وہاں سے پیدل آنا پڑا۔''

اشفاق جس ٹریول ایجنسی میں کام کرتا تھا اس کا نام Big Ben تھا۔ اس سے میرا دھیان فوراً اپنے لاہور کے عزیز دوستوں محمود قریشی اور استاد اختر کی طرف گیا جو انارکلی میں بگ بین واچ کمپنی کے نام سے گھڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں اور پنجابی محاورے کے مطابق اپنے ''جگر جان'' ہیں۔ ایجنسی کی مالکہ زمبابوے کی رہنے والی ایک ہندو خاتون تھی جس کے بارے میں اشفاق نے بتایا کہ وہ کاروباری معاملات میں بہت تیز اور ہوشیار ہے۔ میں نے خاتون کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو خود چلتی پھرتی'' معاملہ

بندی'' ہے۔''

اشفاق نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''ذرا احتیاط سے۔ اس کی اردو کمزور ہے لیکن نظر بہت تیز ہے۔''

پروین کو گیتو کے لیے کچھ شاپنگ کرنا تھی' میں بھی صبح فون پر بیوی بچوں سے بات کرنے کی وجہ سے خاصا ''گھریلو'' ہو رہا تھا سو ہم نے بزمی صاحب کی موٹر مختلف پیکٹوں اور بنڈلوں سے اس طرح بھر دی جیسے پاکستان پہنچتے ہی جنرل سٹور کھولنے کا پروگرام ہو۔ اس سارے عمل میں وقت تیزی سے گزرتا گیا اور شام کے چار بجے ہم نے نیاگرا کا رخ کیا جو اگرچہ وہاں جانے کے لیے انتہائی احمقانہ وقت تھا مگر چونکہ اس کے بعد کوئی اور وقت نکلنے کا امکان نہیں تھا اس لیے ہم نے اس حماقت کو یہ سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کر لیا کہ اگر دوستوں کو یہ پتا چلا کہ ہم نیاگرا سے پچاس میل کے فاصلے پر آٹھ دس دن رہ کر آئے ہیں اور ہم نے آبشار نہیں دیکھی تو وہ ہمیں بہت ذلیل وخوار کریں گے۔

حسب توقع آبشار تک پہنچتے پہنچتے شام رات میں گڈ مڈ ہو چکی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے درختوں کی شاخوں پر جمی ہوئی برف اڑ اڑ کر سوئیوں کی طرح چہروں پر لگ رہی تھی۔ باقی جسم اور ہاتھ اگرچہ ڈھیر سارے گرم کپڑوں کی پناہ میں تھے لیکن سردی کچھ اس طرح سے مزاج پوچھ رہی تھی کہ پروردگار کا شکر ادا کرنے کے لیے بھی منہ کھولنا محال ہو رہا تھا۔

کچھ اس ادا سے آپ نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

نیاگرا آبشار کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس میں کسی قسم کا اضافہ بہت مشکل ہے اور پھر جس وقت اور موسم میں ہم نے اس کی زیارت کی وہ ہر لحاظ سے اس قدر نامعقول تھے کہ اصولاً آبشار کو ہم سے پردہ کر لینا چاہیے تھا لیکن فطرت کے حسن بے پرواہ کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ اپنی موج میں مست رہتا ہے' اسے نہ چشم بینا کی پروا ہوتی ہے اور نہ چشم تماشائی کی بلکہ وہ تو نظر انداز کرنے والوں سے بھی کوئی گلہ نہیں کرتا۔ اشفاق نے بتایا کہ یہ آبشار انسان اور فطرت کی مشترکہ کاوش ہے یعنی ایک نیم قدرتی قسم کا معجزہ ہے۔ اس قدر بلندی سے یکدم پانی کا اس نشیب میں گرنا ایک قدرتی عمل ہے لیکن انجینیرز نے اس کے کناروں کو ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رکھنے' اس کے حسن میں اضافہ کرنے اور اسے سیاحوں کے لیے زیادہ دلچسپ بنانے کی خاطر یہاں کچھ تبدیلیاں کی ہیں جس سے آبشار کے مقام محل وقوع اور شکل وصورت میں خاصا فرق پڑ گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا ایک حصہ امریکی ریاست بفیلو میں واقع ہے۔ ایک پل کے ذریعے دونوں ملکوں کو ملا دیا گیا ہے۔ گویا اس وقت ہم امریکہ سے Walking Distance پر کھڑے

تھے۔اشفاق نے بتایا کہ نیاگرا کا زیادہ خوبصورت حصہ چونکہ کینیڈا کی طرف واقع ہے اس لیے امریکہ کی طرف سے آنے والے سیاح بھی عام طور پر پل پار کر کے ادھر آجاتے ہیں۔

آبشار سے کافی فاصلے پر ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہو کر کم روشنی میں ہم نے اس کے حسن کو دیکھنے کی کوشش کی۔دور کہیں سے کچھ روشنیاں پانی کی اس عظیم جھالر پر ڈالی جارہی تھیں جو ایک پرشور اور قدرے دہشت انگیز آواز کے ساتھ کئی سوفٹ گہرے نشیب میں گر رہی تھی۔پانی کی اس دیوار کے پیش منظر میں چکرائی ہوئی روشنیوں کے درمیان بے شمار آبی پرندے پتانہیں کسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔شاید انہیں بھی اسی حسن ازل کی تلاش تھی جس کے اس سحر انگیز روپ نے میرے دل کو ایک ایسے عجیب وغریب احساس ممنونیت' بے بسی اور روشنی سے بھر دیا تھا جس کے اظہار کے لیے میرے پاس کوئی لفظ اور استعارہ نہیں ہے۔میرا جی چاہا کہ میں وہیں کہیں برف کے کسی ڈھیر پر بیٹھ جاؤں اور اپنے اس گمشدہ وجود سے کلام کروں جو ساز ازل سے ایک نغمے کی طرح پھوٹا تھا اور جس کی گونج میرے باطن سے لے کر نیاگرا آبشار کے اس شور تک پھیلی ہوئی ہے۔میں گم سم وہاں کھڑا تھا۔پتانہیں کتنی دیر بعد کسی نے مجھے آواز دی۔میں نے پلٹ کر دیکھا تو جیسے سارا طلسم ایک لمحے میں ٹوٹ گیا۔ہوا سے لہراتی ہوئی ایک برف پوش شاخ میرے چہرے سے ٹکرائی اور میں نے دیکھا کہ اشفاق کا چار سالہ بیٹا صفی ہم سب اور سردی سے بے نیاز پوز بنا کر تصویر اتروا رہا ہے اور اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر نیاگرا آبشار اور اسے بنانے والے کے درمیان کئی گمشدہ کڑیاں جیسے جڑتی چلی جارہی تھیں۔

رات کا کھانا بیدار بخت کے ہاں تھا۔جمیل الدین عالی نے (جن کا اپنا تعلق غالب کے سسرالی خاندان لوہارو سے ہے اور جو دہلی اور دہلی والوں کے مستند محقق ہیں) بتایا کہ بیدار بخت مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کی اولاد سے ہے اور اس حوالے سے ''شہزادے'' ہوتے ہیں۔بیدار بخت پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں اور بھارتی مسلمانوں کے اس محدود گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں باقاعدہ خوشحال کہا جاسکتا ہے۔ان کی بیگم انیتا ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔بیٹی کا نام نتاشا ہے جو اس کم عمری میں ہی کتھک اور کلاسیکل رقص میں خاصی مہارت رکھتی ہیں۔خوش رو'خوش مزاج اور ذہین بیدار بخت نے ایک اچھے مہذب میزبان کی طرح ہمارے دیر سے پہنچنے کو اس طرح درگزر کیا جیسے ہم وقت سے دس منٹ پہلے پہنچ گئے ہوں۔کمرے کے ایک کونے میں فرش پر کچھ گاؤ تکیے لگے تھے اور بہت سی روشنیوں کے درمیان سردار جعفری پر ایک وڈیو فلم بنانے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔مجھے اور پروین کو بھی گفتگو کرنے والے پینل میں بٹھا دیا گیا۔مختلف ادبی نظریات کے حوالے سے ترقی پسند ادب اور پھر اس حوالے سے علی سردار جعفری کے خیالات' نظریات'عمل اور کومٹمنٹ کے حوالے سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ایک سوال یہ پوچھا گیا کہ ''آپ کے خیال میں ''لمحہ موجود'' کی

شاعری سے کیا مراد ہے؟ ترقی پسند ادیب کے حوالے سے آپ لوگ، جو مستقبل کے نقیب ہیں، اس مسئلے کو کس طرح سے دیکھتے ہیں؟"

جعفری صاحب گفتار کے مرد میدان ہیں اور دلیل دینے اور کاٹنے کا ہنر جانتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑی مہارت سے پہلے تو اس سوال کو خوب الجھایا اور پھر اپنی مرضی کے موڑ پر لا کر ایک ایسا گول مول بیان دیا جس میں سوال کے جواب کے علاوہ ہر چیز موجود تھی۔

انہوں نے میرابائی کے بھجنوں کے اپنے کچھ تراجم بھی سنائے جو بہت اچھے تھے۔ ریکارڈنگ کے خاتمے پر میں نے ایک مترجم کا واقعہ سنایا جس نے حلقہ ارباب ذوق لاہور کی ایک مجلس میں ہیر وارث شاہ کے انگریزی ترجمے کے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ ترجمہ بے حد ناقص، غیر تخلیقی اور گمراہ کن تھا۔ چنانچہ حاضرین نے ان کے بہت لتے لیے۔ مترجم صاحب نے ساری تنقید سننے کے بعد اپنے قریب بیٹھے ہوئے کسی صاحب سے کہا۔ "بھئی اب اگر وارث شاہ انگریزی میں آ کر expose ہو گیا ہے تو میں اس میں کیا کر سکتا ہوں؟"

جعفری صاحب نے ہنس کر کہا۔ "یہ گویا آپ مجھ پر چوٹ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں، آپ کے ترجمے واقعی بہت اچھے ہیں۔ البتہ ان میں میرابائی کتنی ہے؟ یہ ہندی اور میرابائی کو جاننے والے ہی بتا سکتے ہیں۔"

ترجموں سے بات چلتے چلتے پتا نہیں کیسے عبدالعزیز خالد تک پہنچ گئی۔ خالد صاحب نے گزشتہ چند برسوں میں ہوچی منہ، ماؤزے تنگ، سیفو، ٹیگور اور پتا نہیں کس کس کے منظوم اردو ترجمے کئے ہیں۔ ان کی اپنی نظموں میں مختلف زبانوں پر عبور کا جو مظاہرہ ہوتا ہے اس سے بھی اہل ادب بخوبی واقف ہیں۔ ایک بار ایک محفل میں، جو خالد صاحب کے ترجموں کی کسی کتاب کے بارے میں تھی، سید ضمیر جعفری نے ایک بہت مزیدار جملہ اپنے مضمون میں لکھا تھا۔

"خالد صاحب کے ان خوبصورت ترجموں کو دیکھ کر ہمارا جی چاہتا ہے کہ انہیں یہ مشورہ دیں کہ اب کچھ وقت نکال کر وہ اپنی نظموں کا بھی اردو میں ترجمہ کر ہی ڈالیں۔"

کھانے کے بعد جعفری صاحب نے تمام حاضرین کو کاغذ قلم تھماتے ہوئے کہا کہ ہر آدمی غالب کے پانچ ایسے شعر لکھے جو اسے سب سے زیادہ پسند ہوں۔ غالب جیسے شاعر کے حوالے سے صرف پانچ شعروں کا انتخاب بہت مشکل تھا لیکن جعفری صاحب نے ہمارے اصرار کے باوجود تعداد میں اضافہ نہیں کیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے یہ پانچ شعر لکھے۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
وا ماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

پوچھ ہو کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا
افسون انتظار تمنا کہیں جسے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر نفس، ہر یک نفس جاتا ہے قسط عمر میں
حیف ہے ان پر جو کہویں ''زندگانی مفت ہے''

پتا نہیں اس آزمائش سے جعفری صاحب کا کیا مقصد تھا مگر اس بہانے غالب کے چند بے مثال شعروں کی یاد پھر سے تازہ ہوگئی جو آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہونے تک برقرار رہی۔ واپسی پر مجھے وڈیو فلم کے کیمرہ مین اور پروڈیوسر عبداللہ کھنڈوانی کی موٹر میں بیٹھنا تھا جس کا ایک دروازہ بند نہیں ہو رہا تھا۔ ہم لوگ بیدار بخت کے گھر کے باہر برآمدے میں کھڑے تھے کیونکہ اس سے آگے اوپر نیچے اور دائیں بائیں ہر طرف برف ہی برف تھی۔ بیچارے کھنڈوانی ڈکی میں سے مختلف اوزار نکال نکال کر اس نا ہنجار دروازے پر آزما رہے تھے۔ مجھے مصحفی کا ایک شعر یاد آ گیا۔

بھلا دوستی اعضائے پیر کیا ہووے
کہ جیسے رسی سے ٹوٹا کواڑ باندھ دیا

بیدار بخت نے کہا کہ آپ رات یہیں رہ جائیں۔ میں جمال صاحب کو فون کر دیتا ہوں یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ میں آپ کو

چھوڑ آتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ دونوں باتیں قابل قبول نہیں کیونکہ ایک تو یہ کہ آپ نے صبح صبح پاکستان کے لیے روانہ ہونا ہے' دوسرے یہ کہ جمال صاحب کا گھر یہاں سے کم از پون گھنٹے کے فاصلہ پر ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ عبداللہ کھنڈوانی صاحب جس محبت سے مجھے لفٹ دینے پر اصرار کیا تھا اس کا تقاضا ہے کہ اب اس مشکل گھڑی میں ان کا ساتھ دیا جائے۔

میں اگرچہ ٹیکنیکل مسئلوں میں بالکل صفر ہوں' بجلی کا فیوز تک نہیں لگا سکتا' لیکن وہ جو ہم پاکستانیوں خصوصاً پنجابیوں کو ہرفن مولا بننے کا شوق ہے اس کے باعث میں بھی ہرچہ بادا باد کہہ کر روئی کے گالوں جیسی مسلسل برف میں کود پڑا۔ ایک دو بار دروازے کو ہلایا جلایا اور پھر زور سے بند کیا' کھٹاک کی ایک آواز آئی اور دروازہ بند ہو گیا۔

کھڈوانی نے اسے زور سے ہلا کر دیکھا اور مسرت بھری چیخ کے ساتھ بولا۔ ''یہ تو سچ مچ بند ہو گیا ہے۔''

دو تین بار دروازے کو کھول اور بند کر کے دیکھا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں کبھی کوئی خرابی تھی ہی نہیں۔ کھڈوانی نے تعریفی نظروں سے میرے پھیلتے ہوئے جسم کو دیکھا اور اپنے مخصوص گجراتی لہجے میں کہا۔ ''ہم نے آج تک ایسا Strong Poet نہیں دیکھا۔''

میں نے اپنی اور اپنی شاعری کی تعریف میں اس طرح کا معصوم اور نوکیلا جملہ کبھی نہیں سنا تھا لیکن چونکہ کوئی اور سننے والا نہیں تھا اس لیے پی گیا اور کہا کہ یہ سب دیسی گھی کی طاقتیں ہیں۔

''دیسی گھی کی طاقتیں؟...... مطلب نہیں سمجھا ہم۔''

میں نے کہا۔ ''اب اس کا مطلب سمجھنے کے لیے آپ کو ایک عدد لطیفہ سننا پڑے گا۔''

بولے۔ سناؤ سناؤ سناؤ...... ہم تو خود Joke مارنے کا بہت شوقین ہے۔''

میں نے پہلے تو اسے دیسی گھی کے کوائف اور خصوصیات سے آگاہ کیا اور پھر بتایا۔ ''ایک دیہاتی دیسی گھی کا کنستر یعنی ڈبہ لے کر پہلی بار ریل گاڑی میں سوار ہوا۔ ڈبہ رکھنے کے لیے جگہ ڈھونڈی' نہیں ملی تو اسے گاڑی روکنے والی زنجیر کے ساتھ لٹکا دیا۔ ڈبے کے بوجھ سے زنجیر کھینچ گئی' گاڑی رکی۔ چند لمحوں بعد ریلوے کا عملہ پہنچ گیا۔ دیہاتی کو بلاضرورت گاڑی رکوانے کے جرم میں پچاس روپے جرمانہ ہو گیا۔ دیہاتی نے جرمانہ تو ادا کر دیا مگر بار بار خوشی سے ہنستا اور فخر سے مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولا۔ ''دیکھا اصلی گھی کی طاقتیں' ٹرین روک دی ہے۔''

اگلی صبح ابھی دروازہ خاور پوری طرح کھلا بھی نہیں تھا کہ جمال زبیری صاحب نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ کہنے لگے ''ہمل تن

سے آپ کے لیے کسی اختر نواز صاحب کا فون ہے۔

''ہملٹن سے اختر نواز؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی نام بتایا ہے۔'' جمال صاحب نے اپنی گونجیلی آواز میں کہا۔

''میں شاعر اختر آصف اور کرکٹر سرفراز نواز کو جانتا ہوں۔ ہملٹن کے بارے میں اتنا معلوم تھا کہ یہ ٹورنٹو کے قریب ہی واقع ایک شہر ہے جہاں ہماری سابقہ ہیروئین اور حالیہ گلوکارہ مسرت نذیر رہتی ہے لیکن ان سب چیزوں کا یہ Combination اس وقت میرے لیے بالکل نیا تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے فون اٹھایا۔ ادھر سے آواز آئی۔ ''میں اختر نواز بول رہا ہوں' واہ کینٹ والا۔''

اختر نواز سے گزشتہ تین چار برسوں سے واہ فیکٹری والوں کے سالانہ شاعرے میں ملاقات ہوتی ہے جہاں وہ تعلقات عامہ کے شعبے کا بڑا افسر ہے۔ معلوم ہوا کہ موصوف آرڈیننس فیکٹری کی طرف سے مصر اور سپین کی اسلحہ نمائشوں میں پاکستانی وفد کے ساتھ آئے تھے اور اب چند دنوں کے لیے یہاں اپنے بھائی کے پاس رکے ہوئے ہیں۔

اختر بڑا کھلاڈلا اور مزیدار آدمی ہے۔ شاعروں اور شاعری دونوں کا رسیا ہے۔ کہنے لگا کہ ملاقات آج ہی ہونی چاہیے اور جب تک آپ یہاں ہیں مسلسل ہوتی رہنی چاہیے۔ مجھے اپنا ایڈریس سمجھائیں۔ میں بھائی اور گاڑی لے کر آرہا ہوں۔

میں نے کہا۔ ''ایڈریس تو تمہیں میرے میزبان جمال زبیری صاحب سمجھائیں گے۔ البتہ ان سے صرف جگہ کا پتا پوچھنا' راستہ پوچھا تو ہوسکتا ہے وہ تمہیں کسی اور شہر میں پہنچا دیں۔''

لیکن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ جمال صاحب نے پہلے تو اختر نواز کو راستہ سمجھانے کی کوشش کی' جب وہ اچھی طرح کنفیوژ ہو گیا تو اس کے بھائی لیاقت سے مذاکرات شروع کیے جو تقریباً دس منٹ تک جاری رہے' اس دوران میں اتنے ''رائٹ اور لیفٹ'' ٹرن آئے کہ حلقہ ارباب ذوق میں ہونے والی نظریاتی بحثیں بھی ماند پڑ گئیں۔

لیاقت نے بتایا کہ وہ کیچوؤں کا کاروبار کرتا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ کیچوے مچھلیاں پکڑنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ اس کے سب سے بڑے گاہک میک اپ کا سامان تیار کرنے والے کارخانے ہیں۔ عورتوں کی آرائش' خوبصورتی اور دلکشی میں کیچوؤں کی شمولیت کا تصور ایسا عجیب اور غیر متوقع تھا کہ میں کئی سیکنڈ تک حیرت سے لیاقت کا منہ دیکھتا رہا۔ گویا لب و رخسار کی ساری خوشنمائی اور آرائش کے پیچھے اصل میں کیچوے حضرات کلبلا رہے ہیں' لاحول ولاقوۃ!

لیاقت کچھ اور تفصیلات بتانا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔

ایک دفعہ شفیق الرحمن صاحب نے گراؤچو مارکس کے حوالے سے ایک لسانی تشکیلات کی حامل مہمل نظم سنائی جو کچھ یوں تھی۔

I use to adore a sinora,
Once I heard her snora
I adora no mora.

حسین عورتوں کے خراٹے تو شاید برداشت ہو سکتے ہیں لیکن یہ تصور کہ سرخی' پاؤڈر' کریم' شیمپو اور لوشن سب میں کیچوؤں کا خون ناحق شامل ہے' بہت ہی حوصلہ شکن تھا۔ میں نے اختر نواز سے کہا۔ ''ذرا سوچو اگر غالب آج کے زمانے میں ہوتا اور اس حقیقت سے آگاہ ہوتا جو ابھی ابھی مجھ پر آشکار ہوئی ہے' تو یہ شعر کس طرح کہتا۔

غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں' منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غالباً وہ کچھ اس طرح کی ترمیم کرتا.......

غنچہ ناشگفتہ کو دور سے ہی دکھا کہ یوں
بوسے کو اپنے رکھ' ویسے بھی بتا کہ یوں

پورے سفر کے دوران یہ پہلا دن تھا جب میں نے حسین سے حسین چہرے پر بھی دوسری نظر نہیں ڈالی۔ لیاقت ہمیں ٹورنٹو کے Planetarium کے سامنے ڈراپ کر کے چلا گیا کہ آپ لوگ نیچرل ہسٹری اور سائنس کے اس میوزیم کے مزے لوٹیں اور میں ذرا اپنے کیچوؤں کے بزنس کی مزاج پرسی کر آؤں۔

داخلہ ٹکٹ کے کاؤنٹر پر ایک عفیفہ جسے ضعیفہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا' انتہائی گہرے میک اپ سے مزین چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے اختر نواز کے کان کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ کم از کم چار کیچوؤں کا خرچہ ہے۔''

''زیادہ'' اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے آپ یہ تبصرہ با آواز بلند بھی کر سکتے ہیں' اسے اردو نہیں آتی۔''

بڑی بی نے ٹکٹوں کے ساتھ Planetarium سے متعلق کچھ معلوماتی بروشر بھی ہمارے حوالے کئے اور ایک اور کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اگر ہم کچھ سووینیرز وغیرہ خریدنا چاہیں تو ہماری خدمات کے لیے وہاں عملہ موجود ہے۔ یہ عملہ ایک ایسا ضعیفہ پر مشتمل تھا جس کے سامنے پہلے والی کل کی بچی معلوم ہو رہی تھی۔

یہ عمارت غالباً ہم جیسوں کی حیرت اور احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ زمین کی تہوں سے لے کر خلا کی

دسعتوں تک کون سی چیز ایسی ہے جس کا مستند اور قابل فہم حوالہ یہاں موجود نہیں۔ ہم نے ایک چھوٹے سے ہال میں بیٹھ کر اس کی چھت پر بنا ہوا مصنوعی ستاروں اور سیاروں کا جال دیکھا جو ہو بہو ہمارے نظام شمسی کا Replica تھا۔ ہمارے علاوہ وہاں دس سے بارہ برس کی عمر تک کے بہت سے بچے تھے۔ معلوم ہوا وہ سب کسی سکول سے آئے ہیں اور یہ ان کی پڑھائی کا حصہ ہے۔ ستاروں کی سیر کے بعد سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ جواب دینے والا ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا جس کی آواز میٹھی' آنکھ ذہین' لہجہ دوستانہ اور گفتگو انتہائی واضح اور معلومات افزا تھی۔ یہ اس کا روز کا کام تھا مگر نہ اس کے ماتھے پر بیزاری اور یکسانیت کی شکن تھی اور نہ ہی اس کے انداز میں وہ رسمی پن تھا جو عام طور پر ہمارے پروفیسروں کے لیکچروں میں پایا جاتا ہے۔

ہم کچھ ہکے بکے سے باہر نکلے۔ ہمارے پاؤں تو زمین پر تھے مگر اس ''خلانوردی'' کے باعث ذہن کچھ ڈانواں ڈول سا ہو رہا تھا۔ میں نے اختر نواز کی طرف دیکھا' وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک بڑے ہال میں پانچ سے سات برس تک کی عمر کے بچے ایک ایسے انسانی مجسمے کے گرد جمع تھے جس میں انسانی جسم کے اندرونی نظام کی مکمل میکانکی تصویر موجود تھی۔ ایک پانچ سالہ ڈاکٹر کرسچن برنارڈ' انسانی دل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا اور ایک نوجوان سائنس گریجویٹ اسے اس خضوع وخشوع اور سنجیدگی کے ساتھ دل کے مختلف فنکشن سمجھا رہا تھا جیسے سلیکشن بورڈ کے سامنے اس کی پہلی پہلی پیشی ہو۔ میں نے سوچا' جس معاشرے میں پانچ سال کے بچے کو وہ باتیں سمجھا دی جاتی ہوں جن کا شعور ہمارے یہاں شاید (ماہرین طب کے علاوہ) لوگوں کو عمر کے آخری حصے تک نہیں ہوتا تو پھر وہ چاند پر کمندیں نہیں ڈالے گا تو اور کیا کرے گا۔

جب سے ٹورنٹو آئے تھے سی این ٹاور کا ذکر بار بار سنا تھا کہ یہ جدید فن تعمیر کا حیرت انگیز شاہکار ہے اور اس وقت دنیا کی بلند ترین عمارت ہے جس کی کل بلندی پانچ سو ترپین میٹر ہے یعنی تقریباً تین فرلانگ کا زمینی فاصلہ عمودی رخ پر ایستادہ کر دیا گیا ہے۔ بڑی بڑی لفٹیں سیاحوں اور سیر بینوں کو لے کر مسلسل آمد و رفت میں مصروف رہتی ہیں۔ پانچ سو بیالیس میٹر کی بلندی پر ایک گھومنے والا ریستوران ہے جو تقریباً ایک گھنٹے میں اپنا چکر مکمل کرتا ہے۔ اس ریستوران میں صرف داخلے اور ایک ڈرنک کی فیس اٹھارہ ڈالر تھی۔ کھانا کھانے کا موڈ ہو تو پینتیس ڈالر مزید۔ اختر نواز کے بھائی لیاقت نے بتایا کہ ٹکٹ خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' کے حوالے سے یہاں دوستوں نے کچھ مقامی طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ اس نے ہمیں ریستوران سے ایک منزل نیچے لفٹ سے اتارا اور ''ابھی آیا'' کہہ کر ایک سیڑھیوں والے دروازے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک خوبصورت نوجوان

کے ساتھ آیا جس نے اگرچہ ویٹرز کی وردی پہن رکھی تھی مگر اس وردی کی قیمت ہم تینوں کے لباسوں کی مجموعی قیمت سے زیادہ تھی۔ اس نے اکبر علی کہہ کر اپنا تعارف کروایا۔ معلوم ہوا کہ موصوف اسماعیلی ہیں۔ آدھا خاندان ہندوستان میں ہے اور آدھا پاکستان میں۔ خود نیروبی میں پیدا ہوئے تھے اور پوری دنیا گھومنے کے بعد آج کل اس ہوٹل میں بطور سینئر ویٹر ملازم ہیں اور ہوٹلنگ کے بہت سارے کورس بھی کر رکھے ہیں۔

اکبر نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک اور دروازہ آیا جہاں سے انواع واقسام کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا یہ ہوٹل کا کچن عرف مطبخ ہے اور ہم یہیں سے گزر کر ہوٹل میں داخل ہوں گے۔ مجھے یہ طریقہ اچھا نہیں لگا۔ اکبر علی نے شاید میرے چہرے سے میری دلی کیفیت کو پڑھ لیا تھا' مسکرا کر بولا۔ ''فکر نہ کریں' اس چور دروازے سے داخل ہونے والے آپ پہلے آدمی نہیں ہیں' یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔''

''پھر بھی....... '' میں نے متذبذب سے لہجے میں کہا۔ ''اگر اس ہوٹل میں بیٹھنا اتنا ہی ضروری ہے تو ہم....... میرا مطلب ہے.......''

''مطلب وطلب کچھ نہیں بھائی صاحب....... ان سالوں نے بھی تو لوٹ مچا رکھی ہے۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔''

اکبر علی کی میمن انداز کی اردو اور ہوٹل کے ماحول کا کچھ ایسا خوشگوار اثر ہوا کہ ناجائز داخلے کا احساس جرم اورنج جوس کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی ہوا ہو گیا۔ اکبر علی نے قریبی میز پر بیٹھی ہوئی ایک بی بی کی طرف اشارہ کیا جو بڑے انہماک سے پکچر پوسٹ کارڈ پر کچھ لکھ رہی تھی۔

''اگر میری ڈیوٹی ختم ہونے تک اس کو کوئی کھانا کھلانے والا نہ ملا تو معلوم ہوتا ہے آج میرا خرچہ ہو جائے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ سیاحوں کے اس مخصوص طبقے سے تعلق رکھتی ہے جو شام کے بعد پلے سے کچھ خرچ نہیں کرتے۔ خوب پیٹ بھر کے کھاتے پیتے ہیں' حق نمک ادا کرتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔''

''مگر....... اکبر صاحب! یہ تو بڑی معقول اور Well to do قسم کی خاتون دکھائی دیتی ہے۔''

''ارے بھائی' ادھر سب چلتا ہے۔'' اس نے بڑی بے تکلفی سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک بار پھر اس بی بی کا جائزہ لیا عمر تیس پینتیس برس' صورت معقول' صورت کے علاوہ معقول تر لباس' انداز' میک اپ'

دستی بیگ سب میں سلیقے اور تمول کی جھلک۔ میں نے یقین نہ کرنے کے انداز میں اکبر علی کی طرف دیکھا۔اس نے ایک چیمپئن کی سی بے نیازی کے ساتھ میرے تذبذب پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر بغیر کچھ کہے پڑوس کی میز کی طرف مڑ گیا۔مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا' کرسیاں نزدیک تر ہوئیں اور اس سے پہلے کہ میرا اورنج جوس کا گلاس ختم ہوا کبر علی' اکبر اعظم بن چکا تھا۔کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھا اور چار بہت خوبصورت گلاس لے کر آیا۔

معلوم ہوا یہ تحفہ عموماً تین سو ڈالر سے زیادہ کا بل دینے والے گاہک کو ہوٹل کی طرف سے بطور یادگار پیش کیا جاتا ہے۔دو گلاس اس نے مجھے دیے اور بقیہ دو اس عزیزہ کو پیش کئے جو اس وقت تک سارے پکچر کارڈ وغیرہ بھول کر ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

لیاقت نے بتایا کہ اکبر علی صرف دو تین برس پاکستان رہا ہے مگر اسے پاکستانیوں سے بہت محبت ہے اور وہ ان کا خصوصی خیال رکھتا ہے۔پنجابی کے بہت سارے لطیفے اس کو یاد ہیں۔پاکستانی فلم سٹاروں میں ندیم اور شبنم سے اس کی بہت دوستی ہے اور ایک بار اس نے ہندوستانی اداکاروں ونود مہرہ اور شتروگھن سنہا کو ہوٹل سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ ان دونوں نے نشے کی حالت میں اس کے ساتھ بدکلامی کی تھی۔

دیوار گیر شیشوں کے اس پار شام رات کو رستہ دے رہی تھی۔اکا دکا ستارے چمک رہے تھے۔میں نے اس بلندی سے نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ٹورنٹو کا شہر کسی فلم کے سیٹ کی طرح ایک ڈمی معلوم ہو رہا تھا۔لمبی لمبی امریکن کاریں ڈنکیوں کی طرح رینگ رہی تھیں اور تیس تیس چالیس چالیس منزلہ عمارتیں وحدت کالونی کے فلیٹوں جیسی دکھائی دے رہی تھیں۔یگانہ کا ایک شعر بہت یاد آیا۔

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

میں نے سوچا' اس ذرا سے بلندی سے جب مجھے یہ چیزیں اتنی چھوٹی اور بے وقعت نظر آ رہی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کو یہ دنیا کتنی نظر آتی ہو گی! اور پھر اس دنیا میں جرثوموں کی طرح کلبلاتے ہوئے انسان' اور پھر ان انسانوں کے دلوں میں بکھری ہوئی آرزوئیں' حسرتیں' نفرتیں اور پتا نہیں کیا کیا...... بے وقعتی کے ایک گھمبیر اور شدید احساس نے میری روح پر ڈیرا جمانا شروع کر دیا تھا۔ ایلیٹ کی ایک ہی نظم کی دو مختلف لائنیں جیسے ہر منظر پر سپر امپوز ہونے لگیں۔

I have measured my life with coffee spoons.
I have seen horror in a handful of dust.

خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا۔ اکبر علی اس بی بی کو ہماری میز پر لے آیا تھا۔ باہر ستاروں کی تعداد اور چمک بڑھ گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی ستارے دمک رہے تھے مگر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اکبر علی نے خاتون سے ہمارا اور ہم سے اس کا تعارف کرایا اور شاید کچھ مزیدار باتیں بھی کیں کیونکہ وہ لوگ بار بار ہنس رہے تھے مگر مجھ پر اداسی کا وہ مخصوص حملہ شروع ہو چکا تھا جو گزشتہ کئی برسوں سے ہر سال ایک یا دو بار ہوتا ہے اور ہفتوں جاری رہتا ہے مجھے نہ اس عورت اسے کوئی دلچسپی رہی تھی اور نہ اکبر علی کی باتوں سے۔ شاد نے چپکے سے کان میں سرگوشی کی۔

اسیر جسم ہیں' معیاد قید نامعلوم
رہا یہ وہم' کہ ہم ہیں' سو وہ بھی کیا معلوم

کسی شیشے کے برتن کے گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی اور اسی کے درمیان سے کہیں میر صاحب دھیرے سے بولے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

غالب نے میرے بھاری ہوتے ہوئے کندھوں پر ایک دوستانہ تھپکی دی اور ہلاشیری کے انداز میں کہا۔

گل' غنچگی میں' غرقہ دریائے رنگ ہے
اے آگہی' فریب تماشا' کہاں نہیں؟

اپنے اشفاق احمد خاں کے "بابوں" سے لے کر کیپ کینیڈی کے سپیس سنٹر تک گمان اور عقل کی جلتی بجھتی شمعوں میں روشنی کہاں ہے اور دھواں کس طرف! اور یہ دونوں چیزیں ہیں بھی یا نہیں؟ اس ازلی اور ابدی سوال کے تحیر میں گم نجانے کس وقت ہم لوگ وہاں سے اٹھے اور کس طرح اس ٹاور سے نیچے آئے' مجھے کچھ یاد نہیں بس اتنا یاد ہے کہ نیچے کھلے میں ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور ہمیں زمین پر پاؤں جمانا دشوار ہو رہا تھا۔

ٹورنٹو میں شاعروں کی تعداد اس قدر بڑھ چکی ہے کہ تین چار گھنٹے کا مشاعرہ تو وہ لوگ مقامی وسائل ہی سے ترتیب دے سکتے ہیں اور شاعر بھی وہاں ہر طرح کا ہے۔ کلاسیکی' نیم کلاسیکی' جدید' جدید تر' جدید ترین اور جدید ترین تر۔ چنانچہ باوزن' بے وزن اور کم وزن ...... ہر طرح کے شعر سننے کو ملے۔ ایک صاحب نے جوش کے انداز کی ایک بہت گھن گرج والی نظم سنائی جس میں وزن کی ہر کمی کو جوش خطابت سے پر کیا گیا تھا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک مقامی دوست نے سرگوشی کی۔

''جس طرح انسانوں کے اوسان خطا ہوتے ہیں اسی طرح ان کی نظموں کے اوزان خطا ہوتے ہیں۔''

میں نے اس رعایت لفظی پر انہیں دل کھول کر داد دی مگر کچھ دیر بعد جب انہوں نے اپنی غزل سنائی تو اس کے اوزان بھی باقاعدہ خطا تھے۔ اپنی سیٹ پر واپس آ کر انہوں نے دادطلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جی تو بہت چاہا کہ سچ بولوں مگر مروت آڑے آگئی اور میں نے مجبوراً تجاہلِ عارفانہ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''ماشاءاللہ بڑی ادق بحر چنی ہے آپ نے!''

اس مشاعرے کا بنیادی مقصد چونکہ یہی تھا کہ مقامی شاعر مہمانوں کو اپنا کلام سنا لیں اور یوں اگلے روز ہونے والے مشاعرے میں مہمانوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا جا سکے اس لیے ہم لوگ زندگی میں پہلی بار ''سامعین خصوصی'' کے طور پر کسی محفل میں شریک ہوئے۔ پروین کو پتا نہیں کیسے ایک بھولا بھٹکا شعر یاد آ گیا۔ جو ہم نے کئی برس پہلے فیصل آباد کے ایک مشاعرے میں گھڑا تھا' کہنے لگی۔

امجد بھائی! دوسرا مصرعہ کیا کہ۔

''آ جائے کہیں پھر نہ وہ مہمان خصوصی''

میں نے کہا۔ دوسرا مصرعہ تو یہی ہے جو تم نے پڑھا ہے البتہ پہلا کچھ یوں ہے۔

''رکھے ہوئے سر پر کئی دیوان خصوصی''

مشاعرے کے بعد کرنل انور احمد کے گھر پر کھانا تھا جہاں سردار جعفری کو ان کی سالگرہ کے حوالے سے تحفہ پیش کیا گیا اور ہم سب سے روپہلے اور سنہرے مارکروں سے مختلف یادگاروں پر دستخط کروائے گئے۔ انور احمد صاحب کی شخصیت میں جو سلیقہ' رکھ رکھاؤ اور Grace تھی اس کے تو ہم پہلے ہی قائل ہو چکے تھے مگر اب ان کی محبت' علم دوستی' کتاب بینی اور جدت پسندی کے جوہر بھی آشکار ہوئے۔

وہ عقیدتاً قادیانی ہیں اور غالباً یہی ان کے ترک وطن کی بنیادی وجہ بھی ہے کہ مگر بطور انسان وہ ایک انتہائی اعلیٰ درجے کے انسان ہیں اور ان جیسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ اپنے معاشرے کی اس مذہبی گھٹن اور خانقاہی جن سنگھیت سے مزید نفرت پیدا ہوتی ہے جس نے اسلام جیسے روشن خیال اور زندہ مذہب کو ایک بوسیدہ' فرسودہ اور انسان دشمن نظام میں بدل دیا ہے۔ مذہب کے حوالے سے اگرچہ میں ذاتی طور پر اکبر الٰہ آبادی کے اس نظریے کا قائل ہوں۔

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مگر اس کے باوجود کبھی کبھی میں مرمر کے ان سلوں کے مجاوروں سے اس قدر ناخوش و بیزار ہو جاتا ہوں کہ خواہ مخواہ جھگڑنے کو جی چاہتا ہے۔

یہاں میری ملاقات شاعرہ نزہت صدیقی سے بھی ہوئی۔ وہ بھی قادیانی تھی۔ اس کی گفتگو میں اس حوالے سے بہت زیادہ تلخی تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ''دیکھو بی بی' پاکستان میں چند مخصوص لوگوں کو چھوڑ کر جن کا پیشہ ہی فی سبیل اللہ فساد ہے کوئی بھی تمہارے وجود اور بقا کا دشمن نہیں۔ اس معاشرے میں اگر عیسائی' بدھ' ہندو' سکھ' دہریے اور پارسی رہ سکتے ہیں تو تم لوگ کیوں نہیں رہ سکتے؟''

جواب میں نزہت نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ مجھے مجبوراً اسے منیر نیازی کا ایک پنجابی شعر سنانا پڑا جو اتنا واضح اور موثر تھا کہ نہ صرف گفتگو کا رنگ بدل گیا بلکہ یہ نستعلیق اردو اہل زبان کی سمجھ میں بھی فوراً آ گیا۔

کج انج وی راہواں اوکھیاں سن کج گل وچ غم دا طوق وی سی
کج شہر دے لوک وی ظالم سن کج مینوں مرن دا شوق وی سی

اس شعر میں اگر کچھ کا' کے' کی' تبدیل کر لیے جائیں تو یہ سیدھا سادا اردو کا شعر بھی بن سکتا ہے۔

کچھ یوں بھی راہیں مشکل تھیں' کچھ گلے میں غم کا طوق بھی تھا
کچھ شہر کے لوگ بھی ظالم تھے' کچھ ہمیں موت کا شوق بھی تھا

شعر کا ترجمہ شعر میں کیا جائے تو مفہوم سے ماوراء جو زبان کا ایک اپنا لطف ہوتا ہے وہ عام طور پر رہ جاتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اس ترجمے میں بھی وہ ''لطف خاص'' رہ گیا ہے مگر کا' کے' کی' کے حوالے سے صوفی تبسم مرحوم کا ایک بہت پر لطف جملہ یاد آ گیا۔

صوفی صاحب گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان میں بطور ''ماہر'' کے بھی ملازم رہے۔ کسی نے ان سے ان کے کام کی صحیح نوعیت اور تفصیل پوچھی تو صوفی صاحب نے اپنے ''میرے جیسے'' سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں کا' کے' کی' ٹھیک کرتا ہوں۔''

اب مشکل یہ ہے کہ اس کا' کے' کی' سے لطف اندوز ہونے کے لیے پنجابی کا اہل زبان ہونا ضروری ہے یعنی یہاں بھی ترجمے سے بات نہیں بنے گی۔

انور احمد کے گھر عبد الرحیم انجان سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی۔ان کی زبانی معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض مرحوم جب بھی ٹورنٹو آتے تھے انہی کے طرف قیام کرتے تھے اور ان کی آخری آمد کے موقع پر تو انجان صاحب کو پورا ایک مہینہ ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔کسی نے کہا۔''یہ بات زیادہ عام نہ کیجئے انجان صاحب! کہیں لوگ آپ کو فیض کی یادگار کے طور پر محفوظ نہ کرلیں۔''

اس پر مجھے دلدار پرویز بھٹی کا وہ مشہور جملہ یاد آ گیا جو اس نے لیاقت ہال' پنڈی کے اسٹیج سے نامور قوال غلام فرید صابری پر کسا تھا۔ہوا یوں کہ صابری صاحب کو محفل میں بیٹھ کر اپنی قوالی کے مخصوص انداز میں با آواز بلند''اللہ'' کہنے کی عادت ہے۔ان کے اس بار بار''اللہ'' کہنے سے دلدار بہت اپ سیٹ ہو رہا تھا کیونکہ لوگوں کی توجہ اس طرح سے ہٹ جاتی تھی۔ایک بار اس کے کسی لطیفے کے عین درمیان صابری صاحب نے زور سے''اللہ'' کہا۔دلدار نے فوراً لطیفہ روک کر ان سے کہا۔

''اللہ کو اتنا یاد نہ کریں' صابری صاحب! اس نے یاد کر لیا تو پچھتائیں گے۔''

واپسی پر پھر جمال زبیری نے گائیڈ کے فرائض سنبھال لیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے گھنٹے کا راستہ پانچ منٹ کے شارٹ کٹ کی تلاش میں ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔اس ضمن میں ان کا آخری جملہ سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل مشقت اور بوریت کے بعد جب ہم نے ایک ایسا موڑ کاٹا جو واقعی ان کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر نکلتا تھا تو انہوں نے بڑے فخر سے کہا۔

''دیکھا...... دیکھا...... میں نہ کہتا تھا' ادھر کو کاٹو...... مجھے رستے کا پتا ہے۔''

ٹورنٹو کا مشاعرہ یونیورسٹی کے ایک ہال میں تھا جس میں سات سو سے زیادہ کرسیاں تھیں جب کہ ہال میں موجود افراد کی تعداد کم و بیش آٹھ سو اور''سامعین'' کی تعداد دو سو تھی' بقیہ چھ سو خواتین و حضرات غالباً مشاعرے کو ایک Outing اور تفریح سمجھ کر آئے تھے جس کا اندازہ ان کی بے موقع داد اور اس سے بھی زیادہ بے محل خاموشی سے بخوبی ہو رہا تھا۔ڈاکٹر انور نسیم آٹوا سے بطور سامع اور حمیرا رحمٰن نیویارک سے بطور شاعرہ آئیں۔بقیہ سب شعراء سے ہم کسی نہ کسی محفل میں مل چکے تھے۔حمیرا بہت اچھی شاعرہ ہے اور پروین کے بعد آنے والی نسل میں یقیناً وہ بہت نام پیدا کرے گی۔یہاں سب سے زیادہ داد افتخار عارف کو ملی جو بلاشبہ اس کا مستحق تھا۔پڑھنے کا ڈھنگ تو اسے پہلے بھی آتا تھا مگر پچھلے چند برسوں میں اس کی شاعری بھی بہت بہتر ہو گئی ہے۔اردو فکشن میں انتظار حسین اور شاعری میں افتخار عارف نے ہجرت کے تجربے کو جس تسلسل اور مہارت سے استعمال کیا ہے اس کی مثال عصری ادب میں اور کہیں نہیں ملتی۔اس کے دو شعر مجھے خاص طور پر بہت پسند ہیں۔

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں' اس کو گھر کر دے

سچے سائیں حضرت بابا مہر علی شاہ
بابا' ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

◆◆◆

ایڈمنٹن

ایڈمنٹن تک ہماری فلائیٹ کل چار گھنٹے کی تھی مگر چار گھنٹوں کے سفر میں عجیب عجیب گھپلے تھے۔ مثلاً ہم صبح ناشتہ کرنے کے بعد آٹھ بج کر پچاس منٹ پر روانہ ہوئے۔ بارہ پچاس پر ایڈمنٹن پہنچے مگر چونکہ وہاں کا وقت دو گھنٹے پیچھے تھا اس لیے وہاں کی گھڑیوں پر دس بج کر پچاس منٹ ہو رہے تھے یعنی ہم اپنی طرف سے لنچ ٹائم پر پہنچے اور وہاں ابھی ناشتے کے برتن سمیٹے جا رہے تھے۔ عجیب صورت حال تھی کہ میزبان ناشتے کا نہیں پوچھ سکتے تھے اور مہمان دوپہر کے کھانے کے بارے میں متذبذب تھے کہ گیارہ بجے دوپہر کا کھانا کیسے کھائیں اور نہ کھائیں تو کہاں جائیں۔

ائیر پورٹ پر عالی کے نیشنل بنک کے پرانے ساتھی فرید صاحب اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ ان کی بڑی بیٹی طلعت وہاں کام کرتی تھی۔ اس کا میاں ملازمت کی تبدیلی کے چکر میں کسی دوسرے شہر میں تھا۔ فرید صاحب' ان کی بیگم' چھوٹی بیٹی ماریہ اور بیٹا جسے پیار سے سب بوبی کہتے تھے' طلعت کے گھر سے قریب ہی ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ تینوں بچے بڑے خوش رو' نفیس اور محبت کرنے والے تھے اور ان کے والدین بھی انتہائی ملنسار' مخلص اور مہمان نواز تھے چنانچہ طلعت کے گھر اس دن جو کھانا ہم نے کھایا اس میں یہ سب چیزیں شامل تھیں اور کچھ خالص دیسی ڈشیں مثلاً قیمہ بھرے کریلے (جنہیں ہم بت کریلے کہتے ہیں) نرگسی کوفتے' بھنڈی قیمہ' مختلف طرح کے اچار' چٹنیاں اور مربے ان پر مستزاد تھے۔

ماریہ نے جین اور جیکٹ پہن رکھی تھی چنانچہ عالی نے فوراً اس کا نام بوائے سکاؤٹ رکھ دیا جو ایسا چلا کہ اس کے گھر والے بھی اس میں شریک ہو گئے۔ کھانے کے بعد پروین اندر ''زنانے'' میں چلی گئی جو ہماری نشست کے کمرے کے بالکل سامنے تھا اور کسی بھوکے کے منہ کی طرح کھلا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں وی سی آر پر ماریہ عرف بوائے سکاؤٹ کی منگنی کی فلم دیکھی جا رہی ہے۔ پروین نے بتایا کہ وہ لڑکے اور اس کے گھر والوں کو اچھی طرح جانتی ہے' وہ لوگ کراچی میں ان کے ہمسائے تھے اور یہ لڑکا عقلاً شکلاً ماریہ کے لیے موزوں ہے۔

میں نے کہا۔ ''گویا بہت خوبصورت ہے۔''

پروین نے مجھے شرارتاً آمیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔ میں نے فوراً جملہ آگے بڑھایا۔ ''اور معقول حد تک بیوقوف بھی۔''

پروین نے مجھے چھیڑنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ بولی "یہ بیوقوفی آپ نے غالباً اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے اضافہ کی ہے۔"
میں نے کہا۔ "نہیں تو' تمہارے ہی کسی انگریزی مارکہ فلسفی کا مقولہ ہے کہ خوبصورت سروں کے اندر عام طور پر بھوسا بھرا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر سلیم قریشی جو اس دوران میں بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہماری نوک جھونک دیکھ اور سن رہے تھے' بولے "آپ دونوں کی گفتگو سے مجھے ایک فائدہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ اب آپ دونوں میرے مہمان ہوں گے اور میرے غریب خانے پر تشریف پہ رہیں گے!

میں نے کہا۔ "جناب! اس سفر میں ہم تو سرمہ مفت نظر ہیں اور اس کی قیمت کے طور پر چشم خریدار پہ احسان بھی نہیں رکھتے' یہ تو آپ میزبانوں کا مسئلہ ہے جس کو جہاں چاہیں رکھیں' مسافروں کے ٹھکانے تو بہر حال بدلتے ہی رہیں گے۔"

سلیم قریشی تاریخ کے پروفیسر ہیں اور یونیورسٹی آف البرٹا میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین کی سینئر پوزیشن پر کام کر رہے ہیں لیکن ان کی علمیت' خوش مزاجی اور سخن فہمی کے علاوہ بہت سی خصوصیات ہم پر آہستہ آہستہ کھلیں اور بوائے سکاؤٹ ماریہ کے بارے میں گفتگو کا اضافی فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں آئندہ تین دن ایک ایسے مثالی جوڑے کے ساتھ رہنے کا موقع ملا جو اس سفر میں ہمارے بہترین اور باکمال ترین میزبان تھے' شاید!

ڈاکٹر سلیم قریشی کی بیگم ریگولا قریشی پہلی نظر میں بالکل متاثر نہیں کرتیں۔ پتلی دبلی' طویل قامت' عمر چالیس سے اوپر' چہرے کے نقوش امریکی ایکٹر جیمز کوبرن سے ملتے جلتے اور....... میرے خیال میں اس خاتون سے متعلق معمولی باتیں بس اتنی ہی ہیں باقی سب کی سب باتیں اسے ایک غیر معمولی خاتون بنانے والی تھیں۔ ریگولا نسلاً سوئس جرمن ہے مگر اردو ایسی بامحاورہ اور نستعلیق بولتی ہے کہ اپنے صلاح الدین محمود بھی اس کے آگے پانی بھریں' ہندوستانی میوزک پر اتھارٹی ہے اور قوالی کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر چکی ہے۔ "ترنم" اس کے مطالعے کا مخصوص موضوع ہے چنانچہ کسی مترنم شاعر کو ایک بار سن لے تو اس کی آواز اور گائیکی کے انداز کی ایسی نقل اتارتی ہے کہ سننے والوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا۔ فانی' جگر' ساغر' مجروح اور شکیل کا ترنم تو میں نے نہیں سنا۔ لیکن حفیظ' ناصر' جالب اور عالی کو بہت سنا ہے۔ لفظوں کی ادائیگی میں کہیں کہیں لہجے کا فرق تھا مگر جہاں تک ترنم کی لے اور دھن کا تعلق ہے وہ بی بی سو فیصد نمبروں کی حقدار تھی۔ عالی نے بتایا کہ جن مرحوم یا زندہ ہندوستانی شعراء کے ترنم کی ریگولا نے نقل اتاری ہے وہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ ریگولا کی ریسرچ کا زیادہ تر زمانہ ہندوستان میں گزرا ہے۔

ڈاکٹران ریگولا اور سلیم کے دو بچے ہیں۔ لڑکا انیس برس کا ہے اور لڑکی بیس برس کی اور دونوں میں فرق بھی انیس بیس ہی کا تھا۔ دونوں بچے ماں باپ سے علیحدہ الگ الگ فلیٹوں میں رہتے تھے۔ میں نے اپنی مشرقی فطرت کے تحت مجبور ہو کر پوچھ ہی لیا کہ اتنے بڑے مکان اور ایسی اچھی ملازمتوں کے باوجود آپ نے بچوں کو گھر نکالا کیوں دے رکھا ہے جبکہ بقول آپ کے وہ دونوں ابھی طالب ہیں۔ سلیم قریشی نے میرے سوال اور اس میں چھپے ہوئے طنز کو سنا بھی اور سمجھا بھی اور پھر اس کی وضاحت یوں کہ اس کارروائی کا بنیادی محرک یہاں کا معاشرتی نظام ہے جو نوجوانوں کو انفرادیت' آزادی اور ذات کے سماجی اور معاشی تشخص کا ایک ایسا تصور دیتا ہے جس کے حوالے سے سولہ سترہ برس کی عمر کے بعد والدین کے ساتھ یا ان کا دست نگر رہنا ایک طعنہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ اس کارزار حیات میں سب کو اپنی اپنی جنگ اپنے بازوؤں سے لڑنی ہے۔ چنانچہ The sooner the better انہوں نے بتایا کہ ہفتے میں دو تین بار بچوں سے فون پر بات ہو جاتی ہے اور ایک آدھ بار وہ ملنے بھی چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ لوگ ناشتے یا کھانے پر بھی مل بیٹھتے ہیں۔ میرا جی چاہا کہ ڈاکٹر سلیم قریشی سے ان کے اندر کے اس مشرقی آدمی کا ردعمل معلوم کروں جس کی سماجی تربیت میں اولاد اور والدین مہد سے لحد تک زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم دگر پیوست رہتے ہیں مگر پتا نہیں کیوں میں خاموش ہو گیا۔ معاش' سماج اور اخلاقیات کے انہی تضادات کا نام شاید زندگی ہے۔

بات کسی اور طرف نکل گئی' تذکرہ ہو رہا تھا ریگولا قریشی کا' جس کی اردو اور موسیقی سے دلچسپی اور دسترس نے مجھے اور پروین کو مبہوت کر دیا تھا۔ ڈائننگ روم میں ایک طرف ڈیک رکھا تھا جس سے ملحقہ الماری مختلف کیسٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ کلاسیکی' نیم کلاسیکی' فلمی' غیر فلمی' لوک اور انسٹرومینٹل ہر طرح کے میوزک کا بہترین انتخاب وہاں موجود تھا۔ میں نے یوں ہی غلام علی کا کیسٹ نکالا۔ آٹھ کی فہرست میں میری دو غزلیں بھی تھیں۔ خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی کیونکہ مجھے خود علم نہیں تھا کہ غلام علی نے میری یہ غزلیں بھی گائی ہوئی ہیں چنانچہ وطن سے دس ہزار میل دور بیٹھ کر میں نے اپنی ہی غزل پہلی بار سنی۔ غزل اور گائیکی دونوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر اس ''انکشاف'' کا مزا بہرحال اپنی جگہ تھا۔ ریگولا کچن کے دروازے پر آ کر تقریباً ایک منٹ تک سنتی رہی پھر بولی ''غلام علی اچھا گاتا ہے' اگر استاد بننے کی کوشش نہ کرے تو اور اچھا ہو سکتا ہے۔''

یہ ایک ایسا جامع تبصرہ تھا کہ طبیعت پھڑک اٹھی۔ میں نے محض امتحان کی خاطر اپنی پسندیدہ گلوکارہ عابدہ پروین کا ایک کیسٹ لگا دیا۔ ریگولا نے داد دینے کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لڑکی بہت اچھی ہے راگ داری اور فوک دونوں کو خوب جانتی ہے' بہت involve ہو کر گاتی ہے اور یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ سلیم بھی اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔''

ملحقہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے سلیم قریشی نے اخبار سے سر اٹھایا' اثبات میں ہلایا اور پھر مسکرا کر بولے۔ "مجھے اس وقت روح سے زیادہ جسمانی غذا کی ضرورت ہے اس لیے فی الحال میں عابدہ پروین پر ناشتے کو ترجیح دوں گا۔"

سب لوگ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ ریگولا دوبارہ کچن میں چلی گئی اور پروین نے کہیں سے ڈھونڈ کر لتا کا وہ مشہور بھجن لگا دیا جسے سن کر بقول ہمارے ایک دوست کے "دیوی دیوتاؤں پر یقین سا آنے لگتا ہے۔" لتا کہہ رہی تھی۔

اے ری میں تو پریم دوانی...... میرا درد نہ جانے کوئی

ناشتے کے بعد تہہ خانے کی سیر کی جو سلیم قریشی کی سٹڈی کا کام بھی دیتا تھا۔ ایک طرف اردو کے جدید اور قدیم مشاہیر کی تصاویر ایک بڑے سے بورڈ پر نہایت خوبصورتی سے سجی تھیں۔ سلیم قریشی خود بھی بہت اچھے فوٹو گرافر ہیں چنانچہ یہاں ان کی کھینچی ہوئی کئی تصویریں موجود تھیں۔ دیواروں پر کچھ پینٹنگز تھیں۔ سلیم قریشی نے بتایا کہ یہ ان کی بیٹی کے کمالات ہیں جو فائن آرٹ کی طالبہ ہے اور یہ اس نے تیرہ سے اٹھارہ برس کی عمر کے درمیان بنائی تھیں۔ میں کبھی تصویروں کو اور کبھی ڈاکٹر قریشی کے منہ کو دیکھتا تھا اور چپ ہو جاتا تھا کہ میرے دل میں مشرق اور مغرب کے تہذیبی تصورات کا فرق پھر ایک سوال بن کر ابھر آیا تھا۔ مغرب میں جنسی تعلیم نصاب تعلیم کا حصہ ہے اور ہمارے یہاں ایک سربستہ راز' وہاں اظہار کی زیادتی ہے اور یہاں اخفاء کی' وہاں جنسی آزادی کا مسئلہ ہے اور یہاں جنسی گھٹن کا۔ میں اعتدال پسند واقع ہوا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ جنس کے بارے میں ہمارا معاشرتی اور اخلاقی رویہ بہت ناقص' غیر فطری اور ضرر رساں ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی کہ کوئی باپ (خصوصاً مشرقی اخلاقیات کا پروردہ) ایک اجنبی مرد کو اپنی نوجوان بیٹی کی بنائی ہوئی ایسی تصاویر دکھائے جن میں انسانی وجود کی تصویر کشی لباس فطرت کے ساتھ کی گئی ہو۔ ہو سکتا ہے یہ میرا نفسیاتی مسئلہ یا کمپلکس ہو مگر پتا نہیں کیوں میں ایسے کمپلکس کو ختم کرنے کی بجائے اس کی حفاظت کرنا پسند کرتا ہوں۔

رات کو اسی تہہ خانے میں ڈاکٹر سلیم کی طرف سے ایک پر تکلف کھانے اور نسبتاً کم تکلف مشاعرے کا پروگرام تھا۔ غایت اس اکٹھ کی ایڈمنٹن کے برصغیریوں سے ہماری اور ہماری ان سے ملاقات تھی۔ زیادہ تر لوگ یونیورسٹی یا شعبہ تعلیم سے متعلق تھے۔ کچھ شناسا چہرے بھی نظر آئے۔ ملتان کا نوجوان زاہد مخدوم اور اس کی بیوی نگہت سلیم طالب علمی کے زمانے سے اپنے ترقی پسندانہ خیالات کی وجہ سے معروف تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ نگہت کی باتوں سے وطن کی محبت اور دوری کے دکھ کا احساس بری طرح جھلک رہا تھا۔ زاہد اس کے برعکس پاکستانی معاشرے کی گھٹن' خراب سیاسی صورت حال' فوجی آمریت اور اجتماعی زوال کے حوالوں سے تنقید کے ذریعے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ میں بحث میں پڑ کر محفل کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے طرح دیتا رہا مگر جب چار

پانچ احباب اس کی ہمنوائی میں بولنے لگے تو مجبوراً مجھے کہنا پڑا کہ پاکستان اور وہاں کی صورت حال کی جتنی خرابیاں آپ نے بتائی ہیں میں انہیں بغیر بحث تسلیم کر لیتا ہوں لیکن یہ بتائیے کہ جب آپ جیسے لوگ، جن کا علم، فکر، احساس اور عمل کسی ملک میں اقداری تبدیلی کا محور ہوتا ہے، دامن بچا کر وہاں سے نکل آئیں گے اس ''کیچڑ'' سے اپنے اجلے لباسوں سمیت کنارہ کشی کر لیں گے تو پھر وہاں کی صورت حال کس طرح بدلے گی! آپ پاکستان پر اس لہجے میں تنقید کرتے ہیں جیسے وہ آپ کا اپنا نہیں کسی اور دنیا کا ملک ہے! مانا کہ پاکستان میں انسانی حقوق کی حق تلفی ہو رہی ہے مگر آپ لوگوں نے بھی تو پاکستان کی حق تلفی کی ہے۔

اس پر بحث کا رخ بدل گیا، کچھ لوگ نرم پڑ گئے اور کچھ اپنا دفاع کرنے لگے کہ کس طرح معاشی تحفظ اور ترقی کے لیے انہیں ترک وطن کا فیصلہ کرنا پڑا۔ عالی نے کہا۔

''میں گزشتہ پچیس برس سے دنیا بھر میں گھوم رہا ہوں۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے لوگ دنیا کے بے شمار ملکوں کو اپنی صلاحیت اور محنت سے بہتر اور قوی تر بنا رہے ہیں۔ اگر ان کی یہی صلاحیت اپنے ملک میں استعمال ہوتی تو آج پاکستان کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوتا۔ ۱۹۶۲ء میں کوریا والے پاکستان کو اپنا آئیڈیل مانتے تھے مگر آج صنعتی اعتبار سے کوریا ہمارا آئیڈیل بن چکا ہے۔ اس زوال کی بہت سی وجوہات ہیں اور ان میں سے ایک بہت بڑی وجہ خود آپ لوگ ہیں اس لیے کم از کم آپ تو تنقید کرتے وقت ذرا احتیاط ملحوظ رکھا کریں۔''

اس جوابی کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی ہی دیر میں کم و بیش تمام حاضرین دردمندی اور ایک احساس شراکت کے ساتھ پاکستان کے بارے میں اس طرح سے باتیں کرنے لگے جیسے کسی محبوب مریض کے بارے میں اس کے عزیز و اقرباء گفتگو کرتے ہیں۔

زاہد اور نگہت مجھ سے مشترکہ دوستوں کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ نگہت اپنے نفسیات والے پروفیسر امتیاز چیمہ کی شاگرد رہ چکی تھی۔ اس نے سلام کے ساتھ اظہار افسوس بھی بھیجا کہ چیمہ صاحب اب محکمہ تعلیم میں ڈائریکٹر ہو گئے ہیں اور یوں ایک اچھا استاد فائلوں کی صحبت میں داخل دفتر کر دیا گیا ہے۔ زاہد نے سرمد صہبائی کی کافیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے کہا۔

''سرمد میں خوبی یہ ہے کہ وہ بلیک کافی اور صوفیانی کافی دونوں کو ساتھ ساتھ چلا لیتا ہے۔ خیر، یہ تو مذاق کی بات تھی۔ کافیاں اس نے بہت اچھی لکھی ہیں اور اپنے ہم عصروں میں وہ ہمیشہ میرے پسندیدہ شاعروں میں رہا ہے۔''

زاہد نے شرارت آمیز انداز میں سرمد کی غیر سرمدی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نگہت کی وجہ سے ذرا ہچکچایا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''آپ مرد لوگوں کے پاس کتنے کم موضوع ہیں گفتگو کے لیے۔''

زاہد نے ہنس کر کہا۔ ''امجد صاحب اور عطاء الحق قاسمی کو تو منیر نیازی نے ''خواتین پسند مصنفین'' کا خطاب دے رکھا ہے۔''

''اور وہ خود اس انجمن کے تاحیات صدر ہیں' یہ شاید تم لوگوں کو پتا نہیں۔''

اس طرح کی دلچسپ نوک جھونک جاری تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک معقول صورت' معقول لباس' ادھیڑ عمر کے صاحب بڑے فلمی انداز میں لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور ایک بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ چندھی چندھی آنکھوں سے حاضرین کو گھورنے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی پس منظر سے موسیقی شروع ہو گی اور یہ محمد رفیع کے پلے بیک گانے پر ہونٹ ہلانا شروع کر دیں گے۔ ''مجھے دنیا والو شرابی نہ سمجھو' میں پیتا نہیں ہوں پلائی گئی ہے''

آزیر صاحب سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ کھلا کہ جناب فلسفے کے پروفیسر ہیں اور ایک مدت سے یہیں مقیم ہیں اور اسی طرح مقیم ہیں۔ میں نے زاہد مخدوم سے کہا۔ ''لاہور میں ہمارا ایک ٹی وی پروڈیوسر دوست زاہد ازیر نامی ہے۔ یہاں تم دونوں مل کر اس کی کمی پوری کر رہے ہو۔''

مخدوم نے ازیر صاحب کی بدمست نگاہوں اور بے طرح پڑتے ہوئے قدموں کی طرف دیکھا اور ایک ہچکی سی لے کر کہا۔ ''شراب پینا بھی کرکٹ کی اننگ کھیلنے کی طرح ہے۔ جب تک آپ ناٹ آؤٹ ہیں گراؤنڈ میں ہیں' آؤٹ ہوئے اور کام ختم' اب پویلین میں جا کے آرام کریں۔''

میں نے کہا۔ ''اس سلسلے میں تمہارے خیالات برادر عزیز منیر نیازی سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ ایک دفعہ ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا بات ہے جب میں ذرا سی بھی پیتا ہوں تو میرے جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں جب کہ لوگوں کو ڈرم پی کر بھی کچھ نہیں ہوتا؟ منیر نیازی نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا تھا کہ بات یہ ہے کہ برخوردار' شراب کو بھی پتا ہوتا ہے اسے کون پی رہا ہے۔''

مشاعرہ شروع ہوا تو ازیر صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا مگر ''پاؤں رکھتے ہیں کہیں اور کہیں پڑتا ہے'' کی طرح ان کے شعر بھی قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ ایک ہندو شاعر نوشاد جونپوری نے ترنم سے کلام سنایا۔ کلام تو بس ٹھیک ٹھاک تھا مگر ان کی آواز اور ترنم کا انداز بہت عمدہ تھا۔ غزل کو وہ کچھ کچھ ٹھمری اور دادرے کے رنگ میں گاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے منا ڈے' مظفر وارثی کی آواز میں گا رہا ہے۔ یہاں میزبانوں کے بیٹے سے بھی ملاقات ہوئی۔ سترہ اٹھارہ برس کا خاموش' حال مست مہذب سا نوجوان اس ''غیر'' محفل میں ایسے بیٹھے تھا جیسے ''تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ'' سوئس جرمن ماں' پاکستانی باپ' کینیڈین شہری' بیسویں صدی کا آخری ربع ...... میں سوچنے لگا' ہم اپنے کلچر کو روتے ہیں' کوئی اس بیچارے کو بھی دیکھے!

ہر شہر کی طرح یہاں بھی عالی صاحب کی رشتے کی ایک بھانجی نکل آئی۔ سیدہ نامی ایک خاتون ہمیں لنچ کے لیے لینے آئیں۔ معلوم ہوا وہ رشتوں کی بہت سی ضرب، جمع اور تقسیم کے بعد عالی کی بھانجی لگتی ہیں۔ پہلی نظر میں بہت نک چڑھی محسوس ہوئیں مگر کچھ دیر بعد پتا چلا کہ موصوفہ کو دراصل شدید قسم کا زکام ہو رہا ہے۔ ہندو ہوٹل ''انا پورنا'' میں پہنچے۔ سردی منفی انیس درجے سنٹی گریڈ تھی اور ہوٹل کے دروازے کے ارد گرد اس قدر برف تھی کہ وہاں باقاعدہ سکیٹنگ کی جا سکتی تھی۔ عالی صاحب نے پروین کے جوتوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور برف پر چلنے کے آداب سے متعلق ایک عمومی لیکچر کا آغاز کیا لیکن ابھی انہوں نے تمہید ہی باندھی تھی کہ ان کا برج الٹ گیا۔ بھاری جسم پر بہت سے کپڑوں کے اوپر بہت بھاری روسی اوور کوٹ میں عالی کا حجم بہت بڑھ چکا تھا چنانچہ جب وہ پھسلے تو یوں لگا جیسے کوئی پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ رہا ہے۔ فوری ردعمل کے طور پر سب لوگ پہلے ہنسے اور پھر انہیں اٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ اگرچہ وہ خاصے زور سے گرے تھے مگر سیدھا کمر کے بل گرنے اور بھاری کوٹ کی وجہ سے بچ بچا ہو گیا۔ ہوٹل میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھنے کے بعد عالی نے اپنا جائزہ لیتے ہوئے مجھے اور پروین کو مخاطب کر کے کہا۔ ''لو بھئی تم ہمارے کوٹ کی دبازت پر تنقید کرتے تھے اب دیکھو کام آ ہی گیا نا!''

میں نے کہا۔ ''کیوں نہیں، لیکن روسی کوٹ ہے نا۔ اس سے کام لینے کے لیے پہلے گرنا پڑتا ہے۔''

دنیا کے مختلف ملکوں کے مقامی کھانے کھانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی دوسرے ملک کی خوراک کے مخصوص ذائقے سے مانوس ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ پہلی ملاقات پر بہت کم کھانے آپ کو ''پکڑتے'' ہیں۔ مجھے یاد ہے ۱۹۸۲ء میں ہندوستان سے واپسی پر جب میں نے اپنے میزبان راجندر ملہوترہ کے ڈنر کا تذکرہ اپنے سفرنامے میں کیا تھا تو میں نے ہندوستانی کھانوں کے ذائقے پر کچھ تنقید کی تھی۔ بعد میں وقت اور تجربے سے معلوم ہوا کہ میری مایوسی کی اصل وجہ ہندوستانی کھانوں کے بارے میں بزرگوں سے سنی ہوئی بے حد تعریفیں اور ذائقے کی تبدیلی تھی۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے اس وقت ہوئی جب راجندر ملہوترہ نے میرے سفرنامے کا متعلقہ حصہ پڑھا اور مجھ سے گزشتہ معذرت کرتے ہوئے آئندہ تلافی کا وعدہ کیا۔ اس دن سے میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب ایسے کسی موقعے پر فوری ردعمل کا اظہار نہیں کرنا لہٰذا میں ''انا پورنا'' کے کھانے کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گا، ہو سکتا ہے آئندہ کبھی ایڈمنٹن جانا پڑ جائے یا ''انا پورنا'' کی انتظامیہ کے کوئی رکن کہیں مل جائیں اور انہوں نے میری یہ تحریر بھی پڑھ رکھی ہو۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔

کشور قریشی کا ذکر میں کیلگری کے مشاعرے اور اس کے قہقہے کے حوالے سے کر چکا ہوں۔ ایڈمنٹن میں وہ مشاعرے کی منتظم اعلیٰ

تھیں اور "انا پورنا" کے کھانے میں ہمارے ساتھ شریک تھیں۔ پروین نے بتایا کہ کشور یونیورسٹی میں ان سے چند سال سینئر تھی' اور بڑے معرکے کی مقررہ تھیں۔ کشور کی آواز کا مخصوص کرارہ پن' جملوں کی صوتی ساخت اور ادائیگی میں اب بھی مقرروں کے مخصوص Stress and Pauses کی جھلک پائی جاتی تھی مگر اس دوران گزرا ہوا وقت اس کے چہرے اور آواز دونوں میں اپنی نشانیاں چھوڑ گیا تھا۔ دو بچوں' ایک ٹوٹے ہوئے دل اور ناکام شادی نے مل جل کر اسے کچھ ایسا کر دیا تھا کہ معتبر راوی (یعنی پروین شاکر) کے بیان کے باوجود "اعتبار" کا پانسہ کمزور پڑ رہا تھا۔ قاسمی صاحب کا ایک شعر بہت یاد آیا۔

پوچھ بیٹھا ہوں میں تجھ سے ترے کوچے کا پتا
تیرے حالات نے کیسی تری صورت کر دی

کھانے کے بعد کشور ہمیں اپنے ساتھ دنیا کے سب سے بڑے شاپنگ مال کی سیر کے لیے لے گئی۔ پانچ آرمینین نژاد بھائیوں کا تعمیر کردہ یہ مرکز خرید و فروخت' مارکیٹ یا شاپنگ سنٹر ایک حیران کن عمارت ہے۔ اس میں بلا مبالغہ سینکڑوں دکانیں اور بڑے بڑے سٹور ہیں۔ چڑیا گھر ہے' مچھلیوں کا ایکویریم ہے' جگہ جگہ خوبصورت فوارے' سیڑھیاں' اوور ہیڈ پل اور راستے' چھت کی جگہ لوہے اور شیشے کا ایک طویل اور خوبصورت اسٹرکچر۔ غرض ہر جا کہ می بینم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

پرندے اور مچھلیاں پروین کی مسلمہ کمزوریاں ہیں چنانچہ ایکویریم پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ ایسے انہماک اور اشتیاق سے مچھلیوں کو دیکھنے لگی جیسے باقی عمر انہی کی صحبت میں گزارنے کا ارادہ ہو اور سچی بات یہ ہے کہ ایسی خوبصورت اور انوکھی مچھلیاں میں نے بھی آج تک کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ایکویریم کے شیشے کے دوسری طرف ایک شعلہ سا لپکا۔ رنگ برنگی مچھلیوں' پانی اور شام کے جھٹپٹے میں ایک لمحے کے لیے جیسے وقت ٹھہر سا گیا' اپنا ایک بھولا ہوا شعر یاد آ گیا۔

لہریں اٹھ کے مگر اس کا بدن چومتی تھیں
وہ جو پانی میں گیا اور بھی دریا چمکا

اس شعر بلکہ پوری غزل کا سلسلہ نسب مصحفی کی اس خوبصورت غزل سے ملتا ہے۔

پانی میں نگاریں کف پا اور بھی چمکا
بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا

میں نے بہانہ بنا کر دونوں شعر سنائے' کشور نے داد کے طور پر دو چھوٹے چھوٹے قہقہے مارے مگر پروین شاید میری نظروں کا تعاقب کر رہی تھی' شرارت سے مسکرا کر بولی۔ یہاں تو آپ کو میر کا وہ شعر پڑھنا چاہیے تھا کہ

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں مری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں مری

میں نے کہا۔ "بہر حال' ایک بات تو طے ہوگئی ہے کہ تمہارا دھیان بھی مچھلیوں کی طرف نہیں تھا۔"

ہماری اگلی منزل فرید صاحب کا گھر تھا جہاں سے چائے پی کر ہمیں اپنے اصلی میزبان کی طرف پہنچنا تھا۔ کشور نے بتایا کہ چائے کے مقررہ وقت میں صرف دس منٹ باقی ہیں اور راستہ کم از کم بیس منٹ کا ہے اور اس میں مزید تاخیر کا امکان یوں ہے کہ اس نے متعلقہ گھر صرف ایک بار دیکھا ہوا ہے اور رستوں کے بارے میں اس کی یادداشت اور کچھ بھی ہو قابل فخر بہر حال نہیں ہے۔

بہت کم لوگ اپنے بیانات کو اس طرح ثابت کر سکتے ہیں جیسے اس دن کشور نے کیا۔ تقریباً سوا گھنٹہ اس شیر کی بچی نے طلعت کے گھر کے اردگرد کی سڑکوں پر موٹر دوڑائی۔ ہمیں ۵۵ نمبر سڑک پر جانا تھا۔ ۴۹ سے ۵۴ اور پھر ۵۶ سے ۶۰ تک ساری سڑکیں اپنی اپنی جگہ موجود تھیں بیچ میں سے ۵۵ نمبر ہر بار غائب ہو جاتا تھا۔ بارش' برف' پھسلن' کشور کی ڈرائیونگ' بدحواسی' تاخیر کا احساس اور بے معنی بوریت کا دباؤ جب ناقابل برداشت ہو گیا تو پروین کو آئیڈیا سوجھا۔ اس نے کہا۔ "اگر تمہیں فرید صاحب کے فلیٹ کا پتا ہے تو ادھر چلتے ہیں' وہاں سے طلعت کے گھر کا پتا چل جائے گا۔"

کشور نے خالص پنجابی انداز میں اپنے سر پر دو ہتڑ مارا کہ اسے یہ خیال پہلے کیوں نہ آیا اور گاڑی بڑی سڑک پر ڈال دی۔ ابھی ہم چند ہی قدم چلے تھے کہ اس نے دو ہتڑ دہرایا اور ایک دم بریک مار کر موٹر ایک سائیڈ کی سڑک پر ڈال دی اور ہماری سوالیہ نظروں کے جواب میں انگلی سڑک کے کنارے لگے ہوئے بورڈ کی طرف اٹھا دی جس پر ۵۵ کا ہندسہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ طلعت کے گھر ہم ٹھیک ساڑھے چھ بجے پہنچے۔ وہ لوگ ہمارے آنے سے مایوس اور نہ آنے سے سخت پریشان تھے۔ بوائے سکاؤٹ ماریہ کے چہرے کو پہلی بار مسکراہٹ سے خالی دیکھا۔ پروین طلعت سے باتوں میں مصروف تھی اس لیے وجہ بھی پوچھ لی' معلوم ہوا موصوفہ نے ٹیسٹ کی وجہ سے زیادہ پڑھائی کر لی جس کی وجہ سے سر میں درد شروع ہو گیا۔ گھر میں گردے کے درد کی گولیاں پڑی تھیں' انہیں سر درد کی سمجھ کر ایک ساتھ چار کھا ڈالیں اور معاملہ ہسپتال تک پہنچ گیا۔ واپسی ہمارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہوئی ہے۔ کچھ دیر اس بات پر چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی مگر ایک دم بوائے سکاؤٹ کی آنکھوں میں شرم اور ندامت کی وجہ سے آنسو چھلکنے لگے تو موضوع بدل گیا۔

ایڈمنٹن کا مشاعرہ اس لحاظ سے خصوصاً قابل ذکر ہے کہ یہاں سامعین اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں تھے مگر کم وبیش سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مختلف علوم کے پروفیسر تھے۔ تھیٹر نما آڈیٹوریم میں ویڈیو کیمرہ نصب تھا اور سامعین کی صفوں میں خواتین اور مرد تقریباً برابر تعداد میں شریک تھے۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر سلیم قریشی نے کی اور اپنی دلچسپ باتوں سے مشاعرے کو ایک Intimate محفل کا روپ دے دیا۔ کیلگری سے اقبال حیدر، ان کی بیگم، بہنیں اور بہنوئی بھی آئے ہوئے تھے یہاں مجھے زندگی میں پہلی بار کسی مکمل اردو مشاعرے میں پنجابی کلام بھی سنانا پڑ گیا کیونکہ سامعین کا تقاضا بہت پر زور تھا اور پنجاب کا پہلا اور آخری نمائندہ میں ہی تھا۔

عالی کے دوہے حسب معمول مشاعرے کی جان تھے مگر اس مشاعرے میں ان کا ایک جملہ محفل کو لوٹ لے گیا۔ تحریر میں شاید اس جملے کی برجستگی، طرز ادب اور بے ساختگی نمایاں نہ ہو سکے پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔ عالی نے پہلے تو ایک چھوٹی سی تقریر کی جو کچھ کچھ یوں تھی۔

''حضرات دوہا بازی اور گلے بازی تو ہم کرتے رہتے ہیں مگر یہاں جو مضمون باندھا گیا ہے اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ساری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ عشق، مشک اور جوبن ایسی چیزیں ہیں جو چھپائے نہیں چھپتیں۔''

اس کے بعد انہوں نے ذرا وقفہ دیا اور پھر بڑے دلچسپ انداز میں کہا۔ ''ناچیز اس کے خلاف عرض کرتا ہوں۔''

اور پھر بے شمار قہقہوں کے شور میں یہ دوہا پڑھا۔

عشق چھپے اور مشک چھپے اور جوبن تک چھپ جائے
سچا بول اور جھوٹی کویتا کبھی نہ چھپنے پائے

مشاعرے کے بعد سلیم قریشی کے گھر میں ریگولا اور عالی سے مختلف مشاعروں کے ترنم کی نقلیں سنی گئیں۔ تین بجے رات اپنے کمرے میں پہنچا تو نیند آ کر جا چکی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑی ہوئی ایک کتاب یونہی اٹھالی، کتاب کا نام بڑا چونکا دینے والا تھا۔

Three Days and a Child

کتاب کا مصنف ایک نوجوان یہودی افسانہ نگار تھا جس کا نام A. B. Yeho Shua تھا۔ مندرجات کی فہرست دیکھی تو پہلی کہانی کا نام کتاب کے نام سے بھی زیادہ دلچسپ تھا۔

A Poet's continuing Silence

کہانی شروع کی تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ حیرت انگیز جزئیات نگاری' انسانی نفسیات اور کرداروں کی اندرونی کشمکش کے بہت گہرے مشاہدے پر مبنی یہ ناولٹ نما طویل کہانی ایک مہین سے ریشمی دھاگے کی طرح پڑھنے والے کے وجود پر لپٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسے مصنف کے شب و روز کا روزنامچہ تھا جو ایک گھر میں اپنے پیدائشی مخبوط الحواس (retarded) نوجوان لڑکے کے ساتھ رہتا ہے اور گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا فرد نہیں۔ باپ کی بیزاری' الجھن' رحم' شفقت پدری اور Love Hate Relation کا منظرنامہ اتنا مکمل' متحرک اور گہرا تھا کہ میں ان کرداروں کو Cold Print سے متحرک انسانی اجسام میں تبدیل ہوتے دیکھ سکتا تھا۔

اگلی صبح گیارہ بجے اٹھے اور بارہ بجے ناشتے کی میز تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک بجے البرٹا یونیورسٹی کی انگریزی زبان کی فیکلٹی کے ڈین پروفیسر موئلز کے ساتھ لنچ ہے سو ناشتہ گول کر دیا گیا۔ ریگولا ہمیں لے جانے کے لیے یونیورسٹی سے آئی تھی۔ ہمیں چھوڑ کر اسے واپس اپنے ڈیپارٹمنٹ پہنچنا تھا کیونکہ اسے آج اگلے امتحان کا پرچہ تیار کرنا تھا جس کی واحد ممتحن بھی وہ خود ہی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہاں یونیورسٹیاں بہت آزاد ہیں اور طلبہ اور اساتذہ کو تعلیم کے سلسلے میں نصابوں کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اساتذہ کی ترقی شعبے کے ڈین کی سفارش پر ہوتی ہے اور اگر ڈین سفارش نہ کرے تو متعلقہ استاد نہ صرف اس فیصلے کو چیلنج کر سکتا ہے بلکہ ڈین کو اسے وہ وجوہات بھی بتانا پڑتی ہیں جن کی وجہ سے اس نے سفارش نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا' اگر ہمارے یہاں یہ طریقہ رائج ہو جائے تو یونیورسٹی میں طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی روز فوجداری مقدموں میں ملوث ہوں۔

پروفیسر موئلز بھی بیشتر اساتذہ کی طرح یہودی تھا۔ اسرائیل کی دہشت گردی اور اسلام دشمنی سے قطع نظر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ گزشتہ دو صدیوں میں انسان ترقی کے مرکزی افراد میں سے یہودیوں کو نکال دیا جائے تو باقی بہت کم بچے گا۔ اقبال نے کشمیریوں کو نجیب' چرب دست اور تر دماغ کہا تھا۔ یہودیوں کے بارے میں ''نجابت'' کا فیصلہ تو شاید مشکل ہو مگر جہاں تک چرب دستی اور تر دماغی کا تعلق ہے دنیا کی کوئی قوم فی زمانہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عالی نے پروفیسر موئلز کو اپنی کچھ نظموں کے انگریزی ترجمے نظرِ ثانی کے لیے دیے جو پٹیالہ یونیورسٹی کے پروفیسر راجندر سنگھ ورما نے کئے تھے۔ ورما صاحب نے میری چند نظموں کے تراجم بھی مجھے بھجوائے تھے جو بس ٹھیک ہی تھے۔ میں نے عالی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا۔ ''اسی لیے تو پروفیسر موئلز کو تکلیف دے رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''مگر اسے کیا پتا کہ اوریجنل نظم کیا تھی؟''

''نہ ہو؟'' عالی نے مخصوص انداز میں ہنکارا بھرنے اور دانت کٹکٹانے کے بعد کہا۔ ''انگریزی تو اس کی مستند ہو گی نا؟ ترجمے کے

نیچے اس سالے کا نام آئے گا تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔"

ایڈمنٹن میں ہماری آخری شام بہت اداس کر دینے والی تھی۔ دورے کے اس سرد ترین شہر کے بارے میں اشفاق سے ہم نے قیام کی مدت کم کرنے کی فرمائش کی تھی مگر اب یہ عالم تھا کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بوائے سکاؤٹ ماریا اور اس کا بھائی بوبی تصویریں اتار رہے تھے۔ رخصت کے وقت سب لوگوں نے فرداً فرداً ہمیں مختلف تحفے دیے اور ایسی محبت سے رخصت کیا جیسے ہم ان کے بہت ہی اپنے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے جذبات بھی ان سے مختلف نہیں تھے۔

اگلی صبح ہمیں لاس اینجلس روانہ ہونا تھا جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہاں موسم خاصا گرم ہوگا۔ لیکن کیا ایڈمنٹن کی یخ بستگی میں جو حرارت ہمیں ملی تھی اس کا مقابلہ باہر کا کوئی موسم کر سکتا ہے؟

میرا خیال ہے....... نہیں!

◆◆◆

لاس اینجلس

لاس اینجلس ریاست کیلیفورنیا کا وہی مشہور شہر ہے جہاں ۱۹۸۴ء میں اولمپکس ہوئے تھے' جہاں محمد علی باکسر رہتا ہے' جہاں فلمی دنیا کا مرکز ہالی وڈ واقع ہے' جہاں ڈزنی لینڈ ہے' سٹاروک ہے' روشنی ہے' رنگ ہے' خوشبو ہے اور ان کے علاوہ وہ سب کچھ بھی ہے جس کی بدولت دوزخ میں داخلہ آسانی سے مل جاتا ہے۔

ریاست کیلیفورنیا اس اعتبار سے قدرت کا ایک عجوبہ ہے کہ اس کی جغرافیائی حدود کے اندر کم وبیش دنیا کا ہر موسم اور زمینی کیفیت مل جاتی ہے۔ پانی' پہاڑ' برف' صحرا۔ لاس اینجلس شہر کے گرداگرد دو سو میل قطر کا ایک دائرہ کھینچا جائے تو ایک ہی موسم میں یہ سب منظر آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کسی نے کہا لاس اینجلس ایک بگڑا ہوا لفظ ہے اصل میں یہ Where Angeles Lost (جہاں فرشتے کھو جاتے ہیں یا کھو گئے تھے) اور غالباً یہی وہ جگہ ہے جہاں ہاروت و ماروت اترے تھے اور پھر واپس جانے سے انکاری ہو گئے تھے۔

ایڈمنٹن کے منفی ۱۹ درجے سنٹی گریڈ درجہ حرارت سے جب ہم لاس اینجلس کے مثبت ۳۶ درجے ٹمپریچر میں داخل ہوئے تو عالی کا اوورکوٹ ایک بار پھر لطیفے کی شکل اختیار کر گیا کیونکہ یہاں شرفاء ٹی شرٹیں پہنے پھر رہے تھے اور اشرفیاں (خواتین کے حوالے سے شرفاء کی یہ جمع ایسی غلط بھی نہیں) غالب کا مصرعہ اوڑھے گھوم رہی تھیں۔ ''سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا''

ائیرپورٹ پر فارغ بخاری کے صاحبزادے ظفر عباس اور نیر جہاں' ہمارے منتظر تھے۔ نیر جہاں چند برس پہلے پاکستان آئی تھیں اور اخبارات میں ان کے مختلف پروگراموں کے بارے میں بہت کچھ چھپا بھی تھا۔ ان کی شاعری' میڈیکل سائنس کے ایک جدید شعبے میں خصوصی قابلیت' بیوگی' غریب الوطنی اور حالات سے بہادرانہ مقابلے کی تفصیلات بھی مختلف حوالوں سے ہمیں مل چکی تھیں چنانچہ کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ نیر جہاں کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی متین تھے جو بھوپال (ہندوستان ۹ سے آئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے بائیو میڈیکل انجینیر تھے اور بہت سی چیزیں ایجاد کر چکے تھے۔ ان کا ایجاد کردہ ایک آلہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کا تعلق شیر خوار بچوں کی ایسی بیماری ہے جس کے باعث سینکڑوں پھول کھلنے سے پہلے شاخوں سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ متین نے بتایا کہ حمل کے دوران بعض پیچیدگیوں کی وجہ سے بچے کے سر میں پانی جمع ہو جاتا ہے جسے مختلف طریقوں سے نکالنے یا خشک

کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس میں کامیابی کا اوسط ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ ان کے ایجاد کردہ آلے کی مدد سے بچے کا سر کا پانی اس کے کانے کے اندر سے ایک نالی کے ذریعے گزار کر دل تک پہنچایا جاتا ہے جہاں وہ خون میں حل کر صاف ہوتا ہے اور یوں بچہ چند دنوں میں مکمل طور پر صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہڈیوں کے اندر گودے کے سوکھنے' ختم ہو جانے یا نہ بننے کا علاج بھی انہوں نے دریافت کیا ہے۔ یہ ایک ایسی خوفناک بیماری ہے جس کا تعلق بلڈ لیکومیا اور کینسر سے بہت گہرا ہے اور جس کی وجہ سے بے شمار جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے ٹی وی کی ایک بہت اچھی اور پیاری فنکارہ طاہرہ نقوی جو میری ذاتی دوست بھی تھیں' اس نوع کی بیماری کے باعث عین عالم شباب میں ہم سے رخصت ہو گئی۔ متین نے بتایا کہ اس نے ہڈیوں کا گودا بنانے اور اسے دوبارہ ہڈیوں میں بھرنے کے سلسلے میں بہت سے کامیاب تجربے کئے ہیں۔ نیر جہاں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے مختلف انسانی اعضاء خصوصاً گردوں کی Transplantation کے سلسلے میں خصوصی کورسز کئے ہیں اور اس وقت وہ ایک بہت بڑے ادارے میں اس مخصوص شعبے کی چیف ایکسپرٹ کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ وہ مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد رپورٹ دیتی ہیں کہ کوئی عضو کسی جسم کے خون اور ٹشوز کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

نیر جہاں کے چھوٹے سے مگر باسلیقہ فلیٹ میں چائے پینے کے دوران ہم لوگ ان بہن بھائیوں کی قابلیت پر رشک کرنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ نیر جہاں نے بتا کر ہمارے قدموں تلے سے زمین نکال دی کہ وہ دونوں تو سیٹلائیٹ ہیں' اصلی سیارہ تو ان کا ایک اور بھائی ہے جس نے میڈیکل سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے اور جس کی قابلیت سے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے ماہرین بھی خائف رہتے ہیں۔ متین کے انداز اور طرز گفتار میں نسوانیت کی ایک جھلک سی تھی' موقع ملتے ہی پروین نے میری توجہ اس طرف مبذول کروائی' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں کیا عرض کروں' تمہارے یوپی کا کیس ہے البتہ اس سے ایک بات ثابت ہو گئی ہے کہ ہم پنجاب والے اگر زیادہ نستعلیق نہیں ہیں تو یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں۔''

نیر جہاں بڑی حوصلے والی خاتون ہیں۔ زندگی کے اس جوار بھاٹا میں انہوں نے جس طرح اپنی شخصیت کی اکائی کو قائم رکھا ہے اور جس غیر معمولی جرات اور مسلسل محنت سے اس گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی زمین پر اپنے اکھڑے ہوئے پاؤں دوبارہ جمائے ہیں اس کی داستان بہت عجیب' خوفناک اور زندگی آموز ہے۔ آزادی کے بعد یوپی کے بہت سے مسلمان گھرانوں کی طرح ان کا خاندان بھی تقسیم ہو گیا۔ انہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ شادی ہوئی۔ شوہر سابقہ مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش میں اچھے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ تین بچیوں اور میاں بیوی پر مشتمل یہ چھوٹا سا گھرانہ درمیانہ درجے کی عزت دارانہ زندگی گزار رہا تھا کہ مشرقی

پاکستان کی زمین غیر بنگالیوں پر تنگ ہونا شروع ہوگئی۔ نیر جہاں کا خیال تھا کہ غم و غصے اور نفرت کا یہ طوفا سیاست کی سطح پر اپنا راستہ بنائے گا مگر جب دریا کناروں سے باہر نکلا تو اس نے سب سے پہلے انہی کے گھر کا رخ کیا۔ فسادیوں نے اس کے شوہر کو شہید کر دیا اور گھر کو لوٹنے کے بعد بجلی پانی کاٹ دیا۔ آٹھ روز تک نیر جہاں کو تین معصوم بچیوں اور شوہر کی لاش کے ساتھ اپنے خوابوں کے گھر میں اس طرح سے رہنا پڑا کہ ہر لمحہ موت کا پیغامبر بن کر آتا اور روح کو کاٹتا ہوا گزرتا تھا۔ نیر جہاں نے بتایا کہ اس کے مرحوم شوہر کو موم بتیاں جمع کرنے کا عجیب و غریب شوق تھا۔ کسی دوسرے ملک جاتے تو وہاں سے موم بتیاں ضرور خرید کر لاتے تھے۔ یوں ان کے گھر میں ہر طرح کی موم بتیوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا جس پر احباب کے دلچسپ تبصرے ہوا کرتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن یہی موم بتیاں اس روشنی سے محروم تاریک گھر میں اس مرحوم کے سرہانے جلنے کے لیے جمع ہو رہی تھیں۔

اس واقعے کو تیرہ برس بیت چکے ہیں۔ بی اے پاس گھریلو بیوی اب سرجیکل سائنس کے ایک مخصوص شعبے میں خصوصی مہارت حاصل کر چکی ہے۔ ان کی معصوم' بے سہارا بچیاں اعلیٰ تعلیم کے مختلف مدارج طے کر کے ڈھاکہ سے دس بارہ ہزار میل دور ایک مکمل اجنبی معاشرے میں آزادی اور خود اعتمادی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں اور ان کی ماں کے سامنے ان تینوں کے مستقبل کی فکر ہے اور پیچھے اندھیرا ہی اندھیرا ہے اس کے باوجود اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایسا اعتماد ہے کہ زندگی کی معنویت پر یقین آنے لگتا ہے۔

ناشتے کی میز پر میں نے نیر جہاں کی شخصیت کا ایک اور روپ دیکھا۔ وہ ایک گھریلو عورت کا سلیقہ اور گھڑ پن تھا۔ مزیدار ناشتہ اور کھلانے والے کا خلوص یکجا ہو جائیں تو یہ عام طور پر مہمانوں کے معدے کے لیے کوئی اچھی صورت حال نہیں ہوتی چنانچہ ہم لوگوں نے ناشتے کی شکل میں لنچ سے بھی فراغت حاصل کر لی۔ نیر جہاں' اس کی موجود دو بیٹیاں اور متین' سب لوگ نہ صرف متواضع اور خلیق تھے بلکہ غیر معمولی طور پر ذہین بھی تھے چنانچہ ان سے گفتگو کا مزا اپنی جگہ تھا۔ میں نے نیر جہاں سے پوچھا۔

''آپ نے شاعری سے سیدھے میڈیکل سائنس میں کیسے جست لگائی؟ اس طرف نہ تو آپ کا ذہنی رجحان تھا اور نہ ہی ماضی میں اس تبدیلی کی طرف ہلکا سا اشارہ نظر آتا ہے۔''

''یہ سب تقدیر کے کھیل ہی بھیا۔ میں تو ایک سیدھی سادی گھریلو عورت تھی۔ مجھے تو اپنے شاعرہ ہونے کا گمان بھی نہیں تھا۔ کیا پتا لکھنے والے نے میرا رزق اس جگہ بھی لکھ رکھا ہے۔''

ظفر عباس ہمارے بزرگ دوست اور ترقی پسند شاعر فارغ بخاری کا بڑا بیٹا ہے اور برسوں سے یہیں مقیم ہے۔ سیدھا سادا' محبت

کرنے والا نوجوان۔ شروع میں اس کا ارادہ تھا کہ فارغ سے دوستی کے حوالے سے مجھے کچھ کچھ ''چچا'' کے بطور دیکھے مگر میں نے چھوٹتے ہی اسے احساس دلا دیا کہ میری اور اس کی عمروں میں زیادہ سے زیادہ ایک دو برس کا فرق ہوگا اور وہ بھی پتا نہیں کس طرف ہے اس لیے وہ میری عزت بے شک کرے مگر یہ چچا و چا کا تکلف نہ کرے کیونکہ اس صورت میں مجبوراً مجھے فارغ کو چچا بنانا پڑے گا۔ ظفر عباس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور ابتدائی ملاقات کے بعد اس نے وہ رویہ اپنایا جو صحیح اور اس کی عمر کے عین مطابق تھا۔ اس پر میں نے اسے فارغ صاحب کا ایک دلچسپ مصرعہ سنایا۔ ''اس عمر میں بھی بخاری بڑا شرارتی ہے''

ظفر عباس نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ مصرعہ ''صحیح بخاری'' کا ہے' میرا نہیں۔''

رات کا کھانا پروین کی بچپن کی سہیلی امینہ عرف ''پیچو'' کی بہن کے گھر تھا جو ایک معتک' سادہ شکل اور ملنسار خاتون تھی۔ اس کا میاں الیاس اونچا لمبا خوشنما نوجوان تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے شاعری یا شاعروں سے کوئی خاص واقفیت اور دلچسپی نہیں۔ وہاں عارف صاحب سے ملاقات ہوئی جو میرے اور پروین کے مجوزہ میزبان تھے۔ پروین پیچو سے ملاقات پر اتنی Excited تھی کہ اس ہم نے کو یکسر فراموش کر دیا اور اسی طرح کی احمقانہ باتیں کرنے لگی جیسی خواتین عام طور پر ایسے موقعوں پر کیا کرتی ہیں یعنی کسی بات کا گزشتہ اور آئندہ بات سے تعلق نہیں ہوتا بس ایک رو میں بولے چلی جاتی ہیں' بغیر وجہ کے ہنس پڑتی ہیں' ایک دم کچھ سوچ کر سنجیدہ اور پھر رنجیدہ ہو جاتی ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے کسی اور بھولے بسرے واقعے یا سہیلی کے ذکر کر کے ہنسنے لگ جاتی ہیں۔ پیچو بہت زیادہ امید سے تھی' اس کے لیے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا میاں سعید ایک اچھے اور سعادت مند شوہر کی طرح اس کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس کی وجہ سے الیاس کو چھیڑنے اور پیچو کو اسے گھورنے میں خاصی آسانی پیش آ رہی تھی۔

کھانے اور گپ شپ کے دوران میں کب پروین اور پیچو کا پروگرام بنا اس کا مجھے علم نہیں لیکن پروین کا یہ اعلان کہ وہ عارف صاحب کے گھر کی بجائے پیچو کے ساتھ ٹھہرے گی اس محفل میں ایک بم کی طرح پھٹا۔ ہر شہر کی طرح یہاں بھی منتظمین کے درمیان مقامی سیاست چل رہی تھی۔ بحث و تمحیص کے بعد مہمانوں کو ٹھہرانے' لانے لے جانے اور مشاعرے کے انعقاد کے سلسلے میں تقسیم کار کے مختلف مسائل طے پا چکے تھے۔ نیر جہاں اپنی منضبط طبیعت کے باعث پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی کے حق میں نہیں تھے۔ کم و بیش یہی خیال ظفر عباس کا تھا۔ ہمارے مجوزہ میزبان عارف صاحب بظاہر بالکل نیوٹرل تھے جب کہ پیچو اینڈ کمپنی اپنے یکطرفہ فیصلے کے لیے منتظمین کی رسمی اجازت سے بے نیازی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ماحول میں یکدم Tension پیدا ہو گئی۔ میرا خیال ہے اگر

اس وقت پروین ذرا سمجھداری سے کام لیتی اور اپنی طرف سے تھوڑی سے معذرت اور ندامت کا اظہار کر دیتی تو معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جاتا مگر وہ بھی یوپی کی تھی' سیدھی پیچو فیملی کے گروپ میں جا کھڑی ہوئی اور فیصلہ سنا دیا کہ ہم تو پیچو کے ساتھ جائیں گے۔

میری پوزیشن بہت نازک ہوگئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خواہ مخواہ بدمزگی سے کیسے نکلا جائے۔ عارف صاحب نے بڑے رسمی لہجے میں مجھ سے میرا پروگرام پوچھا۔ میں نے کہا۔ ''پیچو پروین کی سہیلی ہے' میری نہیں۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ یہ دونوں سہیلیاں آج جی بھر کے باتیں کر لیں اور غیبتوں کے شامیانے تان لیں' کل پروین بھی آپ کی طرف آ جائے گی۔''

اپنی طرف سے تو میں نے یہ بات صورت حال کی تلخی ختم کرنے کے لیے کی تھی مگر پروین نے غالباً نیر جہاں کو چڑانے کے لیے کہا۔ ''نہیں بھئی ہماری مرضی' ہم تو پیچو کی طرف ہی رہیں گے۔ مہمانوں کو بھی چوائس کا حق ہونا چاہیے۔''

جملے کا رخ نیر جہاں کی طرف تھا مگر یہ لگا سیدھا عارف صاحب کو' انہوں نے گھڑی دیکھی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ ''میں نے اور میرے بیوی بچوں نے آپ لوگوں کے لیے دو دن لگا کر کمرے تیار کیے تھے' بہر حال آپ کی مرضی!''

نیر جہاں اور ظفر عباس مجھے سمجھانے لگے کہ پروین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے عالی کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا جو ایک مہمان سے انتہائی انہماک کے ساتھ عالمانہ اور اپنے کالموں جیسی اعداد و شمار زدہ گفتگو کر رہے تھے اور انہیں غالباً پتا ہی نہیں تھا کہ وہاں گفتگو کا موضوع اور مزاج کیسا چل رہا ہے۔ بڑے سرسری انداز میں بولے۔ ''بھئی رہیں آپ لوگ جہاں مرضی مگر اس امر کا خیال رکھیں کہ صبح دس بجے ہمیں یونیورسل اسٹوڈیو پہنچنا ہے۔''

اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پیچو کے گھر سے عارف صاحب کا گھر تقریباً ستر میل کے فاصلے پر تھا اور یونیورسل اسٹوڈیو ان کے گھر سے چالیس میل اور پیچو کے گھر سے تقریباً ساٹھ میل تھا' ظفر عباس کا گھر (جس نے ہم لوگوں کو یونیورسل اسٹوڈیو لے کر جانا تھا) ایک اور سمت میں کوئی تیس میل دور تھا۔ فاصلوں اور سمتوں کے اس چکر نے کچھ ایسا پریشان کیا کہ بالآخر نیر جہاں کے گھر کو مقام اتصال ٹھہرانا پڑا جو اتفاق سے ان سب فاصلوں کے تقریباً درمیان میں پڑتا تھا البتہ عارف صاحب کا گھر وہاں سے بھی بہت دور تھا۔ پیچو نے مشورہ دیا کہ آج رات کے لیے (جو اس وقت آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی) میں بھی ان کے ساتھ چلا جاؤں' صبح سعید مجھے اور پروین کو نیر جہاں کے گھر ڈراپ کر دے گا' اسٹوڈیو سے واپسی پر وہ لوگ اسے وہیں سے لے لیں گے' میں اگر چاہوں تو بے شک کل عارف صاحب کی طرف منتقل ہو جاؤں۔

اس ساری بک بک جھک جھک کا نتیجہ یہ نکلا کہ پروین اور نیر جہاں میں ایک ایسی سرد جنگ کا آغاز ہو گیا جو ہماری وہاں سے

روانگی تک مسلسل ترقی پذیر رہی۔ پروین کی ناراضگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کلثوم اعجاز محمدی کو نیر جہاں پر ترجیح دینا شروع کر دی اور میری ہر مصالحتی کوشش کا ایک ہی جواب دیا۔ ''آپ بیچ میں نہ بولیں' امجد بھائی''

عام حالات میں پروین بڑی معقولیت اور سمجھداری کا ثبوت دیتی ہے اور خاص طور پر میری باتیں شدید اختلافات کے باوجود بڑے تحمل سے سن لیا کرتی ہے' میں آج بھی حیران ہوں کہ دو اتنی اچھی اور معقول خواتین کے درمیان یہ تنازعہ کیوں اور کس طرح پیدا ہوا۔ ایسے موقعوں پر مجھے مشہور کرکٹ ہٹن کا ایک تاریخی جملہ بہت یاد آتا ہے' اس نے کہیں لکھا ہے۔

Cricket pitches are like women, always unpredictable.

ہالی کا نام لیتے ہی ذہن فوراً فلم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لاس اینجلس کے مضافات میں واقع یہ شہر فلمی دنیا کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں دنیا کا (غالباً) مہنگا ترین رہائشی علاقہ بیورلے ہلز بھی واقع ہے جو امریکہ جیسے امیر ملک میں بھی اسٹیٹس سمبل ہے۔ کسی بھی فلم سٹار کی کامیابی اور مالی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس بیورلے ہلز میں ذاتی مکان ہے یا نہیں! گلیمر' فیشن اور حسن کے اس گہوارے میں یوں تو کئی اسٹوڈیوز ہیں مگر یونیورسل اسٹوڈیو کو اپنی قدامت' وسعت' وسائل اور تخلیقات کی وجہ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اسٹوڈیو اتنا بڑا ہے کہ اس کے اندر ازمنہ قدیم کی وحشی بستیوں سے لے کر خلائی شہروں تک کے سیٹ لگائے جا سکتے ہیں۔ یہاں کاؤبوائے' ریڈ انڈین اور Wild West سے متعلق اس قدر فلمیں تیار ہوئی ہیں کہ سترہویں اٹھارہویں صدی کے پورے پورے شہروں کے مختلف سیٹ یہاں مستقل طور پر لگا دیے گئے ہیں۔ یعنی ایکٹر اور کیمرہ لے آئیے' دو سو سال قبل کا پورا ماحول اپنی ممکنہ جزئیات سمیت آپ کی شوٹنگ کے لیے حاضر ہے۔

امریکہ والوں کا ایک کمال یہ ہے کہ انہیں چیزیں بیچنے کا فن آتا ہے۔ لاس اینجلس آنے والے سیاحوں کے لیے یونیورسل اسٹوڈیو کی یاترا ایک اہم فریضے کی حیثیت رکھتی ہے سو انہوں نے اس یاترا کو سیاحوں کے لیے دلچسپ اور اپنے لیے مفید بنانے کا باضابطہ انتظام کر دیا ہے۔ چودہ عدد امریکی ڈالر خرچ کیجئے اور اسٹوڈیو والوں کے مہمان بن جائیے جو آپ کو Guided Tour کے ذریعے اسٹوڈیو کے تمام اہم حصوں اور قابل ذکر مقامات کی Audio Visual سیر کروا دیتے ہیں۔

خوبصورت لمبی لمبی ائیر کنڈیشنڈ بسیں آپ کو ایسی جگہ لے جا کر اتارتی ہیں جہاں ایک گائیڈ مائکروفون کے ذریعے اسٹوڈیو کے بارے میں آپ کو بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے۔ آپ کی مخصوص بس اور سیٹ کے بارے میں ہدایات دیتا ہے۔ سیر کے مختلف مراحل سے آگاہ کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چٹکلے چھوڑتا ہے۔ ماضی کی مشہور فلموں اور اداکاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا

ہے کہ کس کا ڈریسنگ روم کہاں واقع ہے یا تھا۔ مختلف بین الاقوامی شہرت کی حامل فلموں میں استعمال ہونے والا خصوصی سامان (Props) کہاں کہاں رکھا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

عمومی بریفنگ کے بعد اس گائیڈ نے ہمیں ایک دوسرے گائیڈ کے حوالے کیا جو ایک سیاہ فام' پھرتیلا اور مسخرہ نوجوان تھا۔ اس کے لطیفے سن کر مجھے اپنا دلدار پرویز بھٹی بہت یاد آیا۔ مجھے یقین ہے اگر یونیورسل اسٹوڈیو کے منتظمین ایک بار بھٹی کو بولتے ہوئے سن لیں تو اس گائیڈ غریب کی نوکری پر کاری ضرب لگ سکتی ہے۔ افریقی مسخرے کے ذکر پر مجھے بھٹی کا ایک بہت زندہ اور پھڑکتا ہوا جملہ یاد آ رہا ہے۔ پنجاب میں اکثر کشمیری ''بٹ'' کہلاتے ہیں اور اپنے سرخ وسفید رنگ کی وجہ سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ایک بار کسی شخص نے دلدار بھٹی کے سانولے رنگ جملہ کسا تو اس نے بڑی بے ساختگی سے کہا۔ ''تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں اگر میں سوڈان میں ہوتا تو لوگ مجھے بٹ صاحب کہہ کر بلاتے۔''

ہم ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہوئے جہاں بیٹھنے کے لیے لمبے لمبے ڈیسک نما تختے بچھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا یہاں چند برس پہلے تک مشہور تاریخی فلموں Ben Hur اور Ten Commandments کے کچھ مشہور سینوں کی پکچرائزیشن کی اصلیت دکھائی جاتی تھی' اب زمانہ بدل گیا ہے اس لیے ان کی جگہ Star Wars نے لے لی ہے۔ مشہور امریکی اداکار Robert Wagner ایک پہلے سے ریکارڈ کی ہوئی وڈیو فلم کے ذریعے سامعین سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے جیسے وہ براہ راست ان سے بات چیت کر رہا ہے۔ اس نے سٹار وارز میں استعمال ہونے والے مختلف کیمرہ ٹرکس' سامان اور اسپیشل افیکٹس پر روشنی ڈالی اور اس کے ساتھ ساتھ ان مناظر کی فلمی صورت اور اصل حقیقت ایک فلم کے ذریعے دکھائی گئی۔ اس سارے کاروبار کی حسن کاری' کاریگری اور حیرت انگیزیاں اپنی جگہ لیکن تمام عرصہ یہ خوفناک خیال میرے ذہن میں سانپ کی طرح سرسراتا رہا کہ انسان کس قدر تیزی سے اپنی جگہ بے حس مشینوں کے لیے خالی کرتا جا رہا ہے۔

اس گائیڈ ٹور کے دوران اسٹوڈیو والے ناظرین کی تفریح طبع کے لیے چار لائیو شو بھی پیش کرتے ہیں۔ پہلے شو کا نام A Team تھا اور اس میں موٹر سائیکلوں اور ڈرائیونگ کے مختلف سٹنٹ دکھائے گئے تھے جن میں سے بعض واقعی بے حد خطرناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے تھے۔ اصلی و میکلز' اصلی بندے اور نقلی اسلحے پر مبنی پندرہ بیس منٹ کا یہ شو ایک وسیع میدان میں پیش کیا گیا۔ وہ دن خلاف معمول خاصا سرد تھا اور تیز ہوا میں کھلے میں بیٹھنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود جب شو کے آخر میں حصہ لینے والے فنکار الوداعی سلام کے لیے ناظرین کے سامنے آئے تو ان کے چہرے اور لباس پسینے سے تربتر ہو رہے تھے۔ اقبال نے کیا

خوب کہا تھا۔ ''ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات''

دوسرا شو ایک مشہور فلم کونان دی باربیرین کے ایک سین پر مشتمل تھا جس میں ماقبل تہذیب کی انسانی زندگی کا منظر پیش کیا گیا تھا۔

اس شو پر پروین کا ریمارک بڑے مزیدار تھا' بولی ''یہ غالباً اس لیے دکھایا گیا ہے کہ یہاں بری فلمیں کس طرح بنائی جاتی ہیں۔''

تیسرا شو سدھائے ہوئے جانوروں اور ان کے مختلف کرتبوں پر مبنی تھا۔ میں نے عالی سے کہا۔ ''اس شو کا نام تو تیسری دنیا ہونا چاہیے۔ وہاں بھی تو سدھائے ہوئے جانور ہی کرتب دکھاتے رہتے ہیں۔''

''ہاں....... لیکن انسان ذرا مشکل جانور ہے۔'' عالی نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

اتنے میں ایک کتا اسٹیج پر آیا۔ کرتب دکھانے والی لڑکی نے اپنے دونوں بازو پھیلائے' کتا اس سے بغل گیر ہوا اور دونوں برسر عام بوس و کنار کرنے لگے۔ پروین نے منہ دوسری طرف پھیر لیا' حاضرین نے خوش ہو کر بھرپور تالیوں کی مدد سے ان دونوں ''محبت کرنے والوں'' کو داد دی۔ ہم سے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک ''لوکل'' نے زور سے ہنس کر کتے کو ایک رقیبانہ انداز کی گالی دی۔ ایک دم بلھے شاہ کی مشہور کافی میرے کانوں میں گونج سی گئی۔

اٹھ بلھیا' اٹھ کے یار منا لے

نہیں تاں بازی لے گئے کتے' تیں تھے اتے

(بلھے شاہ! اٹھ اور اٹھ کے اپنے یار کو راضی کر ورنہ کتے بازی لے جائیں گے اور تجھ سے بلند تر رتبے پر فائز ہوں گے)

بعض اوقات علامت جب ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آتی ہے تو کتنی گھناؤنی اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔

چوتھا اور آخری شو بھی مختلف قسم کے سٹنٹوں پر مبنی تھا البتہ یہاں زیادہ زور ایکشن کے سینوں میں استعمال ہونے والے کرتبوں پر تھا۔ چاقو زنی' دست بدست لڑائی' عمارتوں سے گرنا اور ان پر چڑھنا' گولی چلانا اور کھانا' جسم میں تیر یا نیزہ پیوست کرنا' کسی کو زندہ زمین میں دفن کرنا یا کسی مشن کے ذریعے سے کچل دینا اور اسی نوع کے دیگر ایکشن دکھائے گئے مگر ان سب سے زیادہ دلچسپ ایک نقلی چارلی چپلن تھا جو مختلف مزاحیہ حرکتوں کے ذریعے لوگوں کو ہنسا رہا تھا اور لطف کی بات یہ ہے جس آدمی کے ساتھ وہ کوئی شرارت کرتا بعض اوقات اسے آخر تک پتا نہیں چلتا تھا کہ لوگوں کے قہقہوں کا ہدف اس کی اپنی ذات ہے۔

سردی اور تیز ہوا کے باعث عالی نے اس آخری شو کے بارے میں باحسرت و یاس اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور اسٹوڈیو کے کاؤنٹر کے سامنے واقع ایک کیفے میں ملنے کا کہہ کر ہم سے رخصت ہو لیے۔ اس وقت تو ہم نے ان کے اس اقدام کو غیر کھلاڑیانہ قرار دے کر

ان پر بہت جملے بازی کی مگر اب جو سردی نے ہڈیوں کا مزاج پوچھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ تجربہ (چاہے عالی جی کا ہی کیوں نہ ہو) بڑی چیز ہوتا ہے۔

ہم نے کیفے میں داخل ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی' مرد وزن کا ایک ہجوم آتش سیال سے فیض یاب ہو رہا تھا۔ عالی ایک دور دراز کونے میں کافی کا مگ سامنے رکھے مزید سامنے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ کچھ دیر انہیں ہمارے آنے کا پتہ نہیں چلا۔ میں نے عالی کی نظروں کا تعاقب کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کی وہ خود فراموشی کچھ اتنی بے محل بھی نہیں تھی۔ عالی نے اطلاع دی کہ کافی اگرچہ اچھی نہیں مگر اس سردی میں یہ واحد جائز مشروب ہے اس لیے اسی سے گزارہ کرو۔ ہم نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور کافی کی جتنی برائی انہوں نے کی تھی اسے اس سے کچھ زیادہ ہی پایا۔ میں نے ایک گھونٹ لیا اور کہا۔ ''پنجابی میں مجبوری کے عالم میں کسی چیز کے برداشت کرنے کو ''گوڑا گھٹ'' (کڑوا گھونٹ) کرنا کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ تسمیہ اسی طرح کی کوئی کافی رہی ہوگی۔''

جب سے ہم نے لاس اینجلس میں قدم رکھا تھا مختلف حوالوں سے کوئی چار بار سٹار واک کا نام سن چکے تھے۔ سعید نے کہا۔ ''لاس اینجلس میں ڈزنی لینڈ اور یونیورسل اسٹوڈیو کے علاوہ تیسری قابل دید چیز سٹار واک ہے۔ آپ چونکہ ڈرامے اور فلم وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا آپ کے لیے تو اس نہ دیکھنا گناہ کبیرہ ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''اے عزیز باتمیز' اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کرو۔''

بولا۔ ''یہ سننے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''تو پھر چلو۔''

سعید نے ایک جگہ موٹر روکی' جتنی دیر میں کار پارک ہوئی اس سے چار گنا وقت پیچو کو اس میں سے نکلنے میں لگا۔ عورتوں کے آدھے گناہ تو صرف حمل کے دورانیے اور وضع حمل کی تکلیف کے باعث معاف ہو جانے چاہئیں۔ ماں بننے کی خوشی' راحت اور درجہ اپنا جگہ مگر ایسے عالم میں کسی عورت کو دیکھ کر ہمیشہ مجھے اس بیچاری پر انتہائی ترس آتا ہے۔ کیسی کیسی پھولوں میں تلنے والی عورت ڈینو سار کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

Star Walk اصل میں ایک فٹ پاتھ کا نام ہے جو پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے بنایا گیا ہے۔ ہر سل یا سلیب کے درمیان ایک ستارہ ہے جس کے اندر شو بزنس کی کسی بہت اہم شخصیت کا نام کندہ ہوتا ہے۔ آسمان شہرت کی بلندی کو چھونے والی امریکی فنون لطیفہ کی چیدہ چیدہ نامور ہستیاں یہاں سے گزرنے والوں کے پیروں میں ہوتی ہیں۔ عزت اور مقام دینے کا یہ انوکھا طریقہ غالباً

امریکی ذہن ہی ایجاد کرسکتا تھا۔ سعید نے بتایا کہ اس سٹار واک کا تازہ ترین ستارہ مشہور پاپ سنگر مائیکل جیکسن ہے جس کا نام ابھی حال ہی میں ایک خالی ستارے میں لکھا گیا ہے۔ ہم مختلف ناموں کو پڑھتے اور اپنی معلومات عامہ کا امتحان لیتے ہوئے ایک سینما ہال تک پہنچے جہاں سے یہ واک شروع یا ختم ہوتی تھی۔ یہ ایک قدیم سینما گھر تھا جس کے صحن میں فلمی دنیا کے مشہور ستاروں کے ہاتھوں اور پاؤں کے نشانات اور دستخط گیلے گارے میں اس طرح لیے گئے تھے کہ سیمنٹ وغیرہ سوکھنے کے بعد ان کے نقش ہمیشہ کے لیے پتھروں میں محفوظ ہو گئے تھے۔ میں نے وہاں رک کر دور تک جاتی ہوئی سٹار واک کو دیکھا اور پروین سے کہا۔ ”بھئ مصطفی زیدی کے ایک بہت مشہور شعر کے معنی یہاں آ کر بدل گئے ہیں۔“

بولی ”وہ کیسے؟“

”اس کا شعر ہے نا!

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اب دیکھو یہ ایسا عجیب وغریب راستہ ہے کہ کہ آدمی آتا تو پتھروں پہ چل کر ہی ہے مگر دیکھو تو یہ پتھر کسی کہکشاں سے کم بھی نہیں ہیں۔“

سینما کے صحن کے دائیں جانب ایک کونے میں لکڑی کے ایک پرانے سے اسٹینڈ پر بہت سی تصویریں لگی تھیں۔ میں نے سوچا شاید یہاں بھی ہمارے یہاں کے سینما گھروں کی طرح فلموں کے فوٹو سیٹ لگانے کا رواج ہو مگر قریب جا کر دیکھا تو ایک خوشگوار حیرت ہماری منتظر تھی۔ ابتدا سے لے کر اب تک کے تمام آسکر انعام یافتگان (بہترین ایکٹر اور ایکٹرس) کی تصویریں ترتیب کے ساتھ وہاں چسپاں تھیں اور نیچے درج تھا کہ متعلقہ فنکار کو یہ انعام کس سال اور کس فلم پر ملا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز کیتھرین ہپبرن کی دو تصویریں تھیں جسے ۱۹۳۲ء میں پہلا اور ۱۹۶۷ء میں دوسرا آسکر ایوارڈ ملا تھا۔ اس سے آپ اس بے مثال فنکارہ کے درمیانی پینتیس برسوں کے کارناموں کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

سعید نے مشورہ دیا کہ کھانا چینی اسلامی ریستوران میں کھایا جائے۔ چین میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تو ہمیں پتا تھا مگر لاس اینجلس میں اس نوع اور نام کا کوئی ہوٹل بھی ہوگا' یہ بات ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھی چنانچہ ہم نے اس عجوبے کو دیکھنے کے لیے فوراً ہاں کردی۔ راستے میں ایک جگہ سعید نے گاڑی روک کر بتایا کہ یہ عمارت یہاں کا اسلامک سنٹر ہے اور یہاں ہر جمعہ کو

مشہور باکسر محمد علی کلے اپنے بچوں کے ساتھ نماز پڑھنے آتا ہے۔ اکبر نے برسوں پہلے کہا تھا۔

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

لاس اینجلس کے اسلامی سنٹر کے دروازے پر کھڑے ہو کر چند منٹ دنیا کو دیکھیے تو ایک ٹکٹ میں دونوں مزے مل جاتے ہیں۔

اسلامی چینی ریستوران عالم اسلام کی زبوں حالی اور چینیوں کی تاریخی جدوجہد کا منہ بولتا نمونہ تھا۔ ایک ویٹرس نما مالکہ سر سے پاؤں تک "عربی حور" کے لباس میں ملفوف سروس کر رہی تھی اور اس کا میاں (غالباً) ایک نامکمل الماری کے کچھ تختے جوڑنے یا شاید توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سات آٹھ میزوں میں سے صرف دو پر گاہک موجود تھے جو ہمیں دیکھتے ہی یوں رخصت ہوئے جیسے کچھ ادھار وغیرہ کا معاملہ ہو۔

دنیا کے پانچ چھ ملکوں میں (لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں چین شامل نہیں) چینی کھانا' کھانے کا موقع ملا ہے مگر یہ اسلامی چینی ریستوران پہلا اور اب تک آخری جگہ ہے جہاں میدے کی پوری نما روٹی بھی موجود تھی اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہی روٹی اس کھانے کا بہترین حصہ تھی۔ چائنہ ٹاؤنز کے بعد اب چینی کھانے بھی مغرب کے شہروں کا لازمی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ جوابی کارروائی کے طور پر اب امریکہ نے چین میں جین اور کوکا کولا بھیجا تو ہے مگر دیکھیے ماؤ اور چو این لائی کا چین اسے کس طرح قبول کرتا ہے!

اگلا دن ڈزنی لینڈ کے نام تھا۔ عالی نے بتایا کہ میامی کے قریب اس کا ایک ماڈرن روپ بنایا گیا ہے جو سائنسی عجوبوں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے مگر اصلی ڈزنی لینڈ کا اب بھی کوئی جواب نہیں' ہر عمر کے "بچوں" کی تفریح کے لیے اس سے بہتر جگہ دنیا میں اور کہیں نہیں۔

ایک تو میرا جغرافیہ ویسے ہی کمزور ہے اس پر امریکہ کے شہروں کے فاصلے اور پھر شہروں کے اندر کے فاصلے ایسے ہیں کہ کہ ابن بطوطہ کو بھی پریشان کر دیں' سو حرام ہے جو مجھے پتا چلا ہو کہ ہم کدھر سے گزر کر کہاں جا رہے ہیں اور یہ کہ کل اسی طرح کے پل اور سڑک پر سے گزر کر پوائنٹ A آیا تھا تو آج اس کے بالکل مخالف سمت واقع پوائنٹ B کیسے آ گیا ہے۔ چنانچہ میرے اندازے کے حساب سے ڈزنی لینڈ بالکل اسی طرح جیسے کولمبس نے ہندوستان کا راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے امریکہ دریافت کر لیا تھا اور شاید اسی لیے یہاں کے لوکلز کو ریڈ انڈین کہتے ہیں؟

طے یہ پایا کہ مشہور مزاح نگار مرحوم سید محمد جعفری کے صاحبزادے احمد جعفری شام بجے ہمیں ڈزنی لینڈ کے مرکزی گیٹ سے

وصول پالیں گے۔ چنانچہ اس وقت کے لیے ہم ہیں اور ڈزنی لینڈ کی حیرانیاں۔

ڈزنی لینڈ نسل آدم کا ایک اجتماعی خواب ہے جسے والٹ ڈزنی نے تعبیر کا خاکہ دیا اور امریکی قوم نے اس خاکے میں وہ بے شمار رنگ بھرے جنہیں گنتے گنتے دیکھنے والوں کی آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر ایک ریلوے اسٹیشن بنایا گیا ہے۔ یہاں سے ایک ٹرین ہر بیس منٹ کے بعد آپ کو پورے ڈزنی لینڈ کا چکر لگوانے کے لیے روانہ ہوتی ہے۔ اپنے اس سفر کے دوران یہ ٹرین آپ کو دنیا کے مختلف علاقوں کے فطری مناظر دکھاتی ہوئی چار اسٹیشنوں پر رکتی ہے جو دراصل ڈزنی لینڈ کے چار مختلف حصے ہیں اور ہر حصہ اپنے نام کی مطابقت سے آپ کو ایک نئی دنیا میں لے جاتا ہے۔

پہلا اسٹیشن Frontier Land' دوسرا Fantasy Land' تیسرا Tomorrow Land

اور چوتھا Adventure Land-

اگر آپ پیدل چلتے چلتے تھک جائیں تو اپنے متعلقہ لینڈ کے اسٹیشن سے ٹرین پکڑ سکتے ہیں جو وہاں سے ہر بیس منٹ کے بعد گزرتی ہے۔ ہم نے بھی سب سے پہلے ٹرین سے ڈزنی لینڈ کا ایک چکر لگایا اور یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتے رہے کہ اس جگہ کو صحیح طرح سے دیکھنے کے لیے تو کم از کم ایک ہفتہ درکار ہے' چند گھنٹوں میں تو ہم اس کی بس کچھ جھلکیاں ہی دیکھ پائیں گے۔

پنجاب آرٹ کونسل کی ڈپٹی ڈائریکٹری کے دنوں میں میرا دفتر شاہراہ قائداعظم پر واقع فری میسن بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا۔ اس عمارت سے بہت سی پراسرار روایات منسلک تھیں جن کے بارے میں اکثر لوگ سوال کیا کرتے تھے۔ میرا کمرہ اس عمارت کے تہہ خانے میں تھا جس سے ملحقہ عمارت کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ایک سرنگ نما برآمدے کو ہم نے آرٹ گیلری میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک بار وہاں صادقین کی تصویروں کی نمائش جاری تھی۔ میرے ساتھ کچھ دوست صادقین کے مشہور کیکٹس' مڑے تڑے انسانی اعضاء اور انسانی جسموں میں گھونسلا کئے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہے تھے۔ شمیم اختر' جو ان دنوں گوجر خاں میں اسسٹنٹ کمشنر تھا اور چھٹی پر آیا تھا' اچانک بولا ''لو بھئی فری میسن کے بھوتوں کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔''

ہم نے پوچھا۔ ''وہ کیسے......؟''

''بھوت یہاں تھے ضرور مگر یہ تصویریں دیکھ کر فرار ہو گئے ہیں کہ کہیں خواہ مخواہ ان کا نام نہ لگ جائے۔''

ڈزنی لینڈ کے Haunted Mansion کے دروازے پر پتا نہیں کیوں مجھے یہ واقعہ یکدم یاد آ گیا اور میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ پروین نے ایک نظر اس ''بھوت بنگلے'' کے بورڈ کو اور پھر میری طرف دیکھا اور بڑی شرارت آمیز سنجیدگی سے بولی۔ ''آگے چلئے

عالی جی! ان پر تو ابھی سے جنات کا اثر شروع ہو گیا ہے۔"

"یہ آسیب زدہ گھر انسان کے فطری' تاریخی اور بین الاقوامی واہموں کا ایک عکس در آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ جنوں' بھوتوں' طلسمی اور مافوق الفطرت طاقتوں اور خون منجمد کر دینے والی دہشت کی رفاقت میں کہنے کو تو آپ صرف دس منٹ گزارتے ہیں یا شاید اس سے بھی کم مگر باہر نکلتے وقت بڑے بڑوں کے چہرے فق' آنکھیں مضطرب اور سانس ناہموار ہو جاتے ہیں۔ بنانے والوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انسانی فطرت کے بعض مخصوص پہلوؤں کا بہت اچھا مطالعہ کر رکھا ہے۔ تاریخی' خنکی' صوتی اور بصری تاثرات' بھیانک تصویریں' آواز اور سناٹے کی آمیزش میں جب آپ سرکس میں چلنے والے پنگھوڑوں سے ملتے جلتے کیبنوں میں بیٹھتے ہیں اور اندھیرے میں یہ "پنگھوڑا ٹرین" اونچی نیچی شور مچاتی ہوئی گزرتی ہے تو ایک بار تو سچ مچ نانی یاد آ جاتی ہے۔ مسرت' تجسس اور حیرت بھری آوازیں خوف کی سسکیوں اور چیخوں میں بدلنا شروع ہو جاتی ہیں اور خجالت آمیز ہنسی کے ننھے ننھے فوارے بار بار پھوٹتے ہیں۔

بچپن میں سکول جاتے وقت موچی دروازے کی گھاٹی کے ساتھ دائیں ہاتھ پیکو آرٹ پریس کا ایک بورڈ ہم سب بچوں کے لیے حیرت' لطف اور تفریح کا ایک مستقل ذریعہ ہوتا تھا۔ اس بورڈ کو مختلف رنگ دار سلاخوں سے بنایا گیا تھا کہ آپ دیکھتے جاتے ہیں اور رنگ بدلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بورڈ ختم ہونے پر انگریزی کی جگہ اچانک اردو الفاظ آ جاتے تھے۔ ڈزنی لینڈ کے اس بھوت بنگلے میں بھی ایک ایسا ہی کرتب رکھا گیا ہے۔ ہماری سیٹوں کے بائیں جانب دیوار تھی اور دائیں جانب نشیب میں ایک وکٹورین انداز کا اونچے دروازوں والا کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک بڑی ڈائننگ ٹیبل اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک دم اس کمرے میں کولونیل انگریزوں کے سے لباس میں ملبوس چند لوگ نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں' چھری' کانٹوں' پلیٹوں اور گلاسوں کی آوازیں آتی ہیں' پیانو بجتا ہے لیکن ایک چھوٹا سا موڑ کاٹ کر جب آپ دوبارہ دیکھتے ہیں تو نہ وہاں کمرہ ہوتا ہے نہ میز کرسیاں اور نہ آدمی۔

میں غالباً پروین کو موچی دروازے کے پریس والے بورڈ کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ایک دم ایک کونے سے قدیم رومن انداز کا ایک گلیڈی ایٹر ہم پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا کلہاڑا تھا۔ سائیں کی آواز کے ساتھ وہ کلہاڑا ہمارے پاس سے یوں گزرا کہ ایک لمحے کے لیے سچ مچ موت نظر آ گئی۔ چاروں طرف سے ابھرتی ہوئی خوفزدہ چیخوں اور شرمندہ ہنسیوں کے شور میں ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دلوں میں اس کرتب پر لعنت بھیجنے کے بعد منہ سے تعریفیں کرنے لگے۔

U-Boat اور Mono Rail کے ذریعے پانی اور خشکی کی سیر کی۔ ایٹم کے اندر Inner Earth کا مشاہدہ کیا اور غالب کے حوالے سے اس کو یاد کیا جو واماندگی شوق کی ہر سرحد پر کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

مگر ڈزنی لینڈ کی جس چیز نے ہمیں لوٹ لیا وہ دنیا بھر کے بچوں کا ایک گیت ہے۔ جس کے بول اور ساز بدلتے رہتے ہیں مگر ایک ہی جذبہ اور دھن خون کی طرح بدن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت اور خودکار کشتیوں کے ذریعے سطح زمین سے نیچے ہم نے ایک ایسی دنیا کی سیر کی جس میں نوع انسانی کے سارے خوبصورت خواب' گیت' افکار اور رنگ ایک چھوٹی سی دنیا میں جمع ہو گئے تھے۔ اس جادو نگری کا نام بھی It's a small World تھا۔ کشتی کے راستے کے دونوں طرف مختلف روشنیوں کے ذریعے دنیا کے مختلف ممالک کے بچے اپنے ثقافتی رنگ روپ سمیت اپنی خوبصورت اور روح میں اتر جانے والی آوازوں کے ساتھ مل جل کر اس چھوٹی سی خوبصورت دنیا کو سجانے اور بچانے کا گیت گا رہے تھے۔ یہ بچے بے جان پتلیاں تھے اور گیت پہلے سے ریکارڈ شدہ تھے جسے مختلف سپیکرز کے ذریعے چاروں طرف پھیلا دیا گیا تھا مگر سارا منظر کچھ اتنا حقیقی اور پر اثر تھا کہ ہم تینوں مبہوت سے ہو گئے۔ چند منٹ کے سفر کے بعد ہماری کشتی عمارت کا چکر مکمل کر کے دوبارہ روشنی میں اسی مقام پر آ گئی جہاں سے ہم اس میں سوار ہوئے تھے پر پتا نہیں کس جذبے کے تحت ہم تینوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر روانگی کے پلیٹ فارم پر گئے اور ایک کشتی میں بیٹھ کر دوبارہ اسی روح پرور سفر پر روانہ ہو گئے۔

میرے نزدیک اس سارے منصوبے کے سوچنے والے' بنانے والے' گیت لکھنے والا' کمپوز رپٹ اور سیٹ بنانے والے' آڈیو اور روشنی کا اہتمام کرنے والے' غرضیکہ سبھی لوگ اس قابل ہیں کہ انہیں اس ایک نیکی کی وجہ سے سیدھا جنت میں بھیج دیا جائے اور مجھے یقین ہے کہ خدا کا جو تصور میرے دل و دماغ میں ہے وہ سچ نکلا تو نیکیوں کا معیار سجدے نہیں بلکہ اسی نوع کے زندگی آموز کام ہوں گے۔

عالی کی عینک کے شیشے بھیگنے کی وجہ سے دھندلے ہو رہے تھے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ اس کا سبب پانی کے وہ آوارہ چھینٹے ہیں جو کبھی کبھی اچھل کر کشتی کے اندر آ جاتے ہیں مگر جب ہم دوسرا چکر مکمل کر کے باہر نکلے تو ان کی آنکھوں اور ہمارے دلوں کی طرح ان کی آواز بھی بھیگ چکی تھی۔ انہوں نے ایک اداس اور حسرت بھری نظر It's small World کی اس عبارت پر ڈالی جو اس عمارت کی پیشانی پر دمک رہی تھی اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے رقت بھرے لہجے میں بولے۔ ''ہم سے تو اپنی عمروں میں کچھ نہ ہو سکا' خدا کرے ہمارے بچے ہی اس گیت کو سچ کر دکھائیں۔''

اس چھوٹی سی دنیا سے ہم حقیقت کی دنیا میں واپس آئے تو فاصلوں کا احساس ایک دم بڑھ سا گیا۔ شام ہو رہی تھی' احمد جعفری آنے والا تھا' مرکزی دروازہ خاصا دور تھا اور سڑکوں پر کرسمس کی تیاریوں کے سلسلے میں مصنوعی درختوں پر آویزاں روشنیاں جلنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہم نے جلدی جلدی جزائر غرب الہند (جنھیں ہم صرف ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیم کے حوالے سے جانتے ہیں ۹ کے بحری قزاقوں' مدفون سمندری خزانوں اور دہشت بھری دنیا پر ایک نظر ڈالی جسے The World of Carribbean کا نام دیا گیا تھا۔

پیٹر پین اور مکی ماؤس سے ملاقات کی' پروین نے اس کے ساتھ تصویریں بنوائیں' It's a Small World کے لانگ پلے ریکارڈ اور ڈزنی لینڈ کے سوونیئر خریدے۔ عالی جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے۔ وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ نواسے کے لیے Abcort کے نشانی والی ٹی شرٹ نہیں مل رہی۔ میں نے عرض کیا۔ ''قبلہ گاہی' پھیلتی جا رہی ہے شام کی سیاہی' اگر آپ مناسب خیال فرماویں اور دل پر گرد ملال نہ لاویں تو اس بنیان نشان زدہ کی بجائے کوئی اور شے دلپذیر خرید فرمالیں کہ دکان کے لیے آپ کی لائی ہوئی ہر چیز تحفہ بے مثال ہو گی۔''

میر امن اور رتن ناتھ سرشار کی ملی جلی اردو ہماری Continuity بن چکی تھی اور ہم اکثر خاصی خاصی دیر تک اس پیرائے میں باتیں کیا کرتے تھے چنانچہ عالی نے جوابی تقریر کچھ یوں شروع کی۔

''تس پر اس مرد دل گیر نے ایک آہ سرد دل پر درد سے کھینچی' ایک نظر فلک کج رفتار پر ڈالی اور پھر دیار فرنگ کے بارے میں کچھ حقائق خفیہ و پوشیدہ سے بصد احتیاط پردہ اٹھایا۔''

اسی طرح کی باتیں کرتے اور ایک بہت بڑے کرسمس ٹری کے گرد جمع ہجوم میں سے رستہ بناتے ہم جب باہر کے گیٹ پر پہنچے تو وقت مقررہ سے پندرہ منٹ لیٹ ہو چکے تھے مگر احمد جعفری کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ شبہ ہوا کہیں وہ ہمارا انتظار کر کے چلا نہ گیا ہو مگر عالی جی نے کہا کہ سید محمد جعفری کا بیٹا اتنا غبی نہیں ہو سکتا۔

ہم تینوں اپنے لباس کی وجہ سے اس مجمعے میں الگ پہچانے جا رہے تھے چنانچہ فیصلہ ہوا ایک روشن اور قدرے بلند جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ ڈھونڈنے والے کو دقت نہ ہو۔ ابھی اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے پر بحث ہو رہی تھی کہ احمد پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ پچاس میل کا سفر طے کر کے آیا ہے اور یہاں سے عارف صاحب کا گھر تقریباً ستر میل کے فاصلے پر ہے جہاں لوگ کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے تھکے ہوئے وجود کو آرام دہ کار کی سیٹ پر گراتے ہوئے پوچھا۔ ''یار' آپ لوگوں کی طبیعت ان

فاصلوں سے گھبراتی نہیں ہے؟''

احمد نے اپنی خوبصورت مونچھوں کے نیچے سے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بڑے فلفسیانہ لہجے میں بولا۔ ''جس رزق کی تلاش گھر سے بارہ ہزار میل دور لے آئی ہے اسے یہ سو پچاس میل کیا کہہ سکتے ہیں؟''

عارف صاحب کا کھانا اور میرے لطیفے ختم ہوگئے تو مہمان اپنے اپنے ''مہمانوں'' کے ساتھ رخصت ہونا شروع ہوگئے۔ میرا قیام آج عارف صاحب کی طرف تھا اور ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ پروین کی بیچوزدگی اور نیر جہاں اینڈ کمپنی کی خاموش خفگی کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ عارف صاحب بڑے نفیس' کم گو اور معقول انسان تھے چنانچہ انہوں نے اس سارے واقعے کو ایک مہذب آدمی کی طرح بالکل فراموش کر دیا اور اپنے کسی قول یا فعل سے محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کے دل میں کسی قسم کا بھی کوئی ملال ہے۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا محکمہ موسمیات والوں نے شام کو تیز بارش کی پیش گوئی کی ہے اور منتظمین مشاعرہ اس صورت حال سے خاصے پریشان ہو رہے ہیں۔ میں نے یونہی حوصلہ دینے کی خاطر کہہ دیا کہ محکمہ موسمیات کی پیش گوئی غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اس پر عارف صاحب کے بچوں نے بہت برا مانا اور مجھے بتایا کہ یہ امریکہ ہے' یہاں موسمیات والے اتنی واضح اور تفصیلی پیش گوئی کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کسی گزرے ہوئے واقعے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔

آج کا دن مکمل طور پر فارغ تھا کیونکہ تمام میزبان مشاعرے کے مختلف انتظامات میں مصروف تھے۔ میں نے بھی کئی دن بعد ملنے والے اس وقفہ آرام کو غنیمت جانا اور ناشتے کو دوپہر بارہ بجے تک ٹالتا رہا۔ وی سی آر پر ۱۹۸۲ء میں بمبئی میں ہونے والے ایک میوزک پروگرام کی فلم چل رہی تھی' نام تھا.....

Mortal People, Immortal Songs

فانی لوگوں کے ان غیر فانی گیتوں کے پروگرام کی کمپیئر بھارتی فلم سٹار کیفی اعظمی کی بیٹی اور جاں نثار اختر کی بہو' شبانہ اعظمی کر رہی تھی۔ شبانہ ہمارے ماڈرن اور ترقی پسند حلقوں میں بڑی ان جا رہی ہے۔ کچھ لوگ اس کی وجہ اس کی اداکاری بتاتے ہیں اور کچھ بے باکی۔ عزیز عطاء الحق قاسمی کا خیال ہے کہ لوگ شبانہ کو اس کی عمدہ اداکاری کی وجہ سے پسند کرتے ہوں گے کیونکہ بے باکی کے لیے تو اس کے پاس گنجائش ہی نہیں ہے۔

پروگرام تو کوئی خاص نہیں تھا مگر اس کی وساطت سے کئی بھولے بسرے چہروں اور نہ بھولنے والے گیتوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ شروع

میں لتا نے ایک بھجن گایا۔ اس کے بعد ہیمنت کمار، راج کماری، سریندر، جی اے درانی، طلعت محمود، انور، نتن، مکیش، اوشا منگیشکر اور کچھ نوجوان گلوکاروں نے اپنے اور دوسروں کے گیت سنائے مگر سب سے زیادہ رنگ اپنی ملکہ ترنم نور جہاں نے ہی جمایا جس نے تین گانے گائے اور کچھ اس طرح سے گائے کہ ہر تان پہ شعلہ سالپک جاتا تھا۔ نور جہاں اس دن مجھے بالکل اسی طرح اچھی لگی جیسے بھارتی سے ہاکی یا کرکٹ کا میچ جیتنے کے بعد کھلاڑی اچھے لگتے ہیں۔ میرے خیال میں اتنا تھوڑا سا تعصب رکھنے میں کوئی خاص حرج نہیں ہوتا۔

مشاعرہ گاہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دیواروں پر چاروں طرف دیوی دیوتاؤں کے بت اور تصویریں لگی ہیں۔ ہم نے یکے از منتظمین سے پوچھا۔ ''یہ تو لگتا ہے جیسے ہندوؤں کا کوئی مندر ہو۔''

''یہ صرف لگتا ہی نہیں، واقعی مندر ہے۔''

ظفر عباس نے بتایا کہ امریکہ میں مذہبی عمارات کے بارے میں لوگوں کا رویہ بہت معتدل ہے۔ یہاں مذہب اجتماعی سے زیادہ ذاتی حوالہ ہے اس لیے نہ تو اس پر فسادات ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی جن سنگھیت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں بنتی، ٹوٹتی اور شکلیں بدلتی رہتی ہیں لیکن ایک بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی وجہ سے کوئی عبادت گاہ فروخت کرنی پڑ جائے تو اولیت کسی ایسے گروہ یا فرقے کو دی جائے جو اسے مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا کا نام بہر حال کسی نہ کسی شکل میں لیا جاتا رہے۔ بارش کے باوجود سامعین کی خاصی معقول تعداد ہماری منتظر تھی لیکن یہاں بھی کچھ کچھ مونٹریال کا سا ماحول تھا۔ مشاعرے کے سامعین اور پکنک کے مشتاقین ایک ہی چھت تلے جمع ہو گئے تھے۔ نشست فرشی تھی مگر ہال کے ایک جانب کچھ پتلون پوش حضرات اور فتنہ بردوش خواتین کرسیوں پر بیٹھے تھے اور دراصل یہی چالیس پچاس لوگوں سامعین کم اور تماش بین زیادہ تھے۔ ان کی اس کم توجہی کی وجہ ان کا اور شاعروں کا درمیانی فاصلہ بھی ہو سکتی ہے یا لاؤڈ سپیکر کی ترتیب جس کی وجہ سے انہیں ہماری آواز کم آ رہی تھی۔ وجہ بہر حال جو بھی ہو ایک بات طے ہے کہ یہ لوگ مشاعرے کو ایک ثقافتی اور تفریحی شام سمجھ کر آئے تھے کہ اس بہانے دیار غیر میں ذرا اپنے بھولے بسرے کلچر کا مصالحہ بھی چکھ لیں گے۔ ان سامعین میں ایک جوڑا ہماری اور شاید سارے ہال کی توجہ کا مرکز تھا۔ (اس بات کی تصدیق آخر تک نہیں ہو سکی کہ وہ سچ مچ کا جوڑا تھا یا ہنگامی بنیادوں پر انہوں نے یہ پر امن تصفیہ باہمی کر رکھا تھا) عورت معقول حد تک خوش شکل اور اس سے قدرے زیادہ خوش اندام تھی۔ مرد بھی اچھا خوش رو اور خوش لباس تھا۔ غالباً دونوں نے پی رکھی تھی کیونکہ ہر دو منٹ میں وہ کم از کم ایک بار بڑے پر جوش انداز میں بغل گیر ہوتے تھے اور مختصر، درمیانے اور طویل، ہر

دورانیئے کے بوسوں کے مختلف انداز کچھ اس طرح سے دکھاتے تھے کہ غزلوں کے مصرعے بے وزن اور نظموں کی لائنیں بدآہنگ ہونے لگتی تھیں۔ اس طرح کے مناظر مغرب کی فلموں اور وہاں کی حقیقی زندگی میں بارہا دیکھے تھے مگر اپنی دیسی لوگوں کو برسرعام ایسا کرتے دیکھ کر پتانہیں کیوں بہت برا سا لگا۔ وہ لوگ غالباً جیسا دیس ویسا بھیس کے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی قائل تھے۔ مشاعرے کے بعد میں نے ظفر عباس سے اس منظر اور لوگوں کے ردعمل کے بارے میں پوچھا تو اس نے بھی اس کی یہی وجہ بتائی مگر ساتھ ہی ایک بڑا مزیدار لطیفہ بھی سنایا۔

ایک امریکن کھلاڑی کسی ٹورنامنٹ کے سلسلے میں روم (اٹلی) گیا۔ واپسی پر بے تکلف دوستوں نے کچھ داخلی نوعیت کے استفسار کئے اور پوچھا۔ ''سناؤ معاملات عشق وفسق کیسے رہے؟''

کھلاڑی نے کہا۔ ''تم نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ روم میں رہو تو وہی کچھ کرو جو رومن کرتے ہیں!''

سب نے اثبات میں سر ہلایا' کھلاڑی نے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بھی وہاں ایک امریکن سکول ٹیچر پھنسالی تھی۔''

لاس اینجلس کے زیادہ تر مقامی شاعر باقاعدہ طور پر اچھے شاعر تھے البتہ دو شاعروں نے بہت عجیب حرکتیں کیں۔ ایک تو بزرگ تھے جنہوں نے کسی دوسرے کی غزل بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی کہہ کے پڑھ دی اور اپنے تلفظ کی وجہ سے لفظوں کا وہ حلیہ بگاڑا کہ اصل شاعر سن لیتا تو اندیشہ نقص امن کا ماحول پیدا ہو سکتا تھا۔ دوسرے جاوید نامی ایک جوشیلے سے نوجوان تھے جو امام خمینی کے بے انتہا عقیدت مند تھے اور ایران سے جھگڑے میں امریکہ کے مستقبل کی مکمل تباہی پر ایمان رکھتے تھے۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی خیریت تھی لیکن اصل عبرت ناک چیز ان کی نظم تھی جس کا کوئی مصرعہ دوسرے مصرعے سے دست پنجہ نہیں کرتا تھا۔ یہ اتنی آزاد اور خود مختار نظم تھی کہ ہماری توجہ ''رومیو جولیٹ'' کے اس ڈبل ایکس (XX) مظاہرہ فن سے بھی ہٹ گئی۔ جاوید صاحب کے زور کلام اور ادائیگی کے انداز کو سمجھنے کے لیے آپ بھائی صہبا اختر کو سوسوا سو سے ضرب دے لیں تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آسکتی ہے۔ ویسے یہ اس طرح کا موازنہ ہے جیسے کسی ستم ظریف نے سید محمد تقی کے ترجمہ ''داس کیپٹال'' کا اس کتاب کے دوسرے ترجموں کے ساتھ کیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ سید محمد تقی صاحب نے جب کارل مارکس کی مشہور زمانہ تصنیف کا اردو میں ترجمہ کیا تو ایک صاحب نے ان کی منت کی اور داد کچھ اس طرح سے دی (دروغ برگردن راوی)

''مجھے انگریزی' فرانسیسی' ہسپانوی' روسی' جاپانی اور فارسی زبانیں آتی ہیں۔ میں نے ان سب زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے

پڑھے ہیں مگر صاحب' آپ کے ترجمے کا جواب نہیں' عجیب وغریب کام کیا ہے آپ نے۔"

تقی صب نے اندر سے خوش ہوتے ہوئے مگر بظاہر انکسار کے ساتھ کہا۔"ارے نہیں صاحب' یہ معمولی سی کوشش ہے میر ...... آخر ایسی کیا بات نظر آئی آپ کو میرے ترجمے میں؟"

"بات یہ ہے جناب کہ ان زبانوں کے ترجموں میں کہیں کہیں بات سمجھ میں آجاتی ہے مگر آپ کا ترجمہ...... سبحان اللہ' ماشاء اللہ"

سوصہبا اختر کی بات تو کہیں کہیں سمجھ میں آجاتی ہے مگر جاوید صاحب کی شاعری....... سبحان اللہ' ماشاء اللہ

ہماری فلائیٹ صبح آٹھ بجے کی تھی۔ رات دو بجے ہم لوگ احمد جعفری کے گھر پہنچے اور سحری کے انداز میں پر تکلف ڈنر کیا۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہواتے چار بج گئے۔ چنانچہ میں نے دو گھنٹے سونے پر احمد جعفری سے گپ شپ کو ترجیح دی اور ساڑھے چار گھنٹے کی فلائیٹ میں تقریباً چار گھنٹے ڈٹ کر سویا کہ اب آہستہ آہستہ جہاز میں سونے کی مشق ہوتی جارہی تھی۔

ٹورنٹو ائیر پورٹ پر یہ ہمارا تیسرا پھیرا تھا۔ امیگریشن کے کاؤنٹر پر بہت کم لوگ تھے۔ امیگریشن افسر نے پر سکون انداز میں اس چھوٹی سے قطار پر نظر ڈالی اور پھر عالی کے ایک ساتھ سلے ہوئے تین پاسپورٹوں کو انتہائی مشکوک انداز میں دیکھنے لگا۔ چند لمحے مختلف صفحوں کو الٹتا پلٹتا رہا پھر بولا۔"؟یہ تم بار بار کیوں آجا رہے ہو؟" عالی نے بتایا کہ ہم شاعر ہیں اور مشاعروں کے سلسلے میں ہمیں امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں اپنا کلام سنانا ہے اور چونکہ پروگرام ایسا رکھا گیا ہے کہ ہمیں بار بار بارڈر کراس کرنا پڑتا ہے اس لیے ہمیں بار بار یہاں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔

اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ مشاعرہ کس جانور کا نام ہے اور لوگ دوسروں کی شاعری اپنے وقت میں اور پھر اپنی رقم خرچ کر کے کیوں اور کس لیے سنتے ہیں؟ اس نے عالی سے پوچھنے کے بعد کہ ان کے ساتھ اور کون کون ہے' ہمیں بھی قریب بلا لیا اور ہمارے پاسپورٹوں کو بھی اسی خضوع وخشوع کے ساتھ دیکھنے لگا' پھر زچ سا ہو کر بولا۔"تم لوگوں کے پاس کینیڈا میں صرف ایک بار داخلے کا ویزا ہے' اب تم یہاں داخل نہیں ہوسکتے۔" ہم نے بتایا کہ ہم یہ حرکت اس سے پہلے دو بار کر چکے ہیں اور ابھی ایک آدھ بار اور اسے دہرانے کا ارادہ ہے۔

کہنے لگا۔"تو پھر آؤ' آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں' میرے حساب سے تمہیں ائیر پورٹ سے باہر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔"

ہم نے اسے بتایا کہ ہمارے میزبان ہمارا انتظار کر رہے ہیں اور ان کے گھروں پر ہمارا سامان پڑا ہے جس کا ہمارے گھر والے انتظار کر رہے ہیں مگر اس مردِ خبیث پر ہماری اس مزاح نگاری کا کوئی اثر نہ ہوا' اس نے ایک بڈھے سے سکیورٹی والے کو ایک طرف لے جا کر کچھ گفتگو کی' پروین کو بیٹھ کر انتظار کرنے کے لیے کہا اور ہمیں اس بڈھے کے سپرد کر دیا جو ہمیں ملحقہ ہال کے ایک کیبن میں لے گیا۔

ساری کہانی پھر سے دہرائی گئی اور بڑی مشکلوں سے بڈھے کو سمجھایا گیا کہ اس دنیا میں ابھی ایسی قومیں موجود ہیں جو مشاعرے جیسی بے معنی روایت پر یقین رکھتی ہیں اور یہ کہ ہم لوگ شاعر ہونے کے باوجود اپنے معاشرے کے ذمہ دار اور فعال شہری بھی ہیں۔

بڈھے نے انٹرکام پر کسی سے بات کی اور اس دوران میں ہم پر دو تین ایسی مشکوک نظریں ڈالیں کہ میری جیکٹ کی بغلوں میں پسینہ جمع ہونا شروع ہو گیا اور عالی کے ہنکاروں میں بھی ایک کی جگہ کئی کئی ساز بجنے شروع ہو گئے۔ فون رکھ کر اس نے میز سے اپنی ٹوپی اٹھائی' ہم سے ہاتھ ملایا اور مسکرا کر کہا۔ ''شریف آدمیو' تم جا سکتے ہو۔''

سچی بات یہ ہے کہ اتنی Tension کے بعد اس Anti-climax نے طبیعت بدمزہ سی کر دی تھی۔ پروین نے بڑے نروس اور Excited انداز میں ہمیں آتے ہوئے دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی جیسے کچھ بجھ سی گئی ہے۔ اس سارے معاملے میں یوں تو کل پندرہ منٹ صرف ہوئے مگر لگتا تھا کئی گھنٹے گزر گئے ہیں' چنانچہ جب ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے آئے ہوئے دو دوستوں نے ہماری اس ''غیر معمولی'' تاخیر پر کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہ کیا تو ہمیں بہت مایوسی ہوئی اور انتقاماً ہم نے بھی اپنے سنسنی خیز تجربے کو اپنے تک محدود کر لیا۔

ٹورنٹو پہنچنے کے بعد ہمارا مشاعروں کا یہ پروگرام ختم ہو گیا۔ اب ہمیں اپنا اپنا واپسی کا روٹ اور شیڈول طے کرنا تھا تاکہ اشفاق کی ٹریول ایجنسی کی وساطت سے پروازوں کی بکنگ کرائی جا سکے۔ میرا شکاگو جانا ضروری تھا کیونکہ عرفان اور افتخار نسیم وہاں شدت سے میرے منتظر تھے اور چار پانچ مرتبہ اس ضمن میں ان سے بات بھی ہو چکی تھی۔ پروین کی بھی وہاں ایک سہیلی رہتی تھی چنانچہ اس نے بھی شکاگو اوکے کر دیا۔ اب سوال یہ تھا کہ لندن کب پہنچا جائے اور وہاں ہم کتنے دن رک سکتے ہیں کیونکہ گھروں سے نکلے تقریباً سوا مہینہ ہو چلا تھا؟ میں نے لندن مکرم جاوید سے فون ملایا' اس نے بتایا کہ اسے میرا خط اور پیغام مل چکے ہیں اور ان کے مطابق مجھے آج سے تین دن پہلے اس کے پاس پہنچ چکا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے بتایا کہ ہمارے پروگرام میں کچھ تبدیلی ہو گئی تھی جس کی اطلاع میں اسے نہیں دے سکا تھا' بہرحال اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

''فرق پڑتا ہے نا یار...... '' مکرم نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میرے لیے اپنے بزنس میں سے وقت نکالنا کتنا مشکل ہے۔ میں نے تمہارے لیے اپنا سارا پروگرام اس طرح ترتیب دیا تھا کہ تمہیں لندن گھما پھرا کر میں تمہاری بھابھی کے ساتھ چھٹی منانے نکل جاؤں گا کیونکہ کرسمس کے یہ دن ہی گوروں کے اس ملک میں بزن مینوں کے لیے سکھ کے چند دن ہوتے ہیں اور مجھے پورے سال میں یہی دو ہفتے ملتے ہیں جو میں اپنی فیملی کو دے سکتا ہوں۔''

میں نے اسے وہ تمام مغلظات سنائیں جنہیں بے تکلف دوست ایسے موقعوں پر استعمال میں لاتے ہیں اور طوطا چشمی سے ملتی جلتی تمام تشبیہیں بھی فراوانی کے ساتھ استعمال کیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ اس صورت حال سے واقعی پریشان ہے چنانچہ ہم نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ مکرم بیوی کے ساتھ چھٹی منانے نکل جائے' اس کا سٹاف نہ صرف ہمارے استقبال' رہائش اور سیر و تفریح کے مکمل انتظامات کے ساتھ میری آمد سے روانگی تک خدمت کے لیے حاضر ہوگا بلکہ یار عزیز افتخار بٹ کو اس کے تاجیر یا آفس سے بلوا لیا جائے گا تا کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں میرے ساتھ کمپنی کر سکے۔

اگلی صبح مکرم کا فون آیا کہ تمام انتظامات مکمل ہیں۔ افتخار بائیس تاریخ کو لندن پہنچ گا تا کہ اگلے دن گیارہ بجے ہمیں ہیتھرو ائیر پورٹ سے ریسیو کر سکے۔ اس کے بعد اس نے اپنی غیر حاضری کی معذرت کا قصہ شروع کر دیا جسے روکنے کے لیے مجھے مجبوراً غیر پارلیمانی الفاظ استعمال کرنے پڑے جنہیں بے تکلف دوستوں کے علاوہ اگر کوئی اور استعمال کرے تو بات چاقو اور پستول کے حدود میں داخل ہو جائے۔

شکاگو

امریکی فلموں اور جاسوسی ناولوں کے حوالے سے شکاگو کی سب سے مشہور چیزیں وہاں کے بدمعاش ہیں۔ میں نے جہاز میں پروین کو عرفان اور افتخار کے بارے میں بریف کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ یہ معلومات آج سے چند برس پرانی ہیں اب اگر وہاں ان کی جگہ بوسیدہ جینوں کھلے گلے والی چیک جیکٹوں اور کاؤبوائے ہیٹوں والے دو ایسے افراد ملیں جن کے ہاتھوں میں پستول اور ہونٹوں پر غلط انگریزی ہو تو تعجب نہ کرنا۔

ذوق کا ایک بڑا عام سا شعر ہے۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

خواتین کے افسانوں نوعمر لڑکے لڑکیوں کے خطوط اور ڈائجسٹوں کے ''میرا پسندیدہ شعر'' قسم کے کالموں میں یہ اور اس طرح کے کچھ اور اشعار بڑے ''ان'' ہوتے ہیں اور یوں اپنے عوامی اور عامیانہ استعمال کی وجہ سے ''دانشوروں'' کے حلقے سے ''آؤٹ'' ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فوری ردعمل اور روزمرہ زندگی کے عام واقعات اور محسوسات سے متعلق اس قسم کی شاعری کا ایک اپنا مقام ہے اور ہمیں ان سے امیر گھروں میں پلنے والے غریب رشتے داروں جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ساری تمہید میں نے اس لیے باندھی ہے کہ شکاگو ائیر پورٹ پر عرفان صوفی سے بغل گیری کے دوران یہ شعر مجھے اس شدت سے یاد آیا کہ اگر مجھے پروین کی ہوٹنگ کا خوف نہ ہوتا تو میں یقیناً اسے زبان پر بھی لے آتا۔ شاعر نے کیا سدابہار بات کی ہے۔

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

عرفان صوفی گزشتہ تقریباً بارہ برس سے امریکہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ اس دوران میں وہ دو تین دفعہ پاکستان آیا مگر وقت کی کمی اور دو طرفہ بے معنی مصروفیات کی وجہ سے بات چیت کچھ اس طرح سے ہوئی کہ کبھی بات ہے تو چیت نہیں کبھی چیت ہے تو بات نہیں!

امریکی شہروں کا پھیلاؤ کچھ ایسا ہے کہ اکثر بڑے شہروں کے ہوائی اڈے کسی اور شہر کے مضافات میں واقع ہیں۔ اصلی اور پرانا

شہر یعنی Down Town بنئے کے قرض کی طرح ہوتا ہے یعنی اس کا بیاج اصل سے بڑھ جاتا ہے۔ عرفان نے بتایا کہ وہ شکاگو کے مضافات میں ایک قصبے جولیٹ میں رہتا ہے اور وہیں ملازمت کرتا ہے۔ یہ قصبہ ہوائی اڈے سے تقریباً ستر میل اور ڈاؤن ٹاؤن سے پچاس میل کے فاصلے پر تھا جب کہ ڈاؤن ٹاؤن اور ہوائی اڈے کا درمیانی فاصلہ بھی تقریباً چالیس میل ہے۔ غالب پھر یاد آ رہا ہے۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

راستے میں تین جگہ ٹول ٹیکس کے لیے رکنا پڑا جیسے ہمارے یہاں لاہور سے پنڈی جاتے ہوئے راوی' چناب اور جہلم کے پلوں پر رکنا پڑتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہمارے یہاں ٹول ٹیکس کے موقع واردات پر ٹھیکیداروں کے متعین کردہ لڑکے ہاتھوں میں ٹکٹیں پکڑے ہوتے ہیں جو گزرنے والی کاروں کے ڈرائیوروں کے ہاتھوں سے اس طرح چشم زدن میں نوٹ پکڑتے اور ٹکٹ دیتے ہیں کہ ٹی وی پروگرام Wonderful World of Magic کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جبکہ یہاں ڈرائیور اپنے آپ لوہے کی کھلے منہ والی جالیوں میں پیسے پھینکتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ سو ثابت ہوا کہ شکاگو والے انسانوں کی دیانت پر اعتماد میں تو شاید ہم سے آگے ہوں مگر ان کی زندگیوں میں وہ Thrill یقیناً نہیں ہے جو نوٹ اور ٹکٹ کی چھین جھپٹ سے پیدا ہوتی ہے۔

عرفان نے بتایا کہ بعض ریاستوں میں ٹول ٹیکس کے مقامات انقلاب فرانس سے پہلے کے ٹیکسوں سے بھی زیادہ ہیں۔ نیویارک میں یہ صورت حال اور بھی زیادہ خراب ہے کیونکہ وہاں نہ صرف جگہ جگہ ٹول ٹیکس ہیں بلکہ امریکی کالوں (Blacks) کے لوکل اور ہنگامی ٹیکس بھی ہیں جن کی وصولی عام طور پر چھرے کی نوک یا پستول کی نال پر کی جاتی ہے اور امریکی لوگ نوواردوں کو خاص طور پر ہدایت کرتے ہیں کہ ایسے علاقوں میں کبھی زیادہ رقم کے ساتھ یا بالکل خالی جیب نہیں جانا چاہیے۔

''زیادہ رقم نہ لے جانے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے مگر خالی جیب نہ جانے میں کیا مصلحت ہے؟''

''مصلحت یہ ہے کہ اس طرح کے ڈاکو اور اٹھائی گیرے اکثر نشے میں ہوتے ہیں اور اگر ایسے میں ''شکار'' کے پاس کچھ نہ نکلے تو بعض اوقات وہ جھلاہٹ اور فرسٹریشن کی وجہ سے بھی گولی مار دیتے ہیں۔''

جب ہمیں ایئر پورٹ سے نکلے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تو یکدم میں نے محسوس کیا کہ پروین بہت دیر سے خاموش ہے۔ میں نے وجہ پوچھی' بولی۔'' آپ لوگوں کی گفتگو میں کہیں کوئی کاما' سیمی کولن' فل سٹاپ آئے تو میں کچھ عرض کروں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ لاس اینجلس کا بدلہ ہے۔ وہاں تم نے اور پیچو نے تین گھنٹے ایک دوسرے کے علاوہ کسی سے بات نہیں کی تھی۔''

بولی۔ ''تو گویا عرفان صاحب آپ کے ''پیچو'' ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہیں...... مگر اس سے کہیں زیادہ Presentable ہیں۔''

کہنے لگی۔ ''آپ اسے شادی سے پہلے دیکھتے!''

میں نے کہا۔ ''کس کی شادی سے پہلے...... اس کی یا اپنی؟''

اب پریشان ہونے کی باری عرفان کی تھی کہ ایک اچھے خاصے معقول سیرت وصورت کشمیری بچے اور ماہر نفسیات کا موازنہ ایک خاتون سے کس خوشی میں کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس موازنے میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتا میں نے یہ بتا کر اس کی خوشیوں پر اوس ڈال دی کہ اس مقابلے میں اس کی فتح کی بنیادی وجہ خاتون مذکورہ کا زچگی کے آخری مراحل میں ہونا تھا۔

لاہور میں لوگوں کے ناموں کے ساتھ عرف لگانے کا بہت رواج ہے اور اس ضمن میں غالباً دنیا کا کوئی علاقہ لاہوریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہاں کے عوام' اہل حرفہ' مزدور پیشہ' دکاندار اور طالب علم سب کے سب اس کام میں بہت تیز اور جدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ پرانے لاہور کی گلیوں' بیٹھکوں اور سڑکوں پر اب بھی آپ کو ایسے پوتوں نواسوں والے سفید ریش بزرگ مل جائیں گے جو اپنے ہم عصروں کو باآواز بلند ایسے مزاحیہ ناموں سے پکارتے ہیں جن کی عمر نصف صدی سے تجاوز کر چکی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ نام نسل در نسل آگے چلتے ہیں اور متعلقہ شخصیتوں کا اٹوٹ انگ بن جاتے ہیں۔ مثلاً میرے اور عرفان کے محلے میں مندرجہ ذیل ''مشاہیر'' پائے جاتے تھے۔ بشیر کھپی' مسعود جھلا' شیدا ٹل' بلا پری پیکر' اسلم پسوڑی' حاجی لفنگا' ارشد کوڈی' جانو کپتی' سعید گھوڑا' ارشد تیلا' نثار پپو' حجا پیچ' نسیم کریلا' جیلا بھکھو' اکرم کاں' انیس چیف' بھولا خنجر...... وغیرہ وغیرہ۔

کافی عرصہ پہلے کی بات ہے ایک بار دوستوں کے حلقے میں ایک دم بہت سے جاوید جمع ہو گئے چنانچہ ان میں تمیز اور پہچان کے لیے مندرجہ ذیل عرف عطا کئے گئے۔ جاوید ڈراما' جاوید پشاوری' جاوید فری کا چینڈ' جاوید نانی اور جاوید اندھا۔ ان کے علاوہ ایک جاوید ایسا بھی تھا جس کا عرف کا عرف جامہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔

ان بیس برسوں میں یہ سب کے سب زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی اپنی بساط اور قسمت بھر خاصا سفر طے کر چکے ہیں' ان کی کنپٹیاں چنگبری اور بچے جوان ہو رہے ہیں' معاشی حیثیتیں اور آئیڈیل بدل گئے ہیں اور اعصاب میں پارے کی جگہ تھکن نے گھر بنانا شروع کر دیا ہے مگر ایک دوسرے کا عرفیت کے ساتھ نام لیتے ہوئے اب بھی ایک عجیب طرح کی آسودگی کا احساس ہوتا ہے' یوں لگتا ہے جیسے بہت مار کھانے کے باوجود کسی ہارتے ہوئے باکسر کا کوئی مکا مقابل کی ٹھوڑی کے عین نیچے جا لگے۔ پرانے دوستوں اور گزری

ہوئی صحبتوں کے ذکر میں بھی کچھ عجیب قسم کا فراریت آمیز مزہ ہوتا ہے۔آدمی ایسی باتوں کا ذکر بھی انتہائی جوش اور جذبے کے ساتھ کرتا ہے جو راستے کے منظروں کی طرح زندگی کے سفر میں بغیر رکے گزر گئی تھیں۔

پروین کے کھانسنے پر ہمیں احساس ہوا کہ گزشتہ آدھے گھنٹے سے ہم دونوں اس کی موجودگی سے ایک بار پھر بے خبر ہو چکے تھے۔

عرفان نے معذرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''اصل میں ہم بہت دنوں بعد ملے ہیں نا''

''کوئی بات نہیں Please Carry on .... میں تو امجد بھائی کو صرف یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ میں بھی اس دن پپو سے کئی سال بعد ملی تھی۔''

''ایک بات طے ہے'تم ہو اندر سے اب بھی یوپی کی....... بات چھوڑتی نہیں ہو۔''

''وہ تو ہم ہیں۔''اس نے خالص بہاری لہجے میں لہک کر جواب دیا۔

جولیٹ ایک چھوٹا سا بے حد خوبصورت قصبہ ہے جہاں امریکہ کی سب سے بڑی دیواری جیل واقع ہے۔ وہ لوگ اسے Stateville Correction Centre (مرکز اصلاح) کہتے ہیں۔عرفان نے بتایا کہ یہاں ۲۱۰۰ قیدیوں کو رکھنے کی گنجائش ہے اور عام طور پر یہاں سنگین جرائم اور لمبی قیدوں والے خطرناک قیدی رکھے جاتے ہیں جن کی نفسیاتی صحت اور معاملات کی نگرانی کے لیے وہ یہاں بطور ماہر نفسیات کام کر رہا ہے۔

''اتنے خطرناک مجرموں کے درمیان رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا آپ کو؟''

''بات یہ ہے کہ پروین بی بی' ڈرنا تو اس معاشرے میں چاہیے جہاں سے انہیں جرم کی تحریک ہوتی ہے' جیل تو دودھ کے ابل جانے کے بعد کی حالت ہوتی ہے'اس سے کیسا ڈرنا! اور پھر یوں بھی سائنس دان مہلک گیسوں کے درمیان رہتے ہیں اگر وہ ان سے ڈرنا شروع کر دیں تو سائنس کی ترقی رک جائے۔''

میں نے کہا۔''ایسی ترقی کو تو رک ہی جانا چاہیے یار جو اس بات پر فخر کرتی ہے کہ ہم نے ایسی گیس ایجاد کر لی ہے جو صرف جانداروں کو ختم کرے گی' املاک کو اس سے نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے علامہ صاحب کا وہ شعر سن لیا ہے۔''

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

''سوانہوں نے ''افکار'' والوں کا بندوبست کرلیا ہے۔'' پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''افکار'' کسی رسالے کا نام بھی تو ہے شاید' عرفان نے یاد کراتے ہوئے کہا۔

''ہاں' اپنے صہبا بھائی..... صہبا لکھنوی نکالتے ہیں اسے۔''

''صہبا لکھنوی...... ''عرفان نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔''یہ وہی صاحب ہیں نا جو بڑے زور زور سے زانوؤں پر ہاتھ مار مار کر شعر پڑھتے ہیں؟ میں نے ویڈیو میں ان کا ایک مشاعرہ دیکھا تھا۔''

''وہ صہبا اختر ہے بھائی' اس میں سے تو تین چار صہبا لکھنوی نکل آئیں گے۔''

''آپ کو پتا ہے امجد بھائی' مشفق خواجہ اور صہبا صاحب کے بارے میں کیسا ظالم فقرہ لکھا ہے؟'' پروین نے کہا۔

میں نے کہا۔''مشفق خواجہ کے اکثر فقرے بہت گہری کاٹ والے ہوتے ہیں اور صہبا صاحب پر وہ مشق ستم بھی اکثر کرتے رہتے ہیں۔تم کس فقرے کی بات کررہی ہو؟''

''انہوں نے صہبا بھائی کے لندن میں دیے گئے ایک بیان پر تبصرہ کیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ''افکار'' کو لندن سے بھی نکالا کروں مگر افسوس میرے وسائل اور صحت اس کی اجازت نہیں دیتے۔اس پر مشفق خواجہ نے لکھا کہ صہبا صاحب کے وسائل اور صحت اس کی اجازت نہیں دیتے اور لندن والوں کا ضابطہ اخلاق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہاں سے کوئی ایسا رسالہ نکالا جائے جو صرف مشتہرین کے لیے چھپتا ہو۔''

''یہ فاؤل ہے بھئی۔'' میں نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا۔''میرے خیال میں اس میں حقیقت سے زیادہ مشفق خواجہ کا بغض مدیرانہ بول رہا ہے' اب وہ خود بھی ''تخلیقی ادب'' نکال رہے ہیں نا!''

''کچھ بھی ہو' جملہ بہت اچھا ہے۔'' عرفان نے اپنے مخصوص انداز میں ایک طرف دیکھ کر دوسری طرف سر ہلاتے ہوئے داد دی۔

''آپ ویسے رہتے تو امریکہ ہی میں ہیں نا؟'' پروین نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' عرفان نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ہمیں ایئرپورٹ سے چلے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو چلا ہے' امجد بھائی نے بتایا تھا کہ آپ شکاگو میں رہتے ہیں' آپ نے بتایا کہ رہائش شکاگو کے مضافات میں ہے مگر آپ تو چلتے ہی چلے جارہے ہیں' ہم تو اتنی دیر میں کراچی سے حیدرآباد پہنچ جاتے ہیں۔''

''اسی پھیلاؤ کا نام تو امریکہ ہے۔'' عرفان نے ایک ٹرن لیتے ہوئے کہا۔

''ان کے پاس اتنی وسعت ہے پھر بھی یہ لوگ توسیع پسند ہیں' کتنی حیرت کی بات ہے۔''

''اگر اس وقت یہاں میری جگہ اشفاق احمد ہوتے تو تمہیں طمع اور حطمہ کے حوالے سے اس کا روحانی حل بتاتے' ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ بھوک کے پیٹ سے بھوک اور ظلم کے پیٹ سے ہمیشہ ظلم ہی پیدا ہوتا ہے۔ کیوں عرفان!''

''اس موضوع پر راج کپور نے ''آوارہ'' فلم بھی بنائی تھی کہ شریف کا بیٹا شریف اور چور کا بیٹا چور ہوتا ہے۔'' عرفان نے بریک مارتے ہوئے کہا۔''فی الحال صورت حال یہ ہے کہ غریب خانہ آ گیا ہے۔''

''بالاخر........'' پروین نے لقمہ دیا۔

عرفان نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گیراج کا دروازہ کھولا۔

میں نے کہا۔''یہ آئیڈیا ان لوگوں نے غالباً علی بابا چالیس چور کے ''کھل جا سم سم'' سے لیا ہے۔''

''پرانے اور پرائے خیالوں کو نئی شکلیں دینے کا نام تو امریکہ ہے۔'' عرفان نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''سعیدہ بھابی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آج کل ذہنی اور جسمانی طور پر معذور بچوں کے لیے ایک سنٹر میں کام کرتی ہے اور اس وقت ہمارے فون کا انتظار کر رہی ہے۔'' عرفان نے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

دعا سلام کے بعد طے یہ پایا کہ ہم لوگ سامان رکھ کر عرفان کے ساتھ ایک یونانی ریستوران میں پہنچ جائیں تاکہ لنچ سے فراغت حاصل کر لی جائے' اس کے بعد تفصیل سے باتیں ہوں گی۔

شمیم سیفی نے ایک بار کہا تھا کھانے اور موسیقی کے علاوہ عرفان کے کسی ذوق پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے سو اس بیان کی ایک بار تصدیق ہو گئی۔ موٹر میں لتا کے گانوں کا کیسٹ اور ریستوران کا کھانا دونوں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر تھے۔ لتا کہہ رہی تھی۔

تم کیا جانو تمہاری یاد میں ہم کتنا روئے....... چین سے جب تم سوئے
جو میں جانتی بچھڑت میں سیاں....... گھونگھٹا میں آگ لگا لیتی

یونانی کھانوں کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان میں ہمارے اسلامی اور خصوصاً برصغیر کے کھانوں کی خوبو پائی جاتی ہے۔ مرچ مصالحوں کے استعمال کے علاوہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اکثر کھانے بھی ہمارے کھانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ عرفان نے بتایا کہ سپین' اٹلی اور مشرقی یورپ کے کچھ ملکوں کی ''خوراک'' میں بھی یہ تاثرات پائے جاتے ہیں البتہ امریکہ والے اس ذائقے اور

چٹخارے سے مکمل طور پر محروم ہیں۔ میکسیکن کھانوں میں البتہ تھوڑی بہت ''جان'' پائی جاتی ہے مگر وہ ''مولوی مدن کی سی بات'' ان میں بھی نہیں ہے۔

جو روسٹڈ گوشت ہم نے کھایا اس کا نام غالباً گیرو تھا۔ جو چکن اور بیف کا ایک ایسا آمیزہ تھا جسے بڑی بڑی گھومنے والی سلاخوں پر لپیٹ کر ایک مخصوص درجہ حرارت پر مسلسل پکایا جاتا تھا۔ ہماری پلیٹوں میں اس کے بڑی نفاست سے کاٹے ہوئے باریک قتلوں کے ڈھیر پڑے تھے جو ہم نے بڑی رغبت اور تندہی سے چند ہی منٹوں میں اس طرح نوش جان کیے کہ ہمارے ساتھ ساتھ ہوٹل والے کی طبیعت بھی خوش ہو گئی چنانچہ سعیدہ بھابھی کی فرمائش پر اس نے انہیں بڑی فراخدلی سے اس کی Receipt بھی لکھوا دی۔ مجھے حسب معمول مرغ اور گائے کے آمیزے کے حوالے سے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

ایک ہوٹل نے ایک نئی ڈش کا اعلان کیا جو مرغ اور گائے کے گوشت کا مجموعہ تھی۔ ایک گاہک نے اعتراض کیا کہ سالن میں مرغے کا گوشت کہیں نظر نہیں آ رہا' آپ کس تناسب سے دونوں کے گوشت ملاتے ہیں؟ ہوٹل والے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ففٹی ففٹی جناب' ایک مرغ اور ایک گائے۔''

سعیدہ بھابی کو میں نے پہلی بار تب دیکھا تھا جب عرفان سے ان کی منگنی کی بات چل رہی تھی۔ عرفان اسلامیہ کالج سول لائنز کے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر تھا اور سعیدہ بھابی مشرقی پاکستان سے بی اے کرنے کے بعد اس کی کلاس کے رستے اس کے دل میں داخل ہوئی تھیں۔ اس وقت کی شرمیلی سی کم عمر اور زیادہ سنجیدہ لڑکی اور اس ملنسار' پروقار' ذمہ دار اور نفیس خاتون میں بہت فرق آ چکا تھا۔ اب وہ ایک آٹھ سالہ پیارے بچے اسد کی ماں' من پسند شوہر کی محبوب بیوی' بہت سے ڈپلوموں والی ماہر نفسیات اور امریکہ جیسے آزاد معاشرے میں اپنی روایات کی پابند ایک ایسی عورت بن چکی تھی جس کی آنکھوں اور باتوں میں اپنے ہونے کا اعتماد لہریں لے رہا تھا۔ پروین اور سعیدہ پہلی نظر میں ایک دوسرے کی دوست بن چکی تھیں۔ گفتگو کے موضوعات کے اعتبار سے عورتیں ویسے بھی خود کفیل ہوتی ہیں اور یہاں تو دونوں خواتین چونکہ ضرورت سے بھی زیادہ پڑھی لکھی تھیں اس لیے انہوں نے فوراً اپنا زنانہ ڈبہ علیحدہ کر لیا اور اس پراسرار زبان میں گفتگو کرنے لگیں جس کے ذریعے عورتیں چند لمحوں میں ایک دوسرے کی آسوں سے لے کر سانسوں تک کے بارے میں وہ کچھ جان لیتی ہیں جس کا پتا مردوں کو برسوں نہیں لگتا۔

میں نے عرفان کو بتایا کہ امریکہ آنے سے پہلے میں ٹی وی والوں کو اپنے نئے ڈراما سیریل ''وقت'' کا پائلٹ پروگرام دے کر آیا ہوں جس کی ابتدائی قسطوں میں جیل' جرم' سزا اور قیدی کا خاصا تذکرہ رہے گا اور یہ کہ میری خواہش ہے کہ امریکہ کی اس سب سے بڑی

جیل کا راؤنڈ بھی لگایا جائے تا کہ پلاٹ کے تانے بانے میں مزید گہرائی اور وسعت پیدا ہو سکے۔عرفان نے بتایا کہ جیل میں تعمیر کا کام بہت وسیع پیمانے پر جاری ہے جس کی وجہ سے حفاظتی انتظامات زیادہ سخت کر دیے گئے ہیں' بہر حال وہ کوشش کر کے دیکھتا ہے۔ اس کی یہ کوشش ایک عدد ٹیلیفون کال پر محیط تھی جس کے دوران اس نے متعلقہ حکام کو بتایا کہ اس کے ملک سے تیسری دنیا کے دو بین الاقوامی حیثیت کے ادیب' عمرانیات' سماجیات' اخلاقیات اور پتا نہیں کس کس ''آت'' کے ماہر اور ریسرچ سکالر تشریف لائے ہیں اور اپنے عظیم تحقیقی کام کے سلسلے میں آپ کی جیل کا ایک راؤنڈ کرنا چاہتے ہیں۔اب پتا نہیں یہ اس کے ذاتی تعلقات کا احترام تھا یا ہمارے اس تعارف کا نتیجہ کہ نہ صرف ہمیں ''جیل یاترا'' کی اجازت مل گئی بلکہ ''کوئی اور خدمت'' بھی پوچھی گئی۔اس عجیب وغریب آفر پر ہم بہت دیر تک ہنستے رہے۔

میں نے کہا۔''یار' یہ ہسپتال' تھانے اور جیل کی نوکری بھی بڑی عجیب ہے۔آپ مہمان سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتے کہ پھر کب آئیں گے۔''

پروگرام یہ بنا کہ سعیدہ بھابی اپنے کام پر واپس چلی جائیں اور شام پانچ بجے چھٹی کے بعد اسد کو سکول سے لیتی ہوئی گھر پہنچ جائیں' ہم اتنی دیر میں جیل ہو آتے ہیں۔

پروین نے کہا۔''یہاں بچوں کا سکول پانچ بجے تک ہوتا ہے؟''

''سکول سے تو دو بجے چھٹی ہو جاتی ہے لیکن چونکہ بیشتر گھروں میں مائیں موجود نہیں ہوتیں اس لیے چھوٹی عمر کے بچوں کو سکول والے Day Care Centre میں پہنچا دیتے ہیں جہاں سے دفتروں سے واپسی پر ماں یا باپ ان کو لے لیتے ہیں۔''

''یہ تو بچوں سے بڑی زیادتی ہے بھئی۔'' میں نے کہا۔

''اب یہاں کا سسٹم ہی ایسا ہے تو کیا کیا جائے!'' سعیدہ نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

عرفان کی موٹر ایک تفریحی پارک نما علاقے میں داخل ہوئی۔پتا چلا کہ ہم جیل ایریا میں داخل ہو چکے ہیں۔کار پارک کے سامنے ایک خوبصورت انیکسی نما عمارت تھی۔بیرونی کمرے میں ایک استقبالیہ کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے ایک کالی' موٹی اور ٹھگنی عورت کے ساتھ ایک گورا' دبلا اور لمبا مرد کھڑا تھا۔عرفان نے ان سے ہمارا وہی تعارف کرایا جس کے مطابق ہم دونوں عنقریب نوبل لارئیٹ ادیب ہونے والے تھے مگر ان کم بختوں کی آنکھوں میں اس کے باوجود کوئی تاثر نہ ابھرا۔میں نے اردو میں عرفان سے کہا ان پر اپنا وقت اور الفاظ ضائع نہ کرو کیونکہ انہیں ادب سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی جالندھر کے دکاندار کو تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' پروین نے حیرت سے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے آپ پر جیل کی دہشت سوار ہوگئی ہے' جالندھر کا یہاں کیا ذکر؟''

''اے عزیزہ باتمیز! اس اجمال کے پیچھے ایک تفصیل ہے اور وہ کچھ یوں ہے کہ ایک محفل میں جالندھر کے ایک کاروباری سے کسی نے حفیظ جالندھری صاحب کا تعارف کرایا۔

''حفیظ صاحب کو تو آپ جانتے ہوں گے....... ترانہ پاکستان کے خالق.......!'' دکاندار نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تعارف کرانے والے صاحب نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ ''ارے بھئی حفیظ صاحب' شاہنامہ اسلام کے مصنف' مشہور شاعر.......'' دکاندار نے پھر سر دائیں سے بائیں گھمایا۔ تعارف کرانے والے نے بے حد بوکھلا کر کہا۔ ''کمال ہے' تم حفیظ صاحب کو نہیں جانتے ..... بھئی یہ اپنے حفیظ جالندھری ہیں جن کی........'' دکاندار تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور حفیظ صاحب سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ ''ماشاء اللہ ماشاء اللہ' آپ بھی جالندھر کے ہیں' بہت خوشی ہوئی' بہت خوشی ہوئی۔''

پروین کی جو ہنسی چھوٹی ہے تو وہ نیگٹو پازیٹو قسم کا گلی ڈنڈا بھی خواہ مخواہ ہنسنے لگ پڑا۔

ہمارا دستی سامان اور بٹوے لاکرز میں رکھ کر ہمیں ٹوکن دے دیے گئے۔ معلوم ہوا کہ بتیس ڈالر سے زیادہ کرنسی اندر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وزیٹر کا علامتی نشان ہماری جیکٹوں اور پروین کے کوٹ کے ساتھ لگایا گیا اور پھر ہوائی اڈوں جیسی تلاشی کے ایک مرحلے سے گزارنے کے لیے ہمیں علیحدہ علیحدہ کمروں میں بھیج دیا گیا۔ اس تلاشی پر مجھے اجمل نیازی بہت یاد آیا جس کی داڑھی' مخصوص خدوخال اور سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے ہم اسے ''افغان مہاجرین'' کہا کرتے ہیں۔ ایک بار لاہور ائیر پورٹ کے لاؤنج سے وہ مختصر وقفوں کے بعد دو تین دفعہ اٹھ کر باہر گیا۔ ہر بار مذکورہ حلیے کی وجہ سے اس کی مکمل تلاشی لی گئی۔ آخری چکر پر تو سکیورٹی والوں نے اسے تقریباً روک ہی لیا۔ انہیں تو ہم نے سمجھا بجھا کر معاملہ صاف کر دیا مگر جب واپس آتے ہوئے میں نے اجمل سے ان چکروں کی وجہ پوچھی تو اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ''وجہ تو کوئی نہیں تھی' بس جب وہ تلاشی لیتے ہیں تو بہت مزا آتا ہے ...... عجیب طرح کی تھرل محسوس ہوتی ہے۔''

تلاشی کے بعد ہم نے اپنے آپ کو استقبالیہ کی عمارت کے پیچھے اور جیل کی مرکزی عمارت کے سامنے پایا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل اپنے کمرے میں موجود نہیں تھے مگر کمرے میں رکھے ہوئے ٹی وی مانیٹر سیٹ چل رہے تھے یعنی جیلر صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے جیل کے تمام اہم مقامات اور ناکوں کی خبر گیری کر سکتے تھے۔ کمرے میں جیلر کے پیشرووں اور مشہور مشہور زندہ' آنجہانی اور مفرور مجرموں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ عقلمندی ان لوگوں نے یہ کی کہ تصویروں کے ساتھ متعلقہ افراد کا مختصر تعارف بھی لکھ دیا تھا ورنہ اکثر مقامات پر

شدید غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

ریکارڈ آفس میں بھی کم و بیش یہی صورت حال تھی' فرق صرف یہ تھا کہ یہاں قانون شکنوں کے دوش بدوش جیل کے ان محافظین قانون کی تصاویر بھی تھیں جو ادائے فرض کے دوران جان سے گزر گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس جیل میں اس نوع کے واقعات کی تعداد اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہاں عام طور پر خطرناک ترین مجرم رکھے جاتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان کا قتل فلیپر سے مکھی مارنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا' پروین کے چہرے سے رنگ اڑ کر بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ ''آج کل تو حفاظتی اقدامات بہت بہتر ہو گئے ہوں گے۔ ان ماڈرن ایکوپمنٹس کی وجہ سے!''

''ہاں' کچھ بہتری تو ہوئی ہے۔'' متعلقہ افسر نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر بات یہ ہے خاتون کہ دروازے بند کرنے والوں سے کھولنے والے ہمیشہ زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ پروین کا بیٹھا ہوا حوصلہ اب لیٹنے کے قریب ہے۔ شاید عرفان کو بھی اس صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے وہ ہمیں لے کر فوراً اس کمرے سے نکل آیا اور بتانے لگا کہ اعلیٰ ترین حفاظتی اقدامات کی وجہ سے کئی برسوں سے یہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اس لیے ہمیں گھبرانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ دو لمبے کاریڈورز سے گزر کر ہم جیل کے ایک ایسے حصے میں پہنچے جو گول دائرے کی شکل کا ایک بہت بڑا ہال تھا اور جس میں چاروں طرف نیچے سے اوپر تک قیدیوں کے سیل بنے ہوئے تھے۔ ان سیلوں کے سامنے مضافاتی ہوٹلوں کے ورانڈوں جیسی لمبی لمبی راہداریاں تھیں جن کے گرداگرد سلاخ دار جنگلے لگے ہوئے تھے۔ بہت سے قیدی طرح طرح کی جینیں اور ٹی شرٹیں پہنے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ان کے انداز میں ایک عجیب طرح کی بے تکلفی تھی جیسے چڑیا گھر کے جانور مسلسل دیکھے جانے کی وجہ سے بے نیاز سے ہو جاتے ہیں۔

ہال کے درمیان میں ایک بڑا سا لوہے کا کٹہرا تھا۔ معلوم ہوا ایمرجنسی کی صورت میں جیل کا عملہ اسے اپنے دفاعی مرکز کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ایک میکنزم کے تحت یہ پورے کا پورا اسٹرکچر اپنی جگہ سے تیس فٹ اوپر تک کہیں بھی معلق ہو سکتا ہے اور یوں قیدیوں کے حملے کی زد سے باہر ہو کر انہیں کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ یہ اطلاع اس ماحول اور گزشتہ معلومات کے تناظر میں کچھ زیادہ ہی تشویش ناک تھی۔ عین اس وقت قریب سے گزرتے ہوئے دو قیدیوں نے پروین پر ایسی نظریں ڈالیں کہ اس کی ناک کی پھننگ پر پسینہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ عرفان نے بتایا کہ چند برس پہلے جس شخص نے آٹھ نرسوں کو بیک وقت قتل کیا تھا وہ اسی نواح میں موجود ہے' اگر ہم چاہیں تو اس کی ''زیارت'' بھی ہو سکتی ہے۔ پروین نے بڑی مشکلوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہیں' ٹھیک ہے۔ اندازہ تو ہو ہی گیا

ہے...... کیوں امجد بھائی!''

''ہاں' ویسے بھی یہاں کچھ عجیب سی بو ہے۔ دل گھبرا رہا ہے۔''

عرفان نے کہا۔''آیئے آپ کو مسجد دکھائیں۔''

''مسجد' یہاں؟ جیل کے اندر......''

''ہاں' یہاں تمام بڑے بڑے مذاہب کے لیے عبادت گاہیں بنائی گئی ہیں۔ گناہ اور توبہ کا رشتہ تو شاید اس کائنات کا سب سے پرانا اور مستقل رشتہ ہے۔''

چند سیڑھیاں اترنے کے بعد ہم نیچی چھت والے اس کمرے میں پہنچے جسے عرفان نے مسجد کہہ کر متعارف کروایا تھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں مسجد کے سارے لوازمات موجود تھے۔ چٹائیاں' ٹوپیاں' قرآن مجید کے نسخے' حدیث اور فقہ سے متعلق پندرہ بیس کتابیں۔ عرفان نے بتایا کہ یہاں ایک پارٹ ٹائم مولوی صاحب بھی موجود ہیں جو مذہبی معاملات کی بجا آوری اور رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اس نے کیس بنا کر بھجوایا ہے' توقع ہے جلد ہی ایک کل وقتی مولوی صاحب کی مستقل پوسٹ منظور ہو جائے گی۔

میں نے کہا۔''پروگرام تو بہت اچھا ہے مگر یہ سوچ لینا کہیں الٹی آنتیں گلے نہ پڑ جائیں۔ علامہ صاحب نے جو دین ملا فی سبیل اللہ فساد کہا ہے تو یونہی نہیں کہا۔ انگلینڈ میں ان لوگوں نے کئی مسجدوں پر تالے لگوا دیے ہیں۔''

''میرے خیال میں دونوں طرف برابر کا رسک ہے۔ مولوی صاحب کو بھی اتنا اندازہ تو ہو گا کہ جیل میں فساد کا مطلب کیا ہوتا ہے!'' عرفان نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

جیل میں اس وقت کوئی اٹھارہ سو کے قریب قیدی تھی جن میں سے تقریباً پندرہ سو سیاہ فام یا دیگر رنگ دار نسلوں سے تھے۔ میں نے پوچھا۔''گوروں اور کالوں کے اس عدم تناسب کے پیچھے بھی کوئی نسلی تعصب ہے یا......''

''نسلی تعصب تو شاید نہیں معاشی عدم تناسب یقیناً ہے۔ غربت اور کم وسائل کی وجہ سے یہاں کے کالوں میں جرائم کا رجحان غالب ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے۔''

''مگر یار! امریکہ تو پوری دنیا کا ان داتا بنا ہوا ہے یہاں کس چیز کی کمی ہے جو یہ ان لوگوں کو اپنے برابر کے مواقع نہیں دیتے؟''

''یہ بڑی لمبی بحث ہے۔'' عرفان نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔''برابری'' اور ''مزید برابری'' کا چکر ایسا خوفناک ہے

کہ دنیا کا ہر نظام اس پر قابو پانے میں ناکام ہو گیا ہے۔ نعرے بدلتے رہتے ہیں مگر انسان کی تقدیر نہیں بدلتی۔ انسانی تاریخ میں صرف ایک بار چودہ سو سال پہلے اس کا ایک امکان پیدا ہوا تھا جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو قریش مکہ کی موجودگی میں کعبے کی چھت پر کھڑا کر کے رنگ، نسل، قوم اور طاقت کی جو دیوار گرائی تھی، مگر افسوس ہم نے اسے پھر سے تعمیر کر لیا ہے۔ اب تو بہت مشکل ہے۔''

''سپورٹس اور میوزک میں تو زیادہ تر سیاہ فام لوگ ہی آگے ہیں۔'' پروین نے کہا۔

''اور بھی بہت سے شعبوں میں یہ لوگ گوروں سے آگے ہیں۔ لیکن مسئلہ پھر وہی ''مزید برابری'' کا ہے۔''

میرا جی چاہا کہ امریکی معاشرے کے نام نہاد جمہوریت، مساوات، آزاد خیالی اور نسلی حقوق کے نعروں پر تنقید کر کے ان کا پھاکا اڑاؤں مگر میرے اندر سے کسی نے جیسے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ ''یہ تو پھر گورے اور کافر ہیں، کیا ہم سانولے، گندمی اور دیگر رنگ دار لوگ، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، ان سیاہ فاموں کو برابر کے حقوق دینے کو تیار ہیں؟ کیا ہم بھی انہیں ازراہ تحقیر و تمسخر ''کالے حبشی'' نہیں کہتے؟ کیا ہم ان کے رنگ، گھنگھریالے بالوں، موٹے ہونٹوں اور بھڑکدار رنگوں والے لباسوں کو دیکھ کر زیر لب مسکراتے نہیں؟ کیا ہمارے معاشرے میں ان افتادگان خاک کے لیے اتنی جگہ بھی ہے جتنی انہیں یہاں میسر ہے؟''

یہ اور اس طرح کے بے شمار سوالوں سے گھبرا کر میں نے سر کو زور سے دو تین بار جھٹکا۔ سامنے سے ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام ویسٹ انڈیز کے کھلاڑی کلائیو لائیڈ کی طرح کندھے اور منہ آگے کو نکالے، ٹھوڑی اوپر کی طرف اٹھائے اور اوپری جسم کو ایک بے ہنگم سے انداز سے جھلاتے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جس میں دوستی، تجسس اور استہزا آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس کی کمر کے گرد ایک بینڈ تیج سی تھی جس کے ساتھ پلاسٹک کی نالیاں اور ایک تھیلی بندھی ہوئی تھی۔ ہمارے قریب آ کر وہ رکا، مسکرایا اور پھر پروین نے ہاتھ تو ملایا لیکن اس کا اوپر کا سانس کہیں اوپر ہی رہ گیا ہے۔ اس مرد بے تکلف نے اگرچہ مجھ سے اور عرفان سے بھی ہاتھ ملایا مگر اس کی نظریں مسلسل پروین کی طرف رہیں جس کی وجہ سے اس کے اوپر رکے ہوئے سانس کو نیچے آنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس نے پروین کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ایک عجیب سی آواز اور غریب سی انگریزی میں کچھ کہا جو نہ میری سمجھ میں آیا اور نہ پروین کی، حالانکہ اس نے انگریزی میں دو دو ایم کر رکھے ہیں۔ عرفان نے غالباً اس صورت حال کو بھانپ لیا تھا اس لیے اس نے آگے بڑھ کر اسی طرح کی منمنی سی انگریزی میں اس سے کوئی بات کی جس پر اس نے زور زور سے سر ہلا کر ''یس یس'' کہا۔ ایک بار پھر ہم تینوں سے مصافحہ کیا اور جھولتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا۔

''یہ کیا چیز تھی بھائی' اور کیا کہہ رہا تھا؟'' میں نے مصنوعی بے پروائی سے پوچھا۔

یہ چیز نہیں بڑی ''شے'' ہے اور کہہ کچھ نہیں رہا تھا صرف پروین صاحبہ کے ناک کے کوکے کی تعریف کر رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کیا وہ اسے چھو کر دیکھ سکتا ہے؟''

''نہیں...... '' پروین نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''میں نے بھی اسے یہی جواب دیا ہے۔'' عرفان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور اتفاق کی بات ہے وہ آرام سے مان گیا ہے ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' پروین نے پریشان ہو کر کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ......''

''آپ گھبرائیں نہیں۔ اب تو وہ چلا ہی گیا ہے...... دراصل اس سے جیل کا سارا عملہ گھبراتا ہے۔ اس کے گردے میں کوئی تکلیف ہے' آپ نے وہ تھیلی دیکھی تھی نا...... اس پر کسی قسم کی سختی نہیں کی جا سکتی۔ کم بخت نہ صرف اس صورت سے واقف ہے بلکہ ویسے بھی قانون کی بہت سی باریکیاں سمجھتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اس بیماری کی آڑ میں یہ پوری جیل کو بلیک میل کر رہا ہے۔ ذرا کوئی اونچی بات کرو تو یہ تن کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔

Come on, come on, hit me.

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے کہا۔ ''اس طرح تو جیل کا ڈسپلن......''

''یہ امریکہ ہے مائی ڈیئر' یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ قانون شکنی اور جرم کی حوصلہ افزائی یہاں کے سسٹم کا بنیادی جزو ہے۔ عدالتوں میں مجرم کو بچانے کے لیے ایسے ایسے رستے ہیں کہ تم لوگ تصور نہیں کر سکتے۔ یوں لگتا ہے جیسے پورا معاشرہ جج صاحب سمیت مجرم کا وکیل بنا ہوا ہے۔ اس کے باوجود اسے سزا ہو جائے تو جیل میں اس کے حقوق کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے جیل کا عملہ قیدی ہے اور یہ لوگ یہاں کے ایڈمنسٹریٹر ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' پروین نے پوچھا۔

''وہ یوں کے قیدیوں کے حقوق اور ان کی بہبود کے ادارے' وکیلوں کی انجمنیں' انسانی حقوق کی تنظیمیں اور مقامی رفاہی ادارے ...... سب کے سب ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس معاشرے میں ان اداروں کی بڑی طاقت ہے چنانچہ جیل والوں کو ایک عام قیدی پر جتنا خرچ کرنا پڑتا ہے اتنے میں ہمارے یہاں دو وی آئی پی بھگتائے جا سکتے ہیں۔ کچھ جدید جیلیں تو ایسی ہیں کہ انہیں بلا

تکلف ریسٹ ہاؤس قرار دیا جا سکتا ہے۔"

"اس حساب سے تو یہاں کے ترقی پسندوں کو بڑی مشکل ہوتی ہوگی۔ میرا مطلب ہے نہ زنداں کی شام' نہ گوشۂ تنہائی' نہ دار و رسن' نہ حلقۂ زنجیر' نہ زبان پہ مہر' نہ ہاتھ قلم' نہ پاؤں فگار!"

"اس کے لیے یہاں اور طریقے ہیں۔" عرفان نے اپنے مخصوص انداز میں سر کو الٹی طرف گھماتے ہوئے کہا۔ "البتہ ایک بات ہے' یہاں قیدیوں کے حقوق تیسری دنیا کے کئی ملکوں کے آزاد شہریوں سے زیادہ ہیں۔" عرفان کا یہ جملہ اس قدر سچا تھا کہ فوراً فیض صاحب یاد آ گئے۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں! کس سے منصفی چاہیں!

اس کے بعد ہم نے قیدیوں کی جسمانی صحت اور ورزش کے لیے بنایا گیا نیا جمنیزیم دیکھا۔ اس میں جس قدر سہولتیں تھیں اس سے آدھی بھی ہماری اولمپکس میں شریک ہونے والی ٹیم کے ٹریننگ کیمپ کو نصیب نہیں ہوتیں۔ جی اور برا ہوا۔

عرفان نے بتایا کہ اکثر قیدی عدالت میں پاگل یا ابنارمل قرار دیے جانے کے لیے جیل میں دنگا فساد کرتے ہیں یا مختلف طرح کی حرکتیں کرتے ہیں تا کہ انہیں ہسپتال بھجوا دیا جائے جہاں وہ اور بھی زیادہ مزے سے رہ سکتے ہیں۔ عرفان کا کام ایسے لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کر کے رپورٹ لکھنا ہوتا ہے' اس کے علاوہ وہ انہیں مختلف نفسیاتی مسائل کے سلسلے میں بھی مشورت اور رہنمائی مہیا کرتا ہے۔

"یہ تو بڑا خطرناک کام ہے۔" پروین نے کہا۔ "خدانخواستہ اگر کوئی قیدی......"

"نہیں' ایسا ہوتا نہیں ہے' وہ محاورہ ہے نا "دیوانہ بکار خویش ہشیار......" تو کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے اور ویسے بھی ہمارے پاس حفاظتی اقدامات کا مکمل بندوبست ہوتا ہے۔"

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہاں مجرموں کا ایک اپنا ضابطہ اخلاق ہوتا ہے جس پر وہ جیل میں بھی بہت سختی سے عمل کرتے ہیں۔" تم نے ٹھیک سنا ہے...... بعض معاملات میں ان لوگوں کا اندرونی ضابطہ اخلاق عام معاشرتی اخلاقیات سے زیادہ اچھا' گہرا اور مضبوط ہے' مثلاً عورتوں پر حملے اور بچوں سے زیادتی کرنے والوں کو یہ لوگ بہت برا سمجھتے ہیں اور جیل کے اندر نہ صرف ان سے

نفرت کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسے لوگوں کو سخت سزائیں بھی دیتے ہیں۔"

"سزا یافتہ لوگ جب واپس معاشرے میں جاتے ہیں تو ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے یعنی کیا ان سے میل ملاپ، رشتہ داری اور تعلقات میں کوئی فرق پڑتا ہے؟ انہیں ملازمت آسانی سے مل جاتی ہے، لوگ ان سے نارمل انداز میں ملتے ہیں یا ان کے جرم کا سایہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے؟"

"اس معاشرے میں ویسے تو کوئی بھی کسی کے ماضی میں دلچسپی نہیں لیتا اور یہی طرزِ عمل سزا یافتہ مجرموں کے سلسلے میں بھی ہے۔ استثنائی صورتوں میں کچھ لوگوں کی ری ایڈ جسٹ کرنے میں دقت پیش آتی ہے لیکن پھر بھی ہمارے والا معاملہ نہیں ہے کہ چاہے کسی وجہ سے بھی جیل جاؤ آئندہ زندگی کے سارے جائز راستے بند ہو جاتے ہیں۔"

عرفان کے استفسار پر میں نے اسے بتایا۔ "ان سوالات کا مقصد اپنے آئندہ ٹی وی سیریل "وقت" کے سلسلے میں مواد جمع کرنا ہے کیونکہ جرم، معاشرے اور سزا کی یہ مثلث مجھے اکثر پریشان کرتی رہتی ہے اور میں چاہتا ہوں اس موضوع کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔"

"دہلیز میں بھی تو آپ نے یہ اشو ڈسکس کیا تھا؟" پروین نے کہا۔

"مگر وہ ٹی وی احکام اور ان کی پالیسی کی چکی میں پس کر رہ گیا تھا۔ اس وقت کے ایک جنرل مینجر نے، جو کبھی میرا انتہائی قریبی دوست ہوا کرتا تھا، مجھے بتائے بغیر اس کی آخری قسط میں سے پانچ ریکارڈڈ سین کاٹ دیے تھے۔ جس شام یہ قسط چلی وہ میری زندگی کی سب سے ناخوشگوار شام تھی۔"

"مگر کیوں؟" عرفان نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے تو سنا ہے ٹی وی والوں سے تمہارے بڑے تعلقات ہیں اور تم ان کے بڑے فیورٹ رائٹر ہو۔"

"ہاں...... وہ بھی ہوں...... مگر جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بھی حرف بحرف سچ ہے۔"

"یہ تو چاہت نفرت قسم کا تعلق لگتا ہے۔" عرفان نے بڑی پیشہ ورانہ سنجیدگی سے کہا۔

"شاید وہ بھی ہو...... اصل المیہ یہ ہے کہ ہمارا ٹی وی عوام کی بجائے سرکار کا نمائندہ ہو کر رہ گیا ہے۔ تخلیقی لوگ یا تو اس سے نکل گئے ہیں یا گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ جو اس کے باوجود بچ گئے ہیں انہیں افسر بنا کر انتظامیہ میں لگا دیا گیا ہے جہاں ان کا کام وہی ہے جو فرعون کا بنی اسرائیل سے تھا۔ ایسے میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ تمہیں پتا ہے بادشاہ کے "وفادار" بادشاہ سے

زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔"

"یہ آپ نے کیا موضوع چھیڑ دیا۔" پروین نے عرفان سے شکایت کی۔ "اس موضوع پر تو امجد بھائی دس گھنٹے نان سٹاپ بول سکتے ہیں۔"

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ میں بغیر موضوع کے بھی دس گھنٹے بول سکتا ہوں۔"

"دل میں کہا تھا۔" پروین نے ہنستی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

واپسی پر عرفان نے ایک پٹرول پمپ پر موٹر روکی اور کھڑکی کھول کر ایک لیٹر بکس نما ڈبے کے کھلے ہوئے منہ میں بٹوے سے نکال کر ایک کارڈ رکھ دیا۔ اتنے دنوں میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ امریکہ میں روزمرہ زندگی کا زیادہ تر کام کارڈوں کے ذریعے ہی چلتا ہے اور ایک عام امریکی شہری کی کل اوقات چھ سات کارڈوں پر محیط ہوتی ہے مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی حد نہ رہی کہ دو تین منٹ بعد نہ صرف عرفان کا بھیجا ہوا کارڈ واپس آ گیا بلکہ اس کے ساتھ کافی سارے ڈالر بھی تھے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ کیسا پٹرول پمپ ہے یار جہاں پٹرول کے ساتھ ساتھ پیسے بھی ملتے ہیں۔"

عرفان نے مسکراتے ہوئے پٹرول پمپ کے عقب میں واقع ایک خوبصورت عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ پیسے میں نے اپنے بنک سے نکلوائے ہیں۔"

ہماری حیرت دیکھ کر اس نے وضاحت کی کہ عام طور پر سردی' بارش اور برف کی وجہ سے لوگوں کو بنک تک پہنچنے میں تکلیف ہوتی ہے چنانچہ انہوں نے اس پٹرول پمپ پر ایسا انتظام کر دیا ہے کہ جتنی دیر میں آپ پٹرول لیں اس کے اندر اندر آپ کا چیک کیش ہو کر رقم آپ کو یہیں مل جائے۔

میں نے سوچا' یہ امریکی بھی عجیب قوم ہیں' آسانی پیدا کرنے پر آتے ہیں تو کسی کام کے لیے چٹکی تک نہیں بجانا پڑتی اور مشکل کھڑی کرتے ہیں تو ایسی کہ ایک اسرائیل دس عرب ملکوں کے قابو میں نہیں آتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یو این او میں U تو USA کا ہے باقی سب No ہی No ہے۔

گھر پہنچے تو بھابی سعیدہ نے کھانوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ معلوم ہوا دفتر سے آنے کے بعد وہ اسی کام میں جُتی رہی ہیں۔ ہم نے اس تکلف اور تکلیف کی شکایت کرنا چاہی تو اس نے بڑی محبت بھری فہمائش کے ساتھ کہا۔ "آپ مرد ہیں امجد بھائی' آپ شاید نہ سمجھیں' پروین کو پتا ہوگا پسندیدہ لوگوں کے لیے کھانا پکانا عورت کے لیے کتنی بڑی راحت ہوتی ہے۔"

اس جملے نے ایسا کلین بولڈ کیا کہ واپسی کے دن تک مجھے دوبارہ اس موضوع پر بات کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ اس شیر کی بچی نے ہر کھانے پر دو تین نئی ڈشیں ضرور تیار کیں۔ ایک بار عرفان نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا جی چاہتا ہے آپ کو ہمیشہ کے لیے یہیں رکھ لوں کیونکہ جب ہم یہاں ہیں یہ پہلا موقع ہے کہ سعیدہ کھانا پکانے میں اتنی دلچسپی لے رہی ہے۔''

''جی ہاں....... وگرنہ آپ تو آٹھ برسوں سے فاقے ہی کر رہے تھے۔'' سعیدہ نے چوٹ کی۔

''دیکھو بھئی' امجد کو پتا ہے' ہم کشمیریوں کی زندگی میں بس دو ہی شوق ہیں' پہلا کھانے کا.......''

''اور دوسرا بھی کھانے کا۔'' میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ بات آپ نے مجھے شادی سے پہلے کیوں نہیں بتائی۔'' سعیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ اس لیے کہ شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کی صرف خوبیاں ہی بتائی جاتی ہیں۔'' عرفان نے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

''آپ کو تو پتا ہونا چاہیے تھا' بھابی....... افیئر تو آپ کا غالباً ڈیڑھ دو برس چلتا رہا تھا۔'' میں نے دانہ ڈالا۔

عرفان اور سعیدہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے ساختہ مسکرائے۔ پروین بولی ''یہاں آپ کی دال نہیں گلے گی امجد بھائی' دونوں پارٹیاں مضبوط ہیں۔''

''میں بھی یہی چیک کر رہا تھا۔''

''یہ کچھ ویسی ہی چیکنگ نہیں ہو گئی جیسے ایک سردار جی نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے کسی سے پوچھا تھا کہ بتاؤ ہم کس پر بیٹھے ہیں؟'' متعلقہ شخص نے پریشان سا ہو کر کہا۔ ''گھوڑے پر' سردار جی آپ کو نہیں پتا؟''

''پتا تو ہے۔'' سردار جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی چیک کر لینے میں کیا حرج ہے!''

عرفان کے اس لطیفے پر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ اسد نے' جو ابھی تک بڑی خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا' اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں جھپکا کر ہماری طرف دیکھا اور پھر ایسے انداز میں کندھے جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گیا جیسے ہماری ہنسی اور شور سے اس کے گیان دھیان میں فرق آ رہا ہو۔ اس کی اس ادا پر ایک اور مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

''معلوم ہوتا ہے بیٹا ہماری باتوں سے بور ہو گیا ہے۔'' پروین نے کہا۔

''شکر کرو اس کا طوطا یہاں نہیں تھا۔'' میں نے عرفان کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''پروفیسر منظور کے بیٹے والا' یاد ہے نا؟''

''میں نے ہی تو تمہیں سنایا تھا۔'' عرفان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پروین کو بھی سنایئے نا...... ''سعیدہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ ''یہ بیچاری پریشان ہو رہی ہیں۔''

''وہ تو میں واقعی ہو رہی ہوں۔ بات اسد کی ہو رہی تھی' یہ طوطا بیچ میں کہاں سے آ گیا؟''

''یہ ایک بڑا مزیدار واقعہ ہے۔'' عرفان نے قصہ گوؤں کے انداز میں سٹارٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہوا یوں کہ ایک بار میرے سائیکالوجی کے استاد پروفیسر منظور احمد اپنے نو دس سال کے بچے سے باتیں کر رہے تھے۔ بچے کے ساتھ پنجرے میں اس کا طوطا بھی تھا۔ اس اثناء میں منظور صاحب کے کچھ مہمان آ گئے اور وہ سب لوگ کسی سنجیدہ مسئلے پر بحث میں لگ گئے۔ بچہ تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر بور سا ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا مگر چند لمحوں بعد پھر آ گیا اور طوطے کا پنجرا اٹھا کر باہر کی طرف جانے لگا۔ اب کے منظور صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی' انہوں نے پوچھا۔ ''اسے کہاں لے جا رہے ہو بیٹا؟''

''یہ بھی بور ہو رہا تھا...... ابو' بچے نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں عام طور پر انڈین فلمیں نہیں دیکھتا کیونکہ ان میں بے موقع سیکس اور بے معنی تشدد کے علاوہ عام طور پر کچھ نہیں ہوتا' البتہ جب کچھ بہت معقول لوگ کسی فلم کی مسلسل تعریف کریں تو اسے دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں چنانچہ جب سعیدہ اور عرفان نے ''۳۶ چورنگی لین'' کی تیسری دفعہ تعریف کی تو میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ فلم ہندوستان کے مشہور فلمی خانوادے ''کپور فیملی'' کی تخلیق ہے اور اس میں مرکزی کردار اس کی میم بیوی جینفر نے ادا کیا ہے اور فلم بھی بزبان انگریزی ہے۔ موضوع' سکرین پلے' ٹریٹ منٹ' کردار نگاری اور ایکٹنگ...... ہر اعتبار سے یہ ایک عمدہ فلم تھی۔

فلم ختم ہوئی تو فلموں کے گرتے ہوئے معیار پر گفتگو شروع ہو گئی۔ ہم نے یاد کیا کہ ہماری طالب علمی کے دنوں میں ہر سال دس بارہ ہندوستانی اور تین چار پاکستانی فلمیں ایسی ضرور بنتی تھیں جنہیں ہر اعتبار سے عمدہ فلمیں قرار دیا جا سکتا تھا مگر اب جبکہ فلموں کی لاگت اور تعداد میں تقریباً دس سے پندرہ گنا اضافہ ہو چکا ہے' اچھی فلموں کی سالانہ اوسط ہندوستان میں پانچ چھ اور پاکستان میں بمشکل ایک تک گر چکی ہے۔ آخری نتیجہ یہی نکلا کہ اچھی فلم کی بنیاد موضوع اور سکرپٹ ہوتا ہے اور یہی دو شعبے ایسے ہیں جن کی طرف توجہ کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ دونوں ملکوں میں پروڈیوسر کی جگہ فنانسرز نے لے لی ہے چنانچہ اب فلم تخلیق نہیں ہوتی بلکہ بنائی جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی کمرشل پلازہ بنایا جاتا ہے اور یوں ایک سنجیدہ تخلیقی عمل ''لاٹری'' کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

عرفان کی موسیقی کا ذوق بہت اچھا ہے چنانچہ وہاں بھی اس نے ایک بہت خوبصورت آڈیو لائبریری بنا رکھی ہے۔ ایک اچھے کن رس کی طرح اسے اپنی پسند کے گانے اپنی مخصوص ترتیب کے ساتھ سنانے کا شوق ہے تاکہ فضا میں ایک خاص موڈ قائم ہو سکے اور بعد

میں آنے والا ہر گیت پہلے گیت کے تاثر میں اضافے کا باعث بنے۔ اس نے کیسٹوں کے انبار میں سے چن چن کر لتا' امانت علی خاں اور گیتا دت کے گانے منتخب کئے۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اللہ کی اتنی بڑی زمین اور اپنے وطن اور گھروں سے ہزاروں میل دور' اجنبی زمین اور غیر ہوا میں ہم چار آدم زاد ان گیتوں میں سانس لے رہے تھے جن میں ہماری زبان' مٹی' کلچر اور جذبوں کی مہک شامل تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمان اور مکان واقعی نظر کے دھوکے ہیں۔ ''وقت'' اقبال کے بقول سچ مچ زمانے کی ایک رو ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات!

میری اپنی آواز ایسی ہے کہ اگر باتھ روم میں بھی گاؤں تو گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض اوقات کسی آواز میں آواز ملا کر گانے کو جی چاہتا ہے۔ اب ظاہر ہے ایسی بے سری آواز کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوسکتی چنانچہ عام طور پر میں ایسے انداز میں گنگنا کر اپنا شوق پورا کر لیتا ہوں کہ ساتھ والے کو شبہ ہی رہے کہ میں گا بھی رہا ہوں یا نہیں۔ یہ تمہید دراصل اس گلوکاری کی ہے جس کا مظاہرہ میں نے اس رات قوالوں کے ''ہمنوا'' کے انداز میں کم و بیش تین گھنٹے تک کیا تھا۔ ہوا یوں کہ کسی دل کو چھو لینے والے گیت کے دوران پروین نے لتا کی آواز میں آواز ملائی۔ اس کی آواز نہ صرف معقول تھی بلکہ اسے سر کا شعور بھی تھا۔ چند لمحوں بعد عرفان اور سعیدہ بھی بالترتیب گانے اور گنگنانے لگے اور پھر یہ سلسلہ ایسا چل نکلا کہ اصل گانے والا/ والی پس منظر میں چلے گئے اور ''حاضر مال'' کی آوازیں حاوی ہونا شروع ہو گئیں۔ میں نے بھی حوصلہ کر کے بیچ میں کہیں کہیں اپنی اوقات کے مطابق آواز ملانا شروع کی۔ اب یہ ان لوگوں کی شرافت تھی یا ماحول کا اثر کہ مجھے نہ تو کسی نے ٹوکا نہ ہی بے سرے ہونے کا احساس دلایا۔ اس رات مجھے زندگی میں پہلی بار موسیقی کی قوت کا عملی تجربہ ہوا۔ انسان کے داخلی سر کا روح کائنات کے بنیادی سر سے کس قدر گہرا تعلق ہے اور غالب نے جو یہ کہا تھا کہ

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

تو دراصل وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ جدید مغربی موسیقی اور آرکسٹرا نے ہمارے گیتوں کے حسن کو کس بری طرح پامال کیا ہے اس کا اندازہ کرنا ہو تو کبھی چالیس اور پچاس کی دہائیوں میں بنے ہوئے گیت ایک ساتھ سن کر دیکھیے۔ دھیمے دھیمے' نرم و نازک' دکھی اور دل زدہ' سپردگی اور وارفتگی سے چھلکتے ہوئے' محبت اور سوز محبت سے لبریز...... یہ گیت آپ کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں ساری کائنات ایک عظیم سمفنی کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ ایک بے نام سی اداسی' ہمارے رگ و پے میں اترنے لگی۔

اچانک سعیدہ بھابی کی آواز بھرا گئی۔ اس نے گانا بند کر دیا اور بھیگی ہوئی آنکھوں پر آستین کا پردہ کر لیا۔ چند لمحوں تک کمرے میں صرف امانت علی خاں کی گہری دکھ بھری آواز گونجتی رہی۔ وہ یگانہ چنگیزی کی غزل گا رہا تھا۔

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

ٹیپ روک دی گئی' چند لمحے کوئی کچھ نہیں بولا لیکن ایسا تھا کہ خاموشی بول رہی تھی۔ انسان ہجوم اور تنہائی میں گزارہ کر لیتا ہے مگر اجنبی ہجوم اور پردیس کی تنہائی سہارے نہیں جاتے۔ عرفان اور سعیدہ نے بتایا کہ بعض اوقات وہ دونوں گھنٹوں اس کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ دن بھر کی رونق' مصروفیت' دنیاداری اور بھاگ دوڑ کے بعد ملنے والا یہ تخلیہ بہت قیمتی ہے مگر کبھی کبھی طبیعت ان رنگوں کو بھی دیکھنا چاہتی ہے جسے وہ ہزاروں میل دور چھوڑ آئے ہیں۔ اپنے پن کے اس ماحول میں ''اپنوں'' کی یادیں کچھ اور بھی زیادہ منہ زور ہو جاتی ہیں۔

''تم دونوں اپنے شعبے میں کوالیفائڈ اور ایکسپرٹ ہو اور پاکستان میں سائی کیٹری کا میدان ہنوز تقریباً خالی پڑا ہے' واپس کیوں نہیں آتے...... میرا خیال ہے وہاں تمہیں کوئی معاشی پریشانی نہیں ہوگی۔'' میں نے کہا۔

اس گفتگو کا رخ ایک ایسی سمت مڑ گیا جہاں بحث اور اختلاف رائے کی بے حد گنجائش تھی' سو وہی ہوا۔ تھوڑی دیر میں موسیقی کا جادو اور سعیدہ کے آنسو دونوں کہیں پیچھے رہ گئے اور ہم چار نام نہاد پڑھے لکھے دانشور تیسری دنیا' معاشرتی استحصال' معاشی بحران' اقداری خلا اور پتا نہیں کن کن باتوں پر علم و فضل اور مطالعے اور مشاہدے کے وہ موتی لٹانے لگے جن کے بدلے میں انسانی خوشی کے علاوہ سب کچھ مل جاتا ہے۔

اس بحث میں صبح کے چار بج گئے۔ یکدم مجھے یاد آیا کہ آٹھ بجے افتخار نسیم نے آنا ہے اور اس نے پورے دن کا لمبا چوڑا پروگرام بنا رکھا ہے چنانچہ اب کچھ دیر سو لینا چاہیے سو یوں یہ محفل ''جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا وہیں سے پھر ملاحظہ کیجئے'' قسم کے اعلان کے بعد اگلی رات تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

افتخار نسیم بنیادی طور پر شاعر ہے اور ستر کے عشرے کے ابتدائی چند سالوں میں اس کا نام اہم نوجوان شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ ''فنون'' کے جدید غزل نمبر میں اس کی دس غزلیں بھی چھپی تھیں مگر پھر ایک دم وہ منظر سے غائب ہو گیا۔ دو تین برس بعد اس کا شکا گو سے خط آیا کہ تلاش رزق میں معقول خواری کے بعد اب اس کے پاؤں زمین پر لگ گئے ہیں اور آج کل وہ مصرعوں کے بجائے آرڈر

پر بنائی جانے والی رولس رائس کاروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ چند برس پیشتر وہ پاکستان آیا تو اس نے بتایا تھا کہ یہاں قانون کی ڈگری اور فیصل آباد میں اس کے والد خلیق قریشی مرحوم کے چھوڑے ہوئے اخبار ''عوام'' کے باوجود اس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ گزشتہ ایک مہینے میں اس سے تین چار بار ٹیلیفون پر بات ہوئی تھی۔ اس کے لہجے کی اپنائیت' ملاقات کے اشتیاق اور پنجابی زبان کی مخصوص بے تکلفی سے اندازہ ہوتا تھا کہ امریکہ ابھی تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

جب عرفان نے مجھے جگا کر اس کے آنے کی اطلاع دی اس وقت پونے آٹھ بج رہے تھے۔ گویا وہ وقت مقررہ سے بھی پندرہ منٹ پہلے آ گیا تھا۔ میں کچی اور کم نیند کا غبار آنکھوں میں لیے نیچے اترا تو افتخار کچن میں آملیٹ بنانے کے مختلف طریقوں کی وضاحت کر رہا تھا۔ اس نے شکاریوں والی ایک برجس نما جین اور موٹی اون اور بند گلے کے ایک پل اوور کے اوپر بغیر بازوؤں کی لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں لانگ شوز اور سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ اس کا جسم مائل بہ فربہی تھا مگر چہرہ ''مائل'' کی حدوں سے نکل کر تکمیل کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ معانقے اور مصافحے کے دوران اس نے آملیٹ سازی کے فن پر اپنا لیکچر جاری رکھا۔ معلوم ہوا کہ امریکہ میں بیچلر لائف اور آملیٹ بنانے میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ کہ افتخار کو انڈے تلتے بارہ برس سے اوپر ہو گئے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''گویا تمہارے بارے میں دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ باریں برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیا ندا انڈہ''

سعیدہ نے کہا۔ ''یہ تو عورتوں سے زیادہ کچن کا کام جانتے ہیں۔''

''یہ سب امریکہ کی مہربانیاں ہیں۔'' افتخار نے کہا۔ ''جب میں یہاں آیا تھا تو مجھے چائے بھی نہیں بنانی آتی تھی اور اب میں دس پندرہ طرح کے کھانے بنا لیتا ہوں۔ آج رات آپ اس کا عملی مظاہرہ دیکھیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آج رات کا کھانا آپ لوگ میرے غریب خانے پر کھائیں گے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''کھانا کھانے پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا البتہ پکانے کا کام اگر تم اپنی بجائے کسی معقول....... میرا مطلب ہے کسی باقاعدہ قسم کے باورچی کو سونپ دو تو شاید زیادہ مناسب ہو۔ ہم مسافر ہیں اور یہ دونوں بیچارے بال بچے دار نوکری پیشہ لوگ ہیں' بیماری کی صورت میں ہم سب کا بہت ہرج ہوگا۔''

''تو گویا تمہارے خیال میں میں اچھا کک نہیں ہوں!''

اس جملے کے دوران پروین بھی کمرے میں آ گئی۔ اس نے آتے ہی ایک اجتماعی سلام کیا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے افتخار کا

تعارف کرواتا اس نے اسے اوپر سے نیچے دیکھا اور پھر حیران سا ہو کر سعیدہ سے بولی۔ ''آپ کو کک کی کیا ضرورت پڑ گئی بھابی!''

افتخار کا سلام کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ عرفان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب بولیے افتخار صاحب!''

ناشتے کے دوران اس صورت حال پر ہنسی مذاق ہوتا رہا مگر افتخار کچھ ایسا کانشس ہو گیا تھا کہ اس نے اس موضوع پر ہمارے پورے قیام کے دوران دوبارہ زبان نہیں کھولی۔ ناشتے میں ہم نے ایک بہت لذیذ ولایتی باقر خانی بھی کھائی جس کا فرنچ نام اگرچہ بہت مشکل تھا مگر ذائقہ اور شکل وصورت اپنی ہی طرف کی تھی۔ عرفان نے بتایا کہ یہ چیز اس نے پانچ چھ ملکوں کی بیکری کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد دریافت کی ہے۔ ناشتے کی میز پر ماحول ایک دم اس قدر گھریلو سا ہو گیا کہ مجھے اپنے گھر کی یاد اور بھی شدت سے آنے لگی۔ گزشتہ ٹیلیفون کے دوران میں فردوس نے بتایا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اپنے میکے یعنی میرے سسرال جا رہی ہے چنانچہ میں نے وہیں کا نمبر گھمایا۔ شکاگو سے کراچی گیٹ وے ایکسچینج' وہاں سے لاہور کا کوڈ اور وہاں سے گھر کا نمبر...... کوئی چودہ ہندسوں کا چکر تھا مگر ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ادھر گھنٹی سنائی دینے لگی۔ میں نے سوچا ہمارے یہاں بھی یہی مشینیں نصب ہیں مگر پتا نہیں کیوں گڑھی شاہو سے گارڈن ٹاؤن ملانے بیٹھو تو چھ ناکام کوششوں اور چار رانگ نمبروں سے گزرنا پڑتا ہے' درمیان میں چلنے والی کراس ٹاک اس کے علاوہ ہے۔

فردوس اور بچوں سے بات کرنے کے بعد طبیعت مزید تر و تازہ ہو گئی۔ افتخار نسیم ہمارے لیے ایک لمبا چوڑا پروگرام بنا کر لایا تھا۔ اس نے روئے سخن پروین کی طرف رکھتے ہوئے بتایا کہ وہ دو دن دفتر سے مکمل چھٹی کر رہا ہے تاکہ یکسوئی سے ہماری میزبانی کر سکے۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا کہ پروین اس کے بے تکلفانہ انداز سے ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی اور عین ممکن ہے وہ ایک دم کوئی سخت بات کہہ دے۔ میں نے دو تین زبردستی کے لطیفے سنا کر ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ پروین نے اپنی پرانی کولیگ نجمہ حق کا نمبر ملایا' اس سے شام کی سیر اور رات کے کھانے کا پروگرام فائنل کیا اور افتخار کو سناتے ہوئے مجھے اطلاع دی کہ اس کا ہمارا ساتھ سہ پہر تین بجے تک کا ہے اور اس دوران میں چونکہ وہ صرف شکاگو کا مشہور آرٹ سنٹر دیکھنا چاہتی ہے اس لیے افتخار صاحب کے بنائے ہوئے پروگرام سے اس کی معذرت قبول کی جائے۔

افتخار کے چہرے کے مسکراہٹ ایک دم مدھم پڑ گئی۔ اس نے ایک زخم خوردہ ہرن کی طرح میری طرف دیکھا۔ میں نے سفارتی قسم کی گول مول زبان کے ذریعے حالات کو معتدل بنانے کی کوشش کی اور تجویز پیش کہ افتخار کا بنایا ہوا پروگرام بالکل اسی طرح ہم کل پر لے جاتے ہیں۔ پرامن بقائے باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے سب نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور یوں ایک متوقع

ناپسندیدہ صورت حال پر قابو پالیا گیا۔

افتخار نسیم تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد یہ کہہ کر چلا گیا کہ موجودہ صورت حال میں اس کا دفتر سے چھٹی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے وہ کام پر جاتا ہے تاکہ آج کی چھٹی کو پرسوں استعمال کر سکے۔ سعیدہ بھابی نے بھی اسی فارمولے پر عمل کیا چنانچہ آرٹ سنٹر کی یاترا میں ہمارے ساتھ صرف عرفان ہی رہ گیا۔

تاریخ کی زمانی کمی کی وجہ سے امریکہ کی تہذیب میں گہرائی نسبتاً کم ہے۔ امریکن قوم نے اس کمی کو چھپانے یا شاید اس سے نظر چرانے کے لیے بلندی اور پھیلاؤ میں پناہ لے رکھی ہے۔ ان کے شہر بہت بڑے بڑے اور عمارتیں بہت اونچی اونچی ہیں۔ لیکن کسی چیز کی عمر دو تین صدیوں سے زیادہ نہیں۔ وہاں کے آثار قدیمہ کئی دوسری تہذیبوں کے زندہ حصے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے تہذیبی اور تاریخی مراکز' میوزیم اور آرٹ گیلریاں اپنی مثال آپ ہیں۔ ایسی کسی بھی عمارت میں چلے جایئے نوادرات کا ایک خزانہ آپ کا منتظر ہوگا۔

مشرق اگرچہ بہت سی عظیم تہذیبوں کا گہوارا ہے لیکن اس کے حسن کو ''سحر'' کے درجے تک پہنچانے میں سب سے زیادہ ہاتھ مسلمانوں ہی کا ہے۔ چینی' ہندوستانی اور مصری تہذیبیں ہزاروں سال پرانی سہی لیکن یہ اپنے اپنے مخصوص زمانی اور مکانی دائروں سے باہر نہیں نکل سکیں۔ اس کے علاوہ ان کے مظاہر میں روح اور جسم کی ثنویت بھی ہمیشہ دو الگ اور باقاعدہ اکائیوں کی شکل میں نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ فرق اس وقت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے جب آپ کسی وقیع اور بھرے پرے میوزیم میں ماضی کو اس کی حنوط شدہ حالت میں دیکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا ذوق جمال' جذبہ توحید اور عظمت انسان کا تصور بہت سی ذیلی خصوصیات کے ساتھ ان کی تہذیب کے ہر پہلو میں روشن نظر آتا ہے۔ پھر اس سے قطع نظر کہ میرا تعلق مسلمان قوم سے ہے میں بطور انسان پوری ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اس کرہ ارض پر انسانیت نے آج سے چودہ سو برس پہلے جو موڑ کاٹا تھا وہ اس راستے کا آخری موڑ تھا جہاں سے منزل بالکل سامنے اور صاف دکھائی دیتی ہے۔''

اب اس بحث میں پڑے بغیر کہ منزل سامنے ہونے کے باوجود مسلمانوں نے بالخصوص اور باقی دنیا نے بالعموم کہاں کہاں اور کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں میں واپس شکاگو کے آرٹ سنٹر میں آتا ہوں' جہاں ''ہندوستان'' کے شعبے میں قرآن مجید کے بہت سے نادر نسخے اور عربی اور فارسی کی گراں بہا کتابیں رکھی ہوئی ہیں اور آرٹ سنٹر کا ایک سیہ فام نگران سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے۔

شیشے کے اندر کی گئی گل کاری کے حیرت انگیز نمونوں کو دیکھتے ہوئے پروین کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے نگران پر ایک طیش بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہمیں چور سمجھتا ہے' اس وقت ہمارے ہی پیچھے لگا ہوا ہے۔''

''ناراض کیوں ہوتی ہو؟ ہوسکتا ہے تمہاری شاعری کا فین ہو۔ آخر تمہاری نظموں کے انگریزی ترجمے بھی تو چھپے ہیں' ممکن ہے کوئی یہاں بھی پہنچ گیا ہو اور اس نے پڑھ لیا ہو۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا...... میری شاعری آثار قدیمہ میں سے ہے؟''

''نہیں...... آثار قدیمہ تو یہ لوگ بہت چھان پھٹک کر منتخب کرتے ہیں۔ کیوں عرفان؟''

عرفان نے مسکرا کر سر ہلایا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ پروین عام طور پر جملہ ادھار نہیں رکھتی لیکن اس وقت شاید وہ سچ مچ اس نگران کی خصوصی توجہ سے ان ایزی ہو رہی تھی' اس نے میرے حملے کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک بار پھر اس آبنوس کے شہتیر کو گھورا اور بولی۔ ''بھئی مجھے تو گھبراہٹ ہو رہی ہے...... چلئے' چلتے ہیں۔''

''ابھی تو یہاں بہت سے چیزیں دیکھنے والی ہیں' آیئے تصویروں والے حصے میں چلتے ہیں۔'' عرفان نے جلدی سے کہا۔

''اور اگر یہ وہاں بھی پہنچ گیا...... پھر؟''

''پھر جیسا آپ کہیں گی...... وہی کریں گے۔''

لیکن اس جم براؤن کے ہم شکل کی ڈیوٹی غالباً اسی علاقے میں تھی کیونکہ اس کے بعد وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ آرٹ گیلری میں زیادہ تر تصویریں جدید مصوروں کی تھیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ پینٹنگ کے ساتھ کسی نامور استاد کا نام بھی لکھا تھا لیکن ایسی تصویریں بہت کم تھیں جنہیں دیکھ کر مصور کا نام معلوم کرنے کی آرزو ہو۔ ممکن ہے اس کا سبب میرے ذوق کی کمی ہو لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ ہر بڑا فن پارہ کسی نہ کسی سطح پر عوامی ضرور ہوتا ہے۔ بڑی تخلیق عام ذہن سے بلند تر تو یقیناً ہوتی ہے مگر اس سے ماوراء نہیں ہوتی۔ درخت کتنا بھی بڑا اور خوبصورت کیوں نہ ہو اس کی جڑیں بہر حال زمین ہی میں ہوتی ہیں۔ بڑے غلام علی خاں کی گائی ہوئی ٹھمری ہو یا بیتھوون کی سمفنی' غالب کی غزل ہو یا ملٹن کی ''جنت گم گشتہ'' مائیکل اینجلو کی کلاسیکل نقش گری ہو یا پکاسو کی تجریدیت' ارسطو کا فلسفہ ہو یا اقبال کا پیغام' کشف المحجوب ہو یا مارکس کی داس کیپیٹال...... ہر عظیم چیز کی بنیاد میں بنی نوع انسان کا کوئی نہ کوئی مشترکہ درد یا خواب ضرور ہوتا ہے!

فنون لطیفہ میں ہیئت کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور انہیں ہوتے رہنا چاہیے۔ لیکن اس عمل کے دوران ابلاغ ہی عنقا ہو جائے تو

محض جدید کہلوانے کے شوق میں اس چیز سے سمجھوتہ نہیں کر لینا چاہیے۔اس سلسلے میں بہترین رویہ وہی ہے جو اقبال نے پیش کیا ہے۔

اے اہل نظر' ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے' وہ نظر کیا

بات کسی اور طرف نکل گئی' دراصل میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ کینوس پر کھینچی ہوئی ہر لکیر اور بکھرے ہوئے ہر رنگ سے شاہکار تخلیق نہیں ہوتے۔ یہاں رکھی ہوئی بہت سی تصاویر ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر سید محمد جعفری کا مشہور عام مصرعہ ذہن میں گونج جاتا تھا۔

''میں اناس جسے سمجھا تھا وہ عورت نکلی!''

ایک بڑے سے ہال میں کچھ لڑکے لڑکیاں' اردگرد اور اپنے آپ سے بے خبر' تصویر کاری میں مصروف تھے۔ان نومشقان ناز میں سے کچھ کا تعلق خود عالم تصویر سے تھا اور کچھ وہ تھے جنہیں ''تصویر بنا آتی ہے'' ایک چہرہ تو ایسا تھا کہ بس دیکھتے ہی رہیے مگر پروین کی تیز فہمی اور ہوٹنگ کا خوف ایسا تھا کہ میں اس پر تیسری نظر نہیں ڈال سکا۔ طالب علمی کے دنوں میں ایک غزل کا شعر یاد آ رہا ہے۔

یوں اگر سوچوں تو اک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرہ کہ پھر بھی آنکھ میں بنتا نہیں!

میری غزلوں میں یہ واحد شعر ہے جس میں ''ہائے'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مجھے ہائے' اف' آہ اور اللہ سے شروع ہونے والے مصرعے زہر لگتے ہیں مگر پتا نہیں کیوں میں اس شعر کو باوجود کوشش کے اپنے کلام سے خارج نہیں کر سکا۔ نہ جانے کیا فرماتے ہیں مفتیان عقل بیچ اس مسئلے کے؟

امریکن فاسٹ فوڈ میں اگر چہ بہت سی الم غلم چیزیں ملتی ہیں لیکن ہماری دوڑ بنیادی خوراک یعنی برگر اور کوک تک محدود تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس میں کافی کا اضافہ کر لیا جاتا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب کی کسی اور چیز میں اٹکا ہو تو ہو ان کی خوراک سے ہماری دوستی نہ ہو پائی چنانچہ دوپہر میں جب عرفان ہمیں ریستورانوں کے مشہور سلسلے ''برگر کنگ'' کی ایک قریبی شاخ میں لے گیا تو معقول بھوک کے باوجود میں چند لقموں سے زیادہ نہ کھا سکا۔ اشفاق احمد ''تلقین شاہ'' کے حوالے سے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔''ہدایت! تمیں ترقی نہیں کرنی!''

ہم پروین کو نجمہ حق کی طرف چھوڑنے گئے تو وہاں افتخار نسیم پہلے سے موجود تھا۔ معلوم ہوا شکاگو چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو

پاکستانی برادری بہر حال مختصر ہے۔ گفتگو کے دوران پتا چلا کہ ہماری میزبان اپنے شوہر اور بچوں سمیت چند دنوں بعد پاکستان منتقل ہو رہی ہیں۔ نجمہ حق بڑی تیز طرار، چست اور میٹر آف فیکٹ قسم کی خاتون تھیں۔ برسوں کی پروفیسری کی وجہ سے ان کی گفتگو میں ایک مخصوص قسم کی اتھارٹی کا احساس مستقل جگہ بنا چکا تھا۔ ان کی طبیعت میں انتظام اور سلیقہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا چنانچہ انہوں نے فوراً پروین کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اسے امریکہ میں شاپنگ کے موسم اور طریقوں پر اتنا مفصل لیکچر دیا کہ شام کا کھانا آدھی رات پر جا پڑا۔ تنگ آ کر میں نے پروین کو استعارے کی زبان میں صورت بدحال سے آگاہ کیا۔

''پروین، وہ کیا مصرعہ ہے ضمیر جعفری صاحب کا، طبیعت نا ملائم، مستقل استانیوں جیسی۔ بھئی اس میں ''مستقل استانیوں'' کا جواب نہیں۔''

اس نے فوراً بات پک کر لی، میرے قریب سے گزرتے ہوئے آواز دبا کر بولی۔ ''مستقل استانی تک تو ٹھیک ہے مگر طبیعت کو آپ نا ملائم نہیں کہہ سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''اب مصرعہ تو پورا ہی پڑھنا پڑتا ہے نا۔''

کھانے کے بعد افتخار نے آئیڈیا دیا کہ کافی اس کے اپارٹمنٹ میں پی جائے۔ ہم سب تیار ہو گئے۔ افتخار کے اصرار پر نجمہ حق اینڈ کمپنی بھی مان گئے مگر پروین بیگم نے تھکن اور نیند کا عذر پیش کر کے اپنے آپ کو اس پروگرام سے بھی غیر حاضر قرار دے دیا۔ اس کی وجہ سے نجمہ لوگ بھی آؤٹ ہو گئے۔ اب لے دے کے میں اور عرفان باقی رہ گئے تھے اور ہمیں ابھی پچاس میل کا پینڈا کر کے جولیٹ پہنچنا تھا چنانچہ ہم نے بھی دبے لفظوں میں کچھ معذرت نما کی اور وعدہ کیا کہ کل جب کھانے پر اس کے گھر آئیں گے تو کافی کی دو دو پیالیاں پی کر حساب برابر کر دیں گے۔

افتخار کے پاس صبر کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا چنانچہ اس نے صبر کیا۔ ہم نے پروین کو نجمہ حق کے سپرد کیا تا کہ وہ اگلی صبح اپنی شاپنگ کر لے اور خود جولیٹ کی راہ جہاں سعیدہ بھابی ہمارے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔

کٹ ہی گئی جدائی بھی، کب یہ ہوا کہ مر گئے
تیرے بھی دن گزر گئے، میرے بھی دن گزر گئے

Lake Shore کے کنارے ایک عمارت کی چالیسویں منزل پر واقع افتخار نسیم کے خوبصورت اپارٹمنٹ کی کھڑکیوں سے شکاگو شہر کو دیکھتے ہوئے پتا نہیں کیوں مجھے عدیم ہاشمی کا یہ شعر بہت یاد آ رہا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ ابھرنے والے نوجوان شاعروں

میں عدیم ہاشمی کا ایک بہت اہم نام تھا۔اس کی غزل ایک نئے اور منفرد لہجے کی آئینہ دار تھی۔ادبی حلقوں میں اس کی شہرت ہر آنے والی غزل کے ساتھ مزید مستحکم ہو رہی تھی مگر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔پتا چلا کہ تلاش روزگار کے سلسلے میں امریکہ چلا گیا ہے اور اسے وہاں بلانے میں افتخار نسیم کا ہاتھ ہے جو اس کا رشتے کا بھانجا لگتا ہے۔چند برس پہلے اس کا ایک خط آیا تھا جس میں سلام دعا' خیریت کی اطلاع اور چند ادھر ادھر کی باتیں تھیں مگر اس کا پتا درج نہیں تھا۔اس کے بعد اس کی بیوی سمیت کسی کو اس کا پتا نہ تھا۔افتخار نے ہچکچاتے ہوئے بتایا کہ وہ اس کے پاس چند مہینے رہا تھا مگر پھر کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ وہ یہاں سے بتائے بغیر کہیں چلا گیا اور اب پتا نہیں کہاں ہے! میں نے محسوس کیا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔میں نے بڑے دکھ سے سوچا' کیسے کیسے اچھے ذہن دنیا داری کی اس آگ کے خس وخاشاک ہو جاتے ہیں اور یہ وقت کیسا ظالم ہے کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی کہ کون کہاں رہ گیا ہے؟

افتخار کا اپارٹمنٹ اس کے بیچلر ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ہر طرف بکھری ہوئی کتابیں' تصویریں' ویڈیو کیسٹ' انسانی اجسام کی اور یجنل حالت میں لی ہوئی تصویروں سے بھرے ہوئے رسالے' برتن' کپڑے' فرنیچر غرضیکہ ہر چیز ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہی تھی۔دو بہت پلی ہوئی نیم ناراض بلیاں بستر سے غسل خانے تک ہر جگہ انتہائی بے تکلفی سے آجا رہی تھیں۔باتوں باتوں میں عدیم کے ایک اور شعر کا ذکر آیا۔

بچھڑ کے تجھ سے نہ دیکھا گیا کسی کا ملاپ
اڑا دیے ہیں پرندے شجر میں بیٹھے ہوئے

افتخار نے کہا۔''میں آج کل ہجرت کے موضوع پر ایک ناول لکھ رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔''اب یہ موضوع بہت پرانا ہو گیا ہے اور پھر یہ تجربہ تو انتظار حسین کی نسل کا ہے' تم اس پر کیا لکھو گے؟''

بولا۔''میں ۱۹۴۷ء کی ہجرت کی نہیں سات سمندر پار کی اس ہجرت پر لکھ رہا ہوں جس میں روٹی اور گرین کارڈ کا جلوہ ہم جیسوں کو اپنی زمینوں سے کھینچ کر کشاں کشاں یہاں لے آتا ہے۔یہ ناول میں انگریزی میں لکھ رہا ہوں اور اس میں ہجرت زدگان کی مختلف قسمیں ڈسکس ہوں گی۔وہ جو چاہنے کے باوجود ہجرت نہ کر سکے' وہ جو یہاں آئے مگر اس مٹی نے ان کے پاؤں نہیں پکڑے اور وہ گھروں کو لوٹ گئے اور وہ جو اپنی کشتیاں جلا کر یہاں بیٹھ گئے ہیں' امریکہ امریکہ کرتے خود امریکہ ہو گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔''تم کس گروہ میں آتے ہو؟''

ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔''تیسرے میں۔''

میں نے کہا۔ ''اپنے ناول میں ان افراد اور خاندانوں کے بارے میں بھی لکھنا جن کی بیٹیاں یہاں جوان ہو رہی ہیں۔ ان کے والدین کے آنسو بھی دکھانا جو راتوں کو تکیوں میں منہ دے کر روتے ہیں۔ اس نوجوان نسل کے دکھ بھی لکھنا جو صرف حال کے لمحے میں زندہ ہے نہ اس کا کوئی ماضی ہے اور نہ مستقبل۔ ان کے والدین ان کے جسموں کو امریکہ میں اور روحوں کو پاکستان میں زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ ناممکن ہے۔ آپ لاکھ گرین کارڈ کا لالچ دے کر پاکستان سے لڑکوں کو بلائیں اور ان سے ان لڑکیوں کی شادیاں کریں یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ جس طرح ہر کل جزو کو کھا جاتا ہے اس طرح امریکی معاشرہ بھی آپ کو آپ کے خوابوں اور آرزوؤں سمیت نگل جائے گا۔ اگر آپ اس کے معدے میں زیادہ شور مچائیں گے تو وہ آپ کو چبائے ہوئے پان کی طرح تھوک دے گا اور آپ ساری زندگی اپنی تنہائی کے ڈسٹ بن میں پڑے سڑتے رہیں گے۔''

افتخار نے میری باتیں بہت توجہ سے سنیں اور بتایا کہ ان میں سے بہت سی باتیں پہلے سے اس کے خاکے میں شامل ہیں' وہ کوشش کرے گا کہ باقی کے پوائنٹ بھی اپنے پلاٹ میں شامل کر سکے۔

رات کے کھانے کی تیاری کے لیے افتخار نے عدیم کی بہن اور اپنی خالہ کی فیملی کو بطور ہیلپر بلوایا تھا۔ ان کے آتے ہی سب لوگ کچن میں گھس گئے اور مجھے وی سی آر کے سپرد کر دیا گیا۔ میری نظر مائیکل جیکسن کے تازہ اور ریکارڈ توڑ ویڈیو ''تھرلر'' پر پڑی۔ امریکہ کی نوجوان نسل (متاثرین امریکہ سمیت) مائیکل جیکسن اور اس کی موسیقی کی دیوانی ہے اور اس کا نام امریکہ میں سب سے زیادہ لیے جانے والے چند ناموں میں سے ہے۔

پلے بیک گائیکی نے بیک وقت سماعت اور بصارت کی صدیوں پرانی روایت کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ آڈیو ٹیپ کے باریک اور بدرنگ فیتے سے جو آواز نکلتی ہے اس میں گانے والے کی مکمل شخصیت نمایاں نہیں ہو پاتی۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ' آنکھوں اور ہاتھوں کے انداز اور گلوکار کے وجود کی انفرادی کشش سے آواز کے تاثر میں جو رنگ پیدا ہوتے ہیں وہ آڈیو ٹیپ یا گراموفون ریکارڈ میں منتقل نہیں ہو سکتے۔ اہل مغرب نے اس راز کو بہت جلد پا لیا چنانچہ وی سی آر کے ساتھ ہی گلوکاروں کے شوز اور آئٹمز پر مشتمل وڈیو کیسٹ بننے شروع ہو گئے اور اب تقریباً ہر امریکی گھر میں یہ کیسٹ آپ کو ضروری سامان کی طرح موجود ملتے ہیں۔ میں نے مائیکل جیکسن کو تو بہت کم دیکھا اور سنا تھا لیکن اس کے بارے میں بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا تھا۔ فرسٹ ہینڈ نالج کی اس کمی کو دور کرنے کے لیے میں نے سب سے پہلے ''تھرلر'' کا کیسٹ لگایا۔ بیس پچیس منٹ کی اس ویڈیو فلم میں جنوں' بھوتوں اور بدروحوں کے درمیان مائیکل جیکسن (جس کی صورت کسی طور پر بھی قابل رشک نہیں کہی جا سکتی!) طرح طرح کے لباسوں اور گٹ اپ میں گاتا کم اور ناچتا زیادہ پھر رہا تھا۔ اس کی آواز بلاشبہ بہت اچھی ہے مگر آرکسٹرا کے شور اور رقص کی وحشت میں اس کی طرف بہت کم دھیان جاتا تھا۔ فلم

ختم ہونے کے بعد میں بہت دیر تک پریشان رہا کہ اس ''وحشت زدگی'' کے سپرہٹ ہونے اور کریز بننے کے پس پردہ کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ کیا ساری کی ساری امریکی قوم نیم پاگل ہو چکی ہے؟ ان کی سائنس فطرت کو تسخیر کرتے کرتے ''انسان'' کو روندتی ہوئی اسے ایک ایسی منزل پر لے آئی ہے جہاں موت' دہشت' بدروح' انہونی کا خوف' تشدد اور چہروں کی بے چہرگی کے سوا انہیں کچھ نظر نہیں آتا' ان کی روحوں میں یہ کیسا خوف بھر گیا ہے کہ وہ بدصورتی کے ''معمول'' بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم تیسری دنیا کے لوگ تو چلو تاریخ کی جبریت' ذہنی و جسمانی غلامی' استعمار اور استحصال کے مارے ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے پیدا شدہ بدصورتیوں میں اس لیے مبتلا ہیں کہ یہ فی الوقت ہمارے مقدروں کی تحریر بن چکی ہے لیکن اس پہلی دنیا کے کھاتے پیتے' آزاد اور باوسائل معاشرے کو کیا ہوا ہے؟ یا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ ابن آدم کے سارے عذاب سانجھے ہیں' فرق صرف ناموں اور لفظوں کا ہے؟ پھر یہ سوال بھی ذہن میں آئے گا کہ ہمارے دکھ سانجھے ہیں تو سکھ کیوں مشترک نہیں ہیں۔

''تھرلر'' نے مجھے کچھ ایسا مایوس اور پریشان کیا کہ میں نے سارا ولایتی مال اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور دیسی سامان میں سے دلیپ کمار اور وجنتی مالا کی فلم ''مدھومتی'' تلاش کر کے لگا دی۔ فلم تو خیر واجبی سی تھی مگر اس کا میوزک بہت اچھا تھا۔ فلم کے دوران میں ہی باقی مہمان پہنچ گئے۔ افتخار کا خیال تھا کہ کھانے کے بعد شعروشاعری کا دور چلایا جائے لیکن اسد کو بہت تیز بخار تھا جس کی وجہ سے عرفان اور بھابی خاصے پریشان تھے چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ اس محفل کو بشرط زندگی کسی آئندہ ملاقات پر ملتوی کر دیا جائے۔

اگلا دن امریکہ میں ہمارا یعنی ہمارے قیام کا آخری دن تھا۔ پروین نے تو عقل مندی سے کام لیتے ہوئے مختلف مواقع پر وقت نکال نکال کر اپنی خریداری کی فہرست کا خاصا حصہ مکمل کر لیا تھا مگر اب جو میں نے فیملی اور دوستوں کے لیے تحفوں اور مختلف فرمائشوں کی تعداد پر نظر ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو خاصا لمبا کام ہے۔ پروین سے مشورہ کرنا اس لیے مناسب نہیں تھا کہ وہاں ''ایک ایک جملے کا مجھے دینا پڑا احساب'' کا خطرہ تھا۔ صبح صبح اٹھ کر اور یہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد کہ اب اسد کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے' میں نے عرفان اور بھابی کے سامنے یہ گھمبیر سمسیا رکھی اور بزبان حال پکار کر کہا۔ ''سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے۔''

سعیدہ نے کہا۔ ''یہ شاپنگ تو آپ کو کینیڈا میں کرنی چاہیے تھی' وہاں چیزیں امریکہ سے سستی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سستی مہنگی کا معمہ تو گزشتہ ایک مہینے سے حل نہیں ہو رہا۔ پہلے خیال تھا سفر کے آخر میں لندن سے خریداری کریں گے مگر اس پر اجماع امت ہو گیا کہ وہاں چیزیں زیادہ مہنگی ہیں۔ کینیڈا میں احباب سے پوچھا تو ان کا ووٹ امریکہ کی طرف تھا' اب آپ کہہ رہی ہیں کہ کینیڈا بہتر تھا۔''

عرفان نے کسی سالخوردہ اور گرگ باراں دیدہ قسم کے ڈپلومیٹ کی طرح ایک ایسا جواب دیا جس کا کچھ بھی مطلب نکالا جا سکتا

تھا۔ میں نے کہا۔ ''یار مجھے مزید کنفیوژ نہ کرو کوئی حل بتاؤ۔''

سعیدہ نے میرے ہاتھ سے فہرست پکڑی' مختلف چیزوں کے بارے میں مجھ سے ضروری وضاحتیں حاصل کیں' پھر اس فہرست کو تین حصوں میں تقسیم کیا' ایک کاغذ اپنے پاس رکھا' دوسرا عرفان کو دیا اور تیسرا مجھے دیتے ہوئے بتایا کہ یہ چیزیں تو آج دن میں افتخار نسیم کے ساتھ شکاگو کی سیر کرتے ہوئے بھی خریدی جا سکتی ہیں۔ اس دوران میں عرفان کا ایک بھانجا اور بھانجی جو اس کے قریب ہی رہتے ہیں اور آپس میں شادی شدہ ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کے کزن بھی ہیں' آ گئے۔ ناشتہ بے حد دیسی اور انتہائی مزیدار تھا چنانچہ پراٹھے کھانے کے دوران اس قدر ناسٹلجک قسم کی گفتگو کی گئی کہ افتخار کے آنے تک میز پانی پت کے میدان کا نقشہ پیش کر رہی تھی اور ہم سب افراط خوراک کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے۔

افتخار پورے دن کا شیڈول بتانے لگا تو پروین نے اطلاع دی کہ اس نے پورے سفر میں نجمہ حق سے بہتر گائیڈ اور شاپنگ کی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص نہیں پایا اس لیے وہ سب سے پہلے اس سے مل کر اپنی نامکمل شاپنگ مکمل کرے گی اور اس کے بعد کہیں اور جائے گی۔ اس الٹی میٹم کا سیدھا سیدھا مطلب یہ تھا کہ سہ پہر تک کا پروگرام تو کینسل ہی ہو گیا ہے اس کے بعد کی بات بھی کم و بیش مشکوک ہی سمجھی جائے۔ افتخار کا یہ شبہ کہ پروین جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہی ہے اب یقین کی حدوں کو چھونے لگا تھا لہٰذا اس نے اشارے کنائے چھوڑ کر براہ راست مجھ سے شکوہ کیا۔ میں نے بات ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر جب وہ اپنی گردان سے باز نہ آیا تو مجھے مجبوراً اسے سمجھانا پڑا کہ پروین شاکر اپنی شاعری میں لاکھ بولڈ اور بے جھجک سہی لیکن انگریزی میں ایم اے کرنے یا مردوں کے دوش بدوش اعلیٰ ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک باشعور اور ذمہ دار خاتون بھی ہے۔ اس کی ایک اپنی شخصیت اور پسند ناپسند کا معیار ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر پاکستانی ماحول کی پیداوار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم دل سے اسے اپنی مہمان اور منفرد ادبی شخصیت سمجھ کر یہ ساری آؤ بھگت کر رہے ہو مگر امریکہ میں اتنے برس رہنے اور یہاں کی عورتوں سے گفتگو کرنے کی وجہ سے تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا کہ تمہارا انداز' جو اگرچہ مبنی بر خلوص ہے بعض اوقات خاصا بے تکلفانہ ہو جاتا ہے اور یہ خاتون ذرا ریزرو قسم کی ہے۔

کہنے لگا۔ ''کمال ہے یار' پچھلے سال کشور ناہید بھی یہاں آئی تھی' اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی' ہر جگہ ہمارے ساتھ جاتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''اب ہر شاعرہ تو کشور ناہید نہیں ہو سکتی اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ کشور ناہید سے تمہارا پہلے سے تعارف تھا' وہ تمہاری سینئر بھی تھی اور دوست بھی' اوپر سے اس کی طبیعت بھی کھلی ڈلی ہے جب کہ پروین کا مزاج اس سے بہت مختلف ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے تم صلاح الدین محمود سے توقع کرو کہ وہ دلدار پرویز بھٹی کی طرح باتیں کرنے لگیں۔''

''تمہاری یہ تشبیہ میں کشور تک ضرور پہنچاؤں گا۔'' افتخار نے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

''اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ اس بات کا برا مانے گی تو تم غلطی پر ہو ناراض تو وہ تب ہوتی اگر میں اسے صلاح الدین محمود سے تشبیہ دیتا۔''

فوڈ اینڈ فلیور نامی ہندوستانی ریستوران میں دوپہر کا کھانا نجمہ حق کے مشورے سے کھایا گیا۔ تمام ڈشیں چکھنے کے بعد میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے آہستہ سے پروین سے کہا۔ ''اگر نجمہ بی بی کی پسند ایسی ہی ہے تو اپنی شاپنگ کا اللہ ہی حافظ سمجھو۔''

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے بتایا کہ اچار کی چھوٹی سی پلیٹ' جو میں نے نہیں چکھی تھی' اچھی تھی۔

افتخار نسیم مجھے سیئرز ٹاور دکھانے لے گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ اللہ لوک اور خدا رسیدہ عمارت ہے کیونکہ اس کی چھت سے آسمان تک کا فاصلہ کم سے کم پڑتا ہے۔

میں نے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ بیچاری تو ڈیموٹ ہوتے ہوتے اب کہیں دسویں نمبر پر جا پڑی ہے۔ بلندی کے اعتبار سے کینیڈا کے سی این ٹاور کے بعد یہ دنیا کی دوسری بلند ترین عمارت ہے لیکن اس کو سی این ٹاور پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ صرف دکھاوے کی چیز اور مانومنٹ ہے جبکہ یہ ایک رہائشی' تجارتی اور کاروباری مرکز ہے اور اس کی تعمیر غالب کے اس مصرعے کے حوالے سے کی گئی ہے۔ ''یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا''

سیئرز ٹاور کی ایک سو چالیسویں منزل پر کھڑے ہو کر ہم نے شکاگو شہر پر شام کے اترنے کا منظر دیکھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا رش بڑھ گیا تھا۔ اور تاریکی کے ابتدائی حملے سے سنبھلنے کے بعد اب چاروں طرف روشنیاں تیرنے لگی تھیں اور تمام مناظر اپنی اصلی شکلیں کھو کر یک رنگ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ سوچا یہ جدید شہر بھی آگ کے اس گولے کی طرح ہیں جسے کوئی شعبدہ باز بار بار منہ سے نکالتا اور نگلتا رہتا ہے' کئی برس پہلے میں نے اپنے شہر کی کہانی لکھی تھی۔

سحر اور رات کی اس بے عمل مصروفیت میں
شہر کی تاریخ بنتی ہے
سینما گھر' کلب' ہوٹل' ادب' اخلاق' شہرت اور سیاست کے
منافع بخش کاروبار چلتے ہیں
کوئی دیکھے تو سارا شہر جیسے فلم کی شوٹنگ میں کھویا ہے

''ہدایت کار'' سے سیٹ پر کھڑے ''شوقین چہروں'' کی طرح
ہر شخص ''اوکے'' کی صدا کے سحر میں محصور ہے
جیسے ''پیک اپ'' کی گھڑی ہی منزل مقصود ہے
جیسے سب کچھ اس کہانی کے سوا بے سود ہے

اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ روئے زمین پر بسنے والے سارے شہر ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں اور ان بے شمار منظروں کا پس منظر ایک سا ہے۔ ایک ہی ازل گیر وابد تاب تنہائی ہے جو کبھی بھیڑ کی شکل میں جلوہ نما ہوتی ہیاور کبھی دکھ کی چادر اوڑھ کر کسی بڑ کے نیچے چلہ کاٹنے لگتی ہے۔ پیٹ کی بھوک ہو یا روح کی پیاس دونوں اپنی اپنی جگہ اٹل حقیقتیں ہیں۔ کہیں اناج کی فراوانی ہے اور کہیں احتیاج کی۔ شام صرف ایک وقت ہی نہیں ایک کیفیت کا بھی نام ہے۔ ستاروں اور چراغوں کے جلنے سے کچھ دیر پہلے' دن بھر کی مشقت سے تھکے ہوئے لہو میں جو ایک اداسی سی تیرتی ہے وہ روح کے بے لفظ رجسٹر کے سوا کہیں درج نہیں ہوتی' نہ یہ کسی ایکسرے مشین سے نظر آتی ہے اور نہ انجیو اور کارڈیو گرافی میں کہیں اس کا کوئی ریکارڈ ہوتا ہے۔

شکاگو کی بلند و بالا اور زندگی کی آسائشوں سے معمور عمارتوں' فراخ سڑکوں پر رینگتی ہوئی بڑی بڑی موٹروں اور روشنیوں کے ہجوم میں ہنستے گاتے' ناچتے' سوتے' جاگتے' سوچتے' بولتے' لڑتے جھگڑتے' کھاتے پیتے اور ایک دوسرے کے جسموں میں پناہ تلاش کرتے ہوئے لوگوں کے پہلو میں کسی ہمزاد کی طرح میں نے دکھوں کے ایک لشکر کو چلتے ہوئے دیکھا۔ شام کے اس جھٹپٹے میں میں نے ان خدشوں کی آوازیں سنیں جو شام کی ہوا کے ساتھ ساتھ بہہ رہی تھیں۔ دکھوں کے یہ سائے اور خدشوں کی آوازیں رنگ و نسل' اونچ نیچ' موسم اور وقت...... ہر طرح کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ بڑے سے بڑے محل کا دروازہ اور محافظ بھی ان کو روک نہیں سکتے!

درد یک ساغر غفلت ہے' چہ دنیا و چہ دیں

امریکہ میں قیام کی یہ آخری شام بھی ان بے شمار شاموں کی طرح یادوں' خوابوں اور وسوسوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئی رات کی بانہوں میں سوگئی جو میری آنکھوں کے راستے سے ہو کر گزری ہیں۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے خیالات بھی جنازوں کی طرح ہوتے ہیں۔ گھر کے صحن سے لے کر قبرستان تک ان کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھتا۔ اس وقت محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی سے زیادہ بے معنی اور کوئی چیز نہیں۔ عزیز سے عزیز امانت بھی مٹی کو سونپنے کے بعد مٹی ہونا شروع ہو جاتی ہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حالت صحرا کے ان بگولوں کی طرح ہو جاتی ہے جن کے اٹھنے اور بیٹھنے کا پتا بعض اوقات خود صحرا کو بھی نہیں چلتا۔

سیئر زنا ور سے نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد ہم مشہور رسالے ''پلے بوائے'' کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جس کا دفتر راستے میں نظر آیا۔ میں افتخار کو'' پلے بوائے پارٹی جوکس'' سے اپنا ذاتی انتخاب سنا رہا تھا اور وہ مجھے بتا رہا تھا کہ'' پلے بوائے'' کے صفحات پر برہنہ تصویر چھپ جانے سے ماڈلنگ کی شوقین لڑکیوں کی مانگ میں کس قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔

رات کو ایک خالص اطالوی ریستوران میں پیزا (جس کا صحیح تلفظ غالباً پٹزا ہے) کھایا گیا جو واقعی مزیدار تھا۔ پروین نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔ غالباً ایسے ہی کھانے کے بارے میں انگریزوں نے یہ مقولہ بنا رکھا ہے۔

Happiness is at the end of your fork.

میں نے کہا۔'' اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ زیادہ کھانے سے پہلے سوچ لو کہ خوشی تمہارے کانٹے کے دوسرے سرے پر ہے لہٰذا ہاتھ روک لو۔''

پروین نے عرفان اور سعیدہ کو ساتھ ملاتے ہوئے جوابی حملہ کیا۔'' کمال ہے امجد بھائی' یعنی اس انگریزی پر آپ نے ایک پوری کتاب ترجمہ کر دی ہے۔ واہ' واہ...... کیا بات ہے!''

رات کو پیکنگ کا مرحلہ شروع ہوا۔ شوہروں کے بارے میں بیویوں کی رائے ہمیشہ متنازعہ فیہ رہی ہے لیکن اس بات میں' میں اپنی بیوی سے متفق ہوں کہ سوٹ کیس میں سامان کو ترتیب سے رکھنا میرے بس سے باہر ہے۔ میں نے سارا سامان عرفان کے ڈرائنگ روم میں پھیلا دیا لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو سمیٹا کیسے جائے اور سچی بات یہ ہے کہ اگر عرفان میری مدد کو نہ آتا تو وہ کم بخت اٹیچی کیس شاید ابھی تک بند ہونے' نہ ہونے کے مراحل طے کر رہا ہوتا۔

میں نے عرفان کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا''

عرفان نے دوسرے مصرعے میں برجستہ ترمیم کرتے ہوئے کہا۔

''غلط تھا' اے میاں امجد' ترا اندازہ صحرا''

ٹورنٹو۔۳

ہمارا واپسی کا ٹکٹ مونٹریال سے کراچی تک کا تھا جسے ہم نے اشفاق کی مدد سے مونٹریال....... لندن....... کراچی میں تبدیل کرا لیا تھا۔ اس سارے پروگرام کا صدر مقام ٹورنٹو تھا اس لیے شکاگو سے ہمیں پھر ٹورنٹو آنا پڑا۔ عالی جی پٹز برگ سے ہوتے ہوئے پیرس، علی سردار جعفری بمبئی، عارف افتخار لندن اور تسلیم الٰہی زلفی جدہ جا چکے تھے۔ گویا اس آخری چکر میں ٹورنٹو والوں کے پاس صرف دو مہمان بچے تھے۔

ٹورنٹو ائیرپورٹ پر حسب سابق تمام دوست موجود تھے۔ قیام کی مدت صرف ڈیڑھ دن تھی اس لیے طے یہ پایا کہ اب میرا قیام کرنل انور احمد کی طرف ہے جو اشفاق کے گھر سے بہت قریب ہیں تاکہ سب لوگ زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ گزار سکیں۔ رات کو بھی انور صاحب کے گھر جمع ہوئے اور خوب محفل جمی۔ پروین کے بارے میں نرجس سے معلوم ہوا کہ اس نے ناصرہ نامی کوئی سہیلی دریافت کر لی ہے اور اب اس کے ساتھ نیاگرا کی وہ روشنیاں دیکھنے گئی ہے جنہیں ہم پچھلی بار وقت کی کمی کی وجہ سے دیکھ نہیں پائے تھے۔

کرنل انور احمد کی عجیب و غریب اور منفرد البمیں اور ٹورنٹو کے مشاعرے کی وڈیو فلم دیکھی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ فلم چند دنوں میں باقاعدہ مارکیٹ کر دی جائے گی اور توقع ہے کہ پہلے ہی ہفتے میں اس کے کم از کم پانچ سو کیسٹ نکل جائیں گے۔

میں نے کہا۔ ”اگر کیمرہ مین عقل مندی سے کام لیتے ہوئے سامعین کے لانگ شاٹس کے بجائے کلوز میں سلو پیننگ کے ذریعے مختلف شاٹس بنا لیتا تو دو چار سو کیسٹ اور بک جاتے۔ ہر شخص اپنی تصویر دیکھنا پسند کرتا ہے۔“

”اگر سامعین کے شاٹس بناتے تو شاعر مس ہو جاتے۔“ کس بزرجمہر نے رائے دی۔

”طریقہ یہ ہے کہ جب بھی شاعر مکرر ارشاد پر دوسری بار پڑھنے لگے تو آپ کیمرہ سامعین پر لے جائیں، شاعر کی آواز اور سامعین کا ردعمل دونوں ایک ساتھ مل جاتے ہیں اور شاعر کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔“

میری اس ”ماہرانہ رائے“ سے (جو انتہائی مبتدیانہ تھی) گفتگو کا رخ پاکستانی ٹی وی کے اچھے پروگراموں کی طرف مڑ گیا اور ایک بار پھر وہی سوال سامنے آیا کہ بیرون ملک مقیم لاکھوں پاکستانیوں تک ان پروگراموں کو کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے؟ میں نے وعدہ کیا

کہ میں ان کے جذبات ٹی وی کے متعلقہ ارباب حل وعقد تک پہنچادوں گا........ اگے تیرے بھاگ لچھیئے!

اگلی صبح ناشتے کی میز پر کرنل انور نے اطلاع دی کہ آج وہ لوگ مجھے Klandale لے کر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''میرا قصور؟''

بولے۔ ''کیوں؟''

عرض کیا کہ نام سے تو یہ کوئی نازی کیمپ معلوم ہوتا ہے۔ انور صاحب نے بتایا کہ اصل میں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک ایسا میوزیم واقع ہے جس میں سات کینیڈین مصوروں کے فن پارے مستقل طور پر رکھ دیے گئے ہیں۔ میوزیم اور اس سے ملحقہ قریباً سوا ایکڑ زمین وہاں کے ایک فن نواز باسی کا عطیہ ہے اور یہ کہ لوگ دور دور سے اس میوزیم کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ منی اندر سے کیمرہ لے آئی تھی۔ کیمرہ دیکھ کر انور صاحب کی انگلیوں میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے کھٹا کھٹ ناشتے کے دوران ہی دس بارہ تصویریں اتاریں اور منی کو یاد دلایا کہ اپنے بیگ میں فلم کے ایک دو ایکسٹرا رول رکھ لے کیونکہ آؤٹ ڈور میں فوٹو گرافی کا اپنا ہی مزا ہے۔

کلینڈیل ٹورنٹو سے زیادہ دور نہیں تھا' یہی کوئی تیس چالیس کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا مگر یہاں ٹورنٹو کی نسبت زیادہ برف باری ہوتی تھی۔ نوادرات کی دکان کے باہر برف کے کیچڑ میں گاڑی موڑنے کی کوشش کے دوران ایک دو لمحے ایسے بھی آئے جب موٹر' سٹیرنگ اور بریکوں کی پابندی کے باوجود' کہیں بھی جا سکتی تھی۔ میوزیم کی تین منزلہ عمارت اس احتشام سے پاک تھی جس کا مظاہرہ ہم اب تک اس نوع کی ہر عمارت میں دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ یہ ایک سادہ اور بامقصد قسم کی عمارت تھی جس کی ساری پرکاری اس کی سادگی ہی کی مرہون منت تھی۔ مصوروں کے فن پاروں میں اگر کوئی غیر معمولی خصوصیت تھی تو کم از کم مجھے نظر نہیں آئی۔ عام سی تصویریں تھیں جیسی ہمارے یہاں نیشنل کالج آف آرٹس کے طالب علم بناتے ہیں۔ ایک بار پھر اپنے یہاں کے اہل ہنر اور اساتذہ فن کی بے قدری کا خیال آیا جنہیں دفنانے کے لیے بھی عام طور پر چندہ جمع کرنا پڑتا ہے۔

واپسی میں ٹورنٹو کا ڈاؤن ٹاؤن دیکھا۔ کرسمس کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ سڑکوں اور دکانوں پر اضافی روشنیاں اور رنگ راہگیروں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے تھے مگر کیا مجال جو روزمرہ کے معمول میں کسی قسم کا تعطل پیدا ہو۔ ہمارے یہاں عید تو عید روزوں کا استقبال بھی چیزوں کی قیمتیں بڑھانے سے کیا جاتا ہے مگر ان لوگوں نے ہر جگہ کرسمس سیل لگا رکھی تھی۔ اگر یہ رعایت محض نام کی تھی تب بھی اچھی تھی کہ بہرحال اس میں ایک خوش نیتی تو پائی جاتی ہے۔

کرنل انور نے ایک قدیم طرز کی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا مالک اسے گرا کر یہاں ایک جدید شاپنگ پلازہ بنانا چاہتا تھا مگر شہر کی بلدیہ نے اسے اس بات کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ اس حصے کی قدامت اور ماحول کو قائم رکھنا چاہتے تھے کہ یہ شہر کے تشخص کا ایک اہم حصہ ہے۔ بے حد بحث وتمحیص کے بعد انہوں نے اتنی اجازت دی ہے کہ عمارت کے اندرونی حصے کو بے شک ماڈرن بنالیا جائے مگر اس کی بیرونی حالت اور شکل وصورت اسی طرح رہے گی اور اس کی مرمت وغیرہ میں بھی اس کے اصل طرز تعمیر کی پابندی کی جائے گی۔

بیگم انور اور منی مختلف دکانوں میں گھس کر کچھ انکوائریاں کر رہی تھیں اور ہم دونوں ان کے انتظار میں بغیر کسی مقصد کے شوکیسوں کو دیکھتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک میری نظر ایک ریڑھی پر پڑی۔ ایک عام سا پہیوں والا ٹھیلا جس پر سنہرے رنگ کے بے شمار پتے سجے ہوئے تھے۔ یہ ریڑھی برآمدے کے ایک گوشے میں کھڑی تھی۔ اس کے قریب ہی اسٹول پر سیاہ شرٹ اور سکرٹ میں ملبوس تیکھے نقوش اور میک اپ سے عاری چہرے والی ایک ایسی عورت بیٹھی تھی جس کے سیاہ بالوں میں ایک بھوری سی لکیر جیسے آنکھیں مار رہی تھی۔ ہمیں متوجہ پا کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ میں نے سنہری پتوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

بولی۔ ''یہ مختلف پودوں کے اصل پتے ہیں جنہیں ایک خاص پراسس سے گزار کر اس کھولتے ہوئے سنہرے محلول میں تر کیا گیا ہے جو ایک طرح کا نقلی سونا ہے۔'' اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے اپنے گلے میں پڑا ہوا ایک لاکٹ دکھایا۔ سنہری زنجیر کے آخری سرے پر ایک سنہری پتا بڑی خطرناک حدوں کو چھوتا ہوا بڑی سرشاری کے عالم میں جھول رہا تھا۔

میں نے کرنل انور کے مشورے پر دو لاکٹ خرید لیے جو کم از کم اس وقت بالکل مہنگے نہیں تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''کہاں کی رہنے والی ہو؟''

بات ٹال کر بولی۔ ''آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں....... مڈل ایسٹ سے؟''

میں نے کہا۔ ''ایسٹ کی حد تک تمہارا اندازہ صحیح ہے لیکن ہمارا ایسٹ ذرا ساؤتھ کی طرف واقع ہے۔''

''میرا جغرافیہ ذرا کمزور ہے' ملک بتاؤ۔''

''ہم پاکستانی ہیں۔''

اس کی فرمائشی مسکراہٹ سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے پاکستان کا کچھ پتا نہیں اور اگر میں اس سے یہ کہہ دوں کہ میرا ملک افریقہ یا لاطینی امریکہ میں واقع ہے تو وہ اس بیان کو بھی فوراً قبول کر لے گی۔ میں نے پھر پوچھا۔ ''تم کہاں کی ہو؟....... یہاں کی تو نہیں

لگتیں!''

''میں تل ابیب سے آئی ہوں۔''

کرنل انور نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اب معلوم ہوا وہ ہم سے اپنا وطن مالوف کیوں چھپا رہی تھی۔ میں نے اردو میں انور صاحب سے کہا۔''آپ کی وجاہت اور جامہ زیبی سے اگر اسے آپ کے لبنانی یا شامی ہونے کا گمان ہوا ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر مجھ غریب پر یہ خوش گمانی کیسی؟''

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ایک زوردار قہقہہ لگا کر میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولے۔''یہ جو گندمی رنگ ہے اس کی وہی مثال ہے...... غربت خانے میں جا کے چمکا' گمنام تھا وطن میں۔'' ہمیں باتوں میں مصروف دیکھ کر اس عفیفہ نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے اپنی تاجرانہ خوش خلقی کو اتارا اور سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور واپس جا کر سٹول پر بیٹھ گئی۔ کرنل انور نے مسکرا کر کہا' اسے کہتے ہیں''یہودی کی لڑکی!''

اس سارے سفر کے دوران میں میزبانوں نے ہمارے استقبال اور الوداع میں اتنی محبت اور مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا کہ بین الاقوامی ہوائی سفر کے بہت سے مسائل کا ہمیں پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔ آغاز سفر میں میامی کی فلائیٹ مس کرنے کے بعد سے اب تک ائیر پورٹ ہمارے لیے مسئلہ نہیں بنا تھا مگر اب جو میں کرنل انور اینڈ کمپنی کے ساتھ ائیر پورٹ پہنچا تو مونٹریال کے فلائٹ کاؤنٹر کے نواح میں پروین اور اشفاق فیملی کی کوئی نشانی موجود نہیں تھی اور کاؤنٹر بھی خالی پڑا تھا۔ فلائیٹ کا ٹائم نزدیک تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور دور دور تک نہ تو ناقہ سوار نظر آ رہا تھا اور نہ گرد ناقہ۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد پتا چلا کہ ہم غلط کاؤنٹر پر کھڑے ہیں۔ اب جو صحیح کاؤنٹر کی طرف بھاگے ہیں تو وہاں الوداعی گروہ کے دس بارہ ارکان مجسم پریشان کھڑے تھے۔ بغل گیریوں' مصافحوں اور سلاموں کے دوران میں بورڈنگ کارڈ وغیرہ کا مرحلہ طے کیا گیا تو یہ الجھن آن پڑی کہ دو بکسوں میں سامان کا وزن مطلوبہ حد سے زیادہ تھا۔ کاؤنٹر والی نے بتایا کہ ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ائیر پورٹ والوں نے وہاں گتے کے مضبوط کارٹن رکھ چھوڑے ہیں' انہیں استعمال کیا جائے۔ جلدی جلدی بکسے کھولے گئے۔ پیکنگ کے عمل میں چونکہ سب لوگ ہاتھ بٹانے لگے تھے اس لیے زیادہ وقت لگا۔ پروین نے بہت سے چیزیں ایک بڑے سے ہینڈ بیگ میں ٹھونسیں جو پھول کر تقریباً ایک درمیانے سائز کے اٹاچی کیس جیسا ہو گیا۔ میں نے دبے لفظوں میں کہا بھی کہ جہاز کا دستی سامان رکھنے کا خانہ اس توپ خانے کا متحمل نہیں ہو سکے گا مگر پروین نے ایک کان سے میری بات سنی اور اسی سے اڑا دی۔ دستی سامان چیک کرنے والے کاؤنٹر پر ایک نوجوان سکیورٹی افسر نے اس بیگ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی' کچھ کہنے

کے لیے منہ کھولا مگر پھر کندھے جھٹک کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پروین نے ایک فاتحانہ طنزیہ نظر مجھ پر ڈالی بیگ اٹھایا اور ایسے انداز میں آگے چلنے لگی جیسے کوئی کیڈٹ سورڈ آف آنر وصول کرنے جاتا ہے۔

عام طور پر جہاز کی طرف جانے والا گیٹ اس کے فلائٹ کاؤنٹر سے چالیس پچاس گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوتا مگر یہ والا گیٹ اس کے فلائیٹ کاؤنٹر سے چالیس پچاس گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوتا مگر یہ والا گیٹ آ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ ہم تیروں کے نشان دیکھتے اور مختلف کاریڈوروں سے گزرتے ہوئے تقریباً دس منٹ میں منزل مقصود پر پہنچے۔ فلائٹ کی روانگی میں پندرہ منٹ باقی تھے اور تمام مسافر جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔ وہ بے مروت سی خواتین نے سرزنش بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھا' بورڈنگ کارڈ چیک کئے اور اشارے سے جانے کے لیے کہا۔ ابھی میں نے ''میغی'' کہہ کر قدم اٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک چیخ نما آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ان میں سے ایک' دونوں ہاتھوں سے پروین کا راستہ روکے کھڑی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ یہ ہینڈ بیگ اسے سامان کے ساتھ چیک ان کرانا پڑے گا کیونکہ یہ ہرگز ہرگز دستی سامان کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ پروین نے اسے اپنی وکٹورین انگریزی میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر اس بی بی کے دل میں ذرا رحم نہیں آیا' اس نے بیگ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

No, No, No, You will have to check in that
horrible looking suitcase of bag.

میں نے منمناتے ہوئے کہا۔'' کچھ دیا کرو' اگر ہم اسے چیک ان کرانے کے چکر میں پڑیں گے تو ہمارا جہاز نکل جائے گا۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا کہ اگر تم بحث میں وقت ضائع کرنے کی بجائے دوڑ کر جاؤ' تو غالب امکان ہے کہ فلائٹ مس نہیں ہوگی۔

پروین بالکل رونے والی ہو رہی تھی اس لیے میں نے اسے وہیں رکنے کو کہا۔'' بیگ اٹھایا اور اپنا کرکٹ کا زمانہ یاد کر کے دوڑ لگا دی۔ اس دوڑ کے دوران مجھے پہلی بار پتا چلا کہ '' افتاں وخیزاں '' کا اصل مطلب کیا ہوتا ہے!''

اشفاق وغیرہ نے' جو ابھی تک وہیں تھے' جب مجھے اس حالت میں آتے دیکھا تو ان کے چہرے پر سوالیہ نشان بن گئے۔ میرا چہرہ بھی اس وقت '' صورت بہ بیں' عالم میرس'' بنا ہوا تھا اس لیے ہم سب بغیر کچھ کہے سنے بیگیج کاؤنٹر پر پہنچے۔ اب پتا نہیں یہ ہماری پریشانی کا احساس تھا یا اہل فرنگ کی معروف انسان دوستی کہ کاؤنٹر والی نے میری بات سنتے ہی بغیر کسی بحث کے بیگ کو ہمارے سامان کے ساتھ بھجوا دیا حالانکہ چند منٹ پیشتر وہ اس ضمن میں صاف انکار کر چکی تھی۔ فلائیٹ کے ٹیک آف میں صرف چار منٹ باقی تھے' میں نے دوڑ لگائی جس کی رفتار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کاؤنٹر والی کے '' تھینک یو' اور میز باتوں کے '' خدا حافظ'' کے

دوران میں تقریباً بیس گز آگے نکل چکا تھا۔ باہر برف پڑ رہی تھی اور میرے بوٹوں میں پسینہ جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پروین نے مجھے دیکھ کر اطمینان کا ایک اتنا لمبا سانس لیا کہ اس کے قریب کھڑی دونوں بے مروت خواتین کی ہنسی نکل گئی۔ ان میں سے ایک نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

I told you, you won't miss the flight.

بہت دنوں کے بعد اس وقت میرا دل گالیاں دینے کو چاہا۔

یوں تو ہر طرح کی ٹینشن بری ہوتی ہے مگر پردیس میں فلائٹ مس کرنے کی ٹینشن ایسی بیہودہ چیز ہے جس کا مقابلہ شاید کسی اور صورت حال سے نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں اپنی سیٹ تک کیسے پہنچا اور اس کے بعد کیا واقعات ہوئے۔ جب میری سانس متوازن ہوئی اور مجھے دکھائی دینے لگا تو جہاز کو پرواز کرتے بیس منٹ ہو چکے تھے۔ بیگ والے واقعے کی وجہ سے پروین کچھ چور سی بنی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ممنونیت اور شرمندگی کی کچھ ایسی ملی جلی فضا تھی کہ میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد مجھے اس کے زور سے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

بولی۔ ''اس عورت کا جملہ یاد آ رہا ہے کیسے آنکھیں پھاڑ کے کہہ رہی تھی۔

That horrible looking suitcase of bag.

اس کے بعد اس نے پھر ہنسنا شروع کر دیا اور مونٹریال تک ہنستی ہی چلی گئی جہاں یہ خبر ہمارا انتظار کر رہی تھی کہ مونٹریال سے پیرس جانے والی فلائیٹ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے۔

مانٹریال میں زوروں کی برف پڑ رہی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں میں سے ہم نے دیکھا ایک جہاز آ کے رکا ہے اور اس کے پہیوں کے نیچے کوئی دو دو انچ برف ہے۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ دیکھا تو آدھے آدھے پہیے برف کی چادر میں منہ چھپا چکے تھے۔ یہ ان لوگوں کا کمال ہے کہ اس کے باوجود جہاز مسلسل اترتے اور پرواز کرتے رہے۔ ہمارے یہاں چار چھینٹے بارش کے پڑتے ہیں اور آٹھ پروازیں لیٹ یا کینسل ہو جاتی ہیں۔

پیرس پہنچے تو ہماری گھڑیوں پر تین اور پیرس کی گھڑیوں پر نو بج رہے تھے۔ وہاں سے لندن کی فلائٹ ساڑھے دس بجے تھی۔ ایک گھنٹے کی اس پرواز کے بعد جب لندن پہنچے تو وہاں بھی ساڑھے دس ہی بجے تھے!

◆◆◆

لندن

بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک زمانے میں "لندن پلٹ" ہونا ایک ایسی خصوصیت تھی جسے اعلیٰ ڈگری کا درجہ دیا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں کی زندگی میں تو یہ سفر ایک مرکزی نقطے کی حیثیت اختیار کر جاتا تھا' مثلاً

یہ میرے لندن جانے سے چار سال پہلے کی بات ہے!

جن دنوں میں لندن جانے کا پروگرام بنا رہا تھا!

لندن سے آتے ہی میری شادی ہوگئی!

لندن سے آئے ہوئے دس برس ہو چکے تھے مگر.......!

میں نے لندن میں دیکھا کہ .... وغیرہ....... وغیرہ....... وغیرہ!

قیام پاکستان سے پہلے برصغیر سے لندن کی طرف یہاں کی دولت کے علاوہ عام طور پر کچھ طالب علم اور امراء کا ایک محدود طبقہ ہی جایا کرتا تھا' مزدور پیشہ اور تاجر حضرات کی تعداد ان سے بھی کم تھی مگر آزادی کے بعد صورت حال انتہائی تیزی سے بدلنے لگی۔ لندن پر سب سے پہلا ہلا اپنے میرپوری بھائیوں نے بولا اور پھر اس کے بعد چل سو چل۔ ڈاکٹر' انجینیر' تاجر' بینکر' اہل علم و ہنر' سیاستدان' فنکار....... غرضیکہ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے نمائندے وہاں موجود نہ ہوں۔

مشتاق احمد یوسفی' عبداللہ حسین' ضیاء محی الدین' ناہید نیازی' افتخار عارف' ساقی فاروقی' بدیع الزماں' شاہد محمود ندیم' غلام مصطفیٰ کھر' جاوید حکیم قریشی' فارغ بخاری' غلام قادر آزاد' آغا حسن عابدی' سلیم شاہد' جسٹس صمدانی' عظمت نواز باجوہ' ڈاکٹر سعید اختر درانی' ڈاکٹر صفی حسن' الطاف گوہر' شاہد حسین اور بے شمار دوسرے معروف پاکستانی وہاں عارضی یا مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ کچھ لوگ لندن میں ہیں اور کچھ اس کے نواح میں۔ مزدور پیشہ لوگ زیادہ تر انگلستان کے صنعتی شہروں میں رہتے ہیں لیکن لندن کا ایک علاقہ' جو ہیتھرو ائیر پورٹ کے قریب ہے اور ساؤتھ ہال کہلاتا ہے' تقریباً سارے کا سارا ایشیائی اور بالخصوص برصغیر کے لوگوں کے قبضے میں ہے۔ کسی شاعر کا مصرعہ ہے۔ "ہم جہاں بیٹھ کے پی لیں وہیں مے خانہ بنے"

تو یوں سمجھئے کہ ساؤتھ ہال کو ہمارے بھائیوں نے وطن عزیز کا ماحول دینے کی پوری پوری اور کامیاب کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں

کوئی بوڑھا انگریز اپنے کسی پرانے دوست کا گھر ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا۔ عمارت اور فلیٹ نمبر تلاش کرنے کے بعد اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اندر سے ایک سردار جی دھوتی کرتے میں ملبوس' مونچھوں سے مکھن صاف کرتے ہوئے نکلے۔ انگریز نے اپنے دوست کے بارے میں استفسار کیا۔ سردار جی نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

No, No, this is my house. No, Mr. Barrington lives here.

بوڑھے صاحب نے اپنی ڈائری سے دوبارہ پتا چیک کیا اور سردار جی سے پوچھا کہ یہ فلاں بلڈنگ کا فلیٹ نمبر فلاں فلاں نہیں ہے؟

سردار جی بولے۔

Yes, address is al right, but I told you no foreigner lives here.

اب لندن میں کسی انگریز کے لیے فارنر کا خطاب سن کر اس بابے پر کیا گزری ہوگی' اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بابا ایشیائی باشندوں کے زبردست ترین مخالف اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر اینک پاول کا رشتے دار تھا۔

اتنے بڑے لندن شہر میں اگرچہ ہمارے جاننے والوں کی تعداد خاصی معقول تھی مگر میرا پروگرام اپنے بچپن کے دوست مکرم جاوید سید کی طرف رہنے کا تھا جو گزشتہ دس برس سے یہاں ٹریڈنگ کا بزنس کر رہا تھا اور اس میں بہت کامیاب بھی تھا۔ مشاعروں کے پروگرام میں تبدیلی کے باعث صورت حال کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ ہماری آمد سے دو دن قبل اسے اپنی اطالوی بیوی لاریا سمیت لاطینی امریکہ کے مختلف ممالک جانا تھا جہاں سے اس کی واپسی دو ہفتے بعد متوقع تھی یعنی ہماری روانگی کے تین دن بعد۔ اس صورت حال میں قصور سراسر ہمارا تھا مگر مکرم اس قدر شرمندہ ہو رہا تھا کہ میرے بے حد سمجھانے کے باوجود وہ اپنے حق میزبانی سے دستبردار نہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ ہمارے استقبال' خبر گیری' رہائش' نقل و حرکت کے انتظامات اور خاطر خدمت کے لیے نہ صرف اس کے لندن آفس کا عملہ موجود ہوگا بلکہ اس نے اپنے نائیجیریا آفس سے ہمارے مشترکہ اور پیارے دوست افتخار بٹ کو بھی بلوا لیا ہے تاکہ ہم اور زیادہ ایٹ ہوم محسوس کر سکیں۔

پروین نے اپنے کلکٹر کسٹمز جہانگیر خاں صاحب کو ہماری آمد کی اطلاع دے رکھی تھی جو وہاں پاکستانی سفارت خانے کے کمرشل اتاشی تھے۔ ان کی وجہ سے امیگریشن اور کسٹم کا مرحلہ تو دس منٹ میں طے ہو گیا مگر اب جو ہم سامان کی ٹرالیاں لے کر چلے تو چلتے ہی چلے گئے۔ تقریباً آدھ میل چلنے کے بعد جب ہم ایک ایسے کاریڈور میں داخل ہوئے جس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا تو پروین

نے ایک لمبا سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ راستہ تو برٹش راج سے بھی لمبا ہو گیا ہے۔''

لندن ائیر پورٹ پر اگرچہ امریکی ہوائی اڈوں جیسی چمک دمک نہیں تھی مگر اس میں ایک ریٹائرڈ جرنیلوں والی تمکنت اور رکھ رکھاؤ ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ ائیر پورٹ کی عمارت کے اندر کی اس طویل جبری پریڈ کے دوران ہم نے جہانگیر خاں صاحب سے لندن یاترا کی تمام ضروری اور غیر ضروری تفصیلات حاصل کرنے کے علاوہ اپنا تقریباً سارا پروگرام بھی ڈسکس کر لیا تھا جس میں ان کے یہاں قیام کی پر خلوص دعوت سے معذرت بھی شامل تھی۔

قرائن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم ہوائی اڈے کے بیرونی دروازے کے نواح میں ہیں مگر ہمارے میزبانوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ جہانگیر خاں کی آنکھوں میں بہت سے سوالیہ نشان تیر رہے تھے مگر ایک شریف اور باوقار انسان کی طرح ہمیں پریشانی سے بچانے کے لیے وہ جان بوجھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ پروین کی شرمندہ کن نگاہیں بار بار میری طرف اٹھ رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا ہیتھرو ائیر پورٹ ایک بڑے سے سوالیہ نشان کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ میں نے بیچارگی کے انداز میں اجنبی چہروں کے ہجوم پر ایک اور نگاہ ڈالی۔ آؤٹ آف فوکس انسانی نقوش کے ہجوم میں ایک آشنا چہرہ ریگزار میں نخلستان کی طرح طلوع ہوا۔ افتخار بٹ اپنے مخصوص ڈھیلے ڈھالے انداز میں مسکراتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ قد آدم سے کچھ نکلتے ہوئے قد والا ایک اور شخص تھا جس کے ہونٹوں پر اس کے قد سے بھی بڑی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ افتخار نے تعارف کرایا کہ یہ اقبال حسین ساہی ہیں جو مکرم جاوید کے چیف اکاؤنٹنٹ ہیں اور ہمارے لندن میں قیام کا انتظام و انصرام ان کے ذمہ ہے۔ اقبال اور افتخار کے ساتھ میری کھوئی ہوئی خود اعتمادی' بشاشت اور ہیتھرو ائیر پورٹ کی روشنی بھی واپس آ گئی تھی۔ میں نے افتخار سے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ وہ تو اپنے حساب سے وقت سے خاصا پہلے آئے ہیں کیونکہ انٹرنیشنل فلائٹ کے سب سے پہلے آنے والے مسافر کو بھی کسٹم اور امیگریشن سے نکلنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور لگتا ہے۔ جہانگیر خان نے ان کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ ''ایں ہمہ آمدہ من است''

اب پتا چلا کہ ہنگامی حالات میں وی آئی پی بننے کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

سامان کو موٹروں کی ڈکیوں میں رکھنے کی ناکام کوشش کے بعد ٹیکسی منگوائی گئی۔ لارڈ کلائیو کی سی شکل وصورت والے گورے ڈرائیور نے بڑی مستعدی سے سامان لوڈ کرنا شروع کیا۔ میں نے اس کی مدد کرنا چاہی تو افتخار نے مجھے روک دیا۔ بولا ''اٹھانے دو اسے...... ہم نے بھی ڈیڑھ سو سال ان کا بہت سامان اٹھایا ہے۔''

اقبال ساہی نے اسے ہماری منزل سے آگاہ کیا اور تاکید کی کہ ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔ ائیر پورٹ سے ریجنٹ پارک تک کے تقریباً بیس منٹ کے سفر میں ایک لمحے کے لیے بھی وہ سیاہ رنگ کی ٹیکسی ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہے۔ تاریخ کے بہت سے نظریات آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ جو تھا' نہیں ہے' جو ہے' نہ ہوگا.......

افتخار گزشتہ برس دل کے بائی پاس آپریشن سے گزر چکا تھا۔ میں نے اس کے دل کی صحت اور حالت کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور پنجابی محاورے کے مطابق گھوڑے کی طرح فٹ ہے۔ نائجیریا کا ذکر چھڑا تو اس نے کہا کہ وہاں کے حالات ایسے ہیں کہ انہیں ہرگز حالات نہیں کہا جا سکتا کیونکہ افریقی لوگ سسٹم نام کی کسی چیز کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ جس طرح بنکاک کی امتیازی خصوصیت وہاں کی عورت ہے اسی طرح نائجیریا کی پہچان رشوت ہے جو وہاں اس قدر کھلے بندوں چلتی ہے کہ اس پر تعجب کا اظہار کرنا آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

ریجنٹ پارک کے قریب اسلامک سنٹر کے مرکزی دروازے کے تقریباً سامنے ایک تین منزلہ بلڈنگ کی دوسری منزل پر ۱۷ نمبر کا اپارٹمنٹ میرے لیے بک کروایا گیا تھا جو کہ دو بیڈ روم' ایک لونگ روم' باتھ اور کچن پر مشتمل تھا۔ اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی بلکہ بہت سی ایسی چیزیں بھی تھیں جن کی مجھے قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ پروین کی رہائش کا انتظام صابر چوہدری کی فیملی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ صابر کا خوبصورت فلیٹ میرے اپارٹمنٹ سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ صابر بھی مکرم کی طرح لندن سے باہر تھا۔ اس کی بیوی اور سالی نصرت' جو اقبال ساہی کی بھانجیاں بھی تھیں' پروین کو مل کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ لوگ سرائے عالمگیر (جہلم) کے رہنے والے تھے۔ سیدھے سادے' مخلص اور محبت کرنے والے لوگ جو مہمان کو دل سے باعث رحمت خیال کرتے ہیں۔ ان کی اس مہمان نوازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے اپارٹمنٹ کا کچن استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور یوں دنیا یہ جاننے سے بھی محروم رہ گئی کہ انڈہ آملیٹ بننے کے دوران مزید کیا کیا کچھ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

لندن میں اپنے جاننے والوں کی فہرست پر نظر دوڑائی تو آنکھوں پسینہ آ گیا۔ ہمارے پاس کل آٹھ دن تھے جن میں احباب سے ملاقات کے علاوہ لندن کو بھی اچھی طرح دیکھنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دن کے لیے برمنگھم بھی جانا تھا۔ جہاں برادرم ڈاکٹر صفی حسن' ڈاکٹر سعید اختر درانی اور بھائی غلام قادر آزاد سے ملاقات طے تھی۔ عاشور کاظمی' شاہدہ احمد اور سحاب قزلباش کو بھی اطلاع ہو گئی تھی اور ان کے بھی بار بار فون آ رہے تھے۔ بہت غور و فکر کرنے کے بعد جو پروگرام بنا وہ کچھ یوں تھا کہ زیادہ تر ایسی تقریبات میں شرکت

کی جائے جہاں زیادہ سے زیادہ احباب سے ملاقات ہو سکے مگر یہاں اب یہ قباحت آن پڑی کہ پروین بیگم کسی ایسی تقریب میں شرکت پر آمادہ نہیں تھی جس کی ترتیب سے برادرم افتخار عارف کا ذرا سا بھی تعلق ہو یعنی وہی پرانی ناراضگی ابھی تک چل رہی تھی۔ بھائی بندی اور اخلاق اور ہم سفری...... تینوں کا تقاضا یہی تھا کہ میں پروین کا ساتھ دوں' سو میں نے یہی کیا۔ میرے اس رویے سے افتخار کو ملال ہونا تھا سو ہوا مگر اس نے ایک سمجھدار انسان اور اچھے دوست کی طرح اسے لفظ نہیں دیے اور یوں اس بدمزگی کا اندیشہ ٹل گیا جس نے بہت دنوں سے اندر ہی اندر مجھے پریشان کر رکھا تھا۔

افتخار' مکرم اینڈ کمپنی کے زیر انتظام چلنے والے ہوٹل اولیور میں مقیم تھا۔ تھوڑے سے کمرے تھے مگر اتنی مختلف قومیتوں کے مسافر وہاں رہ رہے تھے جیسے وہاں یو این او کا کوئی اجلاس ہونے والا ہو۔ معلوم ہوا کہ لندن میں (کم از کم ہوٹل کی حد تک) رنگ و نسل سے زیادہ استطاعت پر دھیان دیا جاتا ہے۔ اولیور ایک غریب نواز ہوٹل ہے' یہ بات دوسری ہے کہ وہاں کی غریبی ہمارے یہاں سفید پوشی کہلاتی ہے۔ کاؤنٹر کے سامنے ایک لابی نما کمرۂ نشست تھا جہاں ہر وقت ٹی وی آن رہتا تھا لیکن وہاں بیٹھنے والے مرد و زن عام طور پر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے تک نہیں تھے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کی وجہ ٹی وی پروگرام تھے یا ان کے اپنے زیر بحث آئندہ پروگرام۔

دیار فرنگ میں برسر عام دو مردوں کا آپس میں گلے ملنا اتنا ہی معیوب سمجھا جاتا ہے جتنا ہمارے یہاں مرد کا عورت سے بغل گیر ہونا۔ اس بات کا علم مجھے پہلے سے تھا مگر کرسمس کی رات ہوٹل میں مقیم کیرن اور کیرل نامی دو نیم مدہوش سہیلیوں نے مجھے اور افتخار کو اس موضوع پر جو سیر حاصل لیکچر دیا اور جس جس انداز میں اس مسئلے کے مختلف علمی اور عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی وہ اپنی جگہ پر ایک سبق آموز داستان ہے۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ ہر علاقے کی تہذیب و تمدن کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں مگر ان کی سمجھ میں آخر تک یہ بات نہیں آئی کہ تہذیب و تمدن کا عورت اور مرد کے باہمی معاملات سے کیا تعلق ہے!

رات اور نشے کے فروغ کے ساتھ ساتھ ان کی دلیلوں کی جارحیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ براہ راست برصغیر سے آنے والوں کے ''خواتین'' سے متعلق رویوں کا مذاق اڑانے پر اتر آئی تھیں۔ ان کے خیال میں ہم ایشیائی لوگوں کا عورت کی طرف جھکاؤ اور اس سے گریز دونوں ہی غیر حقیقی اور انتہا پسندانہ تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے ذاتی تجربات سے جو مثالیں دیں وہ ایسی زوردار تھیں کہ ہمارا دفاعی نظام کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ میں نے افتخار کی طرف دیکھا مگر وہ کسی اور طرف دیکھ رہا تھا!

کیرن اور کیرل دونوں نسبتاً کم تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ خواتین تھیں اور ایک آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہی تھیں۔ جنس پر گفتگو

ان کے نزدیک تضیع اوقات کے زمرے میں آتی تھی کیونکہ ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ کھانا کھانے کے لیے ہوتا ہے بحث کرنے کے لیے نہیں۔ان کی باتیں سن کر ایک بار پھر میرے ذہن میں ایک پرانی الجھن نے سر اٹھایا کہ اتنا کھلا ڈلا ہونے کے باوجود اس معاشرے میں جسم فروشی' جنسی جرائم اور ہم جنس پرستی وغیرہ کی اتنی فراوانی کیوں اور کیسے ہے!

مغرب اور مشرق کے مزاجوں کا فرق ان کے تہواروں اور رسم و رواج میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ہم عید پر بازاروں کو سجاتے ہیں' انگریز کرسمس پر اپنا گھر سجاتا ہے۔ہم بن پیئے مست ہو جاتے ہیں اور وہ گلے گلے شراب میں ڈوب کر بھی اپنے آپ میں رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھیڑ اور دکانداروں کے تجاوزات کی وجہ سے رستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔اور ان کی سڑکیں بھاں بھاں کرتی ہیں۔ کرسمس کی صبح ہم نے اقبال سہی کے ساتھ تقریباً آدھا لندن گھوم ڈالا۔ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر تصویریں اتروائیں کہ یہ بھی لندن یاترا کے آداب میں شامل ہے۔سپیکرز کارنر میں بہت دیر کھڑے رہے کہ کہیں سے کچھ سامعین ملیں تو ایک عدد تقریر بھی جھاڑ ڈالیں مگر سوائے ایک پولیس والے کے کوئی ادھر سے نہیں گزرا۔اب ایک تو ہم ایشیائی ملکوں کے لوگوں کو ویسے ہی پولیس والے کے سامنے بولنے کی عادت نہیں ہوتی اس پر یہ گوارا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی برف میں لگا ہوا تھا۔وہ ہمارے پاس سے یوں گزرا جیسے کوئی درختوں یا پتھروں کے قریب سے گزرتا ہے۔پتا نہیں کیوں مجھے اس وقت داغ کا یہ شعر بہت یاد آیا۔

زمیں پر پاؤں نخوت سے نہیں رکھتے پری پیکر
یہ گویا اس مکاں کی دوسری منزل میں رہتے ہیں

دریائے ٹیمز کو دو تین مختلف پلوں اور کناروں سے دیکھا مگر ہر بار ایک جیسا پایا۔انگریز قوم کے مزاج کی طرح!ایک پل سے کچھ فاصلے پر ٹاور آف لندن واقع تھا۔اس عمارت سے پرانے وقتوں میں بادشاہ لوگ عقوبت خانے کا کام بھی لیتے رہے ہیں۔پتا نہیں تخت اور زندان میں کیسا ربط خفی ہے کہ اکثر شاہی محلات اپنے مکینوں کے لیے بندی خانے بن جاتے ہیں۔کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا ہے کہ لوگ بظاہر تخت پر متمکن ہوتے ہیں مگر ان کی روحیں سولیوں پر ٹنگی رہتی ہیں۔

میرا دھیان لاہور کے شاہی قلعے کی طرف چلا گیا جہاں دیوان خاص کے پہلو بہ پہلو وہ عقوبت خانے واقع ہیں جہاں اذیت رسانی کا عمدہ ترین انتظام موجود ہے اور یہ اذیت ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جن کے جرم کی نوعیت اخلاقی نہیں ہوتی۔اردو کے بہت عمدہ نظم نگار اور میرے بہت پیارے بزرگ ہم عصر ظہور نظر مرحوم نے ایک خاص پس منظر میں ایک شعر کہا تھا' ٹاور آور لندن دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ شعر صدیوں پر محیط ہو گیا ہو۔

کیا ہے قید مجھے اس جگہ پہ ظالم نے
جہاں سے صاف مرا گھر دکھائی دیتا ہے

دوپہر کو "لاہور کباب ہاؤس" میں تکے، کباب اور تندوری روٹیاں کھا کر اپنے شہر اور شہر والوں کو یاد کیا۔ یاد بھی کیڑے کے رزق کی طرح ہوتی ہے جو پتھر میں بھی سیندھ لگا کر اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

ویسٹ منسٹرایبے کہنے کو تو ایک گرجا ہے مگر آپ بلا تکلف اسے انگلینڈ کی تاریخ کا سب سے بھرپور استعارہ کہہ سکتے ہیں۔ حالی نے دلی کے بارے میں کہا تھا۔

"دفن ہوگا کہیں ایسا نہ خزانہ ہرگز!"

میرا خیال ہے کہ یہی بات اس عمارت کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ عبادت گاہ بھی ہے، شاہی خاندان کی شادیوں کا مخصوص گرجا بھی اور مشاہیر کا قبرستان بھی انگریز کی تہذیب اور تمدن کے مختلف شعبوں کے جتنے نامور تزئین کار ہو گزرے ہیں ان سب کا ایک عمدہ انتخاب اس عمارت کے در و بام میں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں روحانیات کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اللہ والوں کی قبریں جیتی ہیں۔ یعنی ان کی موت کے بعد بھی ان کا فیض جاری رہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات ان لوگوں پر زیادہ صادق آتی ہے جنہوں نے انسانیت کی بقا اور فروغ کے لیے اپنی پوری زندگیاں وقف کر دیں اور دنیا کو اپنے علم و ہنر اور کارناموں سے ایسے سدا بہار تحفے دیے جن کی چمک اور حسن کی چھوٹ مستقبل کی روش روش پر جلوہ نما ہے۔

ہم نے مختلف مشاہیر کے ناموں کی تختیوں پر نظر ڈالی تو یوں لگا جیسے ویسٹ منسٹرایبے کے قبرستان میں داخل ہونے کے لیے پہلی شرط تاریخ کے اوراق میں زندہ ہونا ہے۔ انگلستان کی بادشاہت، جمہوریت کی آندھی اور سوشلزم کے طوفان دونوں کو جھیل چکی ہے اس لیے اس کے افراد کی قبریں ان کے ذاتی میرٹ کی وجہ سے نہ بھی ہوں تو بھی انہیں یہاں دفن ہونے کا حق پہنچتا ہے البتہ ان کے علاوہ جتنی قبریں ہیں ان میں ہر کوئی اپنی جگہ یگانہ اور یکتا ہے۔ صرف شاعروں میں دیکھا تو شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلے اور ٹی ایس ایلیٹ نظر آئے۔ بہت سے ہوں گے جن کی الواح مزار پر یا تو ہماری نظر نہیں پڑی یا ہم وقت کی کمی اور تھکن کی زیادتی کی وجہ سے ان تک پہنچ نہ سکے۔ پروین انگریزوں کی تاریخ کے بارے میں میری معلومات سے باقاعدہ طور پر مرعوب ہو رہی تھی اس لیے میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ بی اے میں برٹش ہسٹری میرا اختیاری مضمون تھا۔

ایک بہت وسیع و عریض اور بے حد بلند چھت والے ہال میں پہنچے تو معلوم ہوا وہیں ڈیانا اور چارلس کی شادی ہوئی تھی اور اس روز

جتنے آدمیوں کو وہاں کرسی ملی ان کے وی آئی پی ہونے میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ گزشتہ دنوں کسی نے وی وی آئی پی کی امریکن تعریف بتائی تھی' اچھی لگی سو اس موقع کی مناسبت سے اس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وی وی آئی پی وہ ہوتا جو امریکی صدر کی رہائش گاہ وائٹ ہاؤس میں مدعو ہو اور مائیکروفون پر اعلان کیا جائے کہ اس کے لیے کوئی فون کال ہے۔''

کسی نے اعتراض کیا کہ اس کے لیے صرف وی آئی پی ہونا ہی کافی ہے' اضافی وی صرف ایسے شخص کے نام کے ساتھ لگنی چاہیے جو وائٹ ہاؤس میں امریکی صدر کے ساتھ مصروف گفتگو ہو' ٹیلیفون کی گھنٹی بجے' صدر سنے اور پھر ریسیور اس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے کہے۔ ''یہ آپ کے لیے ہے۔''

ساقی فاروقی کا نام اور کلام تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ گزشتہ پچیس تیس برسوں سے بڑی عمدہ' سچی اور انوکھی شاعری کر رہا ہے' مگر اسے دیکھنا' اس سے باتیں کرنا اور اس کے ساتھ گھومنا بھی اپنی جگہ ایک عجیب وغریب تجربہ ہے۔ ایک ایسا تجربہ جس کے بارے میں فارسی والے ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' بولتے ہیں۔ چند برس قبل جب وہ پاکستان آیا اور اس سے پہلی بار بالمشافہ ملاقات ہوئی تو اس نے مغربی لباس پر گلے میں موٹے موٹے منکوں والی ایک مالا پہن رکھی تھی اور گفتگو کے دوران شیکسپیئر تھیٹر کے اداکاروں کی طرح ہاتھوں' آنکھوں' چہرے کی مومنٹ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے اتنا زیادہ کام لے رہا تھا کہ مجھے الجھن سے ہونے لگی۔ کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ن۔م۔ راشد' افتخار جالب' مظفر علی سید اور صلاح الدین محمود سے پہلی ملاقات پر بھی ہوئی تھی' یہ اور بات ہے کہ ان سب حضرات سے دو چار بار ملنے کے بعد آپ نہ صرف ان کے ''انداز'' کے عادی ہو جاتے ہیں بلکہ ایک آدھ استثنا سے قطع نظر اس سے لطف اندوز بھی ہونا شروع کر دیتے ہیں' سو ساقی کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا۔

ساقی ان چند شاعروں میں سے ہے جن کی گفتگو اور نظموں کے موضوعات میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک مخصوص قسم کا جذباتی ''وفور'' ہے' مروجہ اصطلاحات میں اس کیفیت کو سیمابیت' جوش' قوت اور جذباتیت کہا جاتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں ساقی کے حوالے سے مجھے ''وفور'' کے علاوہ کوئی لفظ موزوں نہیں لگتا۔ ساقی جب لندن گیا تھا تو اس وقت وہ اینگری ینگ مین بلکہ اینگری ینگ بوائے تھا مگر اب اس کی کنپٹیوں پر کپاس ڈیرا ڈال چکی ہے (اگرچہ اس کا چہرہ اب بھی اس کی عمر کے مقابلے میں بہت جوان ہے اور اس کی آواز کی کھنک بھی قائم ودائم ہے) اس کی آسٹرین نژاد بیوی' جسے وہ گنڈی کہہ کر پکارتا ہے' گزشتہ انیس سال سے اس کی بیوی چلی آ رہی ہے' اس اس خاتون کے باکمال ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جس نے پارے کو مٹھی میں

بند کر رکھا ہے۔ اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر لندن کی اس بہت سرد شام میں ساقی نے ہمیں اپنی اور گنڈی کی اولیں ملاقاتوں کی داستاں بہت مزے لے لے کر سنائی۔ اس کی بیٹی انگا غالباً یہ باتیں بہت دفعہ سن چکی تھی اس لیے وہ کھانا کھاتے ہی میز سے اٹھ گئی البتہ گنڈی نے بیچ بیچ میں جو جملے کسے ان سے اندازہ ہوا کہ لوہا لوہے کو اگر کاٹتا ہے تو کیسے کاٹتا ہے!

گنڈی نے بتایا کہ جب وہ ساقی سے پہلی بار ملی تو اسے انگریزی بہت کم آتی تھی اور اس کی والدہ یعنی ساقی کی ساس تو انگریزی سے بالکل ہی نابلد تھیں چنانچہ جب ساقی ان کی فیملی سے ملا تو وہ سب اس کی ''حرکتوں'' سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کی سیماب طبعی' شوریدہ مزاجی' تیز تیز بولنے کا مخصوص انداز اور گندمی رنگ ایسے نہیں بھائے کہ انہوں نے فوراً نہ صرف اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا بلکہ آج تک بیٹی کی بجائے داماد کا ووٹ بنے ہوئے ہیں۔

ساقی نے کریڈٹ لیتے ہوئے کہا کہ ان کے اسی سلوک کی وجہ سے اتنے برس انگلستان میں رہنے کے باوجود اس نے اپنی ساس کے بارے میں کبھی کوئی مذاق نہیں کیا حالانکہ اس معاشرے میں وہ Mother-in-law Jokes شرفاء کی نشستوں کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''تمہارا دین ایمان تمہارے ساتھ' البتہ مجھے اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے' کہو تو عرض کروں؟''

پروین بولی۔ ''سنائے بغیر آپ نے رہنا تو ہے نہیں' تکلف چھوڑیئے' ارشاد کیجئے۔''

میں نے گنڈی اور ساقی سے اخلاقی مدد لیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو بھئی' میرا ایمان ہے کہ لطیفہ پوری نسل آدم کی میراث ہوتا ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے اسے خلق خدا تک پہنچانا چاہیے۔ اتنی Tense اور پریشان زندگی میں کچھ تو اپنے ہونے کا احساس ہو' سو عرض کیا ہے۔

کسی نے کہا کہ Agony اور Ecstasy کسی ایک لمحے میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ دوسرے نے اختلاف کیا اور ایسی مثال دی کہ پوری محفل قائل ہو گئی۔ بولا.....

اگر آپ یہ دیکھیں کہ آپ کی نئی اور بہت قیمتی کار ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک ایسے زاویے پر پہنچ چکی ہے جہاں سے اس کا گرنا ناگزیر ہے تو اسے Agony کہیں گے لیکن اگر اس میں آپ کی Mother-in-law سوار ہو تو یہی Agony فوراً Ecstasy میں تبدیل ہو جائے گی۔

ساقی نے گنڈی کو چھیڑتے ہوئے بتایا کہ پہلی ملاقات میں جب میں نے اسے فلم دیکھنے کی دعوت دی تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی پوچھا۔ ''بائی دی وے اس فلم میں ہے کون کون؟'' گنڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بس یہی ایک غلطی ہو گئی۔''

میاں بیوی کی اس پر لطف گفتگو کے دوران ساقی کے اپنے ہم عصروں پر تبصرے بھی جاری رہے۔ بقول اس کے جہاں چار ادیب شاعر جمع ہوں وہاں ''غیبت کا شامیانہ'' خود بخود تن جاتا ہے۔ راشد اور فیض صاحب سے لے کر افتخار عارف اور گوپی چند نارنگ تک بے شمار لوگ اس کے اڑتے ہوئے تیروں کی زد میں آئے۔ خوف فساد خلق سے میں اس میدان کارزار سے صرف نظر کرتا ہوں کیونکہ احباب کے دل تو ذرا سی ٹھیس نہیں سہہ پاتے اور یہاں تو.......

مگر ایک جملہ ایسا ہے کہ چھپائے نہ بنے۔

کیٹس کا گھر ساقی کے ہمسائے میں ہے۔ اس کی زیارت تازہ واردان ہوائے لندن کو کروانا وہ اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہے۔ برادرم پروفیسر نظیر صدیقی چند برس پہلے ایک مطالعاتی دورے پر لندن پہنچے تو ایک شام وہ انہیں بھی وہاں لے گیا۔ کیٹس کا گھر دکھایا اور پھر رومانٹک انداز میں اردگرد پھیلے ہوئے باغ نما جنگل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''اور یہ ہے وہ باغ جس کے درختوں سے اڑنے والی بلبلوں کے لیے اس نے ایسی بے پناہ نظمیں لکھی ہیں۔''

نظیر صدیقی نے (دروغ برگردن ساقی) بڑے غور سے باغ کا جائزہ لیا پھر پوری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کس درخت سے اڑی تھی وہ بلبل؟''

یہ واقعہ سنانے کے بعد ساقی نے نظیر صدیقی کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا اور تقریباً اپنے بال نوچتے ہوئے کہا۔ ''ذرا ....اس کی بات پر غور کرو اس کو...... کیٹس کی نظم سے زیادہ اس درخت کی فکر تھی۔ خدا ان محققوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

ساقی کے گھر سے عبداللہ حسین کو فون کیا گیا کہ وہ بھی کھانے پر مدعو تھا۔ معلوم ہوا جس بھانجے یا بھتیجے کو اس نے اپنے سٹور پر کھڑا کر کے آنا تھا وہ کسی وجہ سے نہیں پہنچ سکا اور اب اس کے لیے ''ام الخبائث'' کے ذخیرے کو نامحرموں کی تحویل میں چھوڑ کے آنا ممکن نہ تھا۔ عبداللہ کا ''اداس نسلیں'' میں نے اپنے کالج کے ابتدائی برسوں میں پڑھا تھا اور تب سے میرے دل و دماغ میں اس کے مصنف کے لیے اچھے خیالات موجود تھے مگر عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ بیس برسوں میں عبداللہ حسین سے ٹاکرا نہ ہو سکا۔ ہم نے فون پر ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی، آئندہ ملاقات کے امکانات کا جائزہ لیا اور ایک دوسرے کی تحریروں کے بارے میں اچھی اچھی باتیں کیں۔

ساقی نے کہا۔ ''چلو سحاب کی طرف چلتے ہیں۔ اس نے فیض صاحب پر کوئی مضمون لکھا ہے جسے سنانے کے لیے آج اس نے اپنے گھر پر کچھ سامعین جمع کیے ہیں۔ تم لوگوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گی۔''

پروین نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بتایا کہ سحاب قزلباش نے اس کے ذریعے ہم دونوں سے بھی آنے کی فرمائش کی تھی لیکن ہم ساقی سے وعدہ کر چکے تھے اس لیے سحاب سے معذرت کرنی پڑی۔ اب جبکہ وقت ہے تو کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کئے جائیں!

محاورے کے اس برمحل استعمال پر ساقی جو کہ عام حالات میں بھی تھوڑا بہت پھڑکتا رہتا ہے' بالکل ہی پھڑک اٹھا اور پھر سحاب کے گھر تک گفتگو کا موضوع محاورات کا ''تخلیقی'' استعمال ہی رہا۔ میں نے بتایا کہ ایک بار انٹرمیڈیٹ کے پرچے دیکھتے ہوئے میں ''کلنک کا ٹیکہ لگنا'' کا یہ استعمال بچشم خود پڑھا ہے۔ ''میر محلے میں سب نے کلنک کے ٹیکے لگوائے تھے' میں گھر پر نہیں تھی اس لیے نہیں لگوا سکی۔''

پروین نے فقرہ چست کیا۔ ''یہ تو آپ ہی کے کسی شاگرد کا لگتا ہے۔''

''یہ بیان کسی خاتون کا ہے اور میں لڑکوں کو پڑھاتا ہوں۔''

ساقی نے حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''بھائی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جیسے بدلحاظ لوگ ڈیڑھ مہینے سے ایک ساتھ سفر کر رہے ہو اور ان میں ایک بار بھی لڑائی نہ ہوئی ہو۔ ہم سالے تو اتنی دیر میں دس بار لڑ چکے ہوتے۔''

ساقی نے میرے غریبانہ سر اور امیرانہ پیٹ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر خلاف عادت جملہ روک لیا حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔

سحاب ہمیں دیکھ کر واقعی بہت خوش ہوئیں۔ اپنی بزرگ نسل سے ہم نے ان کی خوش شکلی اور خوش آوازی کی جو داستانیں سنی تھیں ان پر تیس چالیس برسوں کی گرد جم چکی تھی اور اس برسے ہوئے بادل میں اب کوئی بجلی بھی پوشیدہ نہیں تھی مگر یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ اپنے وقت میں یہ گھٹا کتنی گھنگھور ہوگی۔

جب ہم وہاں پہنچے تو مضمون شروع ہو چکا تھا مگر کچھ اس طرح کہ نفس مضمون بار بار جھکائی دے جاتا تھا۔ ہوا یوں کہ سحاب کی نظر کی عینک کہیں ادھر ادھر ہو گئی اور باوجود کوشش بسیار کے نہیں ملی چنانچہ اب وہ نور بصارت کی کمی نور بصیرت سے پورا کرنے کی کوشش میں اٹک اٹک کر مضمون سے گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ حاضرین میں محسنہ جیلانی کے علاوہ چار پانچ اور لوگ بھی تھے جن کے نام میرے ذہن سے اتر گئے ہیں۔ مضمون کے بعد شعر و شاعری ہوئے اور اس قدرت شدت سے کہ واپسی میں رات کے دو بج گئے۔

صبح صبح برادرم غلام قادر آزاد کا فون آیا جو سکاٹ لینڈ کی شدید سردی کے باوجود محبت کی حرارت سے لبریز تھا۔ موصوف ضد کر

رہے تھے ''میں آپ لوگوں کولندن سے لیتا ہوا برمنگھم آجاتا ہوں جہاں آج شام برادر ڈاکٹر صفی حسن نے ایک محفل کا اہتمام کر رکھا ہے۔'' میرا جغرافیہ کا علم ویسے بھی کمزور ہے اور انگلستان کے ضمن میں تو یہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے باوجود مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ آزاد صاحب جو روٹ بنا رہے ہیں وہ سر سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے والا ہے۔ تھوڑی سی تفتیش پر معلوم ہوا' ہمارا شبہ صحیح تھا۔ آزاد صاحب برمنگھم سے کوئی سو میل دور اوپر کی طرف تھے اور ہم سو سو میل نیچے کی طرف۔ گویا وہ برمنگھم سے ہوتے ہوئے لندن آتے اور پھر ہمیں لے کر واپس برمنگھم پہنچتے۔ بڑی مشکلوں سے ان کو یقین دلایا کہ ہمارے پاس ٹرانسپورٹ کا معقول سے بھی کچھ بہتر انتظام ہے کہ زندگی میں پہلی بار رولس رائس میں سفر کر رہے ہیں جس میں ٹیلیفون بھی فٹ ہے۔ یہ اطلاع ہم نے ان کو بالکل ویسے دی جیسے دیہاتی آدمی پہلی بار شہر دیکھ کر اس پر تبصرہ کرتا ہے۔

اقبال ساہی کی ناخدائی میں سو سو میل کا یہ فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہو گیا۔ راستے میں ہم نے انگلستان کی ہریالی دیکھی جس سے طبیعت ہری بھری ہو گئی چنانچہ جب ڈاکٹر صفی حسن کے گھر پہنچے تو یوں محسوس ہوا جیسے ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئے ہیں۔ غلام قادر آزاد اور صفی ہمارے منتظر تھے۔ دونوں بہت خلوص اور محبت والے انسان ہیں۔ مشترکہ دوستوں اور جاننے والوں کے ذکر کا سلسلہ چھڑا اور پھر چھڑتا ہی چلا گیا۔ احمد حسن حامد کے حوالے سے بات عطاء الحق قاسمی تک پہنچی اور ظاہر ہے جب کوئی بات عطاء تک پہنچ جائے تو وہاں سے آگے ذرا رک کر ہی چلتی ہے۔ میں نے انہیں عطاء کا ایک تازہ جملہ سنایا جس کی تفصیل یہ ہے۔

کالج میں ہمارے ایک ساتھی استاد ہیں' پروفیسر غلام یسین افغانی۔ بڑے مرنجان مرنج اور دلچسپ آدمی ہیں۔ ایک دن عطاء نے انہیں بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ ''افغانی صاحب! آپ زندگی میں اور جو کچھ چاہے کیجئے گا' مگر افغانستان نہ جایئے گا۔''

افغانی صاحب نے حیران ہو کر وجہ پوچھی۔ ''عطاء نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔'' اس لیے کہ وہاں تو پہلے ہی ایک روپے کے ۸۰ افغانی ملتے ہیں۔''

ڈاکٹر سعید درانی کے بارے میں معلوم ہوا کہ کہیں قاہرہ وغیرہ کی طرف لیکچر دینے نکلے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں یہ بات بتاتا چلوں کہ امریکی خلائی مشن اپالو چاند سے جو نمونے لایا تھا ان پر تحقیق کرنے والوں سائنس دانوں میں صرف ایک شخص ایشیائی تھا اور وہ ہمارے ڈاکٹر سعید اختر درانی تھے۔ ''غربت میں جا کے چمکا گمنام وطن میں''

ہمارا کمال یہ ہے کہ غربت میں جا کے چمکنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب ابھی تک وطن میں گمنام ہیں۔ ڈاکٹر درانی کا اضافی کمال یہ ہے کہ اتنے نامور سائنس دان ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادب اور شاعری سے بھی باقاعدہ تعلق استوار رکھا ہے۔ کلاسیکل انداز

کی صاف ستھری Goody Goody شاعری کرتے ہیں اور علامہ اقبال کے قیام جرمنی کے بارے میں بے حد اہم تحقیقی مواد بھی گاہے گاہے سامنے لاتے رہتے ہیں۔

غلام قادر آزاد پیشے کے اعتبار سے بینکر ہیں لیکن ان کا خوبصورت دل بھی ادب کے تیر نیم کش کا گھائل ہے۔اپنے اور ہمارے مشترکہ دوست احمد حسن حامد کی طرح بھاری بھرکم، گول مٹول، کھلے ڈلے اور سراپا اخلاص آزاد سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ان کے نام کی رعایت سے شعروں کا ذکر چلا تو عجیب عجیب شعر سامنے آئے مگر میدان پھر بھی اسی کے ہاتھ رہا جس کا دیوان کھولنے سے پہلے چومنے کو جی چاہتا ہے۔کیا زندہ رہنے والا شعر ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

نشست کے لیے جس گھر کا انتخاب کیا گیا اس کے بارے میں مجھے سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ واپسی پر میرا ایک بہت پسندیدہ مفلر وہیں رہ گیا تھا اور جو سالن میں نے پلیٹ میں ڈالا تھا اس میں انتہائی دیندار قسم کی مرچیں تھیں کیونکہ میں نے زندگی میں ''توبہ توبہ'' کا اس قدر ورد ایک ہی نشست میں کبھی نہیں کیا تھا۔

مرچوں کی اس واردات سے قطع نظر میزبان انتہائی میٹھے اور ملنسار تھے۔اس محفل میں سوشیالوجی کے ایک استاد محمد حسن عسکری (تنقید والے نہیں) سے ملاقات ہوئی جو وہیں کہیں پڑھاتے تھے مگر سخن فہموں کی انتہائی اعلیٰ قسم سے تعلق رکھتے تھے۔اچھے شعر کو سن کر ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک ابھرتی تھی۔ان کے چہرے کا تاثر بالکل نہیں بدلتا تھا اور نہ ہی وہ منہ سے کوئی تحسینی کلمہ ادا کرتے تھے مگر آپ کو معلوم ہو جاتا تھا کہ شعر کہیں 'پہنچا' رکا اور گونجا ہے۔

چند برس پہلے ''کالا دھندہ گورے لوگ'' نامی فلم ریلیز ہوئی تھی۔اس محفل میں اس کے پروڈیوسر کفایت حسین سے بھی ملاقات ہوئی جو پیشے کے اعتبار سے کمرشل آرٹسٹ اور ڈیزائنر ہیں۔ان سے آئندہ صبح شیکسپیئر کے آبائی گاؤں کی سیر کا پروگرام بنا۔معلوم ہوا گلوکارہ ناہید نیازی اور اپنے ضیاء محی الدین بھی برمنگھم میں ہی پائے جاتے ہیں۔ضیاء سے فون پر بات ہوئی۔انہوں نے ناشتے کی دعوت دی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے میزبان اول یعنی ڈاکٹر صفی حسن اپنے ''استحقاق'' سے دستبردار ہونے کے موڈ میں نہیں تھے اور ان کی بات میں وزن بھی تھا کہ میزبان کے گھر سے کم از کم ایک وقت تو کچھ کھا پی لیں سو میں نے ضیاء سے معذرت کی اور ''یار زندہ صحبت باقی'' قسم کی گفتگو سے کام چلایا کہ بزرگوں نے یہ چیزیں آخر کس مقصد کے لیے اختراع کی تھیں!

شیکسپیئر کا آبائی گاؤں Start-Ford-upon-Avon کہلاتا ہے جسے عرف عام میں On-Avon بھی کہتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ سکہ بند سفرنامہ نگاروں کی طرح میں عمارتوں اور شہروں وغیرہ کے بارے میں تاریخی معلومات اور اعداد و شمار جمع نہیں کر سکا ورنہ اس موقع پر دو تین صفحے باآسانی کالے ہو سکتے تھے۔

غلام قادر آزاد صبح صبح چلے گئے کہ انہیں جا کر بنک کا کام دیکھنا تھا اور ان کی جگہ کفایت' ان کی بیگم اور دو ننھی منی پیاری پیاری بچیاں ہمارے ساتھ شامل ہو گئیں۔ کہر اور بارش کے درمیان آگے پیچھے رواں تھیں۔ ہوا میں نمی اور ٹھنڈک کے ساتھ ایک عجیب سی خاموشی جیسے رینگتے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یہ ایک مخصوص ''انگریز'' ماحول تھا...... سنجیدہ' باوقار' سرد مہر اور برخود غلط۔

اون ایوان ماضی میں جو کچھ بھی رہا ہو اب اس کا تشخص اول تا آخر شیکسپیئر ہے۔ وہ خود تو دل برداشتہ ہو کر بہتر مستقبل اور اظہار کی تلاش میں لندن کی طرف نکل گیا تھا مگر اب دنیا بھر سے سیاح اس کی جنم بھومی دیکھنے آتے ہیں اور یوں وہ علاقہ جو ایک فرد کو معاشی تحفظ نہیں دے سکا تھا اب اسی شخص کی وجہ سے اس پورے قصبے کی معیشت بہتر ہو گئی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ زندے مردوں کا رزق کھاتے ہیں۔

شیکسپیئر میوزیم سے ملحق اس کا چھوٹا سا گھر ایک قومی اور ثقافتی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے اور اس میں شیکسپیئر کے عہد' اس سے متعلق اشیاء' دستاویزات' خبروں اور یادگاروں کو بڑے سلیقے سے جمع کر دیا گیا ہے۔ ان میں ایسی ایسی تفصیلات بھی ہیں جنہیں ہم اپنے مشاہیر کی زندگیوں سے اس لیے نکال یا چھپا دیتے ہیں کہ کسی کو ان کے انسان ہونے کا یقین نہ آ سکے۔ بڑے انسان کو ''انسان'' سمجھ کر اس سے استفادہ کرنے کا یہی گر ہے جس نے مغرب کو بہت سے میدانوں میں اس قدر آگے پہنچا دیا ہے مگر اس ذکر سے حاصل! ہم لوگ فرشتے اور شیطان کے دو کناروں کے درمیان جھولنے والے وہ آدم زاد ہیں جنہیں انسان بننے یا کہلوانے سے شرم آتی ہے۔

چار بجے شام اردو مرکز لندن میں افتخار عارف نے ہمارے ساتھ ایک نشست رکھی تھی جو پروین کے بائیکاٹ کی وجہ سے اب صرف ''میرے'' ساتھ منعقد ہو رہی تھی۔ خیال تھا' وطن عزیز کی طرح وہاں بھی لوگ آدھ پون گھنٹہ تاخیر سے جمع ہوں گے مگر جب پونے پانچ بجے وہاں پہنچا تو معلوم ہوا تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد افتخار عارف نے لوگوں کی بے چینی اور ہال کی تمام نشستیں پر دیکھ کر مشاعرہ شروع کروا دیا ہے۔ اوسلو (ناروے) سے اردو ماہنامہ ''کارواں'' کے نوجوان مرد مجاہد صاحب آئے ہوئے تھے۔ انہیں عارضی طور پر مہمان خصوصی بنا دیا گیا تھا اور مشہور ماہر قانون' پنجاب ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس اور قانون کے سابق وفاقی سیکرٹری جسٹس اے کے ایم صمدانی صدارت کر رہے تھے۔ حاضرین میں اتنے بہت سے شناسا چہرے نظر آئے کہ میری معذرت

کے کلمات معانقوں اور مصافحوں کے ہجوم میں کہیں کھو گئے۔ ایک نیام میں دو تلواریں بے شک نہ رہتی ہوں' مگر ایک مشاعرے میں دو بلکہ بعض اوقات تین چار مہمانان خصوصی بھی بھگت جاتے ہیں۔ سو اسٹیج پر ایک کرسی بڑھادی گئی اور مشاعرہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے پھر شروع ہو گیا۔ افتخار عارف نے میرے کان میں بتایا کہ یہ مشاعرہ بھی منیر نیازی کے اس مصرعے کی طرح ہے۔ ''اک واری جد شروع ہو جائے گل فیر اویں مکدی نہیں!''

مشاعرے میں لندن میں مقیم یا موجود بیشتر اردو شاعر موجود تھے چنانچہ یہ نشست خوب جمی۔ ایک شاعر' جن کا تخلص غالباً شمسی تھا' کسی حادثے میں بینائی سے محروم ہو چکے تھے چنانچہ جب وہ شعر سنانے کے لیے آئے تو ان کی بیگم بطور پرامٹر ان کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ میں نے دیکھا انہوں نے شمسی صاحب کی غزل ہندی رسم الخط میں لکھی ہوئی تھی۔ ایک اور نابینا شاعر شوقین بدایونی صاحب تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو لاہور کے بچھڑے ہوئے دوست جمع ہو گئے۔ شاہد محمود ندیم (جو کبھی ٹی وی میں پروڈیوسر تھا)' ہمراز احسن (سابق صحافی)' بدیع الزماں (ٹی وی کا مشہور اداکار)' رابعہ سنبل (شاہد کی بیگم)' فارغ بخاری (ہمارے بزرگ ترقی پسند دوست اور شاعر)...... ان کے علاوہ عاشور کاظمی' شاہدہ احمد اور بہت سے دوسرے احباب۔

اگلے دن دوپہر کو یوسفی صاحب نے لنچ پر بلا رکھا تھا۔ یوسفی صاحب سے محبت کا رشتہ تو ان کی تحریروں جتنا پرانا ہے کہ میں انہیں اور شفیق الرحمٰن کو اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار مانتا ہوں لیکن ان سے ملاقات بہت کم رہی ہے جس کی واحد وجہ مکانی فاصلہ ہے کہ جب ان سے تعارف ہوا تو وہ کراچی میں تھے اور جب کچھ تعلق خاطر (ان کی طرف سے بھی) پیدا ہوا تو انہیں آغا حسن عابدی اچک کر لندن لے گئے۔ میرے پاس یوسفی صاحب کا دس بارہ برس پہلے کا ایک خط محفوظ ہے جو انہوں نے میرے کسی خط کے جواب میں بزبان انگریزی لکھا بلکہ ٹائپ کروایا تھا اور جس میں مجھے خط کی رسید کے ساتھ یہ اطلاع دی گئی تھی کہ وہ بینکنگ کونسل کے صدر کی حیثیت سے دو ہفتے کے لیے ملک سے باہر جا رہے ہیں اور واپس آ کر مجھے تفصیلی جواب لکھیں گے۔ یہ تفصیل پانچ چھ سطروں میں تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خط کے اوپر' نیچے اور اردگرد خالی جگہ پر انہوں نے اردو میں کوئی بیس پچیس سطروں کا ایک علیحدہ خط لکھا تھا جس میں بتایا تھا کہ مصروفیت کی وجہ سے انہیں انگریزی میں خط لکھنا پڑا ہے جس کے لیے معذرت خواہ ہیں!

لنچ سے پہلے ان سے بی سی سی آئی کے دفتر میں ملاقات طے تھی۔ ان تک پہنچنے میں بڑے ادب آداب سے گزرنا پڑا۔ بہت سے گوروں اور گوریوں نے ہماری رہنمائی کی' کئی بار نام' کام اور پتا پوچھا۔ دو تین مختلف کمروں اور لفٹوں میں اٹھایا' بٹھایا اور چڑھایا۔ خدا خدا کر کے کوئی دس منٹ بعد ہم ایک چھوٹے سے ریٹائرنگ روم میں پہنچائے گئے جہاں یوسفی صاحب ہمارے منتظر تھے۔ میں

نے ان سے چھوٹتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ ایک مزاح نگار ہونے کے ناطے وہ ایسی تھری پیس اور ٹائی کالر والی زندگی کیسے گزار لیتے ہیں کہ مزاح نگار کا رزق تو بے ترتیبی میں ہوتا ہے۔ انہوں نے میری بات ایک ایسی مسکراہٹ میں لپیٹ دی جو ان سے پہلے میں نے صرف فیض صاحب کے چہرے پر دیکھی تھی اور میں ان کا منہ تکتا رہ گیا۔

یوسفی صاحب' صاحب کمال ہونے کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کے ''کمال پرست'' (Perfectionist) بھی واقع ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں لفظوں اور جملوں کو مانجھنے اور ان کی تراش خراش میں مختار مسعود ان کے ہم سر ہوں تو تیسرا کوئی نہیں ہے۔ بتانے لگے کہ انہوں نے پچھلوں دنوں کوئی تیرہ سو صفحات پر مشتمل اپنے مسودے ضائع کیے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک درجہ کمال کو نہیں پہنچتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ تو آپ نے بہت ظلم کیا' بلکہ کمایا ہے' اس لیے کہ آپ کا معیار ان ہزاروں' لاکھوں قارئین کے معیار سے بہت اونچا ہے جو آپ کی تحریروں کے بے چینی سے منتظر رہتے ہیں' آپ اپنے ذوق کی بلندی پر ان بے چاروں کو کیوں لٹکا رہے ہیں؟ میری بات سن کر وہ پھر فیض صاحب بن گئے۔ میں نے ٹی ایس ایلیٹ کی مثال دی کہ وہ کسی ادب پارے کو خیال کی سطح پر رد کرنے کے خلاف تھا اور کہتا تھا جو بات ذہن میں آئے اسے لکھ کر محفوظ کر لینا چاہیے' کچھ وقت گزرنے کے بعد اسے پھر پڑھیں اور اس وقت فیصلہ کریں کہ وہ چیز نا قابل اشاعت ہے یا نہیں!

یوسفی صاحب اپنی اس بھلی مانس مسکراہٹ کے درمیان ہولے سے بولے۔

''یہی تو میں نے کیا ہے۔''

لنچ پر جاتے ہوئے راستے میں میں نے یوسفی صاحب کو بتایا کہ میں نے اس سفر کے دوران میں ڈائری لکھی ہے اور اب میرا ارادہ ان یادداشتوں کو سفرنامے کی صورت میں لکھنے کا ہے۔ بولے ''ایسا نہ کیجئے گا۔''

میری حیرت اور پریشانی دیکھ کر کہنے لگے۔ ''مجھے خدانخواستہ آپ کے لکھنے کی اہلیت پر شک نہیں ہے' دراصل مجھے سفرناموں کی کثرت نے حیران اور ان کی سطحی انداز اور داستان طرازی نے پریشان کر دیا ہے۔ میں نے ایسی ایسی بوگس' من گھڑت اور افسانوی باتیں پڑھی ہیں کہ اس صنف ادب سے میرا ایمان ہی اٹھ گیا ہے۔''

میرا جی چاہا کہ میں بھی جواب میں ان کی سی فیض صاحب مارکہ مسکراہٹ پیش کروں مگر کسی نے کہا ہے کہ ''ایں سعادت بزور بازو نیست'' تو اب پتا چلا کہ اس مطلب کیا ہے۔ میں نے ابن انشاء' مستنصر حسین تارڑ' عطاء الحق قاسمی' محمد خالد اختر' اشفاق احمد' جمیل الدین عالی اور محمد کاظم کی مثالیں دیں کہ دیکھیے ان لوگوں نے کیسے مزیدار سفرنامے لکھے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمٰن کے

رپورتاژوں کا حوالہ دیا مگران کی رئے میں کوئی تبدیلی نہ لاسکا۔ کہنے لگے" آپ شاعر' ڈرامہ نگار' نقاد اور مترجم ہیں اور خیر سے خاصے مشہور بھی ہیں' اگر سفرنامہ نہیں لکھیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی؟" میں نے انہیں اپنے سفرنامے کے متوقع محاسن سے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں ان تمام برائیوں سے احتراز اور گریز کا ارادہ رکھتا ہوں جن کی وجہ سے وہ سفرنامے سے بدظن ہو چکے ہیں۔ اتنے میں ہوٹل آ گیا اور بات درمیان میں رہ گئی۔

اگلے دن صبح آکسفورڈ اسٹریٹ میں واقع مکرم کا دفتر دیکھا۔ صمدانی صاحب بھی اسی دفتر کے ساتھ وابستہ تھے اور اس دن کے لیے انہوں نے ہمیں لندن دکھانے اور گھمانے کی پیش کش کر رکھی تھی۔ افتخار نے پیپر منٹ والی چائے بنائی جسے اجتماعی طور پر رد کر دیا گیا۔ وہ دوبارہ چائے بنانے لگ گیا۔ اس دوران میں اقبال ساہی نے لندن میں اپنے تعلقات عامہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ائیر فرانس کے بڑے مشکل ٹکٹ کو پی آئی اے کی فلائٹ پر اس قدر آسانی سے منتقل کرایا کہ جملہ حاضرین عش عش کر اٹھے۔

صمدانی صاحب کے ساتھ جب ہم "لندن کا ایک دن" ٹائپ مشن پر نکلے تو طے پایا کہ لندن کو اس طرح سے دیکھا جائے جو سیاحوں کا وطیرہ ہے یعنی پیدل چل کر یا سب وے میں بیٹھ کر۔ لندن کی سب وے' ٹیوب ٹرین یا زیر زمین ریل گاڑی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ چاروں طرف سمندر سے گھرے ہوئے اس جزیرے میں' جہاں اوپر سے بھی سارا سالا پانی پڑتا رہتا ہے' سطح زمین سے ڈیڑھ دو سو فٹ گہرائی میں' لندن کی سڑکوں کے نیچے ایک عجیب وغریب نظام جاری وساری ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تیز رفتار ٹرینیں آتی ہیں' مسافروں کو اٹھاتی اور اتارتی ہیں اور پھر اگلے اسٹیشن کی طرف چل سو چل۔ ارضیات کے بارے میں ہمارے علم کی ابتدا سیالکوٹ کے ننھیال کے گھر کے دروازے پر واقع کنواں تھا جس کی گہرائی کوئی چالیس پچاس فٹ تھی اور انتہا بھی کم وبیش یہی تھی کہ زمین کے نیچے تقریباً اسی فاصلے پر پانی کی ایک سطح ہوتی ہے جہاں تک سوراخ کر کے پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات یہ سطح اس قدر بلند ہوتی ہے کہ پانی سیم وغیرہ کی شکل میں اوپر تک آجاتا ہے مگر یہاں یار لوگوں نے سطح زمین سے دو سو فٹ نیچے تک گاڑیاں چلا رکھی ہیں اور پانی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

خیر یہ تو اس طرح کی خبر ہے جس میں سے خبر کا عنصر غائب ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں سو ہم اس قصے کو یہیں چھوڑتے ہوئے صمدانی صاحب کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہمارا پہلا پڑاؤ پاکستانی سفارت خانہ تھا جہاں کچھ دیر کمرشل اتاشی اور پروین کے افسر جہانگیر خاں صاحب سے گپ شپ ہوئی۔ اس کے بعد فرسٹ سیکرٹری منصور عالم صاحب کے پاس کچھ دیر بیٹھے۔ انہوں نے فون پر علی ارشد صاحب سفیر پاکستان کو ہمارے آنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے فوراً اپنے کمرے میں بلوا لیا اور کافی پلوائی۔ انگلستان میں مقیم

پاکستانیوں کے مسائل اور شکایات کے تذکرے سے گفتگو کا رخ دیار غیر میں قومی تشخص کی تعمیر اور بقا کی طرف مڑ گیا اور بات پاکستان ٹیلیویژن تک پہنچ گئی کہ وہ لوگ اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ کوئی مدد نہیں کرتے بلکہ بی بی سی یا آئی ٹی وی پر دکھانے کے لیے پروگراموں کے اتنے زیادہ پیسے مانگتے ہی کہ کوئی اس بھاری پتھر کو اٹھانے کے لیے آگے نہیں بڑھتا۔ٹی وی سے میرے تعلق کی وجہ سے شاید وہ مجھے بھی ٹی وی کا آدمی سمجھ رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے انہیں بتایا کہ ٹی وی بہت انصاف پسند ہے' جس آنکھ سے انہیں دیکھتا ہے اسی سے مجھے بھی دیکھتا ہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ٹی وی کسی دوسرے نیٹ ورک یا ویڈیو کمپنی کو ہمارے ڈرامے بیچنے پر اوریجنل فیس کا دس فیصد ادا کر کے ہم سے دائمی حقوق حاصل کر لیتا ہے تو ان کے ہاتھ سے کافی کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ میں نے ان کی پیالی میز پر رکھنے کا انتظار کرنے کے بعد بتایا کہ یہ رائلٹی عام طور پر ایک سو روپے سے بھی کم ہوتی ہے۔

علی ارشد اور منصور عالم چند لمحے ہکے بکے میری طرف دیکھتے رہے۔ پروین نے انہیں بتایا کہ پندرہ بیس برس کی ریاضت اور محنت کے بعد جب کوئی شاعر ٹی وی کے آل پاکستان مشاعرے میں پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے اس کارنامے پر مبلغ تین سو روپے پیش کئے جاتے ہیں نصف جن کے ایک سو پچاس سے بھی کم ہوتے ہیں کیونکہ ٹی وی والے محکمہ انکم ٹیکس کی ہدایت پر ہر چیک سے تین فیصدی وضع کر لیتے ہیں۔

میں نے کہا۔نظیر اکبر آبادی نے کیا اچھا شعر کہا ہے۔

حکم حاکم ہے کہ اس محکمہ عدل کے بیچ
دست فریاد کو اونچا نہ کرے فریادی

پروین بولی۔ "آپ کو شاید علم نہ ہو ایک بار کراچی ٹی وی پر نظیر اکبر آبادی کے نام کا چیک کئی مہینے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں پڑا رہا تھا اور ایک بہت سینئر افسر نے اس پر جواب طلبی بھی کی تھی کہ ٹیلنٹ کو اس کا چیک کیوں نہیں پہنچایا گیا؟"

علی ارشد اور منصور عالم کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے انہیں ایک اور واقعہ سنایا۔

"غالب کی صد سالہ برسی کے دنوں میں پاکستان نیشنل سنٹر کے صدر دفتر سے تمام نیشنل سنٹروں کو ہدایت دی گئی کہ دیگر تقریبات کے ساتھ ساتھ غالب کی زمینوں میں ایک عدد مشاعرے کا بھی اہتمام کریں۔ اس پر ایک ریذیڈنٹ ڈائریکٹر نے جواب لکھا تھا کہ جناب میں نے شاعر تو سارے بک کر لیے ہیں مگر بتایا جائے کہ غالب کی وہ زمینیں کہاں ہیں جن پر مشاعرہ کروانا ہے کیونکہ مجھے تلاش کے باوجود ان کا سراغ نہیں مل رہا!"

علی ارشد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’چلئے اسی بات پر اب یہ بتایئے کہ آپ لوگوں کے اعزاز میں ہم کس دن مشاعرہ کریں؟‘‘
طے پایا کہ ۳۱ دسمبر کی شام موزوں رہے گی تا کہ ہم لوگ لندن میں سال کی آخری رات کی تقریبات بھی دیکھ سکیں۔ وہاں سے نکل کر پھر سب وے میں سوار ہوئے اور مادام تساؤ کے موم گھر کے قریبی اسٹیشن پر اترے۔ سب وے اور اسٹیشن پر بہت رش تھا اس لیے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پروین کے بڑے بیگ میں سے اس کا چھوٹا پرس کب اور کہاں گر گیا یا نکالا گیا۔ پرس میں ۱۵۰ ڈالر اور اس کے محکمے کے شناختی کارڈ بھی تھا۔ کچھ دیر نقصان پر افسوس اور پھر اس حسن اتفاق پر شکر ادا کیا گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک ٹکٹ اور پاسپورٹ بھی اس پرس میں تھے اگر اقبال ساہی نے وہ لے نہ لیے ہوتے تو اس وقت بہت لمبی مصیبت پڑ جاتی۔ پنجابی میں ایک محاورہ ہے آدمی موت دیکھ کر بخار پر راضی ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ ایسے ہی موقعوں کے لیے وضع کیا گیا ہے۔
مادام تساؤ کے اس موم گھر کا معاملہ کچھ کچھ لاہور کے شاہی قلعے جیسا ہے یعنی ہر آنے والے کے لیے اسے دیکھے بغیر جانا معیوب ہی حرکت سمجھی جاتی ہے اور سچ پوچھئے تو یہ تاثر کچھ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب موم مجسمے ہیں نظر بار بار دھوکا کھا جاتی ہے۔ گئے ہوؤں کے ساتھ ساتھ یہاں کچھ ایسے لوگوں کے مجسمے بھی ہیں جو اپنے اپنے میدان میں تاریخ ساز تو ہیں مگر ابھی خود تاریخ کا حصہ نہیں بنے یعنی ہمارے آپ کے درمیان سانس لے رہے ہیں۔ ان میں کرکٹ کا انگریز کھلاڑی جیف بائیکاٹ فٹ بال کا برازیلین ہیرو پیلے اور امریکن ٹینس سٹار جان میکنرو بھی شامل ہیں۔ وقت بھی کیسا ظالم ہے کہ آج یہی میکنرو جو ابھی تیس برس کا بھی نہیں ہوا اپنی بہار جانفزا دکھا چکنے کے بعد اب ٹینس کے بڑے مقابلوں میں چھوٹے چھوٹے کھلاڑیوں سے شکست کھاتا نظر آتا ہے۔ یہاں ہم نے ایک انتہائی بدمزہ سینڈوچ کھایا اور اس خیال سے مسرت حاصل کی کہ ہم یہاں مستقل قیام کے لیے نہیں آئے۔
پروین نے برانٹے سسٹرز کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر بنوائی اور ان کی تحریروں کی تعریف میں انگریزی لٹریچر کی ایک اچھی طالبہ ہونے کے حوالے سے خاصا علمی قسم کا لیکچر جھاڑا۔ میں نے کہا۔ ’’مجھے تو یہ جگہ محمد حسین آزاد کے شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار کی سی لگ رہی ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ سفید فاموں کا نسلی غرور یہاں بھی انصاف پر حاوی نظر آ رہا ہے۔ تیسری دنیا کے بہت سے مشاہیر یہاں موجود شخصیات سے بڑے ہیں لیکن انہیں یہاں جگہ نہیں دی گئی۔ صمدانی صاحب اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کے نیچے دھیرے سے مسکرائے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ’’بات یہ ہے امجد صاحب کہ غریب قوموں کا بڑا آدمی بھی امیر قوموں کے بڑے آدمی سے ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ ہاں بھی وہی Some are more equal والا معاملہ چلتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''چھوڑیے اسے' آیئے برٹش میوزیم چلتے ہیں' سنا ہے وہاں اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں دیکھ کر اقبال چلا اٹھے تھے۔ ''جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ!''

برٹش میوزیم پہنچتے پہنچتے چار بج گئے۔ معلوم ہوا پونے پانچ بجے دروازے بند اور کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ پورے سفر کے دوران یہ واحد مقام تھا جہاں داخلے کے لیے ٹکٹ نہیں خریدنا پڑا۔ صمدانی صاحب کے تجربے سے فائدہ اٹھایا گیا۔ معلوم ہوا پہلی منزل پر اسلامی دنیا کے نوادرات اور دوسری منزل پر آرٹ کے نمونے ہیں جن کے جاپانی' چینی اور مصری حصے خاصے کی چیز ہیں۔ ہم نے جلدی جلدی دو تین بڑے بڑے ہالوں کا چکر لگایا' پٹیوں میں لپٹی ہوئی مصریوں کی ممیاں دیکھیں جن کے قد غیر معمولی طور پر چھوٹے تھے۔ شاید چالیس پچاس صدیوں کے فاصلے نے ان کی یہ حالت کر دی ہو۔

پروین نے کہا۔ ''ان کی یہ حالت پانچ ہزار سال میں ہوئی ہے' یہاں تو لوگ اپنی زندگیوں میں ہی دیو سے بونے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔''

اسی کمرے میں دو ہزار سال قبل مسیح کے سنگ مرمر اور دوسرے پتھروں کے خوبصورت تراشتے ہوئے برتن الماریوں میں رکھے تھے۔ بعض میں تو اس قدر نفاست تھی کہ شفیق الرحمٰن کا مضمون ''ٹیکسلا سے پہلے اور ٹیکسلا کے بعد'' یاد آ گیا۔ جی چاہا ان الماریوں کو کھول کر ان برتنوں کے نیچے مہریں چیک کی جائیں کہیں یہ بھی تو میڈ ان جاپان' کوریا یا تائیوان تو نہیں ہیں!

ابھی میں اسی سوچ میں گم تھا کہ نظیر اکبر آبادی کا ایک زندہ جاوید مصرعہ میوزیم کے در و بام پر لہرانے لگا۔ ''اب کوچ نقارہ باج چلا' چلنے کی فکر کرو بابا!''

لندن کی سردی کینیڈا کے برف زاروں سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اوپر سے اس روز تھکن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہڈیوں میں گھر بناتی جا رہی تھی۔ ہم نے صمدانی صاحب کی طرف دیکھا جو یقیناً ہم سے زیادہ تھکے ہوئے تھے مگر ان کے چہرے پر مسکراہٹ اس قدر تر و تازہ تھی جیسے ابھی ابھی گھر سے طلوع ہوئے ہوں۔

اگلے روز ان کے گھر ناشتے کی دعوت تھی جو وقت اور کھانے کی نوعیت کے اعتبار سے کسی صورت لنچ سے کم نہیں تھی۔ بیگم صمدانی نے بیوٹی کورس کر رکھے تھے چنانچہ انہوں نے پروین پر اپنے کمال فن کو آزما کر دکھایا۔ پروین کا چہرہ کسی ایسی لڑکی جیسا ہو گیا جس نے ابھی ابھی میٹرک کے امتحان میں اپنی کامیابی کی خبر سنی ہو۔

دوپہر کو شاہدہ احمد کے گھر کھانے کی دعوت تھی۔ ہم سے ان کا پتا اور فون نمبر کھو گئے چنانچہ ہم ان کے گھر اس وقت پہنچے جب سہ

پہر ڈھل رہی تھی۔ وہاں دیگر احباب کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی اور عاشور کاظمی صاحب سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی اور خوب گپ شپ رہی۔ ہماری میزبان شاہدہ احمد بہت ہی اچھی اور خوش اخلاق خاتون ہیں اور ہمیں یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ وہ ٹانگوں کے کسی انتہائی موذی مرض میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ان کے پٹھے سوکھتے جا رہے ہیں اور خدشہ ہے کہ آئندہ دو تین برسوں میں وہ ٹانگوں کی حد تک بالکل معذور ہو جائیں گی۔ دھیان ایک بار پھر ان سوالوں کی طرف گیا جنہیں زبان پر لانے کا فوری نتیجہ دائرہ اسلام سے خروج کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

رات کا کھانا افتخار عارف کے گھر پر تھا جہاں شہرت بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی جو اسلامیہ کالج کے میرے استاد اور ہمارے سینئر شاعر ہیں۔ بہت دل زدہ اور غمگین تھے کہ اس عمر میں انہیں جلاوطنی کا دکھ سہنا پڑ رہا ہے مگر مجبوری یہ تھی کہ ان کی بیگم فرخندہ بخاری سیاسی وجوہات کی بنا پر پاکستان میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بی بی سی اردو سروس کے رضا علی عابدی ملے۔ انہوں نے بتایا کہ اردو سروس کے انچارج ڈیوڈ پیج کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوگئی ہے اور کل صبح ہمیں انٹرویوز کے لیے تکلیف کرنا ہوگی۔

بی بی سی کے ''بش ہاؤس'' کی اردو سروس کا ماحول بھی کم و بیش وی او اے اور اپنے ریڈیو پاکستان جیسا تھا۔ وہاں راولپنڈی کے نوجوان شاعر شاہد ملک سے ملاقات ہوئی جو تازہ تازہ وہاں آیا تھا۔ انٹرویز مجیب صدیقی نے کئے جو سراسر سرسری نوعیت کے تھے۔

پاکستانی سفارت خانے میں مشاعرے کی محفل خاصی دلچسپ تھی۔ سامعین میں خواجہ شاہد حسین بھی نظر آئے۔ نشست فرشی تھی اور سننے والے شوقین۔ خوب لطف رہا۔ سامعین میں چوڑی دار پاجامے سے لے کر ولایتی پائپ تک ہر طرح کے لوگ موجود تھے اس لیے واہ واہ' سبحان اللہ کے ساتھ ساتھ ویل سیڈ اور ویری گڈ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

۳ جنوری کی صبح لندن میں ہمارے قیام کی آخری صبح تھی۔ ایک مہینہ بائیس دن بعد ہمارا رخ اپنے وطن کی طرف ہو رہا تھا۔ لندن کی کہر' سردی اور سفر کی تھکن کے اس پار مجھے لاہور کی چمکتی صبحیں اور جنوری کا خوبصورت موسم دکھائی دے رہا تھا اور اس پر سپر امپوز ہوتے ہوئے میرے اپنوں اور پیاروں کے چہرے۔

صابر چوہدری کے گھر کی کھڑکی سے میں نے بارش میں بھیگتے ہوئے لندن کو دیکھا۔ زمان و مکان کے مختلف تصورات میرے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ ایک نظم کی لائنیں جیسے کھڑکی کے شیشے پر اپنے آپ رقم ہونے لگیں۔ ایک ایسی نظم کی لائنیں جسے بہت دن بعد کسی اور شہر' کسی اور موسم میں مکمل ہونا تھا۔

دن رات کے آنے جانے میں

دنیا کے عجائب خانے میں
کبھی شیشے دھندلے ہوتے ہیں' کبھی منظر صاف نہیں ہوتے

یہ دھندلے شیشے اور یہی نیم روشن اور ناصاف منظر .... زندگی کے سکے کے دونوں طرف شاید یہی کچھ ہے .... یا .... شاید کچھ اور ہے!

انبالہ

۱۳ مارچ کو بارہ بج کر دس منٹ پر جب ہم انڈین بارڈر کراس کر کے ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچے تو ہماری حالت آج سے ۳۴ برس پہلے یہاں سے گزرنے والے قافلوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ میں نے پہلے عطاء کی طرف اور پھر اردگرد پھیلی ہوئی ان گنت رنگ برنگی پگڑیوں کی طرف دیکھا جن کے نیچے کم وبیش ایک ہی جیسی شکلوں والے بہت سے آدمی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

پاکستانی کرنسی بدلنی ہے؟ امرتسر کے لیے ٹیکسی چاہیے؟ کوئی چیز لائے ہیں؟ (زیرلب) لہوروں آئے او بادشاہو؟

مختلف آوازوں کے اس ہجوم پر مستزاد ان دو مزدوروں کی بھیک مانگتی ہوئی آنکھیں تھیں جو ہمارا سامان اٹھا کر لائے تھے اور اس کے قریب یوں کھڑے تھے جیسے جانے کے لیے راستہ نہ مل رہا ہو۔

''لو بھائی عطاء الحق قاسمی' تم امرتسر کے بہت قصے سنایا کرتے ہو اب تم ہی انہیں سنبھالو۔''

عطاء نے میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور مکھن لگایا۔ ''انتظامی معاملات میں تمہارے سلیقے کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں۔''

میں نے رہنمائی کی یہ سند توصیف بڑے اطمینان سے وصول پائی اور سب سے قریب کھڑے ٹیکسی والے سے ایسے سرسری لہجے میں پوچھا جیسے یہاں سے میرا روز روز آنا جانا ہو۔

''ہاں جی فیئر ٹھیک کتنے پیسے ہوں گے؟''

ٹیکسی والے نے میری بے تکلفی سے متاثر ہوئے بغیر بتایا کہ ٹیکسی کا ریٹ مقرر ہے اور کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ ثبوت کے لیے اس نے مجھے قریب ہی لگا ہوا ایک بورڈ پڑھنے کی ہدایت کی اور سامان ڈگی میں رکھنا شروع کر دیا۔ بھیک مانگتی ہوئی آنکھوں کے ایک جوڑے نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ ''مہاراج کچھ چاء پانی......''

میں نے بتایا کہ ان کی مزدوری ادا کی جا چکی ہے' اور ایک بورڈ پر بڑی وضاحت سے لکھا ہوا ہے کہ مزدوروں کو براہ راست ادائیگی نہ کریں۔ اس پر اس نے ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ بے اختیار میرا ہاتھ جیب کی طرف چلا گیا۔

ٹیکسی ہندوستان کی بنی ہوئی تھی اور یہ بات اگرچہ اس کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی لیکن ہم یہ سوچ کر چپکے بیٹھے رہے کہ ہم نے تو

آج تک ایسی موٹر بھی نہیں بنائی۔ ڈرائیور نے تقریباً ٹیک آف کرنے کے انداز میں انجن اسٹارٹ کیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ابھی تین دن قبل ہم سرگودھا جاتے ہوئے ویگن اور ٹرک کے ایک انتہائی خوفناک تصادم سے معجزانہ طور پر بچ چکے تھے۔ لیکن اس ٹیکسی والے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ قدرت اپنے فیصلے پر نظرثانی کا ارادہ کر رہی ہے۔ اس سے پیشتر کے پہیے سڑک سے بلند ہوتے ایک چیختی ہوئی بریک جمہوریت میں ایمرجنسی کی طرح لگی اور اگلا دروازہ کھول کر ایک فوجی افسر گاڑی میں داخل ہوا۔ ٹیکسی دوبارہ مائل بہ پرواز ہوئی۔ سڑک کے چاروں طرف ہرے بھرے کھیت اور ٹیکسی کے اندر ایک سنگین خاموشی تھی جو دم بہ دم گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ میں نے عطاء کی طرف تذبذب بھری نظروں سے دیکھا' کہ کہیں اس آرمی آفیسر کی آمد اس کے گزشتہ سفرنامہ ہندوستان (مسافتیں) سے تو متعلق نہیں جس میں اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار کا بہت دلدوز نقشہ کھینچا تھا اور جس کے نتیجے میں تین سال قبل اسے ہندوستانی حکومت نے ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی الجھن بتا رہی تھی کہ وہ بھی یہی سوچ رہا ہے۔

خاموشی مزید خاموش ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ہرچہ بادا باد کے انداز میں نووارد کو مخاطب کر کے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بتایا کہ اس کا نام ایشور سنگھ ہے اور وہ کسٹم کے محکمے کا افسر ہے۔ ہم نے دوبارہ اس کی وردی پر نظر ڈالی جو رنگ اور تراش خراش میں بالکل فوجی لگتی تھی اور پہلی نظر میں کوئی بھی اس کا دھوکا کھا سکتا تھا۔ عطاء نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور آدھے سے زیادہ سگریٹ کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ خطرناک پاکستانی ادیبوں کی گرفتاری پر مامور آدمی کا کمانڈو چند لمحوں کے اندر اندر ایک مفت خورے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ عطاء نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''اپنے لاہور میں پولیسیئے بھی اسی طرح ٹیکسی رکشوں میں لفٹ لیتے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کسٹم آفیسر ایشور سنگھ سے پوچھنے لگا کہ امرتسر سے فرنٹیر میل ایک بجے ہی چلتی ہے نا! ایشور سنگھ نے گھڑی دیکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''ہاں بس ابھی نکلی ہی ہوگی۔''

''لیکن ابھی تو بارہ پینتیس ہوئے ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''آپ کے اور ہمارے ٹائم میں آدھے گھنٹے کا فرق بھی تو ہے نا۔'' ایشور سنگھ مسکراتے ہوئے بولا۔

''یعنی جس وقت آپ کے بارہ بجتے ہیں ہمارے یہاں ساڑھے گیارہ ہوتے ہیں۔'' عطاء نے شرارت سے کہا۔

''جی ہاں'' ایشور سنگھ نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ''اور جب آپ کے بارہ بجتے ہیں ہمارے ہاں ساڑھے بارہ کا وقت ہوتا

ہے۔"

ہم تینوں ہنس پڑے۔ٹیکسی والے نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور ایکسی لیٹر پر پاؤں دباؤ بڑھا دیا۔اب سامنے سے آتی ہوئی بسیں اڑن طشتری کی طرح گزر رہی تھیں اور ہم ان شعروں کے مصرعوں کو وزن میں یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے جن میں غریب الوطنی کی موت کا مضمون باندھا گیا ہے۔

ٹیکسی امرتسر کے بارونق بازاروں سے گزرتی ہوئی ایک پل پر پہنچی جہاں بہت سے پولیس کے سپاہی سڑک کے ایک طرف خواہ مخواہ کھڑے تھے۔ٹیکسی والے نے انہیں مخاطب کر کے باآواز بلند کچھ مہمل قسم کے جملے کہے۔ جواباً ان میں سے بھی ایک نوجوان قسم کے سپاہی نے اسی نوع کے جذبات کا اظہار کیا اور دونوں ہاتھ ہلاتا ہوا ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگا۔ہم نے مشرقی پنجاب میں گڑبڑ کی خبریں تو سنی تھیں مگر یہ قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ سول نامتابعت اور راست اقدام تک پہنچ چکا ہے۔اس سے پیشتر کہ ہم ڈرائیور کو بھاگ نکلنے کا مشورہ دیتے سپاہی ہمارے سروں پر پہنچ چکا تھا۔اس نے بڑے اسٹائل سے ڈرائیور کی طرف کھڑکی پر ہاتھ رکھا اور پھر دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔دونوں نے ہنسی کے درمیانی وقفوں میں جو چند باتیں کیں ان میں صرف ایک جملہ ہماری سمجھ میں آیا جو کچھ یوں تھا۔

"ایہوای پل سی ناجتھے آپاں پھڑے گئے ساں!اج گرو دی کرپا نال آپاں اتھے دی وردی وچ کھڑے آں۔"

ٹیکسی دوبارہ چلنے پر ڈرائیور نے ہمیں بتایا کہ یہ سپاہی اس کا بڑا بھائی تھا اور اسے یاد کرا رہا تھا کہ ایک دفعہ (اس کے سپاہی بننے سے پہلے) ان دونوں کا یہیں چالان ہوا تھا اور آج وہ گرو کی مہربانی سے اسی چوک میں کھڑا دوسروں کے چالان کر رہا ہے۔

ہم نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے اس حسن اتفاق کی داد دی۔لیکن بس اسٹینڈ میں داخل ہوئی اور ہم جیسے لاہور کے لاری اڈے میں آ گئے۔وہی گندگی' وہی ہجوم' ڈیزل کی بدبو اور بے معنی ہارن۔ کسی بھی بس کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ آ رہی ہے یا جا رہی ہے۔ایک قلی نما مزدور نے ہمیں اطلاع دی کہ انبالہ کی ڈائریکٹ بس چار بجے ملے گی۔اس کے لہجے کے وثوق سے ہم بے حد متاثر ہوئے اور پوچھا کہ لدھیانے کی بس کون سی ہے اور ٹکٹ کہاں سے ملے گا؟ اس نے ایک ایسی سمت میں اشارہ کیا جہاں بہت سی بسیں نیم کھڑی تھیں اور کہا کہ آیئے آپ کو ٹکٹ دلوا دوں۔ٹکٹ بیچنے والے ایک فٹ پاتھ نما برآمدے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی میزیں سامنے رکھے سوویتی ریل والے بکنگ کلرک کی طرح بیٹھے تھے۔میں نے لدھیانے کے دو ٹکٹ مانگے اور یوں ہی پوچھ لیا کہ انبالہ کی ڈائریکٹ بس چار بجے سے پہلے بھی چلتی ہے؟ بکنگ کلرک نے بڑے اطمینان سے کہا۔"جس بس میں آپ جا رہے ہیں وہ ڈائریکٹ

انبالہ ہی کی بس ہے اور کوئی دس منٹ میں روانہ ہو رہی ہے۔ میں نے مڑ کر قلی کی طرف دیکھا جو بڑے بے شرمی سے کھیسیں نکالے کھڑا تھا اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ سنی مسلمان ہونا اپنی جگہ لیکن اب کسی سنی سنائی بات پر اعتبار نہیں کرنا۔ امرتسر سے انبالہ کا فاصلہ معلوم کرنا چاہا تو چار مختلف جوابات میں مجموعی طور پر تقریباً دو سو کلو میٹر کا فرق تھا۔ بہت سی ضرب جمع تفریق کے بعد اوسطاً ایک سو ساٹھ میل کے لگ بھگ نکلی۔ وطن عزیز میں بس والے (اگر منزل پر پہنچ جائیں تو) یہ فاصلہ کم وبیش ساڑھے چار گھنٹے میں طے کراتے ہیں۔ لیکن ہمیں بتایا گیا کہ یہ بس آٹھ بجے انبالہ پہنچے گی۔ دل کو اطمینان سا ہوا کہ چلو' موت کا منظر' مرنے کے بعد کیا ہوگا'' سے تو نجات ملے گی۔ بکنگ کلرک نے بیالیس روپے کے عوض تقریباً آٹھ آنے کی ردی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ خدا جھوٹ نے بلوائے تو کل چودہ ٹکٹیں تھیں۔ پتا چلا کہ ہر اسٹاپ کی علیحدہ علیحدہ ٹکٹ کاٹی جاتی ہے۔ سلیقے، تنظیم اور احتیاط کا یہ مظاہرہ دیکھ کر سکھوں کے بارے میں مشہور کئے گئے لطیفوں پر بے اعتمادی سی پیدا ہوگئی۔ بس کے اندر کا منظر انتظار حسین کے افسانوں جیسا تھا۔ یعنی سب کے سب مسافر ایک دوسرے کی طرف سے مشکوک نظر آرہے تھے۔ عطاء تو خیر پتلون قمیض میں تھا اس لیے اوپرا نہیں لگ رہا تھا لیکن میری شلوار قمیض سب کی نظروں میں آگئی۔ میں نے بے شمار نگاہوں سے بچنے کے لیے سیٹ پر بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیں مگر دوسرے ہی لمحے عطاء نے میرا شانہ ہلایا۔ ''کچھ کھا نہ لیں یار؟ بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔''

بھوک تو مجھے بھی لگ رہی تھی لیکن ایک تو دن بھر کی Tension اور سفر سے طبیعت کچھ بوجھل ہو رہی تھی اور دوسرے یہ خیال بھی ذہن کے کسی گوشے میں تھا کہ حرام حلال کا پتا کیسے چلایا جائے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ فی الحال پھل وغیرہ کھا کر ٹائم پاس کرتے ہیں' اس بعد دیکھا جائے گا۔ بس روانہ ہوئی اور شہر سے نکلنے سے قبل ہی فراٹے بھرنے لگی۔ میں نے عطاء کو بتایا کہ یہ خصوصی رفتار غالباً ہمارے اعزاز میں ہے کیونکہ میں نے ڈرائیور کو بتایا تھا کہ ہمیں جلدی انبالہ پہنچنا ہے۔

''بہتر ہوتا اگر ہم اس پر یہ بھی واضح کر دیتے کہ ہم وہاں زندہ پہنچنے چاہتے ہیں۔'' عطاء نے یہ کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ اسے پتا ہے کہ میں اس کی چین سموکنگ سے بہت چڑتا ہوں اس لیے اکثر سفر کے دوران وہ خصوصی اہتمام سے سگریٹ نکالا کرتا ہے چنانچہ وہاں بھی اس نے بڑے اسٹائل سے سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں دبا کر حسب معمول جس جیب میں لائٹر رکھا تھا اسے چھوڑ کر باقی سب جیبیں ٹٹولنے لگا۔ لیکن اس بار میری باری تھی۔

''مجھے افسوس ہے پیارے مگر آئندہ چھ گھنٹے تک تم سگریٹ نہیں پی سکو گے۔''

عطاء نے مکھی اڑانے کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور کہا کہ تم آدھے سکھ ہو۔ میں نے کہا'' میں آدھا ہوں لیکن تمہارے ارد گرد والے

پورے ہیں اور اسی لیے انہوں نے بس کے اندر باقاعدہ سگریٹ نہ پینے کا اعلان لکھ رکھا ہے۔'' اعلان کا پڑھنا تھا کہ عطاء کی ساری شگفتگی ایک پل میں ہوا ہوگئی۔ چھ گھنٹے کے لیے سگریٹ کی مناہی اس کے لیے چھ سال قید بامشقت سے کم نہ تھی۔ رہی سہی کسر اس موضوع پر میری جملے بازی نے پوری کردی۔

ہمارے دائیں جانب کی نشست پر ایک صاحب مسلسل اپنے انگوٹھے کو عجیب وغریب زاویوں پر گھمارہے تھے۔ ان کی اس فنی ریاضت میں صرف چند لمحوں کے لیے اس وقت خلل آیا جب جالندھر سے کچھ پہلے ایک سٹاپ سے چند استانی نما خواتین بس میں سوار ہوئیں۔ کوئی سیٹ خالی نہیں تھی ہم یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ نہ کسی نے ان کے لیے سیٹ خالی کی اور نہ ہی ان کی آنکھوں میں متوقع یا چہروں پر تکدر دکھائی دیا۔ ہم دونوں اپنی جگہوں پر ذرا کسمسائے کہ اگر وہ ہماری طرف دیکھیں تو کچھ شولری کا مظاہرہ کیا جائے مگر وہ سیٹوں کے درمیان اس بے تکلفی سے کھڑی باتیں کرتی رہیں جیسے اپنے سٹاف روم میں بیٹھی ہوں۔ انگوٹھے والے صاحب دوبارہ اپنے کام میں لگ چکے تھے۔

جالندھر میں بس کا اسٹاپ دس منٹ کا تھا۔ عطاء کہیں سے نہایت بدمزہ پوریاں نما کوئی چیز لے آیا تھا اور چنوں کا دونا مجھے پکڑا کر کھڑکی کے قریب کھڑا کسی مل کی چمنی کی طرح دھواں نکال رہا تھا۔ بس چلی تو استانیاں اور انگوٹھے والے صاحب سمیت بہت سی سواریاں بدل چکی تھیں۔ ہم سے اگلی سیٹ پر دو سکھ نوجوان آ گئے جو اپنے لباس اور انداز و اطوار سے پڑھے لکھے اور نسبتاً خوشحال نظر آتے تھے۔ میرے ڈرامے ''وارث'' کی مشرقی پنجاب میں مقبولیت کا اخبارات میں بہت ذکر ہوا تھا۔ ''اپنی بات'' میں بے شمار خط بھی آتے تھے اور خود مجھ سے بھی ادھر سے آنے والے کئی لوگ بڑے مداحانہ انداز میں مل چکے تھے اس لیے میں نے بڑے فاتحانہ انداز میں عطاء کی طرف دیکھ کر ٹی وی کی بات چھیڑی۔ بات ہندوستانی پروگراموں سے ہوتی ہوئی پاکستانی ٹی وی پروگراموں کے اعلیٰ معیار تک پہنچی تو میں ذہنی طور پر ''وارث'' کا قصیدہ سننے کے تیار ہو چکا تھا مگر چند لمحوں بعد یہ اشتیاق پریشانی میں ڈھلنے لگا کیونکہ وہ دونوں گھوم پھر کر عمومی باتیں کر رہے تھے اور عطاء کی نظروں میں تبسم کی کرنیں لشکارے مار رہی تھیں۔ تنگ آ کر میں نے خود ہی پوچھا۔

''ہمارا ڈرامہ ''وارث'' تو آپ نے دیکھا ہوگا؟''

''بارش؟''

''نہیں جناب ''وارث'' وہ جو یہاں بہت مقبول ہوا ہے۔ جس میں وہ چوہدری حشمت تھا۔ وہ مونچھوں والا حشمت تھا۔ وہ مونچھوں والا حشمت؟''

''ہاں کچھ تھا تو ایسا........ میں نے دیکھا نہیں سنا ہے اس کے بارے میں۔'' عطاء کی آنکھیں زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اس نے بڑی ظالمانہ سنجیدگی سے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ اس کے رائٹر ہیں...... امجد اسلام امجد''

''امجد........ کیا بات آپ نے؟''

میں نے جلدی سے انگریزی کا باتصویر رسالہ جو جالندھر سے خریدا گیا تھا' کھول لیا جو بظاہر ایک سوسائٹی میگزین تھا مگر جس میں شائع شدہ تمام تصویریں انتہائی پرائیویٹ تھیں۔

جالندھر کے بعد بس کا اگلا بڑا اسٹاپ لدھیانہ کا تھا۔ دونوں شہروں کے درمیان حفیظ جالندھری اور ساحر لدھیانوی بہت یاد آئے۔ اندھیرا آہستہ آہستہ اردگرد پھیلے ہوئے کھیتوں میں اتر رہا تھا اور ہم سے تھوڑے فاصلے پر ایک ایسی فربہ اندام خاتون آ بیٹھی تھیں جن کی ساڑھی دیکھ کر ہندوستان میں کپڑے کی قلت کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ گلزار وفا چودھری نے کشور ناہید کے خاکے میں لکھا ہے کہ وہ ساڑھی اس طرح باندھتی ہیں کہ ''بساط عجز'' میں جو کچھ ہے وہ سامنے آ جاتا ہے۔ مگر اس خاتون کے مقابلے میں ہمیں کشور کی ساڑھی عرب کی عبا محسوس ہو رہی تھی۔

اس بے پایاں جثے اور نصف صدی پرانے چہرے کے باوجود خاتون موصوف بڑی زندہ دل اور بیدار نظر دکھائی پڑتی تھیں کیونکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ایسی غلط انداز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتی تھی کہ ہم مجبور ہو کر ایک دوسرے کی بغلیں جھانکنے لگتے تھے۔

ہاں یاد آیا' یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ جس سفر کی روداد لکھ رہا ہوں یہ کس سلسلے میں کیا گیا تھا۔ دراصل ہم دونوں انبالہ میں ایک انڈو پاک مشاعرے میں شرکت کے لیے جا رہے تھے جو ''شام بہار ٹرسٹ'' کی طرف سے ہر سال اسی موسم میں منعقد کیا جاتا ہے۔ اس ٹرسٹ کے چیئرمین راجندر ملہوترا صاحب چند ماہ قبل پاکستان آئے تھے اور ہم لوگوں کو اس میں مدعو کر گئے تھے۔ مدعو تو انہوں نے اور بھی بہت سے شعراء کو کیا تھا مگر ویزے کے حصول میں اتنی بہت سی دشواریاں پیش آئی تھیں کہ ہمیں کچھ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ہمارے علاوہ اس میں کون کون شرکت کر رہا ہے۔ یہ تو انبالہ پہنچنے پر پتا چلا کہ راولپنڈی سے سید ضمیر جعفری اور سلطان رشک' جھنگ سے رفعت سلطان' ساہیوال سے بسمل صابری اور جہلم سے جوگی جہلمی' امداد ہمدانی' تنویر سپرا اور اقبال کوثر بھی پہنچ چکے ہیں۔ قتیل شفائی بھی جو چند دن پہلے دلی کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے' وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ہمیں سیدھا راجندر ملہوترا صاحب کے گھر پہنچایا گیا جہاں جگن ناتھ آزاد اپنی بھرپور محبت اور جپھیوں کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ معانقوں اور مصافحوں کے طویل دور

میں جو چند نام ہمارے کانوں میں پڑے ان میں مخمور سعیدی' سبودھ ساقی' راشد ممتاز' اظہر عنایتی' رفعت سروش اور ساحر ہوشیار پوری تو معروف تھے باقی حضرات میں سے شاعروں کا پتا مشاعرے میں جا کر چلا۔ ملہوترا صاحب کے گھر پر کنہیا لال پوسوال سے بھی ملاقات ہوئی۔ پوسوال صاحب کے بارے میں بعد میں پتہ چلا کہ وہ صوبہ ہریانہ کے ہوم منسٹر ہیں اور گزشتہ بائیس برس سے مسلسل الیکشن جیتتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان اطلاعات سے پہلے ہی حسن اخلاق' جامہ زیبی اور سخن فہمی کی وجہ سے وہ ہم پر ایک اچھا تاثر قائم کر چکے تھے۔ بات بات پر اساتذہ کے ایسے باموقع شعر (اچھے والے) پڑھتے تھے کہ ہمیں بے اختیار اپنے اورینٹل کالج کے استاد ڈاکٹر ناظر حسن زیدی یاد آ جاتے تھے۔

مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو اس کا اہتمام دیدنی تھا۔ پنڈال جس قدر بڑا تھا اس سے زیادہ خوبصورت تھا اور ہجوم کا یہ عالم کہ دور تک سر ہی سر نظر آتے تھے۔ شروع کی دس پندرہ قطاریں افسران کے لیے مخصوص تھیں۔ اس کا علم ہمیں تین وجوہات کی بنیاد پر ہوا۔ ایک تو یہ کہ وہاں قیمتی ساڑھیوں کی بھرمار تھی' دوسرے یہ کہ وہ لوگ منہ سے زیادہ چشم و ابرو اور سر کی جنبش خفی سے داد دیتے تھے اور تیسرے کہ یہ شروع کی قطاریں ہوتی ہی افسروں کے لیے ہیں۔ صدر مشاعرہ کے ایل پوسوال تھے۔ آغاز میں انبالہ کے ڈپٹی کمشنر دوشی دال نے ایک لکھا ہوا سپاسنامہ بڑی تنگ و دو کے بعد پڑھا' جس کے بعد مسٹر پوسوال نے ایک ایسی دلچسپ حرکت کی کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ اس شخص کو الیکشن میں کوئی نہیں ہرا سکتا۔ ہوا یوں کہ اسٹیج پر تقریباً تیس پینتیس شعراء تھے یعنی کم سے کم چار گھنٹے صاحب صدر کو دو زانو یا چوکڑی مار کر بیٹھنا تھا۔ مسٹر پوسوال نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ مجھے شعر کا مزاہ شاعر کے روبرو بیٹھ کر سننے میں آتا ہے اور اسٹیج پر یہ ممکن نہیں۔ اس لیے میں سامنے کی صف میں بیٹھوں گا اور یوں انہوں نے سارا مشاعرہ مزے سے صوفے پر بیٹھ کر سنا۔

چونکہ کسی ہندوستانی مشاعرے میں شرکت کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا اس لیے بہت سی باتوں پر سخت حیرت ہو رہی تھی۔ ایک تو یہ دو تین کو چھوڑ کر سب کے سب ہندوستانی شاعروں نے ترنم سے کلام سنایا اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے بھائی صہبا اختر' دلاور فگار' ساقی فاروقی اور صلاح الدین محمود کی طرح باقاعدہ پرفارم کرتے تھے۔ تیسری حیرت کی بات یہ تھی کہ ہلکے پھلکے اور فٹ سمجھ میں آ جانے والے شعروں پر داد نسبتاً زیادہ ملتی تھی۔ ان سب کا سبب ہمیں اس وقت معلوم ہوا جب یہ بتایا گیا کہ مشاعرے کے تین چار ہزار سامعین میں سے بمشکل پچاس لوگ ایسے تھے جو اردو لکھ یا پڑھ سکتے تھے۔ گویا ان کے لیے مشاعرہ ایک طرح کا ورائٹی پروگرام بھی تھا جس کا خیال شعراء کو رکھنا پڑتا تھا۔ مشاعرہ دس بجے رات سے ساڑھے تین بجے صبح تک چلا۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں سرکاری طور پر اردو کی حیثیت پنجابی' ہندی اور انگریزی کے بعد چوتھے نمبر پر ہے۔ لوگوں کا یہ ذوق اس بات کا غماز تھا کہ اردو ہی صحیح معنوں میں اس

برصغیر کی لنگوا فرینکا ہے۔

میں اور عطاء چونکہ طویل سفر سے بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے ملہوترا صاحب نے مشاعرہ ختم ہوتے ہی ہمیں ایک ڈرائیور کے ساتھ پی ڈبلیو ڈی کے ریسٹ ہاؤس میں بھجوا دیا۔ وہاں پہنچے تو چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ ڈرائیور چوکیدار کو ڈھونڈنے چلا گیا۔ گھڑی دیکھی تو چار بج رہے تھے۔ سردی اور تھکن کی وجہ سے برا حال تھا اور جی چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی کمبل ملے تو وہیں ڈھیر ہو جائیں اور شاید میں کچھ دیر کے لیے سو بھی گیا تھا کیونکہ ڈرائیور کی چوکیدار کو پکارتی ہوئی آواز مجھے یوں سنائی دے رہی تھی جیسے بہت دور کہیں سمندر پار سے آ رہی ہو۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد اس نے آ کر بتایا کہ چوکیدار تو نہیں ملا کیونکہ وہ چھٹی پر ہے البتہ اس کا ایک نائب ملا ہے۔ ہم نے کہا۔ ''بھائی ہم نے چوکیدار کے آٹوگراف نہیں لینے' جو بھی ہے تم کمرہ کھلوا دو۔'' وہ ہمیں ایک نیم تاریک برآمدے کی طرف لے گیا جہاں ایک آدمی کمبل لپیٹے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور اور اس آدمی میں کچھ مکالموں کا تبادلہ ہوا جو ہم لہجے کی غرابت اور اپنی تھکن کی وجہ سے ٹھیک طور پر سن نہ سکے۔ بہرحال ان مذاکرات کے نتیجے میں اس آدمی نے ایک کمرے کی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا' ایک سایہ نمودار ہوا۔ کمبل والے آدمی نے ممیاتی ہوئی آواز میں اس سے کوئی بات کی جس پر سائے نے بڑے غصے میں کچھ کہا اور کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ ہم حیران کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ اب جو ہم نے اس سارے سین کی تفصیل پوچھی تو ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ساری تھکن اور سستی ہوا ہو گئی۔ کمبل والا آدمی ایک سرکاری ڈرائیور تھا جو اپنے صاحب کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ صاحب کمرے میں سو رہا تھا اور وہ برآمدے میں۔ اب پتا نہیں کیسے ہمارے ڈرائیور نے اسے چوکیدار کا نائب سمجھ لیا اور نامعلوم اس نے آگے سے کیا سمجھا کہ اپنے صاحب کو رات کے چار بجے جگا کر پوچھنے لگا کہ ان لوگوں کا (یعنی ہمارا) کمرہ کون سا ہے۔

اگلے دن صبح آنکھ کھلی تو صبح کو گزرے بہت دیر ہو چکی تھی۔ کمرے میں عطاء کے خراٹے دندنا رہے تھے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ میری آنکھ انہی غیر انسانی آوازوں سے کھلی ہے لیکن نیند کا غبار ذرا کم ہوا تو کچھ اس قسم کی آوازیں سنائی دیں جیسی امریکی فلموں میں جرمن سپاہیوں کے بوٹوں سے نکلا کرتی ہیں۔ پھر اس میں ہتھیاروں کی آوازیں اور فوجی پریڈوں کے کاشن بھی شامل ہو گئے۔ میں گھبرا کر اٹھا تو ہمارے کمرے کے سامنے اور برآمدے میں آٹھ دس ہتھیار بند سپاہی اور قدرے فاصلے پر کچھ کاریں اور جیپیں کھڑی تھیں۔ ماحول میں بڑی سنگین سی خاموشی تھی۔ میں نے عطاء کو جگا کر یہ منظر دکھایا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ یہ سب کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ ایک دم باہر کچھ شور سا ہوا اور کاروں کے دروازے کھٹاکھٹ بند ہونے لگے۔ ہم بھاگ کر دروازے پر آئے تو

کاریں اور جیپیں مین گیٹ سے نکل رہی تھیں اور سپاہی اٹین شن کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ایک میلا سا نوجوان پتا نہیں کس طرف سے نکل کر آیا اور نمسکار کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''ناشتہ لے آؤں؟'' ہم نے کہا' پہلے یہ بتاؤ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟....... پتہ چلا کہ کوئی منسٹر صاحب کسی دورے پر آئے ہوئے تھے اور سب شور و غوغا اور دہشت گردی انہی سے متعلق تھی۔

تھوڑی دیر بعد راجندر ملہوترا آئے اور بتایا کہ ہمیں انبالہ کے ڈی آئی جی کنور رنبیر سنگھ یادو کے پاس جانا ہے کیونکہ ابھی پولیس اسٹیشن پر ہماری آمد کی باقاعدہ رپورٹ ہونی ہے اور سہارنپور کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ہمارے ویزے کا انتظام بھی رہتا ہے۔ سہارنپور کا مشاعرہ اگلے دن یعنی ۱۵ مارچ کو ہونا تھا اور اس کے لیے سبودھ بہاری لال ساقی نے گزشتہ رات ہی ہم سے وعدہ لے لیا تھا۔ ملہوترہ صاحب نے بتایا کہ یادو صاحب اور ان کی بیگم شعر و شاعری سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں اور انہوں نے یہ محبت بھری شرط عائد کی ہے کہ ہم ان کے ساتھ چائے پئیں اور اپنا کلام ریکارڈ کرائیں تو یہ دونوں کام ان کے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہو سکتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی ضمانت پر اس شرط کو تسلیم کر چکے ہیں۔ انہوں نے یہ بات اتنے بھولے اور دلچسپ انداز میں کہی کہ مجھے بے اختیار عطاء کے سفرنامہ امریکہ ''شوق آوارگی'' کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب اس سے کسی لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا تھا کہ کیا سچ مچ تمہارے ملک میں شادیاں دولہا دلہن کی بجائے ان کے والدین کی مرضی سے طے ہوتی ہیں اور لڑکا لڑکی شادی سے پہلے ایک دوسرے کے صورت آشنا بھی نہیں ہوتے! تو عطا نے اسے بتایا تھا کہ یہ بات صرف ایک حد تک درست ہے یعنی شادیاں طے تو دولہا دلہن کے والدین ہی کرتے ہیں مگر یہ طے کرنے سے پہلے وہ لڑکے یا لڑکی سے اس کی رائے ضرور لیتے ہیں۔ اگر وہ ہاں کر دیں تو یہ شادی کر دی جاتی ہے لیکن اگر انکار کر دیں تو.......

''انکار کر دیں تو کیا ہوتا ہے؟'' لڑکی نے اشتیاق سے پوچھا۔

''پھر بھی کر دیتے ہیں۔'' عطاء نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

راجندر ملہوترہ ذہین آدمی تھے۔ میرے یہ واقعہ سنانے پر پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے۔ ''ہاں کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ میں نے آپ سے پوچھے بغیر وعدہ بھی اسی لیے کر لیا تھا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔''

ملہوترہ صاحب کی گاڑی میں ہم دوسرے ریسٹ ہاؤس پہنچے جہاں ہمارے باقی ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے آثار قدیمہ بکھرے پڑے تھے اور ایک کرسی پر مخمور سعیدی تقریباً اسی پوز میں بیٹھے ہوئے تھے جس میں ہم نے ان کو گزشتہ رات آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر اپنی جسمانی حالت اور کشش ثقل میں مطابقت نہ پاتے

ہوئے اسے راستے ہی میں چھوڑ دیا۔ ان کو دیکھ کر غالب کا وہ شعر یاد آ رہا تھا۔

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا

تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا

ایک طرف بسمل صابری غالباً کوئی انٹرویو دے رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر جہلم کی پارٹی یعنی جوگی جہلمی، امداد ہمدانی، تنویر سپرا اور اقبال کوثر شیو، ناشتے اور لباس کی تبدیلی سے فارغ ہو کر چلنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ قتیل شفائی دلی سے اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک صاحب کو (جو آخر تک ان کے ساتھ رہے) اپنے بوٹ دکھا کر کہہ رہے تھے کہ یہ کسی سے بدل گئے ہیں۔ ساتھ والے کمرے سے ضمیر جعفری صاحب اپنے دانتوں کے سیٹ کی عدم موجودگی کے باوجود اسی محبت بھری اور خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوئے جوان کی شخصیت کا حصہ ہے اور اعلان کیا کہ وہ سہارنپور کے مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گے کیونکہ انہیں دلی پہنچنا ہے، پتا چلا کہ سلطان رشک اور رفعت سلطان بھی ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اندر کمرے میں سلطان رشک ناقابل تحریر لطیفوں کی ایک انگریزی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے جس کے بارے میں انہوں نے ہمیں بتایا کہ بہت مہنگی ہے۔

وہاں پر موجود لوگوں کی اوسط عمر نکالی جائے تو وہ کسی صورت میں ۴۵ سے کم نہیں بنتی تھی لیکن ماحول بالکل کالج کے ہوسٹل جیسا تھا۔ وطن سے دور اجنبی در و دیوار کے درمیان آشنا چہروں کا یہ چھوٹا سا جوم مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ راجندر ملہوترہ کئی سال سے مشاعرے کرا رہے ہیں اس لیے ان کے واسطے شاعروں کا یہ غیر رسمی پہلو نیا تو نہیں تھا لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عمروں کے فرق کے باوجود ہم سب کی آپس میں بے تکلفی اور خوش دلی پر مبنی جملے بازی یقیناً ان کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔

یادو صاحب کے گھر پہنچے تو وہ اور ان کی بیگم مدھو ہمارا انتظار کر رہے تھے یادو ہاکی کے انٹرنیشنل کھلاڑی رہ چکے ہیں اور ان کی بیگم سنسکرت میں ایم اے تھیں۔ میں نے جب اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ان کے دونوں بچوں کی عمریں اٹھارہ اور بیس سال ہیں جبکہ وہ خود ابھی بالکل جوان لگتے ہیں تو عطاء نے میرے کان میں چپکے سے کہا۔ "اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ یہ لوگ یوسف کامران اور کشور ناہید سے زیادہ جوان تو نہیں۔"

ریکارڈنگ کا مرحلہ شروع ہوا تو رفعت سلطان کو اپنے علاوہ ہر شاعر کے پڑھنے کے دوران کھانسی آئی۔ چائے آئی تو اقبال کوثر یہ کہہ کر پھنس گئے کہ وہ ٹھنڈا پئیں گے۔ ٹھنڈا منگوانے کے لیے آدمی بھجوایا گیا اور ہم سب چائے سے فارغ ہو کر اس کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا بیچارے اقبال کوثر کی خجالت بڑھتی گئی۔ ایک طرف انہیں یہ احساس تھا کہ ہم سب ان کے ٹھنڈے کی

وجہ سے کھانے سے لیٹ ہو رہے ہیں دوسری طرف میزبانوں کا خیال تھا کہ بس چند لمحے اور۔ اس وقت سے لے کر واپسی تک ٹھنڈے کی یہ فرمائش ایک مستقل مذاق بنی رہی۔ اور ہم سب اقبال کوثر کی معصوم وضاحتوں کا مزہ لیتے رہے۔ اسٹینڈرڈ ہوٹل میں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے تو راجندر ملہوترا صاحب نے ہمیں بتایا کہ مسٹر پوسوال نے عطاء، بسمل صابری اور مجھ کو رات کے کھانے پر پنجوڑ آنے کی دعوت دی ہے جو انبالہ سے تقریباً پچاس میل دور ہے اور ساتھ ہی یہ لالچ بھی دیا کہ راستے میں ہم چندی گڑھ بھی دیکھ سکیں گے جو پنجاب ہی نہیں پورے ہندوستان کا بہت ہی خوبصورت شہر ہے اور وہاں کا Rock Garden خاص طور پر دیکھنے کی چیز ہے۔ چونکہ یہاں بھی ہماری نارضامندی سے طے شدہ پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی متوقع نہیں تھی اس لیے ہم نے اس حقیقت پسند خاتون کے مشورے پر عمل کیا جس نے کہا تھا کہ جب کچھ باتیں ناگزیر ہو جائیں تو عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا جائے۔

کھانے اور چندی گڑھ جانے کے درمیان کچھ وقت بچتا تھا اس لیے ہم نے سوچا کہ اسے غنیمت جان کر مشاعرے کے ہندوستانی شرکا سے مل لیا جائے' کیونکہ شنید یہ تھی کہ ان میں سے چند ایک سہارنپور کے مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گے۔ وہ لوگ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے کمرے میں جمع تھے' لیکن ٹھہریئے' آگے بڑھنے سے پہلے ملک زادہ صاحب کا کچھ تعارف ہو جائے۔ اپنے یہاں پاکستان میں کیونکہ اس طرح کی کوئی شخصیت ون پیس میں نہیں پائی جاتی اس لیے تشبیہ یا مثال سے سمجھانا بہت مشکل ہے۔ یوں سمجھئے کہ خواجہ شفیع دہلوی' راغب مراد آبادی اور بھائی افتخار عارف کو اگر جمع کر لیا جائے تو حاصل جمع ملک زادہ منظور احمد نکلے گا۔ ملک زادہ منظور صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی کے بھی ایم اے ہیں اور ہندوستان میں ہونے والے تقریباً ایک تہائی بڑے مشاعروں میں بطور پیشہ ور اسٹیج سیکرٹری شریک ہوتے ہیں۔ اپنی ''نظامت'' کے دوران وہ حاضر جوابی' ذہانت اور شاعری سے واقفیت اور شعور کا بہت دلچسپ مظاہرہ کرتے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ بہت زیادہ کرتے ہیں۔ شاعروں کا تعارف ایسے انداز میں کراتے ہیں کہ بیک وقت پانچ چھ شاعر چوکنے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ دیکھیں قرعہ فال کس کے نام نکلتا ہے۔ اس کے باوجود کئی دفعہ ایسا ہوا کہ تعارف کے بعد انہوں نے جس شاعر کا نام لیا اسے مطلق اندازہ نہیں تھا کہ موت اس سے اتنی قریب کھڑی ہو گی۔ ہمارے پوچھنے پر ملک زادہ صاحب نے بتایا کہ یہ سب کچھ اس پیشے کے استادی گر ہیں اور ان کے بغیر یہاں مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا۔ ان کی بات میں اسی طرح کا اور اتنا ہی وزن تھا جتنا ہماری فلموں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کے دلائل میں ہوتا ہے لیکن ہم نے اس خیال سے بحث نہیں کی کہ آخر کوئی فلم چل بھی تو جاتی ہے۔

ملک زادہ صاحب کے کمرے میں والی آسی، انور ندیم، راشد ممتاز اور صہبا اختر کی طرح کے ایک جوشیلے شاعر بھی تھے جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا، اتنا یاد ہے کہ ان کے نام میں انجم آتا ہے اور کسی کالج میں اردو پڑھاتے ہیں۔ ابھی ہم ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک نوجوان سا لڑکا اندر داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک فری لانس صحافی ہے اور ہم سے انٹرویو کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی کہ اسے شاعری یا اردو سے بالکل واقفیت نہیں ہے۔ ویسے اگر وہ یہ وضاحت نہ بھی کرتا تو اس کے سوالات اس سلسلے میں خود مکتفی تھے۔ پاکستان اور پاکستانی ادب کے بارے میں اس کی معلومات اتنی ہی تھیں جتنی گوئٹے مالا کے موسم اور سبزیوں کے بارے میں ایک عام شریف آدمی کی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے لہجے میں ایسا جارحانہ اعتماد تھا جس کی مثال اپنے یہاں صرف اقبال ساجد کی گفتگو یا محمد مصدق کی دنیائے لطیفہ کے اشتہاروں میں نظر آتی ہے۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اس بلا سے کیسے نمٹا جائے کہ لکھنو کا خوش نما شاعر انور ندیم درمیان میں آ گیا۔ اب پتا نہیں یہ ہماری موجودگی کی وجہ سے تھا یا انور ندیم پہلے سے شیشے کی طرح بھرا بیٹھا تھا، اس نے شوقیہ صحافی کی وہ گت بنائی کہ الٹا ہمیں ریفری بن کر گفتگو ختم کروانی پڑی۔

والی آسی مشاعروں کے علاوہ لکھنو میں کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں نہ صرف بغیر اجازت چھاپتے ہیں بلکہ اتنے فخر سے اپنے اس کارنامے کا ذکر کرتے ہیں جیسے مخاطب سے انہیں شکوے کی بجائے شکریے کی توقع ہو۔ اندازہ کیجئے کہ جو شخص قتیل شفائی جیسے زمانہ دیدہ شخص کو اس جیسے مسئلے پر چپ کرا دے وہ کتنا بڑا کاریگر ہوگا۔ والی آسی صاحب سے مل کر مجھے اپنی فلم انڈسٹری کا ایک مشہور مصنف یاد آیا جس نے میرے ایک ٹی وی ڈرامے کو تقریباً حرف بہ حرف اک فلم میں ڈال دیا تھا اور میرے استفسار پر بڑے اطمینان سے کہا تھا۔

''امجد صاحب! یہ سب آپ کو فلم انڈسٹری میں لانے کے چکر ہیں۔ السلام علیکم!''

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے ہمیں پتہ چلا کہ اس وقت اسٹیج سیکرٹری شپ کے میدان میں ان کے صرف تین حریف ہیں لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سوائے بشیر بدر کے کسی کو اپنے لیے فوری خطرہ نہیں سمجھتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خلاف معمول گزشتہ دنوں ڈی سی ایم (دلی کاٹن ملز) کے مشاعرے میں ان کی جگہ اس بار بشیر بدر کو اسٹیج سیکرٹری بنایا گیا تھا۔ اس چپقلش کا منظر ہم نے سہارنپور کے مشاعرے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

کنور رنبیر یادو کی موٹر چندی گڑھ کی طرف جانے والی صاف ستھری اور ہموار سڑک پر رواں دواں تھی اور بسمل صابری پچھلی سیٹ پر یادو اور مدھو یادو کے درمیان سینڈوچ یا کباب میں ہڈی بنی بیٹھی روحی بانو جیسے بکھرے بکھرے انداز میں انگریزی بول رہی تھی۔

لطیفوں کا دور شروع ہوا تو یادو کو بھی اپنی پولیس افسری کے احساس سے نجات ملنا شروع ہوئی لیکن اس نے جو پہلا لطیفہ سنایا اس کی باری عام طور پر بہت ہی نجی قسم کی محفلوں کے اختتام پر آیا کرتی ہے۔ مسز یادو منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اور بسمل صابری بھی جو عام طور پر لطیفہ ختم ہونے سے پہلے ہنس پڑتی ہے' اپنے ناخنوں میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ عطاء نے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور پھر پچھلی سیٹ کی طرف مڑتے ہوئے ایک ایسا لطیفہ سنایا کہ مسز یادو نے گھبرا کر اپنی خوبصورت عینک اتار دی۔ اس پہلے راؤنڈ کے ختم ہونے پر کچھ دیر موٹر میں مکمل خاموشی رہی اور اس کے بعد ایسے لطیفوں کا دور شروع ہوا جنہیں با آسانی ''حور'' اور ''زیب النساء'' میں شائع کیا جاسکتا ہے۔

چندی گڑھ واقعی خوبصورت شہر ہے۔ اپنے اسلام آباد کی طرح جدید' سرسبز اور کھلا کھلا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلام آباد پہاڑ کے بالکل دامن میں ہے جبکہ چندی گڑھ وادی میں ہوتے ہوئے بھی پہاڑی سلسلے سے فاصلے پر واقع ہے۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے مارکیٹیں بند تھیں اس لیے ہم صرف ان کی بڑی بڑی عمارتوں کی جھلک ہی دیکھ سکے۔ موٹر باغات کے ایک طویل سلسلے کے ساتھ چلتی ہوئی ایک جگہ رکی تو یادو نے کہا۔

''آیئے جی' راک گارڈن آ گیا ہے۔'' ایک چھوٹے قد کی فصیل نما دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم ایک ایسے دروازے پر پہنچے جس کی اونچائی زیادہ سے زیادہ چار فٹ ہوگی۔

''آ و جی'' یادو نے کہا اور بڑے اطمینان سے رکوع کے انداز میں جھک کر اس دروازے سے گزر گیا۔ سنا ہے کہ کچھ بادشاہوں نے اللہ لوک قسم کے صوفیاء سے سجدہ تعظیم کروانے کے لیے اس طرح کے دروازے اپنے درباروں میں بنوا رکھے تھے۔ میں نے پہلے جھک کر چور نظروں سے جائزہ لیا کہ دروازے کے اس پار کیا ہے مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک تنگ سی راہداری تھی جو تھوڑی دور جا کر ایک طرف مڑ جاتی تھی۔ میں نے عطاء کی طرف دیکھا کہ یہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ ایسی جگہیں تو ماہرین ارضیات کے دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ ہم شاعروں کو تو پتھر سے پتھر دل صنم' پہاڑ سے عزیزی فرہاد اور چٹانوں سے بھی شاعری کی جا سکتی ہے۔ یہ راک گارڈن' جسے گلشن سنگ کہنا چاہیے' انسانی تخیل' محنت' لگن اور جدت طرازی کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ اس میں استعمال ہونے والی تمام چیزیں اس ملبے اور Wastage سے بنائی گئی ہیں جو چندی گڑھ شہر کی تعمیر میں بچ رہا تھا۔ اس میں ناکارہ اینٹیں' پتھر' ٹائلیں' ڈبے' ٹین' بوریاں' سینٹری کا ٹوٹا ہوا سامان' کانچ کے ٹکڑے' بے کار سریا' نلکوں کی ٹونٹیاں' غرضیکہ ہر وہ چیز جو عمارتوں کی تعمیر میں کسی نہ کسی شکل میں ضائع ہوتی ہے' ایسی فنکارانہ صناعی سے استعمال کی گئی ہے کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ بغیر چھت کی یہ عمارت کم و

بیش چھوٹے بڑے چالیس کمروں پر منقسم ہے جو داخلے کے دروازے جیسے چار فٹے دروازوں سے باہم دگر ملے ہوئے ہیں اور ہر کمرے میں Trash سے مختلف چیزیں' اشکال' مورتیاں' Compositions اور علامتی پیکر اس انداز میں بنائے گئے ہیں کہ ہر بے معنی چیز با معنی ہوگئی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کا سب ایک فردِ واحد کی محنت اور تخلیقی صلاحیت کی پیداوار ہے۔ مسز یادو نے بتایا کہ یہ شخص پی ڈبلیو ڈی میں سپروائزر کے معمولی عہدے پر فائز تھا اور چنڈی گڑھ کی تعمیر کے منصوبے سے وابستہ تھا۔ اسی دوران میں یہ آئیڈیا اس کے دماغ میں آیا جو مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آج ایک گارڈن کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

میں نے سوچا' اپنا یار محمد منشا یاد بھی اسلام آباد کے تعمیراتی منصوبے سے کم و بیش اسی طرح وابستہ رہا ہے اور آج کل بھی سی ڈی اے میں تعلقات عامہ کا افسر ہے' کیوں نہ یہ آئیڈیا اسے دیں تاکہ افسانوں کے علاوہ بھی اس کا نام زندہ رہ سکے' لیکن پھر ایک دم خیال آیا کہ اسلام آباد آئیڈیوں کا نہیں دستخطوں کا شہر ہے۔ وہاں بڑی بڑی عمارتوں میں فائلیں شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتی رہتی ہیں اور سارا شہر ان کی موسیقی میں مست رہتا ہے۔ وہاں دفتروں میں سرکاری ملازم نہیں ان کے گریڈ بیٹھتے ہیں۔ اٹھارہ گریڈ سے نیچے کے آدمی کو تو وہاں چپڑاسی بھی سلام نہیں کرتا۔ منشا یاد اس جیسے کسی سرپھرے اردو میڈیم کی بات کس نے سننی تھی۔ کیونکہ ملبے سے تعمیر جیسے دیسی آئیڈیے کے لیے نہ تو انگریز بہادر کوئی نوٹ یا ریفرنس چھوڑ گیا ہے اور نہ ہی امریکہ والے ان لائنوں پر سوچ رہے ہیں۔ میرا ذہن ایسی ہی فضول باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ یکدم یادو نے ایک ٹوٹی ہوئی منقش دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ''مدھو جی' کیوں نہ ہم بھی اپنے گھر میں ایک ایسی ہی دیوار بنوالیں۔ اس آدمی کو میں جانتا ہوں اس کو بلوالیں گے۔''

مدھو نے اثبات میں سر ہلایا اور پتھر کی ایک کرسی پر ہاتھ رکھے ہوئے بولی۔ ''لان کے لیے اس طرح کی کرسیاں بھی بنوائیں گے۔''

ایک لمحے کے لیے اس گلشن سنگ میں وقت جیسے رک سا گیا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ میں نے سوچا' آج سے ہزاروں لاکھوں سال پہلے جب پہلی بار کسی نے گھر یا دیوار کے بارے میں سوچا ہوگا تو اس نے یہ بات پتا نہیں کن لفظوں میں کہی ہوگی۔

چنڈی گڑھ سے پنجوڑ تک کا سفر راک گارڈن کے سحر میں ہی گزر گیا۔ لیکن آگے ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ یہ مہاراجہ پٹیالہ کا شاہی باغ تھا۔ مغل طرزِ تعمیر اور جدید آرائش کا ایک خوبصورت اور پرشکوہ امتزاج۔ یہ باغ چار منزلہ ہے اور اس میں آپ اوپر سے نیچے کی طرف جاتے ہیں۔ صدر دروازہ پہلی منزل پر ہے جو بلندی کے اعتبار سے چوتھی منزل پر ہے۔ گھاس کے وسیع قطعے کے درمیان

شالامار باغ کے انداز کی مصنوعی نہر ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فوارے اور روشنیاں نصب ہیں۔ اس کے بعد ایک عمارت ہے جس سے گزر کر نیچے یعنی دوسری منزل کی سیڑھیاں اترتے ہیں۔ اس عمارت کا نام ''جل محل'' ہے۔ دوسری اور تیسری منزل کے درمیان بھی اسی طرح کی ایک عمارت ہے جو دو طرف سے کھلی ہے۔ اس کو ''رنگ محل'' کہتے ہیں۔ اسی طرح تیسری اور چوتھی منزل کے درمیان واقع عمارت کو ''شیش محل'' کہتے ہیں مگر اب اس کی شکل بدل کر اسے ایک جدید طرز کے کیفے میں تبدیل کر دیا گیا ہے جس کے چاروں طرف فواروں کی پھواریں پڑتی رہتی ہیں۔ یادو غالباً پوسوال صاحب کی پیشوائی کے لیے دروازے پر ہی رک گیا تھا۔ مدھو اپنے بارے میں ہمیں بتا چکی تھی کہ وہ روزانہ یوگا کی مشقیں کرتی ہیں اور بسمل کے بارے میں بھی ہم جانتے تھے کہ وہ محکمہ تعلیم میں کھیلوں سے متعلق شعبے میں ہے۔ چنانچہ دونوں کی سبک رفتاری اور سانس کی ہمواری پر تو ہمیں تعجب نہیں تھا البتہ یہ ڈر ضرور لگا ہوا تھا کہ کہیں ہمارا مردانہ وقار خطرے میں نہ پڑ جائے۔ چنانچہ جب مدھو نے یہ مشورہ دیا کہ رنگ محل تک واپسی کا سفر باغ کی حد بندی کے ساتھ ساتھ نیم دائرے کی شکل میں کیا جائے تو مجبوراً ہمیں چند دن قبل ہونے والے ٹریفک کے حادثے کا سہارا لینا پڑا۔ واپسی میں بسمل نے مدھو کی کمر میں جس طرح بے تکلفی سے ہاتھ ڈال رکھا تھا اسے میر حسن نے اپنی مثنوی میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں مست جوں ہاتھ گردن میں ڈال

عطاء نے یہ منظر دیکھ کر کہا۔ ''تھرڈ ورلڈ کا ایک بہت بڑا مسئلہ تقسیم کار کا بھی ہے۔ ابھی تک ہم لوگ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ کون سے کام عورتوں کے کرنے کے ہیں اور کون سے مردوں کے۔'' اور پھر تلقین شاہ کے لہجے میں آہ بھر کر بولا۔ ''اوئے ہدایت! تیں ترقی نہیں کرنی۔''

رنگ محل کے کمرۂ خاص تک پہنچنے کے لیے ہمیں پندرہ بیس تنگ اور چکر کھاتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنا پڑا۔ یادو نے ہمیں بتایا کہ مہاراجہ صاحبان جب ان سیڑھیوں پر چڑھتے تھے تو خوبرو کنیزیں دو رویہ کھڑی ہوتی تھیں۔ ہم نے حیرت سے کہا۔ ''یہ تو اتنی تنگ ہیں کہ ایک آدمی کا گزرنا مشکل ہے کنیزیں کہاں کھڑی ہوتی تھیں اور فرض کرو اگر وہ کھڑی ہو بھی جائیں تو راجہ صاحب کیسے گزرتے تھے؟''

یادو نے آنکھ مار کر کہا۔ ''اسی کا نام تو بادشاہی ہے۔''

عطاء نے کہا۔ ''آپ کو چاہیے مہمانوں کو سمجھانے کے لیے کبھی کبھی اس منظر کا عملی مظاہرہ بھی کیا کریں۔''

یادو نے کہا۔ "فی الحال کنیزیں تو مہیا نہیں ہو سکتیں' پسند کرو تو گارڈ کے کچھ آدمی منگوا لوں۔"

اس پر ہم تینوں ہنس پڑے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر مدھو رکیں اور مڑ کر مجھ سے کہنے لیں۔ "لگتا ہے کوئی اچھا Joke ہوا ہے۔ ہمیں بھی سنائیں۔"

میں نے سٹپٹا کر یادو کی طرف دیکھا۔ وہ بھی پکا پلسیا تھا' اقرار جرم کروانے کے انداز میں بولا۔ "ہاں ہاں سنایئے! مدھو جی آپ کی شاعری سے زیادہ آپ کے لطیفوں کی فین ہیں۔"

جملہ براہ راست اور شدید تھا۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا کہ سچ مچ اصل بات بتا کر یہ ادھار ہاتھ کے ہاتھ چکا دوں مگر حوصلہ نہ ہو سکا اور میں نے آئیں بائیں شائیں کر کے بات ٹال دی۔

رنگ محل کا کمرۂ خاص تھا۔ یہ دراصل ایک بہت بڑا بیڈ روم تھا جس میں محض احتیاطاً سامنے کے کونے میں ایک صوفہ سیٹ بھی رکھ دیا گیا تھا۔ ایک سائڈ پر موسیقی والوں کے لیے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواریں اور دروازے اپنی اوریجنل شکل و صورت میں تھے البتہ چھت پر False Ceiling لگائی گئی تھی مگر اس میں بھی نقاشی کا وہی انداز برقرار رکھا گیا تھا جو دروازوں اور کھڑکیوں میں تھا۔ بیڈ بہت خوبصورت اور بہت بڑا تھا۔ یادو نے بتایا کہ یہ مہاراجہ پٹیالہ کا ماسٹر بیڈ روم تھا اور اب بھی کبھی کبھی شوقین مزاج اور امیر لوگ اسے حجلۂ عروسی کے طور پر خاصی بھاری رقم خرچ کر کے بک کروا لیتے ہیں۔

"یہ تو اتنا بڑا ہے کہ بیک وقت دو تین شادی شدہ جوڑے یہاں ہنی مون منا سکتے ہیں۔"

اس سے پیشتر کہ یادو اس بات کا کوئی جواب دیتا' پوسوال صاحب آ گئے وہ ہماری خاطر کوئی تقریب ادھوری چھوڑ کر آئے تھے اور بڑی نستعلیق اردو میں تاخیر کی معذرت چاہ رہے تھے انہوں نے بتایا کہ وہ ہمیں اپنے گھر پر مدعو کرنا چاہتے تھے لیکن چند دن پہلے ان کی جوان بیٹی فوت ہو گئی ہے جس کی وجہ سے گھر کا ماحول بے تکلف محفل کے لیے سازگار نہیں۔ وہ ایف سی کالج لاہور کے پڑھے ہوئے تھے اور اتنے برس گزرنے کے بعد بھی لاہور کا جادو ان کے سر چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ اساتذہ کے اچھے اور انتخابی مہم میں چلنے والے چالو شعروں کے علاوہ انہوں نے ہمیں لاہور کے کچھ پرانے پنجابی شعراء کا ایسا کلام بھی سنایا جو صرف سنایا ہی جا سکتا ہے۔

پوسوال صاحب کی ایک خوبی جو مجھے بہت اچھی لگی یہ تھی کہ سیاسی آدمی ہونے کے باوجود انہوں نے ایک بھی بات ایسی نہیں کی کہ جس سے سیاست کی بو آتی ہو چنانچہ ہلکی پھلکی باتوں اور شعر و شاعری پر مشتمل یہ پر لطف محفل رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک چلتی رہی۔ واپسی میں سنسان سڑک پر لتا کے پرانے گانوں کے ایک ٹیپ نے جو مزا دیا وہ اس خوبصورت شام اور رات کا موزوں ترین

اختتام تھا۔

اگلی صبح (۱۵ مارچ) کو بھی آنکھ دیر سے کھلی۔ عطاء نے کہا کہ ناشتہ کہیں باہر چل کے کیا جائے۔ انبالہ لاکھ یو پی کی سرحد پر سہی' ہے تو پنجاب ہی کا حصہ' خوراک سے مار نہیں کھاتا ہوگا۔ چنانچہ ماڈرن کولمبس اور واسکوڈے گاما حلوہ پوری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ریسٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ایک چوک تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن گل امید کی خوشبو کسی طرف سے نہ آئی۔ بڑی تلاش کے بعد ایک خان ہوٹل نما جگہ نظر آئی۔ لیکن وہ کڑاہی سے صرف سموسے بنانے کا کام لیتا تھا۔ اب سموسے ہم لاہور میں بھی اکثر کھاتے ہیں اور بڑے شوق سے کھاتے ہیں لیکن صبح گیارہ بجے سموسوں سے ناشتہ کرنا خاصی ٹیڑھی کھیر تھی مگر ہم نے بھی کسی نہ کسی طور اسے سیدھا کرلیا۔

واپس ریسٹ ہاؤس پہنچے اور ملہوترہ صاحب کے گھر فون کیا۔ پتا چلا کہ وہ صبح سے ہمارے سہارنپور کے ویزے لگوانے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ اب کیا کریں؟ اخبار پڑھنا شروع کیا۔ ہمارے مشاعرے کی رپورٹ بھی شائع ہوئی تھی لیکن ناموں کے سلسلے میں عجیب گھپلے بازی تھی۔ ضمیر صاحب جمیر ضغری تھے تو قتیل شفائی قاتل شافی۔ مجھے ازراہ بے تکلفی صرف امجد لکھا گیا تھا اور عطاء کا نام سرے سے غائب تھا۔ اسی طرح رفعت سلطان اور سلطان رشک کے اختلافات بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور ان کے ناموں کے مختلف حروف ملا کر ایک نیا نام ایجاد کیا گیا تھا جبکہ بقول روحی کنجاہی ''حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی!''

دوپہر کا کھانا ملہوترا صاحب کے گھر پر تھا۔ وہاں ان کے منجھلے بیٹے ستیش' اس کی بہت گریس فل بیوی اور دو پیاری پیاری بیٹیوں سے ملاقات ہوئی۔ بچیاں سکول سے آرہی تھیں اور ان کے چہرے وسط مارچ کی بہت ہلکی گرمی کے باوجود تمتمارہے تھے۔ ملہوترا نے بتایا کہ ان کے تین بیٹے ہیں جن میں سے دو ملک سے باہر ہیں۔ بیگم تین چار سال قبل انتقال کرچکی ہیں اور اب وہ ستیش' بہو اور پوتیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ کاروبار معقول سے بھی کچھ اچھا ہے۔ باسٹھ برس کی عمر کے باوجود ان میں جوانوں کی سی چستی تھی۔ ہم نے اس کا راز جاننے کی کوشش کی تو انہوں نے بڑے مزے سے کہا۔

''بس جی آپ جیسے پڑھے لکھے اور اچھے شاعروں کی صحبت کا فیض ہے۔ اس کے علاوہ مجھے نایاب نسل کے کتے رکھنے کا بھی شوق ہے اور میں کتے پالنے والوں کی عالمی انجمن کا باقاعدہ ممبر بھی ہوں۔''

اب کتا چاہے کسی بزرگ ہی کا کیوں نہ ہو کوئی شریف آدمی اس کے ساتھ بریکٹ ہونا پسند نہیں کرتا۔ ملہوترہ صاحب کو بھی شاید اپنے جملے کے اس پہلو کا احساس ہوگیا تھا چنانچہ انہوں نے جو وضاحتی معذرت شروع کی اسے سن کر اکبر اور ملا دوپیازہ کا ''عذر گناہ بدتر

ازگناہ' والا واقعہ یاد آ گیا۔

اکبراعظم کے بارے میں مشہور ہے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود اسے چیزوں کے بارے میں جاننے اوران کی تہہ تک پہنچنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب اس کی موجودگی میں کسی نے "عذر گناہ بدتر از گناہ" کی ضرب المثل استعمال کی تو اکبر پوچھنے لگا کہ اس کی وضاحت کرو اور مثال دے کر سمجھاؤ کہ گناہ سے اس کا عذر کس طرح بدتر ہو سکتا ہے۔ اب جناب سارے نورتن سوچ میں پڑ گئے۔ جو بھی مثال وہ دیتے تھے اس میں گناہ عذر گناہ سے زیادہ نکلتا تھا۔ آخر ملا دو پیازہ نے بادشاہ سے ایک دن کی مہلت طلب کی اور کہا کہ میں کل تک آپ کو اس کی مثال پیش کروں گا۔ دربار برخاست ہو گیا۔ اسی دن شام کو بادشاہ حمام کر رہا تھا کہ اچانک ملا اندر گھس آیا۔ بادشاہ اسے دیکھ کر بہت ناراض اور جزبز ہوا اور پوچھنے لگا کہ اسے اس گستاخی کی ہمت کیسے ہوئی؟ ملا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ ظل الٰہی میں معافی چاہتا ہوں' میں سمجھا تھا شاید ملکہ حضور حمام کر رہی ہیں۔ یہ بات سن کر بادشاہ کو تو آگ لگ گئی۔ قریب تھا کہ وہ جلاد کو بلوا کر ملا کا قصہ پاک کراتا' ملا نے دوبارہ ہاتھ جوڑے اور عرض کیا۔ "برا نہ مانیے گا حضور' میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ عذر گناہ' گناہ سے بدتر کیسے ہو سکتا ہے۔"

ابھی ان کی وضاحت کا سلسلہ جاری تھا کہ کمرے میں ایک انتہائی خوفناک اور غیر معمولی طور پر بڑا کتا داخل ہوا۔ شاید اسی قسم کے کسی کتے کو پطرس مرحوم نے "بہت ہی کتا" کہا تھا۔ اگرچہ ملہوترہ صاحب نے اسے فوراً ہی ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا لیکن اس مختصر عرصے میں ہی کچھ ایسی دہشت ہم پر طاری ہوئی کہ لقمے حلق سے اترنے مشکل ہو گئے۔ جب حواس ذرا قابو میں آئے تو پتا چلا کہ ملہوترہ ہمیں اپنے کتوں کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔ ان کی کتنی باتیں ہم نہیں سن سکے اس راز سے اب شاید کبھی پردہ نہ اٹھ سکے۔ باہر نکلے تو کتوں کی تعداد بڑھ کر "چار شیروں" تک پہنچ چکی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکیا ور چک پھیریاں لے لے کر ہمیں چکھنے لگے۔

ملہوترہ صاحب ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے بتا رہے تھے کہ یہ دیکھنے میں جتنے خوفناک ہیں دوستوں کے لیے اتنے ہی بے ضرر اور جانثار ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ویسے نسلاً یہ One Man's Dog ہیں یعنی مالک کے علاوہ کسی کو Spare نہیں کرتے' یہاں تک کہ اگر ان کی وابستگی بیوی سے ہو تو شوہر کو محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ہم نے سوچا' کسی محقق سے سگ لیلیٰ کی نسل معلوم کریں گے' عین ممکن ہے جس طرح ہم شاعر لوگ مجنوں کے سلسلہ عشقیہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کتوں میں بھی کوئی اس کا رشتے دار ہو اور کل کے اخباروں میں "صدیوں پرانی دشمنی کا بدلہ" قسم کی سرخی لگی ہو۔ اس اثناء اندر سے ستیش اینڈ کمپنی نکل آئے۔ وہ لوگ کوئی فلم دیکھنے جا

رہے تھے۔ ملہوترہ نے کہا۔ ’’آپ لوگ چاہیں تو آرام کر لیں۔ میں آپ کو کچھ دیر بعد پک کروں گا۔‘‘ ہم نے جلدی سے کہا۔ ’’نہیں نہیں آرام کیا کرنا ہے، چلتے ہیں...... ویسے بائی دی وے، یہ کتے کب آرام کرتے ہیں؟‘‘

ملہوترہ اشارہ سمجھ گئے اور فوراً نوکروں کو حکم دیا کہ ان کتے کے بچوں کو لے جا کر بند کر دیں۔

◆◆◆

سہارن پور

شام بہار ٹرسٹ کے نوجوان ہندی افسانہ نگار چندن کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ اس کو لے کر ہم تقریباً ساڑھے تین بجے انبالہ سے سہارنپور کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جمنا نگر کے قریب ملہوترہ صاحب نے ہمیں ہندوستانی اداکار سنیل دت کا آبائی گھر دکھایا اور بتایا کہ اس علاقے کی ترقی کے لیے اس نے بہت نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ اپنی بیوی نرگس کی موت کی رسمیں اس نے بمبئی کے علاوہ یہاں آ کر بھی پورے اہتمام سے ادا کی تھیں۔ سنیل دت بطور ایکٹر مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا لیکن یہ باتیں سن کر میرے دل میں بطور انسان اس کے لیے عزت پیدا ہوئی کیونکہ میں نے بیشتر نیچے سے اوپر آنے والے لوگوں کو اپنا ماضی Disown کرتے دیکھا ہے۔ شاید وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی عظمت دراصل اسی پستی سے متعین ہوتی ہے جہاں سے انہوں نے اپنا سفر آغاز کیا تھا۔

سبودھ بہاری لعل ساقی، جو سہارنپور میں ہمارا میزبان اور مشاعرے کا منتظم اعلیٰ تھا، ایک خوبصورت اور نفیس انسان ہے۔ اس کا گھر بھی اس کی شخصیت کی طرح نکھرا نکھرا اور پر سکون تھا۔ ہمارا استقبال ان کے والد نے ایک چھوٹے سے مگر پھولوں سے بھرے ہوئے لان میں کیا۔ یہ ایک کائستھ گھرانہ تھا۔ اردو اور فارسی سے محبت ان لوگوں کے خون میں شامل ہے۔ سبودھ کے والد اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور طالب تخلص کرتے ہیں۔ ان کے انداز و اطوار میں دلی والوں کی وہ مخصوص نفاست اور رکھ رکھاؤ نظر آیا جو ہم نے پرانی ہندوستانی فلموں اور کتابوں میں دیکھا اور پڑھا تھا۔ یہ اور بات کہ آگے چل کر خود دلی میں ہمیں اس کا نام و نشان تک نہ ملا۔ طالب صاحب کو بھی میری طرح کرکٹ سے بہت لگاؤ تھا۔ چنانچہ ہم دونوں پرانے شکاریوں کی طرح ایک دوسرے کو اپنے تجربات اور مشاہدات سے آگاہ کرنے لگے اور اگر عطاء کے سگریٹ ختم نہ ہو جاتے تو ممکن تھا مشاعرے کا وقت ہمیں وہیں ہو جاتا۔

سہارنپور امرتسر سے دہلی تک غالباً واحد شہر ہے جس میں مسلمانوں کی اب بھی اکثریت ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ زیادہ تر لوگ دستکار ہیں اور لکڑی کے کام میں بہت شہرت رکھتے ہیں۔ شہر کے جن حصوں سے ہم گزرے وہ بہت گنجان آباد اور خاصے گندے تھے۔ مجموعی طور پر پورے شہر کے منظر پر غربت اور پسماندگی کا ایک سایہ سا محیط تھا۔ پہلی بار مسجدیں نظر آئیں اور اذان کی آواز سنائی دی۔ مشاعرہ

گاہ جس کالج کی گراؤنڈ میں تھی اس کا نام اسلامیہ کالج تھا۔ پرنسپل کے کمرے میں کالج کے بانی کی تصویر کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کی تصویر بھی آویزاں تھی۔ پرنسپل صاحب اور ان کے دفتر دونوں کی حالت خستہ تھی اور جو ٹیلیفون وہاں رکھا تھا وہ غالباً گراہم بیل کے ذاتی استعمال میں رہ چکا تھا۔ مشاعرہ چونکہ باٹکٹ تھا اور پہلی دفعہ اس انداز میں منعقد ہو رہا تھا اس لیے منتظمین کی بے چینی اور پریشانی نمایاں تھی۔ کچھ لوگوں کو ہم نے بار بار تیزی سے ادھر ادھر آتے جاتے اور باقی لوگوں کو مزید پریشان کرتے دیکھا مگر مشاعرے کے آخر تک وہ کوئی بھی کام کرتے نظر نہیں آئے۔ مشاعرہ فراق اور جوش کی مشترکہ یاد میں تھا لیکن مشاعرہ گاہ میں دونوں بزرگ شعراء کی جو تصویریں لگائی گئی تھیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اگر ان تصویروں کو وہ اپنی زندگیوں میں دیکھ لیتے تو شاید آج یہ مشاعرہ مرحوم مصور کی یاد میں منعقد ہو رہا ہوتا۔ مشاعرے کے وقت سے کچھ ہی دیر پہلے بجلی چلی گئی۔ متبادل انتظام کے طور پر جنریٹر موجود تھا جو فوراً چلا دیا گیا لیکن جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہتیں اسی طرح اس جنریٹر کی موجودگی میں کسی شاعر کا پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ ملک زادہ منظور احمد، جو یہاں بھی اسٹیج سیکرٹری تھے، ایک ایسے موسیقار کی طرح تلملائے ہوئے پھر رہے تھے جس کے ساز سر نہ ہو رہے ہوں۔ انہیں دیکھ کر آغا حشر مرحوم کے کسی ڈرامے کا ایک مکالمہ یاد آ رہا تھا۔

''توفیق کس حال میں ہے؟ شیر لوہے کے جال میں ہے۔''

یہاں جن دو نئے قابلِ ذکر شاعروں سے ملاقات ہوئی وہ ڈاکٹر بشیر بدر اور شمیم جے پوری تھے۔ دونوں کے بارے میں پتا چلا تھا کہ بڑے معرکے کے مشاعرہ باز ہیں۔ شمیم صاحب کے بارے میں تو ہم زیادہ نہیں جانتے تھے لیکن ''فنون'' کے حوالے سے بشیر بدر جدید غزل کا حوالہ تھا اور ہمارے لیے یہ بات بہت تعجب انگیز تھی کہ اس طرح کا شاعر مشاعرے میں کس طرح ہٹ ہو سکتا ہے۔

بجلی کے انتظار اور بہت بڑے ہجوم کی بے چینی کے براہ راست اظہار سے تنگ آ کر ملک زادہ صاحب نے مشاعرہ شروع کر دیا۔ وہ تو خیر گزری کہ تھوڑی دیر بعد ہی بجلی آ گئی اور جنریٹر سے جان چھوٹ گئی ورنہ ہم تو شاید مہمان ہونے کے ناطے سے بخش دیے جاتے مگر منظور صاحب شاید یہ آخری مشاعرہ ہوتا۔ قتیل صاحب اپنے دلی والے ساتھی کے ساتھ خاصی دیر سے آئے اور غالباً اسٹیج کی ناہمواری کی وجہ سے کئی بار گرتے گرتے بچے۔ سہارنپور کے سامعین نسبتاً زیادہ سخن فہم اور Alive تھے اس کے باوجود ملک زادہ منظور احمد کچھ اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے تھے۔ مشاعرے کے دوران جب بشیر بدر اور ان کے درمیان ایک Battle of Wits (جسے عطاء نے Battle of Half-Wits کا نام دیا) شروع ہوئی تو اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ یہ سب کچھ اس پیشہ ورانہ چپقلش کا شاخسانہ تھا جو ان دونوں حضرات کے درمیان موجود تھی۔ بشیر بدر کو بہت داد ملی لیکن جس انداز میں انہوں نے اپنی

شاعری Perform کی مجھے یقین ہے کہ اگر وہ پاکستان کے کسی سٹیج پر ہوتے تو دوسرا شعر نہ پڑھ پاتے۔ ایک اچھے اور معقول شاعر کو اس طرح اداکاری کرتے دیکھ کر افسوس ہوا مگر یہ سوچ کر چپ ہو رہے کہ معاشرے اور ماحول کے جبر کی ایک ہی صورت تو نہیں ہوتی۔ شمیم جے پوری کا ترنم بہت اچھا تھا۔ بڑے دھان پان سے آدمی تھے اور اس قدر زور لگا کے پڑھتے تھے کہ ہر لحظہ ان کے ٹوٹنے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو بسمل صابری نے بشیر بدر کو پکڑ لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مشاعرے کے دوران بشیر بدر نے اس کو انتہائی غیر مہذب انداز میں باتیں بند کرنے کو کہا تھا جبکہ وہ باتیں نہیں کر رہی تھی اور اگر کر بھی رہی ہوتی تو بھی کسی خاتون کو ایسے انداز میں ٹوکنا تہذیب کے منافی ہوتا۔ بشیر بدر کا کہنا تھا کہ اس نے بسمل کو نہیں بلکہ اس کے نزدیک بیٹھے ہوئے ایک ہندوستانی شاعر کو ٹوکا تھا۔ جب ہم اس سین میں داخل ہوئے تو دونوں کا حال ایسے لڑکوں جیسا ہو رہا تھا جنہیں کوئی چھڑانے والا نہ مل رہا ہو۔ چنانچہ فوراً ہی صلح صفائی ہو گئی۔

◆◆◆

دہلی

صبح کے چار بج رہے تھے اور ہم ابھی تک یہ طے نہیں کر پائے تھے کہ سہارنپور سے دلی جاتے ہوئے دیوبند کس طرح دیکھا جائے۔ بڑی مشکل سے روٹ اور ذرائع رسل ورسائل تو تقریباً طے ہو گئے مگر اب یہ مسئلہ آ پڑا کہ دارالعلوم دیوبند دو دھڑوں میں کشیدگی کی وجہ سے بند تھا' اور وہاں جانے کے لیے خصوصی اجازت درکار تھی۔ عطاء اس لیے بے چین تھا کہ اس کے نزدیک یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات تھی یعنی دیوبند بھی دیکھ لیں گے اور اسے اخبار کے لیے سٹوری بھی مل جائے گی۔ لیکن اس ساری بحث کا جو آخری نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ پونے چھ بجے ہم سہارنپور کے لاری اڈے پر تھے جہاں سے ہمیں ایک ڈی لکس بس کے ذریعے سیدھے دلی جانا تھا۔ یہ بس اتنی ہی ڈیلکس تھی جتنی ہماری گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی لگژری کوچ ہوتی ہے۔ سبودھ تو خیر ہمیں چھوڑنے کے لیے ہمارے ساتھ آیا تھا لیکن وہاں پہلے سے بھی تین چار میزبان حضرات موجود تھے۔ پتا چلا کہ یہ ہمارے لیے سیٹیں روکنے کی خاطر آئے ہوئے ہیں کیونکہ اس بس میں ٹکٹ اس کو ملتی ہے جس کے پاس سیٹ کا قبضہ ہو۔ بس تقریباً بھر چکی تھی۔

ہمارے بائیں ہاتھ کی سنگل سیٹ پر بس میں موجود دس پندرہ خواتین میں سے واحد صنف لطیف بیٹھی تھی۔ میں نے عطاء سے کہا۔ ''لو بھائی اب یہ تمہارا اور مستنصر تارڑ کا علاقہ شروع ہو گیا ہے' لیکن یہ خیال رکھنا کہ اگرچہ ہنوز دلی دور است گر اتنی بھی نہیں دور است۔'' عطاء نے دزدیدہ نظروں سے اس عفیفہ کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہا کہ یہ سو فیصدی اس کا کیس کیونکہ خاتون کے ہاتھ پاؤں ناک کان آنکھ وغیرہ سب صحیح سلامت ہیں۔ اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے میں کسی خاتون کے داخلے کی پہلی شرط اس کا کسی نہ کسی طرف سے معذور ہونا ہے۔ سبودھ اور دیگر میزبانوں سے ہماری گفتگو کے دوران اس کو غالباً پتا چل گیا تھا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں اور غریب الوطن ہیں کیونکہ بس اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے ایک ایسی میٹھی اور چھتنار نظر ہم پر ڈالی کہ آتش کے شعر پر ایمان تازہ ہو گیا۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اس خطرناک عمر میں اتنی صبح صبح اس کا اکیلے اکیلے سفر کرنا جہاں اس کی اپنی ذات پر اعتماد کا اظہار تھا وہاں اس کے بیٹھنے کے انداز میں ایسی پر وقار بے اعتنائی تھی جیسے اسے پتا ہو کہ اسے ایک نظر دیکھ کر گزر جانا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن یہ سب باتیں اس وقت تک

تھیں جب تک دن کا اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا اور اس کا چہرہ اور جسم کسی آئس برگ کی طرح 10 / 1 نظر آ رہا تھا۔ لیکن واضح رہے اس انکشاف کے دوران تقریباً ایک گھنٹہ حائل تھا جس میں ساٹھ منٹ اور چھتیس سو سیکنڈ ہوتے ہیں۔ لڑکی سے پیچھے کی نشست پر کپڑے کے دو نوجوان تاجر بیٹھے تھے۔ اس سے پیشتر کہ ہم اس کی پہلی نظر کا کوئی معقول جواب دے پاتے وہ دونوں بیچ میں کود پڑے۔ سب سے پہلے انہوں نے مجھ سے اپنے متمول کاروباری ہونے کا تعارف اس طرح کرایا کہ منہ میری طرف اور روئے سخن کسی اور کی طرف تھا اور اس کے بعد پاکستان کے بارے میں کچھ ایسے سوالات کی بوچھاڑ کر دی جن میں سے ہر ایک کئی کئی سوالوں کا مجموعہ تھا۔ میں نے شروع شروع میں تو سنجیدگی سے جواب دینے کی کوشش کی مگر جب محسوس کیا کہ وہ "جتی رووے یاراں نوں لے لے ناں بھراواں دے" والا ہاتھ دکھا رہے ہیں تو میں نے بھی اسی نوع کی جوابی کارروائی شروع کر دی۔ نیند عطاء کے لیے اس طرح کے قحط کا درجہ رکھتی ہے جس کے دنوں میں بقول شیخ سعدی دمشق والوں نے عشق کو فراموش کر دیا تھا چنانچہ تھوڑی دیر بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ گوڈے گوڈے نیند میں تھا۔ اگلی سیٹ کا جادو چونکہ ٹوٹ چکا تھا اس لیے میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور غالباً سو بھی گیا تھا کیونکہ جب بس دلی پہنچ کر رکی تو اس لڑکی نے اترتے وقت ہم دونوں پر ایک ایسی غضبناک نظر ڈالی جسے لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔

دلی میں ہمارا سارا پروگرام منیر احمد شیخ کی وساطت سے طے ہونا تھا جو وہاں ہمارے سفارت خانے میں پریس کونسلر تھے چونکہ ہمیں نہ ان کے گھر کا پتا تھا اور نہ ہی ہم سفر اور شب بیداری کی وجہ سے سیدھے اپنے سفارت خانے میں جانے کی حالت میں تھے اس لیے یہی طے پایا کہ فوری طور پر کسی ہوٹل میں پڑاؤ کیا جائے۔ ٹیکسی والا ہمیں دلی کے ایک مہنگے علاقے میں لے گیا جہاں گیسٹ ہاؤس نما ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ کرائے خاصے زیادہ تھے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کناٹ پیلس کے نزدیک واقع رنجیت ہوٹل میں ڈیرہ ڈالیں' جس کا پتا ہمیں راجندر ملہوترہ نے دیا تھا مگر La-Sagrita گیسٹ ہاؤس منیجر مسز پاوا نے یہ کہہ کر ہمیں نفسیاتی محاذ پر شکست دے دی کہ وہ بھی لاہور کی رہنے والی ہے۔ رہی سہی مزاحمت اس نے پنجابی بول کر اور یہ کہہ کر ختم کر دی کہ آپ لوگوں کے ساتھ انتہائی رعایت کی جائے گی۔

لاسگریتا کا کمرہ نمبر ۲۰۵ پہلی نظر میں بالکل او کے تھا۔ ہر چیز نک سک سے درست نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں تسلی دی کہ کرایہ زیادہ سہی مگر ناجائز نہیں۔ ٹیلیفون اٹھایا تو فوراً ایک ایسی آواز نے گڈ مارننگ کہا جس کی عمر مسز پاوا سے کم از کم چالیس سال کم دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے منیر احمد شیخ کا نمبر دیا' اسی مترنم اور میٹھے لہجے میں "ابھی ملاتی ہوں" کہا گیا اور

خاموشی چھا گئی۔ عطاء باتھ روم میں تھا اور میں ٹیلیفون کو رئیس امروہوی کے تجویز کیے ہوئے ایک عمل کے انداز میں گھور رہا تھا۔ خاصے طویل وقفے کے بعد گھنٹی بجی۔ آواز کچھ عجیب سی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیا پتا یہاں اس طرح کی گھنٹی ہو۔ فون اٹھایا تو دوبارہ گھنٹی بجی۔ کوئی دروازے پر تھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ساڑھی میں لپٹی ایک عجیب و غریب چیز کھڑی تھی۔

''ذرا پلیز اپنے پاسپورٹ دیجئے' ایک کالم رہ گیا ہے۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ آواز ہو بہو وہی تھی جو کچھ منٹ پہلے میں نے فون پر سنی تھی۔ پریم چند نے اپنے کسی کردار کے بارے میں لکھا تھا کہ ''وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بدصورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' کاش پریم چند نے اس حسینہ کو ایک نظر دیکھ لیا ہوتا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے تناسخ کے نظریے میں سچائی محسوس ہوئی کیونکہ بیس بائیس کی عمر میں اس طرح کا جسم اور چہرہ کسی پچھلے جنم کی سزا ہی ہو سکتے تھے۔ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''ایک نمبر دیا تھا ابھی میں نے؟''

''جی ہاں' میں ابھی ملواتی ہوں۔ دراصل ہمارے پاس ایک ہی لائن ہے.......

ابھی ملواتی ہوں۔''

خدا خدا کر کے ٹیلیفون ملا تو ایک اور بری خبر ہماری منتظر تھی۔ منیر شیخ دو دن قبل پاکستان جا چکے تھے۔ اپنے سفیر ستار صاحب کا پتا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مدارس گئے ہوئے ہیں اور ۲۱ تاریخ کو لوٹیں گے یعنی ہماری روانگی سے ایک دن بعد.......

''ہور چوپو'' میں نے عطاء سے کہا۔

اس نے مجھے ایک طرف ہٹاتے ہوئے حسب معمول اپنے لباس میں موجود تمام جیبوں کی تلاشی لی اور پھر اٹیچی کیس سے اپنی مشہور زمانہ ٹیلیفون ڈائری نکالی جو اپنی شکل و شباہت میں قبل مسیح کے مخطوطوں کو مات کرتی ہے۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد اس نے بتایا کہ مجتبیٰ حسین اور خلیق انجم حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ ذہین نقوی اور آمنہ ابوالحسن کا نمبر نہیں مل رہا اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے یہاں سے کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔ میں نے کہا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب سے ہم صحیح معنوں میں پردیس میں ہیں۔ تھوڑی سی مزید کوشش کے بعد آمنہ ابوالحسن کا نمبر مل گیا۔ بہت خوش ہوئیں لیکن پتا چلا کہ ان کے میاں بھی حیدر آباد گئے ہوئے ہیں اور انہیں بچوں کو سکول سے لانا ہے اس لیے فوری طور پر ان کا آنا ممکن نہیں اور اصرار کیا کہ ہم ان کی طرف آ جائیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ سندر نگر (جہاں ہمارا لاسگریٹا واقع تھا) سے کون کون سے قابل دید مقامات قریب ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ آپ لوگ بستی نظام الدین سے آدھے میل کے فاصلے پر ہیں۔

اتنا تو ہمیں پتا تھا کہ امیر خسرو خواجہ صاحب کے مزار کے احاطے میں دفن ہیں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ پیرو مرشد مرزا غالب بھی اسی نواح میں ہوتے ہیں۔ مزارات وغیرہ سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں کیونکہ میرے نزدیک کسی بڑے تخلیق کار یا بزرگ کی عزت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے عمل سے روشنی حاصل کی جائے' لیکن پتا نہیں کیوں ان تینوں بزرگوں کے نام سن کر دل بے اختیار سا ہو گیا۔ یقیناً عطاء کی بھی یہی حالت ہوئی ہوگی کیونکہ ایک لفظ بولے بغیر ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔

خواجہ صاحب کی درگاہ مین روڈ سے دائیں طرف مڑنے والی ایک ذیلی سڑک پر ہے۔ وہاں ہمیں پہلی دفعہ مسلمان ناموں والے ہوٹل اور دکانیں نظر آئیں۔ اسلامی کتابوں کی دکانوں' پھول والوں کے کھوکھوں اور فقیروں کی ٹولیوں سے گزرتے ہوئے ہم درگاہ میں داخل ہوئے تو پہلے امیر خسرو کا مزار تھا۔ چاروں طرف ایک بے سروسامانی کی کیفیت تھی۔ تقریباً سو برس تک مختلف سلاطین اور شاہی خاندان کا مقرب' طوطیِ شکر مقال' میدان سخن کا شہنشاہ ار خواجہ غریب نواز کا محبوب مرید۔ وہ نابغہ روزگار شخص سنگ مرمر کے ایک نشان تلے اس امر سے بے نیاز سو رہا تھا کہ اس کے لکھے ہوئے لفظوں کی کمندیں کتنی صدیوں کو اپنا اسیر کر چکی ہیں۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم خواجہ صاحب کے احاطے میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے مختلف جگہوں پر رکھی ہوئی چندے اور نذرانے کی صندوقچیوں پر نظر پڑی۔ برصغیر کی اتنی بڑی درگاہ کی خستگی دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مالی حالت واقعی بہت پتلی ہے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد پتا نہیں کس جذبے کے تحت وہیں بیٹھ گیا۔ خدا' کائنات اور ان مقدس لوگوں کے درمیان وہ کونسا رشتہ ہے جو ہم عامیوں کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن کبھی کبھی اپنے ہونے کا ایسا بھرپور احساس دلاتا ہے کہ دلوں پر آیتیں سی اترنے لگتی ہیں۔ ہو سکتا ہے نفسیات والے فرد کو قوموں کے اجتماعی لاشعور پر تقسیم کر کے اس کا کوئی سبب ایجاد کر لیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جس طرح کائنات کی وسعت کے آگے ریاضی کے قاعدے اور اعداد و شمار بے بس ہو جاتے ہیں اسی طرح انسان کا باطن بھی اس کے ''علم'' کی چار دیواری میں کبھی قید نہیں ہوگا۔

باہر نکل کر حسب توفیق ہم نے ایک صندوقچی میں کچھ رقم ڈالی لیکن اس سے پیشتر کہ ہم آگے بڑھتے پتا نہیں کدھر کدھر سے نکل کر چھ سات صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس داڑھیوں والے نوجوان ہمارے اردگرد جمع ہو گئے اور نذرانہ گزارنے کی تاکید کی۔ ہم نے بتایا کہ ہم اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے ایک رجسٹر نکال لیا اور کہنے لگے کہ اپنا نام پتا لکھوائیے۔ ہم نے جان چھڑانے کے لیے لکھوا دیا۔ کہنے لگے اب عمارت کے لیے کچھ دیتے جائیے! بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے مختلف خاندانوں کے نمائندے ہیں اور مختلف مدوں میں چندے وصول کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے درمیان ''کاروباری''

جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں۔یعنی مزار کی خستگی کی اصل وجہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خستگی نہیں بلکہ ان مجاوروں کی بے ہنری تھی۔ دنیا بھی عجب جگہ ہے۔کہیں زندوں کا رزق مردے کھاتے ہیں اور کہیں مرنے والوں کے رزق سے زندہ لاشیں پلتی ہیں۔

درسگاہ سے نکلے تو دھوپ اور بھوک میں تیزی آ چکی تھی۔محبوب ہوٹل کے تنور سے نکلتے ہوئے گرم گرم نانوں نے ہمارے دامن دل کو کھینچتے ہوئے بتایا کہ جا ایں جا است۔کھانا اگرچہ واجبی سا تھا لیکن بل اپنے پرانی انارکلی والے پیپلز ہوٹل سے بھی کم تھا۔میں نے عطاء سے کہا۔"اگر ہم یہی کھانا کسی بڑے ہوٹل میں کھاتے تو کم از کم اس سے دس گنا زیادہ بل آتا۔"

"اور ذائقہ اس سے بھی گیا گزرا ہوتا۔" عطاء نے میری بات سیکنڈ کرتے ہوئے کہا۔

اس پر مجھے کراچی کا ایک بڑا ہوٹل یاد آ گیا ہے جہاں ایک انتہائی بدمزہ بیف برگر کا بل جب چھتیس روپے طلب کیا گیا تو میرے ایک ساتھی نے بڑی معصومیت پوچھا۔"کیوں بھائی اس برگر میں جس بھینسے کا قیمہ استعمال کیا گیا ہے اس نے کیا کوئی مقابلہ جیتا تھا؟"

تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہم نے ایک راہ گیر سے غالب کے مزار کا پتا پوچھا تو معلوم ہوا کہ ہم بالکل اس کے دروازے پر کھڑے ہیں۔یہ مزار مغلوں کے پرانے شاہی قبرستان کے بیرونی احاطے میں واقع ہے۔قبرستان کے دروازے سے چند فٹ ادھر بائیں جانب غالب کی قبر ہے جس کے گرداگرد سفید پتھر سے ایک چبوترہ اور ایک منقش سائبان تعمیر کیا گیا ہے' لیکن یہ ساری تعمیر اتنے مختصر رقبے میں ہے کہ مزار کے اندر فاتحہ خوانی کے لیے بیک وقت چھ سے زیادہ آدمی کھڑے نہیں ہو سکتے۔لوح مزار پر غالب کے اشعار ہی اس کا تعارف کرا رہے ہیں۔پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے یہ شعر بہت یاد آیا۔

ہر نفس' ہر یک نفس جاتا ہے قسط عمر میں
حیف ہے ان پر جو کہویں "زندگانی مفت ہے"

ہم دونوں مقبرے کے اندر بہت دیر تک خاموش کھڑے رہے۔چند قدم کے فاصلے پر اپنے وقت کے وہ لوگ سو رہے تھے جن کا سکہ خود وقت پر چلتا تھا۔عالیشان محلوں میں زندگیاں گزارنے والے یہ بے نام "بڑے آدمی" اس قرض کی مے پینے والے اپنے ہی درباری شاعر کے مقابلے میں کتنے بے حقیقت تھے۔تاریخ کے Waste Land میں' جہاں افراد تو کیا پوری پوری تہذیبیں گرد بادوں کی طرح بے ٹھکانہ ہو جاتی ہیں' یہ کیسا نخل سبز تھا کہ جس کی چھاؤں اردو زبان و ادب سے ذوق رکھنے والے ہر شخص کی روح میں خیمہ کیے ہوئے ہے۔ہم' جو ابھی خواب ہنر میں ہیں مگر اپنی چار دن کی جزیروں جیسی شہرت پر پھولے نہیں سماتے' اب سمندر گیر صاحب ہنر کے روبرو اپنی ہیچمدانی پر نادم و شرمسار کھڑے تھے۔کیا اپنی گرمی نشاط تصور میں اس نے جس گلشن ناآفریدہ کا خواب

دیکھا تھا وہ کبھی ظہور میں آئے گا۔ کیا ہنر کی قسمت میں کوئی منزل نہیں ہے؟ میرے ذہن میں اس کے دو شعر گونجے۔

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
وہ نالہ دل جس میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

کچھ آنسو میرے دل کے اندر کی طرف گرے اور شاید آنکھوں میں آجاتے لیکن ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میرے جھکے ہوئے سر پر اس نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

گل غنچگی میں غرقہ دریائے رنگ ہے
اے آگہی فریب تماشا کہاں نہیں؟

ہاں ٹھیک ہی تو کہا ہے اس نے۔ یہ سب کچھ فریب تماشا ہی تو ہے ورنہ منوں مٹی تلے دبی ہوئی یہ ایک مشت خاک مجھ سے کس طرح ہم کلام ہو سکتی تھی!

مزار سے باہر لیکن اسی احاطے میں غالب کی بیوی اور بھانجے عارف کی قبریں ہیں۔ وہاں فاتحہ پڑھ کر مڑے تو فقیروں کے ایک خاندان نے گائیڈ کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔ ان کی لیڈر ایک نوجوان عورت تھی جس کی گفتگو میں سوائے ''گالب صاحب'' کے اور کسی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی اور وہ وقفے وقفے سے ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش بھی کر رہی تھی کہ جو رقم ہم اسے دیں گے وہ انصاف کے ساتھ بقیہ تمام لوگوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ اہل خیر پر خدا کی کیسی رحمت ہوتی ہے کہ ان کا سلسلہ فیض کسی نہ کسی رنگ میں چلتا رہتا ہے۔

ہوٹل واپس پہنچے تو Reception کاؤنٹر پر مسز پاوا نے تیسری مرتبہ اپنے ٹمپل روڈ لاہور والے مکان کے متعلق بتایا۔ عطاء نے میرے کان میں کہا۔ اس سے ذرا پوچھو تو سہی وہ دلی کہاں ہے جس کے بارے میں میر نے کہا تھا۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی!

میں نے بھی آواز دبا کر جواب دیا کہ وہ کوچے تو میر کی زندگی میں ہی خواب و خیال ہو گئے تھے اب تو یہی کچھ ہے جو سامنے نظر آ

رہا ہے۔

عطاء نے کہا۔ ''یہ تو پرانی بلکہ بہت پرانی دلی ہے۔''

ہم نے مسز یادوا سے درخواست کی کہ ہماری فون کال ذرا جلدی ملا دیا کریں کیونکہ دلی میں ہمارے قیام کا پروگرام اسی مواصلاتی رابطے پر منحصر ہے۔ اب پتا نہیں یہ ہماری درخواست کا اثر تھا یا خوف کہ کہیں گاہک ہاتھ سے نہ نکل جائے' جو نمبر بھی ہم نے دیا کھٹ سے ملا دیا گیا۔ آمنہ ابوالحسن نے بتایا کہ غالب اکیڈمی کے ذہین نقوی صاحب سے ان کی بات ہوگئی ہے اور وہ کل صبح ہمارے منتظر ہوں گے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بتایا کہ پرسوں دوپہر ہم فارغ رکھیں کیونکہ جامعہ ملیہ میں شعبہ اردو کے اساتذہ اور طلبہ ہمارے ساتھ ایک خصوصی محفل کا انتظام کر رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس کے پروڈیوسر رفعت سروش نے اطلاع دی کہ پاکستان کے مہمان شعراء کی ایک خصوصی نشست وہ اپنی اردو مجلس کے لیے ریکارڈ کر رہے ہیں جس کی تفصیل وہ کل بتائیں گے اور یاد دلایا کہ وہ اس سلسلے میں انبالہ میں ہم سے پکا وعدہ لے چکے ہیں۔ دن بھر کی تھکاوٹ کی وجہ سے طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی۔ اس لیے کھانا ہم نے کمرے میں ہی کھانے کا فیصلہ کیا اور زندگی میں پہلی بار رات کے کھانے میں مکھن ٹوسٹ اور جیم کا انتخاب کیا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ کیوں؟

۷ مارچ کو صبح آٹھ بجے کے قریب جب میری آنکھ کھلی تو کھلا ہوا رسالہ میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ مجھے ایک دم یاد آیا کہ سونے سے پہلے میں ایک ایسا مضمون پڑھ رہا تھا جس میں مصنف نے انتہائی بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے اپنے کچھ ایسے تجربات بیان کئے تھے جن پر جوش صاحب کی ''یادوں کی برات'' کا گمان ہوتا تھا۔ عطاء اپنے خراٹوں کے مکمل آرکسٹرا کے ساتھ سو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر دانت صاف کئے۔ اخبار منگوا کر حسب معمول سب سے پہلے کھیلوں کا صفحہ پڑھا' پھر باقی صفحوں کی موٹی موٹی سرخیاں دیکھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پورے اخبار میں ایک بھی فلم کا اشتہار نہیں تھا۔ سینما کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود اخبار میں فلموں کے اشتہار نہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے بعد کے دنوں میں کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ کسی سے اس کا سبب بھی نہ پوچھ سکا۔ باتھ روم میں شیو کے لیے گرم پانی کا نل کھولا تو پانی ٹھیک ٹھاک گرم تھا لیکن شیو کے دوران ہی اس کا درجہ حرارت کچھ اس تیزی سے گرنا شروع ہوا کہ جب منہ ہاتھ دھونے کی باری آئی تو باقاعدہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مینجر کو اطلاع دی تو اس نے بتایا کہ ہوٹل کے مکینک کو بھجوایا جا رہا ہے۔ چند لمحوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ روم سروس والا بیرا اندر آیا اور ''حکم'' پوچھنے لگا۔ میں نے بتایا کہ فی الحال ہمیں اس کی نہیں ہوٹل کے مکینک کی ضرورت ہے۔ اس نے ایک پیچ کس دکھاتے ہوئے اطلاع دی کہ وہی ہوٹل کا مکینک بھی ہے۔

میں نے اسے گیزر کی خرابی سے آگاہ کیا۔ اس نے باتھ روم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بغیر کسی چیز کو چھوئے فیصلہ سنا دیا کہ مرمت میں کچھ دیر لگے گی اور مشورہ دیا کہ ہم لوگ کسی اور باتھ روم میں نہا لیں۔ نئے باتھ روم میں پہنچا تو پہلے سین کا ''ایکشن ری پلے'' منتظر تھا۔ لیکن میں چونکہ اس وقت تک بے خطر ہو کر ٹب میں کود چکا تھا اس لیے سوائے موسیقی سے دست و گریباں ہونے کے کچھ نہ کر سکا اور وہ سب مشہور گانے گا ڈالے جن کی طرزیں میری اپنی ایجاد کی ہوئی ہیں۔

آمنہ ابوالحسن ٹھیک وقت مقررہ پر آ گئیں۔ ان کے میاں مصطفیٰ علی اکبر آل انڈیا ریڈیو کے مشہور اردو نیوز ریڈر ہیں اور ذاتی حیثیت میں اپنے آبائی وطن حیدر آباد کی سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ آمنہ بار بار معذرت کر رہی تھی کہ اگر انہیں ہمارے آنے کا پہلے سے علم ہوتا تو وہ اپنے میاں کو روک لیتیں اور یوں ہمارے دلی کے قیام کے دوران ان کی موٹر ہمارے کام آ جاتی۔ جس خلوص سے انہوں نے یہ بات کی وہ ان کی پروقار اور مہمان نواز شخصیت کی آئینہ دار تھی۔ غالب اکیڈمی پہنچے تو ذہین نقوی ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں اکیڈمی کی عمارت کے مختلف حصوں کی سیر کرائی اور ان سب منصوبوں پر روشنی ڈالی جن پر کام ہو رہا ہے یا جو ابھی زیر ترتیب ہیں۔ عمارت بڑی نفیس' کشادہ اور مضبوط ہے۔ اردو رسم الخط کے تحفظ' ترویج و ارتقاء اور اسے ایک ذریعہ معاش بنانے کے لیے اکیڈمی میں کتابت کے مختلف اسالیب کے ساتھ ساتھ آرائشی خطاطی کی بھی یہی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اکیڈمی کی ایک اپنی مستقل آرٹ گیلری بھی ہے جہاں چند دن پہلے مشہور پاکستانی مصور صادقین کی ایک بہت ہی کامیاب نمائش منعقد ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک خاصے بڑے کمرے میں غالب کی زندگی کو تصویروں' دستاویزوں' تحریروں اور اس کی ذات سے متعلق دیگر یادگاروں سے مزین کر کے ایسا ماحول پیدا کیا جا رہا ہے کہ آپ اس کی شخصیت کو اس کے عہد کے پس منظر میں دیکھ سکیں۔ اس طرح غالب لائبریری میں غالب سے متعلق بے شمار مطبوعہ مواد کے علاوہ بیش قیمت مسودات بھی محفوظ کیے گئے ہیں۔ غالب سے متعلق واقعات' خطوط اور شخصیات کی علیحدہ علیحدہ فائلیں کھولی گئی ہیں۔ مثلاً اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ غالب کا شاگرد منشی شیو نرائن کون تھا اور اس کے بارے میں غالب اور دوسروں لوگوں نے کیا لکھا ہے تو آپ کو منشی شیو نرائن کی فائل میں یہ سب کچھ ایک جگہ پر مل جائے گا۔ ہم نے یہ فائلیں دیکھ کر ذہین نقوی صاحب کو بہت داد دی اور بتایا کہ فائلیں ہمارے یہاں بھی کھلتی ہیں اور اکثر حکومتیں بدلنے کے ساتھ ساتھ ان میں موجود افراد کے گناہ و ثواب بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن یہاں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ عطاء نے ذہین نقوی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس ہنر کو زیادہ عام نہ کریں ورنہ سی آئی ڈی والے انہیں بطور ریکارڈ کیپر پکڑ کر اپنے محکمے میں لے جائیں گے۔

اکیڈمی کی عمارت اور انتظام دیکھ کر ہمارا خیال تھا کہ یہ بھی ہمارے مرکزی اردو بورڈ کی طرح کا سرکاری گرانٹ سے چلنے والا کوئی

ادارہ ہے لیکن جب ذہین نقوی نے بتایا کہ یہ سب کا سب ایک فردِ واحد کی محنت، لگن اور غالب پسندی کا کارنامہ ہے تو شروع میں سچ مچ ہمیں یقین نہیں آیا۔ ذہین صاحب نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ہمدرد ٹرسٹ کے حکیم محمد حمید (جو پاکستان والے حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی ہیں) نے ۱۹۶۸ء میں بستی نظام الدین کے مجاوروں سے اراضی کے دو ٹکڑے خریدے۔ ایک پر غالب اکیڈمی کی عمارت تعمیر کی گئی اور دوسرے پر ایک کمرشل بلڈنگ بنا کر اس کا کرایہ مستقلاً اکیڈمی کے نام کر دیا ہے جو تقریباً دس ہزار روپے مہینہ بنتا ہے تا کہ اکیڈمی کو اپنے انتظامی اخراجات پورے کرنے کے لیے کسی کی محتاجی نہ رہے۔ بھارت کے مرحوم صدر ذاکر حسین بھی اکیڈمی کے سلسلے میں بہت سرگرم تھے لیکن موت نے انہیں زیادہ مہلت نہیں دی۔ یہ بھی پتا چلا کہ حکیم صاحب موصوف کا ادب سے کوئی براہ راست تعلق نہیں اور نہ ہی وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح لکھنے لکھانے اور سیاست وغیرہ سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ حکیم محمد سعید کے ذکر سے مجھے خیال آیا کہ یوں تو وہ بھی شام ہمدرد ٹیونیسکو کے خوبصورت باتصویر رسالوں اور ہمدرد وقف کی مطبوعات کے ذریعے سے ادب کی سرپرستی کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر ان سب کی جگہ وہ کوئی ایسا ہی مستقل نوعیت کا کام کر جائیں۔

ذہین نقوی صاحب ابھی یہ کہانی سنا ہی رہے تھے کہ سید ضمیر جعفری اور سلطان رشک آگئے۔ انبالہ سے چونکہ ہم لوگ سہارنپور اور وہ دلی چلے گئے تھے اس لیے جلدی جلدی گزشتہ دو دنوں کے بعد اہم واقعات کا تبادلہ عمل میں لایا گیا۔ ضمیر صاحب ۱۹۴۶ء کے بعد پہلی بار دلی آئے تھے اور اس عمر اور اپنے موٹاپے کے باوجود ہم لوگوں سے زیادہ مستعد اور پرجوش نظر آرہے تھے۔ ان کی پوری شخصیت موسم بہار کی شاموں جیسی ہے۔ غالب نے جب یہ کہا تھا۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

تو مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے محبوب کی نہیں تو یقیناً ضمیر صاحب جیسی کسی باغ و بہار شخصیت کی صحبت میں ہوگا۔ ہاں یہ میں نے ضمیر صاحب کے موٹاپے کا جو ذکر کیا ہے تو اس کا تعلق بھی ان کے اپنے ہی ایک شعر کے ساتھ ہی جو کچھ یوں ہے۔

یہ بڑھاپا تو مجھ کو خدا نے دیا
ہے مٹاپا مگر میرا خود ساختہ

ضمیر صاحب کے آتے ہی محفل کا رنگ بدل گیا اور ذہین نقوی صاحب کے بارے میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ ہنسنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ وہیں باتوں باتوں میں پتا چلا کہ شمس الرحمٰن فاروقی بھی آج کل دلی میں ہیں اور وہیں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان

حسین صاحب نے مجھے ان کے گھر اور دفتر کے فون نمبر بھی لکھوا دیے۔ فاروقی سے میری خط و کتابت بہت مختصر ہے لیکن تاریخی اعتبار سے یہ تقریباً بارہ برس پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں ان کے پرچے ''شب خون'' میں چھپتا بھی رہا ہوں اور گزشتہ برس لاہور میں ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی' چنانچہ میں نے فوراً ان کے دفتر کا نمبر گھمایا۔ گھنٹی'' دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو'' کے انداز میں دیر تک بجتی رہی۔ حسین صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ شاید ابھی لنچ بریک ختم نہیں ہوا۔ بعد میں فاروقی صاحب نے بتایا کہ اگر ہم اسی نمبر پر ٹرائی کرتے رہتے تو یہ لنچ بریک کبھی ختم نہ ہوتا کیونکہ وہ نمبر ان کے دفتر کا نہیں تھا۔

غالب اکیڈمی سے نکلے تو سوچا کہ اس وقفے کو غنیمت جان کر کوئی فلم دیکھ لی جائے کیونکہ اس کے بعد کی مصروفیات میں اس کی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔ رکشے والا ہمیں ہوٹل سے قریب ہی واقع اسٹیڈیم سینما میں لے گیا جہاں ہندوستانی فلم ''لوسٹوری'' لگی ہوئی تھی۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے دنوں کا بنا ہوا ایک عارضی سینما گھر تھا۔ فوجیوں کے لیے بنایا گیا تھا چنانچہ ابھی وہاں ٹکٹ کا ریٹ باقی سینماؤں کی نسبت تقریباً نصف یعنی سوا تین روپے تھا جبکہ ہمارے یہاں یہی ٹکٹ دس روپے میں ملتا ہے۔ ''لوسٹوری'' گزشتہ برس کی کامیاب ترین فلموں میں سے تھی اور پاکستانی پریس میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ چھپتا رہا تھا۔ ہیرو کمار گورو ماضی کے ایک ہیرو راجندر کمار کا بیٹا تھا۔ ہندوستان میں آج کل Teenage رومانس پر مبنی فلمیں بنانے کی لہر چلی ہوئی ہے اور پرانے ایکٹر دھڑا دھڑ اپنی اولادوں کو سامنے لا رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بعض کیسوں میں سینئر نسل بھی ابھی تک فلموں میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہے جیسے ششی کپور اور اس کا بیٹا۔ فلم شروع ہوئی تو ابتدا ہی سے اندازہ ہو گیا کہ اس میں کہانی کم اور ''سٹوری'' زیادہ ہے۔ کرداروں کا تعارف اس طرح کرایا گیا جیسے ٹی وی پر کرکٹ میچ کی جھلکیاں دکھائی جا رہی ہیں۔ ہیرو اور ہیروئین کے والدین کو بر سبیل تذکرہ دکھانے کے بعد ہیرو اور ہیروئین کی ملاقات ہوئی اور پھر فلم کے اختتام تک ہوتی ہی چلی گئی۔ سوائے میوزک کے پوری فلم انتہائی بے معنی اور بے ربط واقعات کا ایک ملغوبہ تھی اور انٹرول کا وقفہ اس قدر مختصر تھا کہ اس میں زیادہ سے زیادہ آپ سیٹ پر پہلو بدل سکتے ہیں۔ غالباً اسی نوع کی قید کو قید بامشقت کہا جاتا ہے۔

ہمارے ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر سندر نگر کا شاپنگ سنٹر تھا۔ عطاء کو عارف نظامی کے لیے ایک کتاب ڈھونڈنا تھی اور مجھ سے اشفاق صاحب نے اچاریہ رجنیش کی کتابوں کے بارے میں کہہ رکھا تھا' چنانچہ ہم سب سے پہلے کتابوں کی دکان میں داخل ہوئے۔ کتابوں کے معاملے میں ہندوستان میں جہاں جہاں ہم گئے انگریزی کا غلبہ بہت واضح تھا۔ رسائل بھی زیادہ تر انگریزی میں تھے اور ان کی بیشتر تعداد ایسے مواد اور تصویروں سے پر تھی جنہیں ہمارے یہاں لوگ گناہوں کی طرح چھپا چھپا کر رکھتے ہیں مگر وہاں

ہر عمر کے مرد و زن نہ صرف ان کی سر عام خریداری میں مصروف تھے بلکہ خریدنے سے پہلے اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھتے بھی تھے۔ بیشتر رسائل کے اندرونی صفحات پن لگا کر بند کر دیئے گئے تھے۔ وجہ پوچھی تو دکاندار نے بتایا کہ یہ مفت بینوں سے بچاؤ کے لیے حفاظتی اقدام ہے۔ کیونکہ دوسری صورت میں لوگ خریدنے کی بجائے تصویریں وغیرہ دیکھ کر وہیں دل پشوری کر لیتے ہیں اور یوں ان کے کاروبار کا نقصان ہوتا ہے۔ ہماری مطلوبہ کتابیں وہاں نہیں تھیں لیکن مجھے انگریزی لطیفوں کے چند ایسے مجموعے مل گئے جو میرے لیے نئے تھے۔ عطاء نے جملہ کسا۔ ''لگتا ہے ٹی وی والوں سے صلح کے بعد اب تم کوئی مزاحیہ سیریل لکھنے کا ارادہ کر رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں یہ میں تمہارے لیے بطور ریفرنس بکس کے خرید رہا ہوں کیونکہ میرے سنائے ہوئے لطیفے جو تم اپنے کالموں میں میرا حوالہ دیئے بغیر درج کرتے ہو میں نے انہی کتابوں سے پڑھے ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تم اور کچھ نہیں تو کم از کم لطیفوں کی حد تک تو خود کفیل ہو جاؤ گے۔''

چند قدم کے فاصلے پر نوادرات کی ایک دکان تھی۔ عطاء نے اس میں داخل ہونے کی کوشش کی تو میں نے اسے روکا کہ پہلے شو کیس میں لگی ہوئی قیمتوں کی پرچیوں پر ایک نظر ڈال لو۔ اس نے وہ نظر ڈالی اور پھر ''ایک بار دیکھا ہے اور دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں ہے'' کی مجسم تصویر بنا ہوا جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اگلی دکان چائے کی تھی لیکن یہاں چائے جس شکل میں ملتی تھی اس کی کیفیت کولرج کے لفظوں میں کچھ یوں تھی۔

Water Water every where
And not a drop to drink

مالک دکان مسٹر ہیکل کے چہرے پر ایسی بیچارگی اور آواز میں ایسی لجاجت تھی کہ بڑے سے بڑا سنگدل گاہک بھی اس دکان سے خالی ہاتھ نہیں نکل سکتا تھا اور ہم تو رقیق القلب ہونے کے ساتھ ساتھ پردیسی بھی تھے چنانچہ اس نے ہمیں طرح طرح کے ڈبوں سے اتنا لاد دیا کہ ہم شاعر کے بجائے چائے کے ہول سیل ڈیلر نظر آنے لگے۔ اس نے یہ چائے ہمارے ہاتھ بالکل اسی طرح بیچی جیسے ڈپٹی نذیر احمد کی ''توبۃ النصوح'' میں مرزا ظاہر دار بیگ نے کلیم کو چنے کی دال کھلائی تھی۔ ہیکل کو اردو اور فارسی سے بھی شغف تھا جس کا اس نے عملی مظاہرہ بھی کیا۔ گویا اب ہم چاہتے بھی تو اس کے جال سے نہیں نکل سکتے تھے۔

ہوٹل پہنچے تو مسز پاوا نے بظاہر بڑے سرسری انداز میں ہماری شاپنگ کا جائزہ لیا لیکن اس کی آنکھوں میں تیرنے والی شک کی پرچھائیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے ان لفافوں میں چرس یا ہیروئین ہونے کا خاصا قوی شبہ ہے۔ ہم نے یہ محسوس کر کے اپنے انداز کو جان بوجھ کر کچھ اور مشکوک بنا لیا۔ میں نے بڑے تشویش بھرے انداز میں پوچھا کہ ہمارے بعد کوئی فن تو نہیں آیا۔ مسز پاوا نے کہا۔

''نہیں'' میں نے مزید مشوش ہوکر بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''ابھی آئے گا' ہم اپنے کمرے میں ہیں فوراً ملوا دیجئے گا۔''
یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیکٹوں کو اس طرح سمیٹا جیسے انہیں مسز پاوا کی نظروں سے چھپانا ہو۔ وہ واقعی پریشان ہوگئی کیونکہ اس بار اس نے ہمیں اپنے لاہور والے مکان کی کوئی بات نہیں سنائی۔ نو بجے کے قریب رفعت سروش کا فون آیا کہ ریکارڈنگ کل بارہ بجے ہوگی۔ میں نے بتایا کہ ہم اس وقت کے لیے ڈاکٹر نارنگ سے جامعہ ملیہ آنے کا وعدہ کر چکے ہیں اس لیے وہ ڈاکٹر صاحب سے بات کرکے اپنا یا ان کا وقت بدل لیں کیونکہ دوسری صورت میں ہمیں مجبوراً ان کے پروگرام میں شرکت سے معذرت کرنا ہوگی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا فون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ رفعت صاحب سے ان کی بات ہوگئی ہے اور یہ طے پایا ہے کہ ہم جامعہ ملیہ سے فارغ ہوکر ڈھائی بجے کے قریب ریڈیو اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔
اٹھارہ کی صبح ہم جلدی جاگ گئے۔ گیارہ بجے جامعہ ملیہ کے ایک طالب علم نے ہمیں لینے آنا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ اس سے قبل ہم قطب مینار دیکھ آئیں۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو معلوم ہوا کہ قطب مینار جنوبی دلی میں ہے۔ گویا ہمیں دلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانا تھا۔ اس ٹیکسی کا ڈرائیور بھی سکھ تھا لیکن اس کا اندازہ اس کی ڈرائیونگ سے کرنا بہت مشکل تھا۔ راستے میں ہم نے صفدر جنگ پل کے قریب وہ جگہ دیکھی جہاں سنجے گاندھی کا جہاز کریش ہوا تھا۔ وقت کی کمی اور فاصلے کی زیادتی کے بین بین سفر کرتے ہوئے ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں قطب مینار پہنچے تو شفیق الرحمٰن کی تزک نادری میں لکھا ہوا نادر شاہ کا حکم بہت یاد آیا جس میں ٹورسٹوں کی سہولتوں کے لیے تمام تاریخی عمارتوں کو ایک جگہ پر جمع کرنے کا آئیڈیا پیش کیا گیا ہے۔
قطب مینار ان عمارتوں میں سے ایک ہے جن کا حسن لفظ اور کیمرے میں قید نہیں ہوسکتا۔ اس کے اصل جوہر تو اس کی قربت میں ہی کھلتے ہیں۔ یہ سنگ تراشی' نقاشی اور فن تعمیر کا ایک حیرت انگیز مجموعہ ہے۔ اس کی بلندی کے سائے میں کھڑے ہوں تو اپنا وجود اس قدر بے حقیقت محسوس ہوتا ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے۔ انسان جب اپنی تخلیق کے سامنے اتنا بے بس ہوتا ہے تو پھر وہ پوری کائنات سے کس طرح نبرد آزما ہولیتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ازل اور ابد کی بے انت وسعتوں میں کہیں نہیں ہے لیکن یہ مبہوت کردینے والی عظمت کچھ ایسی باتیں سوچنے پر مجبور ضرور کردیتی ہیں۔ جس کی فرصت ہمیں اپنی بے حد مصروف زندگیوں میں ملے بھی تو نہیں ملتی۔ مینار کے علاوہ اردگرد کی تمام عمارات ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں اور اگرچہ مختلف جگہوں پر سنگی کتبوں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ کون سی عمارت ہے (تھی) اور اس کے ساتھ اس کی مختصر تاریخ بھی درج کردی گئی ہے لیکن شکستہ دیواروں اور پتھروں کے نیم ایستادہ ڈھانچوں کے سوا آپ کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ انتہا یہ ہے کہ جب ہم اس عمارت میں داخل ہوئے جسے ''مسجد

قوت الاسلام'' کہا گیا تھا تو بہت دیر تک ہم اسی تذبذب میں رہے کہ یہ کوئی اور جگہ ہے۔ جس احاطے میں ہم کھڑے تھے وہ تو صحن مسجد سے مشابہ تھا لیکن محراب و منبر کی اور کوئی علامت قابل شناخت حالت میں نہیں تھی۔ ایک طرف ڈیوٹی پر موجود عملے کے کچھ افراد کھڑے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا کہ کیا یہی ''مسجد قوت الاسلام'' ہے تو اس نے بڑے مبلغانہ جوش کے ساتھ کہا۔ ''مہاراج' یہ ہے تو مسلمانوں کی مسجد مگر اس کا نام معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے ستائیس جین اور ہندو مندر مسمار کر کے ان کے پتھروں سے اسے بنایا تھا۔''

باہر نکلے تو دروازے پر یہی مضمون ایک پتھر پر لکھا نظر آیا۔ چند قدم آگے بڑھے تو گائیڈ غیر ملکی ٹورسٹوں کو یہی کہانی مزے لے لے کر سنا رہا تھا۔ میں نے عطاء کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ بھی کشیدہ ہو چلا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جو لوگ تقسیم کو غلط سمجھتے ہیں انہیں چند مہینوں کے لیے ضرور یہاں بھجوانا چاہیے۔''

ہم تاریخ اور جغرافیہ کے اس باہمی عم اور رد عمل پر باتیں کرتے ہوئے خواجہ الدین بختیار کاکی کا مزار بھی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے جسے ہماری تاریخی معلومات کے پیش نظر یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ دو تین لوگوں سے پوچھا' انہوں نے جواب میں صرف شانے ہلا دیئے۔ ایک پان سگریٹ کی دکان والا نظر آیا۔ سوچا' یہ یہیں کا ہے' اس سے پتا کرنا چاہیے۔ اس نے بے انتہائی بے نیازی سے جواب دیا۔

''وہ تو ادھر نہیں ہے.......''

''تو پھر کہاں ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

''ادھر مہرولی میں ہے۔'' اس نے ہاتھ سے ایک ایسا مبہم اشارہ کیا جس سے کوئی بھی سمت مراد لی جا سکتی تھی۔

''مہرولی کیا ہے بھائی؟''

مگر بھائی نے ہماری بات کو تضیع اوقات سمجھتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس سے پیشتر کہ میں اس بدلحاظ آدمی سے بزبان پنجاب گفتگو کرتا عطاء نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''مٹی پاؤ پہلوان جی' ناراض ہونے کا ٹائم نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ آپ کا جوڑ کا نہیں۔''

ہوٹل پہنچے تو جامعہ ملیہ کا ایک نوجوان طالب علم' جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا' ہمارا منتظر تھا۔ جامعہ کا شعبہ اردو دو مختلف عمارتوں میں واقع ہے۔ کلاسیں جامعہ کی مرکزی عمارت میں ہوتی ہے اور اساتذہ کے کمرے اور سیمینار روم اس عمارت میں واقع ہیں

جہاں ہمیں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے کمرے میں نہیں تھے' البتہ ان کے رفقاء میں سے مظفر حنفی' ڈاکٹر شمیم حنفی' ڈاکٹر صغرا مہدی اور دو اور استاد ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ سب لوگ بڑی محبت سے ملے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر عنوان چشتی اور ایک اور نوجوان ڈاکٹر بھی تشریف لے آئے جن کے بارے میں پتا چلا کہ مطالعہ اقبال سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ ان کا نام بڑا آسان اور یاد رہ جانے والا تھا مگر ایک ساتھ زیادہ لوگوں سے تعارف میں یہی برائی ہے کہ نام آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ چائے کے دوران زیادہ تر ''کون کہاں ہے!'' قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نارنگ بھی پہنچ گئے۔ دراصل جامعہ ہنگاموں کی وجہ سے کئی دنوں سے بند تھی اور باقاعدہ طور پر اسی دن کھلی تھی۔ ایسے میں مختلف تدریسی شعبوں کے سربراہ جس پریشانی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اس کے آثار ان کے چہرے سے ہویدا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جامعہ کا مجوزہ میر تقی میر سیمینار' جس میں شرکت کی دعوت انہوں نے چند دن قبل مجھے بذریعہ منیر احمد شیخ بھجوائی تھی' حالات ناسازگار ہونے کے باعث ملتوی کرنا پڑے گا اور اب وہ غالباً دسمبر میں ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ اس التواء میں آپ کا کوئی قصور نہیں' دراصل یہ سارا چکر میر کے ستاروں کا ہے جو اسے پس مرگ بھی چین نہیں لینے دیتے۔ میر کی بات چلی تو اس کے ایسے اشعار کا ذکر بھی چھڑا جن میں کسی لفظ کو بڑے اچھوتے اور نئے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنو سے تھا
وہیں میں کاش مر رہتا' سراسیمہ نہ آتا یاں

ابھی میں دوسرا دروازہ پڑھ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور فہمیدہ ریاض اندر داخل ہوئی۔ اس شعر اور اس کی آمد میں ایک ایسا ربط خفی تھا کہ چند لمحوں کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ فہمیدہ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے ہندوستان میں ہی مقیم ہے اور یہاں جامعہ ملیہ میں اسے شاعرہ در جامعہ (Poetess in the Campus) کے طور پر پروفیسر گریڈ میں تعینات کیا گیا ہے۔ پاکستان میں اس کے طرز عمل کے بارے میں جو خبریں ہم تک پہنچی تھیں وہ بے حد افسوسناک تھیں۔ کسی حکومت' نظریے یا طریقہ کار سے اختلاف کا یہ حل نکالنا کہ آدمی وطن چھوڑ کر زبردستی جلاوطنی اختیار کر لے اور اپنے درد کا درماں غیروں سے چاہے' کسی طور بھی موزوں اور مناسب نہیں کیونکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جو اپنوں کا نہیں بنتا اسے کوئی بھی نہیں اپناتا۔ گھر کا جھگڑا گھر کی دیواروں کے اندر ہی نمٹا دیا جائے تو اچھا لگتا ہے۔ فہمیدہ ہماری نسل کی بہت اہم اور توانا آواز ہے لیکن جب سے اس نے اپنے آپ کو سیاسی دانشور اور مزاحمتی تحریک کا نمائندہ تصور کیا ہے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں اپنے محور سے ہٹ گئی ہیں۔ شاید اسے خود بھی اس کا احساس تھا کیونکہ اس کے تپاک میں ایک عجیب طرح کی بے کلی سی تھی جو چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اس کے آتے ہی ماحول میں ایک دم سرد مہری سے

آ گئی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی اس تقرری پر جامعہ سے متعلق تمام اساتذہ سخت ناخوش ہیں اور ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی تقریب میں اس کو مدعو نہ کیا جائے کیونکہ اس کے طرزِ عمل کی وجہ سے انہیں اکثر اپنے مہمانوں کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا ہے لیکن وہ اسے شرکت سے روک بھی نہیں سکتے کیونکہ اسے ''اوپر'' سے بھیجا گیا ہے۔ میرے دل کو دھکا سا لگا۔ ایک اتنے اچھے اور تخلیقی ذہن رکھنے والے فنکار نے بے حرمتی کا یہ سودا کیسے کر لیا! یہ کیسا نعرۂ حریت ہے جو ایک غیر سرزمین پر حق نمک بن کر رہ گیا ہے۔ یہ کس طرح کی مزاحمت ہے جو میدانِ عمل سے دور ہوا میں تلواریں لہرا رہی ہے؟ میرے ذہن میں پھر میر کا مصرعہ گونجنے لگا۔''خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنو سے تھا''

سیمینار روم میں چالیس کے قریب طلباء و طالبات ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ہم دونوں کا مختصر سا تعارف کرایا اور پھر طلبہ اور اساتذہ کو دعوت دی کہ وہ ہم سے شعر و ادب اور ہماری اپنی تحریروں کے بارے میں سوالات کریں۔ یہ مرحلہ خاصا دلچسپ تھا۔ عطاء نے حسبِ معمول یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ فی البدیہہ جواب دینا یا اسٹیج پر آ کر بات کرنا اس کے بس سے باہر ہے اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ میرا اختیارِ عام ہے' اس کی رائے میں مجھے شامل سمجھا جائے۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ تقریباً ایک گھنٹے تک چلتا رہا۔ وہاں لوگ پاکستانی کے ادبی پس منظر سے بہت زیادہ آگاہ نظر آئے۔ افتخار جالب اینڈ کمپنی کی لسانی تشکیلات' وزیر آغا کے انشائیے' ظفر اقبال کی گلافتابی غزل اور جدید علامتی افسانے کے پنپ نہ سکنے کے محرکات کا جو جائزہ ڈاکٹر گوپی چند اور شمیم حنفی نے پیش کیا اسے اگر یہاں دہرایا جائے تو باقیوں کا تو مجھے علم نہیں البتہ کوٹ ادو سے ڈاکٹر انور سدید ردِ عمل بھیج بھیج کر ملک بھر کے ادبی پرچوں اور ادبی ایڈیشنوں کے مدیران کی جان عذاب میں ڈال دیں گے لہٰذا میں ان سب لوگوں کا پیشگی شکریہ قبول کرتے ہوئے اس بات کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

شاعری کا سلسلہ شروع ہوا تو فہمیدہ ریاض نے ''الذوالفقار'' کے نام سے ایک نظم سنائی۔ عطاء نے میرے کان میں کہا۔''اگر فہمیدہ یہ سوچ کر پاکستان سے بھاگی ہے کہ اس طرح کی نظموں پر اسے گرفتار کر لیا جائے گا تو وہ غلطی پر ہے کیونکہ یہ جرم قانون کی نہیں شاعری کی حدوں میں آتا ہے' اور بری اور کمزور شاعری پر ہم نے آج تک کسی کو گرفتار ہوتے نہیں دیکھا۔''

ایک دفعہ تو میرے جی میں آئی کہ فہمیدہ سے اس مسئلے پر بات ہو ہی جائے مگر پھر یہ دیکھ کر چپ ہو رہا کہ ہمارے میزبان پہلے ہی خاصے شرمندہ اور پریشان ہو رہے تھے اور اس نوع کی بحث میں بدمزگی پیدا ہونے کے امکانات انتہائی زیادہ تھے۔ میں سوچنے لگا اگر فہمیدہ نے یہی نظم پاکستان میں رہتے ہوئے پڑھی ہوتی تو حبیب جالب کی طرح ہم سب کے دلوں اور نظروں میں اس کے لیے کتنی

عزت اور محبت ہوتی۔

جالب کا شعر ہے۔

کہاں قاتل بدلتے ہیں، فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے، فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں

فہمیدہ کو ہندوستانی حکومت سے وظیفہ لینے کی کیا مجبوری تھی! اور فرض کیجئے کہ جالب نے یہی شعر کابل ریڈیو سے پڑھا ہوتا تو کیا یہ پھر بھی یہ اتنا ہی با معنی اور شدید ہوتا جتنا کہ اب ہے! نہیں، ہرگز نہیں۔

جامعہ سے نکلتے نکلتے سوا دو بج گئے۔ آل انڈیا ریڈیو تک رہنمائی کے لیے نوجوان افسانہ نگار شمس الحق ہمارے ساتھ چلے۔ ان کے افسانے پڑھنے کا تو مجھے اتفاق نہیں ہوا لیکن معاصر افسانے پر ان کی گفتگو بہت سلجھی ہوئی اور ان کے وسیع اور گہرے مطالعے کی آئینہ دار تھی۔ رفعت سروش کے کمرے میں پہنچے تو وہاں کوئی ویرانی سے ویرانی کا عالم تھا۔ ملحقہ کمرے میں ایک سال خوردہ سی خاتون اور ایک عیال دار سے صاحب اپنے آپ سمیت دونوں جہان سے بیزار بیٹھے تھے۔ بہت مشکل سے ہم انہیں سمجھا پائے کہ ہمیں رفعت سروش صاحب سے ملنا ہے جو ایک انٹرویو کے سلسلے میں ہمارے منتظر ہیں۔ یہ سن کر دونوں تھوڑی دیر کے لیے مراقبے یا شاید غشی میں چلے گئے۔ مرد نے پہلے سنبھالا لیا اور خاتون کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ مجھے اسٹوڈیو تک جانے کی اجازت نہیں ہے، اس کے پاس پروانہ راہداری ہے۔ آپ لوگ بیٹھیں، ہم پتا کرواتے ہیں۔ ہمیں رفعت سروش کی یہ ادا اچھی تو نہیں لگی پھر بھی شک کا فائدہ دیتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت پرانی ہونے کے باوجود بہت خوبصورت اور باوقار تھی لیکن کمروں کی کمی اور اسٹاف کی زیادتی کی وجہ سے اندر کا حال خاصا خراب تھا۔ ایک ایک کمرے میں تین تین چار چار بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ پروڈیوسر اوتھ کمشنروں کی طرح میزیں لگائے بیٹھے تھے۔ رفعت سروش کا نام تو ہم نے یہاں آ کر سنا تھا البتہ اردو سروس کے حوالے سے جس لکھنے والے کا نام بہت معروف ہے وہ محمود ہاشمی ہیں اور چونکہ دلی سے ہو کر آنے والے تقریباً سبھی اہل قلم کو ان کے علم و فضل اور ذوق سلیم کا مداح پایا تھا اس لیے سوچا کہ یہاں بیٹھ کر بے کار وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ان سے مل لیا جائے۔ ان کے کمرے میں پہنچے تو طبیعت خوش ہو گئی۔ ملنے کو تو اکثر لوگ بہت محبت، تپاک اور گرم جوشی سے ملتے ہیں لیکن پہلی نظر میں ہی انسیت پیدا کر لینے والی آنکھیں کم کم دکھائی دیتی ہیں۔ ہندوستان میں اب تک جتنے لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی (اور بعد میں بھی جو لوگ ملے) انمیں سے جدید ادب اور اس کے رویوں پر اتنی گہری نظر رکھنے والا اور کوئی نہ تھا۔ باتوں باتوں میں کے۔ کے نیر کا ذکر آیا تو محمود ہاشمی نے بتایا کہ

وہ بھی ان دنوں دلی اسٹیشن پر ہی ہیں۔ نیر صاحب سے کیونکہ چند برس پہلے لاہور میں دو تین بہت دلچسپ ملاقاتیں رہی تھیں اور نوجوان شاعر اور ڈرامہ نگار اصغر ندیم سید کی شادی میں بھی ہم اکٹھے شریک ہوئے تھے' سوچا کہ اس نشست میں انہیں بھی شامل کر لیا جائے۔ ان کا کمرہ نزدیک بھی تھا اور وہاں تخلیہ بھی میسر تھا چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ محفل وہیں جمائی جائے۔ نیر صاحب اپنے ریڈیو انٹرویوز کی وجہ سے پورے برصغیر میں جانے پہچانے اور مانے جاتے ہیں اور انہیں اس فن میں بجا طور پر صاحب اسلوب کہا جاسکتا ہے۔ ان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہم محمود ہاشمی سے بین الاقوامی تناظر میں جدید اردو ادب کی معروضی صورت حال پر بڑی ثقہ قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن ادھر نیر صاحب نے اپنی شگفتہ پنجابی میں ''جی آیاں نوں'' کہا۔ ادھر جیسے ہمیں بہانہ مل گیا۔ اب جو پنجابی شروع ہوئی تو ایسی چلی ہے کہ دس منٹ کے اندر اندر اچھا بھلا دفتر' ریڈیو پاکستان لاہور کا دیہاتی پروگرام بن گیا۔ محمود ہاشمی بیچارے پریشان کہ یہ اچھے بھلے شریف آدمی پلک جھپکتے میں انور سجاد کے افسانوں سے دلدار پرویز بھٹی کے فقروں تک کیسے پہنچ گئے۔

کافی دیر کے بعد جب ماحول کچھ پرسکون ہوا تو نیر صاحب نے محمود ہاشمی سے پوچھا کہ انہیں ریکارڈنگ کے لیے قابو کیا ہے یا نہیں۔ اس دوران ہمیں رفعت صاحب کی اسٹوڈیوز میں عدم موجودگی کی اطلاع مل چکی تھی اور ہم دل ہی دل میں انٹرویو کے آئیڈیے پر تین حرف بھیج چکے تھے اس لیے میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر ساری بات صاف صاف ان لوگوں کو بتا دی کہ کس طرح رفعت صاحب نے خود ہمیں اپنے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی' اصرار کر کے ہم سے وعدہ لیا' یاددہانیاں کرائیں اور اب جب کہ ہم کئی کام چھوڑ کر یہاں پہنچے ہیں تو ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا چنانچہ اس حسن سلوک کی وجہ سے اب ہم ذہنی طور پر انٹرویو کے لیے تیار نہیں ہیں مگر نیر صاحب اور محمود ہاشمی کی محبت اور اپنائیت نے ہمیں بے بس کر دیا اور پندرہ منٹ بعد ہم آل انڈیا ریڈیو کے اسٹوڈیو نمبر ۸ میں بیٹھے ومبلڈن کے ڈبلز فائنل کی طرح مائیکروفون پر جملے اچھال رہے تھے۔ ہم نے خود بھی دیکھا اور سنا تھا اور ہمیں بتایا بھی گیا تھا کہ ہندوستان میں ریڈیو اور ٹی وی پر پاکستانی ادیبوں اور فنکاروں کو گھیر گھار کر ان سے ایسے سوالات کئے جاتے ہیں جن کے جواب میں دو قومی نظریے کی نفی ہوتی ہو لیکن پتا نہیں کیوں ہمارے ساتھ کسی نے بھی ایسی چکر بازی کی کوشش نہیں کی!

دراصل یہ ''پتا نہیں کیوں'' میں نے محض تکلفاً لکھ دیا ہے کیونکہ دوسری صورت میں خودستائی کا ایک پہلو نکلتا ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ کو اپنے قومی وجود پر محکم ایمان ہو اور آپ اس کا اظہار کرنے کی اہلیت اور ہمت بھی رکھتے ہوں تو کسی کو آپ کی طرف انگلی اٹھانے کی جرات نہیں ہوسکتی۔ جس طرح آپ اپنے گھر میں ماں باپ' بہن بھائی یا بیوی بچوں سے کتنے ہی خفا کیوں نہ ہوں لیکن کسی دوسرے کی ہمدردی یا دخل اندازی کو یہ کہہ کر روک دیتے ہیں کہ ''معاف کیجئے گا' یہ میرا نجی مسئلہ ہے'' تو ایسی ہی حد بطور ''پاکستانی''

لگانے میں کیا حرج ہے؟ خواہ مخواہ کی معذرت کو حقیقت پسندی کا نام دے کر ہمارے کچھ دوست جس غیر ضروری احساس کمتری کا مظاہرہ کرتے ہیں' غور کیا جائے تو اس کی کوئی ٹھوس وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

پانچ بجے غالب اکیڈمی میں تقریب تھی لیکن دن بھر کی دوڑ بھاگ میں شکم کے سلسلے میں جو بے اعتنائی اور زیادتی روا رکھی گئی اس نے اب مظلوم قوموں کی طرح اپنے حقوق کی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ اس بار بھی قرعہ فال بستی نظام الدین کے نام ہی نکلا کیونکہ ایک تو ہمیں جانا بھی وہیں تھا اور دوسرے وہاں کھانا کسی نفسیاتی دباؤ کے بغیر کھایا جا سکتا تھا۔ اقبال ہوٹل دیکھنے میں محبوب ہوٹل سے بہتر اور بڑا تھا مگر کھانے کے سلسلے میں ''معیار کا تکلف سرے سے پالا ہی نہیں گیا تھا۔ ادھر اپنے بھائی عطاء الحق قاسمی کا بھی کم و بیش یہی مسئلہ ہے چنانچہ اس نے یہ کھانا بھی انتہائی انہماک سے رج کے کھایا۔ اس انہماک پر مجھے ایک مزیدار جملہ یاد آ گیا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ کسی محفل میں ہمارے بہت ہی پیارے بزرگ اور دوست عارف عبدالمتین صاحب کا یہ مصرعہ کسی نے سنایا کہ

پھولوں پہ انہماک سے شبنم گرایئے

اس پر احمد راہی نے کہا۔

''ذرا اس شعر کا منظر تصور میں لانے کی کوشش کرؤ یوں لگتا ہے جیسے شاعر نے اپنے سامنے پھولوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے' ایک طرف مٹکے میں شبنم بھر کے رکھی ہوئی ہے۔ شاعر مٹکے سے ڈراپر میں شبنم بھرتا ہے اور پھر انتہائی احتیاط سے فی پھول تین تین قطرے شبنم ڈالتا جا رہا ہے۔''

غالب اکیڈمی میں نہ صرف یہ کہ سب لوگ ہمارے منتظر تھے بلکہ ان کے آگے میزوں پر پڑی کھانے پینے کی اشیاء بھی معقول تعداد میں ہماری جان کو رو رہی تھیں۔ وہیں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ وہ گزشتہ برسوں میں کئی بار لاہور آئے ہیں لیکن ''ہمہ یاراں دوزخ'' میں صدیق سالک نے ان کی جانب سے کچھ ایسی بدظنی پیدا کر دی ہے کہ کبھی ملاقات کی تحریک نہ ہو سکی۔ پتا نہیں سودا کے لفظوں میں سالک نے انہیں کس آن میں دیکھا تھا' مجھے تو وہ خاصے بدحواس سے نظر آئے۔ یہ خصوصیت ان میں سن و سال کی افزائش نے پیدا کی ہے یا جوش قدح کا کرشمہ تھا۔ اس کا فیصلہ اس وقت کرنا ممکن نہ تھا۔ بسمل صابری اور اقبال کوثر سے معلوم ہوا کہ ان کے ویزے میں کوئی قانونی سقم تھا جس کی وجہ سے وہ دو دن بہت پریشان رہے ہیں یہاں تک کہ اقبال کوثر غریب کو توانبالہ کا ایک چکر بھی لگانا پڑا۔ بسمل کا معاملہ قتیل صاحب نے کوشش کر کے دلی ہی میں طے کرا دیا تھا لیکن بعد از خرابی بسیار۔ انیس دہلوی' رئیس مرزا' واجد سحری' ابرار کرتپوری اور ذہین نقوی کی معیت میں جب ہم لوگ نیچے ہال میں پہنچے تو کرسیاں تقریباً بھر چکی

تھیں۔ اسٹیج پر فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اعلان ہوا کہ اس تقریب کی صدارت مالک رام کریں گے۔ غالبیات کے سلسلے میں مالک رام کا نام اتنا وقیع اور معتبر ہے کہ ہم نے تقریباً سکول کے بچوں کے سے اشتیاق کے ساتھ نہیں انہیں دیکھا۔ شیروانی' پاجامے اور ٹوپی میں ملبوس' عینک کے شیشوں سے آنکھیں مارتی ہوئی روشن اور متبسم آنکھیں اور ایک بہت ہی شفیق چہرہ۔ تحقیق اور تنقید سے ان کی زندہ دل شخصیت کا ایک رنگ بھی نہیں چھین سکی تھی۔ اگر واقعی چہرہ کسی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے تو یہ چہرہ ایک مکمل اور بے داغ آئینہ تھا۔

آمنہ ابوالحسن صاحبہ نے شعراء کے سلسلے میں ایک مختصر تعارفی مضمون پڑھا' اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جس کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے سنبھالی۔ انہوں نے مہمانوں کے گلے میں ہار ڈالے اور اپنی ایک نظم کے بند سے مشاعرے کا آغاز کیا۔ بیدی صاحب کی شاعری اور نثر دونوں ہی روایت کے پسینے میں شرابور تھیں۔ انہوں نے ہر شاعر کا تعارف ایسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ادبی اصطلاحات کے ساتھ کرایا کہ لفظ و معنی کے تمام رشتے.......

''آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے''

مالک رام بھی ہماری طرح ''بندہ جائے فقرہ نہ جائے'' کے قائل معلوم ہوتے تھے۔ بعض جملے تو ایسے برجستہ اور شریر تھے کہ ہنسی روکنا محال ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف یہ احساس بھی تھا کہ سب لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ عطاء نے اس کا یہ حل نکالا کہ ایسے موقعوں پر ہار منہ کے سامنے رکھ کر سونگھنے کی ایکٹنگ کی جائے۔ مالک رام صاحب نے ہماری توجہ رفعت سلطان کی طرف منعطف کرائی جو اپنی کتابوں' بیاض اور جیبوں سے نکالے ہوئے کاغذوں کے ڈھیر میں سے غالباً اس غزل کا انتخاب کر رہے تھے جو انہیں یہاں پڑھنی تھی۔ وہ اس کام میں اتنی دیر تک اور ایسے صمیم قلب سے محو رہے کہ پورا ہال ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رہی سہی کسر کنور مہندر سنگھ بیدی نے ان کے اور سلطان رشک کے ناموں میں گڑبڑ پیدا کر کے پوری کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طور پر وہ مائیک کے سامنے پہنچے اور مطلع پڑھا۔ اتفاق سے مطلع انتہائی کمزور تھا۔ مالک رام نے ایک لمبا سانس لے کر ہماری طرف دیکھا اور بڑے معصوم لیکن شرارتی لہجے میں کہا۔

''اچھا..... تو یہ غزل ڈھونڈ رہے تھے' رفعت صاحب''

اس بار ہاروں کی آڑ بھی ہمارا ساتھ نہ دے سکی۔ بیدی صاحب کے خود ساختہ اور مالک رام کے بے ساختہ جملوں کی وجہ سے یہ مختصر یہ محفل مشاعرہ ہمارے لیے ایک یادگار چیز بن گئی۔ آخر میں پاکستانی شعراء کی طرف سے ضمیر جعفری صاحب نے غالب اکیڈمی

اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ حاضرین میں فکر تونسوی، شمس الرحمٰن فاروقی، نسیم مخموری اور اے پی پی کے عزیز الرحمٰن تو جانے پہچانے چہرے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ بہت سے ایسے احباب سے بھی ملاقات ہوئی جن کے نام صرف سن رکھے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی ملے جو اس شام سے پہلے تک سربسر اجنبی تھے۔ تصویریں اور آٹو گراف اس طرح کی تقریبات کا لازمی حصہ ہیں سو اس حصے کے دوران دو واقعات ہوئے یعنی فکر تونسوی غائب ہو گئے اور رفعت سروش حاضر۔ ہمیں ان واقعات کے نتائج سے شدید اختلافات تھا جس کا اظہار ہم نے رفعت صاحب کو "ٹھنڈا دکھا کر" کیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی سے طے پایا کہ وہ دو گھنٹے بعد ہمیں ہمارے ہوٹل میں ملیں گے۔ واجد سحری، جو برادرم مظفر وارثی کے انتہائی عزیز دوست اور مداح ہیں، مصر تھے کہ کہیں بیٹھ کر کچھ دیر گپ شپ کی جائے چنانچہ ان کے ساتھ جا کر ہم نے وہ ہار غالب کے مزار پر چڑھائے جو ہمیں پہنائے گئے تھے اور یادگار کے طور پر ایک تصویر بھی اتروائی اور پھر ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ عطاء کو اپنے والد صاحب کے لیے کچھ کتابیں خریدنا تھیں۔ ہم قریب ہی واقع ایک اسلامی کتابوں کی دکان میں داخل ہوئے تو ایک ملازم نے ٹوکا کہ جوتے دکان کے باہر اتاریں۔ معلوم ہوا کہ یہ احتیاط ان مذہبی کتابوں کی وجہ سے کی جاتی ہے جو دکان کے فرش پر ڈھیریوں کی صورت میں رکھی ہوئی ہیں۔ دکان خاصی بڑی تھی اور اس میں اتنی جگہ موجود تھی کہ ان سب کتابوں کو الماریوں اور شیلفوں میں باآسانی رکھا جا سکتا تھا لیکن مذہب کے سلسلے میں ہمارا سب سے بڑا المیہ بھی تو یہی ہے کہ ہم نے کتابوں، رسموں اور مزاروں کو اس کا نعم البدل سمجھ لیا ہے اور اصل کی جگہ اس کی نقل کو مقصود بالذات بنا لیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خواجہ صاحب کی درگاہ کی مجاور ہی نام بدل کر اس دکان میں بیٹھے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

ہوٹل پہنچے تو آمنہ ابوالحسن کا پیغام ملا کہ مجتبیٰ حسین (ابراہیم جلیس مرحوم کے برادر خورد) حیدر آباد سے آ گئے ہیں اور ان کے گھر میں بیٹھے ہمارے فون کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں اطلاع دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اور شمس الرحمٰن فاروقی دونوں پہنچ گئے۔ کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کے بعد ہندوستان میں مجتبیٰ حسین ہی ایسے ہیں جنہیں نمائندہ مزاح نگار کہا جا سکتا ہے۔ احمد حسن حامد اور چاچا منصور قیصر جب امیر خسرو کے عرس کے سلسلے میں دلی گئے تھے تو واپسی پر ان کے حسن اخلاق اور مشکل ترین کاموں کو انتہائی تیزی سے تکمیل دینے کی صلاحیت کے بھی بڑے معترف تھے لیکن پہلی نظر میں نہ تو وہ مزاح نگار لگتے ہیں اور نہ ہی ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ

خط بھی ٹھیک سے پوسٹ کر سکیں گے۔ میں نے عطاء کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر وہ مجتبیٰ کی چھچھی بلکہ تھوتھے میں اس بری طرح سے پھنسا ہوا تھا کہ

زبان ہر سر مو حال دل پرسید نی جانے

شمس الرحمٰن فاروقی ''صاحبان عروض'' میں سب سے کم عمر ہیں اور شاید اسی لیے اپنے بقیہ تین ہم عصروں (شان الحق حقی' جابر علی سید' آصف ثاقب) کی نسبت زیادہ مستعد بھی ہیں۔ وہ اگرچہ گزشتہ کئی برسوں سے سرکاری افسری' شاعری' تنقید' شب خون کی ادارت اور غالب کے شعروں سے چھیڑ خانی وغیرہ کو ایک ساتھ چلا رہے ہیں لیکن ان کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ وہ ایک غیر مجلسی قسم کے لیے دیے رہنے والے عالم خشک قسم کے آدمی ہیں۔ خود لاہور میں گزشتہ برس کی ملاقات کے بعد میرا اپنا تاثر بھی یہی تھا مگر اس رات غیر رسمی اور کھلی ڈلی فضا میں ان کا جو روپ سامنے آیا اس پر ان کے برسوں کے رفیق مجتبیٰ حسین بھی حیران تھے اور بعد میں بار بار کہتے رہے کہ میں نے فاروقی کو آج تک کبھی اتنا بے تکلف اور جملے بازی کا رسیا نہیں دیکھا جتنا وہ اس وقت نظر آ رہا تھا۔ بہر حال یہ پر لطف محفل رات بارہ بجے تک چلتی رہی اور اس دوران میں ہوٹل کے طلسمی ٹیلیفون سے مجتبیٰ حسین نے وہیں بیٹھے بیٹھے جس طرح کل کے لیے فرنٹیر میل پر ہماری سیٹیں ریزرو کرائیں' کمشنر آفس میں واپسی کے اندراج کا بندوبست کیا اور پورے دن کے لیے ایک ڈرائیور والی گاڑی کے انتظام کی نوید جانفزا سنائی وہ اپنی جگہ پر فسانہ عجائب کا ایک نیا باب ہے۔ سو ثابت ہوا کہ ضروری نہیں انسان کا اصل روپ پہلی نظر میں ہی ظاہر ہو جائے۔

۱۹ مارچ دلی میں ہمارا آخری دن تھا۔ مجتبیٰ کے عزیز حسینی صاحب ساڑھے دس بجے گاڑی لے کر پہنچ گئے لیکن ابھی تک ہم طے نہیں کر پائے تھے کہ اتنے بہت سے کاموں کو ممکنہ وقت کس طرح تقسیم کیا جائے کہ جواب سارے کاموں کے پورا ہونے کی صورت میں نکلے۔ ''فلمی ستارے'' کے ایڈیٹر انیس دہلوی نے ہمیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا جن کا دفتر ترکمان گیٹ میں تھا۔ تین بجے ہمیں جنوبی دلی میں مجتبیٰ کے دفتر پہنچنا تھا جہاں سے ہمیں خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جانا تھا۔ (مزار کا علاقہ مہرولی' قطب مینار سے اس قدر نزدیک تھا کہ اگر وہ سگریٹ والا تھوڑی سی انسانیت کا ثبوت دیتا تو ہم وقت کی تنگی کے باوجود گزشتہ روز ہی وہاں کا چکر لگا سکتے تھے) چار بجے ہمیں فاروقی صاحب کے دفتر پہنچ کر راجندر ملہوترہ (انبالہ) اور کلدیپ سنگھ (امرتسر) کو بالترتیب اپنی روانگی اور آمد کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون دینا تھی۔ چھ بجے ایوان غالب میں اپنے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں شریک ہونا تھا اور ۹ بجے فرنٹیر میل سے امرتسر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اس آمد و رفت کے درمیانی وقفوں میں ہمیں جامع مسجد کے قریب سے بیگ خریدنے تھے'

کناٹ پیلس سے کتابیں اور بھائی انوار فیروز کے بتائے ہوئے لکڑی کے گلاس خریدنے تھے' کمشنر آفس میں ویزا فارموں پر مہریں لگوانی تھیں اور اپنے اہل خانہ کو منہ دکھانے کے لیے کچھ تحفے تحائف خریدنے تھے۔ ان سارے کاموں میں اگر آپ اس فاصلے کو بھی جمع کرلیں (جسے بہرحال درمیان میں پڑنا تھا) تو معاملہ ملکی سیاست سے کسی طور کم پیچیدہ نہیں تھا۔

عارف نظامی اور اشفاق صاحب کی فرمائش کردہ کتابیں تو ہمیں جلد ہی مل گئیں مگر انوار فیروز کے گلاسوں نے پھڈا ڈال دیا۔ ہم انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے کراکری کی ایک بہت بڑی دکان میں گھس گئے۔ مالک دکان نے ہماری زبان یا شاید شلوار قمیضوں سے پہچان لیا کہ ہم پاکستانی ہیں۔ اب وہ دوا لے ہو گیا کچھ دیر بیٹھیں۔ وجہ یہ بتائی کہ اس کا آبائی شہر بھی لاہور ہے۔

شوراج کھیٹھ کاروباری تھا اور غالباً اپنی عقل کو ہندسوں تک محدود رکھنے کا عادی تھا کیونکہ اسے تقسیم پاک و ہند پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کاروبار کی صورت بہت بہتر ہوتی۔ ایسے آدمی سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا لیکن جب اس نے ذرا زیادہ لبرٹی لینے کی کوشش کی تو مجبوراً ہمیں ''ایک لوہار کی'' سے کام لینا پڑا۔ گلاسوں کے بارے میں پتا چلا کہ یہ مدھیہ پردیش کے ایمپوریم سے ملیں گے اور ان کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ جس درخت کی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں اس میں کچھ ''شوگر کش'' قدرتی مادے شامل ہیں جو پانی میں حل ہو جاتے ہیں اور باعث شفا بنتے ہیں۔ تین گلاسوں کے اس سیٹ کی قیمت تقریباً ستر روپے تھی۔

''یہ تو سر کے پیچھے سے ہاتھ لا کر ناک پکڑنے والی بات ہوئی۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی کاٹھ کر برادہ پانی میں ابال کر پی جائے۔ آخر جوشاندہ بھی تو لوگ پیتے ہیں۔''

میری اس مناظرے والی دلیل کا عطاء کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے اس نے حسب معمول اسے ان سنا کر دیا۔

انیس دہلوی کا گھر ترکمان گیٹ سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ اور دو گلیوں کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں ایک احتجاجی جلوس ملا جس میں احتجاجی کم اور پولیس والے زیادہ تھے۔ انیس دہلوی نے بتایا کہ دلی کو خوبصورت اور وسیع تر کرنے کے لیے آنجہانی سنجے گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں یہاں بلڈوزر چلوا دیے تھے اور مکینوں سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں نئے تعمیر ہونے والے رہائشی فلیٹ متبادل گھروں کے طور پر دیے جائیں گے۔ اب ساڑھے پانچ سو فلیٹ تو تیار ہو گئے ہیں لیکن چونکہ بے دخل ہونے والے خاندانوں کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہے اس لیے جھگڑا پڑا ہوا ہے اور یہ جلوس اسی جھگڑے کی ایک کڑی ہے یعنی جمہوریت کی تعریف یہ ہوئی کہ مارتا ضرور ہے مگر رونے بھی دیتا ہے۔

ترکمان دروازہ اندر سے بالکل لاہور کا بھاٹی دروازہ نکلا۔ گلیاں' مکان' ٹریفک' تھڑوں پر بیٹھے اور سڑک پر کھڑے لوگ' حکیموں کی دکانیں...... ہر چیز ملتی جلتی تھی۔ سائن بورڈ بھی اردو میں تھے۔ جگہ جگہ افغانستان پر روسی جارحیت کے خلاف کسی جلسے کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ انیس دہلوی نے بڑی مہارت سے ایک پوسٹر ہمیں اکھیڑ کر دے دیا۔ ان کا گھر تغلق دور کی ایک ایسی مسجد کے پہلو میں ہے جو عام رہائشی مکانات سے خاصی بلند سطح پر بنائی گئی ہے۔ مکان کے نچلے حصے میں انیس دہلوی کے رسالے ''فلمی ستارے'' کا دفتر ہے جو بیک وقت جاسوسی ناول شائع کرنے والا پبلشنگ ہاؤس بھی ہے اور مایوس اور لاعلاج مریضوں کی آخری پناہ گاہ بھی۔ انیس دہلوی نے بتایا کہ آخر الذکر کاروبار سب سے زیادہ چلتا ہے اور روزانہ درجنوں لوگ ان سے بذریعہ ڈاک ایسی ادویات منگواتے ہیں جنہیں کھا کر عمر رفتہ کی بازگشت سنائی دینے لگے۔

انیس دہلوی بڑے مخلص اور دل سے محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ جامع مسجد کے علاقے میں خریداری کے دوران جس طرح انہوں نے آگے بڑھ کر بیگ اٹھائے اور ہمارے بے حد اصرار کے باوجود انہیں اٹھائے رکھا وہ ایک ایسا اظہار محبت تھا جس کا بدل کوئی ارب پتی اپنے خزانوں کے منہ کھول کر بھی نہیں دے سکتا۔ کھانا خوش ذائقہ ہو اور کھلانے والے کا خلوص بھی شریک طعام ہو تو دو آتشے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس وقت چونکہ ہماری اشتہا بھی شریک محفل تھی اس لیے کچھ سہ آتشہ قسم کی چیز بن گئی۔ ان سے ہمیں دلیپ کمار کی دوسری شادی کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات بھی ملیں لیکن اب وہ پرانی باتیں ہو چکی ہیں اس لیے تکرار سے کیا حاصل!

اپنے دفتر میں محبتی ہمارے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ مہرولی پہنچے۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر' جس کے دونوں طرف گداگر ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے' ہم ایک ڈیوڑھی تک پہنچے جہاں ایک بڑے معزز صورت بزرگ سفید براق کپڑوں میں ملبوس ایک اور صاحب سے مصروف گفتگو تھے انہوں نے بڑے پروقار اور شیریں لہجے میں ہمیں السلام علیکم کہا اور ہاتھ سے ایک طرف کو اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''ادھر تشریف لے آیئے۔''

انکی صورت اور طرز کلام ایک لمحے کے لیے مجھے دو صدیاں پیچھے لے گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے رتن ناتھ سرشار کا کوئی خاندانی نواب ''فسانہ آزاد'' سے نکل کر اس ڈیوڑھی میں آن بیٹھا ہو۔ فاتحہ خوانی کے بعد ہم لوگ واپس لوٹے تو وہ صاحب ابھی تک وہیں تھے۔ ہمیں دیکھ کر بڑے پرتپاک انداز میں اپنی جگہ سے اٹھے' دوبارہ اسی رس بھرے انداز میں سلام کیا اور قریب آ کر کہنے لگے۔

''بس حضور اب ہم پیرزادے رہ گئے ہیں' خواجہ صاحب کے نام لیوا۔ ان کی اولاد کے لیے حسب توفیق کچھ عطا کرتے جایئے'

اب ہماری سفید پوشی آپ ہی لوگوں کے دم قدم سے ہے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں میں کوئی پگھلا ہوا سیسہ ڈال رہا ہے۔ یا خدا اگر یہ واقعی اس عظیم بزرگ کی نسل سے ہیں تو ان کے خون سے وہ درویشی کہاں گئی جس کے ڈر سے منعم کو بخش کا یارا نہیں ہوتا تھا۔ ان ہٹے کٹے سلامت ہاتھ پیروں والے لوگوں اور ان معذوروں' اپاہجوں اور کاہلوں میں سوائے مانگنے کے طریقے کے اور کیا فرق ہے؟ یہ اپنا نسب نامہ بیچنے کے بجائے کوئی آبرومندانہ کام کیوں نہیں کرتے؟

مجھے سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔ عطاء نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر میں نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ دینا ہی ہے تو ان سے زیادہ مستحق لوگ باہر موجود ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی کا دفتر ''سماچار بھون'' کی گیارہویں منزل پر تھا۔ داخلے کے پاس کے لیے ہم ریسپشن کاؤنٹر پر پہنچے تو عین سیڑھیوں کے اوپر آرائشی چھت میں دو بڑے بڑے رخنے نظر آئے جن میں کبوتر بلا تکلف آ جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''یہ غالباً قاصد کبوتر ہیں جو محکمہ ڈاک والوں نے ہنگامی صورت حال کے پیش نظر پال رکھے ہیں۔''

''اور شاید انہی میں سے کسی کے دادا پردادا کو مخاطب کر کے طفیل ہوشیاری نے اپنا مشہور فلمی گیت لکھا تھا۔'' عطاء نے گرہ لگائی۔

واسطہ ای رب دا توں جاویں وے کبوترا
چٹھی میرے ڈھول نوں پچاویں وے کبوترا

عام سرکاری دفاتر کی طرح یہاں بھی خواتین خاصی تعداد میں ملازم تھیں۔ کم از کم ہماری لفٹ کی حد تک تو انہیں واضح اکثریت حاصل تھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زیادہ تر تعداد نچلے درجے کے عہدوں تک محدود ہے کیونکہ ہم جس طویل راہداری سے گزر کر فاروقی صاحب کے کمرے میں پہنچے وہاں تقریباً دو درجن کمروں میں سے صرف ایک پر زنانہ نام کی تختی تھی۔ فاروقی نے بتایا کہ کلدیپ سنگھ کو انہوں نے فون کر دیا تھا' وہ گھر پر نہیں تھا۔ رات تک اس کی آمد متوقع ہے اس لیے آپ کا پیغام اسے مل جائے گا' احتیاطاً گھر سے دوبارہ فون کر دوں گا۔ انبالہ فون ملانے کی کوشش کی تو ''لائن خراب ہے'' کی اطلاع ملی۔

''چلو یہ قصہ بھی تمام ہوا۔'' عطاء نے کہا۔ ''اب ہمیں جلدی سے بازار کا چکر لگا لینا چاہیے کیونکہ فنکشن کا وقت ہونے والا ہے۔''

بازار کے ذکر پر فاروقی کے اس ماتحت نے جو ہمیں پانی پلا رہا تھا' چونک کر پہلے ہماری اور پھر فاروقی کی طرف دیکھا اور آدھا جگ مجھ پر گرا دیا۔

''ہم قرول باغ جا رہے ہیں بھائی' شالیں خریدنے کے لیے۔'' مجتبیٰ نے اسے بتایا۔ اس پر وہ ایسے انداز میں مسکرایا جو قدرت صرف غبی لوگوں کو عطا کرتی ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ''مجھے سب پتا ہے بچو'' کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

شالیں خریدنے کے دوران فاروقی نے جس زنانہ سوجھ بوجھ اور انداز مول تول کا مظاہرہ کیا اسے دیکھ کر ہمیں آمنہ ابوالحسن اور نسیم مخمور کی کمی بالکل محسوس نہیں ہوئی جو ہمیں اس شاپنگ کے سلسلے میں رضاکارانہ خدمات پیش کر چکی تھیں۔ ایک دو شالوں کو فاروقی نے ایسے انداز میں رد کیا جیسے وہ وزن سے گرے ہوئے شعر ہوں تو دکاندار کو بھی جوش سا آ گیا۔ اب جو جناب شالوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی ہے تو ہم جو پہلے ہی کپڑے کی کوالٹی' رنگ اور ڈیزائن کے سلسلے میں صفر ہیں' بالکل ہی چکرا گئے۔ فاروقی صاحب ہر گرم کپڑے پر ہاتھ پھیر کر اس کے ٹیکسچر کو پرکھتے اور پھر بتاتے کہ اس میں کتنے سبب اور کتنے وتد ہیں اور کہاں کہاں زحافات کا استعمال غلط کیا گیا ہے۔ اب مصیبت یہ تھی کہ جو چادر وزن پر پوری اترتی تھی وہ صنائع بدائع سے مار کھاتی تھی اور جس کا لف ونشر اچھا تھا اس میں سکتہ پڑتا تھا۔

بھاگتے دوڑتے ایوان غالب پہنچے تو سب سے پہلے کنور مہندر سنگھ بیدی پر نظر پڑی جو شکل سے پریشان نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی سامان ایک اسٹیشن ویگن میں رکھوایا جو انہوں نے ہمیں ریلوے اسٹیشن پہنچانے کے لیے منگوا رکھی تھی اور ہمیں ساتھ لیے بغیر ہال میں پہنچ کر جلسہ شروع کر دیا۔ دروازے پر بلراج میزا سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ایک دو بہت ضروری باتیں کرنا تھیں مگر بیدی صاحب کے اعلان کی وجہ سے مجبوراً ہال کی طرف بھاگنا پڑا۔ پہلی لائن میں غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دینے والے بزرگ نقاد کلیم الدین احمد بیٹھے تھے جنہیں حکومت ہند سے تازہ تازہ پدم شری کا خطاب ملا تھا۔ اسٹیج پر بھارت کے مرحوم صدر فخر الدین علی احمد کی بیوہ محترمہ عابدہ احمد اور ہندوستانی کابینہ کے دو مسلمان وزراء بیٹھے تھے اور حاضرین میں بھی اہل ذوق کے ساتھ ساتھ کچھ افسر قسم کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی آغاز میں ہمیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے جو غیر معمولی طور پر وزنی اور انتہائی خوبصورت تھے۔

ابتدائی استقبالیہ تقریروں کے بعد سب پاکستانی شعراء نے اپنا کلام سنایا اور خوب خوب داد سمیٹی۔ چائے پر مجتبیٰ حسین نے قاضی سلیم سے ملوایا جو اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ حیدرآباد سے راجیہ سبھا کے رکن بھی ہیں۔ بہت محبت سے ملے اور فرمائش کر کے ہمارے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ بقیہ دو وزیر بھی جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے' بڑے غیر وزیرانہ انداز میں ملے۔ اس پر مجھے اپنے ایک سابق افسر یاد آئے جنہوں نے ایک غیر ملکی مہمان سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ مسٹر فلاں ہیں اور ان کا گریڈ ۲۱ ہونے

والا ہے۔

گاڑی کا وقت ہو رہا تھا اس لیے ہم جلدی جلدی ہاتھ ملاتے اور گلے ملتے باہر نکلے تو ہمارے سامان والی ویگن غائب تھی۔ بیدی صاحب سے اس کے بارے میں پوچھا تو بڑے گھبرائے ہوئے بولے۔ ''اچھا تو آپ اس میں نہیں گئے۔''

عرض کیا کہ ''اگر ہم جا چکے ہوتے تو آپ سے مخاطب کیسے ہوتے؟''

کہنے لگے۔ ''تو پھر اس میں کون کون گیا ہے؟''

اب تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین سرکی' ہم نے کہا۔ ''تو کیا ویگن چلی گئی ہے؟'' بولے۔ ''ہاں ابھی ابھی نکلی ہے۔ آپ فوراً اسے پکڑیں۔'' پھر خود ہی کہنے لگے کہ ''اب تو کوئی گاڑی بھی نہیں ہے' آپ جائیں گے کیسے؟''

جب مسیحا مریض سے علاج دریافت کرنے لگے تو مریض کو کیا کرنا چاہیے؟ میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ قدرے فاصلے پر نیم تاریکی میں ایک موٹر کھڑی تھی۔ ''یہ کار کس کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی۔'' پتا نہیں کس نے بتایا۔ میں بھاگا بھاگا واپس گیا اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ساری صورت حال بتائی۔ کہنے لگے۔ ''کوئی بات نہیں میں ابھی آپ کو کہیں سے ٹیکسی لے دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وقت بہت کم ہے اور ریلوے اسٹیشن پر اگر ہم دیر سے پہنچے تو خدشہ ہے کہ جو ساتھی ہمارا انتظار کیے بغیر ویگن لے کر چلے گئے ہیں وہ ہمارے سامان سمیت اسے واپس بھجوا دیں گے اور یوں ہم کہیں درمیان میں ٹاپتے نہ رہ جائیں۔''

خیال تھا کہ اس رقت انگیز تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب ہمیں سیدھے پرانی دلی کے ریلوے اسٹیشن پر لے جائیں گے لیکن وہ بھی شاید بہت جلدی میں تھے اس لیے سب سے پہلے جو ٹیکسی نظر آئی اس کے ڈرائیور کو انہوں نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ ہیں اسٹیشن تک پہنچنے کی کتنی جلدی ہے۔ ٹیکسی نے اسٹیشن تک پہنچنے میں دس منٹ لیے۔ اتفاق سے ویگن ٹیکسی اسٹینڈ کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ مجھے اصل غصہ سلطان رشک پر تھا کہ چلو ضمیر صاحب بزرگ ہیں' بسمل عورت ہے' رفعت سلطان ہے مگر اسے تو یہ خیال کرنا چاہیے تھا کہ دو ساتھی کم ہیں۔ اس نے بیان دیا کہ ان لوگوں کو بیدی صاحب نے اتنی گھبراہٹ میں مبتلا کر رکھا تھا کہ اس سے پیشتر کہ وہ سنبھل سکتے ویگن چل چکی تھی۔ وہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ شاید ہمارے لیے کسی اور سواری کا بندوبست کیا گیا ہے۔ سامان کے لیے یہ وضاحت پیش کی گئی کہ اس کی موجودگی کا علم انہیں یہاں آ کر ہوا ہے۔ ابھی ہم یہ شکوے گلے کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب مسرت آمیز چیخیں مارتے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھ معانقے کے لیے کھلے ہوئے تھے اور رخ بسمل کی طرف تھا۔ خیریت ہوئی کہ عین آخری

لمحے میں ان کی کامن سینس بیدار ہوگئی اور وہ ذرا سے ترچھے ہو کر ضمیر جعفری صاحب کی آغوش میں جا گرے۔ وہ شخص تیز تیز بولنے والے ان آدمیوں میں سے تھا جو کٹے ہوئے ٹیلیفون پر گھنٹوں گفتگو کر سکتے ہیں۔ اس کی باتوں سے ہم نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کیوں کر رہے تھے؟ یہ راز آخر تک نہیں کھلا۔ ہم نے سامان قلیوں کو اٹھوایا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس پلیٹ فارم پر پہنچے جہاں سے فرنٹیر میل چلنے والی تھی۔ پسینے اور تھکن سے میرا برا حال تھا اور چند دن قبل لگی ہوئی چوٹیں' جنہیں میں تقریباً بھول چکا تھا' نئے ساز و سامان کے ساتھ اپنا جلوہ دکھانے لگی تھیں۔ جس بورڈ پر مسافروں کے ناموں اور ڈبوں کی فہرستیں لگی تھیں اس کے گرد بھیڑ زیادہ تھی اس لیے میں سیدھا انکوائری کاؤنٹر پر گیا اور بتایا کہ ہم لوگ پاکستان سے آئے ہیں ہماری رہنمائی کریں۔ انکوائری کلرک نے میرے دور تک پھیلے ہوئے ماتھے پر چمکتا ہوا پسینہ دیکھا' میرے ہاتھ سے ٹکٹیں پکڑ کر ان پر ایک نظر ڈالی اور بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ سب سے پہلا ڈبہ آپ کا ہے' لیکن ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔''

میں ذہنی طور پر اتنے بڑے اینٹی کلائمکس کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے سامان ڈبے میں رکھنے کے بعد بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ عطاء ایسے موقعوں پر ہمیشہ ڈیٹ پر آئی ہوئی لڑکی کی طرح سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا کرتا ہے چنانچہ سامان رکھنے کے فوراً بعد وہ سگریٹ سلگا کر پلیٹ فارم کی سیر کرنے لگا۔ یہ محسوس کر کے کہ سامنے والی برتھ پر بیٹھا ہوا آدمی میری بدحواسی سے محظوظ ہو رہا ہے' میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایک انتہائی بے تکا سا سوال کر دیا۔

''یہ فرنٹیر میل ہی ہے نا؟''

''ہاں جی!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ پاکستانی ہیں شاید!''

میں نے گزشتہ دو تین دن سے بغیر تعارف کے پہچانے جانے پر متعجب ہونا چھوڑ دیا تھا اس لیے اگلا سوال کیا۔ ''یہ گاڑی لیٹ کیوں ہے؟''

''پیچھے سے ہی لیٹ آ رہی ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

اتنے میں وہی تیز تیز بولنے والا آدمی کسی طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور مجھے بازو سے کھینچتا ہوا بولا۔ ''یہ آپ کہاں بیٹھے ہیں؟ فرنٹیر میل تو وہ سامنے کھڑی ہے۔ اٹھئے' سامان اٹھائیے اپنا۔ جلدی کیجئے ورنہ گاڑی نکل جائے گی۔''

اس کی آواز میں ایسی تشویش تھی کہ میں بھی گھبرا گیا۔

''گھبرائیے نہیں جناب' یہ بھی فرنٹیر میل ہی ہے۔'' میرے ہم ڈبہ نے میری ڈھارس بندھائی۔ ''یہ ڈبے دلی سے لگتے ہیں اس

لیے اس پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔''

''مروانہ دینا بھائی۔''میں نے بے اختیار کہا۔

''میں خود امرتسر جا رہا ہوں۔''اس نے مسکرا کر کہا۔''اور بیس سال سے ریلوے کی نوکری میں ہوں۔''

اس کی اس بات پر مسٹر تیز گفتار بھی مخمصے میں پڑ گیا اور بالآخر کچھ دیر کے بعد قائل ہو کر چلا گیا۔ میں نے عطاء کی تلاش میں پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی تو واجد سحری' ذہین نقوی اور ابرار کرتپوری جنگ عظیم کے دنوں کے کسی جرمن ریلوے اسٹیشن پر اتحادی مفرور قیدیوں کی طرح مشکوک انداز میں چاروں طرف دیکھتے نظر آئے۔ میں نے آواز دے کر انہیں بلایا۔ تھوڑی دیر میں عطاء بھی آ گیا اور گاڑی چلنے کے وقت تک خوب دھما چوکڑی مچی۔ اس دوران ٹکٹ کنڈیکٹر تین چار مسافروں کے جلو میں کئی بار ہمارے دروازے کے سامنے سے گزرا اور ہر بار ہمیں سنانے کے انداز میں اونچی آواز میں بولا کہ وہ سرکاری قانون کا ملازم ہے اس لیے سیٹ کے سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اتنے طویل مذاکرات صرف سیٹ کی قیمت بڑھانے کے لیے کر رہا ہے چنانچہ وہی ہوا۔ گاڑی چلنے پر ان امیدواروں میں سے ایک بڑے فاتحانہ انداز سے ڈبے میں داخل ہوا۔ سیاہ جرسی اور پتلون میں ملبوس یہ ایک مائل بہ فربہی خوشنما نوجوان تھا۔ گفتگو شروع ہوئی تو پتا چلا کہ ریلوے ملازم کا نام اوم پرکاش اور سیٹ خریدنے والے کا نام کیول سیٹھ ہے اور وہ دونوں امرتسر کے رہنے والے ہیں۔ جب انہیں یہ پتا چلا کہ میں ''وارث'' کا مصنف ہوں تو ان کے انداز میں یک دم تعلق کا رنگ پیدا ہو گیا۔ کیول سیٹھ ایک سیدھا سادا مخلص قسم کا نوجوان تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی فیملی کپڑے کے بزنس میں اور بھگوان کی بڑی کرپا ہے۔

ہمارا پروگرام امرتسر میں چند گھنٹے کلدیپ سنگھ کے پاس ٹھہرنے کا تھا تا کہ ایک نظر شہر بھی دیکھ لیں اور عطاء کے دادا مرحوم کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھ لیں۔ امرتسر اسٹیشن سے کلدیپ کے گھر فون کیا تو پتا چلا کہ وہ کسی ٹھیکے کے سلسلے میں جالندھر گیا ہوا ہے' گزشتہ رات اس کی واپسی متوقع تھی لیکن ابھی تک نہیں آیا۔ ہم سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ کیول غالباً اس دوران میں کہیں قریب ہی کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ ابھی ہم ایک ٹیکسی والے سے امرتسر کی سیر اور واہگہ بارڈر تک کا کرایہ طے کر ہی رہے تھے کہ وہ آ گیا اور اطلاع دی۔''گاڑی کا انتظام ہو گیا ہے' آپ لوگ میرے گھر چلیں وہاں منہ ہاتھ دھوئیں ناشتہ کریں۔ پھر میں آپ کو بارڈر تک پہنچا آؤں گا۔''اس سے پیشتر کہ ہم کوئی بات کہتے اس نے ٹیکسی والے کو رخصت کیا اور قلیوں سے کہا کہ وہ سامان اٹھا کر باہر لے چلیں کیونکہ اس کے ہم زلف کا ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچنے ہی والا ہو گا۔

کیول کے گھر اس کے بھائی رویندر اور ماتا پتا کے علاوہ اس کی چھوٹی چھوٹی دو بیٹیوں سے ملاقات ہوئی جن میں سے چھوٹی جس کا نام شیتل تھا' بے حد شریر تھی۔ اس کی معصوم شرارتوں سے ہمیں اپنے بچے زیادہ یاد آنے لگے۔ وہاں سے ایک بھرپور اور مزیدار ناشتہ کرنے کے بعد ہم عطاء کے دادا جان کی قبر ڈھونڈنے نکلے۔ اب موٹر کیول کا ہم زلف چلا رہا تھا اور کچھ اس انداز سے چلا رہا تھا جیسے ہم عطاء کے دادا جان کی نہیں خود اپنی قبریں ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ قبر جس مسجد میں تھی اسے اب گوردوارے میں تبدیل کر دیا گیا تھا لیکن قبر محفوظ ہے۔ ہمیں فاتحہ پڑھتے دیکھ کر ایک سکھ کسی کمرے سے نکلا اور قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ ان مولوی صاحب کا استھان ہے جنہوں نے یہ مسجد بنائی تھی۔''

واہگے کے رستے میں بھی بمل کی ڈرائیونگ نے ''دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا'' والا مصرعہ بار بار یاد کرایا۔ کیول کے ایک دوست کی وجہ سے انڈین کسٹم والوں نے ہمیں بہت جلد فارغ کر دیا اور ظاہر ہے دوسری طرف تو اپنا پاکستان تھا۔ امیگریشن کے انسپکٹر اللہ دتہ اور کسٹم کے افسروں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ٹھنڈی ٹھار بوتلیں پلوائیں اور اس طرح ہمیں رخصت کیا جیسے ہم ہاکی کا فائنل جیت کر آرہے ہیں۔

ٹیکسی شالامار باغ کے قریب سے گزر رہی تھی۔ میلے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور میں پچھلی سیٹ پر یادوں کے ہجوم میں گھرا ہوا سوچ رہا تھا کہ چند میل پیچھے بھی یہی ہوا اور ایسے ہی کھیت اور مکان تھے لیکن وہ کیا چیز ہے جو اپنے وطن کو دنیا میں سب سے انوکھا' پیارا اور بے مثال بنا دیتی ہے!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس پار

امجد اسلام امجد

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اے ربِ ملائک و جن و بشر میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
خدمت میں تری شرمندہ نظر، دیں میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

جو تیری ثنا کے لائق ہو اک لفظ بھی ایسا پاس نہیں
کیا تابِ سخن، کیا غرضِ ہنر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

قطرے کی نگاہ حیراں پر دریا کی حقیقت کیسے کھلے!
میں جانتا ہوں یہ بات، مگر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے چار طرف ہیں دروازے، مرا سرمایہ کچھ اندازے
مجھ بے خبرے کو بخشِ خبر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

یہ ارض و سما کی پہنائی، یہ میری ادھوری بینائی
ہے شوق سفر ہی زادِ سفر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مری کان تری آہٹ سے بجیں، مرے سانس تری خوشبو میں پلیں
مری آنکھیں اپنے خواب سے بھر، میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اے نور ازل، اے حسن ابد، سبحان اللہ، سبحان اللہ

رہیں روشن تیرے شمس و قمر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

وہ جو معبود ہے

ہر جگہ جلوہ گر اور موجود ہے

سجدہ گہ ہے جہاں، وہ ہی مسجود ہے

سب کا مقصود ہے

اس کی حیرت کے ہیں آئینے، شش جہت

سب زمانے اسی کے یقیں کا گماں

سارے رستوں کا رخ اس کے گھر کی طرف

ساری آنکھیں اسی خواب کی باندیاں

اس کا خواب حسیں

سجدہ گاہ جہاں میں جبیں در جبیں

سانس لیتا ہوا جگمگاتا ہوا

روشنی کے خزانے لٹاتا ہوا

اس کی باتوں کی خوشبو سے مہکے ہوئے

آسماں اور زمیں

حسن ہے بے کراں، آنکھ محدود ہے

وہ ہے سب کی طلب، سب کا مقصود ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہر جگہ جلوہ گر اور موجود ہے

وہ جو معبود ہے

وہ جو مسجود ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

حمد

میں اس کا نام لیتا ہوں
تو ہونٹوں پر تبسم کی
دھنک لہرانے لگتی ہے
میں اس کو یاد کرتا ہوں
تو اک مانوس سی خوشبو
مجھے مہکانے لگتی ہے

وہ میرے دل میں رہتا ہے گل امید کی صورت!
زمانے کی شب تاریک میں خورشید کی صورت!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

نعت

حرا کی خلوتوں میں جو شہ لولاک پر اترا
رہے گا حشر تک امجد اسی پیغام کا چرچا

نہ رستہ ہے، نہ منزل ہے عجب آشوب میں دل ہے
میرے ہادی! مرے رہبر! مرے مولا! مرے آقا

خوشا راہیں کہ جن پر آپ ﷺ نے اپنے قدم رکھے
خوشا آنکھیں کہ جن کمبخت میں تھا، آپ ﷺ کا چہرا

بس اک آواز گونجے اور جہاں کا رخ بدل جائے
نہ ممکن تھا، نہ ممکن ہے، مگر یہ معجزہ دیکھا

وہ مسجد، جس کی دیواریں تری خوشبو سے روشن ہیں
خوشا قسمت کہ میں نے اس کی مٹی پر کیا سجدہ

ترے الطاف بے حد سے نہیں رہتی کوئی مشکل
ترے دریائے رحمت سے نہیں پھرتا، کوئی پیاسا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ترے شہر مکرم کی ہوا میں سانس لیتے ہی
مرے سینے کا سارا بوجھ جیسے ہو گیا ہلکا

ترے روضے کے گنبد پر نظر جس وقت ٹھہری تھی
وہی لمحہ کنارا تھا مرے دشت تمنا کا

ازل سے تا ابد امجد درود اس پرُ سلام اس پر
کہ جس نے آدمی کو آدمی کا مرتبہ بخشا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سلام

بھٹک رہی ہے زمیں پہ خلق خدا ہراساں
کہ رہبری کا کمال دنیا سے اٹھ گیا ہے
پھر اہل زر کی تو نگری ہی نشان رتبہ و جاہ ٹھہری
ہنر وری کا جمال دنیا سے اٹھ گیا ہے

تلاش رزق حلال کس کو ہو اور کیوں ہو؟
کہ جن کی آنکھوں میں تھی حیا وہ
چراغ مجرم بنے کھڑے ہیں
وہ جن کے سینوں میں روشنی تھی
وہ لوگ چپ چاپ بجھ گئے ہیں
سروں کو ہاتھوں پہ لے کے چلنے کے مدعی ہیں ہزار لیکن
کسی کے رستے میں کربلا کا سفر نہیں ہے
کہاں گئے اے زمیں وہ راہ وفا کے جویا؟
کہ لاکھ اہل نظر ہیں لیکن "نظر" نہیں ہے
میں منتظر ہوں ہوا کے رستے میں اس خبر کا
جو روشنی کا پیام لائے
میں منتظر ہوں گزرتے لمحوں میں اس گھڑی کا
جو اس سفر کے محیط غم میں سکوں کا مقام لائے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

زباں پہ کانٹے سے اگ رہے ہیں
پھر آج شدت وہ پیاس میں ہے
مرے وطن کی فضا عجب اک ہراس میں ہے
حسین تیری تلاش میں ہے
یہ راہ بھولا ہوا قبیلہ
حسینؑ تیری تلاش میں ہے!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تو جو ہو گیا اسے مان لے

کسی ہاتھ نے کسی لوح پر جو نہیں لکھا
وہی اک حرف گماں ہیں ہم!
خط گمشدہ میں لکھی گئی
کوئی اجنبی سی زبان ہیں ہم
کسی اور خطہ درد پر جو گزر گیا
اسی وقت کی تنگ و تار کا
کوئی بے نشاں سا نشاں ہیں ہم
کبھی اپنے ہونے کے واہمے سے نکل کے دنیا کو دیکھئے
تو نہ کھل سکے کہ کہاں ہیں ہم!
مری جاںٔ ہماری یہ داستاں
اسی آسمان کی چھت تلے
انہی کہکشاؤں کے درمیاں
کئی لاکھ بار کہی گئی کئی لاکھ بار سنی گئی
یہ حدیث نغمہ بے صدا
کبھی سرخ پھولوں کی تیز خوشبو میں رگ گئی
کبھی آنسوؤں میں رواں ہوئی
یہ وہ شمع شام وصال ہے
جو تمام رات جلی کبھی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کبھی ایک پل میں دھواں ہوئی
کبھی روشنی کا یقیں بنی
کبھی تیرگی کا گماں ہوئی

تو جو ہو گیا اسے مان لے
کہ یہ داغ وہ ہیں جو سات بحروں
کے پانیوں سے نہ دھل سکیں گے
کہ ایک تیرے نہ ماننے سے
یہ شہر بھر کی عمارتوں پہ
جو چلتے بجھتے حروف پہنے
شکستہ وعدے لٹک رہے ہیں
نہ جڑ سکیں گی، نہ چھپ سکیں گے!
ہوا کے رستے میں اڑنے والے اداس پتے
نہ رک سکے ہیں نہ رک سکیں گے
تو جو ہو گیا اسے مان لے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ

ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ کیسے دیکھ تو آئیں
چلو اس شہر کو اک بار پھر سے، دیکھ تو آئیں

بہت دن سے سمندر کی ہوا گم سم سی آتی ہے
نہ ہوں طوفان کے رخ پر سفینے، دیکھ تو آئیں

کسی دن آرزوؤں کے کھنڈر میں جھانک کر ہم بھی
در و دیوار پر کیا کیا ہیں جالے، دیکھ تو آئیں

ہوا میں ڈولتی خوشبو پتہ خود ہی بتا دے گی
چلو رستوں پہ تھوڑی دور چل کے، دیکھ تو آئیں

ہمارا نام سنتے ہی کسی مہ وش کی آنکھوں میں
چمک اٹھتے ہیں کیا اب بھی تارے! دیکھ تو آئیں

بہت دھندلے سہی شیشے سرِ بزمِ وفا امجد
مگر اک بار وہ گم گشتہ چہرے، دیکھ تو آئیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اے دل

اے دل یہ تری وحشت کیا اور دکھائے گی!
کب تک انہی گلیوں میں بے سمت پھرائے گی
کس موڑ پہ رکنا ہے، کس راہ پہ جانا ہے
بتلا تو سہی ظالم، کس اور ٹھکانا ہے
اس شہر تذبذب میں، ہم بات کریں کیسے
دن کاٹ کے حیران ہیں، اب رات کریں کیسے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اب تم میرے نہیں رہے

میں جس شہر میں رہتا ہوں

وہ کہتا ہے

''اب تم میرے نہیں رہے''

سانس جو اب تک میری ہوا میں تم نے لیے ہیں

لوٹا دو

خواب جو میری مٹی کی خوشبو میں جیے ہیں

دفنا دو

میرے رزق کا لقمہ لقمہ

میرے جل کا اک اک گھونٹ

میری فضا میں اڑنے والے پنکھ پنکھیرو

اور ان کی خوش رنگ صدائیں

ان سب سے اب ہاتھ اٹھاؤ اور سنو

تیز ہوا کی سائیں سائیں

میرے اوپر تنی ہوئی افلاک کی چادر

ابر کے سائے' چاند کی کرنیں' روشن تارے نہیں تمہارے!

میرے شہر اے میرے پیارے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اتنے کڑوے بول یہ تو نے
کیسے سوچے! کیسے کہے!
''اب تم میرے نہیں رہے''

www.KitaabPoint.Blogspot.com

آبِ حیات

آتے جاتے موسموں کی لوح پر
لکھے ہواؤں نے
بہت سے لفظ ایسے
جن کے معنی اب کسی کو بھی نہیں آتے
کہ وہ گزرے زمانوں کے کسی انجان دوراہے پہ
رستہ بھول بیٹھے تھے
نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ ماضی میں تو زندہ ہیں
مگر کچھ اس طرح جیسے
مشینوں کے توسط سے کوئی ''کومے'' میں زندہ ہو

کچھ ایسے لفظ بھی اس لوح پر لکھے ہوئے ہیں
جن کے معنی اب نہیں ظاہر
مگر اک وقت آئے گا
کہ یہ مفہوم کی پوشاک پہنیں گے
بلند آواز میں بولیں گے اور باتیں کریں گے!

کبھی کے مر چکے اور آنے والے لفظ میں کیسا یہ رشتہ ہے!
کہ دونوں ایک ہی لمحے میں زندہ بھی ہیں، مردہ بھی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہمارا کام تو بس لوح کی خالی جگہوں پر
حاشیوں کی بالکونی سے
انھیں آواز دینا ہے
کہ یہ اپنی جگہ پر آ کے بیٹھیں تو
ہماری بات بھی تحریر میں آئے
ہمارے ہست کا منظر کسی تصویر میں آئے

ہمیں معلوم ہے اک دن
گزرتے وقت کی دیمک ہمیں بھی چاٹ جائے گی
کہ یہ اس کا وظیفہ ہے
یہ روشن دن جو نکلا ہے یہ آخر شام بھی ہوگا
"وہ مہلت جو ملی ہم کو وہ کیسے بے ثمر نکلی!
وضاحت کون سنتا ہے!
تلافی کس سے مانگیں ہم!"
ہمارے سر پہ اپنے خون کا الزام بھی ہوگا
تو اس دیمک کا رزق بے نشاں بننے سے پہلے
آخری حیلہ تو کر دیکھیں
جو کاغذ اپنے حصے کا ہے وہ کاغذ تو بھر دیکھیں
بہت مشکل سہی لیکن امکان سے باہر
کہ وہ الفاظ جن کے آج تک معنی نہیں ظاہر
ہم ان کا بھید پا جائیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

انھیں اس لوح پر لکھی ہوئی سحر کا حصہ بن جائیں
اگر اس موڑ سے پہلے
جہاں اس بے جہت کاوش کو رزق خاک ہونا
جہاں اس زندگی کے قرض کو بے باق ہونا ہے
جہاں پر ہر بقا لمحہ فنا پیغام بھی ہوگا
جہاں خورشید کا سایا شریک شام بھی ہوگا
اگر اس موڑ سے پہلے
کسی صورت
ہم ان الفاظ کے پوشیدہ معنی جان پائیں تو
سے کی لوح پر لکھے ہوئے کچھ خاص ناموں میں
ہمارا نام بھی ہوگا
ہمارا کام بھی ہوگا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بدن سے اٹھتی تھی اس کے خوشبو

بدن سے اٹھتی تھی اس کے خوشبو، صبا کے لہجے میں بولتا تھا
یہ میری آنکھیں تھیں اس کا بستر، وہ میرے خوابوں میں جاگتا تھا

حیا سے پلکیں جھکی ہوئی تھیں، ہوا کی سانسیں رکی ہوئی تھیں
وہ میرے سینے میں سر چھپائے نجانے کیا بات سوچتا تھا

کوئی تھا چشمِ کرم کا طالب، کسی پہ شوقِ وصال غالب
سوال پھیلے تھے چار جانب، بس ایک میں تھا جو چپ کھڑا تھا

عجیب صحبت، عجیب رت بھی، خموش بیٹھے ہوئے تھے دونوں
میں اس کی آواز سن رہا تھا، وہ میری آواز سن رہا تھا

بہار آئی تو تتلیوں کے پروں میں رنگوں کے خواب جاگے
اور ایک بھنور کلی کے لبوں کو رہ رہ کے چومتا تھا!

وہ اور ہوں گے جن کو امجد نئے مناظر کی چاہ ہو گی
میں اس کے چہرے کو دیکھتا ہوں، میں اس کے چہرے کو دیکھتا تھا!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

آنکھ کے حصار میں ہے

یہ کون آج مری آنکھ کے حصار میں ہے
مجھے لگا کہ زمیں میرے اختیار میں ہے

چراغ رنگ نواؔ اب کہیں سے روشن ہوا
سکوت شام سفرؔ کب سے انتظار میں ہے

کچھ اس طرح ہے تری بزم میں یہ دلؔ جیسے
چراغ شام خزاںؔ جشن نو بہار میں ہے

مری حیات کے سارے سفر پہ بھاری ہے
وہ ایک پل جو تری چشم اعتبار میں ہے

جو اٹھ رہا ہے کسی بے نشان صحرا میں
نشان منزل ہستی اسی غبار میں ہے

ہماری کشتی دل میں بھی اب نہیں وہ زور
تمہارے حسن کا دریا بھی اب اتار میں ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کبھی ہے دھوپ کبھی ابر خوش نما امجد
عجب طرح کا تلون مزاج یار میں ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کوئی موسم ہو دل میں ہے

کوئی موسم ہو دل میں ہے، تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں، تمہارے بعد کا موسم

نہیں تو آزما کر دیکھ لو، کیسے بدلتا ہے
تمہارے مسکرانے سے دل ناشاد کا موسم

صدا تیشے سے جو نکلی، دل شیریں سے اٹھی تھی
چمن خسرو کا تھا لیکن، رہا فرہاد کا موسم

پرندوں کی زباں بدلی، کہیں سے ڈھونڈ لے تو بھی
نئی طرز فغاں اے دل کہ ہے ایجاد کا موسم

رتوں کا قاعدہ ہے وقت پر یہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رک گیا فریاد کا موسم

کہیں سے اس حسیں آواز کی خوشبو پکارے گی
تو اس کے ساتھ بدلے گا دل برباد کا موسم

www.KitaabPoint.Blogspot.com

قفس کے بام و در میں روشنی سی آئی جاتی ہے
چمن میں آ گیا شاید لب آزاد کا موسم

مرے شہر پریشاںؔ میں تری بے چاند راتوں میں
بہت ہی یاد کرتا ہوں تری بنیاد کا موسم

نہ کوئی غم خزاں کا ہے، نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

چلیں ہم فرض کرتے ہیں

یہ کیسا کھیل ہے تقدیر کی بے نام بازی کا
کہ جو ہارے سو ہارے ہیں
مگر جو جیت جاتے ہیں
انھیں بھی اک نئی الجھن کی دلدل گھیر لیتی ہے
کہ اک مشکل کے بعد اک اور مشکل گھیر لیتی ہے

سمجھنے کے لیے آئیں
چلیں ہم فرض کرتے ہیں
''کسی لمحے کسی اک شخص کو پانا
ہماری زندگی سے بھی زیادہ بیش قیمت تھا
ہم اس کی آرزو میں ساری دنیا بھول بیٹھے تھے
بس اس کا نام لیتے تھے، اسی کو یاد کرتے تھے
اس کی دھن میں جیتے تھی اسی کے غم میں مرتے تھے
تو پھر کچھ یوں ہوا اک روز اس کو پالیا ہم نے
اسے رنگوں کی ڈولی میں بٹھا کر گھر میں لے آئے
تصور کی ہر اک خوشبو گل منظر میں لے آئے''
کہانی آگے چلتی ہے!
''تو ہوتا اس طرح ہے۔ زندگی کے کارخانے میں دنوں کے آنے جانے میں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جہاں کے ان گنت کاموں کا چکر چلنے لگتا ہے
بدن تھکتا ہے
آنکھیں دیر تک بیدار رہنے سے سلگتی ہیں
زباں اک تاجرانہ اور مسلسل جھوٹ
کی تکرار سے اکتانے لگتی ہے
مگر مجبور ہوتی ہے
کہ دنیا کا دباؤ اس کو رکنے ہی نہیں دیتا
کوئی بے کار سا قصہ وہ پھر دوہرانے لگتی ہے
تھکن اور نیند کی ملتی حدوں میں، سرد بستر پر
سحر سے رات تک کی بے نتیجہ گفتگو
یاد آنے لگتی ہے
تو اس لمحے
وہ عمروں کی ریاضت کا ثمر، وہ گوہر یکتا
اسی شکنوں بھرے بستر کے اک حصے میں ہوتا ہے
مگر محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے وہ ہزاروں میل کی دوری پہ رہتا ہے
اسی دوری کے صحرا میں کئی راتیں بکھرتی ہیں
کئی دن فوت ہوتے ہیں۔
تو پھر اک دن
کسی بے نام سے احساس کی آہٹ
ہمارے ہست کی خالی گلی میں گونجتی ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اور ہمیں بیدار کرتی ہے، بتاتی ہے
کہ ہم جس گھر میں رہتے ہیں
وہاں کچھ خوبصورت خواب بھی آباد ہوتے تھے"
چلیں ہم فرض کرتے ہیں
یہ سب کچھ اک کہانی ہے
مگر کتنی پرانی ہے!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کرو جو بات کرنی ہے

کرو جو بات کرنی ہے!
اگر اس آس پہ بیٹھے' کہ دنیا
بس تمہیں سننے کی خاطر
گوش بر آواز ہو کر بیٹھ جائے گی
تو ایسا ہو نہیں سکتا
زمانہ' ایک لوگوں سے بھرا فٹ پاتھ ہے جس پر
کسی کو ایک لمحے کے لیے رکنا نہیں ملتا
بٹھاؤ لاکھ تم پہرے
تماشا گاہِ عالم سے گزرتی جائے گی خلقت
بنا دیکھے' بنا ٹھہرے۔۔۔۔
جسے تم وقت کہتے ہو
دھندلکا سا کوئی جیسے زمیں سے آسماں تک ہے!
یہ کوئی خواب ہے جیسے
نہیں معلوم کچھ اس خواب کی مہلت کہاں تک ہے!
کرو' جو بات کرنی ہے۔۔!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کہیں سنگ میں بھی ہے

کہیں سنگ میں بھی ہے روشنی کہیں آگ میں بھی دھواں نہیں
یہ عجیب شہر طلسم ہے! کہیں آدمی کا نشاں نہیں

نہ ہی اس زمیں کے نشیب میں نہ ہی آسماں کے فراز پر
کئی عمر اس کو تلاشتے' جو کہیں نہیں پہ کہاں نہیں؟

یہ جو زندگانی کا کھیل ہے' غم و انبساط کا میل ہے
اسے قدر کیا ہو بہار کی! کبھی دیکھی جس نے خزاں نہیں

وہ جو کٹ گرے پہ نہ جھک سکے' نہ مقتلوں سے بھی رک سکے
کوئی ایسا سر نہیں دوش پر' کسی منہ میں ایسی زباں نہیں

جو تھے اشک میں نے وہ پی لئے' لب خشک و سوختہ سی لیے
مرے زخم پھر بھی عیاں رہے' مرا درد پھر بھی نہاں نہیں

نہیں اس کو عشق سے واسطہ ہے وہ ہے اور ہی کوئی راستہ
اگر اس میں دل کا لہو نہیں اگر اس میں جاں کا زیاں نہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

لبوں پہ پھول کھلتے ہیں

لبوں پہ پھول کھلتے ہیں کسی کے نام سے پہلے
دلوں کے دیپ جلتے ہیں' چراغ شام سے پہلے

کبھی منظر بدلنے پر بھی قصہ چل نہیں پاتا
کہانی ختم ہوتی ہے کبھی انجام سے پہلے

یہی تارے تمہاری آنکھ کی چلمن میں رہتے تھے
یہی سورج نکلتا تھا تمہارے بام سے' پہلے!

دلوں کی جگمگاتی بستیاں تا راج کرتے ہیں
یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے' پہلے

ہوئی ہے شام جنگل میں' پرندے لوٹتے ہوں گے!
اب ان کو کس طرح روکیں' نواح دام سے پہلے!

یہ سارے رنگ مردہ تھے تمہاری شکل بننے تک
یہ سارے حرف مہمل تھے تمہارے نام سے پہلے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہوا ہے وہ اگر منصف تو امجد احتیاطاً ہم
سزا تسلیم کرتے ہیں کسی الزام سے پہلے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بے وفائی کی مشکلیں

جو تم نے ٹھان ہی لی ہے
ہمارے دل سے نکلو گے
تو اتنا جان لو پیارے
وفا کی سیڑھیوں پر ہر قدم پھیلا ہوا
یہ آرزوؤں کا لہو ضائع نہ ہو جائے گا
سمندر سامنے ہو گا اگر ساحل سے نکلو گے!
ستارے جن کی آنکھوں نے ہمیں اک ساتھ دیکھا تھا
گواہی دینے آئیں گے!
پرانے کاغذوں کی بالکونی سے بہت سے لفظ جھانکیں گے
تمہیں واپس بلائیں گے
کئی وعدے فسادی قرض خواہوں کی طرح رستے میں روکیں گے
تمہیں دامن سے پکڑیں گے
تمہاری جان کھائیں گے!
چھپا کر کس طرح چہرہ
بھری محفل سے نکلو گے!
ذرا پھر سوچ لو جاناں
نکل تو جاؤ گے شاید
مگر مشکل سے نکلو گے!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

خزاں کی دھند میں

خزاں کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں
شجر مجبوریاں پہنے ہوئے ہیں

یہ کیسی فصلِ گل آئی چمن میں
پرندے خوف سے سہمے ہوئے ہیں

ہواؤں میں عجب سی بے کلی ہے
دلوں کے بادباں سمٹے ہوئے ہیں

ہمارے خواب ہیں مکڑی کے جالے
ہم اپنے آپ میں الجھے ہوئے ہیں

دمکتے، گنگناتے موسموں کے
لہو میں ذائقے پھیلے ہوئے ہیں

مری صورت، زمیں کے سارے منظر
ترے دیدار کو ترسے ہوئے ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

مثال نقش پا حیران تیرے!
ہوا کی راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں

نگاہوں سے کہو ہم کو سمیٹیں
مری جاں ہم بہت بکھرے ہوئے ہیں

ادھوری خواہشوں کا غم نہ کرنا
کہ سارے خواب کب پورے ہوئے ہیں!

سمندر آسماں اور سانس میرا
تری آواز پر ٹھہرے ہوئے ہیں

ہر اک رستے پہ کہتی ہیں یہ آنکھیں
یہ منظر تو کہیں دیکھے ہوئے ہیں

ستارے آسماں کے دیکھ امجد
کسی کی آنکھ میں اترے ہوئے ہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اے شعلہ جاں دیکھ

کھلتے تھے جہاں چاند وہاں برف جمی ہے
تاروں سے تہی رات کی آنکھوں میں نمی ہے
کم کم ہیں دیئے اور بہت تیز ہوا ہے

ہیں اہل ہوس رونق ایوان تمنا
کانٹوں کا ہوا رزق خیابان تمنا
غنچے ہیں پریشاں گلوگیر صبا ہے

خوشبو کی زباں گنگ ہے رنگوں کی نوا گم
منزل تو بڑی بات ہے رستہ بھی ہوا گم
آشوب ہے ایسا کہ نہ دیکھا نہ سنا ہے

ہے دور بہت دور کہیں صبح کا تارا
معدوم سہی دشت شب غم کا کنارا

لیکن یہی آشوب تو میزان وفا ہے
اے دل یہ کڑا وقت ہی عرفان وفا ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اے شمع نظرؔ ضو پہ تری حرف نہ آئے
اے شعلہ جاںؔ دیکھ تری لو نہ لرز جائے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اشک آنکھوں میں آئے

اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں
پھر بھی ہم مسکرائے جاتے ہیں

دشت بے سایاں میں ہم تیری
یاد کے سائے سائے جاتے ہیں

کوئی سنتا نہیں کسی کی بات
اپنی اپنی سنائے جاتے ہیں

قصر شاہی سے کب رکے وہ سوال
جو سڑک پر اٹھائے جاتے ہیں

ایسے جھکتی ہیں مہرباں آنکھیں
جیسے بادل سے چھائے جاتے ہیں

نہ سہی زور گر ہوا پہ نہیں
ہم دیا تو جلائے جاتے ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

راستہ صاف ہو نہ ہو لیکن
ہم تو پتھر ہٹائے جاتے ہیں

ہم سناتے ہیں حال دل اپنا
اور وہ مسکرائے جاتے ہیں

پھیلتی جا رہی ہے تنہائی
شہر میں لوگ آئے جاتے ہیں

پردے میں ایک مسکراہٹ کے
کتنے آنسو چھپائے جاتے ہیں!

کون آیا ہے روبرو امجد
آئینے جگمگائے جاتے ہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

شہر کے بے نشان رستوں میں

شہر کے بے نشان رستوں میں
ڈھونڈتی پھر رہی ہے رات کسے؟
جو ہوا سے الجھ رہا تھا کبھی
وہ دیا تو دیار وحشت میں
آپ اپنی ضیا کا رزق ہوا
وقت کے بے یقین صحرا میں
حیرت بے صدا کا رزق ہوا

راستے اجنبی، فضا دشمن، ہم کہیں جا کے اب یہ بات کسے!
کس نے کرنا تھا روشنی کا سفر، اور جلنا تھا کس کے ساتھ کسے؟
شہر کے بے نشان رستوں میں، ڈھونڈتی پھر رہی ہے رات کسے!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

وہ دمکتی ہوئی لو کہانی ہوئی

وہ دمکتی ہوئی لو کہانی ہوئی وہ چمک دار شعلہ فسانہ ہوا
وہ جو الجھا تھا وحشی ہوا سے کبھی' اس دیے کو بجھے تو زمانہ ہوا

ایک خوشبو سی پھیلی ہے چاروں طرف اس کے امکان کی اس کے اعلان کی
رابطہ پھر بھی اس حسن بے نام سے' جس کا جتنا ہوا' غائبانہ ہوا

باغ میں پھول اس روز جو بھی کھلا اس کی بالوں میں سجنے کو بے چین تھا
جو ستارا بھی اس رات روشن ہوا' اس کی آنکھوں کی جانب روان ہوا

کہکشاں سے پرے' آسماں سے پرے' رہگزار زمان و مکاں سے پرے
مجھ کو ہر حال میں ڈھونڈنا تھا اسے' یہ زمیں کا سفر تو بہانہ ہوا

اب تو اس کے دنوں میں بہت دور تک آسماں میں نئے اور نئی دھوپ ہے
اب کہاں یاد ہو گی اسے رات وہ جس کو گزرے ہوئے اک زمانہ ہوا

موسم وصل میں خوب ساماں ہوئے ہم جو فصل بہاراں کے مہماں ہوئے
گھاس قالین کی طرح بچھتی گئی' سر پہ ابر رواں' شامیانہ ہوا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اب تو امجد جدائی ہے اس موڑ تک درد کی دھند ہے اور کچھ بھی نہیں
جان من' اب وہ دن لوٹنے کے نہیں چھوڑیئے اب وہ قصہ پرانا ہوا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

یکم جنوری ۱۹۹۰ء

ہر طرف دھند ہے
دھند ہی دھند ہے
ایسے لگتا ہے جیسے زمیں آسماں
دھند کے اس اجل خیز سیلاب میں
خار و خس کی طرح
بہتے بہتے کہیں دور کھو جائیں گے
وہ مناظر جو گنتی میں آتے نہ تھے
ایک ہو جائیں گے!
بے یقینی کے رنگوں میں الجھی ہوئی
چاندنی درد کی، جگمگاتی نہیں!
دھند کی جھیل پر تیرتی ہے مگر
راہ پاتی نہیں!
وہ نظر جو ستاروں کی ہمراز تھی
دس قدم دور تک ساتھ جاتی نہیں
روشنی بھی کہیں کچھ دکھاتی نہیں

آنکھ کہتی ہے "باہر بہت دھند ہے"
دل یہ کہتا ہے "اندر بھی کم تو نہیں ہے!"

www.KitaabPoint.Blogspot.com

میں گیا تھا اس گلی میں......

میں گیا تھا اس گلی میں کئی خواہشیں پہن کر
وہ جو تھیں بہت شناسا
انہی کھڑکیوں سے اب کے
کسی رخ کی روشنی سے نہ چراغ کوئی لرزا
نہ کوئی ستارا چمکا' نہ ہی پھول کوئی آیا
دلِ منتظر کی جانب
نہ اٹھائی کوئی چلمن کسی دست پر حنا نے
نہ صبا کی دستکوں سے کوئی پردا سرسرایا
کسی خواب سے الجھ کر نہ تو چوڑیاں ہی چھنکیں
کسی آنکھ میں سمٹ کر نہ ہی چاند مسکرایا
میں گیا تھا اس گلی میں کئی خواہشیں پہن کر

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں؟

ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں!
فلک کی شاخ سے جھڑتے ہوئے یہ اطلسی پتے
زمین کی سمت آتے ہیں تو ان کی آخری سانسیں
دمکتی اور چمکتی روشنی کے
لہریوں کی شکل چلتی ہیں
بظاہر ایسا لگتا ہے
''وہاں''
بستی کے اس جانب' کسی جنگل کی وسعت میں
کسی پربت کے سینے پر
گرا ہوگا کہیں ملبہ
اسی خوش رنگ تارے کا
جواب سے ثانیہ بھر قبل روشن تھا
چمکتا تھا' دمکتا تھا' فلک پر جگمگاتا تھا
(مگر اب اس کے ہونے کی نشانی تک نہیں ملتی

نظر حیران ہوتی ہے
کہ جو کوندسا لپکا تھا
اسے اب کس طرح ڈھونڈے! کہاں ڈھونڈے!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

خلا اندر خلا اک خامشی ہے اور دہشت ہے
ستاروں کی گزرگاہوں میں بس وحشت ہی وحشت ہے
نظر کے واہمے ہیں یا گماں ہیں!
کچھ نہیں کھلتا
ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں!
کچھ نہیں کھلتا!!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کسی کی دھن میں جینا ہے

کسی کی دھن میں جینا ہے کسی کے ڈر میں رہنا ہے
بتا اے زندگی کب تک اسی چکر میں رہنا ہے

دھنک بنیاد تھی جن کی وہ بام و در نہ بن پائے
تذبذب نام ہے جس کا ہمیں اس گھر میں رہنا ہے

تمنا اور حسرت میں ہے فرق اظہار کا' یعنی
جو شعلہ جل نہیں سکتا اسے پتھر میں رہنا ہے

ترے باغِ توجہ کی فضا میں زندگی کرنا
زمِ خوشبو میں چلنا ہے گلِ منظر میں رہنا ہے

کہانی ایک ہے لیکن' جدا ہیں واقعے اپنے
تمہیں محشر اٹھانا ہے ہمیں محشر میں رہنا ہے

تمنا نے ہمیں پایا' تغافل ان کو راس آیا
کہ ہر احساس کو امجد کسی پیکر میں رہنا ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جان جاں کیا کریں؟

جان جاں کیا کریں؟
”جو مہ و سال گزرے ہیں ان کو نہ گزرے ہوئے فرض کر لیں!
سمجھ لیں کہ موسم ابھی اپنے ہاتھوں سے نکلے نہیں
راستے' سرخ پھولوں سے مہکے ہوئے ہیں
ہوا' ساحلوں پر ہماری امانت سنبھالے ہوئے
چل رہی ہے' ستارے
ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہیں
ہونٹوں پہ کھلتے ہیں' آنکھوں میں سجتے ہیں
سانسوں میں چلتے ہوئے جگمگاتے ہیں!
یہ فرض کر لیں
کہ لفظوں کے معنی ابھی تک وہی ہیں
تمنا کے انداز بدلے نہیں
جو شب و روز گزرے ہیں' گزرے نہیں“

کیا کریں جان جاں!
جو عبارت ہواؤں پہ تحریر ہے
فرض کیسے کریں!
یہ جو لمحوں کی الجھی سی زنجیر ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس سے کیسے بچیں

جوبھی کچھ ہو چکا' ہو چکا جان جاں!

جوشب و روز تیری مری زندگی کے کناروں کو چھوتے ہوئے جا چکے

ان کو ڈھونڈیں کہاں اور چھپائیں کہاں!

کیا کریں جان جاں!

نارسائی کے صحرا میں کٹ گئے

وقت کی لوح پر ان مہ و سال کا

ثانیہ ثانیہ ماجرا درج ہے!

گردباد زماں کے خم و پیچ سے

راستہ کوئی باہر کو جاتا نہیں!

خواہشوں کے بچھائے ہوئے جال میں

خواہش کے سوا کچھ بھی آتا نہیں!

جان جاں کیا کریں!

کیا کریں جان جاں!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ایک احساس دل کشا سے

ایک احساس دل کشا سے ہی
کھل اٹھا دل تری صدا سے ہی

مدعا حرف نارسائی کو
مل گیا عرض مدعا سے ہی

شاخ در شاخ زندگی جاگی
موسم سبز کی ہوا سے ہی

کس قدر سلسلے نکل آئے
لرزش چشم نیم وا سے ہی

پھول سے رت سے باغباں سے نہیں
اپناہ شکوہ تو ہے صبا سے ہی

رسم یہ حق پہ جان دینے کی
ہم نے سیکھی ہے کربلا سے ہی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

خود جیو دوسروں کو جینے دو
اپنی عادت ہے یہ سدا سے ہی

ہنر و مرتبہ نہیں مخصوص
جبہ و خلعت و قبا سے ہی

کتنے ہی بے جہت نہ کیوں ہو جائیں!
اپنا رشتہ تو ہے خدا سے ہی

سینکڑوں بار مل چکے ہوتے
آپ ملتے اگر دعا سے ہی!

درد کی آبرو نہیں رہتی
نیت حرف التجا سے ہی

وہ دوراہا بھی آ گیا امجد
جس کا دھڑکا تھا ابتدا سے ہی

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

منیر احمد شیخ کے لیے کچھ پھول

اے خدا

یہ ترا مال تھا تو نے واپس لیا

ہم جو اس موسم گل کی یادوں میں ہیں

یہ ترا مال تھا تو نے واپس لیا

تیرے دربار میں، سر جھکائے ہوئے

کرتے ہیں التجا

اس لحد کے مکیں پر کشادہ رہے

تیری رحمت سدا

اے خدا....... اے خدا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ایک سوگوار نظم

(منیر احمد شیخ کے لیے)

جتنے موسم ترے ساتھ گزرے
نجانے ترے واسطے ان کی صورت ہے کیا!
جو تجھے یاد کرتے ہیں، ان کے لیے
اب خزاں کے سوا کوئی موسم نہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہم تھے ہمارے ساتھ کوئی

ہم تھے ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہ تھا
ایسا حسین دل کہیں دیکھا سنا نہ تھا

آنکھوں میں اس کی تیر رہے تھے حیا کے رنگ
پلکیں اٹھا کے میری طرف دیکھتا نہ تھا

کچھ ایسے اس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

ہاتھوں میں دیر تک کوئی خوشبو بسی رہی
دروازہ چمن تھا وہ بند قبا نہ تھا

اس کے تو انگ انگ میں جلنے لگے دیے
جادو ہے میرے ہاتھ میں مجھ کو پتا نہ تھا

اس کے بدن کی لو سے تھی کمرے میں روشنی
کھڑکی میں چاند طاق میں کوئی دیا نہ تھا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کل رات وہ نگار ہوا ایسا متلفت
عکسوں کے درمیان کوئی آئنہ نہ تھا

رویا کچھ اس طرح مرے شانے سے لگ کے وہ
ایسے لگا کہ جیسے کبھی بے وفا نہ تھا

ہے عشق ایک روگ محبت عذاب ہے
اک روز یہ خراب کریں گے، کہا نہ تھا!

امجد وہاں پہ حد کوئی رہتی بھی کس طرح
رکنے کو کہہ رہا تھا مگر روکتا نہ تھا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کوئی کسی اور کے خوابوں میں کیسے زندہ رہ سکتا ہے!

یہ جان کر بھی
کہ سارے انساں بس اپنے خوابوں میں زندہ رہتے ہیں
اور اپنے آخیر دم تک انہی کے چہرے نکھارتے ہیں
انہی میں ہنستے' انہی میں بستے' انہی میں سجتے' سنورتے ہیں
یہ جانتے ہیں
بہت ہی اچھی طرح سے یہ بات جانتے ہیں
کہ جس کی آنکھوں میں جتنے سپنے ہیں اس کے اپنے ہیں

پھر بھی کیسا عجب ہے قصہ
کہ ہر کوئی اپنے اپنے خوابوں کو خواہشوں کو کسی کی آنکھوں میں دیکھتا ہے
ہیں اپنے چہرے کے نقش جن کو
وہ اور چہروں میں ڈھونڈتا ہے
ہے باپ جو بھی' وہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا
جہاں کو اپنی بجائے اس کی نظر سے دیکھے
اور اس کی آنکھوں میں خواب جتنے بھی گھر بنائیں

سبھی کے دروازوں کی جبیں پر
بس اس کے حرفوں سے بننے والے اک اسم دائم کی تختیاں ہوں
وہ اپنی آنکھوں سے "اس" کی آنکھوں کے خواب دیکھے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اسی کی سوچ محل بنائے اسی کے دیکھے سراب دیکھے

یہ جان کر بھی.....

یہ جان کر بھی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

قاصد جو تھا بہار کا

قاصد جو تھا بہار کا نا معتبر ہوا
گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہوا

خواہش جو شاخ حرف پہ چٹکی، بکھر گئی
آنسو جو دل میں بند رہا، وہ گہر ہوا

اک منحرف گواہ کی صورت، چراغ شام
اس کی گلی میں رات مراہم سفر ہوا

آواز کیا کہ شکل بھی پہچانتا نہیں
غافل ہمارے حال سے وہ اس قدر ہوا

عمر رواں کے رخت میں ایسا نہیں کوئی
جو پل تمہاری یاد سے باہر، بسر ہوا

خوشبو تھی جو خیال میں، رزق الم ہوئی
جو رنگ اعتبار تھا، گرد سفر ہوا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

دل کی گلی میں حد نظر تک تھی روشنی
کرنیں سفیرِ چاند ترا نامہ بر ہوا

تارے مرے وکیل تھے، خوشبو تری گواہ
کل شب عجب معاملۂ پیش نظر ہوا

امجد اگر وہ دور جنوں جا چکا، تو پھر
لہجے میں کیوں یہ فرق کسی نام پر ہوا!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

یہ اب جو موڑ آیا ہے

یہ اب جو موڑ آیا ہے
یہاں رک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے
کہ یہ اس راستے کا ایک حصہ ہی نہیں، سارے
سفر کو جانچنے کا، دیکھنے کا، تولنے کا
ایک پیمانہ بھی ہے، یعنی
یہ ایسا آئنہ ہے
جس میں عکس حال و ماضی اور مستقبل
بہ یک لحمہ نمایاں ہے
یہ اس کا استعارہ ہے
جو اپنی منزل جاں ہے
سنا ہے ریگ صحرا کے سفر میں
راستے سے دو قدم بھٹکیں
تو منزل تک پہنچنے میں کئی فرسنگ کی دوری نکلتی ہے
سو اب جو موڑ آیا ہے
یہاں رک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سورج! تیری آگ بجھے گی کتنے پانی سے؟

سوچ رہی ہے جانے کب سے آدم کی اولاد
ایک ہی بیج سے جب یہ اتنے ڈھیروں پیڑ اگے

ایک ہی پیڑ کی شاخ شاخ پہ مہکے جو سب پھول
ایک ہی پھول کے دامن میں جو سارے رنگ بھرے

پھر یہ کیسا فرق ہے ان میں کیسا ہے الجھاؤ!
ایک ہی پھول کی ہر پتی میں دنیا ایک نئی

ایک ہی شاخ پہ کھل اٹھتے ہیں کیسے کیسے پھول!
ایک ہی پیڑ پہ مل جاتے ہیں باہم رنگ کئی

لیکن ان کے میل میں بھی ہے اک دوری موجود
کھا جاتے ہیں زرد و سیہ کو سرخ اور گہرے رنگ

زور آور سے دب جاتے ہیں جتنے ہیں کمزور
طاقت والے ہو جاتے ہیں طاقتور کے سنگ

www.KitaabPoint.Blogspot.com

پوچھ رہی ہے جانے کب سے آدم کی اولاد
سکھ کا دن کب پیدا ہو گا رات کہانی سے؟

دھرتی! تیرا پیٹ بھرن کو کتنی مٹی ہو!
سورج! تیری آگ بجھے گی کتنے پانی سے؟

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بیت المقدس کی ایک شام

بہت سال گزرے
اسی شہر اقدس میں اک شام ایسی بھی روشن ہوئی
کہ جس کے جلو میں ستاروں کا اک کارواں بھی رواں تھا
اور اس کا سفر' آنے والی کئی
چاند آباد صدیوں پہ سایہ کناں تھا

پھر ایسا ہوا' روشنی کم ہوئی
اور آہستہ آہستہ ظلمت کی چادر نے اس شہر اقدس پہ پردہ کیا
اور آنکھوں کے سب طاق ویراں ہوئے
جن چراغوں کی لو سے ہوا بدگماں تھی
خود اپنے لیے مرگ ساماں ہوئے
اور بجھتے ہوئے آنسوؤں کی نمی نذر جاں کر گئے
اور چاروں طرف اک دھواں کر گئے

وہ دیوار گریہ
جو ظلمت فروشوں کا نقش فغاں تھی
ہمارے الم کا نشاں بن گئی
بے بسی اور ہزیمت ہمارے سفر کی زباں بن گئی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

وہ حزیران کا موسم بے نمو، عزم کھیتیاں ساتھ لیتا گیا
ایک سیل بلا کتنی ہی بستیاں ساتھ لیتا گیا

میں اس شہرِ اقدس کے باہر کھڑا ہوں
کہ جس کی فصیلوں میں میرے لہو کے دیے جل رہے ہیں
ہوا تیز چلنے لگی ہے
سپاہی نے دروازہ پر قفل ڈالا ہے
بندوق لہرا کے مجھ سے کہا ہے
''چلو، شام ہونے لگی ہے، چلو اپنی بستی میں جاؤ
کہ یہ شہرِ اقدس تمہارے لیے شہرِ ممنوع ہے''

اور میں سوچتا ہوں
درِ شہرِ اقدس کے باہر کھڑا میں یہی سوچتا ہوں
کہاں تک یہ ذلت کی اور غم کی آتش
مرے دل ہی دل میں سلگتی رہے گی!
گھنی شام کی یہ گھنیری اداسی
کہاں تک مرے ساتھ چلتی رہے گی!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

چاند مری کھڑکی میں آئے

چاند کبھی تو تاروں کی اس بھیڑ سے نکلے
اور مری کھڑکی میں آئے
بالکل تنہا اور اکیلا
میں اس کو باہوں میں بھر لوں
ایک ہی سانس میں سب کی سب وہ باتیں کر لوں
جو میرے تالو سے چمٹی
دل میں سمٹی رہتی ہیں
سب کچھ ایسے ہی ہو جائے‘ جب ہے نا
چاند مری کھڑکی میں آئے‘ تب ہے نا!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سادہ سے اک چہرے پر

سادہ سے اک چہرے پر کیا جادوگری آنکھیں ہیں
جو دیکھے ان کا ہو جائے
جو اترے وہ تھاہ نہ پائے
کتنے سپنے جاگ رہے ہیں
ان پلکوں کے سائے سائے
شمعِ سحری، چارہ گری، نامہ بری آنکھیں ہیں!
انجانی، پہچانی بھی
اپنی اور بیگانی بھی
ایک ہی منظر کا حصہ ہیں!
عکس بھی اور حیرانی بھی
ساحل جیسی لگتی ہیں وہ اور بھنور سی آنکھیں ہیں
سادہ سے اک چہرے پر کیا جادوگری آنکھیں ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا

خواب بھی ایک مسافر کی طرح ہوتے ہیں
چشم در چشم سدا ان کو سفر میں رہنا
رنگ کی موج میں، خوشبو کے اثر میں رہنا
ان کی عادت ہی نہیں
ایک جگہ پر رکنا
ان کی قسمت ہی نہیں
ایک نگر میں رہنا

ہم بھی اک خواب ہیں اے جان، تری آنکھوں میں
چند لمحوں کو جو ٹھہریں تو ہمیں
اپنی پلکوں کی اماں میں رکھنا
سایہ ابر توجہ کے گماں میں رکھنا
دھیان کے طاق سے ہم کو نہ ہٹانا، جب تک
رات کے بام پہ تاروں کے دیے جلتے رہیں
دیکھنا ہم کو، ہمیں دیکھتے جانا، جب تک
ہم تری آنکھ کی وادی میں سفر کرتے رہیں
خواب کا شوق یہی، خواب کی قسمت بھی یہی
حلقہ ریگ رواں، گردِ سفر میں رہنا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

رنگ کی موج میں، خوشبو کے اثر میں رہنا

ہم مگر خواب ہیں کچھ اور طرح کے ہم کو

نہ کوئی شوق سفر ہے نہ تلاش خوشبو

تیری آنکھوں میں جلیں اور انہی میں بجھ جائیں

چشم در چشم نہیں ہم کو سفر میں رہنا!

ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ویرانہ وجود میں چلنا

ویرانہ وجود میں چلنا پڑا ہمیں
اپنے لہو کی آگ میں جلنا پڑا ہمیں

منزل بہت ہی دور تھی، رستے تھے اجنبی
تاروں کے ساتھ ساتھ نکلنا پڑا ہمیں

سایا مثال آئے تھے اس کی گلی میں ہم
ڈھلنے لگی جو شام تو ڈھلنا پڑا ہمیں

اپنے کہے سے وہ جو ہوا منحرف، تو پھر
اپنا لکھا ہوا بھی بدلنا پڑا ہمیں

محراب جاں کی شمعیں بچانے کے واسطے
ہر رات کنج غم میں پگھلنا پڑا ہمیں

ہم چڑھتے سورجوں کو سلامی نہ دے سکے
سو دوپہر کی دھوپ میں جلنا پڑا ہمیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تھا ابتدا سے علم کہ ہے راستہ غلط
اور قافلے کے ساتھ بھی چلنا پڑا ہمیں

شانے پہ اس ادا سے رکھا پھر کسی نے ہاتھ
دل مانتا نہ تھا پہ بہلنا پڑا ہمیں

امجد کسی طرف بھی سہارا نہ تھا کوئی
جب بھی گرے تو خود ہی سنبھلنا پڑا ہمیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کاش کبھی تو ایسے ہو!

آنکھیں دیکھیں خواب
آنکھیں دیکھیں اور کسی کے خواب
اپنی آنکھیں ہی جب دیکھیں اور کسی کے خواب
کون بنے پھر خواب ہمارے شکوے کون سنے!
کانٹے کون چنے!
دل کو ہے بس ایک ہی الجھن
''من چاہی تعبیر سے روشن 'سپنا' کیسے ہو؟
آنکھوں میں جو خواب بسا ہے 'اپنا' کیسے ہو!''
تم دیکھو اک خواب
اپنی آنکھوں سے تم دیکھو میرا خواب
اپنی آنکھوں سے تم دیکھو کاش کبھی اک میرا خواب
شکووں کی پرچھائیاں اوڑھے' مجھ سے کرو پھر بات
مجھ سے کرو یہ بات
دل کو ہے بس ایک ہی الجھن
من چاہی تعبیر سے روشن' سپنا کیسے ہو!
آنکھوں میں جو خواب ترا ہے' اپنا'' کیسے ہو!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سرِ طاقِ جاں نہ چراغ ہے

سرِ طاقِ جاں نہ چراغ ہے پسِ بام شب نہ سحر کوئی
عجب اک عرصہ درد ہے' نہ گمان ہے نہ خبر کوئی

نہیں اب تو کوئی ملال بھی کسی واپسی کا خیال بھی
غمِ بے کسی نے مٹا دیا مرے دل میں تھا بھی اگر کوئی

تجھے کیا خبر ہے کہ رات بھر تجھے دیکھ پانے کو اک نظر
رہا ساتھ چاند کے منتظر تری کھڑکیوں سے ادھر کوئی

سرِشاخِ جاں ترے نام کا عجب ایک تازہ گلاب تھا
جسے آندھیوں سے خطر نہ تھا جسے تھا خزاں کا نہ ڈر کوئی

تری بے رخی کے دیار میں' گھنی تیرگی کے حصار میں
جلے کس طرح سے چراغِ جاں ! کرے کس طرف کو سفر کوئی!

کٹے وقت چاہے عذاب میں کسی خواب میں یا سراب میں
جو نظر سے دور نکل گیا اسے یاد کرتا ہے ہر کوئی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سر بزم جتنے چراغ تھے وہ تمام رمز شناس تھے
تری چشم خوش کے لحاظ سے نہیں بولتا تھا مگر کوئی

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

چراغ جلتا رہا

شام بجھتی، چراغ جلتا رہا
قافلہ، زندگی کا چلتا رہا

شاد تھا رنج رہگزر میں کوئی!
کوئی منزل پہ ہاتھ ملتا رہا

دھوپ تھی جس نگر میں کم نہ ہوئی
سایہ آفتاب، ڈھلتا رہا

بجھ گئے تھے دیے بھی، تارے بھی
اک مرا خواب تھا کہ جلتا رہا

آئینے بھی نہ روک پائے اسے
وقت کچھ اس طرح سے چلتا رہا

بات کا رخ کبھی، کبھی پہلو
ہجر کی شام وہ بدلتا رہا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہر پل دھیان میں بسنے والے

ہر پل دھیان میں بسنے والے لوگ افسانے ہو جاتے ہیں
آنکھیں بوڑھی ہو جاتی ہیں خواب پرانے ہو جاتے ہیں

ساری بات تعلق والی جذبوں کی سچائی تک ہے
میل دلوں میں آ جائے تو گھر ویرانے ہو جاتے ہیں

منظر کھل اٹھتی ہے پیراہن کی قوس قزح
موسم تیرے ہنس پڑنے سے اور سہانے ہو جاتے ہیں

جھونپڑیوں میں ہر اک تلخی پیدا ہوتے مل جاتی ہے
اسی لیے تو وقت سے پہلے طفل سیانے ہو جاتے ہیں

موسم عشق کی آہٹ سے ہی ہر اک چیز بدل جاتی ہے
راتیں پاگل کر دیتی ہیں دن دیوانے ہو جاتے ہیں

دنیا کے اس شور نے امجدؔ کیا کیا ہم سے چھین لیا ہے
خود سے بات کیے بھی اب تو کئی زمانے ہو جاتے ہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تجھے یاد ہے اسی ریت پر

میں ہوں جس مکان کی چھت تلے

مرا گھر نہیں

ترا نام درج ہے جس جگہ

ترا در نہیں

تجھے یاد ہے!

تجھے یاد ہے کسی شام ہم نے بنایا تھا

کہیں ایک چھوٹا سا ریت گھر

اسی ریت سے اسی ریت پر

(اسی ریت پر

جو تھی راہ میں کسی موج کے

کبھی اپنے ہونے کے دھیان میں

کبھی معجزوں کے گمان میں)

ہمیں علم تھا

ہمیں علم تھا کہ وہ ریت گھر

جو تھے منتظر کسی موج کے

انھیں ٹوٹ جانے سے روکنے کا خیال امر محال ہے

اسی موج و ریگ کے کھیل سے ہی بحال ہے

وہ تلازمہ

www.KitaabPoint.Blogspot.com

وہی رابطہ جسے ماننے کے فشار میں

رہ آگہی کے سراب بھی

سبھی خواب بھی

اسی ایک لمحۂ مختصر کے حصار میں ہے گھرا ہوا

خطِ ریگ بھی کفِ آب بھی!

پہ یہ داستاں

تو تھی ترجماں کسی کھیل کی

اسی کھیل کی

جسے کھیلتے ہمیں آ لیا کسی رات نے

اسی رات نے

جسے اپنے خوں سے جواں کیا

مرے شوق نے ترے ساتھ نے

کسی ان چھوئے سے خیال نے

کسی دور ہوتی سی بات نے

تجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

وہ جو بات کی بڑی دیر تک

مرے ہاتھ سے ترے ہاتھ نے!

کہاں تھا گماں کسے تھی خبر

جو کہا تھا شوق کی لہر نے

جو لکھا تھا ریت کی لوح پر

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اسی ایک شام کا کھیل تھا
اسی ایک پل کا جمال تھا
اسی کھیل میں
اسی شام کو
وہ جو ریت گھر سے بکھر گئے
وہ جو ایک پل میں اجڑ گئے
مرے خواب تھے
ترے خواب تھے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اسی ایک نقش کے عکس ہیں

اسی ایک نقش کے عکس ہیں
یہ زمین بھی یہ زمان بھی
جو اس آرزو کے صنم کدے
تھکی جستجو کے جہان بھی!
وہی ایک موج نمود ہے کبھی دشت میں کبھی باغ میں
اسی ایک ڈال کے پھول ہیں
یہ یقین بھی یہ گمان بھی

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

نہیں اب جہاں پہ نشاں

نہیں اب جہاں پہ نشان بھی
یہاں لوگ بھی تھے مکان بھی

مری آرزو میں جئے گا وہ
مجھے کب تھا ایسا گمان بھی!

تری بے رخی کے فشار سے
کبھی مل سکے گی امان بھی؟

اسی خاکداں کے حصار میں
مری خواہشوں کے جہان بھی

مری گمرہی کے غبار میں
مری منزلوں کے نشان بھی

عجب اس کا رنگ جمال ہے
کہ چمک اٹھا ہے مکان بھی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

عجب اس حسیں کا خیال ہے
کہ مہک رہا ہے گمان بھی

اسی آسمان کی چھت تلے
مرا آشیاں بھی اڑان بھی

ترے اک اشارے کے منتظر
یہ زمین بھی یہ زمان بھی

تری چشم خوش کی پناہ میں
مرے خواب بھی مرے مان بھی

میں جہاں گیا مرے ساتھ تھی
مری عمر بھر کی تھکان بھی

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بہت اچھا بھی لگتا ہے

بہت اچھا بھی لگتا ہے
اچانک اس طرح دل کا دوبارہ مبتلا ہونا
محبت آشنا ہونا
مگر جب دیکھتا ہوں
وقت کتنا جا چکا ہے
راستوں کی دھول
قدموں اور سروں پہ کس طرح سے جم چکی ہے
اور ہم تم
اپنی اپنی زندگی کے دائروں میں
اپنی اپنی گردشوں میں
اس طرح الجھے ہوئے ہیں
جس طرح دشت فلک میں ساتھ چلتے
دو ستارے
جو بظاہر پاس لگتے ہیں
مگر ان کی رفاقت میں
کروڑوں میل کی تنہائی کا دریا بھی ہوتا ہے

"یہ دریا پار کیسے ہو

www.KitaabPoint.Blogspot.com

نہ تم ہو اس کنارے پر
نہ ہم ہیں اس کنارے پر"

سو بہتر ہے
ہم اپنے اپنے دائروں کے اس خلا میں گھومتے جائیں
ستاروں کی طرح
اک ساتھ چمکیں اور دمکیں تو سہی لیکن
یہ اپنے بیچ میں جو فاصلوں کا سرخ دریا ہے
اسے تسلیم ہی کر لیں
کہ اس بے پل کے دریا میں
نہ تم ہی تیر سکتے ہو نہ ہی تیر سکتے ہیں!
بہت اچھا تو لگتا ہے!
اچانک اس طرح دل کا محبت آشنا ہونا
دوبارہ مبتلا ہونا۔

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کہیں بے کنار سے رت جگے

کہیں بے کنار سے رت جگے، کہیں زرنگار سے خواب دے!
ترا کیا اصول ہے زندگی؟ مجھے کون اس کا جواب دے!

جو بچھا سکوں ترے واسطے، جو سجا سکیں ترے راستے
مری دسترس میں ستارے رکھ، مری مٹھیوں کو گلاب دے

یہ جو خواہشوں کا پرند ہے، اسے موسموں سے غرض نہیں
یہ اڑے گا اپنی ہی موج میں، اسے آب دے کہ سراب دے!

تجھے چھو لیا تو بھڑک اٹھے مرے جسم و جاں میں چراغ سے
اسی آگ میں مجھے راکھ کر، اسی شعلگی کو شباب دے

کبھی یوں بھی ہو ترے روبرو میں نظر ملا کے یہ کہہ سکوں
''مری حسرتوں کو شمار کر، مری خواہشوں کا حساب دے؟

تری اک نگاہ کے فیض سے مری کشت حرف چمک اٹھے
مرا لفظ لفظ ہو کہکشاں مجھے ایک ایسی کتاب دے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ممکن نہیں تھا جو وہ

ممکن نہیں تھا جو وہ ارادہ نہیں کیا
ہم نے تجھے بھلانے کا وعدہ نہیں کیا

لہجے میں اس کے رنگ تھا کم اعتماد کا
ہم نے بھی اعتبار زیادہ نہیں کیا

تھے مصلحت کی راہ میں سائے بہت گھنے
پر دل نے اختیار وہ جادہ نہیں کیا

جھولی میں ہم نے پھر لیے فاقے سمیٹ کر
دامن کسی کے آگے کشادہ نہیں کیا

تھے خاکِ پائے اہلِ محبتؔ مگر کبھی
سجدۂ یہ پیشِ تاج و لبادہ نہیں کیا

حرمت شناس درد تھے سو ہم نے عمر بھر
امجدؔ حدیث جاں کا اعادہ نہیں کیا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بازی

کیا عجیب قصہ ہے!
اس زمیں کے نقشے پر
جو غرب قومیں ہیں
ان کے پاس جو کچھ ہے
جتنے زور والے ہیں' سب انہی کا حصہ ہے
کیا عجیب قصہ ہے!

کیا عجیب قصہ ہے
زیر دست قوموں کو
سرحدیں بدل جائیں
دست اہل حشمت کی جنبش قلم سے وہ
اٹلسوں کے صفحوں سے
ایک دم نکل جائیں
آستین قاتل کی پھر بھی صاف رہتی ہے
خون اس کے ہاتھوں پر سر بسر چمکتا ہو
زخم کھانے والوں کی
مضمحل زباں اس کو
پھر بھی امن عالم کا چمپئن ہی کہتی ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کیا عجیب قصہ ہے!

ظلم کی وکالت میں ان فریب کاروں کی

مختلف زبانیں کیا

ایک ساتھ چلتی ہیں

ریشمی سے لفظوں میں

وحشتیں اگلتی ہیں

آرزوئیں دنیا کے، زبردست لوگوں کی

آنسوؤں میں پلتی ہیں

سسکیوں میں ڈھلتی ہیں

اس قمار خانے میں اس گھڑی

(دل بہت ہی راضی ہے)

جتنے اچھے پتے ہیں

سب ہیں ان کے ہاتھوں میں!

آستیں میں سورج ہیں

چاند ان کے ماتھوں میں!

تاش کھیلنے والے!

یہ تو جانتے ہوں گے!

ہاتھ کتنا اچھا ہو، جیت کتنی بھاری ہو

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تاش کے یہ پتے تو بار بار بٹتے ہیں

کھیل آگے چلنا ہے

بازیاں بدلنی ہیں

ایک دن یہی چالیں

دوسروں نے چلنی ہیں!!!

وقت کے عناں گیرو! اطلسوں کے رکھوالو!

کھیل جیتنے والو!

ہار کی گھڑی کو بھی زندگی کی بازی کا

ایک رنگ جانو گے!

پستیوں میں گر کر بھی

کیا یہ بات مانو گے!

مدوجزر دنیا کا یہی اصل قصہ ہے

جس کے ہاتھ جو آئے وہ اسی کا حصہ ہے!

کیا یہ بات مانو گے

کیا یہ بات مانو گے!!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

رات کیوں ہوگئی؟

میرے شہروں کو کس کی نظر لگ گئی
میری گلیوں کی رونق کہاں کھو گئی
روشنی بجھ گئی، آگہی سو گئی
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہوگئی؟

رات کیوں ہوگئی، طالبانِ سحر!
ہم سے کیوں روشنی نے یہ پردا کیا
کیوں اندھیروں نے رستوں پہ سایا کیا
آؤ سوچیں ذرا
ہم بھی سوچیں ذرا، تم بھی سوچو ذرا
آگہی سے پرے، روشنی کے بنا
جتنے امکان ہیں سارے مرجائیں گے
جو بھی تخلیق ہے وہ بکھر جائے گی
زندگی اپنے چہرے سے ڈر جائے گی
طالبانِ سحر، آؤ سوچیں ذرا، آؤ دیکھیں ذرا
آرزو کے ستاروں سے دمکا ہوا
پرچمِ روشنی کس طرح پھٹ گیا!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کون سا موڑ ہم سے غلط کٹ گیا!
پھول رت میں خزاں کس طرح چھا گئی
بیج کیا بو گئی!
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سورج لیے
رات کیوں ہو گئی!!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

وہ ملال تو کوئی اور تھا

مرے چار سو جو کھلا رہا وہ جمال تو کوئی اور تھا
مرے خواب جس میں الجھ گئے وہ خیال تو کوئی اور تھا!
یہاں کس حساب کو جوڑتے
مرے صبح و شام بکھر گئے!
جو ازل کی صبح کیا گیا وہ سوال تو کوئی اور تھا!
جسے تیرا جان کے رکھ لیا وہ ملال تو کوئی اور تھا!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہانگ چو

ہے پہاڑوں کے درمیاں یہ نگر
جیسے محبوب کا حسیں چہرا
اپنے عاشق کے گرم ہاتھوں کے
پر طلب، مضطرب، حصار میں ہو
ایک بوسے کہ انتظار میں ہو!

یوں فضا ہو رہی ہے سر تا سر
رنگ جیسے ہوا میں حل جائے
آنکھ میں یوں ہیں ڈولتے منظر
ڈھیر ریشم کا جس طرح کوئی
انگلیوں سے پھسل پھسل جائے
جھیل میں تیرتے ہوئے یہ کنول
بے حد و بے شمار ایسے ہیں
آسماں پر ہوں جس طرح انجم
جیسے حلقہ کیے ہوئے موسم
اک گلِ نو بہار کی خاطر
خواہشِ وصل میں نہائے ہوئے
جیسے آغاز عاشقی خواب

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کہکشاں راہ میں بچھائے ہوئے
شاعر چین کا کہا سچ ہے
جھیل یہ ہانگ چو کے دامن کی
جیسے کوئی حسین عورت ہے"
ایک جنت ہے آسمانوں پر
ہانگ چو! اس زمیں پہ جنت ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ییجنگ

نگاہ شاعر مشرق کی پیش بینی نے
ہمالیہ کے جو چشمے ابلتے دیکھے تھے
نمو کے جوش نے دریا بنا دیا ہے انھیں
ہر ایک آنکھ میں ٹھہرے تھے جتنے خواب گراں
نگار صبح کا چہرا بنا دیا ہے انھیں

ہر ایک شے سے نمایاں ہے لذت تعمیر
ہر ایک نقش ہے اک شاہکار محنت کا
بس ایک خواب ہی دیکھا تمام آنکھوں نے
ہر ایک بوئے گا خوشیاں ہر ایک کاٹے گا
ہر ایک رشتہ الفت میں استوار بھی ہیں
یہ لوگ ایک بھی ہیں اور بے شمار بھی ہیں
جہان نو کی حسیں صبح کا نکھار ہیں یہ
یہ شہر باغ ہے اور قاصد بہار ہیں یہ

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

شنگھائی

ڈیڑھ کروڑ انسان
یک دل اور یک جان
ہاتھ میں ڈالے ہاتھ
آگے بڑھتے جائیں
اک دوجے کے ساتھ
منزل روشن ہے
مہکی سبز بہار
گلشن گلشن ہے
محنت پر ایقان
ڈیڑھ کروڑ انسان
ہر جانب تعمیر
مٹی پتھر دھات
سب میں ہے تنویر
سایا کرتے رکھ
مل کر بانٹے ہیں
سارے دکھ اور سکھ
بستی، دل کھلیان
ڈیڑھ کروڑ انسان

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہر اک ہے مزدور

سانجھی خوشیوں میں

رہتے ہیں مسرور

ہر غنچہ کھلتا ہے

اک جیسا انصاف

سب کو ملتا ہے

محنت سب کی شان

یک دل اور یک جان

ڈیڑھ کروڑ انسان

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ایک دن

آخری چند دن دسمبر کے
ہر برس ہی گراں گزرتے ہیں
خواہشوں کے نگار خانے سے
کیسے کیسے گماں گزرتے ہیں!

رفتگاں کے بکھرتے سایوں کی
ایک محفل سی دل میں سجتی ہے
فون کی ڈائری کے صفحوں سے
کتنے نمبر پکارتے ہیں مجھے
جن سے مربوط بے نوا گھنٹی
اب فقط میرے دل میں بجتی ہے

کس قدر پیارے پیارے ناموں پر
رینگتی بد نما لکیریں سی
میری آنکھوں میں پھیل جاتی ہیں
دوریاں دائرے بناتی ہیں
دھیان کی سیڑھیوں پہ کیا کیا عکس
مشعلیں درد کی جلاتے ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

نام جو کٹ گئے ہیں ان کے حرف
ایسے کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں
حادثے کی مقام پر جیسے
خون کے سوکھتے نشانوں پر
چاک سے لائنیں لگاتے ہیں

پھر دسمبر کے آخری دن ہیں
ہر برس کی طرح سے اب کے بھی
ڈائری ایک سوال کرتی ہے
کیا خبر اس برس کے آخر تک
میرے ان بے چراغ صفحوں سے
کتنے ہی نام کٹ گئے ہوں گے!
کتنے نمبر بکھر کے رستوں میں
گردِ ماضی سے اٹ گئے ہوں گے!
خاک کی ڈھیریوں کے دامن میں
کتنے طوفاں سمٹ گئے ہوں گے
ہر دسمبر میں سوچتا ہوں میں
ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے
رنگ کو روشنی میں کھونا ہے
اپنے اپنے گھروں میں رکھی ہوئی
ڈائری' دوست دیکھتے ہوں گے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ان کی آنکھوں کے خاکدانوں میں
ایک صحرا سا پھیلتا ہو گا
اور کچھ بے نشان صفحوں سے
نام میرا بھی کٹ گیا ہو گا!!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بھنور میں کھو گئے

بھنور میں کھو گئے اک ایک کر کے ڈوبنے والے
سر ساحل کھڑے تھے سب تماشا دیکھنے والے

خدا کا رزق تو ہر گز زمین پر کم نہیں یارو!
مگر یہ کاٹنے والے! مگر یہ بانٹنے والے!

کہاں یہ عشق کا سنگ گراں ہر اک سے اٹھتا ہے!
بہت سے لوگ تھے یوں تو یہ پتھر چومنے والے!

وفا کی راہ مقتل سے گزرتی ہے تو بسم اللہ
نہیں پسپائی سے واقف تمہارے چاہنے والے

ازل سے ظلم دیکھے جا رہی ہیں؛ دیکھتی آنکھیں
ازل سے سوچ میں ڈوبے ہیں امجد سوچنے والے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کوئی ہجر تھا نہ وصال تھا

کوئی ہجر تھا نہ وصال تھا مرے سامنے
مری آرزوؤں کا جال تھا مرے سامنے

میں گرا ہوں کتنی ہی بار پھر بھی رکا نہیں
مگر ایک تیرا خیال تھا مرے سامنے

کسی آنکھ میں نہ تھی روشنی کسی خواب کی
عجب ایک شہر ملال تھا مرے سامنے

لیے تنگ انگ میں پیاس سی سر شام وہ
مری خواہشوں کی مثال تھا مرے سامنے

مجھے رات اپنی نگاہ پہ بھی یقیں نہ تھا
کوئی معجزوں سا کمال تھا مرے سامنے

سر بزم جب کسی آئنے پہ نظر پڑی
وہی ایک عکس جمال تھا مرے سامنے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

وہی ایک چپ کا غبار تھا پسِ چشم نم
وہی ایک تشنہ سوال تھا مرے سامنے!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہوا کیوں تیز چلتی ہے!

ہوا کیوں تیز چلتی ہے!
کوئی بے نام سی وحشت چمن کے دل میں پلتی ہے
ہوا جب تیز چلتی ہے
ہوا' کیوں تیز چلتی ہے

ابھی کلیوں کے چہرے پر بہت سی اوس پڑنی تھی
ابھی پھولوں نے موسم سے کچھ اپنی بات کرنی تھی
ابھی سے کیوں یہ شمع زندگی' بجھ بجھ کے جلتی ہے
ہوا کیوں تیز چلتی ہے!

لپٹ جائے کبھی یہ بادباں سے' موج سے الجھے
کسی صورت نہ الجھن سیل بے زنجیر کی سلجھے
سفینے لوٹ کر آئے نہیں اور شام ڈھلتی ہے
نواحِ ساحلِ غم میں ہوا پھر تیز چلتی ہے
ہوا کیوں تیز چلتی ہے!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جہاں کشتی رکی میرا کنارا

جہاں کشتی رکی میرا کنارا اور تھا کوئی
جسے میں دوست سمجھا تھا ستارا اور تھا کوئی

فلک کی بالکونی میں خدا خاموش بیٹھا تھا
تو کیا ان گرنے والوں کا سہارا اور تھا کوئی

بجھی آنکھوں کے دامن میں جمی تھی دھول برسوں کی
وہ چہرا اب جو دیکھا ہے دوبارہ، اور تھا کوئی

بہت عادل سہی منصف، مگر انصاف کیسے ہو!
گواہی اور ہے، قاتل ہمارا، اور تھا کوئی

ہوا کی سمت دیکھی اور کشتی ڈال دی ہم نے
کھلا آ کر سمندر میں اشارہ اور تھا کوئی

فضا مہکی چمن جاگا، اچانک کھل اٹھے تارے
کسی کے مسکراتے ہی نظارہ اور تھا کوئی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

وہی مانوس لہجہ تھا، وہی آواز تھی امجد
مگر جو مڑ کے دیکھا تو پکارا اور تھا کوئی

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

حد گماں تک کوئی جا سکتا ہے

حد سے، حد گماں تک کوئی جا سکتا ہے
ڈھونڈنے اس کو کہاں تک کوئی جا سکتا ہے

کہکشاں کون سی، اس حسن کے حلقے میں نہیں
ہاں چلا جائے، جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

کسی مانوس سے لہجے کا اشارہ مل جائے
معجزہ ہائے بیاں تک کوئی جا سکتا ہے

کشتی شوق ہے خطرے کے نشاں سے آگے
اور خطرے کے نشاں تک کوئی جا سکتا ہے

پھیلتے جاتے ہیں ہر سمت وہ اڑتے گیسو
رات کے ساتھ کہاں تک کوئی جا سکتا ہے

مرتبہ میرا یہی ہے کہ زمیں زاد ہوں میں
سو وہاں ہوں کہ جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

راستے عشق کے آسان نہیں ہیں، امجد
ہاں مگر جاں کے زیاں تک کوئی جا سکتا ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

خواب

صاحبو! خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں
چھونا چاہو تو یہ اڑ جاتے ہیں
اور پھر ہاتھ نہیں آتے ہیں

کبھی اک شاخ تمنا پہ مہکتے ہوئے گاتے رہنا
داستاں دور کے دیسوں کی سناتے رہنا
ہر نئی رت میں نیا گیت بنا کر لانا
کبھی ہنستا، کبھی تا دیر رلاتے رہنا

اڑتی خوشبو کی طرح قید نہیں ہو سکتے
کسی بھی تیر سے یہ صید نہیں ہو سکتے
کبھی منزل کبھی رستوں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو! خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو! خواب کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں
آبگینوں کی طرح پھوٹ گئے
اک ذرا ٹھیس لگی، ٹوٹ گئے!

یہ کسی عمر، کسی وقت کے پابند نہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کبھی گڑیا کی طرح سوئیں گلے سے لگ کر
کبھی کونوں میں پڑے رہتے ہیں بیگانے سے
کسی مانوس سی آہٹ کا اشارا پا کر
دھیان کے طاق میں سجتے ہیں پری خانے سے
خواہشیں دل میں کھلاتی ہیں ستارے کیا کیا
آنکھ میں خواب کا اک چاند اتر آنے سے
کبھی اپنے کبھی غیروں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو! خواب کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں

صاحبو! خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں
جو بڑی دیر میں گھر بنتے ہیں
اور اک پل میں کھنڈر بنتے ہیں

ان در و بام میں جو لوگ تھے زندہ وہ گئے
پر یہ آواز کے سائے نہیں، مرنے والے!
شب کی پہنائی میں کچھ کھوئے ہوئے قدموں کی
آہٹیں ڈھونڈتے رہتے، نہیں مرنے والے!

کس قدر رنگ بہم ہوں تو بنے گلدستہ
ایک لمحے میں بکھر جائیں کسی بات سے وہ!
عمر بھر جاگ کے کاتیں جو ملائم ریشم

www.KitaabPoint.Blogspot.com

آنکھ جھپکیں تو پھسل جائے وہیں ہاتھ سے وہ
گمشدہ آگ کے شعلوں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو! خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

زیرلب یہ جو تبسم کا

زیر لب یہ جو تبسم کا دیا رکھا ہے
ہے کوئی بات جسے تم نے چھپا رکھا ہے

چند بے ربط سے صفحوں میں، کتاب جاں کے
اک نشانی کی طرح عہد وفا رکھا ہے

ایک ہی شکل نظر آتی ہے، جاگے، سوئے
تم نے جادو سا کوئی مجھ پہ چلا رکھا ہے

یہ جو اک خواب ہے آنکھوں میں نہفتہ مت پوچھ
کس طرح ہم نے زمانے سے بچا رکھا ہے!

کیسے خوشبو کو بکھر جانے سے روکے کوئی!
رزق غنچہ اسی گٹھڑی میں بندھا رکھا ہے

کب سے احباب جسے حلقہ کیے بیٹھے تھے
وہ چراغ آج سر راہ ہوا، رکھا ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

دن میں سائے کی طرح ساتھ رہا، لشکرِ غم
رات نے اور ہی طوفان اٹھا رکھا ہے

یاد بھی آتا نہیں اب کہ گلے تھے کیا کیا
سب کو اس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے

دل میں خوشبو کی طرح پھرتی ہیں یادیں، امجد
ہم نے اس دشت کو گلزار بنا رکھا ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اختر حسین جعفری کے لیے ایک نظم

آج وہ خود بھی بجھ گیا یارو
جس نے اک روشنی کی رخصت پر
یہ ابد تاب لفظ لکھے تھے
''تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں''

آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے خود
ایسا بے مثل عکس گر تھا وہ
سارے کانٹے سمیٹ لیتا تھا
ایسا انمول ہم سفر تھا وہ
وہ جو زرتاب لفظ لکھتا تھا
انگلیاں اس کی رزق خاک ہوئیں
کتنے سپنے ہوئے ہیں بے چہرا!
اس کی آنکھیں جو بجھ کے راکھ ہوئیں

اپنے دل میں سنبھال کر اس کو
آج ہاتھوں سے کھو رہے ہیں اسے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی
آئینہ خانے رو رہے ہیں اسے

اس کو کس روشنی میں دفنائیں
اس کو کس خواب کا بدن ہم دیں!
وہ جو خوشبو میں ڈھل گیا یارو
اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس طرح بھی ہونا ہے

ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے
رنگ کو روشنی میں کھونا ہے

جاگنا ہے غبار میں، ہم کو
خاک کی تیرگی میں سونا ہے

کتنی راتوں کو کر گیا جل تھل
ایک آنسو ابھی جو رونا ہے

عمر کی قید بامشقت میں
جسم کا بوجھ ہم کو ڈھونا ہے

وقت اور بخت کے تعلق میں
ایک بچہ ہے اک کھلونا ہے

تیری آنکھوں کے کنج خوشبو میں
ہم کو بھی ایک خواب بونا ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اے مری چشم تر بتا تو سہی
کون سا داغ ہے جو دھوتا ہے!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

مکاں اور مکیں

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں
اپنے نام کی تختی والی' ایک عمارت
کتنے دکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے

پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو
میں نے بھی اک گھر ہے بنایا
رنگوں' پھولوں' تصویروں سے اس کو سجایا
دروازے کی لوح پہ اپنا نام لکھایا
لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

دریا میں قطرے کی صورت
گم ہو جاؤں
اپنے آپ سے باہر نکلوں
"تم" ہو جاؤں

◆◆◆

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

پسِ گفتگو

امجد اسلام امجد

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود تمام ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ وہ لوگ جو وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤنلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز :روشنی، بسمہ یا مینجمنٹ وقار سے رابطہ کریں، شکریہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

پسِ گفتگو

امجد اسلام امجد

غزلوں کا انتخاب

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

اب تک نہ کھل سکا کہ مرے روبرو ہے کون!
کس سے مکالمہ ہے ! پسِ گفتگو ہے کون!

سایہ اگر ہے وہ تو ہے اُس کا بدن کہاں؟
مرکز اگر ہوں میں تو مرے چار سو ہے کون!

ہر شے کی ماہیت پہ جو کرتا ہے تو سوال
تجھ سے اگر یہ پوچھ لے کوئی کہ تو ہے کون!

اشکوں میں جھلملاتا ہوا کس کا عکس ہے
تاروں کی رہگزر میں یہ ماہ رو ہے کون!

باہر کبھی تو جھانک کے کھڑکی سے دیکھتے،

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

!کس کو پکارتا ہوا یہ کو بہ کو ہے کون

آنکھوں میں رات آ گئی لیکن نہیں کھلا
!میں کس کا مدعا ہوں؟ مری جستجو ہے کون

کس کی نگاہِ لُطف نے موسم بدل دیئے
!فصلِ خزاں کی راہ میں یہ مُشکبو ہے کون

بادل کی اوٹ سے کبھی تاروں کی آڑ سے
!چُھپ چُھپ کے دیکھتا ہوا یہ حیلہ جُو ہے کون

تارے ہیں آسماں میں جیسے زمیں پہ لوگ
!ہر چند ایک سے ہیں مگر ہو بہو ہے کون

!ہونا تو چاہیے کہ یہ میرا ہی عکس ہو

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

لیکن یہ آئینے میں مرے روبرو ہے کون!

اس بے کنار پھیلی ہوئی کائنات میں
کس کو خبر ہے کون ہوں میں! اور تُو ہے کون

سارا فساد بڑھتی ہوئی خواہشوں کا ہے
دل سے بڑا جہان میں امجدؔ عدُو ہے کون!

آئینوں میں عکس نہ ہوں تو حیرت رہتی ہے
جیسے خالی آنکھوں میں بھی وحشت رہتی ہے
ہر دم دُنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

کرنی ہے تو کھل کے کرو انکارِ وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

شہرِ سُخن میں ایسا کُچھ کر، عزت بن جائے
سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے ، عزت رہتی ہے

بنتے بنتے ڈھے جاتی ہے دل کی ہر تعمیر
خواہش کے بہروپ میں شاید قسمت رہتی ہے

سائے لرزتے رہتے ہیں شہروں کی گلیوں میں
رہتے تھے انسان جہاں اب دہشت رہتی ہے

موسم کوئی خُوشبو لے کر آتے جاتے ہیں
کیا کیا ہم کو رات گئے تک وحشت رہتی ہے

دھیان میں میلہ سا لگتا ہے بیتی یادوں کا
اکثر اُس کے غم سے دل کی صُحبت رہتی ہے

پھولوں کی تختی پہ جیسے رنگوں کی تحریر
لوحِ سُخن پر ایسے امجدؔ شہرت رہتی ہے

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارا ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارا ہے

کسی چراغ میں ہم ہیں کسی کنول میں تم
کہیں جمال ہمارا کہیں تمہارا ہے

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشے میں
تمام عمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

ہر اک صدا جو ہمیں باز گشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارہ کہ یہ دوبارہ ہے

وہ منکشف مری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حُسن کسی حُسن کا اشارہ ہے

عجب اصول ہیں اس کاروبارِ دُنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اُتارا ہے

کہیں یہ ہے کوئی خُوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالمِ موجود استعارا ہے

نجانے کب تھا! کہاں تھا مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے

!یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے ، ہم تم
!مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

دامِ خوشبو میں گرفتارِ صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی اُلجھن میں پڑا ہے کب سے

اے کڑی چُپ کے در و بام سجانے والے
منتظر کوئی سرِ کوہِ ندا ہے کب سے

چاند بھی میری طرح حُسن شناسا نکلا
اُس کی دیوار پہ حیران کھڑا ہے کب سے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

بات کرتا ہوں تو لفظوں سے مہک آتی ہے
کوئی انفاس کے پردے میں چھپا ہے کب سے

شعبدہ بازیِ آئینۂ احساس نہ پوچھ
حیرتِ چشم وہی شوخ قبا ہے کب سے

دیکھئے خون کی برسات کہاں ہوتی ہے
شہر پر چھائی ہوئی سُرخ گھٹا ہے کب سے

کور چشموں کے لئے آئینہ خانہ معلوم!
ورنہ ہر ذرہ ترا عکس نما ہے کب سے

کھوج میں کس کی بھرا شہر لگا ہے امجد
ڈھونڈتی کس کو سرِ دشت ہوا ہے کب سے

یہ گرد بادِ تمنا میں گھومتے ہوئے دن

کہاں پہ جا کے رُکیں گے یہ بھاگتے ہوئے دن

غروب ہوتے گئے رات کے اندھیروں میں

نویدِ امن کے سورج کو ڈھونڈتے ہوئے دن

نجانے کون خلا کے یہ استعارے ہیں

تمہارے ہجر کی گلیوں میں گونجتے ہوئے دن

نہ آپ چلتے ، نہ دیتے ہیں راستہ ہم کو

تھکی تھکی سی یہ شامیں یہ اونگھتے ہوئے دن

پھر آج کیسے کٹے گی پہاڑ جیسی رات

گزر گیا ہے یہی بات سوچتے دن

تمام عمر مرے ساتھ چلتے رہے

تمہی کو ڈھونڈتے تم کو پکارتے ہوئے دن

ہر ایک رات جو تعمیر پھر سے ہوتی ہے
کٹے گا پھر وہی دیوار چاٹتے ہوئے دن

مرے قریب سے گزرے ہیں بار ہا امجدؔ
کسی کے وصل کے وعدے کو دیکھتے ہوئے دن

!نہ ربط ہے نہ معانی ، کہیں تو کس سے کہیں
!ہم اپنے غم کی کہانی ، کہیں تو کس سے کہیں

سلیں ہیں برف کی سینوں میں اب دلوں کی جگہ
!یہ سوزِ دردِ نہانی کہیں تو کس سے کہیں

نہیں ہے اہلِ جہاں کو خود اپنے غم سے فراغ
ہم اپنے دل کی گرانی کہیں تو کس سے کہیں!

پلٹ رہے ہیں پرندے بہار سے پہلے
عجیب ہے یہ نشانی کہیں تو کس سے کہیں!

نئے سخن کی طلب گار ہے نئی دُنیا
وہ ایک بات پرانی کہیں تو کس سے کہیں

نہ کوئی سُنتا ہے امجدؔ نہ مانتا ہے اسے
حدیثِ شامِ جوانی کہیں تو کس سے کہیں!

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

!جو کچھ دیکھا جو سوچا ہے وہی تحریر کر جائیں

!جو کاغذ اپنے حصے کا ہے وہ کاغذ تو بھر جائیں

نشے میں نیند کے تارے بھی اک دوجے پر گرتے ہیں

تھکن رستوں کی کہتی ہے چلو اب اپنے گھر جائیں

کچھ ایسی بے حسی کی دھند سی پھیلی ہے آنکھوں میں

ہماری صورتیں دیکھیں تو آئینے بھی ڈر جائیں

نہ ہمت ہے غنیمِ وقت سے آنکھیں ملانے کی

نہ دل میں حوصلہ اتنا کہ مٹی میں اتر جائیں

گُلِ امید کی صورت ترے باغوں میں رہتے ہیں

کوئی موسم ہمیں بھی دے کہ اپنی بات کر جائیں

دیارِ دشت میں ریگِ رواں جن کو بناتی ہے

بتا اے منزلِ ہستی کہ وہ رستے کدھر جائیں

تو کیا اے قاسمِ اشیاء یہی آنکھوں کی قسمت ہے

اگر خوابوں سے خالی ہوں تو پچھتاووں سے بھر جائیں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

جو بخشش میں ملے امجدؔ تو اس خوشبو سے بہتر ہے
کہ اس بے فیض گلشن سے بندھی مُٹھی گزر جائیں

اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
جس پر تیرا نام لکھا ہے اُس تارے کو ڈھونڈوں گا

تم بھی ہر شب دیا جلا کر پلکوں کی دہلیز پہ رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمہارے شہر کی جانب بھیجوں گا

ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
پانی کی ہر سطر پہ میں کچھ دل کی باتیں لکھوں گا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھیگے تھے
تم بھی اُس کو چھو کے گزرنا، میں بھی اُس سے لپٹوں گا

خواب مسافر لمحوں کے ہیں، ساتھ کہاں تک جائیں گے،،
تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میں بھی اب کچھ سوچوں گا

بادل اوڑھ کے گزروں گا میں تیرے گھر کے آنگن سے
قوسِ قزح کے سب رنگوں میں تجھ کو بھیگا دیکھوں گا

رات گئے جب چاند ستارے لگن میٹی کھیلیں گے
آدھی نیند کا سپنا بن کر میں بھی تم کو چھو لوں گا

بے موسم بارش کی صورت، دیر تلک اور دُور تلک
تیرے دیارِ حسن پہ میں بھی کِن مِن کِن مِن برسوں گا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

شرم سے دوہرا ہو جائے گا کان پڑا وہ بُندا بھی
بادِ صبا کے لہجے میں اِک بات میں ایسی پوچھوں گا

صفحہ صفحہ ایک کتابِ حسن سی کھلتی جائے گی
اور اُسی کو لَو میں پھر میں تم کو اَزبر کر لوں گا

وقت کے اِک کنکر نے جس کو عکسوں میں تقسیم کیا
آبِ رواں میں کیسے امجدؔ اب وہ چہرا جوڑوں گا!

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجدؔ ہم نے بچتے دیکھا کم

تاریکی کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کا
سُورج کی بس ایک کِرن سے گھُٹ جاتا ہے دَم

رنگوں کو کلیوں میں جینا کون سکھاتا ہے!
شبنم کیسے رُکنا سیکھی! تِتلی کیسے رَم!

آنکھوں میں یہ پلنے والے خواب نہ بجھنے پائیں
دل کے چاند چراغ کی دیکھو، لَو نہ ہو مدّھم

ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انساں
بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں نم!

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

بستیوں میں اک صدائے بے صدا رہ جائے گی
بام و دَر پہ نقش تحریرِ ہوا رہ جائے گی

آنسوؤں کا رزق ہوں گی بے نتیجہ چاہتیں
خشک ہونٹوں پر لرزتی اِک دُعا رہ جائے گی

رُو برو منظر نہ ہوں تو آئنے کس کام کے
ہم نہیں ہوں گے تو دُنیا گردِ پا رہ جائے گی

خواب کے نشّے میں جھکتی جائے گی چشمِ قمر
رات کی آنکھوں میں پھیلی التجا رہ جائے گی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

بے ثمر پیڑوں کو چومیں گے صبا کے سبز لب
دیکھ لینا، یہ خزاں بے دست و پا رہ جائے گی!

اب کے سفر ہی اور تھا، اور ہی کچھ سراب تھے
دشتِ طلب میں جا بجا، سنگِ گرانِ خواب تھے

حشر کے دن کا غلغلہ، شہر کے بام و دَر میں تھا
نگلے ہوئے سوال تھے، اُگلے ہوئے جواب تھے

اب کے برس بہار کی، رُت بھی تھی اِنتظار کی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

لہجوں میں سیلِ درد تھا، آنکھوں میں اضطراب تھے

خوابوں کے چاند ڈھل گئے تاروں کے دم نکل گئے
پھولوں کے ہاتھ جل گئے، کیسے یہ آفتاب تھے!

سیل کی رہگزر ہوئے، ہونٹ نہ پھر بھی تر ہوئے
کیسی عجیب پیاس تھی، کیسے عجب سحاب تھے!

عمر اسی تضاد میں، رزقِ غبار ہو گئی
جسم تھا اور عذاب تھے، آنکھیں تھیں اور خواب تھے

صبح ہوئی تو شہر کے، شور میں یوں بِکھر گئے
جیسے وہ آدمی نہ تھے، نقش و نگارِ آب تھے

آنکھوں میں خون بھر گئے، رستوں میں ہی بِکھر گئے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

آنے سے قبل مر گئے، ایسے بھی انقلاب تھے

ساتھ وہ ایک رات کا، چشم زدن کی بات تھا
پھر نہ وہ التفات تھا، پھر نہ وہ اجتناب تھے

ربط کی بات اور ہے، ضبط کی بات اور ہے
یہ جو فشارِ خاک ہے، اِس میں کبھی گلاب تھے

اَبر برس کے کھُل گئے، جی کے غبار دھُل گئے
آنکھ میں رُو نما ہوئے، شہر جو زیرِ آب تھے

درد کی رہگزار میں، چلتے تو کس خمار میں
چشم کہ بے نگاہ تھی، ہونٹ کہ بے خطاب تھے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

دِل کو حصارِ رنج و اَلم سے نکال بھی
کب سے بِکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی

آہٹ سی اُس حسین کی ہر سُو تھی، وہ نہ تھا
ہم کو خوشی کے ساتھ رہا اِک ملال بھی

سب اپنی اپنی موجِ فنا سے ہیں بے خبر
میرا کمالِ شاعری، تیرا جمال بھی

حسنِ اَزل کی جیسے نہیں دُوسری مثال
ویسا ہی بے نظیر ہے اُس کا خیال بھی!

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

مت پوچھ کیسے مرحلے آنکھوں کو پیش تھے
تھا چودھویں کا چاند بھی، وہ خوش جمال بھی

جانے وہ دن تھے کون سے اور کون سا تھا وقت!
گڈ مڈ سے اب تو ہونے لگے ماہ و سال بھی!

اِک چشمِ التفات کی پیہم تلاش میں
ہم بھی اُلجھتے جاتے ہیں، لمحوں کا جال بھی!

دنیا کے غم ہی اپنے لئے کم نہ تھے کہ اور
دل نے لگا لیا ہے یہ تازہ وبال بھی!

اِک سرسری نگاہ تھی، اِک بے نیاز چُپ
میں بھی تھا اُس کے سامنے، میرا سوال بھی!

آتے دنوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ کھُلے
سب کچھ فنا کا رزق ہے ماضی بھی حال بھی!

تم دیکھتے تو ایک تماشے سے کم نہ تھا
آشفتگانِ دشتِ محبت کا حال بھی!

اُس کی نگاہِ لُطف نہیں ہے، تو کچھ نہیں
امجدؔ یہ سب کمال بھی، صاحب کمال بھی!

اِک سرابِ سیمیا میں رہ گئے
لوگ جو بیم و رجا میں رہ گئے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

کس شبِ نغمہ کی ہیں یہ یادگار!

چند نوحے جو ہَوا میں رہ گئے

پی لئے کچھ اشک پاسِ عشق نے

کچھ فشارِ التجا میں رہ گئے

کھو گئے کچھ حرف دشتِ ضبط میں

کچھ غبارِ مدعا میں رہ گئے

چند جستوں کا یہ سارا کھیل ہے

رہ گئے، جو ابتدا میں، رہ گئے

سبز سایہ دار پیڑوں کی طرح

رفتگاں، دشتِ وفا میں رہ گئے

حاصلِ عمرِ رواں، وہ وقت، جو

ہم تری آب و ہَوا میں رہ گئے

ہے لہو کا قافلہ اَب تک رواں

اور قاتل، کربلا میں رہ گئے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

ہم ہیں امجدؔ اُن حقائق کی طرح
جو بیانِ واقعہ میں رہ گئے

ہاتھ پہ ہاتھ دَھرے بیٹھے ہیں، فرصت کتنی ہے
پھر بھی تیرے دیوانوں کی شہرت کتنی ہے!

سُورج گھر سے نکل چکا تھا کرنیں تیز کیے
شبنم گُل سے پوچھ رہی تھی "مہلت کتنی ہے!"

بے مقصد سب لوگ مُسلسل بولتے رہتے ہیں
شہر میں دیکھو سناٹے کی دہشت کتنی ہے!

لفظ تو سب کے اِک جیسے ہیں، کیسے بات کھلے؟
دُنیا داری کتنی ہے اور چاہت کتنی ہے!

سپنے بیچنے آ تو گئے ہو، لیکن دیکھ تو لو
دُنیا کے بازار میں ان کی قیمت کتنی ہے!

دیکھ غزالِ رم خوردہ کی پھیلی آنکھوں میں
ہم کیسے بتلائیں دل میں وحشت کتنی ہے!

ایک ادھورا وعدہ اُس کا، ایک شکستہ دل،
لُٹ بھی گئی تو شہرِ وفا کی دولت کتنی ہے!

میں ساحل ہوں امجدؔ اور وہ دریا جیسا ہے
کتنی دُوری ہے دونوں میں، قربت کتنی ہے!

حضورِ یار میں حرف التجا کے رکھے تھے
چراغ سامنے جیسے ہَوا کے رکھے تھے

بس ایک اشکِ ندامت نے صاف کر ڈالے
وہ سب حساب جو ہم نے اُٹھا کے رکھے تھے

سمومِ وقت نے لہجے کو زخم زخم کیا
وگرنہ ہم نے قرینے صَبا کے رکھے تھے

بکھر رہے تھے سو ہم نے اُٹھا لیے خود ہی
گلاب جو تری خاطر سجا کے رکھے تھے

ہوا کے پہلے ہی جھونکے سے ہار مان گئے
وہی چراغ جو ہم نے بچا کے رکھے تھے

تمہی نے پاؤں نہ رکھا وگرنہ وصل کی شب
زمیں پہ ہم نے ستارے بچھا کے رکھے تھے!

مٹا سکی نہ انہیں روز و شب کی بارش بھی
دلوں پہ نقش جو رنگِ حنا کے رکھے تھے

حصولِ منزلِ دُنیا کُچھ ایسا کام نہ تھا
مگر جو راہ میں پتھر اَنا کے رکھے تھے!

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

ہر قدم گریزاں تھا، ہر نظر میں وحشت تھی
مصلحت پرستوں کی رہبری قیامت تھی

!منزل تمنا تک کون ساتھ دیتا ہے
گردِ سعی لا حاصل ہر سفر کی قسمت تھی

آپ ہی بگڑتا تھا، آپ مَن بھی جاتا ہے
اس گریز پہلو کی یہ عجیب عادت تھی

اُس نے حال پوچھا تو یاد ہی نہ آتا تھا
!کس کو کس سے شکوہ تھا، کس سے کیا شکایت تھی

دشت میں ہواؤں کی بے رُخی نے مارا ہے
شہر میں زمانے کی پوچھ گچھ سے وحشت تھی

یوں تو دن دہاڑے بھی لوگ لُوٹ لیتے ہیں
لیکن اُن نگاہوں کی اور ہی سیاست تھی

ہجر کا زمانہ بھی کیا غضب زمانہ تھا
آنکھ میں سمندر تھا، دھیان میں وہ صورت تھی

خواب نگر ہے آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہوں
اُس کو اپنی جانب آتے دیکھ رہا ہوں

کس کی آہٹ قریہ قریہ پھیل رہی ہے

دیواروں کے رنگ بدلتے دیکھ رہا ہوں

!کون مرے جادو سے بچ کر جا سکتا ہے
آئینہ ہوں، سب کے چہرے دیکھ رہا ہوں

دروازے پر تیز ہواؤں کا پہرا ہے
گھر کے اندر چُپ کے سائے دیکھ رہا ہوں

جیسے میرا چہرا میرے دُشمن کا ہو
آئینے میں خود کو ایسے دیکھ رہا ہوں

منظر منظر ویرانی نے جال تنے ہیں
گلشن گلشن بِکھرے پتے دیکھ رہا ہوں

منزل منزل ہَول میں ڈُوبی آوازیں ہیں

رستہ رستہ خوف کے پہرے دیکھ رہا ہوں

شہرِ سنگدلاں میں امجدؔ ہر رستے پر
آوازوں کے پتھر چلتے دیکھ رہا ہوں

نکل کے حلقۂ شام و سحر سے جائیں کہیں
!زمیں کے ساتھ نہ مل جائیں یہ خلائیں کہیں

سفر کی رات ہے پچھلی کہانیاں نہ کہو
!رتوں کے ساتھ پلٹتی ہیں کب ہوائیں کہیں

فضا میں تیرتے رہتے ہیں نقش سے کیا کیا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

مجھے تلاش نہ کرتی ہوں یہ بلائیں کہیں!

ہوا ہے تیز، چراغِ وفا کا ذِکر تو کیا
طنابیں خیمۂ جاں کی نہ ٹوٹ جائیں کہیں!

میں اوس بن کے گُلِ حرف پر چمکتا ہوں
نکلنے والا ہے سُورج، مجھے چھپائیں کہیں!

مرے وُجود پہ اُتری ہیں لفظ کی صورت
بھٹک رہی تھیں خلاؤں میں یہ صدائیں کہیں

ہَوا کا لمس ہے پاؤں میں بیڑیوں کی طرح
شفق کی آنچ سے آنکھیں پگھل نہ جائیں کہیں!

رُکا ہوا ہے ستاروں کا کارواں امجدؔ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

چراغ اپنے لہو سے ہی اَب جلائیں کہیں

شمعِ غزل کی لَو بن جائے، ایسا مصرعہ ہو تو کہو
اِک اِک حرف میں سوچ کی خوشبو، دل کا اُجالا ہو تو کہو

رازِ محبت کہنے والے لوگ تو لاکھوں ملتے ہیں
رازِ محبت رکھنے والا، ہم سا دیکھا ہو تو کہو!

کون گواہی دے گا اُٹھ کر جھوٹوں کی اس بستی میں
سچ کی قیمت دے سکنے کا تم میں یارا ہو تو کہو!

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

ویسے تو ہر شخص کے دل میں ایک کہانی ہوتی ہے

ہجر کا لاوا، غم کا سلیقہ، درد کا لہجہ ہو تو کہو

امجدؔ صاحب آپ نے بھی تو دُنیا گھوم کے دیکھی ہے

ایسی آنکھیں ہیں تو بتاؤ! ایسا چہرا ہو تو کہو!

زیرِ لب یہ جو تبسّم کا دِیا رکھا ہے

ہے کوئی بات جسے تم نے چھپا رکھا ہے

چند بے ربط سے صفحوں میں، کتابِ جاں کے

اِک نشانی کی طرح عہدِ وفا رکھا ہے

ایک ہی شکل نظر آتی ہے، جاگے، سوئے

تم نے جادُو سا کوئی مجھ پہ چلا رکھا ہے

یہ جو اِک خواب ہے آنکھوں میں نہفتہ، مت پوچھ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

!کس طرح ہم نے زمانے سے بچا رکھا ہے

!کیسے خوشبو کو بِکھر جانے سے روکے کوئی

رزقِ غنچہ اسی گٹھڑی میں بندھا رکھا ہے

کب سے احباب جسے حلقہ کیے بیٹھے تھے

وہ چراغ آج سرِ راہِ ہوا، رکھا ہے

دن میں سائے کی طرح ساتھ رہا، لشکرِ غم

رات نے اور ہی طوفان اٹھا رکھا ہے

یاد بھی آتا نہیں اب کہ گلے تھے کیا کیا

سب کو اُس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے

دل میں خوشبو کی طرح پھرتی ہیں یادیں، امجدؔ

ہم نے اس دشت کو گلزار بنا رکھا ہے

یہ کون آج مِری آنکھ کے حصار میں ہے
مجھے لگا کہ زمیں میرے اختیار میں ہے

چراغِ رنگِ نوا، اب کہیں سے روشن ہو
سکوتِ شامِ سفر، کب سے انتظار میں ہے

کچھ اِس طرح ہے تری بزم میں یہ دل، جیسے
چراغِ شامِ خزاں، جشنِ نو بہار میں ہے

مِری حیات کے سارے سفر پہ بھاری ہے
وہ ایک پل جو تری چشمِ اعتبار میں ہے

جو اُٹھ رہا ہے کسی بے نشان صحرا میں
نشانِ منزلِ ہستی اُسی غبار میں ہے

ہماری کشتیٔ دل میں بھی اب نہیں وہ زور
تمہارے حسن کا دریا بھی اب اُتار میں ہے

کبھی ہے دُھوپ کبھی ابرِ خوش نما امجدؔ
عجب طرح کا تلون مزاجِ یار میں ہے

یہ دشتِ ہجر، یہ وحشت، یہ شام کے سائے
خدا یہ وقت تری آنکھ کو نہ دِکھلائے

اُسی کے نام سے لفظوں میں چاند اُترے ہیں
وہ ایک شخص کہ دیکھوں تو آنکھ بھر آئے

جو کھو چکے ہیں اُنہیں ڈھونڈنا تو ممکن ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

!جو جا چکے ہیں اُنہیں کوئی کس طرح لائے

کلی سے میں نے گلِ تر جسے بنایا تھا
رُتیں بدلتی ہیں کیسے، مجھے ہی سمجھائے

جو بے چراغ گھروں کو چراغ دیتا ہے
اُسے کہو کہ مِرے شہر کی طرف آئے

یہ اضطرابِ مسلسل عذاب ہے امجدؔ
!مِرا نہیں تو کسی اور ہی کا ہو جائے

اوروں کا تھا بیان تو موجِ صدا رہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

خود عمر بھر اسیرِ لبِ مدعا رہے

مثلِ حباب بحرِ غمِ حادثات میں

ہم زیرِ بارِ منتِ آب و ہَوا رہے

میں اُس سے اپنی بات کا مانگوں اگر جواب

لہروں کا پیچ و خم وہ کھڑا دیکھتا رہے

ق

گلشن میں تھے تو رونقِ رنگِ چمن بنے

جنگل میں ہم امانتِ بادِ صبا رہے

سُرخی بنے تو خونِ شہیداں کا رنگ تھے

روشن ہوئے تو مشعلِ راہِ وفا رہے

اُبھرے تو ہر بھنور کا جگر چاک کر گئے

ٹھہرے تو موج موج کو اپنا بنا رہے

امجدؔ درِ نگار پہ دستک ہی دیجئے

اس بے کراں سکوت میں کچھ غلغلہ رہے

نہ آسماں سے نہ دُشمن کے زور و زَر سے ہُوا
یہ معجزہ تو مِرے دَستِ بے ہنر سے ہُوا

قدم اُٹھا ہے تو پاؤں تلے زمیں ہی نہیں
سفر کا رنج ہمیں خواہشِ سفر سے ہوا

میں بھیگ بھیگ گیا آرزو کی بارش میں
وہ عکس عکس میں تقسیم چشمِ تر سے ہوا

سیاہی شب کی نہ چہروں پہ آ گئی ہو کہیں
سحر کا خوف ہمیں آئینوں کے ڈر سے ہوا

کوئی چلے تو زمیں ساتھ ساتھ چلتی ہے

یہ راز ہم پہ عیاں گردِ رہگزر سے ہوا

ترے بدن کی مہک ہی نہ تھی تو کیا رُکتے
گزر ہمارا کئی بار یوں تو گھر سے ہوا

کہاں پہ سوئے تھے امجدؔ کہاں کھُلیں آنکھیں
گماں قفس کا ہمیں اپنے بام و دَر سے ہوا

مقتل میں بھی اہل جنوں ہیں کیسے غزل خواں، دیکھو تو!
ہم پہ پتھر پھینکنے والو، اپنے گریباں، دیکھو تو!

ہم بھی اُڑائیں خاکِ بیاباں، دَشت سے تم گزرو تو سہی

ہم بھی دکھائیں چاکِ گریباں، لیکن جاناں، دیکھو تو

اے تعبیریں کرنے والو، ہستی مانا خواب سہی
اس کی رات میں جاگو تو، یہ خوابِ پریشاں دیکھو تو!

آج ستارے گم صُم ہیں کیوں، چاند ہے کیوں سَودائی سا
آئینے سے بات کرو، اِس بھید کا عنواں دیکھو تو!

کس کے حُسن کی بستی ہے یہ! کس کے رُوپ کا میلہ ہے!
آنکھ اُٹھا اے حُسنِ زلیخا، یوسفِ کنعاں، دیکھو تو!

جو بھی علاجِ درد کرو، میں حاضر ہوں، منظور مجھے
لیکن اِک شب امجدؔ جی، وہ چہرۂ تاباں، دیکھو تو!

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

کہیں بے کنار سے رتجگے، کہیں زر نگار سے خواب دے!
ترا کیا اُصول ہے زندگی؟ مجھے کون اس کا جواب دے!

جو بچھا سکوں ترے واسطے، جو سجا سکیں ترے راستے
مری دسترس میں ستارے رکھ، مری مُٹھیوں کو گلاب دے

یہ جو خواہشوں کا پرند ہے، اسے موسموں سے غرض نہیں
یہ اُڑے گا اپنی ہی موج میں، اِسے آب دے کہ سراب دے!

تجھے چھو لیا تو بھڑک اُٹھے مرے جسم و جاں میں چراغ سے
اِسی آگ میں مجھے راکھ کر، اسی شعلگی کو شباب دے

کبھی یوں بھی ہو ترے رُوبرو، میں نظر مِلا کے یہ کہہ سکوں

’’مری حسرتوں کو شمار کر، مری خواہشوں کا حساب دے!‘‘

تری اِک نگاہ کے فیض سے مری کشتِ حرف چمک اُٹھے
مِرا لفظ لفظ ہو کہکشاں مجھے ایک ایسی کتاب دے

اک نام کی اُڑتی خوشبو میں اک خواب سفر میں رہتا ہے
اک بستی آنکھیں ملتی ہے اک شہر نظر میں رہتا ہے

کیا اہلِ ہُنر، کیا اہلِ شرف سب ٹکڑے ردی کاغذ کے
اس دور میں ہے وہ شخص بڑا جو روز خبر میں رہتا ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

پانی میں روز بہاتا ہے اک شخص دیئے اُمیدوں کے
اور اگلے دن تک پھر ان کے ہمراہ بھنور میں رہتا ہے

اک خوابِ ہُنر کی آہٹ سے کیا آگ لہو میں جلتی ہے
کیا لہر سی دل میں چلتی ہے! کیا نشہ سر میں رہتا ہے

جو پیڑ پہ لکھی جاتی ہے جو گیلی ریت سے بنتا ہے
!کون اُس تحریر کا وارث ہے !کون ایسے گھر میں رہتا ہے

ہر شام سُلگتی آنکھوں کو دیوار میں چُن کر جاتی ہے
ہر خواب، شکستہ ہونے تک زنجیرِ سحر میں رہتا ہے

یہ شہر کتھا بھی ہے امجدؔ اک قصہ سوتے جاگتے کا
ہم دیکھیں جس کردار کو بھی جادو کے اثر میں رہتا ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

دستک کسی کی ہے کہ گماں دیکھنے تو دے
دروازہ ہم کو تیز ہوا دیکھنے تو دے

اپنے لہو کی تال پہ خواہش کے مور کو
اے دشتِ احتیاط کبھی ناچنے تو دے

سودا ہے عمر بھر کا کوئی کھیل تو نہیں
اے چشمِ یار مجھ کو ذرا سوچنے تو دے

اُس حرفِ "کُن" کی ایک امانت ہے میرے پاس
لیکن یہ کائنات مجھے بولنے تو دے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

شاید کسی لکیر میں لکھا ہو میرا نام
اے دوست اپنا ہاتھ مجھے دیکھنے تو دے

یہ سات آسمان کبھی مختصر تو ہوں
یہ گھومتی زمین کہیں ٹھہرنے تو دے

کیسے کسی کی یاد کا چہرہ بناؤں میں
امجدؔ وہ کوئی نقش کبھی بھولنے تو دے

چہرے پہ مرے زُلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو برس جاؤ کسی دن

رازوں کی طرح اُترو مرے دل میں کسی شب
دستک پہ مرے ہاتھ کی کھُل جاؤ کسی دن

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

پیڑوں کی طرح حُسن کی بارش میں نہا لوں
بادل کی طرح جھوم کے گھر آؤ کسی دن

خُوشبو کی طرح گزرو مرے دل کی گلی سے
پھولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن

پھر ہاتھ کو خیرات ملے بندِ قبا کی
پھر لُطفِ شبِ وصل کو دوہراؤ کسی دن

گزریں جو مرے گھر سے تو رُک جائیں ستارے
اس طرح مری رات کو چمکاؤ کسی دن

میں اپنی ہر اک سانس اُسی رات کو دے دوں
سر رکھ کے مرے سینے پہ سو جاؤ کسی دن

ایک آزار ہوئی جاتی ہے شہرت ہم کو
خود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت ہم کو

روشنی کا یہ مسافر ہے رہِ جاں کا نہیں
اپنے سائے سے بھی ہونے لگی وحشت ہم کو

آنکھ اب کس سے تحیر کا تماشا مانگے
اپنے ہونے پہ بھی ہوتی نہیں حیرت ہم کو

اب کے اُمید کے شعلے سے بھی آنکھیں نہ جلیں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

جانے کس موڑ پہ لے آئی محبت ہم کو

کون سی رُت ہے زمانے، ہمیں کیا معلوم
اپنے دامن میں لئے پھرتی ہے حسرت ہم کو

زخم یہ وصل کے مرہم سے بھی شاید نہ بھرے
ہجر میں ایسی ملی اب کے مسافت ہم کو

داغِ عصیاں تو کسی طور نہ چھپتے امجدؔ
ڈھانپ لیتی نہ اگر چادرِ رحمت ہم کو

تارا تارا اُتر رہی ہے رات سمندر میں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

جیسے ڈوبنے والوں کے ہوں ہاتھ سمندر میں

ساحل پر تو سب کے ہونگے اپنے اپنے لوگ
رہ جائے گی کشتی کی ہر بات سمندر میں

ایک نظر دیکھا تھا اُس نے آگے یاد نہیں
کھل جاتی ہے دریا کی اوقات سمندر میں

میں ساحل سے لوٹ آیا تھا کشتی چلنے پر
پگھل چکی تھی لیکن میری ذات سمندر میں

کاٹ رہا ہوں ایسے امجد یہ ہستی کی رہ
بے پتواری ناؤ پہ جیسے رات سمندر میں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

اُس نے آہستہ سے جب پُکارا مجھے
جھک کے تکنے لگا ہر ستارا مجھے

تیرا غم، اس فشارِ شب و روز میں
ہونے دیتا نہیں بے سہارا مجھے

ہر ستارے کی بجھتی ہوئی روشنی
میرے ہونے کا ہے استعارا مجھے

اے خدا کوئی ایسا بھی ہے معجزہ
جو کہ مجھ پر کرے آشکارا مجھے

کوئی سورج نہیں کوئی تارا نہیں
تو نے کس جھٹپٹے میں اُتارا مجھے

عکسِ امروز میں نقشِ دیروز میں
اک اشارا تجھے اک اشارا مجھے

ہیں ازل تا ابد ٹوٹتے آئینے
آگہی نے کہاں لا کے مارا مجھے

میں بے نوا ہوں، صاحبِ عزت بنا مجھے
اے ارضِ پاک اپنی جبیں پر سجا مجھے

جس پر رقم ہیں نقشِ کفِ پائے رفتگاں
اے عہدِ نا تمام، وہ رستہ دکھا مجھے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

میں حرف حرف لوحِ زمانہ پہ درج ہوں
میں کیا ہوں! میرے ہونے کا مطلب سکھا مجھے

یا مجھ کو اپنا چہرۂ منزل نما دکھا
یا قیدِ صبح و شام سے کر دے رہا مجھے

میں موجِ شوقِ خام تھا لیکن ترے طفیل
دریا بھی اپنے سامنے قطرہ لگا مجھے

آنکھوں سے اک خواب گزرنے والا ہے
کھڑکی سے مہتاب گزرنے والا ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

صدیوں کے ان خواب گزیدہ شہروں سے
مہرِ عالم تاب گزرنے والا ہے

جادو گر کی قید میں تھے جب شہزادے
قصے کا وہ باب گزرنے والا ہے

ق

سناٹے کی دہشت بڑھتی جاتی ہے
بستی سے سیلاب گزرنے والا ہے

دریاؤں میں ریت اُڑے گی صحرا کی
صحرا سے گرداب گزرنے والا ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

مولا جانے کب دیکھیں گے آنکھوں سے
جو موسم شاداب گزرنے والا ہے

ہستی امجدؔ دیوانے کا خواب سہی
اب تو یہ بھی خواب گزرنے والا ہے

ہر شخص کی خُوں رنگ قبا ہے کہ نہیں ہے
یہ قتل گہِ اہلِ وفا ہے کہ نہیں ہے

محرومِ جواب آتی ہے فریاد فلک سے
ان ظلم نصیبوں کا خُدا ہے کہ نہیں ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

اے قریۂ بے خوابِ تمنا کے مکینو
اس راہ کا اُس کو بھی پتا ہے کہ نہیں ہے

اک ریت کا دریا سا ادھر بھی ہے اُدھر بھی
صحرائے محبت کا سرا ہے کہ نہیں ہے

آنکھوں کے لئے خواب ہیں شبنم کے لئے پھول
ہر چیز یہاں رشتہ بپا ہے کہ نہیں ہے

اک نسل کی تعزیر سہیں دوسری نسلیں
اے منصفِ بر حق یہ ہوا ہے کہ نہیں ہے

بے رنگ ہوئے جاتے ہیں آنکھوں کے جزیرے
طوفان کی یہ آب و ہوا ہے کہ نہیں ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں
www.pakistanipoint.com

امجدؔ جو رکا اس کی صدا پر نہ چلا پھر
انسان کا دل کوہِ ندا ہے کہ نہیں ہے

ذرا پھر سے کہنا

از

امجد اسلام امجد

امجد اسلام امجد

جہانگیر بکڈپو اردو بازار ○ لاہور

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

سمے کے سمندر، کہا تُو نے جو بھی، سُنا، پر نہ سمجھے
جوانی کی ندّی میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہنا

میرے پہلے تینوں شعری مجموعوں برزخ (۱۹۷۴ء) ساتواں در (۱۹۷۸ء) اور فشار (۱۹۸۲ء) کے درمیان چار چار برس کا وقفہ تھا" ذرا پھر سے کہنا" چھ برس کے بعد آ رہی ہے - یہ گویا اعلان ہے اس بات کا کہ اب زمانی اعتبار سے کچھ چیزیں بدلنا شروع ہو گئی ہیں اور شاید آئندہ کتاب کا درمیانی وقفہ اس سے بھی زیادہ ہو! کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید چیزیں نہیں بدلتیں، اُن کو دیکھنے والی آنکھیں، اُن پر سوچنے والے ذہن اور اُن سے متاثر ہونے والے دل بدل جاتے ہیں یا پھر شاید یوں ہے کہ تبدیلی کا عمل دونوں طرف واقع ہوتا ہے! یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں کچھ بھی نہ بدلا ہو اور ہم محض ایک واہمے میں اسیر ہوں - بقول میرؔ

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

غالب نے بھی شاید ایسے ہی کسی عالم میں کہا تھا کہ

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہیں، چہ دنیا و چہ دیں

اصل حقیقت جو بھی ہو بہرحال ایک بات طے ہے کہ وقت انسانوں اور واقعات کے درمیان ایک غیر مرئی دھاگے کی طرح نہ صرف موجود رہتا ہے بلکہ ہمہ دم نت نئے ڈیزائن اور پیٹرن (PATTERN) بناتا چلا جاتا ہے - میری پہلی کتاب " برزخ " میری بیوی فردوس کے نام معنون ہے جو اُس وقت میری منگیتر تھی اور یہ چوتھی کتاب اُن تین خوبصورت پھولوں کے نام ہیں جو قدرت نے ہمارے مشترکہ آنگن میں مہکائے ہیں - برزخ کا انتساب لکھتے وقت میں نے شاید ان بہت

سی باتوں کو سوچا بھی نہیں تھا جو گزشتہ چودہ برس میں ظہور پذیر ہوئیں جبکہ معلوم ہے آج یہ سطریں لکھتے وقت میں جو کچھ سوچ رہا ہوں آگے چل کر وہ کس رنگ میں صورت پذیر ہو گا۔ میر کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

جائے عبرت ہے خاکدانِ جہاں
تو کہاں منہ اُٹھائے جاتا ہے

مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی تو نہیں، اس "خاکدانِ جہاں" میں اس "شعلۂ خاکی" کو بہرحال جلنا، چمکنا، دمکنا، سُلگنا اور بُجھنا ہے اب ان سب کیفیتوں کا کون سا تناسب کس کے حصے میں آتا ہے اور کیوں آتا ہے، یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جنہیں حل کرنے میں عقل و دانش اور ادراک و وجدان اپنے اپنے طور پر سرگرداں رہتے ہیں مگر آخری نتیجہ وہی نکلتا ہے۔ یعنی

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

وقت کی ہیئت، مفہوم، رفتار اور انسانی زندگیوں کے ساتھ اس کے تعلق پر بہت بڑے بڑے ذہنوں نے بہت کچھ سوچا اور لکھا ہے اور بڑے بڑے انوکھے ڈھنگ سے لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھتے رہیں گے کہ انسان کے باطنی اور خارجی دونوں نوعیت کے سفر اس بنیادی حوالے کے بغیر سمجھے اور سمجھائے نہیں جاسکتے، میں اس قافلے کا ایک ادنیٰ سا مسافر ہوں اور اپنی محدود سمجھ بوجھ کی مدد سے اپنی تحریروں میں اس مسئلے کے صحرائے اعظم کو عبور کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اپنی چالیسویں سالگرہ کے حوالے سے میں نے جب نظم "ابھی کچھ دنوں میں" لکھی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں اور اب اس کے بعد کا سارا سفر دوسری طرف اُترنے کا ہے مگر دُھند اس قدر ہے کہ کسی بھی طرف کا رستہ ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا۔ زندگی کے چالیس برس جمع ہوئے ہیں یا تفریق؟ اس پُرانے سوال سے قطع نظر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سارے حساب کتاب میں خود ہم کس جگہ پر کھڑے ہیں! مذہب اور سائنس دونوں ہمارے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہیں مگر اُن کی آوازیں اسی طرح سے آتی ہیں جیسے باکسنگ رِنگ میں راؤنڈ کے خاتمے پر باکسر کے کانوں میں اُس کے مینجر اور ساتھی کچھ سرگوشیاں کرتے ہیں وہ ان کو سُن کر

سر تو ہلاتا ہے مگر اُس کی سمجھ میں سوائے اپنے حریف کے لگائے ہوئے اور متوقع مکوں کے اور کچھ بھی نہیں آتا۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان کو زندگی کے رِنگ میں ایک غیر مرئی مگر انتہائی وحشی اور طاقتور حریف کے سامنے ڈال دیا گیا ہے وہ اندھوں کی طرح اپنا دفاع کرتا تو ہے لیکن کر نہیں پاتا اور راؤنڈ گزرتے چلے جاتے ہیں۔

مایوسی کے اس سارے منظر نامے کے باوجود ہمارے اندر کہیں کوئی چیز ایسی ضرور ہے جو ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں ہوتی ایک ایسا دیا ہے جو وقت کی وحشی اور منہ زور ہوا کے سامنے بھی جلنے کی کوشش سے باز نہیں رہتا، ایک ایسا پھول ہے جو صحرا کی جھلسی ہوئی ریت میں بھی اپنے ہونے کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔ ایک ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی ہے جو بھاگنے کی بجائے لپکتی ہوئی تلواروں کے رُخ پر سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور گرتے گرتے بھی اپنا عَلم بلند رکھنا چاہتا ہے۔ سو وقت اور انسان کے مابین جاری اس کشمکش میں انسان کے پاس زندہ رہنے (SURVIVAL) کے انتہائی طاقتور اور پُراسرار جذبے اور خواب دیکھنے کی لامحدود صلاحیت ہی وہ دو ہتھیار ہیں جن سے وہ اپنے شب و روز میں معنی تلاشتا اور تراشتا ہے جب زیادہ موج میں آتا ہے تو "شب آفریدی چراغ آفریدم" کے نعرے لگانے لگتا ہے اور بہت ہی تھک جائے تو "لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے" کا ورد کرنے لگتا ہے مگر محسوس یوں ہوتا ہے کہ اصل معاملہ ان دونوں حدوں کے درمیان کہیں ہے! سو بہتر ہے کہ انہیں اسی علاقے میں تلاش کیا جائے۔

"ذرا پھر سے کہنا" کے عنوان میں گزشتہ کی تکرار اور اعادے کی ایک خواہش جھلک رہی ہے مگر یہ صرف ایک خواہش ہے میرا منشور نہیں کہ میں تو ہمیشہ ماضی حال اور مستقبل کو ایک ہی تسلسل کی کڑیاں سمجھتا ہوں اور زندگی کو ایک متحرک اور آگے کی طرف بڑھتی ہوئی قوت کے طور پر دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی خواہش بھی اسی عمل کا حصہ ہے کہ وقت کی عمارت میں آئندہ کے تصور کے لیے رفتہ کا وجود ایک مرکزی ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر گزرنے والا لمحہ اس ستون کے محیط میں، ایک اینٹ کی طرح جڑتا چلا جاتا ہے اور یوں آنے والا کل "آج" میں اور "آج" گزرے ہوئے کل میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ یہ بات میں نے اسی کتاب میں شامل نظم "آج" میں ذرا وضاحت کے ساتھ کہنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ اس ابتدائیے کو میں اُسی نظم کی اختتامی لائنوں کے ساتھ

ختم کرتا ہوں۔

سوائے وقت کی حیرت میں کھو جانے والی آنکھ، ٹھہر
آج کے پُل پر رُک کر آگے پیچھے دیکھ
روشنی اور تاریکی شاید ایک ہی ڈال کے پتے ہیں
لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکا ہے
وقت کی اس ناوقتی کے سیلاب میں، شاید
آج ہی واحد لمحہ ہے!

عمرِ رواں کی دہشت میں کھو جانے والی آنکھ، ٹھہر

امجد اسلام امجد
۲۲ اگست ۱۹۸۸ء

ترتیب

ایک حمدیہ نظم

مرے خیالوں کے پیچ و خم سے
خلا کی بے سمت وسعتوں تک
جہان اندر جہان بے انت گردشوں کا جو سلسلہ ہے
یہ سب اُسی ایک ذاتِ واحد کا آئنہ ہے
وہ ذاتِ واحد
کہ جس کے اثبات کے جلو میں وہ کہکشائیں بھی چل رہی ہیں
جو اپنی رفتارِ روشنی میں ازل سے میری طرف رواں ہیں
مگر نہاں ہیں،
مگر نہاں ہیں وہ میری آنکھوں کی دسترس سے
کہ میری آنکھیں تو روشنی کے بس ایک ذرّے،
بس ایک سُورج کی سلطنت میں بھٹک رہی ہیں
یہ ایک سُورج کہ جس کی مٹّی سے میرے دن رات پھُوٹتے ہیں

یہ اُس کے گھوڑے کی گردِ پا ہے
یہ میری ہستی کا حاشیہ ہے !

میں اس کو کس طرح سوچ پاؤں
کہ میری آنکھوں کی پُتلیوں میں
سوائے حیرت کے کچھ نہیں ہے !
کہ میری بے صرفہ مٹھیوں میں
سوائے حسرت کے کچھ نہیں ہے !
جو چُھونا چاہوں تو چُھو نہ پاؤں
زباں پہ جب اُس کا نام لاؤں
تو ذائقے کی لُغت میں لکھے تمام الفاظ بھول جاؤں
میں نیم شب کی گھنی اُداسی میں اپنے سائے کے رُوبرو ہوں
اور اُس کو آواز دے رہا ہوں
جو صَوت و آہنگ کے وسیلوں سے ماورا ہے
جو میری بے سمت خواہشوں کا قطب نما ہے

کبھی کبھی جب مری صدائیں ،
گھروں سے بچھڑی یہ فاختائیں
(جو کہکشاؤں کے راستے پہ رواں ہوئی تھیں)
مرے زمان و مکاں سے آگے
مرے تخیّل سے اور میرے گماں سے آگے
حدودِ حدِّ بیاں سے آگے کی وسعتوں سے پلٹ کے آتی ہیں
اور میرے لہو کی وادی میں گونجتی ہیں
میں سوچتا ہوں
میں اپنے ہونے کے اور نہ ہونے کے مخمصے میں یہ سوچتا ہوں
یہ میرے چاروں طرف جو بکھرا ہُوا خلا ہے !
میں اِس کے اندر ہوں ؟
اس سے باہر ہوں ؟
اِس کا حصّہ ہوں ؟
یا کہ کیا ہے ؟ ؟

نعت

اُداسی کے سفر میں جب ہوا رُک رُک کے چلتی ہے
سوادِ ہجر میں ہر آرزو چپ چاپ جلتی ہے
کسی نادیدہ غم کا گھر میں لپٹا ہوا سایا
زمیں تا آسماں پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے
گزرتا وقت بھی ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا ہے

تو ایسے میں تری خوشبو ،
محمدؐ مصطفٰے ، صلِّ علیٰ کے نام کی خوشبو
دلِ وحشت زدہ کے ہاتھ پر یوں ہاتھ رکھتی ہے
تھکن کا کوہِ غم ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے
سفر کا راستہ کٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے

خزاں کے آخری دن تھے

خزاں کے آخری دن تھے
بہار آئی نہ تھی لیکن
ہوا کے لمس میں اک بے صدا سی نغمگی
محسوس ہوتی تھی
درختوں کے تحیّر میں
کسی بے آسرا اُمید کی لَو تھرتھراتی تھی
گزرگاہوں میں اُڑتے خشک پتّے
اجنبی لوگوں کے قدموں سے لپٹتے اور اُلجھتے تھے
تو اک بھولی ہُوئی تصویر جیسے کوند جاتی تھی ،

ہر اک منظر کے چہرے پر
لرزتی بے کلی کی ریشمیں چلمن کشیدہ تھی
نظر رستہ نہ پاتی تھی

کچھ ایسا ہی سماں تھا جب
وہ میرے بخت کے صحرا میں ساون کی طرح اُتری
مرے سانسوں میں مہکی تھی
نگاہوں کے ستارے، آرزو کے استعارے تھے،
تمنّاؤں کے سیلِ شوق میں بہنے لگی تھی وہ
مرے سینے پہ سر رکھ کر اچانک مسکرائی
اور کچھ کہنے لگی تھی وہ ....
نہ جانے کیا تھا وہ جُملہ!
وہ اُس کا ادھ کہا جُملہ،
جو غنچے کی طرح اُن کانپتے ہونٹوں پہ پھُوٹا تھا
اُسی لمحے کوئی کوئل بڑے ہی درد سے کُوکی تھی
وہ جیسے، اچانک نیند سے جاگی تھی
اور اُس نے بڑے دُکھ سے فلک کی سمت دیکھا تھا

وہ بولی تھی ....
"ستارہ شام کا روشن ہوا ہے، اب میں چلتی ہوں!"

خزاں کے آخری دن ہیں
ہوا کے لمس میں اک بے صدا سی نغمگی محسوس ہوتی ہے
کوئی مانوس سی خوشبو مرے کانوں میں کہتی ہے،
"پھر اُس کے حُسن کا محرم ترا دل ہونے والا ہے
وہ اُس کا اَدھ کہا جُملہ
مکمّل ہونے والا ہے!"

زنجیر

ریت کی لوح پہ لکھے ہوئے دریا کی طرح
یہ جو ہر راہ کے ہمراہ چلی آتی ہے
کیسی دیوار ہے یہ؟
از ازل تا بہ ابد
خواب اور خواب کی تعبیر کے مابین جو یہ
بھاگتے وقت کی تلوار سی لہراتی ہے
کیسی تلوار ہے یہ؟
یہ جو ہر موڑ پہ رکتے ہوئے رستے کی طرح
ڈولتے پاؤں کی زنجیر بنی جاتی ہے
کیسی رفتار ہے یہ؟

لفظ کی راہ میں، معنی کی گزرگاہوں میں
کون سے سچ کو چھپانے کے لیے
جھوٹ اسٹیج کے پردے کی طرح حائل ہے
یہ بھی معلوم نہیں
کون ناظر ہے یہاں اور تماشا کیا ہے؟

ریت کی لوح پہ لکھے ہوئے دریا کی طرح
از اُفق تا بہ اُفق
شک کی دیوار چلی جاتی ہے
شک کی دیوار کے اُس پار کا منظر کیا ہے؟
کون بتلائے مجھے!
بات کا روپ ہے کیا، بات کے اندر کیا ہے؟

O I

تُو نہیں، تیرا استعارا نہیں
آسماں پر کوئی ستارا نہیں

وہ مرے سامنے سے گزرا تھا!
پھر بھی میں چُپ رہا، پکارا نہیں

وہ نہیں ملتا ایک بار ہمیں
اور یہ زندگی دوبارا نہیں

ہر سمندر کا ایک ساحل ہے
ہجر کی رات کا کنارا نہیں

ہو سکے تو نگاہ کر لینا
تم پہ کچھ زور تو ہمارا نہیں

ناؤ اُلٹی تو یہ ہوا معلوم
زندگی موج ہے، کنارا نہیں!

O

مرنے کا ترے غم میں ارادہ بھی نہیں ہے
ہے عشق مگر اتنا زیادہ بھی نہیں ہے

ہے یوں کہ عبارت کی زباں اور ہے کوئی
کاغذ مری تقدیر کا سادا بھی نہیں ہے

کیوں دیکھتے رہتے ہیں ستاروں کی طرف ہم!
جب اُن سے ملاقات کا وعدہ بھی نہیں ہے

کیوں راہ کے منظر میں اُلجھ جاتی ہیں آنکھیں!
جب دل میں کوئی اور ارادہ بھی نہیں ہے

کیوں اُس کی طرف دیکھ کے پاؤں نہیں اُٹھتے
وہ شخص حسیں اِتنا زیادہ بھی نہیں ہے

کس موڑ پہ لے آیا ہمیں ہجرِ مسلسل !
تا حدِّ نگہ وصل کا وعدہ بھی نہیں ہے

پتھر کی طرح سرد ہے کیوں آنکھ کسی کی !
امجد جو بچھڑنے کا ارادہ بھی نہیں ہے

رحمان بابا کے لیے ایک نظم

وہ نیم شب کی گھنی اُداسی میں اپنے سائے کے رُوبرو تھا
اور ایک حیرت کا شامیانہ سا چارسُو تھا

یہی وہ حیرت ،
یہی وہ ہستی شکارِ حیرت
تھی جس کی لشکوں سے
اُس کے لفظوں کے بخت جاگے ،
پہاڑ جھمکے ، گلاب چمکے ، درخت جاگے !

وہ وادیوں کی گھنی اُداسی میں
چُپ کی آواز سُننے والا
وہ اَن لکھے لفظ پڑھنے والا
وہ اَن بہے اشک چننے والا
وہ میری ارضِ وطن کا شاعر
جو اپنے لفظوں میں جی رہا ہے
وہ اُس کے گیتوں کا تھا مسافر
ہر اک سفر کا جو منتہا ہے
میں جس تحیّر کی راہ میں ہوں
وہ اُس کی منزل سے آشنا ہے

ذرا سی بات

زندگی کے میلے ہیں، خواہشوں کے ریلے ہیں
تم سے کیا کہیں جاناں، اس قدر جھمیلے ہیں
وقت کی روانی ہے، بخت کی گرانی ہے
سخت بے زمینی ہے، سخت لامکانی ہے
ہجر کے سمندر میں
تخت اور تختے کی ایک ہی کہانی ہے
تم کو جو سنانی ہے
بات گو ذرا سی ہے
بات عمر بھر کی ہے
(عمر بھر کی باتیں کب دو گھڑی میں ہوتی ہیں !
درد کے سمندر میں
اَن گنت جزیرے ہیں، بے شمار موتی ہیں)

آنکھ کے دریچے میں تم نے جو سجایا تھا
بات اُس دیئے کی ہے
بات اُس گِلے کی ہے
جو لہو کی خلوت میں چور بن کے آتا ہے
لفظ کی فصیلوں پر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے
زندگی سے لمبی ہے، بات رَت جگے کی ہے
راستے میں کیسے ہو!
بات تخلیئے کی ہے
تخلیئے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے
پیار کرنے والوں کو اک نگاہ کافی ہے
ہو سکے تو سُن جاؤ ایک دن اکیلے میں
تم سے کیا کہیں جاناں، اس قدر جھمیلے ہیں

○

دُور تلک ویرانہ ہے
کب تک چلتے جانا ہے
آئینے کے ہاتھوں میں
مقتل کا پروانہ ہے
جانے والو، یاد رہے
شام ڈھلے گھر آنا ہے
فرق ہے کچھ کرداروں میں
باقی کھیل پرانا ہے
سچّی باتیں کون کرے
کون یہاں دیوانہ ہے
تجھ سا دُوجا دیکھنے کو
سارا عالم چھانا ہے
مٹّی بھی ہے، سونا بھی
دل بھی عجب خزانہ ہے

Excellent

محبّت

محبّت اوس کی صورت ،
پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے
گُلوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے
سحر کے جھٹپٹے میں، گنگناتی، مسکراتی، جگمگاتی ہے
محبّت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے
کسی فردوس کی صورت
محبّت اوس کی صورت !

محبّت ابر کی صورت
دلوں کی سرزمیں پہ گھر کے آتی اور برستی ہے
چمن کا ذرّہ ذرّہ جھومتا ہے، مسکراتا ہے
ازل کی بے نمو مٹّی میں سبزہ سر اُٹھاتا ہے
محبت اُن کو بھی آباد اور شاداب کرتی ہے
جو دل ہیں قبر کی صُورت
محبّت ابر کی صُورت !

محبّت آگ کی صُورت ،
بُجھے سینوں میں جلتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں
محبّت کی تپش میں کچھ عجب اسرار ہوتے ہیں
کہ جتنا یہ بھڑکتی ہے، عروسِ جاں مہکتی ہے
دلوں کے ساحلوں پر جمع ہوتی اور بکھرتی ہے
محبّت، جھاگ کی صُورت
محبّت، آگ کی صُورت !

محبت خواب کی صُورت ،

نگاہوں میں اُترتی ہے کسی مہتاب کی صُورت
ستارے آرزو کے اس طرح سے جگمگاتے ہیں
کہ پہچانی نہیں جاتی دلِ بے تاب کی صُورت!
محبت کے شجر پر خواب کے پنچھی اُترتے ہیں
تو شاخیں جاگ اُٹھتی ہیں
تھکے ہارے ستارے جب زمیں سے بات کرتے ہیں
تو کب کی منتظر آنکھوں میں
شمعیں جاگ اُٹھتی ہیں
محبت اِن میں جلتی ہے چراغِ آب کی صورت
محبت ،خواب کی صورت!

محبت درد کی صُورت

گزشتہ موسموں کا استعارہ بن کے رہتی ہے
شبانِ ہجر میں، روشن ستارہ بن کے رہتی ہے
منڈیروں پر چراغوں کی لَویں جب تھرتھراتی ہیں

نگر میں نااُمیدی کی ہوائیں سنسناتی ہیں
گلی میں جب کوئی آہٹ، کوئی سایہ نہیں رہتا
دُکھے دل کے لیے جب کوئی بھی دھوکہ نہیں رہتا
غموں کے بوجھ سے جب ٹوٹنے لگتے ہیں شانے تو
یہ اُن پہ ہاتھ رکھتی ہے
کسی ہمدرد کی صورت !
گزر جاتے ہیں سارے قافلے جب دل کی بستی سے
فضا میں تیرتی ہے دیر تک
یہ گرد کی صورت ،
محبت، درد کی صورت !

○

مقتل میں بھی اہلِ جنوں ہیں کیسے غزل خواں، دیکھو تو!
ہم پہ پتھر پھینکنے والو، اپنے گریباں، دیکھو تو!

ہم بھی اُڑائیں خاکِ بیاباں، دشت سے تم گزرو تو سہی
ہم بھی دکھائیں چاکِ گریباں، لیکن جاناں، دیکھو تو!

اے تعبیریں کرنے والو، ہستی مانا خواب سہی
اس کی رات میں جاگو تو، یہ خوابِ پریشاں دیکھو تو!

آج ستارے گُم صُم ہیں کیوں، چاند ہے کیوں سودائی سا
آئینے سے بات کرو، اس بھید کا عنواں دیکھو تو!

کس کے حُسن کی بستی ہے یہ! کس کے روپ کا میلہ ہے!
آنکھ اُٹھا اے حسنِ زلیخا، یوسفِ کنعاں، دیکھو تو!

جو بھی علاج درد کرو، میں حاضر ہوں، منظور مجھے
لیکن اک شب امجد جی، وہ چہرۂ تاباں، دیکھو تو

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

ستارا ڈھونڈنا ہے
ستاروں سے بھرے اِس آسماں کی وسعتوں میں
مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

فلک پر کہکشاں در کہکشاں اک بے کرانی ہے
نہ اُس کا نام ہے معلوم، ناں کوئی نشانی ہے

بس اتنا یاد ہے مجھ کو
ازل کی صبح جب سارے ستارے
الوداعی گفتگو کرتے ہوئے رستوں پہ نکلے تھے

تو اُس کی آنکھ میں اِک اور تارا جھلملایا تھا
اُسی تارے کی صورت کا
مری بھیگی ہوئی آنکھوں میں بھی اک خواب رہتا ہے
میں اپنے آنسوؤں میں اپنے خوابوں کو سجاتا ہوں
اور اُس کی راہ تکتا ہوں
سُنا ہے گمشدہ چیزیں
جہاں پہ کھوئی جاتی ہیں
وہیں سے مل بھی جاتی ہیں

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے !

اے دُنیا

اے دُنیا، ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں!
جو موزوں پیمانہ دیکھیں اُس میں ڈھلتے جائیں
چہرہ بدلیں، لہجہ بدلیں، آنکھ بدلتے جائیں!
کب تک ہم اس جھوٹ نگر میں یُونہی چلتے جائیں

اندر کی اس آگ میں کتنا اور جلیں!
اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں!
اپنے شک کی دیواروں کے نیچے بیٹھے ہیں
دیکھ رہے ہیں، پھر بھی، آنکھیں میچے بیٹھے ہیں
دوست ہمارے ہر جھاڑی کے پیچھے بیٹھے ہیں

اِک دُوجے کے خُون پہ کتنا اور پلیں !
اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں !

اے دُنیا تُو چار طرف ہے تیرے رُوپ ہزار
جو بھی بھاگے، جتنا بھاگے! تجھ سے نہیں فرار
آپ مریں یا تجھ کو ماریں، دونوں ہیں دشوار
کب تک ہم پچھتائیں، کب تک ہاتھ ملیں!
اے دُنیا ہم کب تک تیرے ساتھ چلیں!

ماہیے

جگنو کہ ستارا تھا
ترے بام پہ جو چمکا
وہی نام ہمارا تھا

دریاؤں کے دھارے ہیں
تم مانو کہ نہ مانو
ہم دل سے تمھارے ہیں

پُھولوں کی کیاری ہے
ترے دل کی خوشی سجنا
ہمیں جان سے پیاری ہے

قصّے نہیں دوہراتے
جو لمحے گزر جائیں
وہ مُڑ کے نہیں آتے

دُنیا مرے ساتھ چلے
ہر چیز ٹھہر جائے
جب تم سے بات چلے

تکرار نہیں کرتے
جب ساجن بات کرے
انکار نہیں کرتے

ازلوں سے باندی ہوں
جو مرضی صاحب کی
میں اُس کی باندی ہوں

بہتا ہُوا ساگر ہیں
تک ایک نظر سائیں
دو پَل کے مسافر ہیں

آواز کا صحرا ہے
یہ زخم جدائی کا
دریاؤں سے گہرا ہے

کچھ کام تو کر جائیں
تری چاہ میں زندہ ہیں
تری راہ میں مر جائیں

اِک بھول نہ ہو جائیں
تری ڈاچی کے مُڑنے تک
ہم دُھول نہ ہو جائیں

سوچوں، گھبراؤں میں
کچھ بھی تو نہیں پلّے
کیسے یار مناؤں میں

نذرِ وطن ـــ کچھ ماہیے

اک خواب سفر میں ہے
پھولوں میں نہیں اُترا
جو رنگ شجر میں ہے

رحمت کا اشارا ہے
اس گھور اندھیرے میں
اُمید کا تارا ہے

پھر بات نہیں چلتی
جو پیڑ سے کٹ جائے
وہ شاخ نہیں پھلتی

اب فرض حفاظت ہے
یہ پاک وطن ساتھی
اللہ کی امانت ہے

اک باغ بنے ایسا
ہو خاک کے تختے پر
کوئی اور نہ اُس جیسا

ہم تاج یہ ہیرا ہے
دُنیا کے سمندر میں
یہ مُلک جزیرہ ہے

باغوں میں کھلیں کلیاں
رہیں روزِ قیامت تک
آباد تری گلیاں!

کھیتوں میں ستارے ہیں
ہر شاخ کی آنکھوں میں
ارمان ہمارے ہیں

تقدیر نہیں بنتی
جب خواب اُدھورا ہو
تعبیر نہیں بنتی

یہ خواب رہے زندہ
ہے آج بھی یہ روشن
کل اور ہو تابندہ

گلزار بنا دیں گے
اس چاند زمیں کو ہم
تاروں سے سجا دیں گے

پہچان ہماری ہے
یہ پاک زمیں یارو
رجند جان ہماری ہے

کرنوں کے اشارے ہیں
یہ چاند ہمارا ہے
ہم اس کے ستارے ہیں

اِک چاند، اِک تارا ہے
لہراتا ہوا پرچم
اعلان ہمارا ہے

تعمیر کی صورت ہے
اس دیس کا ہر بچّہ
تعبیر کی صورت ہے

ابھی کچھ دنوں میں

ابھی کچھ دنوں میں
مری عمر کی اک دہائی ، یہ چوتھی دہائی
گزشتہ دہائیوں کی مانند فردا سے
اُبھرے گی اور راکھ ہو جائے گی
وقت کے دشتِ حیرت میں کھو جائے گی ۔

شب و روز کے اس تسلسل میں چالیس برسوں
پہ پھیلے ہوئے خواب مجھ سے پتہ پوچھتے ہیں

خود اپنے ہی چھوڑے ہوئے راستوں کا!
سُلگتے ہوئے بے صدارت جگوں کا
بھٹکتی ہوئی بے ثمر بارشوں کا !
لہو میں مچلتی ہوئی خواہشوں کا

وہ لمحے ، جو غم کی کمانوں سے چھوٹے تو سیدھے دلوں میں ترازو ہوئے!
وہ لمحے، جو زلفوں کی چھاؤں میں گزرے تو ہر آس کے دست و بازو ہوئے!
وہ لمحے، جنھیں بھول جانے کی خاطر میں اَن دیکھے رستوں پہ چلتا رہا
وہ لمحے، جنھیں دیکھنے کے لیے میں چراغوں کی مانند جلتا رہا
جمع و تفریق کے اِس مسلسل عمل میں
جو لمحہ بھی گزرے پلٹتا نہیں
وقت کے آئنے میں کوئی عکس بھی
ایک پَل سے زیادہ ٹھہرتا نہیں

(۲)

وقت شطرنج ہے !
جس کی چالوں کو گننا، ستاروں کے گننے سے کمتر نہیں

اور ہمارا سفر — یہ ازل سے ابد تک کا سارا سفر!
انہی چند خانوں کی گردش میں ہے، ان سے باہر نہیں!

(۳)

عمر کی جس دہائی کی سرحد پہ میں ہوں
وہاں پر زمانے!
کمانوں سے چھوٹے، بھٹکتے ہوئے تیر جیسے زمانے!
بس اک پل کو رکتے ہیں
آپس میں ملتے ہیں
اک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں...،
مگر اس سے پہلے کہ کچھ بول پائیں
اُون کے اس اُلجھتے ہوئے ڈھیر کا اک سرا کھول پائیں
ملاقات کی مہلتِ یک نفس ختم ہوتی ہے
اور زندگی
جیل کے وارڈن کی طرح اِن زمانوں کو پھر
بیرکوں کے اندھیرے میں لے جاتی ہے

وقت کی بیرکیں
جن میں ماضی بھی ہے اور آئندہ بھی — حال کوئی نہیں
ایک پُل کی طرح
عمر کے اس سمندر پہ ٹھہرا ہوا کوئی لمحہ نہیں — سال کوئی نہیں
ابھی کچھ دنوں میں مری عمر کی یہ دہائی بھی گزری دہائیوں کی مانند
فردا سے اُبھرے گی اور راکھ ہو جائے گی
وقت کے دشتِ حیرت میں کھو جائے گی!
ابھی کچھ دنوں میں...،
ابھی کچھ دنوں میں!

(۱)

کس رات کی آنکھوں میں پیمانِ سحر ہوگا
یہ خواب جو کونپل ہے، کس رُت میں شجر ہوگا

آنچل کی ہوا رکھنا، تو اس کی بچا رکھنا
یہ شمع جدھر ہوگی، پروانہ اُدھر ہوگا

جب رات کے پردے سے پھر رات نکل آئے
اُس وقت کدھر جائے، جو اہلِ نظر ہوگا

تاریخ کے چکّر میں وہ موڑ نہیں آتا
جب شاد مکیں ہوں گے، آباد نگر ہوگا

بجھتے ہوئے تاروں کی جھلمل بھی غنیمت ہے
اس ٹھہری ہوئی شب میں کچھ وہمِ سفر ہوگا

افکار پہ پہرا ہے، قانون یہ ٹھہرا ہے
جو صاحبِ عزّت ہے وہ شہر بدر ہوگا

محسوس یہ ہوتا ہے، ہر جلتا ہوا تارا
گزرے ہوئے وقتوں میں اک زخمِ ہنر ہوگا

سہمے ہوئے پنچھی کی آواز بتاتی ہے!
اُس کا بھی یہیں کوئی، جلتا ہوا گھر ہوگا

———

اِس بھید بھری چُپ میں

اے شمعِ کوئے جاناں ،
ہے تیز ہَوا ، مانا
تُو اپنی بچا رکھنا ۔ رستوں پہ نگہ رکھنا

ایسی ہی کسی شب میں
آئے گا یہاں کوئی ، کچھ زخم دکھانے کو
اِک ٹوٹا ہوا وعدہ ، مٹی سے اُٹھانے کو

پیروں پہ لہو اُس کے
آنکھوں میں دُھواں ہوگا
چہرے کی دراڑوں میں
بیتے ہوئے برسوں کا
ایک ایک نشاں ہوگا
بولے گا نہ کچھ لیکن ، فریاد کُناں ہوگا

اے شمعِ کوئے جاناں
وہ خاک بسر راہی ــــ وہ سوختہ پروانہ
جب آئے یہاں اُس کو مایوس نہ لوٹانا !
ہو تیز ہوا کتنی ، تُو اپنی بچا رکھنا
رستوں پہ نگہ رکھنا ــــ راہی کا پتا رکھنا ،

اِس بھید بھری چُپ میں اک پھُول نے کھلنا ہے!
اُس نے انہی گلیوں میں، اِک شخص سے ملنا ہے!!

○

کون سی چیز دل کے بس میں نہیں
دل مگر اپنی دسترس میں نہیں

یہ تو ہم ہیں، جو خار وخس میں ہیں
منزلِ گل تو خار وخس میں نہیں!

کب سے آنکھیں تلاشتی ہیں اُسے
ایک دن، جو کسی برس میں نہیں

جسم کتنی بڑی حقیقت ہو!
دل کی تسکیں مگر ہوس میں نہیں

کامراں، عاشقی کی منزل میں
ہے وہی دل جو پیش وپس میں نہیں

دیکھ لی جنتری زمانے کی
وصل کا دن کسی برس میں نہیں

(ق)

نارسائی کی دھند کے اُس پار
عشق میں کیا ہے، جو ہوس میں نہیں!

لذتِ پر کشادگی کے سوا!
باغ میں کیا ہے، جو قفس میں نہیں!

○

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجدؔ ہم نے بچتے دیکھا کم

تاریکی کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کا
سُورج کی بس ایک کرن سے گھُٹ جاتا ہے دَم

رنگوں کو کلیوں میں جینا کون سکھاتا ہے!
شبنم کیسے رُکنا سیکھی! تتلی کیسے رَم!

آنکھوں میں یہ پلنے والے خواب نہ بجھنے پائیں،
دل کے چاند چراغ کی دیکھو، لَو نہ ہو مدّھم

ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انساں
بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں نم!

عُمر کی سیڑھیاں

ہاں، سنو دوستو!
جو بھی دُنیا کہے
اُس کو پرکھے بِنا، مان لینا نہیں۔
ساری دُنیا یہ کہتی ہے،
پربت پہ چڑھنے کی نسبت اُترنا بہت سہل ہے
کس طرح مان لیں،
تُم نے دیکھا نہیں!
سرفرازی کی دُھن میں کوئی آدمی
جب بلندی کے رستے پہ چلتا ہے تو
سانس تک ٹھیک کرنے کو رُکتا نہیں
اور اُسی شخص کا
عُمر کی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے
پاؤں اُٹھتا نہیں!
اس لیے دوستو، جو بھی دنیا کہے
اُس کو پرکھے بِنا، مان لینا نہیں۔

ساری دُنیا یہ کہتی ہے
اصل سفر تو مسافر کی آنکھوں میں پھیلا ہوا خواب ہے

کس طرح مان لیں ،
تم نے دیکھا نہیں .
عمر کے اس سرابِ اجل خیز میں
خواب تو خواب ہیں
ہم کھُلی آنکھ سے جو بھی کچھ دیکھتے ہیں
وہ ہوتا نہیں

راستے کے لیے (راستے کی طرح)
آدمی اپنے خوابوں کو بھی کاٹ دیتے ہیں لیکن
سُلگتا ہوا راستہ
پھر بھی کٹتا نہیں !
اس لیے دوستو
جو بھی دنیا کہے
اُس کو پرکھے بِنا ، مان لینا نہیں .

○

ملے کیسے صدیوں کی پیاس اور پانی ، ذرا پھر سے کہنا
بڑی دلربا ہے یہ ساری کہانی ، ذرا پھر سے کہنا

کہاں سے چلا تھا جُدائی کا سایا ، نہیں دیکھ پایا
کہ رستے میں تھی آنسوؤں کی روانی ، ذرا پھر سے کہنا

ہَوا یہ خبر تُو سُناتی رہے اور میں سُنتا رہوں
بدلنے کو ہے اب یہ موسم خزانی ، ذرا پھر سے کہنا

بکھر جانے والا کبھی زندگی میں ، خوشی پھر نہ پائے !
یونہی ختم کر لیں ، چلو یہ کہانی ، ذرا پھر سے کہنا

سمے کے سمندر ! کہا تُو نے جو بھی ، سُنا پر نہ سمجھے
جوانی کی ندّی ، بس تھا تیز پانی ، ذرا پھر سے کہنا

آج

یہ "آج" جو کل میں زندہ تھا
وہ "کل" جو آج میں زندہ ہے
وہ "کل" جو "کل" کے ساتھ گیا
وہ "کل" جو ابھی آئندہ ہے
گزر چکے اور آنے والے، جتنے "کل" ہیں، جتنے "کل" تھے!
ان کا کوئی وجود نہ ہوتا
ہم اور تم بے اسم ہی رہتے
"آج" اگر موجود نہ ہوتا
ممکن ہے "آیندہ" صرف اِک خواب ہو جس کی
تعبیروں میں جینے والی ساری آنکھیں ڈوب چکی ہوں!
(لیکن وہ خود بجھ کر بھی رخشندہ ہو!)

ہو سکتا ہے
"رفتہ" کی دہلیز پہ ٹھہری
بھید بھری اس آنکھ کے اندر

چھپا ہوا آئندہ ہو!
"آئندہ" کے مُنہ پہ پڑی یہ غیب کی چادر
اُٹھ جائے تو ہو سکتا ہے
اس میں ہمارا اور تمھارا
ایک اِک لمحہ زندہ ہو
(روشن اور تابندہ ہو!)
لیکن یہ بھی دھیان میں رکھنا
ہو سکتا ہے آنے والے کل میں ہمارا "آج" نہ ہو
اور اُس کی جگہ
اک ایسے وقت کا سایہ سا رقصندہ ہو، جو
ماضی، حال اور مستقبل کے
تین کناروں والے اس دریا سے یکسر باہر ہو
(اور کہیں سے جنم ہو اس کا — اور کہیں پہ ظاہر ہو!)

ماضی، حال اور مستقبل،
تین کناروں والے اس دریا کے اندر
اپنی اپنی موجیں مارتے چلتے ہیں

پھر اُس لہر میں ڈھلتے ہیں
جو صبحِ ازل کو اچھلی تھی اور اب تک کہیں معلّق ہے !
اُسی معلّق لہر کے بے خود قطرے ہیں ہم ،
ہم اور ہم سے اربوں ، کھربوں
(گزر چکے اور آنے والے)
سو، اے وقت کی حیرت میں کھو جانے والی آنکھ ـــــ ٹھہر

"آج" کے پُل پر رک کر آگے پیچھے دیکھ
روشنی اور تاریکی شاید ایک ہی ڈال کے پتّے ہیں !
لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکہ ہے ،
وقت کی اِس "ناوقتی" کے سیلاب میں ـــــ شاید !
"آج" ہی واحد لمحہ ہے !!
عمرِ رواں کی دہشت میں کھو جانے والی آنکھ ـــــ ٹھہر

○

گزرے ہیں ترے بعد بھی کچھ لوگ اِدھر سے
لیکن تری خوشبو نہ گئی ، راہ گزر سے

کیوں ڈوبتی ، بجھتی ہوئی آنکھوں میں ہے روشن
راتوں کو شکایت ہے تو اتنی ہے سحر سے !

لرزا تھا بدن اُس کا مرے ہاتھ سے چھُو کر
دیکھا تھا مجھے اُس نے عجب مست نظر سے

کیا ٹھان کے نکلا تھا، کہاں آکے پڑا ہے!
پوچھے تو کوئی اس دلِ شرمندہ سفر سے

آیا ہے بہت دیر میں وہ شخص ، پر اُس کو
جذبات کی اِس بھیڑ میں دیکھوں میں کدھر سے

ہم رزقِ گزرگاہ تو خاشاک تھے، لیکن!
وہ لوگ، جو نکلے تھے ہوا دیکھ کے گھر سے!

ایسا تو نہیں، میری طرح سروِ لبِ جُو!
قدموں پہ کھڑا ہو کسی اُفتاد کے ڈر سے

دن تھے کہ ہمیں شہرِ بدن تک کی خبر تھی
اور اب نہیں آگاہ تری خیر خبر سے

امجد نہ قدم روک کہ وہ دُور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گردِ سفر سے

○

دریا کی ہَوا تیز تھی، کشتی تھی پرانی
روکا تو بہت، دل نے مگر ایک نہ مانی

میں بھیگتی آنکھوں سے اُسے کیسے ہٹاؤں
مشکل ہے بہت ابر میں دیوار اُٹھانی

نکلا تھا تجھے ڈھونڈنے اِک ہجر کا تارا
پھر اُس کے تعاقب میں گئی، ساری جوانی

کہنے کو نئی بات کوئی ہو تو سنائیں
سو بار زمانے نے سنی ہے یہ کہانی!

یہ پُل ہے یہاں پھول کہاں، پچھلے برس کے
ہے دن تو وہی دوست، مگر اور ہے پانی

کس طرح مجھے ہوتا گماں، ترکِ وفا کا
آواز میں ٹھہراؤ تھا، لہجے میں روانی

اب میں اُسے قاتل کہوں امجدؔ کہ مسیحا
کیا زخمِ ہنر چھوڑ گیا، اپنی نشانی!

○

تری زد سے نکلنا چاہتا ہے
یہ دریا رُخ بدلنا چاہتا ہے

وہ سپنا، جس کی صورت ہی نہیں ہے
مری آنکھوں میں پلنا چاہتا ہے

دلوں کی ماندگی پہ کیا تعجب!
کہ سُورج بھی تو ڈھلنا چاہتا ہے

نشستِ درد بدلی ہے تو اب دل
ذرا پہلو بدلنا چاہتا ہے

ہُوا ہے بند اور شعلہ وفا کا
بہت ہی تیز جلنا چاہتا ہے

یہ دل اِس گرد بادِ زندگی میں
بس اِک لمحہ سنبھلنا چاہتا ہے

مجھے بھی سامنا ہے کربلا کا
مرا سر بھی اُچھلنا چاہتا ہے

نہیں ہیں ترجمانِ غم، یہ آنسو
یہ پانی اب اُبلنا چاہتا ہے

گزشتہ صحبتوں کا ایک لشکر
مرے ہمراہ چلنا چاہتا ہے

اُن آنکھوں کی ادا کہتی ہے امجد
کوئی پتّھر پگھلنا چاہتا ہے

چھیڑیں گے وہی قصّۂ غم اور طرح سے
لائیں گے تجھے راہ پہ ہم اور طرح سے

سجدے میں جبیں، سینے میں پندارِ خدائی!
اب آئے ہیں کعبے میں صنم اور طرح سے

ہوتا ہے گماں ان پہ کسی دستِ طلب کا
اب کھولے ہیں یاروں نے عَلم اور طرح سے

ہے کام مساواتِ محمّد کو مٹانا
کرتا ہے عرب اور، عجم اور طرح سے

ہم سوچتے رہتے ہیں عطا اور طرح کی
دیتا ہے ترا دستِ کرم اور طرح سے

مرتے تو شہیدانِ محبّت بھی ہیں امجد
جاتے ہیں مگر سوئے عدم اور طرح سے

چہرے پہ مرے زُلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو، برس جاؤ کسی دن

رازوں کی طرح اُترو مرے دل میں کسی شب
دستک پہ مرے ہاتھ کی کُھل جاؤ، کسی دن

پیڑوں کی طرح حُسن کی بارش میں نہاؤں
بادل کی طرح جھوم کے گِھر آؤ کسی دن

خُوشبو کی طرح گزرو مرے دل کی گلی سے
پھُولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن

پھر ہاتھ کو خیرات ملے بندِ قبا کی
پھر لطفِ شبِ وصل کو دوہراؤ کسی دن

گزریں جو مرے گھر سے تو رُک جائیں ستارے
اِس طرح مری رات کو چمکاؤ کسی دن

میں اپنی ہر اک سانس اُسی رات کو دے دُوں
سر رکھ کے مرے سینے پہ سو جاؤ، کسی دن

سپنے کیسے بات کریں

سپنے کیسے بات کریں!
خدشوں کی زنجیر پڑی ہے نیند بھری سب آنکھوں میں
سپنے کیسے بات کریں!
سپنے کس سے بات کریں!
جن لوگوں کا رستہ تکتے عمریں رزقِ خاک ہوئیں
اب وہ لوگ اور اُن کے سپنے دیکھنے والی
آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
راکھ کے اس انبار میں ہوں گے کیسے کیسے زندہ خواب!
خوابوں کی اس راکھ کو لیکن چھیڑے کون؟

جس رستے پر چھاؤں نہ پانی
اُس پر ڈالے ڈیرے کون؟
جس مٹی میں ریت ملی ہو
اُس میں کیسے باغ لگائیں!
دریا ہی پایاب ہو جب تو
اس میں کشتی کیا لے جائیں!

خوشبو ایک آوارہ جھونکا، اس جھونکے کو گھیرے کون!
کیسے دنیا کو بتلاؤں، تم ہوتے ہو میرے کون!!

منظر — پس منظر

کاسہ ہے گدائی کا درویش کا پیالہ بھی
مانگے کی ضیا لے کر یہ چاند ہوا روشن
یہ چاند ہوا روشن اور چاند کا ہالہ بھی

امروز کا پردا ہو، ماضی ہو کہ فردا ہو!
اک بھید انوکھا ہے، اک راز یہ گہرا ہے!
اس برف کی گھاٹی پہ کچھ دیر کو ٹھہرا ہے
خوابوں کا اُجالا بھی، دن رات کا جالا بھی
یہ بجھتا ہوا منظر اور دیکھنے والا بھی!

خواب اور خدشے

جاگتے میں بھی سوتی ہیں،
کچھ آنکھیں ایسی ہوتی ہیں!
بے موسم کلیوں کی صورت ہولے ہولے کھلتی ہیں
دُنیا کی اِس بھیڑ میں یونہی اک لمحے کو مِلتی ہیں،
محفل محفل گھومنے والے
لوگ اکیلے ہو جاتے ہیں
ان آنکھوں کی کھوج میں اکثر
اپنے آپ کو کھو جاتے ہیں
میں نے بھی دیکھی تھیں اک دن
ایسی ہی دو مشکل آنکھیں
ہلکی سبز اور بوجھل آنکھیں
یُوں تو اب تک جتنی گزری خوش چشموں میں گزری ہے
لیکن ایسے گہرے ساگر!
لیکن ایسی ساحل آنکھیں!!

یوں لگتا تھا جیسے میری رُوح میں رستہ بن جائے گا
یا پھر اک بے نام سا پردا ہر منظر پہ تن جائے گا
ساتویں دروازے کی صورت ہستی مجھ پر کھُل جائے گی
یا پھر شمعِ ہجر کی صورت قطرہ قطرہ گھُل جائے گی
یوں لگتا تھا جیسے اب وہ
موڑ بس آنے والا ہے
جس کے بعد اُجالا ہے
(یا پھر باقی عمر کا رستہ اک بے معنی ہالہ ہے!)

اُن آنکھوں کی راہ میں سب یہ
خواب اور خدشے رکھوں گا
اب جو اُن کو دیکھوں گا
اور دیکھ سکا تو پوچھوں گا!

میں اور وہ

میں اُس کو دیکھتا ہوں
پیاس کا مارا ہوا جیسے
بہت ہی فاصلے سے اک کنوئیں کو دیکھتا ہے

میں اُس کو چومتا ہوں
تاش میں ہارا ہوا جیسے
اخیری داؤ کے پتے اُٹھا کر چومتا ہے۔

وہ تو بھری بہار کے دن تھے!

موسموں کے اس ملنے اور جُدا ہونے سے
جانے دل کا کیا رشتہ ہے!
جب اک موسم دوسرے موسم سے ملتا ہے!
جانے کیوں اس دل کے اندر۔ دُور کہیں پر
ایک چھناکا سا ہوتا ہے
جیسے کچھ شیشے کے برتن
اک وحشی آواز کو سُن کر
نم ہاتھوں سے چھُوٹ گئے ہوں
چھوٹے سے دو ریت گھروندے
بنتے بنتے ٹوٹ گئے ہوں

بُجھتی رات کا سنّاٹا کیوں
خوف رگوں میں بھرتا ہے ؟
پت جھڑ کی دہلیز پہ ٹھہرا
لمحہ کس سے ڈرتا ہے ؟

وہ تو پورے چاند کی شب تھی جب اک تارا ٹوٹا تھا !
وہ تو بھری بہار کے دن تھے جب تُو مُجھ سے بچھڑا تھا !

ایک کمرۂ امتحان میں

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
اَن بنے سے لفظوں پر اُنگلیاں گھماتے ہیں
یا سوالنامے کو دیکھتے ہی جاتے ہیں !

ہر طرف کنکھیوں سے بچ بچا کے تکتے ہیں
دوسروں کے پرچوں کو رہنما سمجھتے ہیں ،
شاید اس طرح کوئی ، راستہ ہی مل جائے !
بے نشاں جوابوں کا کچھ پتہ ہی مل جائے !
مجھ کو دیکھتے ہیں تو
یوں جواب کاپی پر ، حاشیے لگاتے ہیں
دائرے بناتے ہیں
جیسے اُن کو پرچے کے سب جواب آتے ہیں

اِس طرح کے منظر میں
امتحان گاہوں میں، دیکھتا ہی رہتا تھا
نقل کرنے والوں کے
نت نئے طریقوں سے
آپ لُطف لیتا تھا، دوستوں سے کہتا تھا

کس طرف سے جانے یہ
آج دل کے آنگن میں اک خیال آیا ہے
سینکڑوں سوالوں سا اک سوال لایا ہے

" وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو تیرے ہاتھوں میں، اک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے!
کس لیے بنایا ہے!
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟

زندگی کے پرچے کے
سب سوال لازم ہیں، سب سوال مشکل ہیں!

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتا ہوں پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
اَن بنے سے لفظوں پر اُنگلیاں گھُماتا ہوں
حاشیے لگاتا ہوں
دائرے بناتا ہوں،
یا سوالنامے کو
دیکھتا ہی جاتا ہوں!

○

کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے
کہیں آنکھیں، کہیں چہرا نہیں ہے

یہاں سے کیوں کوئی بیگانہ گزرے!
یہ میرے خواب ہیں، رستہ نہیں ہے

جہاں پر تھے تری پلکوں کے سائے
وہاں اب کوئی بھی سایا نہیں ہے

زمانہ دیکھتا ہے ہر تماشہ
یہ لڑکا کھیل سے تھکتا نہیں ہے

ہزاروں شہر ہیں ہمراہ اس کے
مسافر دشت میں تنہا نہیں ہے

یہ کیسے خواب سے جاگی ہیں آنکھیں
کسی منظر پہ دل جمتا نہیں ہے

جو دیکھو تو ہر اک جانب، سمندر
مگر پینے کو اک قطرہ نہیں ہے

مثالِ چوبِ نم خوردہ، یہ سینہ
سُلگتا ہے، مگر جلتا نہیں ہے

خُدا کی ہے یہی پہچان، شاید
کہ کوئی اور اُس جیسا نہیں ہے

پھر بھی

دن رات کے آنے جانے میں
دنیا کے عجائب خانے میں
کبھی شیشے دھندلے ہوتے ہیں، کبھی منظر صاف نہیں ہوتے!
کبھی سورج بات نہیں کرتا
کبھی تارے آنکھ بدلتے ہیں
کبھی منزل پیچھے رہتی ہے
کبھی رستے آگے چلتے ہیں
کبھی آسیں توڑ نہیں چڑھتیں
کبھی خدشے پورے ہوتے ہیں
کبھی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں
کبھی خواب ادھورے ہوتے ہیں
یہ سب تو صحیح ہے لیکن اس
آشوب کے منظر نامے میں
(دن رات کے آنے جانے میں
دنیا کے عجائب خانے میں)

کچھ سایہ کرتی آنکھوں کے پیماں تو دکھائی دیتے ہیں!
ہاتھوں سے اگرچہ دُور سہی، امکاں تو دکھائی دیتے ہیں!
ہاں، ریت کے اِس دریا سے اُدھر
اِک پیڑوں والی بستی کے عنواں تو دکھائی دیتے ہیں!
منزل سے کوسوں دُور سہی
پُر درد سہی، رنجور سہی
زخموں سے مسافر چُور سہی
پر کس سے کہیں اے جانِ وفا
کچھ ایسے گھاؤ بھی ہوتے ہیں جنہیں زخمی آپ نہیں دھوتے
اَن روئے ہوئے آنسو کی طرح سینے میں چھپا کر رکھتے ہیں
اور ساری عمر نہیں روتے
نیندیں بھی مہیّا ہوتی ہیں، سپنے بھی دُور نہیں ہوتے
کیوں پھر بھی جاگتے رہتے ہیں! کیوں ساری رات نہیں سوتے!
اب کس سے کہیں اے جانِ وفا
یہ اہلِ وفا
جس آگ میں جلتے رہتے ہیں، کیوں بجھ کر راکھ نہیں ہوتے!

کہاں آ کے رُکنے تھے راستے! کہاں موڑ تھا! اُسے بھول جا
وہ جو مل گیا اُسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اُسے بھول جا

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دلِ بے خبر مری بات سُن، اُسے بھول جا، اُسے بھول جا

میں تو گُم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس، تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی مرے کان میں، میرے ساتھ آ، اُسے بھول جا

کسی آنکھ میں نہیں اشکِ غم، ترے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بُھلا دیا، تو بھی مُسکرا، اُسے بھول جا

کہیں چاکِ جاں کا رفو نہیں، کسی آستیں پہ لہو نہیں
کہ شہیدِ راہِ ملال کا نہیں خوں بہا، اُسے بھول جا

کیوں اَٹا ہوا ہے غبار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
وہ جو درج تھا ترے بخت میں، سو وہ ہو گیا، اُسے بھول جا

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دلِ منتظر تو یہ کس لیے، ترا جاگنا، اُسے بھول جا

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ، اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل، سرِ آئنہ، اُسے بھول جا

جو بساطِ جاں ہی اُلٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اُسے روکنے سے حصول کیا، اُسے مت بُلا، اُسے بھول جا

تو یہ کس لیے شبِ ہجر کے اُسے ہر ستارے میں دیکھنا
وہ فلک کہ جس پہ ملے تھے ہم، کوئی اور تھا، اُسے بھول جا

تجھے چاند بن کے ملا تھا جو، ترے ساحلوں پہ کھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا، سو اُتر گیا، اُسے بھول جا

اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
جس پر تیرا نام لکھا ہے اُس تارے کو ڈھونڈوں گا

تم بھی ہر شب دیا جلا کر پلکوں کی دہلیز پہ رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمھارے شہر کی جانب بھیجوں گا

ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
پانی کی ہر سطر پہ میں کچھ دل کی باتیں لکھّوں گا

جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھیگے تھے
تم بھی اُس کو چھُو کے گزرنا، میں بھی اُس سے لپٹوں گا

"خواب مسافر لمحوں کے ہیں، ساتھ کہاں تک جائیں گے"
تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میں بھی اب کچھ سوچوں گا

بادل اوڑھ کے گزروں گا میں تیرے گھر کے آنگن سے
قوسِ قزح کے سب رنگوں میں تجھ کو بھیگا دیکھوں گا

رات گئے جب چاند ستارے ٹُکن میٹی کھیلیں گے
آدھی نیند کا سپنا بن کر میں بھی تم کو چھُو لوں گا

بے موسم بارش کی صُورت، دیر تلک اور دُور تلک
تیرے دیارِ حُسن پہ میں بھی رِم جھِم رِم جھِم برسوں گا

شرم سے دوہرا ہو جائے گا کان پڑا وہ بُندا بھی
بادِ صبا کے لہجے میں اک بات میں ایسی پُوچھوں گا

صفحہ صفحہ ایک کتابِ حُسن سی کھُلتی جائے گی
اور اُسی کی لَو میں پھر میں تم کو ازبر کر لوں گا

وقت کے اک کنکر نے جس کو عکسوں میں تقسیم کیا
آبِ رواں میں کیسے امجد اب وہ چہرا جوڑوں گا

ہوا سیٹی بجاتی ہے

خزاں کی بالکونی سے
ہوا سیٹی بجاتی ہے
چلو — چلنے کا وقت آیا

درختوں سے ہزاروں خشک پتّے ٹوٹتے ہیں
اور اُس کے ساتھ اُڑتے ہیں
وہ شاید خود نہیں اُڑتے ..... ؟
قضا اُن کو اڑاتی ہے
ہوا سیٹی بجاتی ہے
..... تو یہ اُڑتے ہوئے پتّے
گلستاں کے کسی نامہرباں گوشے میں تھوڑی دیر کو رُکتے ہیں
پیلی گھاس کے اُس اجنبی صحرا کو تکتے ہیں

جو اُن کے — اور اُن کے آشیاں کے، درمیاں پھیلا ہوا ہے
اور جس کی حد نہیں ملتی
خزاں اس اجنبی صحرا کی حدِّ ممکنہ سے
اُن کی جانب دیکھتی ہے
اور اک فاتح کی صورت مسکراتی ہے
ہوا سیٹی بجاتی ہے

ہوا سیٹی بجاتی ہے تو یہ رُکتے ہوئے پتّے
کسی انجان سی دہشت کے ڈر سے کپکپاتے ہیں
لرز کر سر جھکاتے ہیں
گلستاں کے کسی نامہرباں گوشے کی پستی سے ہوا ان کو اُٹھاتی ہے
ہوا ان کو اُٹھا کر شہر کی بے مدّعا سڑکوں پہ لاتی ہے

میں ان پتّوں کو جب شہروں کی سڑکوں پر بکھرتے دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں — !
"ادھورے خواب کی صورت یہ بے کل بے نوا پتّے
جب اُڑتے ہیں تو اپنے دل میں کیا کیا سوچتے ہوں گے ؟

سفر کے زخم کا کچھ تو مداوا سوچتے ہوں گے ؟"

میں اپنے پاؤں سے لپٹا ہوا اک مضطرب پتہ اُٹھاتا ہوں

اور اُس سے پوچھتا ہوں ——— !

مری باتیں وہ سُنتا ہے مگر کچھ بھی نہیں کہتا

بس اک زخمی نگہ سے میری جانب دیکھتا ہے

دُکھ بھرا چہرا اُٹھاتا ہے

اچانک وقت رُکتا ہے ———

میں اُس پتے کے چہرے میں خود اپنا عکس پاتا ہوں

کسی انجان سی دہشت کے ڈر سے کپکپاتا ہوں

مری گردن پہ جیسے چھپکلی سی سرسراتی ہے

فضا میں اجنبی سے درد کا کہرا اُبھرتا ہے

نمی سی پھیل جاتی ہے ۔ ہوا سیٹی بجاتی ہے

خزاں کی بالکونی سے

ہوا سیٹی بجاتی ہے .... !

———

○

بانجھ ارادہ اور کوئی !

جُھوٹا وعدہ اور کوئی !

ہم جیسا کیا دیکھا ہے !

تم نے سادہ اور کوئی

دل میں سارا کھوٹ ہی کھوٹ

تن پہ لبادہ اور کوئی

دیر و حرم تو چھان لیے

دیکھیں جادہ ، اور کوئی

دل میں اب کیوں رہتا ہے!
تم سے زیادہ اور کوئی!

نکلے تھے ہم اپنے گھر سے
کر کے ارادہ اور کوئی

آخر کس اُمّید پہ مانگیں
امجدؔ وعدہ اور کوئی!

قاصد

خوشبو کی پوشاک پہن کر
کون گلی میں آیا ہے!
کیسا یہ پیغام رساں ہے
کیا کیا خبریں لایا ہے!

کھڑکی کھول کے باہر دیکھو،
موسم میرے دل کی باتیں، تم سے کہنے آیا ہے

○

شہد کہیں گے سم کو بھی
جینا تو ہے ہم کو بھی

تجھ بِن جلتے دیکھا ہے
پھولوں کے موسم کو بھی

بازاروں میں لے آئے
لوگ تو دل کے غم کو بھی

مہلت آنکھ جھپکنے کی
منظر کو بھی، ہم کو بھی

صدیوں پیچھے بھاگے گا
ٹھہرا جو اک دم کو بھی

قاصد کر کے دیکھیں گے
اب کے چشمِ نم کو بھی

کون یہ پیاسا گزرا ہے؟
توڑ کے جامِ جم کو بھی

مولا —— تیری دُنیا میں
چین ملے گا ہم کو بھی!

امجد اُونچا رکھیں گے
جلتے ہوئے پرچم کو بھی

وہ جو اُوپر ہے بیٹھا ہُوا ، اور ہے
میری بستی کا شاید خدا اور ہے

وصل کی شب تو چمکے تھے تارے بہت
ہجر کی شام کا سلسلہ اور ہے

شہر میں جو اُڑی وہ خبر ، اور تھی
جس سے گزرے تھے ہم ، واقعہ اور ہے

کر رہا ہوں مسلسل سفر کس لیے؟
اُس کی بستی کا تو راستہ اور ہے

خود کو لگتے ہیں کیوں ، اجنبی ، اجنبی!
عکس بدلا ہے یا آئنہ اور ہے

ماند پڑتے ہوئے منظروں کی قسم!
واپسی کے سفر کا مزا اور ہے

دردمندِ وفا ، کس طرح سے رُکے!
اس نگر کی تو آب و ہوا اور ہے

اپنے تاروں سے کہنا ، چمکتے رہیں!
میری آنکھوں میں اِک رتجگا اور ہے

اب تو ہے راکھ کی ایک مٹھی ، یہ دل
جو ہَوا سے لڑا تھا دِیا اور ہے!

صدائے آشنا

تری آہٹ
سُلگتی دوپہر کو ایک پل میں شام کرتی ہے
اُترتی ہے سوادِ ہجر میں کچھ اس طرح جیسے
صدائے آشنا کوئی
گھنے، گہرے، اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں
رُخِ منزل دکھاتی
روشنی کا کام کرتی ہے!

○

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، فرصت کتنی ہے؟
پھر بھی تیرے دیوانوں کی شہرت کتنی ہے!

سُورج گھر سے نکل چکا تھا کرنیں تیز کیے
شبنم گُل سے پُوچھ رہی تھی "مہلت کتنی ہے"!

بے مقصد سب لوگ مسلسل بولتے رہتے ہیں
شہر میں دیکھو سنّاٹے کی، دہشت کتنی ہے!

لفظ تو سب کے اک جیسے ہیں، کیسے بات کھلے؟
دُنیا داری کتنی ہے اور چاہت کتنی ہے!

سپنے بیچنے آ تو گئے ہو، لیکن دیکھ تو لو
دُنیا کے بازار میں ان کی قیمت کتنی ہے!

دیکھ غزالِ رم خوردہ کی پھیلی آنکھوں میں
ہم کیسے بتلائیں دل میں وحشت کتنی ہے!

ایک ادھورا وعدہ اُس کا، ایک شکستہ دل،
لُٹ بھی گئی تو شہرِ وفا کی دولت کتنی ہے!

میں ساحل ہوں امجدؔ اور وہ دریا جیسا ہے
کتنی دُوری ہے دونوں میں، قربت کتنی ہے!

شمعِ غزل کی لَو بن جائے، ایسا مصرعہ ہو تو کہو
اِک اِک حرف میں سوچ کی خوشبو، دل کا اُجالا ہو تو کہو

رازِ محبت کہنے والے لوگ تو لاکھوں ملتے ہیں
رازِ محبت رکھنے والا، ہم سا دیکھا ہو تو کہو

کون گواہی دے گا اُٹھ کر جھوٹوں کی اس بستی میں
سچ کی قیمت دے سکنے کا تم میں یارا ہو تو کہو!

ویسے تو ہر شخص کے دل میں ایک کہانی ہوتی ہے
ہجر کا لاوا، غم کا سلیقہ، درد کا لہجہ ہو تو کہو

امجدؔ صاحب آپ نے بھی تو دُنیا گھوم کے دیکھی ہے
ایسی آنکھیں ہیں تو بتاؤ! ایسا چہرا ہو تو کہو

ابھی تو

ابھی تو رُت بدلنی تھی ابھی تو پھول کھلنے تھے
ابھی تو رات ڈھلنی تھی ابھی تو زخم سِلنے تھے

ابھی تو سرِ زمینِ جاں پہ اک بادل کو گھرنا تھا
ابھی تو وصل کی بارش میں ننگے پاؤں پھرنا تھا

ابھی تو کشتِ غم میں اِک خوشی کا خواب بونا تھا
ابھی تو سینکڑوں سوچی ہوئی باتوں کو ہونا تھا

ابھی تو ساحلوں پر اک ہوائے شاد چلنی تھی
ابھی جو چل رہی ہے، یہ تو کچھ دن بعد چلنی تھی!

○

حضورِ یار میں حرفِ التجا کے رکھے تھے
چراغ سامنے جیسے ہوا کے رکھے تھے

بس ایک اشکِ ندامت نے صاف کر ڈالے
وہ سب حساب جو ہم نے اُٹھا کے رکھے تھے

سمومِ وقت نے لہجے کو زخم زخم کیا
وگرنہ ہم نے قرینے صبا کے رکھے تھے

تمھی نے پاؤں نہ رکھا وگرنہ وصل کی شب
زمیں پہ ہم نے ستارے بچھا کے رکھے تھے

بکھر رہے تھے سو ہم نے اُٹھا لیے ، خود ہی
گلاب جو تری خاطر سجا کے رکھے تھے

ہَوا کے پہلے ہی جھونکے سے ہار مان گئے
وہی چراغ جو ہم نے بچا کے رکھے تھے

مٹا سکی نہ انھیں روز و شب کی بارش بھی
دلوں پہ نقش جو رنگِ حنا کے رکھے تھے

حصولِ منزلِ دُنیا کچھ ایسا کام نہ تھا
مگر جو راہ میں پتھر اَنا کے رکھے تھے

وقت بھی کتنا ظالم ہے

اتنے برس کی دُوری اور مہجوری کے
افسونِ سفر میں لپٹا ہوا
اِک شخص اچانک آن ملا
میں اُس کو دیکھ کے ششدر تھا
وہ مجھ سے سوا حیران ملا

یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے!
اس ہجر میں کیا کیا روئے تھے ہم
اِس یاد میں کیا کیا کھوئے تھے ہم!

کچھ دیر تو دونوں چپ سے رہے ،
پھر اُس نے کہا —— "تم کیسے ہو ؟"
پھر میں نے کہا —— "بس اچھا ہوں"

پھر اُس نے کہا ،
" یہ اتنے دنوں کے بعد کا ملنا خوب رہا .... !
کوئی پرانا دوست ملے تو دل کو بھلا سا لگتا ہے ....
یہ شہر تو بالکل بدل گیا .... اب چلتی ہوں ! "

پھر میں نے کہا ،
" میں شام سمے ہر روز یہاں پر آتا ہوں ...
جب وقت ملے تم آ جانا ...
اس وقت مجھے بھی جلدی ہے .... اب چلتا ہوں ! "

یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے !!!

دُوسری ملاقات

ہجر کی پہلی شام سے اب تک
جتنی شامیں گزری تھیں !
اُن کی پتھر چُپ میں، میں نے
(اُس کے سامنے کرنے والی)
کیا کیا باتیں سوچی تھیں !

" باتیں، گزرے برسوں کی جو ہم نے الگ سے کاٹے ہیں
غموں کی اور اُن خوشیوں کی ہم جن سے ہو کر گزرے ہیں
جیتوں اور اُن ماتوں کی جو عُمرِ رواں کا رزق ہوئیں
آسوں اور اُمنگوں کی جو دشتِ گماں کا رزق ہوئیں"

کیسے کیسے بھٹکے آہو، صحرائے امکاں میں آئے
شمع طلب کے کیسے کیسے روشن پہلو دھیان میں آئے
ڈھلتی رات کا جادو ہوگا!
لمحہ لمحہ خوشبو ہوگا!
پھول اور تتلی یکجا ہونگے!
رنگ ہوا سے پیدا ہونگے!

ایک ہی وصل کی بارش سے وہ سارے شکوے دھو دے گا
یعنی میرے ساتھ لپٹ کر، کچھ نہ کہے گا، رو دے گا

ارمانوں کا پھول اچانک کھل ہی گیا
جس کے غم میں آنکھ برستی رہتی تھی
آج مجھے وہ مل ہی گیا
جس کو میری پیاس ترستی رہتی تھی
وہ ایک چھلکتا جام مرے ہمراہ رہا
آج وہ ساری شام مرے ہمراہ رہا

لیکن اب وہ اور تھا کوئی، اور تھا اُس کا رُوپ نگر
اوس رُکی تھی آنکھوں میں تو راکھ جمی تھی بالوں پر
اور کوئی تھی دُنیا اُس کی، اور تھے اُس کے شام و سحر
(میری حیرت لکھی ہوئی تھی شاید میرے چہرے پر!!)

اُس نے کہا "تم مجھے نہ دیکھو، آبِ روانِ وقت سے پُوچھو
جیون کے اس پُل نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہے!
مجھ میں جو اِک شخص تھا زندہ، وہ تو کب کا بکھر چکا ہے
میں تو فقط رستہ ہوں اُس کا، دریا جو تھا اُتر چکا ہے

آؤ چلو اب اپنی اپنی دنیا کو ہم لوٹ چلیں
حدِ ابد تک اس رستے میں بکھرے ہیں غم، لوٹ چلیں!"

پلٹے ہم تو ہم دونوں کے ساتھ زمانہ پلٹ گیا
اَن دیکھی تعبیر لیے اک خواب پرانا پلٹ گیا

چاروں جانب بکھر رہی تھی
ایک ادھوری تنہائی ،
ہوا نے رُک کر ہم دونوں کو
مُڑتے دیکھا تو گھبرائی
پت جھڑ کی دہلیز پہ اُس نے
پیڑ سے کچھ سرگوشی کی
اِس کے بعد اُس راہ گزر پہ
دُور تلک خاموشی تھی

آسمان پر بادل تھا اور اُس میں تارے سمٹے تھے
ہم دونوں کے قدموں سے کچھ سوکھے پتّے لپٹے تھے!!

○

آگ لگی تھی سینہ سینہ، ہر شعلہ جوالا تھا
اب کے شہر میں روشنیوں کا منظر دیکھنے والا تھا

دروازوں پر پڑے ہوئے تھے ڈھیر شکستہ خوابوں کے
دالانوں میں نفرت کے آسیب نے ڈیرا ڈالا تھا

گلیوں گلیوں بھٹک رہا تھا ایک سنہرا خواب، جسے
میرے بڑوں نے اپنی لاکھوں نیندیں بیچ کے پالا تھا

اپنی اپنی کشتی لے کر یوں دریا میں کُود پڑے
جیسے صرف جہاز ہی اس طوفان میں ڈوبنے والا تھا

امجد یہ تقدیر تھی اُس کی یا قدرت کا کھیل ؟
گرا جہاں پہ رات کا پنچھی، تھوڑی دُور اُجالا تھا

تیرے دھیان کی تیز ہوا

پت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرا پتّوں کی صُورت
ہم کو ساتھ لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہوا!

بھیڑ میں اِک اجنبی کا سامنا اچھا لگا
سب سے چُھپ کر وہ کسی کا دیکھنا اچھا لگا

سُرمئی آنکھوں کے نیچے پھول سے کھلنے لگے
کہتے کہتے کچھ کسی کا سوچنا اچھا لگا

بات تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کا ایک دم
ہاتھ کو ہونٹوں پہ رکھ کر روکنا اچھا لگا

چائے میں چینی ملانا اُس گھڑی بھایا بہت
زیرِ لب وہ مسکراتا "شکریہ" اچھا لگا

دل میں کتنے عہد باندھے تھے بھلانے کے اُسے
وہ ملا تو سب ارادے توڑنا اچھا لگا

بے ارادہ لمس کی وہ سنسنی پیاری لگی
کم توجہ آنکھ کا وہ دیکھنا اچھا لگا!

نیم شب کی خامشی میں بھیگتی سڑکوں پہ کل
تیری یادوں کے جلو میں گھومنا اچھا لگا

اُس عدوئے جاں کو امجد میں برا کیسے کہوں
جب بھی آیا سامنے وہ بے وفا اچھا لگا

جنگلی پھولوں کے لیے۔ ایک نظم

خوش نما لڑکیو
خوش ادا لڑکیو
تم جو ہنستی ہوئی کھلکھلاتی ہوئی
خوشبوؤں کی طرح رقص کرتی ہوئی
کہکشاں کی طرح جگمگاتی ہوئی
راہ چلتی ہو تو
ایسے لگتا ہے جیسے
زمیں پر دھنک سی اُتر آئی ہو

اپنے بے باک سے قہقہوں کے ترنّم میں گُم جس گھڑی
تم سروں کو جھٹک کر
گھٹاؤں سی زُلفوں کو
چہروں کے جادو گھروں سے ہٹاتی ہو تو
ایسے لگتا ہے جیسے
اچانک فضا میں بہار آگئی ہو!

دُکھوں کا وہ صحرا
جو چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا
سمٹ سا گیا ہے،
مجھے یہ پتہ ہے!
ابھی تم جو اس رہگزر سے
مری سمت دیکھے بِنا
اپنی عمروں کی شبنم میں بھیگی ہوئی
خوشبوؤں کی طرح سے گزر جاؤ گی
تو یہ جادو بھی نابُود ہو جائے گا۔

مگر لڑکیو،

خوش نما، خوش ادا، بے خبر لڑکیو
میں تمھارے لیے اپنے دل کی تہوں سے
دُعا مانگتا ہوں
تم یونہی خوش رہو، مسکراتی رہو
ہر خوشی کا وہ پَل
جو تمھارے وسیلے مرے دل پہ نازل ہُوا ہے
تمھارے شب و روز پر اس طرح پھیل جائے
کہ تم اس کی خوشبو سے مہکی رہو

اور دن ڈوب جائے

○

ایک آزار ہوئی جاتی ہے شہرت ہم کو
خُود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت ہم کو

روشنی کا یہ مسافر ہے، رہِ جاں کا نہیں!
اپنے سائے سے بھی ہونے لگی وحشت ہم کو

آنکھ اب کس سے تحیّر کا تماشہ مانگے!
اپنے ہونے پہ بھی ہوتی نہیں حیرت ہم کو!

اب کے اُمید کے شعلے سے بھی آنکھیں نہ جلیں
جانے کس موڑ پہ لے آئی محبت ہم کو

کون سی رُت ہے زمانے میں؟ ہمیں کیا معلوم
اپنے دامن میں لیے پھرتی ہے حسرت ہم کو

زخم یہ وصل کے مرہم سے بھی شاید نہ بھرے
ہجر میں ایسی ملی اب کے مسافت ہم کو

داغِ عصیاں تو کسی طور نہ چھپتے امجد
ڈھانپ لیتی نہ اگر چادرِ رحمت ہم کو

لوگ محبّت کرنے والے

چپکے چپکے جل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

پُروا سنگ نکل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

آنکھوں آنکھوں چل پڑتے ہیں تاروں کی قندیل لیے

چاند کے ساتھ ہی ڈھل جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

دل میں پھول کھلا دیتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
آگ میں راگ جگا دیتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
پانی بیچ بتاشہ صورت خود تو گھلتے رہتے ہیں
سم کو شہد بنا دیتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

خواب خوشی کے بو جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
زخم دلوں کے دھو جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!
تتلی تتلی لہراتے ہیں پھولوں کی اُمّید لیے
اک دن خوشبو ہو جاتے ہیں
لوگ محبّت کرنے والے!

بن جاتے ہیں نقش وفا کا
لوگ محبّت کرنے والے!

جھونکا ہیں بے چین ہوا کا
لوگ محبّت کرنے والے!

جلی ہوئی دھرتی پہ جیسے بادل گھر کر آئیں
بستی پر ہیں فضل خدا کا
لوگ محبّت کرنے والے!

○

شہر اُجڑا ہو تو آباد کروں!
جو نہ بھُولے اُسے کیا یاد کروں!

ساری چیزیں ہی بدل کر رہ جائیں
اک ہُنر ایسا بھی ایجاد کروں

میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو ترے بعد کروں

بھیک لعنت ہے! ملے یا نہ ملے
کیوں میں رسوائیِ فریاد کروں

کوئی اُس آنکھ پہ شاید اُترے!
روز اک خواب کو آزاد کروں

یہ تو ہے کھیل کا حصّہ امجد
کس لیے شکوۂ بیداد کروں

درد کے رشتے عجب ہیں

درد کے رشتے عجب ہیں
کوئی اِن کی حد نہیں
کوئی ان کی تھاہ نہیں ہے
اور کوئی سرحد نہیں

"یہ "زماں" اور یہ "مکاں"
یہ قربتیں، یہ دُوریاں!
دُور تک بچھتی زمیں اور اُس پہ پھیلا آسماں!"
درد کے رشتوں کے آگے ان کی ساری وسعتیں
ریت کے اک بے ٹھکانہ ذرّے سے زیادہ نہیں

اس گھڑی چاروں طرف اِک ہجر کا آشوب ہے
میرے تیرے درمیاں اک خواب سینہ کوب ہے!

پھر بھی اے جانِ سخن!
جس طرح اہلِ سخن کی گفتگو
کتنی صدیوں کی مسافت ایک پل میں کاٹتی ہے
تیری میری خواہشوں میں، اپنے دُکھ سُکھ بانٹتی ہے
اور جیسے
اجنبی سی کہکشاں سے ڈولتے تارے کی ضَو
روشنی رفتار سے چلتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے
اور جیسے کچھ پرندے
موسموں کے ساتھ اُڑتے
اپنی اپنی منزلوں کے راستوں پر
مستقل پرواز کرتے ہیں
کبھی کی منتظر اور مضطرب شاخوں کی
سیجوں پر اُترتے ہیں

ہمارے خواب بھی (ان کی طرح)
اِک دن ہمارے "ہست"، کی شاخوں پہ اُتریں گے
دھنک کے رنگ ان بھیگی ہوئی آنکھوں پہ اُتریں گے
کہ رشتے درد کے،

منزل بھی ہیں قطبی ستارا بھی !
ہمارے خواب کی تجسیم بھی ہیں
استعارا بھی !

جو اُتر کے زینۂ شام سے، تری چشمِ خوش میں سما گئے
وہی جلتے بجھتے چراغ سے، مرے بام و در کو سجا گئے

یہ عجیب کھیل ہے پیار کا، مَیں نے آپ دیکھا یہ معجزہ
وہ جو لفظ میرے گماں میں تھے، وہ تری زبان پہ آ گئے

وہ جو گیت تم نے سُنا نہیں، مری عمر بھر کا ریاض تھا
مرے درد کی تھی وہ داستاں، جسے تم ہنسی میں اُڑا گئے

وہ چراغِ جاں کبھی جس کی لَو، نہ کسی ہوا سے نگوں ہوئی
تری بے وفائی کے وسوسے، اُسے چُپکے چُپکے بجھا گئے

وہ تھا چاند شامِ وصال کا، کہ تھا رُوپ تیرے جمال کا
مری رُوح سے مری آنکھ تک، کسی روشنی میں نہا گئے

یہ جو بندگانِ نیاز ہیں، یہ تمام ہیں وہی لشکری!
جنھیں زندگی نے اماں نہ دی، تو ترے حضور میں آ گئے

تری بے رُخی کے دیار میں، میں ہوا کے ساتھ ہوا ہُوا
ترے آئینے کی تلاش میں، مرے خواب چہرا گنوا گئے

ترے وسوسوں کے فشار میں، ترا شہرِ رنگ اُجڑ گیا
مری خواہشوں کے غبار میں، مرے ماہ و سالِ وفا گئے

وہ عجیب پھول سے لفظ تھے، ترے ہونٹ جن سے مہک اُٹھے
مرے دشتِ خواب میں دُور تک کوئی باغ جیسے لگا گئے

مری عمر سے نہ سمٹ سکے، مرے دل میں اتنے سوال تھے
ترے پاس جتنے جواب تھے، تری اِک نگاہ میں آ گئے

○

شکستہ لاکھ ہو نیّا کسی کی
نہیں سُنتا مگر دریا کسی کی

ضروری کیوں ہے زخمِ بے وفائی
گزرتی کیوں نہیں، تنہا کسی کی

کسی کے ساتھ سایا تک نہیں ہے
کسی کے ساتھ ہے دُنیا کسی کی

میں آنکھوں میں سجائے پھر رہا ہوں
نشانی ہے مرا صحرا کسی کی

پرانے میلگجے کپڑوں میں امجد
بڑھی کچھ اور بھی شوبھا کسی کی

ہر موسم کا سپنا

موسم موسم آنکھوں کو اِک سپنا یاد رہا
صدیاں جس میں سمٹ گئیں وہ لمحہ یاد رہا
قوسِ قزح کے رنگ تھے ساتوں اُسکے لہجے میں
ساری محفل بھول گئی ، وہ چہرا یاد رہا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

www.KitaabPoint.Blogspot.com

امجد اسلام امجد

www.KitaabPoint.Blogspot.com

حمد

سب ناموں کا مالک سب کے دکھ کا چارا ہے
ہر بستی پر روشن جو بے نام ستارا ہے

ریگ رواں کی وحشت میں بھی ایک نشانی ہے
دریا کے سناٹے میں بھی ایک اشارہ ہے

حد ازل سے حد ابد تک اس تاریکی میں
بام تمہارا روشن تھا یا نام تمہارا ہے

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں کتنا بے مایہ
بڑے خسارے میں ہوں بیشک' بڑا خسارا ہے

ہر رستے کی منزل ہے وہ' ہر منزل کی رہ
اس تاریک خلا میں کیسا عجب ستارا ہے

اے آنکھیں اور آنکھوں کو یہ نیندیں دینے والے
میں نے ہر اک خواب میں چھپ کر تجھے پکارا ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تاروں کی پوشاک پہن کر رات سجانے والے
سورج تیرے حسن ازل کا ایک اشارا ہے

اے حرفوں اور آوازوں کو شکلیں دینے والے
تیرے حرفوں آوازوں نے تجھے پکارا ہے

کیسے بندے ہیں وہ امجد جو یہ سوچتے ہیں
مولاؐ سب دنیا کا نہیں ہے صرف ہمارا ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

نعت

ان کے دامن کی بات کی جائے
کوئی شکل نجات کی جائے

آپ کے سایہ عطا میں بسر
زندگی کی یہ رات کی جائے

آپ کے لطف و اعتنا کی نظر
رہبر شش جہات کی جائے

آرزو کی زبان میں لکھ کر
آپ کی بات بات کی جائے

آپ کے اسم سے عبارت ہو
جو بھی سعی ثبات کی جائے

آپ کے دم سے صبح جاری ہو
آپ کے غم سے رات کی جائے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کر کے دھڑکن کا آئنہ روشن
کملی والے کی بات کی جائے

منہ میں جب تک زبان ہے باقی
آپ ہی کی صفات کی جائے

ذکر احمد کی ایک اک ساعت
حاصل کائنات کی جائے

آپ سے آ گہی کی شرط ہے یہ
پہلے تسخیر ذات کی جائے

سائے جس سمت بھی بڑھیں امجد
روشنی ساتھ ساتھ کی جائے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

دعا

مولا۔۔۔۔۔۔۔اس بستی کی آنکھیں کب تک سپنے دیکھیں

ایسا بھی اک سورج، جس میں، چہرے اپنے دیکھیں

رت آئے رت جائے مولا، خالی اپنے ہاتھ

ہر موسم میں پچھلی رت کے زخم چلے ہیں ساتھ

ان زخموں کی خوشبو میں ہیں جینے کے ارمان

آٹھ کروڑ انسان

اس بستی کی خاک ہمارے ہونے کی پہچان

جینے کا سامان

تیرے عرشوں سے اب ہم پر ہن برسے یا کال

مولا ہم بے نام پرندے کیسے چھوڑیں ڈال

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہم ایسے مرگ طلب بھی نہ تھے محبت میں

ہم ایسے مرگ طلب بھی نہ تھے محبت میں
کہ جلتی آگ کے دریا میں بے خطر جاتے
(یقین جان' مری جاں کہ ہم ٹھہر جاتے
تمہاری آنکھ کے آنسو تھے' سیل' آب نہ تھا
چھلک بھی جاتے اگر' رزق خاک ہو جاتے
مثال قطرہ شبنم' چمکتے' کھو جاتے)
رہا وہ حرف وفا جس کی سبز کونپل پر
تمہارے بوسہ لب سے گلاب جاگے ہیں
(سو وہ گلاب تو کونپل سے کٹ بھی سکتے ہیں)
رہے وہ خواب جو آنکھوں کے آبگینوں میں
دھنک کے رنگ لئے ڈولتے سے رہتے ہیں
(سو ایسے خواب تو آ کر پلٹ بھی سکتے ہیں)

سو بات حرف وفا کی ہے اور نہ خوابوں کی
نہ ڈولتے ہوئے رنگوں سے پر گلابوں کی
سے کے چڑھتے اترتے ہوئے سمندر میں
سب ایک پل کی حقیقت
سب ایک پل کا سراب

www.KitaabPoint.Blogspot.com

دلوں میں ترک تمنا کا حوصلہ ہو اگر

تو کیسا حرف وفا

اور کہاں کے خواب و گلاب

یہ کیسے دشت ندامت میں گھر گئے اے جاں

کہ اک تو ترک تمنا کا حوصلہ بھی نہیں

اور اس پہ یہ بھی قیامت

اگر۔۔۔ بفرض محال

تمہاری راہ سے پھرنے کا حوصلہ بھی ملے

پلٹ کے جائیں کہاں، گھر کا راستہ بھی ملے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

غبار دشت طلب میں ہیں

غبار دشت طلب میں ہیں رفتگاں کیا کیا
چمک رہے ہیں اندھیرے میں استخواں کیا کیا

دکھا کے ہم کو ہمارا ہی قاش قاش بدن
دلاسے دیتے ہیں دیکھو تو قاتلاں کیا کیا

گھٹی دلوں کی محبت تو شہر بڑھنے لگا
مٹے جو گھر تو ہویدار ہوئے مکاں کیا کیا

پلٹ کے دیکھا تو اپنے نشان پا بھی نہ تھے
ہمارے ساتھ سفر میں تھے ہمرہاں کیا کیا

ہلاک نالہ شبنمؔ ذرا نظر تو اٹھا
نمود کرتے ہیں عالم میں گل رخاں کیا کیا

کہیں ہے چاند سوالی کہیں گدا خورشید
تمہارے در پر کھڑے ہیں یہ سائلاں کیا کیا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بچھڑ کے تجھ سے نہ جی پائے مختصر یہ ہے
اس ایک بات سے نکلی ہے داستاں کیا کیا

ہے پر سکون سمندر مگر سنو تو سہی
لب خموش سے کہتے ہیں بادباں کیا کیا

کسی کا رخت مسافت تمام دھوپ ہی دھوپ
کسی کے سر پہ کشیدہ ہیں سائباں کیا کیا

نکل ہی جائے گی اک دن مدار سے یہ زمیں
اگرچہ پہرے پہ بیٹھے ہیں آسماں کیا کیا

فنا کی چال کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی
بساط دہر سے اٹھے حساب داں کیا کیا

کسے خبر ہے کہ امجد بہار آنے تک
خزاں نے چاٹ لیئے ہوں گے گلستاں کیا کیا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہری بھری اک شاخ بدن پر

ہری بھری اک شاخ بدن پر
میرے لبوں کے لمس سے پھوٹے
ایسے ایسے پھول
سادہ سے ملبوس میں بھی وہ ساتوں رنگ کھلاتی ہے
اپنے حسن کی تیز مہک سے
لوگوں کے انبوہ میں بیٹھی یوں گھبرا سی جاتی ہے
جیسے باتیں کرتے کوئی
جاتا ہے کچھ بھول
میرے لبوں کے لمس سے پھوٹے
ہری بھری اک شاخ بدن پر
کیسے کیسے پھول

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں

جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں

جب دل کا جوالا سرد پڑا

جب شام وسحر کے صحرا میں

خوابوں کے ستارے ریت ہوئے

جب عمر رواں کے میداں میں

سب زندہ جذبے کھیت ہوئے

اس وقت مجھے محسوس ہوا

''وہ عشق میں ساری عمر کٹی شاید وہ نظر کا دھوکا تھا

کرنوں سے کسی کے لہجے میں تنویر تھی میری اپنی ہی

شب تاب بدن کے جادو میں خود میرے لہو کا نشہ تھا''

کل رات مگر جب کھڑکی پر

مہتاب نے آکر دستک دی

خوشبو کی طرح لہرانے لگی

ہر سمت کوئی سرگوشی سی

''جب آنکھیں بجھنے لگتی ہوں' جب دل کا جوالا سرد پڑے

اس وقت کسی کو کیا معلوم' کون اپنا کون پرایا تھا

لہجے میں نشہ تھا کس کے سبب اور کس نے کسے مہکایا تھا!''

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

پسپا ہوئی سپاہ تو پرچم بھی

پسپا ہوئی سپاہ تو پرچم بھی ہم ہی تھے
حیرت کی بات یہ ہے کہ برہم بھی ہم ہی تھے

گرنے لگے جو سوکھ کے پتے تو یہ کھلا
گلشن تھے ہم جو آپ تو موسم بھی ہم ہی تھے

ہم ہی تھے تیرے وصل سے محروم عمر بھر
لیکن ترے جمال کے محرم بھی ہم ہی تھے

منزل کی بے رخی کے گلہ مند تھے ہمیں
ہر راستے میں سنگ مجسم بھی ہم ہی تھے

اپنی ہی آستیں میں تھا خنجر چھپا ہوا
امجد ہر ایک زخم کا مرہم بھی ہم ہی تھے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

مشورہ

لذیذ ہو تو حکایت دراز تر بھی کروں
زوال کی ہے شکایت سو اس زمانے میں
ہے کون جو اسی دولت سے بہرہ مند نہیں
وہاں خشک سے تلخی ملے گی، قند نہیں

تو آؤ آج سے یہ رسم گفتگو چھوڑیں
عنان وقت کو تھامیں خود اپنے ہاتھوں میں
بہت نہیں تو ذرا سا ہی اس کا رخ موڑیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

گلیڈی ایٹرز

ہم اپنے قتل ہونے کا تماشا دیکھتے ہیں
تو اپنی تیز ہوتی سانس کے کانوں میں کہتے ہیں
''ابھی جو ریت پر لاشہ گرا تھا
میں نہیں تھا
میں تو زندہ ہوں۔۔۔یہاں
دیکھو
میری آنکھیں' مرا چہرہ' مرے بازو
سبھی کچھ تو سلامت ہے!''

ابھی کل ہی کا قصہ ہے
سر مقتل ہمارے دست و بازو کٹ رہے تھے
پہ ہم اپنے گھروں میں مطمئن بیٹھے ہوئے
ٹی وی کے قومی نشریاتی رابطے پر
سارے منظر دیکھتے تھے
اور یہ کہتے تھے
''نہیں یہ ہم نہیں ہیں''
ہماری آستیں پر خون کے دھبے ابھی تازہ ہیں
سوکھے بھی نہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

خوابِ سراب

اب جو سوچیں بھی تو خوف آتا ہے
کس قدر خواب تھے جو خواب رہے
کس قدر نقش تھے جو نقشِ سراب رہے
کس قدر لوگ تھے جو
دل کی دہلیز پہ دستک کی طرح رہتے تھے
اور نایاب رہے
کس قدر رنگ تھے جو
بندگلیوں کے خم و پیچ میں چکراتے رہے
اپنے ہونے کی تب و تاب میں لہراتے رہے
پر کبھی آپ سے باہر نہ ہوئے
پھول کے ہاتھ پہ ظاہر نہ ہوئے
دل کے گرداب میں ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح
ہم تنِ رقص رہے
خون کے سرخ میں بے نام ستاروں کی طرح
عکس در عکس رہے
کیسے آدرش تھے جن کے سائے
سنسناتے ہوئے تیروں کی طرح چلتے تھے
ہست اور نیست کے مابین عجب رشتہ تھا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

روح کی آگ بھڑکتی تو بدن جلتے تھے
وہ شب و روز تھے کیا
جب کسی خواہش بیدار کی طغیانی میں
وقت کی قید سے لمحات نکل جاتے تھے
خون میں جب بھی سلگتا تھا ارادہ کوئی
آہنی طوق تمازت سے پگھل جاتے تھے

آنکھ کے دشت میں اب لاکھ الاؤ دہکیں
روح کی برف پگھلتی ہی نہیں
اب وہ آدرش کبھی

وقت کی اوٹ سے جھانکیں بھی تو یوں جھانکتے ہیں
جس طرح ٹوٹتا تارا کوئی
ایک لمحے کے لئے کوند کے چھپ جاتا ہے
کس قدر خواب تھے جو خواب رہے
اب جو سوچیں بھی تو خوف آتا ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس رات آسمان پہ تارے تھے اس قدر

اس رات آسماں پہ تارے تھے اس قدر
دشوار ہو رہا تھا سفر ماہتاب کا
آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے پار
انگڑائی لے کے پھیل رہا تھا چہار سو
اک بے کنار ہجر کا دشت، چمن نما
اٹکی ہوئی تھی نخلِ تمنا کی شاخ پر
فصلِ پریدہ رنگ کی مسلی ہوئی قبا
اک اجنبی دعا
کھلنے لگے تھے دستِ ہوا پر خزاں کے پھول
(جاتی ہوئی بہار کے ٹوٹے ہوئے اصول)
چہرہ ازل کی آگ تھا آنکھیں ابد کی دھول

اس رات ٹوٹتے ہوئے تاروں کی گونج میں
ہم کتنی دیر چلتے رہے، کچھ پتہ نہیں
کب تک ہم اپنے ان کہے لفظوں کی کرچیاں
فرشِ ہوا سے چنتے رہے، کچھ پتہ نہیں

شبنم کے ساتھ ساتھ جو چمکے تمام شب

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تارے تھے وہ کہ عکس مرے آنسوؤں کے تھے
کیوں قربتوں کے شور میں گھٹنے لگا تھا دم
قسمت کے تھے کہ حلقے ترے بازوؤں کے تھے
کچھ پتہ نہیں

گرد اس قدر ہے آئنہ ماہ و سال پر
خوابوں کے عکس اپنے خد و خال کھو گئے
آنکھوں کے رنگ لے گئی تاروں کی روشنی
چہروں کے نقش ریت کی تحریر ہو گئے
تکتے تھے دل کی سمت جو قرنوں کی اوٹ سے
بے نام خواہشوں کے وہ موسم بدل گئے
سورج غروب ہو گئے' مہتاب ڈھل گئے
اس بے کنار ہجر کا دشت چمن نما
تمثال وشت کرب و بلا بن چکا ہے اب
طائر شہید ہو چکے' اشجار جل گئے
یہ سچ ہے لوح وقت پہ تحریر موج رنگ
نقش و نگار آب کی صورت ہے برق پا
اک بار پل تلے سے جو پانی گزر گیا
سمجھو کہ مر گیا
ساحل کا جھاگ ہو کے مٹے یا کہ رزق ابر
آتا نہیں پلٹ کے کبھی' جو گیا۔۔۔گیا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

لیکن یہ کیا کہ آج بھی جس رات ماہتاب
تاروں کے بے کنار میں رستہ نہ پا سکے
آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے پار
ملتی ہیں اس طرح سے زمانوں کی سرحدیں
چلتا نہیں پتہ
ہم پیچھے رہ گئے ہیں کہ آگے نکل گئے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

رو برو

اپنے خوبوں کی دہلیز پر مضمحل
کب سے بیٹھے ہیں عشاق
ژولیدہ مو اور پژمردہ دل
رسم بخیہ گری
شہر کم رزق میں اس طرح سے بڑھی
بھوک کے زخم بھی سلک ایمان سے لوگ سینے لگے
سلک ایمان کھنچ کھنچ کے تنتا گیا
اس قدر تن گیا
ہر گھڑی دل میں رہتا ہے یہ وسوسہ
یہ اگر ٹوٹ کے
وقت کے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے چھوٹ کے
بھوک کے اس جہنم کے پاتال میں گر گیا
تو یہ تنور جس میں
شب و روز نان جویں کے لیئے خود بھی
نان جویں کی طرح سرخ شعلوں میں بنتے
بگڑتے ہیں انساں
سلک ایمان کو اور اس کے کناروں سے لپٹی ہوئی بے اماں خلق کو
ہیزم خشک کی مثل کھا جائے گا۔

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تار پر چلنے والے نٹوں کی طرح
ہم بھی تنور کے منہ پہ تانے ہوئے
سلک ایمان پر محو رفتار ہیں
(زندہ تاریخ بھی ایک سورج ہے پر
اس کا نور جہاں تاب ان کے لیے
ہے جو سورج مکھی کی طرح ہر نفس
رو بہ خورشید ہیں)
ہم کہ خود اپنی تاریخ پر بوجھ ہیں
اپنے کمزور کاندھوں پہ تاریخ کا بوجھ لادے ہوئے
(جس میں آبا کے بھولے ہوئے نقش ہیں
اک حقیقت نما خواب کے عکس ہیں .... اور کچھ بھی نہیں)
معجزوں کے لیے
اپنی آنکھوں کی جھولی پسارے ہوئے خواب اوڑھے ہوئے
آنے والے دنوں کی طرف پیٹھ موڑے ہوئے
ہیں رواں بے جہت
بے نوا اور خجل
اپنے ہونے کے آشوب سے منفعل
رسم بخیہ گری
شہر کم رزق میں اس طرح سے پڑی
خواہشیں بے عمل
آرزو پا بہ گل

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اپنے خوابوں کی دہلیز پر مضمحل
کب سے بیٹھے ہیں عشاق
ژولیدہ مو اور پژمردہ دل!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کب سے ہم لوگ

کب سے ہم لوگ اس بھنور میں ہیں!
اپنے گھر میں ہیں یا سفر میں ہیں!

یوں تو اڑنے کو آسماں ہیں بہت
ہم ہی آشوب بال و پر میں ہیں

زندگی کے تمام تر رستے
موت ہی کے عظیم ڈر میں ہیں

اتنے خدشے نہیں ہیں رستوں میں
جس قدر خواہش سفر میں ہیں

سیپ اور جوہری کے سب رشتے
شعر اور شعر کے ہنر میں ہیں

سایہ راحت شجر سے نکل
کچھ اڑانیں جو بال و پر میں ہیں؟

www.KitaabPoint.Blogspot.com

عکس بے نقش ہو گئے امجد
لوگ پھر آئینوں کے ڈر میں ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جب بھی آنکھوں میں

جب بھی آنکھوں میں ترے وصل کا لمحہ چمکا
چشم بے آب کی دہلیز پہ دریا چمکا

فصل گل آئی کھلے باغ میں خوشبو کے علم
دل کے ساحل پہ ترے نام کا تارا چمکا

عکس بے نقش ہوئے آئینے دھندلانے لگے
درد کا چاند سر بام تمنا چمکا

پیرہن میں بھی ترا حسن نہ تھا برق سے کم
جب کھلے بند قبا اور ہی نقشا چمکا

روح کی آنکھیں چکا چوند ہوئی جاتی ہیں
کس کی آہٹ کا مرے کان میں نغمہ چمکا

رنگ آزاد ہوئے گل کی گرہ کھلتے ہی
ایک لمحے میں عجب باغ کا چہرا چمکا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

دل کی دیوار پہ اڑتے رہے ملبوس کے رنگ
دیر تک ان میں تری یاد کا سایا چمکا

لہریں اٹھ اٹھ کے مگر اس کا بدن چومتی تھیں
وہ جو دریا پہ گیا خوب ہی دریا چمکا

یوں تو ہر رات چمکتے ہیں ستارے لیکن
وصل کی رات بہت صبح کا تارا چمکا

ہجر پنپا نہ ترا وصل ہمیں راس آیا
کسی میدان میں تارا نہ ہمارا چمکا

جیسے بارش سے دھلے صحنِ گلستان امجد
آنکھ جب خشک ہوئی اور بھی چہرا چمکا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سائے ڈھلنے، چراغ جلنے

سائے ڈھلنے چراغ جلنے لگے
لوگ اپنے گھروں کو چلنے لگے

اتنی پر پیچ ہے بھنور کی گرہ
جیسے نفرت دلوں میں پلنے لگے

دور ہونے لگی جرس کی صدا
کارواں راستے بدلنے لگے

اس کے لہجے میں برف تھی لیکن
چھو کے دیکھا تو ہاتھ جلنے لگے

راہ گم کردہ طائروں کی طرح
پھر ستارے سفر پہ چلنے لگے

پھر نگاہوں سے کٹ گئیں آنکھیں
عکس پھر آئینے بدلنے لگے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس کے بند قبا کے جادو سے
سانپ سے انگلیوں میں چلنے لگے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

پردے میں اس بدن کے

پردے میں اس بدن کے چھپیں راز کس طرح!
خوشبو نہ ہو گی پھول کی غماز کس طرح!

طرز کلام ان کا ہوا طرز خاص و عام
بدلیں گے اب وہ بات کا انداز کس طرح

بدلا جو اس کی آنکھ کا انداز تو کھلا!
کرتے ہیں رنگ پھول سے پرواز کس طرح

آنکھوں میں کیسے تن گئی دیوار بے حسی
سینوں میں گھٹ کے رہ گئی آواز کس طرح

وہ حق پرست کیسے ہوئے مصلحت پرست؟
نغموں سے بے لباس ہوئے ساز کس طرح!

آنکھوں میں موم ڈال کے بیٹھیں گے کب تلک
آئینوں سے چھپائیں گے یہ راز کس طرح!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس کی نظر میں عکس تعلق کہیں نہیں

امجدؔ حدیث شوق ہو آغاز کس طرح!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اپنے ہونے کی تب وتاب

اپنے ہونے کی تب و تاب سے باہر نہ ہوئے
ہم ہیں وہ سیپ جو آزادۂ گوہر نہ ہوئے

حرف بے صوت کی مانند رہے دنیا میں
دشت امکاں میں کھلے نقش مصور نہ ہوئے

پھول کے رنگ ہر ہر شاخ خزاں بھی چمکے
قیدی رسم چمن خاک کے جوہر نہ ہوئے

تھک کے گرتے بھی نہیں گھر کو پلٹتے بھی نہیں
نجم افلاک ہوئے آس کے طائر نہ ہوئے

اس کی گلیوں میں رہے گی گرد سفر کی صورت
سنگ منزل نہ بنے راہ کا پتھر نہ ہوئے

اپنی ناکام امیدوں کے خم و پیچ میں گم
ابر کم آب تھے ہم رزق سمندر نہ ہوئے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ایک خواب کے ٹوٹنے پر!

نہ کوئی حرف رہا معتبر نہ شکل کہ ہم
کسی سخن کسی صحبت پہ افتخار کریں!
تمام آئینے دھندلا گئے ہیں شہروں میں
نہ کوئی نقش ہے سالم نہ کوئی عکس کہ ہم
کسی نظر کسی چہرے پہ اعتبار کریں

یہ کیسے شک کا عذاب گراں پڑا ہم پر
خجل ہوئی ہے بصیرت، بصارتیں نادم
ہر ایک حرف دعا، بے نوا گدا کی طرح
خود اپنے خواب حضوری کی بازگشت میں گم

فصیل لب پہ کھڑا ہے اسی تذبذب میں
ابھی کواڑ کھلیں گے در مسیحا کے!
ابھی وہ دست کرم
کھلے کواڑ کی خندہ جبیں سے جھانکے گا
مگر یہ خوف کہ زنجیر در کی جنبش بھی
ہوا کے ڈولتے لمحے کی کوئی چال نہ ہو
لہو میں چور کی صورت نقب لگاتا ہے!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کٹی ہے ایسے دھندلکوں میں زندگی اپنی
کہ صبح و شام کے تارے کا فرق یاد نہیں
ہے پر امید بھی خلقتؒ دلوں میں خوف بھی ہے
سحر کے جال کے پیچھے شبوں کا جال نہ ہو!
کہ یہ سفر بھی شہید رہ ملال نہ ہو!

تمام شہر کی خلقت یہی دہائی دے
رہائی دے ہمیں مولاؐ ہمیں رہائی دے
دلوں کی تہہ میں چھپے بھید جاننے والے
تری نگاہ پہ روشن ہیں ایسی تحریریں
کہ جن کے حرف کسی لوح پر لکھے نہ گئے

وہ اپنے عہد میں قائم نہیں رہا لیکن
جو خواب اس نے دکھایا ہے وہ تو سچا تھا
ہر ایک روح کی ڈوری ہے تیری مٹھی میں
اسے گھٹا کہ بڑھا یہ تری مشیت ہے
پر اس کے خواب کے رستوں میں روشنی رکھنا
کوئی چراغ بجھے یا جلے مگر مولا!
مرے وطن کی فصیلوں میں روشنی رکھنا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

لہو کے پھول سرِ شاخ

لہو کے پھول سر شاخ انتظار کھلے
یہ کس بہار کے غنچے پس بہار کھلے!

دلوں سے گرد مسافت دھلی تو آنکھوں میں
گل وصال کھلے اور بے شمار کھلے

خود اپنے سامنے بے بس ہے قوت تخلیق
کہ موج رنگ تو پتھر کے آر پار کھلے

ہے جو بھی پھول وہ فرد حساب جیسا ہے
گئی رتوں میں جو بوئے تھے اب کی بار کھلے

ہوا کچھ ایسی چلی ہے سواد ہجراں میں
خزاں کے صحن میں جیسے گل بہار کھلے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

لہو میں تیرتے پھرتے ملال

لہو میں تیرتے پھرتے ملال سے کچھ ہیں
کبھی سنو تو دلوں میں سوال سے کچھ ہیں

میں خود بھی ڈوب رہا ہوں ہر اک ستارے میں
کہ یہ چراغ مرے حسب حال سے کچھ ہیں

غم فراق سے اک پل نظر نہیں ہٹتی
اس آئینے میں ترے خد و خال سے کچھ ہیں

اک اور موج کہ اے سیل اشتباہ ابھی
ہماری کشت یقیں میں خیال سے کچھ ہیں

ترے فراق کی صدیاں ترے وصال کے پل
شمار عمر میں یہ ماہ و سال سے کچھ ہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

علموں بس کریں او یار!

علموں کی روشنی میرے چاروں طرف پھیلتی ہے
اس کی عکسی شعاعیں ہر اک شے کے باطن
کو ظاہر میں تبدیل کرتی ہیں....... میں
انکشافات کے ایک آتش فشاں کے دہانے پہ ہوں
میرے چاروں طرف دھوپ ہے!
میری اقدار کے سبز چشموں پہ صحراؤں کی ریت خیمہ فگن ہے
ہواؤں کے لہجے میں تلخی کا اعلان ہے
اور درختوں کے سائے بھٹکتے ہوئے قافلوں کے تعاقب
میں صحرا کی پہنائیوں میں کہیں کھو چکے ہیں
جس قدر خواب تھے
گردبادوں کی دہلیز پر سو چکے ہیں
اے خدا
اے سمندر کی گرہوں کے عقدہ کشا
میرے چشموں سے ریگ رواں کے یہ خیمے ہٹا
ان کو پانی سے بھر
میرے پیڑوں کو سائے کی توفیق دے
گردبادوں کی دہلیز پر سو چکے خواب کو
اس کی تعبیر دے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

پھر ہواؤں کے لہجے میں سینوں کے در
کھول دینے کی گم گشتہ تاثیر دے
اے خدا....... میرے لب!
میرے اونٹوں کے لب' پیاس سے خشک ہیں
آسماں پر مرے نام کا کوئی بادل نہیں
اور چاروں طرف دھوپ ہی دھوپ ہے!
میری ایڑی کو بھی کوئی چشمہ جگانے کا اعجاز دے!
میرے بے صوت لفظوں کو آواز دے!
میری پتھر مسافت کو آغاز دے!
اور اگر یہ نہیں
تو مری آنکھ کے اس الاؤ کو بھی' خشک مٹی سے بھر
مجھے اس جہنم سے آزاد کر
مجھے علم کے اس جہنم سے آزاد کر!!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اے شام گواہی دے

بوسوں کی حلاوت سے جب ہونٹ سلگتے ہوں
سانسوں کی تمازت سے جب چاند پگھلتے ہوں
اور ہاتھ کی دستک
جب بندِ قبا اس کے کھلنے کو مچلتے ہوں!
عشق اور ہوس کے بیچ، کچھ فرق نہیں رہتا
(کچھ فرق اگر ہے بھی اس وقت نہیں رہتا)
جب جسم کریں باتیں، دریا بھی نہیں بہتا
میں جھوٹ نہیں کہتا
اے شام گواہی دے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

آج پورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے

آج پورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے

تم بھی اس شب

اک چھلکتے جام کی صورت لبالب تھے

تمہارے جسم کی قوسیں

تمہارے خوبصورت جسم کی سب دلربا قوسیں

کچھ ایسے زاویے پر ایک لمحے کو رکی تھیں

جس طرح' بادل کے کونے پر

لرزتے چاند کی آنکھیں

لرزتے چاند کی ارماں بھری' حیرت زدہ آنکھیں

تمہارا حسن

اک سیال بجلی کی طرح

ملبوس کی شکنوں میں ایسے مضطرب تھا

چاندنی کو اپنے ہی رنگوں سے جیسے راستہ ملتا نہ ہو

جس طرح جادو سے کوئی

سیل سے اٹھتی ہوئی اک موج کو

مدتوں سے پیاس کی ماری ہوا میں روک دے

اور اگر تم

اپنی اس انگڑائی میں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ان جھیل سی گہری نگاہوں سے

فلک کی سمت کوئی آس کا طائر اڑاتے

مسکرا کر چاند کو آواز دیتے

تو یقین جانو وہ بادل کی فصیلیں توڑتا

ان گنت تاروں کے اس جھرمٹ کو پیچھے چھوڑتا

آسماں کی شاخ سے پرواز کرتا اور چلا آتا

تمہارے در پہ سائل کی طرح آواز دیتا

اور پھر عشاق کی صف میں کھڑا

شام ابد تک منتظر رہتا

کہ تم اس کے لیے دروازہ کھولو

اور اسے اندر بلاؤ

ہاں یقین جانو

کہ اس لمحے تمہارا حسن امکاں کی حدوں سے ماورا تھا

ایک زندہ معجزہ تھا'

دم بدم بجھتے ہوئے لمحوں کے آتشدان میں

معجزوں سا حسن خاکستر ہوا

اجنبی تارے' سحر کے کھیت میں

بارش کے بے تعبیر قطروں کی طرح مٹی ہوئے

بے ثمر جذبوں سے بوجھل چاند لکڑی کی طرح

خورشید کے تنور میں ایندھن بنا!

(یہ ہمارے روز و شب بھی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بے ثمر جذبوں کا ایندھن ہی تو ہیں!)

آج پورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے
کیا خبر اس بیچ' کتنے چاند بے چہرہ ہوئے
وہ جو بادل کے کنارے پر
کسی انگڑائی کی صورت میں لرزاتھا
کہاں کا تھا....... کہاں ہوگا!
کہ اب تو آسماں پر ان گنت تاروں کے جھرمٹ میں
فقط اک دائرہ ہے
ایک تنہا دائرہ ہے
جس کی وحشت سے بھری
آنکھوں کے سونے آئینے میں
کوئی روشن عکس لہرایا نہیں
اور تا حدِ نظر
ابر کا سایا نہیں!!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

خوشحال خاں خٹک کے لیے ایک نظم

زمیں دلہن ہے
اور افلاک کی ان بے ٹھکانہ وسعتوں میں
جس قدر تارے ہیں اس کی اوڑھنی کی
جھلملاہٹ سے بنے ہیں!
یہ ستارے استعارے ہیں
ہماری آپ کی اس زندگی کا
(جس کے ہونے اور نہ ہونے کے تذبذب میں
ازل سے تا ابد تاریخ کے جالے تنے ہیں
ستارے سانس لیتے ہیں!
ستارے بھی ہماری آپ کی صورت فضا میں سانس لیتے ہیں
ہماری ہی طرح یہ بھی فنا کی کوکھ میں تخلیق ہوتے ہیں
چمکتے ہیں' دمکتے ہیں' خلا کا رزق بنتے ہیں!
ہماری آپ کی یہ داستاں تو
ٹوٹتے تاروں کی اس وحشی چمک کے استعارے
میں سمٹ جاتی ہے لیکن سب ستارے
اتنے بے مایہ نہیں ہوتے!!
کئی مہتاب خو سورج بکف ایسے بھی ہوتے ہیں
کہ جو خود ٹوٹ بھی جائیں تو ان کی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

روشنی موجود رہتی ہے
صدائے بازگشت ان کی ہوا کے ساتھ بہتی ہے
وہ اپنی موت سے لوحِ ابد پر زندگی تحریر کرتے ہیں
فنا تسخیر کرتے ہیں!
مرے خوشحال کے نغمے بھی اک ایسے ہی لافانی ستارے
کی ضیا ہیں
مری مٹی کے چہرے کی حیا ہیں!
انہی نغموں کے پرتو سے امنگیں جگمگاتی ہیں
انہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دلہن کی آنکھیں مسکراتی ہیں
اسی تارے کی مشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن!
کرن اندر کرن روشن!
مرے خوشحال کے نغموں سے ہے میرا وطن روشن!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

پلکوں کی دہلیز پہ چمکا

پلکوں کی دہلیز پہ چمکا ایک ستارا تھا
ساحل کی اس بھیڑ میں جانے کون ہمارا تھا!

کہساروں کی گونج کی صورت پھیل گیا ہے وہ
میں نے اپنے آپ میں چھپ کر جسے پکارا تھا

سر سے گزرتی ہر اک موج کو ایسے دیکھتے ہیں
جیسے اس گرداب میں فنا یہی سہارا تھا!

ہجر کی شب وہ نیلی آنکھیں اور بھی نیلی تھیں
جیسے اس نے اپنے سر سے بوجھ اتارا تھا

جس کی جھلملاہٹ میں تم نے مجھ کو قتل کیا
پت جھڑ کی اس رات وہ سب سے روشن تارا تھا

ترک وفا کے بعد ملا تو جب معلوم ہوا
اس میں کتنے رنگ تھے اس کے کون ہمارا تھا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کون کہاں پر جھوٹا نکلا! کیا بتلاتے ہم
دنیا کی تفریح تھی اس میں ہمیں خسارا تھا

جو منزل بھی راہ میں آئی دل کا بوجھ بنی
وہ اس کی تعبیر نہ تھی جو خواب ہمارا تھا

یہ کیسی آواز ہے جس کی زندہ گونج ہوں میں
صبح ازل میں کس نے امجد مجھے پکارا تھا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کیا کبھی تم نے سوچا ہے

جب یونہی بے ارادہ
کبھی باتیں کرتے
مرا ہاتھ اس کے بدن پر کہیں چھو سا جائے
تو لگتا ہے جیسے مری انگلیوں میں
یکا یک بہت سے دیے جل اٹھے ہیں
کبھی یونہی جب
باتیں کرتے ہوئے
ایک دم رک سے جائیں
اور اک دوسرے سے کہیں
''ہاں تو کیا بات تھی وہ.......
چند لمحے اسے
یاد کرنے کی ناکام کوشش کریں اور پھر
اس طرح ہنس پڑیں
جیسے باتوں کا مقصد
فقط ایک دوجے کی قربت میں رہنا
اور اس اجنبی بے تعارف سے لمحے کی آہٹ سے بچنا
ہو جس کے سبب دل کی دھڑکن کبھی
ایڑیوں اور کبھی سر سے اس طرح آتی ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جیسے یہیں اس کا مسکن ہو، گھر ہو
یہیں اس کی منزل یہیں رہگزر ہو

جان جاں...... میں نے سوچا بہت ہے!
تمہاری قسم
میں نے ان سارے لمحوں کو، ژولیدہ لمحوں کے بکھرے ہوئے
موتیوں کو
شب و روز کے بے ٹھکانہ تسلسل کی تسبیح میں
دانا دانا پرویا بہت ہے
(خود کو کھویا بہت ہے)
مگر جب بھی میں اس نشاط الم آفریں سے گزرتا......
گزرنے کی کوشش یا تدبیر کرتا ہوں تو
ایک دیکھا ہوا بے تعارف سا لمحہ
کوئی اجنبی سا خیال آ کے دامن پکڑتا ہے
میں یاد کرتا ہوں
میں یاد کرنے کی بھرپور کوشش میں
ٹوٹے ہوئے ریزہ ریزہ بدن آئینے کی طرح
سارے عکسوں کو ترتیب دیتا ہوں پر
شکل بنتی نہیں
شکل بنتی نہیں اور ژولیدہ لمحوں کے آشوب میں یاد آتا نہیں
مجھ کو کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

وہ تعلق مری روح کا عطر تھا
یا فقط جسم کی
بے ٹھکانہ صدا تھی!
تمہاری قسم اس سے کی قسم
مجھ کو کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں!!

دن بہت جا چکے ہیں اور اب جانِ جاں
تم بھی میری طرح
زندگی کے سب اس نوع کے تجربوں سے یقیناً گزر آئی ہو
جنھیں لوگ
گم گشتہ جنت میں گیہوں کے دانے سے نکلی ہوئی
داستاں کے حوالے سے تفسیر کرتے ہیں!
تمہیں بھی.......
(اور اس "تم" سے میں خود کو منفی نہیں کر رہا)
ان حقائق پہ اور ان کی تفسیر پر پختہ ایمان ہوگا!
مگر جانِ جاں
کیا کبھی تم نے سوچا ہے
وہ لمس کیا تھا!
جو پوروں میں تارے جگاتا ہوا مسکراتا ہوا
ازازل تا ابد پھیلتا تھا
(پھیلتا تھا مگر کچھ بتاتا نہ تھا۔ ہاتھ آتا نہ تھا)

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اور چپ کے وہ سب بے کنارا جزیرے
جو باتوں کے بے نام گہرے سمندر
میں یوں ڈولتے تھے
کہ پورے بدن میں بدن بولتے تھے
وہ کیا تھے!!!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تاریخ

سورج نکلا

اور سورج کے ساتھ درختوں کی شاخوں سے

آوازوں کے پھول کھلاتے طائر نکلے

حسنِ ازل کے شاعر نکلے!

سورج کا رتھ اپنا چکر پورا کر کے نکل گیا ہے

لیکن طائر

اس کے سفر کی جھلملتا میں

اپنی سمت گنوا بیٹھے ہیں!!

اپنے خواب لٹا بیٹھے ہیں!!

شام درختوں کے آنگن میں اتر رہی ہے

لیکن ان سے دور نہ جانے کتنی دور

وہ گم کردہ راہ پرندے

(رکی ہوئی ہے جن کے لبوں پر ایک سلگتی چیخ!

جمی ہوئی ہے جن کے پروں پر سورج رتھ کی دھول)

تھک کر گرنے کے لمحے میں سوچ رہے ہیں

کل سورج پھر

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ان کے گھروں پر دستک دے گا

اور درختوں کی شاخوں سے اُن کے بچے

آوازوں کے پھول کھلاتے نکلیں گے!!!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تارا تارا اتر رہی

تارا تارا اتر رہی ہے رات سمندر میں
جیسے ڈوبنے والوں کے ہوں ہاتھ سمندر میں

ساحل پر تو سب کے ہونگے اپنے اپنے لوگ
رہ جائے گی کشتی کی ہر بات سمندر میں

ایک نظر دیکھا تھا اس نے آگے یاد نہیں
کھل جاتی ہے دریا کی اوقات سمندر میں

میں ساحل سے لوٹ آیا تھا' کشتی چلنے پر
پگھل چکی تھی لیکن میری ذات سمندر میں

کاٹ رہا ہوں ایسے امجدؔ یہ ہستی کی رہ
بے پتواری ناؤ پہ جیسے رات سمندر میں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

زندگی بھی مہنگی ہے موت بھی نہیں سستی
یہ زمین بے سایہ
گھر گئی خدا جانے کن عجب عذابوں میں
بے وجود سایوں کا یہ جو کارخانہ ہے
کن عجب سرابوں میں کس طرف روانہ ہے؟
نیستی ہے یا ہستی!
زندگی بھی مہنگی ہے موت بھی نہیں سستی!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

لرزش نگہ میں، لہجے میں لکنت

لرزش نگہ میں، لہجے میں لکنت عجیب تھی
اس اولیں وصال کی وحشت عجیب تھی

روشن ہوئی اسی نے اسی سے بکھر گئی
شبنم کو آفتاب سے نسبت عجیب تھی

آنسو دیئے پر آنکھ کو رونے کی خو نہ دی
اے بادشاہ غم! یہ عنایت عجیب تھی

کھڑکی میں آ کے چاند نے جھپکی نہیں پلک
کل شب مرے مکان میں صحبت عجیب تھی

اک پل تو جیسے سارا بدن سنسنا اٹھا
اس سرسری نگاہ میں دعوت عجیب تھی

ساحل پہ تھے تو ریت کا جادو تھا ہر طرف
کشتی چلی تو بحر کی دہشت عجیب تھی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

دل میں نہ رہ سکے جو کہیں تو کہی نہ جائے
امجد شکست دل کی حکایت عجیب تھی

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس بستی کے ہر آنگن میں

ایک ہی جگنو بھٹک رہا ہے تاریکی کے گھیرے میں
ایک ہی تارا چمک رہا ہے چاروں اور اندھیرے میں
ایک ہی سپنا ہمک رہا ہے لاکھوں بجھتی آنکھوں میں
زخمی، خالی ہاتھوں میں

ٹوٹ رہا ہے حلقہ حلقہ زنجیروں کا جال
پگھل رہے ہیں قطرہ قطرہ گمنامی کے طوق
سمٹ رہا ہے لقمہ لقمہ اس بستی سے کال

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

دشت دل میں سراب

دشت دل میں سراب تازہ ہیں
بجھ چکی آنکھ خواب تازہ ہیں

داستان شکست دل ہے وہی
ایک دو چار باب تازہ ہیں

کوئی موسم ہو دل گلستاں میں
آرزو کے گلاب تازہ ہیں

دوستی کی زباں ہوئی متروک
نفرتوں کے نصاب تازہ ہیں

آگہی کے ہماری آنکھوں پر
جس قدر ہیں عذاب تازہ ہیں

زخم در زخم دل کے کھاتے ہیں
دوستوں کے حساب تازہ ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سر پہ بوڑھی زمین کے امجد
اب کے یہ آفتاب تازہ ہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جو سر دار آ نہیں

جو سر دار آ نہیں سکتا
قرض ہستی چکا نہیں سکتا

"آج" جس آئینے میں دھندلا ہو
عکس کل کا دکھا نہیں سکتا

لہر ایسی چلی ہے بستی میں
کوئی بھی سر اٹھا نہیں سکتا

ضبط سے یوں چیخ رہے ہونٹ
آدمی مسکرا نہیں سکتا

زخم بے حرمتی کی کیفیت
کوئی ہونٹوں پہ لا نہیں سکتا

اتنی گہری ہوئی ہے تاریکی
آدمی راہ پا نہیں سکتا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

رات کے اس حصار میں میں تو
صبح کے گیت گا نہیں سکتا

کس قدر خواب ہیں نگاہوں میں
جن کو لفظوں میں لا نہیں سکتا

تم نہ دیکھو تمہارا دین ایمان
میں تو نظریں چرا نہیں سکتا

دل سمندر بھی ہو اگر امجد
پیاس غم کی بجھا نہیں سکتا

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس نے آہستہ سے جب

اس نے آہستہ سے جب پکارا مجھے
جھک کے تکنے لگا ہر ستارا مجھے

تیرا غم' اس فشار شب و روز میں
ہونے دیتا نہیں بے سہارا مجھے

ہر ستارے کی بجھتی ہوئی روشنی
میرے ہونے کا ہے استعارا مجھے

اے خدا' کوئی ایسا بھی ہے معجزہ
جو کہ مجھ پر کرے آشکارا مجھے

کوئی سورج نہیں' کوئی تارا نہیں
تو نے کس جھٹپٹے میں اتارا مجھے

عکس امروز میں' نقش دیروز میں
اک اشارا تجھے اک اشارا مجھے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہیں ازل تا ابد ٹوٹتے آئینے
آگہی نے کہاں لا کے مارا مجھے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اطہر نفیس کے لیے ایک نظم

وہ ایک ہمدرد آئینہ تھا

کہ اس کی آنکھوں میں جو بھی اک بار دیکھتا تھا

یہ سوچتا تھا

وہ اب اکیلا نہیں رہا ہے!!

عجب تسلی بدوش تھیں وہ نگار آنکھیں

وہ زندگی کی امید' روشن نوید ایسی بہار آنکھیں

جو سو گئی ہیں!

وہ رنجشوں کے دھوئیں میں لپٹا اداس چہرہ

مگر وہ آنکھیں

وہ آگہی کی سفیر آنکھیں جو کھو گئی ہیں

وہ جس کے لفظوں میں چاہتوں کے چراغ جلتے تھے

بجھ گیا ہے!

وہ جس کے لہجے میں پھول کھلتے تھے

اس کی آواز جل گئی ہے

وہ دوستی کا شفیق موسم

وہ روشنی کی لکیر' آگے نکل گئی ہے

وہ اک جزیرہ تھا دوستی

جو ہولے ہولے سمندروں کے نمک کی چھریوں سے کٹ رہا تھا!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

الجھتی سانسوں کے زیر و بم میں
وہ روز و شب کے اداس صفحے الٹ رہا تھا
ہماری آنکھوں میں پھیلنے کو سمٹ رہا تھا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ان جھیل سے گہری آنکھوں میں

ان جھیل سے گہری آنکھوں میں اک شام کہیں آباد تو ہو!
اس جھیل کنارے پل دو پل
اک خواب کا نیلا پھول کھلے!
وہ پھول بہا دیں لہروں میں
اک روز کبھی ہم شام ڈھلے
اس پھول کے بہتے رنگوں میں
جس وقت لرزتا چاند چلے!
اس وقت کہیں ان آنکھوں میں اس بسرے پل کی یاد تو ہو!
ان جھیل سے گہری آنکھوں میں اک شام کہیں آباد تو ہو!
پھر چاہے عمر سمندر کی
ہر موج پریشاں ہو جائے!
پھر چاہے آنکھ دریچے سے
ہر خواب گریزاں ہو جائے!
پھر چاہے پھول کے چہرے کا
ہر درد نمایاں ہو جائے!
اس جھیل کنارے پل دو پل وہ روپ نگر ایجاد تو ہو!
دن رات کے اس آئینے سے وہ عکس کبھی آزاد تو ہو!
ان جھیل سے گہری آنکھوں میں اک شام کہیں آباد تو ہو!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

لہو میں رنگ لہرانے

لہو میں رنگ لہرانے لگے ہیں
زمانے خود کو دہرانے لگے ہیں

پروں میں لے کے بے حاصل اڑانیں
پرندے لوٹ کر آنے لگے ہیں

کہاں ہے قافلہ بادِ صبا کا!
دلوں کے پھول مرجھانے لگے ہیں

کھلے جو ہم نشینوں کے گریباں
خود اپنے زخم افسانے لگے ہیں

کچھ ایسا درد تھا بانگ جرس میں
سفر سے قبل پچھتانے لگے ہیں

کچھ ایسی بے یقینی تھی فضا میں
جو اپنے تھے وہ بیگانے لگے ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہوا کا رنگ نیلا ہو رہا ہے
چمن میں سانپ لہرانے لگے ہیں

فلک کے کھیت میں کھلتے ستارے
زمیں پر آگ برسانے لگے ہیں

لب زنجیر ہے تعبیر جن کی
وہ سپنے پھر نظر آنے لگے ہیں

کھلا ہے رات کا تاریک جنگل
اور اندھے راہ دکھلانے لگے ہیں

چمن کی باڑ تھی جن کا ٹھکانہ
دل شبنم کو دھڑکانے لگے ہیں

بچانے آئے تھے دیوار لیکن
عمارت ہی کو اب ڈھانے لگے ہیں
خدا کا گھر تمھی سمجھو تو سمجھو
ہمیں تو یہ صنم خانے لگے ہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سنو پیارے

سنو پیارے
محبت کرنے والوں کی نگاہیں بھی
ہوا میں ڈولتی خوشبو کی صورت منظروں میں
اپنے ہونے کی نشانی چھوڑتی ہیں
چاندنی راتوں میں جیسے
چاند کی کرنیں
سمندر کے بدن میں نغمگی آباد کرتی ہیں

محبت کرنے والوں کے تعلق اور ان کی دوریاں سب سے
انوکھی ہیں
کہ جیسے بے خبر سورج کے حلقے میں
اگرچہ ان گنت تارے' کئی سیارگاں ہیں
اور پھر حلقہ بہ حلقہ ان کے اپنے چاند ہیں لیکن
سبھی اک رشتہ بے نام کی ڈوری میں ایسے منسلک ہیں
جس طرح عشاق کی آنکھیں
سنا ہے عورتیں تو
چاہنے والے کی خوشبو
بے کراں انبوہ میں پہچان لیتی ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

محبت کی نظر، ملنے سے پہلے جان لیتی ہیں
مگر پیارے.......

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں

اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا

کچھ ایسی برف تھی اس کی نظر میں!
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا

تمہی نے کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

کھلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

میں اس کی انجمن میں تھا اکیلا
کسی نے بھی مجھے دیکھا نہیں تھا

سحر کے وقت کیسے چھوڑ جاتا!
تمہاری یاد تھی، سپنا نہیں تھا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کھڑی تھی رات کھڑکی کے سرہانے
دریچے میں وہ چاند اترا نہیں تھا

دلوں میں گرنے والے اشک چنتا
کہیں اک جوہری ایسا نہیں تھا

کچھ ایسی دھوپ تھی ان کے سروں پر
خدا جیسے غریبوں کا نہیں تھا

ابھی حرفوں میں رنگ آتے کہاں سے!
ابھی میں نے اسے لکھا نہیں تھا

تھی پوری شکل اس کی یاد مجھ کو
مگر میں نے اسے دیکھا نہیں تھا

برہنہ خواب تھے سورج کے نیچے
کسی امید کا پردا نہیں تھا
ہے امجدؔ آج تک وہ شخص دل میں
کہ جو اس وقت بھی میرا نہیں تھا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ساحل

تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں نہیں ہیں
نجانے کب سے یہ موسم
ستاروں کی طرح دھرتی کے سینے پر فروزاں ہیں
نگران کی نگاہوں نے
تمہارے وصل کے لمحوں سے بہتر وقت
دیکھا ہے نہ سوچا ہے
ہوا نے منظروں پر آج تک جو کچھ بھی لکھا ہے
تمہارے نام لکھا ہے
خلا میں ٹوٹتے' تارے' تمہارے بام سے گزریں
تو رکنے کو مچلتے ہیں
فلک کو چومتے جذبے تمہاری آنکھ سے اتریں
تو پاتالوں میں گرتے ہیں
تمہارے خواب سے روشن منارے
وقت کے دریائے بے حد میں نہیں ہیں
تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں نہیں ہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

آبلہ

اداسی کے افق پر جب تمہاری یاد کے جگنو چمکتے ہیں
تو میری روح پر رکھا ہوا یہ ہجر کا پتھر
چٹکتی برف کی صورت پگھلتا ہے!
اگرچہ یوں پگھلنے سے یہ پتھر، سنگریزہ تو نہیں بنتا!
مگر اک حوصلہ سا دل کو ہوتا ہے
کہ جیسے سر بسر تاریک شب میں بھی
اگر اک زرد رُو سہما ہوا تارا نکل آئے
تو قاتل رات کا بے اسم جادو ٹوٹ جاتا ہے
مسافر کے سفر کا راستہ تو کم نہیں ہوتا
مگر تارے کی چلمن سے
کوئی بھولا ہوا منظر اچانک جگمگاتا ہے!
سلگتے پاؤں میں اک آبلہ سا پھوٹ جاتا ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جو آنسو دل میں گرتے ہیں

جو آنسو دل میں گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے
بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے

کتابوں میں لکھے جاتے ہیں دنیا بھر کے افسانے
مگر جن میں حقیقت ہو کتابوں میں نہیں رہتے

بہار آئے تو ہر اک پھول پر اک ساتھ آتی ہے
ہوا جن کا مقدر ہو وہ شاخوں میں نہیں رہتے

لیے پھرتے ہیں کچھ احباب ایسے مضطرب سجدے
جہاں دربار مل جائے جبینوں میں نہیں رہتے

مہک اور تتلیوں کا نام بھونرے سے جدا کیوں ہے
کہ یہ بھی تو خزاں آنے پہ پھولوں میں نہیں رہتے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کبھی تو دل تمناؤں کے

کبھی تو دل تمناؤں کے اس گرداب سے نکلے
ہنر بھی کچھ ہمارے دیدہ بے خواب سے نکلے!

ستارے ٹوٹ کر جیسے خلاؤں میں بکھر جائیں!
ہمارے نام بھی ایسے دل احباب سے نکلے

چمن میں گل بکھرنے پر بھی خوشبو چھوڑ جاتے ہیں!
زمیں کی انجمن سے جو اٹھے آداب سے نکلے

ابھی تک ان کے بام و در پہ امیدیں لرزتی ہیں
یہ کن شہروں کے نقشے وادی سیلاب سے نکلے

محبت کا سخن وہ ہے کہ دشت سنگ میں کہیے
تو اس کی بازگشت غم دل مہتاب سے نکلے

نہ ٹھہرا ایک بھی امجد مری آنکھوں کے ساحل پر
ہزاروں کارواں اس رہگذر آب سے نکلے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سدا معتبر

وہی چند سر

جو اگے ہیں شاخ صلیب پر

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ان کہا لفظ

جانِ من

کل سرِ گفتگو تیری ان خوش نما

وحشی ہرنی سی آنکھوں کے ساحل پہ جو

اک ستارا سا لرزا تھا

وہ رات بھر

یوں مرے جسم و جاں میں ترازو رہا

جیسے آنسو نہ تھا نیم کش تیر تھا!

ایک زنجیر تھا

جس کا ہر حلقہ آہنی

اس قدر سرد اور مرگ تاثیر تھا

جیسے پھانسی کی شب

جیسے قاتل کا دل

جیسے خنجر کے لب!!

ہاں مری جان وہ قطرہ شبنمیں

جو تری سرمہ سا

وحشی ہرنی سی آنکھوں میں اک پل کو لرزا تھا

میرے لیے

جیسے کانٹوں میں الجھی ہوئی اک صدی تھا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ایک ایسی ندی تھا

جو کوہ الم سے سراسیمہ نکلے

اور افسوس کے دشت بے رنگ میں جذب ہو!

جان من! یوں تو اس کرہ ارض پر

سینکڑوں ہی زبانیں، کروڑوں ہی الفاظ ہیں

مگر ہر زباں میں فقط ایک ہی لفظ ہے

جو سدا معتبر ہے

ازل کے تعلق کا پندار ہے....... اس کا معیار ہے

میں ترے سامنے اس کو کیسے کہوں

یہ مری خامشی اس کا اظہار ہے!

ہاں سنو جان من

زندگی کی طرح....... آدمی بھی نہایت پراسرار ہے

کہ جو دیکھو تو ہے

اور نہ دیکھو تو موج ہوا کی طرح

ایک پل میں ازل، دوسرے میں ابد

جیسے خوابوں کی حد

جیسے دل کی سند

کل سر گفتگو تیری ان بے صدا

وحشی ہرنی سی آنکھوں میں بھی ایک پل کے لیے

جو ستارا سا چمکا تھا وہ اصل میں

کہکشاں میں پرویا ہوا لفظ تھا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

میرا صدیوں کا کھویا ہوا لفظ تھا

جانِ من!

کرہ ارض پر جس قدر بھی زبانیں اور الفاظ ہیں

ان کے دامن میں اس لفظ بے صوت سے

خوبصورت کوئی استعارہ نہیں

آسماں آسماں

اس ستارے سے روشن ستارا نہیں

یہ ازل کے سمندر کی وہ موج ہے

جس کا حد ابد بھی کنارا نہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

اس وقت جو دریا ہے

ہم تم بھی یہیں ہوں گے یہ پل بھی یہیں ہوگا
اس وقت جو دریا ہے کل صبح نہیں ہوگا
آنسو کی طرح لمحے پلکوں پہ لرزتے ہیں
پھر وقت کے دریا میں اس طرح اترتے ہیں
پہنائی صحرا میں
جس طرح کوئی ذرہ
بے نام ونشاں ہوجائے
ہونے کا گماں ہوجائے
یہ جمتا ہوا آنسو .... یہ ٹھہرا ہوا لمحہ
اک جھیل سی ہے جس میں
اک وصل رمیدہ کے کچھ پھول مہکتے ہیں .... کچھ عکس لرزتے ہیں
یہ عکس لرزنے دے .... یہ پھول مہکنے دے!
اس جھیل کے ساحل پر اس چاند کو چمکنے دے!
آنکھوں سے گرا آنسو ٹوٹا ہوا پرچم ہے
ساحل کے ادھر ہر سو اک ہجر کا موسم ہے
اس ہجر کے موسم میں
یہ جھیل کہیں ہوگی یہ چاند کہیں ہوگا
اس وقت جو دریا ہے! کل صبح نہیں ہوگا!!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کبھی رقص شام بہار

کبھی رقص شام بہار میں اسے دیکھتے
کبھی خواہشوں کے غبار میں اسے دیکھتے

مگر ایک نجم سحر نما، کہیں جاگتا
ترے ہجر کی شب تار میں اسے دیکھتے

وہ تھا ایک عکس گریز پا، سو نہیں رکا
کئی عمر دشت و دیار میں اسے دیکھتے

وہ جو بزم میں رہا بے خبر کوئی اور تھا
شب وصل میرے کنارے میں اسے دیکھتے

جو ازل کی لوح پہ نقش تھا، وہی عکس تھا
کبھی آپ قریہ دار میں اسے دیکھتے

وہ جو کائنات کا نور تھا، نہیں دور تھا
مگر اپنے قرب و جوار میں اسے دیکھتے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

یہی اب جو ہے یہاں نغمہ خواں یہی خوش بیاں
کسی شام کوئے نگار میں اسے دیکھئے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

یہ جو ریگ دشت فراق ہے

یہ جو ریگ دشت فراق ہے یہ رکے اگر
یہ رکے اگر تو نشاں ملے .... یہ نشاں ملے
کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے
یہ گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں!
مرے آسماں سے کدھر گئی ترے التفات کی کہکشاں
مرے بے خبر' مرے بے نشاں
یہ رکے اگر تو پتہ چلے
میں تھا کس نگر تو رہا کہاں!
کہ زماں مکاں کی یہ وسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
(وہ مرے نصیب کی بارشیں
کسی اور چھت پہ برس گئیں!)
مرے چار سو ہے غبار جاں' وہ فشار جاں
کہ خبر نہیں مرے ہاتھ کو مرے ہاتھ کی
مرے خواب سے ترے بام تک
تری رہگزر کا تو ذکر کیا
نہیں ضوفشاں ترا نام تک!
ہیں دھواں دھواں' مرے استخواں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

مرے آنسوؤں میں بجھے ہوئے مرے استخواں

مرے نقش گر مرے نقش جاں

اسی ریگ دشت فراق میں رہے منتظر....... ترے منتظر

مرے خواب، جن کے فشار میں

رہی میرے حال سے بے خبر

تری رہگزر

تری رہگزر کہ جو نقش ہے مرے ہاتھ پر

مگر اس بلا کی ہے تیرگی

کہ خبر نہیں مرے ہاتھ کو مرے ہاتھ کی

وہ جو چشم شعبدہ ساز تھی وہ اٹھے اگر

مرے استخواں میں ہو روشنی

اسی ایک لمحہ دید میں تری رہگزر

مری تیرہ جاں میں چمک اٹھے

مرے خواب سے ترے بام تک

سبھی منظروں میں دمک اٹھے

اسی ایک پل میں ہو جاوداں

مری آرزو کہ ہے بے کراں

مری زندگی کہ ہے مختصر

یہ جو ریگ دشت فراق ہے یہ رکے اگر!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کسی کی آنکھ میں خود کو

کسی کی آنکھ میں خود کو تلاش کرنا ہے
پھر اس کے بعد ہمیں آئینوں سے ڈرنا ہے

فلک کی بند گلی کے فقیر ہیں تارے!
کہ گھوم پھر کے یہیں سے انہیں گزرنا ہے

جو زندگی تھی مری جان! تیرے ساتھ گئی
بس اب تو عمر کے نقشے میں وقت بھرنا ہے

جو تم چلو تو ابھی دو قدم میں کٹ جائے
جو فاصلہ مجھے صدیوں میں پار کرنا ہے

تو کیوں نہ آج یہیں پر قیام ہو جائے
کہ شب قریب ہے، آخر کہیں ٹھہرنا ہے

وہ میرا سیل طلب ہو کہ تیری رعنائی
چڑھا ہے جو بھی سمندر، اسے اترنا ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سحر ہوئی تو ستاروں نے موند لیں آنکھیں
وہ کیا کریں کہ جنہیں انتظار کرنا ہے

یہ خواب ہے کہ حقیقت، خبر نہیں امجد
مگر ہے جینا یہیں پر، یہیں پہ مرنا ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

زندگانی، جاودانی بھی نہیں

زندگانی، جاودانی بھی نہیں
لیکن اس کا کوئی ثانی بھی نہیں

ہے سوا نیزے پہ سورج کا علم
تیرے غم کی سائبانی بھی نہیں

منزلیں ہی منزلیں ہیں ہر طرف
راستے کی اک نشانی بھی نہیں

آئینے کی آنکھ میں اب کے برس
کوئی عکس مہربانی بھی نہیں

آنکھ بھی اپنی سراب آلود ہے
اور اس دریا میں پانی بھی نہیں

جز تحیرِ گردِ باد زیست میں
کوئی منظر غیر فانی بھی نہیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

درد کو دلکش بتائیں کس طرح!
داستاں غمِ کہانی بھی نہیں

یوں لٹا ہے گلشن وہم و گماں
کوئی خار بدگمانی بھی نہیں

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

زندگی درد بھی، دوا

زندگی درد بھی، دوا بھی تھی
ہم سفر بھی، گریز پا بھی تھی

کچھ تو تھے دوست بھی وفا دشمن
کچھ مری آنکھ میں حیا بھی تھی

دن کا اپنا بھی شور تھا لیکن
شب کی بے آواز صدا بھی تھی

عشق نے ہم کو غیب دان کیا
یہی تحفہ یہی سزا بھی تھی

گرد باد وفا سے پہلے تک
سر پہ خیمہ بھی تھا ردا بھی تھی

ماں کی آنکھیں چراغ تھیں جس میں
میرے ہمراہ وہ دعا بھی تھی

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کچھ تو تھی رہگزر میں شمع طلب
اور کچھ تیز وہ ہوا بھی تھی

بے وفا تو وہ خیر تھا امجد
لیکن اس میں کہیں وفا بھی تھی!

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تم جس خواب میں آنکھیں کھولو
اس کا روپ امر
تم جس رنگ کا کپڑا پہنو
وہ موسم کا رنگ
تم جس پھول کو ہنس کر دیکھو
کبھی نہ وہ مرجھائے
تم جس حرف پہ انگلی رکھ دو
وہ روشن ہو جائے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جب شب کے شکستہ زینوں سے مہتاب اترنے لگتا ہے
جب غم کے سرد الاؤ میں امیدیں بجھنے لگتی ہیں
جب دل کے شور سمندر میں آوازیں مرنے لگتی ہیں

جب موسم ہاتھ نہیں آتے جب تتلی بات نہیں کرتی
جب زندہ رہنا اک بے معنی کام دکھائی دیتا ہے
جب آنے والا ہر لمحہ دشنام دکھائی دیتا ہے

جب یاد کے گہرے سناٹے میں چہرے گم ہو جاتے ہیں
جب درد سے بوجھل آنکھوں میں گرداب سے پڑنے لگتے ہیں
جب شمعیں گل ہو جاتی ہیں جب خواب بکھرنے لگتے ہیں
اس وقت اگر تم آ جاؤ! اس وقت اگر تم آ جاؤ!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

آنکھوں سے اک خواب

آنکھوں سے اک خواب گزرنے والا ہے
کھڑکی سے مہتاب گزرنے والا ہے

صدیوں کے ان خواب گزیدہ شہروں سے
مہر عالم تاب گزرنے والا ہے

جادوگر کی قید میں تھے جب شہزادے
قصے کا وہ باب گزرنے والا ہے

سناٹے کی وحشت بڑھتی جاتی ہے
بستی سے سیلاب گزرنے والا ہے

دریاؤں میں ریت اڑے گی صحرا کی
صحرا سے گرداب گزرنے والا ہے

مولا جانے کب دیکھیں گے آنکھوں سے
جو موسم شاداب گزرنے والا ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ہستی امجد دیوانے کا خواب سہی
اب تو یہ بھی خواب گزرنے والا ہے

◆◆◆

www.KitaabPoint.Blogspot.com

تم سچے برحق سائیں

تم سچے برحق سائیں
سر سے لے کر پیروں تک
دنیا شک ہی شک سائیں
تم سچے' برحق سائیں
اک بہتی ریت کی وحشت ہے
اور ریزہ ریزہ خواب مرے
بس ایک مسلسل حیرت ہے
کیا ساحل' کیا گرداب مرے!
اس بہتی ریت کے دریا پار
کیا جانے ہیں کیا کیا اسرار!
تم آقا چاروں طرفوں کے!
اور میرے چار طرف دیوار
اس دھرتی سے افلاک تلک
تم داتا' تم ہو پالنہار
میں گلیوں کا ککھ سائیں
تم سچے برحق سائیں
سر سے لے کر پیروں تک
دنیا شک ہی شک سائیں!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

کچھ بھید ازل سے پہلے کا!

کچھ راز ابد کی آنکھوں کے!

کچھ قصہ ہجر سراپے کا

کچھ بھیگے موسم خوابوں کے!

کوئی چارہ میری پستی کا!

کوئی دارو آنکھ ترستی کا!

بس ایک نظر سے جڑ جائے

آئینہ میری ہستی کا

ازلوں سے راہیں تکتا ہے

اک موسم دل کی بستی کا

اس کی اور بھی تک سائیں

تم سچے برحق سائیں

سر سے لے کر پیروں تک

دنیا شک ہی شک سائیں!

تم سچے برحق سائیں

میں ایک بھکاری لفظوں کا

یہ کاغذ ہیں کشکول مرے

ہیں ملبہ زخمی خوابوں کا

یہ رستہ بھٹکے بول مرے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

یہ ارض و سما کی پہنائی
یہ میری ادھوری بینائی
کیا دیکھوں، کیسے دیکھ سکوں!
یہ ہجر کی جلوہ آرائی
یہ رستہ کالے کوسوں کا
اور ایک مسلسل تنہائی
مانگوں ایک جھلک سائیں
تم سچے برحق سائیں
سر سے لے کر پیروں تک
دنیا شک ہی شک سائیں
تم سچے برحق سائیں!

www.KitaabPoint.Blogspot.com

بوڑھا کسان

کسان ہوں میں
ازل سے اب تک زمیں کے سینے میں رزق بونا
مرا مقدر لکھا گیا ہے
تمام موسم مرے لیے موسمِ سزا ہیں
مرے گرسنہ اداس بچے دہکتی فصلوں کو دیکھتے ہیں
تو پوچھتے ہیں

"اگر یہ فصلیں تمہاری محنت سے خون لے کر
جواں ہوئی ہیں
تو ان کا جوبن ہمارے گھر کے بجائے گاؤں
کی سب سے اونچی سیہ حویلی کا نور کیوں ہے!
جوان دلہن سی فصل جس کو
ہوا کا جھونکا جو چھو کے گزرے تو کانپتی ہے
ہمارے ہاتھوں سے دور کیوں ہے!"

میں اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں
یہ کن گناہوں کے سلسلے میں مرے حوالے کیے گئے ہیں
کہ ان کی قسمت میں بھوک لکھی ہے اور مجھ کو

www.KitaabPoint.Blogspot.com

زمیں کے سینے میں رزق بونے کا کام بخشا

گیا ہے تا کہ مری ہی محنت مرے لیے دور کی صدا ہو

سوال جی میں اٹھیں کچھ ایسے کہ سننے والا بہت خفا ہو

www.KitaabPoint.Blogspot.com

خدائے برتر

جو کچھ ہے

تو ہے

تری مشیت وہ لفظِ اول ہے جس کا آخر

تو آپ ہی ہے

تو ایسا رازق ہے جس کے دستِ عطا سے پتھر

میں بند کیڑے کی زندگی ہے

تجھے یقیناً یہ علم ہوگا

کہ اس زمیں پر کچھ ایسی بدبخت بستیاں بھی ہیں جن کے باسی

تری توجہ کے خواب قریے میں جی رہے ہیں

تری توجہ کا خواب قریہ جہاں اندھیرا ہی روشنی ہے

مجھے بتا ان گرسنہ نسلوں کا جرم کیا ہے

یہ کس سے اپنے گناہ پوچھیں

جو اپنے رستے سے بے خبر ہوں!

وہ کس طرح تیری راہ پوچھیں!

خدائے برتر....... خدائے برتر

www.KitaabPoint.Blogspot.com

نوجوان کسان

خدائے برتر' تری زمیں پر

یہ راہ بھولا ہوا قبیلہ کسی ٹھکانے کو ڈھونڈتا ہے

کوئے ٹھکانہ!

جہاں حفاظت' سکون' راحت

متاع محنت کا اجر' رنگ گل تمنا کی سبز خوشبو

مشام جاں کو بہار کر دے

کوئی ٹھکانہ' خدائے برتر

جہاں پہ طاقت وروں کی طاقت

تونگروں کی تجوریوں میں کھنکتے سکے

کسی کی عزت کی سمت میلی نظر سے تکتی ہوئی نگاہوں

کا خوف سایہ نہ راہ پائے

زمین کا مالک وہی ہو جس کے جوان بازو

پسینہ بن کر چمکتی محنت سے خشک مٹی میں بیج بوئیں

وہی زمینوں سے اٹھنے والی حسیں مہک کو

بدن سے اٹھتی ہوئی مہک سے ملا کے نکلے

جو گرمیوں کی

لہو جلاتی ہوئی ہواؤں میں ہل چلائے

بدن کو ڈستے ہوئے زمستاں کی کہر افشاں فضا میں

کھیتوں کی آبیاری کو گھر سے نکلے

زمیں پہ حق ہو اسی بشر کا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

جو اپنے ہاتھوں سے خشک مٹی
کو سبز کھیتوں کا رنگ بخشے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

چودھری

تیری یہ جرأت، تو میرے کھیتوں پہ حق جتائے
تجھے خبر ہے کہ تیرے جیسے کئی مزارعے
مری نگاہوں کے اک اشارے پہ میرے تلووں کو چاٹتے ہیں
مری زمیں ہے مرے لیے اس پہ کام کرنا
تمہارے جینے کا راستہ ہے
اگر میں تم کو یہاں نہ رکھتا
تو اور کوئی مرے لیے اس پہ کام کرتا
مگر زمیں کا وجود قائم ہے اور دائم
رہے گا میں اور میرے بچے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

ابد تلک اس کی بخششوں کا خراج لیں گے

کہ سارے مالک خراج لیتے ہیں

ہاتھ باندھو!

جھکاؤ سر کو!

بھکاریوں کی طرح ترستی ہوئی نگاہوں میں اشک بھر کے

مری حویلی کی خیر مانگو

اگر کسی نے مری حویلی کے گرد لہجہ بلند کر کے صدا لگائی

تو یاد رکھو

میں ان زبانوں کو کاٹ دیتا ہوں جن کے مالک

مری حکومت سے بے خبر ہوں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

گیت

درِ طلسمِ صدا کھلے تو اسے پکاریں
کہ اس کے ہاتھوں میں خواہشوں کا قبول رد ہے
اسے دکھائیں کہ کتنے بادل
ہمارے کھیتوں سے بے تعلق نکل گئے ہیں
اسے بتائیں کہ کتنی کلیاں
کشادہ ہونے کی آرزو میں بکھر گئی ہیں
رلائیں اس کو ان آنسوؤں پر
جو خشک آنکھوں میں کھو گئے ہیں
درِ طلسمِ صدا کھلے تو اسے پکاریں

بوڑھا کسان

مرے خدایا کہاں تلک یہ عذاب جھیلیں
کہاں رکے گا یہ کاروانِ سیاہ قسمت!
اخیر ہوں گی کہاں پہ آخر
یہ دکھ کی بوجھل طویل راتیں
کبھی کبھی تو فریب لگتی ہیں آنے والے دنوں کی باتیں
گمان لگتی ہیں اپنی ذاتیں

www.KitaabPoint.Blogspot.com

مرے خدایا کوئی بشارت....... کوئی بشارت مرے خدایا

مرے خدایا

نوجوان

بشارتوں کا وروداں کے لیے نہیں ہے

جو منتظر ہیں

سکول کی منزل خود آپ چل کے قریب آئے

حصول منزل بنا سفر کے نہ ہو سکا ہے کبھی نہ ہو گا

مسافروں کے لیے سفر کا شعور لازم

بوڑھا

مگر ہمارے لیے تو رستے بھی منتخب ہیں

تمہیں پتا ہے سوال کرنے کی کیا سزا ہے؟

نوجوان

عذاب جو ہم پہ آرہے ہیں

تمام دنیا کی سب سزاؤں سے سخت تر ہیں

میں بزدلی کی حیات جی جی کے تھک گیا ہوں

میں آنسوؤں کے ایاغ پی پی کے تھک گیا ہوں

میں زندہ رہنے کی طرح زندہ رہوں گا میرا فیصلہ ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

میں جانتا ہوں سوال کرنے کی کیا سزا ہے!

بوڑھا

مگر وہ آقا

جو کتنی نسلوں سے ان زمینوں کا حکمراں ہے بگڑ گیا تو

ہماری جانوں کا کیا بنے گا

نوجوان

ہماری جانیں......

مرے مکرم ہماری جانیں تو اس کی نظروں میں خشک مٹی کی ڈھیریاں ہیں

جو ہوں تو کیا ہے نہ ہوں تو کیا ہے!

سنو! فضاؤں میں حوصلوں کی نوید ہم کو بلا رہی ہے

ہوا ترانے سنا رہی ہے

www.KitaabPoint.Blogspot.com

یہ ہوائے آخر شب ہے سحر آنے کو ہے
آرزو کے زرد لہجے میں اثر آنے کو ہے
پا سکیں گے بونے والے اپنی محنت کا ثمر
سیپیوں کی آستینوں میں گہر آنے کو ہے
ختم ہو جائے گا اب یہ سلسلہ بے نشاں
شوق کی منزلِ وفا کی رہگزر آنے کو ہے

نوجوان

زمیں کی آنکھیں
جوان جذبوں کی روشنی سے دمک رہی ہیں
اب اس زمیں سے جو کچھ اُگے گا
وہ ظالموں کی بجائے ان کو وصول ہوگا
جو اپنی محنت سے اس کو تخلیق کر رہے ہیں
یہ سردیوں کے خنک سویرے
یہ گرمیوں کے تنور موسم
دہکتی فصلوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں کے سبز ہاتھوں کو چومتے ہیں
ہوائیں ان کے گھروں میں بکھری ہوئی گھٹن کو

www.KitaabPoint.Blogspot.com

سکوں کی خوشبو سے بھر رہی ہیں
ترنجنوں میں کھنکتے لہجے نئے دنوں کی نوید پا کر چمک رہے ہیں
گلاب سینوں میں آنے والے بہار موسم مہک رہے ہیں
دلوں کی دھڑکن میں چوڑیوں کی کھنک بسی ہے
سہیلیوں کے مذاق آنکھوں میں الجھنوں کے حسین دھند لکے
بنا کے سانسوں میں پھیلتے ہیں
اور آہٹوں کو مسافروں کے وجود دے کر
سلگتی شاموں میں جاگتے ہیں
لبوں پہ نغمے مچل رہے ہیں

بوڑھا کسان

جواں ارادے نئی رتوں سے قدم ملا کے نئے سفر کی طرف چلے ہیں
دمکتی فصلوں کا روپ منزل کا آئینہ ہے
وطن کی منزل
جو پکی فصلوں کی مثل محنت کشوں کو اپنی
جبین روشن دکھا رہی ہے

نوجوان

کہاں گئے وہ پرانے آقا!
خراج لیتے تھے جو غریبوں کی بے کسی کا

www.KitaabPoint.Blogspot.com

خراج لیتے تھے ان کی محنت کا' ان کی آنکھوں کی روشنی کا

ترنجنوں میں جوان ہوتے ہوئے خیالوں کی دل کشی کا

بوڑھا

حویلیوں کے نواح بڑھتی ہوئی صداؤں سے گونجتے ہیں

مگر جو خوشبو کے راستے میں فصیل ہونے کے مدعی تھے

ہوا کے جھونکوں سے ڈر رہے ہیں

بدل رہا ہے جہان کہنہ تازہ ابھر رہا ہے

زمیں کا چہرہ نکھر رہا ہے

کورس

زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے

بکھر رہی ہے فصیل ظلمت' وفا کا سورج نکل رہا ہے

نظر میں جذبے جواں ہوئے ہیں' دلوں میں دریا اچھل رہا ہے

زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے

بڑھا ہے محنت کشوں کا لشکر

ہلوں کی ہتھی پہ ہاتھ رکھ کر

اداس کھیتوں پہ بچھ رہی ہے

دمکتی فصلوں کی چاند چادر

کرے جو محنت وہی ہے مالک

www.KitaabPoint.Blogspot.com

حویلیوں کا نہیں رہا ڈر

چلو فضاؤں کا ذرہ ذرہ حسین رنگوں میں ڈھل رہا ہے

زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے

ساحلوں کی ہوا
امجد اسلام امجد
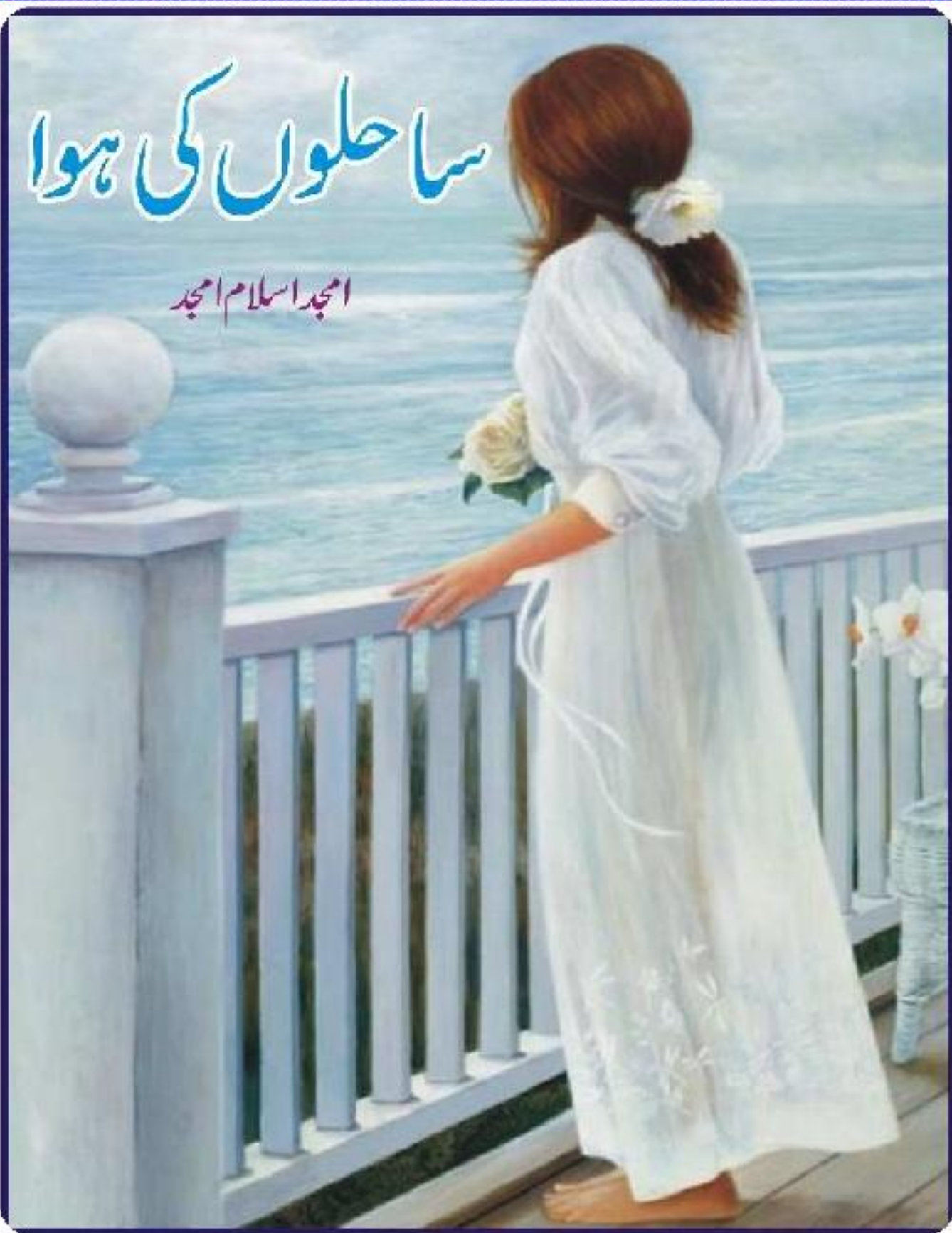
ساحلوں کی ہوا

امجد اسلام امجدؔ

حمد

ہر ایک لغزش پا کو سنبھالنے والا
وہی ہے سب کو غموں سے نکالنے والا

درون سنگ جو دیتا ہے رزق کیڑے کو
وہی ہے دل میں امیدوں کو پالنے والا

یہ کہکشاؤں کی شمعیں اسی سے روشن ہیں
کہ جس کا نور ہے روحیں اجالنے والا

شکست خوردہ دلوں کو نشان فتح وہی
وہی ہے بیج کو پھولوں میں ڈھالنے والا

بس اک نگاہ وہی گرہیں کھولنے والی
بس اک سخن وہی رستے نکالنے والا

فلک کو دیتا ہوا بے نشان پہنائی
زمین کی سمت ستارے اچھالنے والا

اسی نے لفظ کی حرمت لبوں کو سکھلائی
وہی ہے پاس وفا دل میں ڈالنے والا

درون جاں یہ ہدایت کی لو اسی سے ہے
وہی ہے روح کا زنداں اجالنے والا

◆◆◆

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عجب یہ رتبہ دعا کو ملا مدینے میں
کہ لفظ کوئی نہ خالی گیا مدینے میں

خوشا وہ آنکھ جو روضے کی جالیوں پہ کھلی
خوشا وہ دل کہ ہوا مبتلا مدینے میں

گیا تھا جب تو کوئی اور آدمی تھا میں
میں اپنے آپ سے واقف ہوا مدینے میں

نہ ایک پل کو ٹھہرتا نہ بند ہوتا ہے
ہوا مثال فضل خدا مدینے میں

وہ چند روز مری زندگی کا حاصل ہیں
میں جن کی چھاؤں میں آیا گیا مدینے میں

کوئی کہیں سے بھی آئے غریب شہر نہیں
عجیب راز یہ ہم پر کھلا مدینے میں

مگر یہ ایک کرشمہ ہے ان کی رحمت کا
کہ لو بھی لگتی ہے باد صبا مدینے میں

وہ بات ان کو پہنچتی ہیں جو دلوں میں ہو
بیاں سے پہلے ملے دعا مدینے میں

خوشی سے گھومو یہاں ناچتے پھرو امجد
کسی کو کوئی نہیں روکتا مدینے میں

◆◆◆

تیرے کوچے میں ٹھہرنے

تیرے کوچے میں ٹھہرنے کا بہانہ ہی سہی
تیرے ملنا جو نہیں جان سے جانا ہی سہی

زندگی ایک پہیلی ہے جدھر سے دیکھیں
یہ حقیقت نہ سہی' ایک فسانہ ہی سہی

ہم کو جانا ہے بہر طور' تمہاری جانب
راستہ روکے ہوئے ایک زمانہ ہی سہی

ہر دفعہ جسم نیا' قبر نئی ہوتی ہے
خاک سے خاک کا یہ میل پرانا ہی سہی

جس طرف تو ہے' ادھر ہوں گی سبھی کی نظریں
عید کے چاند کا دیدار' بہانہ ہی سہی

◆◆◆

انکشاف

نہ وعدہ ہے کوئی تم سے' کوئی رشتہ نبھانے کا
نہ کوئی اور ہی دل میں' تہیہ یا ارادہ ہے
کئی دن سے مگر دل میں
عجب الجھن سی رہتی ہے!
نہ تم اس داستاں کے سرسری کردار ہو کوئی
نہ قصہ اتنا سادہ ہے
تعلق جو میں سمجھا تھا کہیں اس سے زیادہ ہے!!

◆◆◆

ریگ رواں

وقت رکتا ہی نہیں ریگ رواں کی صورت
کوئی بنتی ہی نہیں نام و نشاں کی صورت

موسم گل کی طرح جب ہو خزاں کی صورت
کس طرح نکلے گی ایسے میں بیاں کی صورت

ثبت ہے وقت کا ایک ایک نشاں چہرے پر
ہم کو دیکھو جو نہ دیکھی ہو فغاں کی صورت

◆◆◆

انتظار

میں جہاں گیا مرے ساتھ ہی
مری خواہشوں کا قفس گیا
وہ سحاب میں جسے دیکھنے کو ترس گیا
کہیں اور جا کے برس گیا
وہ جو پھول تھا مرے ہاتھ میں وہ بکس گیا
مری آنکھ کب سے ہے منتظر کسی موج باد بہار کی

◆◆◆

وقت کا دریا

آگ اور خاک کا سنگم ہے ہمارا ملنا
بیچ میں وقت کا دریا جو بہا جاتا ہے
کیسے ممکن ہو کنارے سے کنارا ملنا
اس قدر بھیڑ ہے تاروں کی سر محفل شب
سخت دشوار ہے قسمت کا ستارا ملنا

◆◆◆

شفیق الرحمن

بہت عجیب شخص تھا
تمام عمر جس قلم سے دوسروں کے واسطے
لکھے تھے اس نے قہقہے
اسی قلم سے اپنا کوئی ایک دکھ نہ لکھ سکا
بہت عجیب شخص تھا

1

تیرا نام لیا

تیرا نام لیا
صبح و شام لیا

اس نے آنکھوں سے
کتنا کام کیا

ہم نے محفل میں
خالی جام لیا

گرتے گرتے بھی
تم کو تھام لیا

بیٹھے سوچتے ہیں
کیوں الزام لیا

روشن صبحوں سے
اک پیغام لیا

درس آزادی

زیر دام لیا

◆◆◆

پیادے

شاہ و وزیر و فیل و رخ و اسپ سست رو

جتنے ہیں اس بساط پہ مہرے سجے ہوئے

سب ہی کی خیر ہو

لیکن اے خوش نگہ

جب کھیلنے کے واسطے بیٹھو تو دیکھنا

خود سے کلام کرتے ارادوں کی صف میں ہیں

کیا لوگ ہیں پیادوں کی صف میں ہیں

◆◆◆

دم بدم گھٹتی ہوئی

دم بدم گھٹتی ہوئی مہلت فسانی کی قسم
تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے پانی کی قسم

رات ڈھلتے ہی بدل جاتے ہیں سارے منظر
نشہ حسن کی صہبائے جوانی کی قسم

اس کا گھر راہ میں آئے تو وہیں رک جانا
دجلہ درد تجھے تیری روانی کی قسم

جاں بلب رہتا ہے جس شخص کے ہاتھوں یہ دل
اب بھی کھاتا ہے اسی دشمن جانی کی قسم

لفظ اظہار کے پابند ہیں، معنی کے نہیں
تیری خاموشی، مری شعلہ بیانی کی قسم

یہ وہ پستی ہے جسے رشک سے دیکھے نعت
خلد سے تا بہ زمیں نقل مکانی کی قسم

رنگ آنکھوں میں ہوا کرتے ہیں منظر میں نہیں
موسمِ گل کی قسم، شامِ خزانی کی قسم

◆◆◆

احتمال

بہت مشکل نہ ہو جائے
تمنا اب جو رہتی ہے مری بے خواب آنکھوں میں
کہیں یہ دل نہ ہو جائے

کبھی آنکھ سے جو گرا نہیں

کبھی آنکھ سے جو گرا نہیں میں وہ اشک ہوں مرے دوستو
مرا ضبط ہے مری زندگی سو میں کیا کہوں مرے دوستو

میں تو اک حرف سوال ہوں میں تو ایک موج خیال ہوں
وہ سنے تو عرض وفا کروں' کہے تو بہوں مرے دوستو

تمہی میری رونق شہر تھے مری جاں تھے' معنی دہر تھے
مرا آس پاس اجڑ گیا' میں کہاں رہوں مرے دوستو

وہ جو پھول ہیں جو چراغ ہیں مرے نام کے وہ تمہیں ملیں
یہ جو زخم ہیں یہ جو داغ ہیں انہیں میں سہوں مرے دوستو

کہیں جیت کر تمہیں کھو نہ دوں تو شکست اپنی ہی مان لوں
مرے ظرف کا ہے یہ فیصلہ کہ میں چپ رہوں مرے دوستو

◆◆◆

سب سے اچھے لفظ

میں صبح و شام لکھتا ہوں
زمین پر جس قدر اچھی زبانیں بولی جاتی ہیں
میں ان سے حرف چنتا
اور تمہارا نام لکھتا ہوں

چراغ جلتے رہیں یا ہوا

چراغ جلتے رہیں یا ہوا ٹھہر جائے
تری نگاہ پہ ہر سلسلہ ٹھہر جائے

ٹھہر گیا ہے سر شام بہتا دریا بھی
کہیں یہ اب تو دل مبتلا ٹھہر جائے

کسی بھی حرف میں تاثیر ہی نہیں رہتی
دلوں کے بیچ اگر فاصلہ ٹھہر جائے

شب وصال میں کیسا عجب کرشمہ ہو
مقابل اس کے اگر آئینہ ٹھہر جائے

لرز رہا ہے ستارہ سا جو سر مژگاں
کچھ ایسا ہو ترے دامن پہ آ ٹھہر جائے

ترے سلوک سے ہوتا نہیں یہ اندازہ
کوئی اٹھے تری محفل سے یا ٹھہر جائے

قصور تھا کہ نہیں اس پہ خاک ڈالیں آپ
بس ایک بار ہے جو بھی سزا ٹھہر جائے

کسی کے وصل کا آیا نہیں ابھی موسم
کوئی بہار سے کہہ دو ذرا ٹھہر جائے

فنا کا کھیل ہے ہستی تو کیسے ممکن ہے
زوال عمر کا یہ سلسلہ ٹھہر جائے

پلٹ کے آئیں زمانے وہی محبت کے
کہ رنگ چلنے لگیں اور صبا ٹھہر جائے

کسی کا ساتھ ملے اور اس طرح امجد
کہ وقت چلتا رہے، راستہ ٹھہر جائے

◆◆◆

مجھے دیکھو

دریچہ یاد کا کھلتے ہی سب کچھ لوٹ آتا ہے
پرانے منظروں کو آنکھ پھر سے دیکھ پاتی ہے
تری تصویر بنتی ہے، تری آواز آتی ہے

غلط ہے
کہ کوئی گزرے کل میں جی نہیں سکتا
سرابوں میں بنے دریا سے پانی پی نہیں سکتا
مجھے دیکھو

◆◆◆

ایک پل

آہستگی سے گھٹتی ہوئی سہ پہر کی دھوپ
دل میں اتر رہی ہے کسی خواب کی طرح
نیلے فلک پہ ابر کے ٹکڑے کہیں کہیں
لرزاں ہیں دل کے ساز پہ مضراب کی طرح

صحنِ چمن میں ڈولتے رنگوں کے درمیاں
ہے ایک بے قرار سی خوشبو رکی ہوئی
ٹھہرے ہوئے سے وقت کی سرگوشیوں کے بیچ
تتلی کوئی ہے پھول کے لب پر جھکی ہوئی

پتے صبا کے پاؤں کی آہٹ کے منتظر
شاخوں کے درمیاں کوئی حیرت رواں سی ہے
بیٹھی ہے یوں وہ گھاس پہ پھولوں کے روبرو
آنکھوں کے آس پاس کوئی کہکشاں سی ہے

چہرے پہ دھوپ چھاؤں کا میلہ لگا ہوا
شانوں پہ بے دریغ سے گیسو کھلے ہوئے
قوسِ قزح نے اپنا خزانہ لٹا دیا

رنگت میں اس کی رنگ ہیں سارے گھلے ہوئے

آہٹ پہ میرے پاؤں کی دھیرے سے چونک کر
دیکھا ہے اس نے مڑ کے مجھے اس ادا کے ساتھ
پھیلی ہے جسم و جاں میں عجب ایک سرخوشی
خوشبو سی کوئی اڑنے لگی ہے ہوا کے ساتھ

کہتا ہے دل کہ اس سے کوئی بات کہیۓ
لمحہ یہی بیان غم آرزو کا ہے
ایسا نہ ہو سحر یہ موسم کا ٹوٹ جائے
اس کم سخن سے وقت یہی گفتگو کا ہے

◆◆◆

محبت کی اپنی الگ ہی زباں ہے

محبت سے خردمندی اگر مشروط ہوتی تو
نہ مجنوں دشت میں جاتا
نہ کوئی کوہ کن عشرت گہ خسرو سجانے کو
کبھی تیشہ اٹھاتا اور
نہ کوئی سوہنی کچے گھڑے پہ پار کرتی
چڑھتے دریا کو
نہ تم برباد کرتے اس طرح میری تمنا کو
نہ میں الزام دیتا اپنی ناکامی پہ دنیا کو
محبت سے خردمندی اگر مشروط ہوتی تو

وفا کو پیش ہیں جو امتحاں

وفا کو پیش ہیں جو امتحاں نئے بھی نہیں
وفورِ شوق و دلِ بد گماں نئے بھی نہیں

نئے نئے نظر آتے ہیں اس گلی کے لوگ
کسی کا ذکر جو چھیڑیں تو ہاں نئے بھی نہیں

مرے جوار میں یہ روشنی سی کیسی ہے
ستارے یوں تو سرِ آسماں نئے بھی نہیں

یہ آج کیوں مرے آنسو تمہیں عزیز ہوئے
کہ سیلِ درد کے یہ ترجماں نئے بھی نہیں

تو ان کا نام نہ جانے تو اور بات ہے یہ
تری گلی میں یہ آوارگاں نئے بھی نہیں

وہی ہے کھیل وہی مرحلے وہی ہم تم
یقیں پرانے نہیں ہیں گماں نئے بھی نہیں

◆◆◆

تمہارا غم

تمہارا غم سلامت ہے
تو پھر بازار ہستی میں
کسی کی کیا ضرورت ہے

◆◆◆

پس ہر آرزو آنکھیں تری ہیں

پس ہر آرزو آنکھیں تری ہیں
ہمارے چار سو آنکھیں تری ہیں

ستارے جھک کے باتیں سن رہے ہیں
کہ محو گفتگو آنکھیں تری ہیں

گل و شبنم میں تیرا عکس لرزاں
میان آب جو آنکھیں تری ہیں

بدن سے روح تک پھیلی ہے خوشبو
کچھ ایسی مشکبو آنکھیں تری ہیں

مرے زخموں کو نیند آنے لگی ہے
بہت تسکین خو آنکھیں تری ہیں

وہ کیا منظر ہے جس کے دیکھنے کو
بھٹکتی کو بہ کو آنکھیں تری ہیں

یہ بادل ہیں تری پلکوں کے سائے
ستارے ہو بہو آنکھیں تری ہیں

ترا الطاف ہے اپنا تعارف
ہماری آبرو آنکھیں تری ہیں

اجالے ہی اجالے ہر طرف ہیں
عجب خورشید رو آنکھیں تری ہیں

کہ جیسے ابر سے دریا کا رشتہ
ہماری جان تو آنکھیں تری ہیں

جو تو دیکھے تو ہم بھی جگائیں
ہماری جستجو آنکھیں تری ہیں

◆◆◆

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں

اے چشم یار تیرے ارادے کو دیکھ کر
ہاتھوں میں لے کے سر
ہم آ گئے ہیں آپ ہی مقتل کی راہ پر

◆◆◆

کیسے کہیں کہ تم سے

کیسے کہیں کہ تم سے بچھڑنے کا غم نہیں
اتنے بھی خود فریب مری جان ہم نہیں

خواہش بقدر وسعت داماں زیاد ہے
مل جاؤ مجھ کو دوست مگر ایک دم نہیں

ہم سے بہت سہی تری گلیوں میں جان جاں
دیکھو کبھی تو شہر میں تم سے بھی کم نہیں

یہ دن ہیں احتیاط کے سقراط کے نہیں
کاسے میں سکے بولتے ہیں اور سم نہیں

تیرا سلوک اہل حد بخت نارسا
اسباب کون سا ہے جو ہم کو بہم نہیں

◆◆◆

ریت

ریت سرکتی ہے
ریت کا کام سرکنا ہے سو ریت سرکتی رہتی ہے
شہروں کی آواز کو سن کر
صحرا پیچھے ہٹ جاتے ہیں
چشمے خاک سے بھر جاتے ہیں
نخلستان سمٹ جاتے ہیں
ریت بھٹکتی رہتی ہے
ریت کا کام بھٹکنا ہے سو ریت بھٹکتی رہتی ہے
ریزہ ریزہ اس کو سمیٹیں
جاں پر بوجھ لیے رکھیں ہم
لاکھ جتن سے اس کو روکیں
مٹھی بند کیے رکھیں ہم
ریت پھسلتی رہتی ہے
ریت کا کام پھسلنا ہے سو ریت پھسلتی ہے

ساحل ساحل بکھری یادوں
آب رواں کی تحریروں کو
موج بہا کر لے جاتی ہے

ریت کی ساری تعمیروں کو

ریت بکھرتی رہتی ہے
ریت کا کام بکھرنا ہے سو ریت بکھرتی رہتی ہے

◆◆◆

غم زمانہ سے دل کو

غم زمانہ سے دل کو بچا کے رکھتے ہیں
تمہارے خواب سے آنکھیں سجا کے رکھتے ہیں

بھٹک رہے ہیں ترے شہر میں گداگر سے
وہ چند لوگ جو سکے وفا کے رکھتے ہیں

یہ دور اہل ہوس ہے یہاں پہ اہل حیا
بدن سمیٹ کے آنکھیں جھکا کے رکھتے ہیں

تمہارے آنے کا سنتے ہی گھر کی چیزوں کو
کبھی اٹھاتے کبھی پھر سے لا کے رکھتے ہیں

سنا ہے کانوں کے کچے ہو تم بہت سو ہم
تمہارے شہر میں سب سے بنا کے رکھتے ہیں

بیان کس کا غلط ہے قصور وار ہے کون
چلو حساب یہ آگے خدا کے رکھتے ہیں

جو اہل درد ہیں امجد وہ غم گزیدوں سے
سخن بہار کے لہجے صبا کے رکھتے ہیں

◆◆◆

شہرِ سبا

تھی وہ بلقیس کی ہم نام مگر اس کے لیے
وقت نے کھیل کوئی اور رچا رکھا تھا
خواب کے دشت میں خواہش کے صنم خانے میں
وہ جو اک شہرِ سبا اس نے بسا رکھا تھا
جس کی ہر راہ کو پھولوں سے سجا رکھا تھا

اس کے بام و در و دیوار کی تعمیر میں تھا
اس کے اجداد کا خوں
آگ اور خوف کے دریا سے گزر کر اس نے
پائی تھی صبح سکوں
پھر بھی بے چین بہت رہتی تھی آنکھیں اس کی
وہ جو اک شہر طلب شہر اماں شہر یقیں
اس کے احساس میں خوشبو کی طرح رہتا تھا
یہ تو وہ شہر نہ تھا
ان مکانوں کو تو گھر ہونا تھا
یہ تو وہ لوگ نہ تھے
ان کو تو اہل ہنر ہونا تھا
وہ بہت سوچتی رہتی تھی

یہی کہتی تھی
یہ وطن غیب کا تحفہ ہے اسے رہنا ہے
میں نہ ہوں گی نہ سہی
یہ جو دریائے محبت ہے تنک آب بہت
اس کو اک روز سمندر کی طرح بہنا ہے
میں نہ ہوں گی نہ سہی

تیرا کیا بنے گا اے دل

کسی خواب سے فروزاں کسی یاد میں سمٹ کر
کسی حسن سے درخشاں کسی نام سے لپٹ کر

وہ جو منزلیں وفا کی مرے راستوں میں آئیں
وہ جو لذتیں طلب کی مرے شوق نے اٹھائیں

انہیں اب جمع کرکے کبھی دھیان میں جو لاؤں
تو ہجوم رنگ و بو میں کوئی راستہ نہ پاؤں

کہیں خوشبو کی جھلمل کہیں خواہشوں کے ریلے
کہیں تتلیوں کے جمگھٹ کہیں جگنوؤں کے میلے

پہ یہ دل فریب منظر کہیں ٹھہرتا نہیں ہے
کوئی عکس بھی مسلسل سر آئینہ نہیں ہے

انہیں کس طرح سمیٹوں کہ سے کا تیز دھارا
سر موج زندگانی ہے فنا کا استعارا

یہی چند ثانیے ہیں مری ہر خوشی کا حاصل
نہ کھلے گرہ بھنور کی، نہ ملے نشاں کا حاصل
ترا کیا بنے گا اے دل! تیرا کیا بنے گا اے دل

◆◆◆

ارض وطن کے لیے

اک نظم لکھیں
اے ارض وطن ہم تیرے لیے اک نظم لکھیں
تتلی کے پروں سے رنگ چنیں
ان سازوں سے آہنگ چنیں
جو روح میں بجتے رہتے ہیں
اور خواب بنیں ان پھولوں کے
جو تیری مہک سے وابستہ
ہر آنکھ میں سجتے رہتے ہیں
ہر عکس ہو جس میں لاثانی
ہم ایسا اک ارژنگ چنیں
تتلی کے پروں سے رنگ چنیں
اور نظم لکھیں

وہ نظم کہ جس کے حرفوں جیسے حرف کسی ابجد میں نہیں
وہ رنگ اتاریں لفظوں میں جو قوس قزح کی زد میں نہیں
اور جس کی ہر اک سطر میں خوشبو ایسے لہریں لیتی ہو
جو وہم و گماں کی حد میں نہیں
اور جب یہ سب انہونی باتیں ان دیکھی اَن چھوئی چیزیں

اک دوجے میں مل جائیں تو نظم بنے
اے ارض وطن وہ نظم بنے جو اپنی بنت میں کامل ہو
جو تیرے روپ کے شایاں ہو اور میرے ہنر کا حاصل ہو
اے ارض اماں، اے ارض وطن
تو شاد رہے آباد رہے
میں تیرا تھا، میں تیرا ہوں
بس اتنا تجھ کو یاد رہے
اس کشت ہنر میں جو کچھ ہے
کب میرا ہے
سب تجھ سے ہے سب تیرا ہے

یہ حرف وسخن، یہ لوح وقلم
سب اڑتی دھول مسافت کی
سب جوگی والا پھیرا ہے
سب تجھ سے ہے سب تیرا ہے
سب تیرا ہے

◆◆◆

پس منظر میں منظر گم

پس منظر میں منظر گم
دریا بیچ سمندر گم

ایک ہی طاقِ نسیاں میں
دارا گم سکندر گم

ریت کو جیسے نگلے ریت
غم ہے غم کے اندر گم

وقت کی اڑتی مٹی میں
کیسے کیسے لشکر گم

بنتے بنتے مٹتے رنگوں میں
میں رہتا ہوں اکثر گم

موتی گم ہے سیپی میں
میں ہوں اپنے اندر گم

ایک ہی حیرت میں امجد
دھرتی، آنکھیں، امبر گم

◆◆◆

معجزہ

محبت اور خواہش میں کئی بے نام رشتے ہیں
مگر جو غور سے دیکھیں
تو دونوں میں بہت سے فاصلے بھی اس طرح موجود ہیں جیسے
سمندر ایک ہوتا ہے
مگر اس کے کنارے ایک دوجے سے سراسر
اجنبی اور مختلف رستوں کو چھوتے ہیں
سو ایسا ہے
سے کے اس سمندر میں
جہاں ہر شے بدلتی ہے
وہاں ہم تم بھی بدلے ہیں، بدلنا تھا
کہ رشتے بھی ہمارے عکس کی صورت
بہت آہستگی سے اس طرح کروٹ بدلتے ہیں
بسا اوقات بستر پر پڑی چادر پہ سلوٹ تک نہیں پڑتی
نہ آنکھوں میں سفر کرتے پرانے رنگ ہی تبدیل ہوتے ہیں
نہ باتوں کے تسلسل میں کوئی دیوار آتی ہے

بس اتنا ہے
کہ خواہش کی بندھی مٹھی سے وہ جوریت سی پل پل

پھسلتی ہے اسی کے بیچ میں شاید وہ جذبہ بھی کہیں ہوتا ہے

جس کو پیار کہتے ہیں

محبت نام ہے جس کا

کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

ہمیں خود اپنے ہاتھوں سے پھسلتی ریت کی

ریزش کا اندازہ نہیں ہوتا

مگر وہ گرتی رہتی ہے

کبھی ہم اس کو پھر سے جمع کرنے اور اٹھانے کے لیے

کوشش بھی کرتے ہیں

مگر دن رات کی سرکش ہوائیں

اس قدر مٹی اڑاتی ہیں کہ کچھ بھی ہو نہیں پاتا

یہ دل فریاد تو کرتا ہے لیکن رو نہیں پاتا

تو وہ آنسو

کہ جن کو اس پھسلتی ریت میں بکھری محبت کو

دوبارہ زندگی دینا تھا اور شاداب کرنا تھا

نہیں بہتے

وہی آنکھیں کہ جن میں ہر گھڑی شمعیں سی جلتی تھیں

انہی چہروں پہ ہوتی ہیں مگر ان میں

محبت اور تعلق کو پرائی کو نہیں ہوتی

زمانہ ان کے اندر سے گزر کر خود تو جانے کس طرف جاتا

کہاں بسرام کرتا ہے

مگراس کے غبار راہ میں الجھے ہوئے رستے
کئی چہرے بدلتے ہیں
محبت کرنے والے شخص اوران کی محبت بھی
بدلتے وقت کی یلغار سے بچنے کی خاطر اک
نئی صورت میں ڈھلتے ہیں
وفا ہارے ہوئے میداں سے جو پرچم اٹھاتی ہے
انہی لشکر نہیں ملتا
گزرتے وقت کے آشوب میں چہرہ بدلتا ہے
تو پھر پیکر نہیں ملتا
سو جان جاں اگر ہم تم
بدلتے وقت کی اس تیز آندھی میں ابھی تک ایک ہیں
اور ایک دوجے کے لیے بے چین رہتے ہیں
تو شاید یہ ہمارے بخت کی خوبی ہماری خوش نصیبی ہے
کہ ہم دونوں گزرتے وقت کی سرکش روانی میں
بہے بھٹکے تو ہیں لیکن
ہمارے ساحلوں کا رخ کسی لمحے نہیں بدلا
یہ حسن اتفاق ایسا ہے جو قسمت سے ملتا ہے
بہت کڑوا سہی لیکن یہی سب سے بڑا سچ ہے
کہ جو لمحہ گزر جائے
وہ کتنا بھی مقدس قیمتی یا خوبصورت ہو
کبھی واپس نہیں آتا

محبت اور خواہش اور ان کے درمیاں پھیلے ہوئے
بے نام رشتے بھی انہی چیزوں میں شامل ہیں
جنہیں یہ وقت کا دریا
ہمارے چاہنے ناں چاہنے سے بے نیاز و بے خبر ہو کر
پرانی ڈائری پچھلے کیلنڈر کی طرح تبدیل کرتا ہے
اسے اک معجزہ کہیے
کہ خواہش کے سفر میں ہم نے جتنے موڑ کاٹے
جس قدر رہوار بدلے ہیں
وہ سب اک ساتھ بدلے ہیں
نہ گرتی ریت بدلی ہے نہ اپنے ہاتھ بدلے ہیں
اسے اک معجزہ کہیے

◆◆◆

دیکھوں دل آئینے میں

دیکھوں دل آئینے میں تجھے آشکار پھر
توفیق دے مجھے مرے پروردگار پھر

جب آدمی کی ذات سے اٹھنے لگے یقیں
میں دیکھتا ہوں اس کی طرف ایک بار پھر

آنکھوں سے ہو نہ پائی تھی مانوس روشنی
رستوں میں آ گئی ہے شب انتظار پھر

جائے گا کیا نہ دور خزاں اس چمن میں اب
آئے گی کیا نہ لوٹ کے فصل بہار پھر

جس میں حساب سود و زیاں درمیان ہو
امجد وہ عشق بھی تو ہوا کاروبار پھر

◆◆◆

ایک انوکھی کہانی

اربوں، کھربوں، تاروں اور سیاروں کی اس
بھیڑ میں رک کر دیکھ سکیں تو
اپنی زمیں کی ساری وسعت اور پھیلاؤ
دنیا بھر کے صحراؤں میں پھیلی ریت کا اک ذرہ یا
ممکن ہے اس سے بھی کم ہو
لیکن پھر بھی

اس موہوم سے ذرے اندر
کیسی کیسی دنیائیں اور کیا کیا منظر بستے ہیں
دیکھنے والی آنکھیں روز بدل جاتی ہیں منظر بجھتے رہتے ہیں
لیکن ہر منظر کے اندر اپنا ایک تماشا ہے
دیکھنے والی سب آنکھوں کی اپنی اپنی دنیا ہے
سورج کی شرطوں پر چلتا یہ جو ہمارا
جلتا بجھتا سیارا ہے
اب تک کے معلوم جہانوں کی یہ واحد آبادی ہی
آدم کا اور اس کی ساری نسلوں کا گہوارا ہے
ہست و بود کے جتنے منظر جتنے رنگ ہیں
ان سب کا ورتارا ہے
کیسا عجب تماشا ہے یہ

ایک ہی آدم کی اولادیں ایک ہی دھرتی پر رہتی ہیں
لیکن پھر بھی
اک دوجے کے بیچ میں کتنی دیواریں ہیں
رنگوں، نسلوں، ملکوں کی
دولت اور عقیدوں کی
جن سے دنیا ہم سب کی یہ ایک ہی دنیا
ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے
کوئی کسی کا میت نہ ہوگا، لمحوں کا فرمان یہی ہے
ہر گلشن کا رنگ جدا ہے موسم کا اعلان یہی ہے
ہم جس خلقت کا حصہ ہیں اس کی سب پہچان یہی ہے
بے چہرہ ہیں سب کے ہونٹ سوالی رہتے ہیں
بھوک کی بولی بولتی آنکھیں
پیٹ کے اندر ہوتی ہیں جو اکثر خالی رہتے ہیں
آئی ایم ایف اور اسی طرح کے کئی ادارے
اس کے رزق کا لقمہ لقمہ گنتے ہیں اور اس کو اس کے
اپنے ہی پیڑوں کا پھل بھی بھیک کی صورت ملتا ہے
یوں لگتا ہے جیسے سب اخلاقی قدریں سارے رشتے
صرف کتابوں میں ہوتے ہیں
جیسے بس یہ زور آور ہیں اصل حقیقت
باقی سارے قصے ہیں
ایک شکستہ آئینے کے ٹوٹے بکھرے حصے ہیں
ٹوٹے بکھرے ان حصوں کو جوڑے کون
چاروں اور سے گھیرا کرتی، دیواروں کو توڑے کون

یوں لگتا ہے
جیسے یہ اک خواب ہے جس کی کوئی بھی تعبیر نہیں
ٹکڑے ہو کر پھر سے ملنا دھرتی کی تقدیر نہیں
شاید یہ سب ٹھیک ہو لیکن
دل کہتا ہے
اس سارے سنسار سے اوپر
اور کوئی بھی تو رہتا ہے
جس کے حکم سے وقت کا دھارا
رکتا بھی ہے اور بہتا ہے
یہ جو اندر سے اٹھتی ہے ایک صدا انجانی سنئے
آیئے ایک کہانی سنئے
مکتب کی دیوار پہ چسپاں کرہ ارض کا اک نقشہ تھا
اس نقشے پر بنے ہوئے تھے کتنے ہزاروں شہر اور قصبے
نہریں جھیلیں دریا جنگل
گہرے اور منہ زور سمندر، ساحل، کوہستان
برفوں کے بے پایاں وسعت، جلتے ریگستان
اک دن اک بچے نے یونہی
کھیل کھیل میں نقشے والا کاغذ یکدم پھاڑ دیا

اور

اک اک کر کے اس کے اتنے ڈھیروں ٹکڑے کر ڈالے
جن کو اب ترتیب سے واپس جوڑ کے رکھنا ناممکن تھا
ٹیچر نے بچے کو ڈانٹا
جب تک سارے ٹکڑے جوڑ کے نقشے کو ترتیب مطابق نہیں کرو گے

تم کو چھٹی نہیں ملے گی

جاؤ اس کونے میں بیٹھو

اور یہ سارے پرزے جوڑو

سارا نقشہ پھر سے اس کی اصلی شکل میں واپس لاؤ

ٹیچر دل میں سوچ رہا تھا

کام بہت مشکل ہے لیکن بچے کی اصلاح کی خاطر اتنی سختی لازم ہے

لیکن اس کی حیرت کی تو حد نہ رہی جب اس نے دیکھا

بچہ پانچ منٹ میں سارا نقشہ جوڑ کے لے آیا تھا

ہر شے اپنی جگہ پر ٹھیک طرح سے رکھی تھی

اس نے پوچھا

''تم نے اتنے ڈھیروں ٹکڑے اتنے تھوڑے وقت میں آخر

کیسے جوڑ لیے؟''

بچہ بولا

''اس نقشے کے پیچھے ایک انسان کا چہرا بنا ہوا تھا

میں نے جب وہ چہرہ جوڑا

دنیا کے نقشے کے ٹکڑے 'خود ہی جڑ کر

اپنی جگہ پر آ بیٹھے ہیں''

کیا یہ ایک کہانی ہے!

◆◆◆

فنا کی راہ پر کوئی

فنا کی راہ پر کوئی دوبارہ جا نہیں سکتا
گزرتا پل کبھی پھر سے گزارا جا نہیں سکتا

بہت نزدیک ہو کر بھی وہ اتنا دور ہے مجھ سے
اشارہ ہو نہیں سکتا' پکارا جا نہیں سکتا

یہ مد و جزر دنیا کھیل ہے سانپ اور سیڑھی کا
یہاں سے اور آگے استعارا جا نہیں سکتا

اسے میں کسی طرح پاؤں وہ مجھ تک کس طرح پہنچے
کہ اپنی راہ سے ہٹ کر ستارا جا نہیں سکتا

جہاں تک خواہشیں اس آدم خاکی کی جاتی ہیں
وہاں تک زندگی کا گوشوارا جا نہیں سکتا

کوئی پوچھے کہ آخر یہ وفا کا بوجھ کیسا ہے
سہارا بھی نہیں جاتا اتارا جا نہیں سکتا

سرکتی ریت رستوں کی نشانی بن نہیں سکتی
سے کی رہگزر میں گھر اسارا جا نہیں سکتا

کہیں پہ رک بھی سکتا ہے ہمارے عشق کا سودا
کہ جاناں حد سے آگے تو خسارا جا نہیں سکتا

◆◆◆

نیلسن منڈیلا کے لیے ایک نظم

چاروں جانب ایک مسلسل تاریکی تھی
جس میں دن اور رات کے آنے جانے کا احساس نہیں تھا
کوئی اس کے پاس نہیں تھا
زنداں کے دیوار و در پر سایہ کرتی خاموشی کو
پہرے پر مامور، دھمکتے قاتل قدموں کی آوازیں
اور بھی گہرا کر دیتی تھیں
وہ آوازیں جن کو سنتے اس زمانے بیت گئے تھے
پورے بیس اور سات برس
اتنے برس تو' قاتل قدموں والے ان بیدادگروں میں
کچھ کی پوری عمر نہیں تھی
جانے کس مٹی سے بنا تھا
زنداں کی دیوار سے لگ کر بیٹھا وہ خاموش ''ارادہ''
اپنے سے مجبور' نہتے' کالے لوگوں کا ''شہزادہ''
ایک انوکھا آدم زادہ
جس کی روح میں کھلتے پھول کی روشن خوشبو
زنداں کی دیوار سے باہر قریہ قریہ پھیل رہی تھی
اس کی آنکھیں ایسے خوابوں سے روشن تھیں
جن کی لو میں لمحہ لمحہ طوق و سلاسل پگھل رہے تھے

اس کے ذہن میں ان تعمیروں کے نقشے تھے

جن کے چاروں جانب دہشت کا ڈیرا تھا

لاشیں تھیں اور سپنے تھے

مرنے والے سب اس کے ہمزاد تھے' اس کے اپنے تھے

بے چہرہ سے لوگ جو اپنے

گھر کے ہوتے بھی بے گھر تھے

جن کی آنکھیں لہو لہو تھیں

جن کے منظر' بے منظر تھے

وہ زندانی' وہ تنہا خاموش ہیولا

اک ایسا ''اظہار'' تھا جس کے

اک اک نقش میں لاکھوں چہرے سمٹ گئے تھے

اک ایسا ''انکار'' تھا جس میں

بل والوں کے گھڑے ہوئے لفظوں کے معنی الٹ گئے تھے

ایک ایسی ''دیوار'' تھا جس سے

کتنے ہی طوفان اٹھتے آئے تھے اور پلٹ گئے تھے

اس کی روح کے اندر جیسے چاروں جانب آئینے تھے

اس کو پتہ تھا

حدِ نظر تک پھیلی یہ تاریکی اپنی حد رکھتی ہے

زنداں کی دیوار کے باہر

اس کے خواب کی روشن خوشبو' سینہ سینہ پھیل رہی ہے

اس کو پتہ تھا

وہ دن اب کچھ دور نہیں جب اس کی دھرتی
''اس'' کی ہوگی اور سراسر گلشن ہوگی

جب وہ دنیا
آدرش اور امکان کی دنیا
ناممکن سے ''ممکن'' ہوگی
نئی صدی کے دروازے پر کھڑی یہ دنیا
جب جب پیچھے دیکھے گی تو ''اس'' کا سایا
منظر منظر پھیلا ہوگا
آدم کی توقیر کا قصہ جب بھی لکھا جائے گا
جلی قلم سے درج سنہرے اور دمکتے کچھ حرفوں میں
اس کا نام بھی لکھا ہوگا

◆◆◆

حقیقت کے نگر میں جاگتے

حقیقت کے نگر میں جاگتے لمحوں میں پھیلے گا
مرا خواب تمنا شہر کے رستوں میں پھیلے گا

یہی آواز کا صحرا یہی راتوں کا سناٹا
پرندوں کی صدا بن کر مری صبحوں میں پھیلے گا

محبت رنگ ہے ایسا کہ روکے سے نہیں رکتا
کبھی پھولوں میں بکھرے گا کبھی تاروں میں پھیلے گا

دما دم نت نئی کچھ کہکشائیں بنتی جاتی ہیں
وہ اک لمحہ نجانے کس قدر قرنوں میں پھیلے گا

اکیلے ساحلوں کی سرد راتوں میں یہ لپٹا ڈر
کئی بہروپ بدلے گا' کئی چہروں میں پھیلے گا

بڑے جتنوں سے جو غم کا دھواں میں نے سمیٹا تھا
کسے معلوم تھا اک دن تری آنکھوں میں پھیلے گا

یہی لمحہ وفا کا جو ہمارے بیچ ٹھہرا ہے
اسے محفوظ کر لیں تو کئی صدیوں میں پھیلے گا

وفا کے بام و در پہ ڈولتا یہ ہجر کا سایا
مری صبحیں اجاڑے گا تری شاموں میں پھیلے گا

میں ہٹ جاؤں گا منظر سے مگر امجد مرا جوہر
دھنک میں سانس لے گا' ان بنے رنگوں میں پھیلے گا

◆◆◆

کس کو معلوم تھا؟

یونہی چلتے ہوئے راستوں میں کئی ہم سفر جو ملے
اور بچھڑتے گئے
آتے جاتے ہوئے موسموں کی طرح
آپ ہی اپنی گردِ سفر ہو گئے
نہ کبھی میں نے پھر مڑ کے دیکھا نہیں اور نہ سوچا کبھی
وہ کہاں کھو گئے
جو گئے، سو گئے

پھر یہ کیسے ہوا
یوں ہی اک اجنبی، دیکھتے دیکھتے
دل میں اترا، نظر میں سما سا گیا
اور دھنک رنگ جذبے جگا سا گیا
جیسے بادل کوئی، بے ارادہ یونہی، میری چھت پہ رکا
اور برسے بنا اس پہ ٹھہرا رہا
کیا تماشا ہوا سامنے تھی ندی اور کوئی تشنہ لب
اس کو تکتا گیا اور پیاسا رہا
ایک لمحے میں سمٹے گی یہ داستاں
کس کو معلوم تھا
تم ملو گے مجھے اس طرح بے گماں
کس کو معلوم تھا

◆◆◆

بارش اور ہم

بارش تھی ہم تھے اور گھنی ہو رہی تھی شام
تم نے لیا تھا کانپتے ہونٹوں سے میرا نام

میں نے کہا تھا' آؤ یونہی بھیگتے چلیں
ان راستوں میں دیر تلک گھومتے رہیں

میری کمر میں ہاتھ یہ پھولوں سا ڈال کر
کاندھے پہ میرے رکھے رہو یونہی اپنا سر

ہاتھوں کو میں کبھی' کبھی بالوں کو چوم لوں
دیکھو مری طرف تو میں آنکھوں کو چوم لوں

پانی کے یہ جو پھول ہیں رخ پر کھلے ہوئے
ان میں دھنک کے رنگ ہیں سارے گھلے ہوئے

ہونٹوں سے ان کو چنتے رہیں خوشدلی کے ساتھ
تارے ہمیں تلاش کریں' چاندنی کے ساتھ

یونہی کسی درخت کے نیچے کھڑے رہیں
بارش کے دیر بعد بھی لپٹے کھڑے رہیں

تم نے کہا تھا، آؤ چلیں رات آ گئی
دل جس سے ڈر رہا تھا وہی بات آ گئی

بچھڑے سمے کی یاد ہی رستوں میں رہ نہ جائے
یہ دل کہیں وصال کی بارش میں بہہ نہ جائے

کچھ دیر ایک چپ سی رہی درمیان میں
گرہیں سی جیسے پڑنے لگی ہوں زبان میں

تم پیچھے ہٹنے والے تھے، جانے کے واسطے
آنکھیں جھکا رہے تھے، چرانے کے واسطے

یک دم گرا تھا پھول کوئی شاخسار سے
دیکھا تھا تم نے میری طرف اضطرار سے

بارش میں بھیگتے ہوئے جھونکے ہوا کے تھے
وہ چند بے گمان سے لمحے بلا کے تھے

نشہ سا ایک چاروں طرف پھیلتا گیا
پھر اس کے بعد میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا

◆◆◆

حکیم محمد سعید کے لیے

کوئی خواب تھا
کسی اور خواب کے درمیاں کوئی خواب تھا
جو بکھر گیا
وہ بکھر گیا تو ٹھہر گئیں کئی سسکیاں سی ہواؤں میں
وہ جو شہر، شہر نگار تھا کسی آنکھ میں
اسی شہر جاں کی فضاؤں میں
وہی آنکھ دشنۂ تیرگی کا ہدف بنی
وہی شہر پل میں اجڑ گیا
وہ جو اک شجر تھا وقار کا
وہ جو نامہ بر تھا بہار کا
کسی موڑ پر جو رکا نہیں
وہ جو کٹ گیا پر جھکا نہیں

وہ پڑا رہا کسی صبح اپنی ہی چھاؤں میں
اسی شہر جاں کی فضاؤں میں
وہ جو ہاتھ رہتا تھا مضطرب سر نبض جاں
وہ جو اک تبسم جانفزا کسی رخ پہ تھا
وہ جو دھیمے دھیمے سے حرف تھے کسی ہونٹ پر

وہ نہیں رہے

وہ نہیں رہے تو پتہ چلا
یہ جو گرد اڑتی ہے کو بہ کو
یہ جو چار سو کسی بے دلی کا حصار ہے
کوئی نیم سوزی راکھ ہے کوئی بے جہت سا غبار ہے
اسی راکھ میں اسی گرد میں
مری آنکھ سے تری آنکھ تک
وہی خواب اب کسی اور خواب کے درمیان ہے مشکبو
وہ جو خون خاک میں مل گیا
مری فصل گل کی ہے آبرو مرے شہر جاں کی بہار ہے
اسی تیرگی میں یہیں کہیں کسی روشنی کا مزار ہے

◆◆◆

آنکھ میں منظروں میں

آنکھ میں منظروں میں پانی ہے
پیاس کی پھر بھی حکمرانی ہے

ڈھیر ہے روز و شب کی لاشوں کا
لوگ کہتے ہیں زندگانی ہے

ہم ہیں دو مختلف کناروں پر
بیچ میں وقت کی روانی ہے

دل کے رستے میں آ گئی دنیا
یہ کہانی بہت پرانی ہے

ایک چھوٹی سی گیند ہے یہ زمیں
اور خلاؤں کے بے کرانی ہے

ہر حقیقت ہے مائل اظہار
کر گزر جو بھی دل میں ٹھانی ہے

دور ہٹتے ہوئے ستاروں میں
اس کی وحدت کی اک نشانی ہے

◆◆◆

کناروں پر جو بہتا ہے

کناروں پر جو بہتا ہے اسے دریا نہ سمجھو تم
کہ دریا کی روانی تو اسی شور تلاطم
اور بھنور سے جانی جاتی ہے
جہاں لہریں سفینوں کو اٹھاتی اور پٹختی ہیں
تو اگلا پل کوئی موہوم سے تحریر لگتا ہے
ہر اک لمحہ اسیر روزن تقدیر لگتا ہے

سو جان جاں، محبت بھی
کسی دریا کی صورت ہی سفر آغاز کرتی ہے
کنارے سے نہیں چلتا پتہ اس کے تلاطم کا
کہ جو لہریں لب ساحل سپر انداز ہوتی ہیں
وہ دریا کی تھکن، پانی کی پسپائی بتاتی ہیں
کنارے پر کھڑی کشتی کے سالم بادبانوں کو
ہوا جب چھو کے چلتی ہے تو سب کچھ ٹھیک لگتا ہے
ہم اک دوجے کی چاہت میں کوئی دعویٰ جو کرتے ہیں
وہ روحوں میں اترتے کیف کی تصدیق لگتا ہے
مگر یہ خوش نما گھاتیں، حسین و دلربا باتیں
کناروں سے نکلتے ہی تلاطم خیز موجوں کی روانی

اور بہاؤ میں کئی چہرے بدلتی ہیں

کہ دریائے محبت بھی

زمیں پر بہنے والے دوسرے دریاؤں جیسا ہے

سو چاہت اور تعلق کی وہی باتیں حقیقت ہیں

جو دریا میں کہی جائیں

کہ دریا ان کو سنتا ہی نہیں دل میں بھی رکھتا ہے

کنارے جب کناروں سے' کنارا کرنے لگتے ہیں

تو اس لمحے وہ چپکے سے

ہمارے درمیاں آ کر ہمیں آواز دیتا ہے

وہ سب باتیں سناتا ہے

کہ جو اک اور موسم میں کوئی عرفان لگتی تھیں

کناروں کے تحفظ میں بہت آسان لگتی تھیں

سنو جاناں' تلاطم میں

کناروں پر کہی باتوں کو جو تکریم کرتے ہیں

وہی دل ہیں کہ جن کی خود بھنور تعظیم کرتے ہیں

بچا کر کچھ چمکتے دن

چرا کر کچھ حسیں راتیں

چلو آؤ کہ دریا میں

کریں پھر سے یہی باتیں

کناروں پر جو بہتا ہے اسے دریا نہ سمجھو تم

◆◆◆

شام تھی ساعت زوال میں گم

شام تھی ساعت زوال میں گم
زخم تھا اپنے اندمال میں گم
حد ادراک میں تھا جو بھی کچھ
سب تھا بس ایک ہی سوال میں گم

تیز آندھی میں کا چراغ کی لو
برف میں کیسی آبلہ پائی
کارنس پر تھے پھول سوکھے ہوئے
سیڑھیوں میں بچھی تھی تنہائی

خواب تھے کھڑکیوں میں آویزاں
زینت طاق تھی شکیبائی
ایک ناطاقتی تھی چاروں طرف
راستہ راستہ تھی پسپائی

کہکشاؤں کے درمیاں لرزاں
ایک نامختتم سی پہنائی
فاصلے تھے فریب آنکھوں کا
ناپتا کون غم کی گہرائی

اک گریزاں سے عکس کی خاطر
آئینے ہو رہے تھے سودائی
یوں ستارے تھے منتظر جیسے
در محبوب پر تمنائی

وقت تھا روز و شب کی چال میں گم
میں تھا اپنے کسی خیال میں گم

◆◆◆

وہ

باتیں کرتے ہونٹ اچانک رک جاتے اور
آنکھیں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتی تھیں
دھیان کا رستہ کھو جاتا تھا
محفل میں جس سمت وہ جاتی
کمرے کا وہ حصہ جیسے یک دم روشن ہو جاتا تھا
جادوگر تھیں آنکھیں اس کی
پلکیں تھیں اک راز
روح بھی جھلمل کر دیتی تھی
ایسی تھی آواز

◆◆◆

اور جو کچھ ہے واہمہ

اور جو کچھ ہے واہمہ ہے بس
ایک میں اک مرا خدا ہے بس

منزلیں سب کی اپنی اپنی ہیں
وقت تو ایک راستہ ہے بس

نقش ہے کوئی اور نہ عکس اس کا
زندگی ایک آئینہ ہے بس

میں زمانے سے ہوں کہ یہ مجھ سے
اک یہی دل کو وسوسہ ہے بس

جسم کی احتیاج سے آگے
صرف انسان سوچتا ہے بس

جو تماشا بھی ہے یہیں پر ہے
اس سے باہر تو اک خلا ہے بس

کوئی لمحہ ہو یا کوئی کردار
جو گیا' سو چلا گیا ہے بس

اک چکا چوند سی ہے چاروں طرف
کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے بس

میرے اور اس کے درمیاں امجد
ایک لمحے کا فاصلہ ہے بس

◆◆◆

گلیاں

نظم لکھی گئی تو ''ہنوئی'' کی گلیوں سے موسوم تھی
اس میں گرتے بموں سے نکلتی ہوئی موت کا
تذکرہ تھا' تباہی فلاکت' دکھوں
اور بربادیوں کی اذیت بھری داستاں درج تھی
اس کے آہنگ میں
موت کا رنگ تھا اور دھن میں تباہی
ہلاکت' دکھوں اور بربادیوں کی الم گونج تھی
نظم کی اک بڑے ہال میں پیش کش کی گئی
اک گلوکار نے اس کو آواز دی
اور ساز ینے والوں نے موسیقیت سے بھری
دھن بنا کر سجایا اسے
ساز و آواز کی اس حسیں پیش کش کو
سبھی مجلسوں میں سراہا گیا

جب یہ سب ہو چکا تو کچھ ایسے لگا
جیسے عنواں میں
شہر کا نام بھولے سے لکھا گیا ہو
حقیقت میں یہ نام ''سائگان'' تھا

اور ہر چیز جس رنگ میں پیش آئے وہی اصل ہے

سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں
شاعری اور نغمہ گری کی زباں ایک ہے
جیسے گرتے بموں سے نکلتی ہوئی موت کی داستاں ایک ہے
اور جیسے تباہی' فلاکت' دکھوں اور بربادیوں کا نشاں ایک ہے
سچ تو یہ ہے کہ کرہ ارض پر
دوسرے شعر گو کی ضرورت نہیں
ہر جگہ شاعری کا سماں ایک ہے
اس کے الفاظ کی بے نوا آستینوں پہ حسب ضرورت
ستارے بنانا' مقامی حوالوں کے موتی سجانا
تو ایڈیٹروں کے قلم کی صفائی کا انداز ہے
وزیر ثقافت کے دفتر میں بیٹھے
کلرکوں کے ہاتھ کا اعجاز ہے

◆◆◆

(D. J. Enright کی نظم Streets کا آزاد ترجمہ)

بساط وقت پہ دائم

بساط وقت پہ دائم نشاں کسی کا نہیں
زمیں کسی کی نہیں، آسماں کسی کا نہیں

ذرا سی ٹھیس پہ سب کچھ بکھر سا جاتا ہے
سنو یہ کوچہ شیشہ گراں کسی کا نہیں

یہ جتنے روپ ہیں سب آدمی کے اپنے ہیں
کہ رنگ موسم عمر رواں کسی کا نہیں

ہر ایک مدعی اپنے ہی مدعا کا ہے
عجیب لوگ ہیں کوئی یہاں کسی کا نہیں

بس ایک کھیل ہے ساحل کا اور سمندر کا
بھنور کسی کا نہیں، بادباں کسی کا نہیں

خزاں کے جشن میں مصروف ہے چمن ایسے
کہ جیسے قتل بہاراں زیاں کسی کا نہیں

یہ کیسی سوچ ہے امجدؔ یہ کیسا منظر ہے
ہے آگ شہر کی سانجھی دھواں کسی کا نہیں

◆◆◆

ہم دوست بنیں کیسے؟

وہ کہتا ہے
مرے ماضی کے رستوں کے پرانے ہم سفر آجا
ہم اچھے دوست بن جائیں
بھلا کر سب گلے شکوے
ہر اک رنجش کو رکھ کر درگزر کے طاق میں
دیکھیں
ہوا کے ہاتھ میں آتے دنوں کے جو شگوفے ہیں
انہیں کس طور کھلنا ہے
ہمیں کس راہ پر چلنا اور کہاں سے موڑ مڑنا ہے
کہ اپنے دکھ ہیں سانجھے اور خوشیاں ایک جیسی ہیں
ہمارے لوگ سرحد کے ادھر ہوں یا ادھر ان کے
گھروں میں ایک سے فاقے ہیں آنکھیں ایک سی خالی
ہیں مستقبل کے اندیشوں کی گلیاں ایک جیسی ہیں
میں کہتا ہوں
یہ سارے خوبصورت لفظ جذبوں سے بھرے جملے
محبت آشنا باتیں
بہت اچھی تو لگتی ہیں
مگر جو ہاتھ تم مجھ سے ملانے کے لیے آگے بڑھاتے ہو

وہ لاکھوں بے نوا کشمیریوں کے خوں سے رنگیں ہے

تمہارے پاؤں کے نیچے مرے اپنوں کی لاشیں ہیں

فضا میں عورتوں کی سسکیاں بچوں کی چیخیں ہیں

درختوں اور گھروں میں آگ کے شعلے لپکتے ہیں

دھواں رستوں میں پھیلا ہے

دھواں آنکھوں میں پھیلا ہو

تو ایسے میں

بتاؤ کس طرح ہم درد کے رشتے' وفا کے راستے دیکھیں

محبت کا کوئی موسم ہمارے درمیاں اترے

دلوں کی سرزمینوں سے

کہو کیسے

وفا نا آشنا لمحوں کا یہ سیل رواں اترے

نشان امن کی جو فاختہ تم نے اڑائی ہے

بتاؤ وہ کہاں اترے

منظر میں جب تو ہی نہیں

منظر میں جب تو ہی نہیں تھا کیا کرتی بینائی بھی
بستی بستی گھوم آئے ہیں ہم بھی اور تنہائی بھی

عشق میں کس کو کیا ملتا ہے اپنی اپنی قسمت ہے
ایک ہی سکے کے چہرے ہیں' عزت بھی رسوائی بھی

اپنے دھیان میں ایسے گم تھے اس کی گلی بھی چھوڑ آئے
کم کم ہوں گے اس دنیا میں ہم جیسے سودائی بھی

بھرتے بھرتے بھر گئے سارے زخم تمہاری فرقت کے
آتے آتے آ گئی آخر ہم کو راس جدائی بھی

یوں بھی نہیں ہے ہم وہ گلیاں بالکل بھول گئے ہوں
اور بہت سی باتوں کے سنگ یاد تمہاری آئی بھی

اب کے تمہارے شہر سے بھی ہم سیلانی سے گزرے ہیں
تلخ بہت یہ بات سہی پر' اس میں ہے ''سچائی'' بھی

سے کی دیمک اندر اندر جانے کیا کچھ کھا جاتی ہے
تم چاہو تو کہہ لو ہم کو جھوٹا بھی ہرجائی بھی

کب ان راتوں اور آنکھوں کی امجد قسمت جاگے گی
کب وہ سورج روشن ہو گا جو دے گا دکھلائی بھی

◆◆◆

شہرت عروج حسن کی دولت

شہرت عروج حسن کی دولت کسی سے بھی
کرتا نہیں یہ وقت رعایت کسی سے بھی

جو بھی ہوا وہ ایسے ہی ہونا تھا ہو گیا
یعنی نہیں ہے ہم کو شکایت کسی سے بھی

دل ہے کھلی کتاب کی صورت رکھا ہوا
کرتے نہیں ہیں ہم تو سیاست کسی سے بھی

سود و زیاں کا جوڑتے رہتے ہیں جو حساب
کرتے نہیں وہ لوگ محبت کسی سے بھی

آنے کو آ تو سکتا ہے پتھر پہ بھی یہ دل
ہونے کو ہو تو سکتی ہے الفت کسی سے بھی

ہے کون سے زبانؑ یہ کیسے حروف ہیں
کھلتا نہیں ہے عقدۂ قسمت کسی سے بھی

دنیا کی دھوپ چھاؤں پہ تکیہ نہ کیجئے
کرتی نہیں نباہ یہ عورت کسی سے بھی

کیسی چتاونی ہمیں غالب یہ دے گئے
حاصل نہ کیجے دہر میں عبرت کسی سے بھی

امجد تماش بین ہیں سارے یہ غمگسار
کیجے نہ اپنے غم کی وضاحت کسی سے بھی

◆◆◆

ان کھیلی بازی کی ہار

تینتیس برس پہلے
ایسی ہی کسی رت میں
دو خواب سی آنکھوں نے اک بات کہی مجھ سے
اس بات کے مطلب کے
اڑتے ہوئے رنگوں کا مفہوم سمجھنے میں
کیا شام و سحر گزرے
اس رمز کی رم جھم میں
میں روح تلک بھیگا
سرسبز ہوا ایسا
موسم مری گلیوں میں، خوشبو کی طرح پھیلے
شاداب نظر گزرے
وہ بات رہی روشن یوں بھیڑ میں لمحوں کی
جگمگ سے ستاروں کی جس طرح قمر گزرے

تینتیس برس پہلے
اک شام ہوئی ایسی
جس شام کے پہلو میں
جھرنوں کا ترنم تھا، پھولوں کی سواری تھی

کچھ ایسے لگا جیسے اس لطف کا صدقہ تھا
اس شام سے پہلے تک جو عمر گزاری تھی
وہ سامنے بیٹھا تھا اور اس کی گھنی پلکیں
جس وقت مری جانب اٹھنے کو لرزتی تھیں
اک پل کے لیے جیسے موقوف سا ہو جاتا
اس دل کا دھڑکنا بھی
لمحوں کا گزرنا بھی
دریاؤں کا چلنا بھی
ٹوٹے ہوئے جملوں میں، اک رکتا ہوا لہجہ
آواز کے جادو کا ہر انگ سمو جاتا

تینتیس برس پہلے
باہوں کا یہی حلقہ
ویران و تہی حلقہ
اک چاند کا ہالہ تھا
زلفوں کے اندھیرے میں چہرے کا اجالا تھا
سانسوں کی تمازت میں
پھولوں سا بدن جیسے
اک تھان سا ریشم کا جو کھلتا چلا جائے
مجحوب سے چہرے پر
موتی وہ پسینے کے

ہونٹوں سے کوئی جن کو بس چھتا چلا جائے
سازِ دلِ مضطر کو
چوڑی کی کھنک جیسے مضراب کی صورت تھی
چڑیوں کے چہکنے میں
پھولوں کے مہکنے میں
اک رنگ کا میلہ تھا' اک خواب کی صورت تھی
انگلی سے اگر انگلی
چھو جائے کبھی یوں ہی
وہ لمس کی لذت سے سرشار سا ہو جانا
ہلکی سی کسی رنجش' چھوٹی سی جدائی سے
نیندوں سے بگڑ جانا' تکیوں کو بھگو جانا
اس وقت یہ لگتا تھا
دھرتی کے خزانوں میں
امبر کے تلے جو کچھ موجود ہے اپنا ہے
اس وقت جو آنکھیں ہیں
اس وقت جو سپنا ہے
تا صبحِ ابد اب تو ان کا ہی زمانہ ہے
سنسار کا ہر کونا چاہت کا ٹھکانہ ہے
ہر نقشِ وفا جیسے رنگوں کی کہانی ہے
خوشبو کا فسانہ ہے
اک وصل کے رستے پر ہر خواب روانہ ہے

اس خواب کو دیکھے اب تینتیس برس گزرے
اس شام کو بیتے اب اک عمر ہوئی جاناں
اس زہر کو پیتے اب اک عمر ہوئی جاناں
اس دہر کی وسعت میں تم جانے کہاں ہو گے
انسان زمانے کے منہ زور ہواؤں میں
اس طرح بھٹکتے ہیں
آندھی میں اڑیں جیسے بے سمت سفر پتے
اس وقت کی وحشت میں تم جانے کہاں ہو گے

تینتیس برس پہلے
اس ہجر کے دریا کے اک ریت کنارے پر
اک پل کے لیے ہم تم کچھ دیر رکے لیکن
اب تک نہ کھلا مجھ پر
کس وقت چھوا ہم کو اس موج کے ہاتھوں نے
جس موج کے جادو نے مدہوش رکھا مجھ کو
تم پار گئے جاناں
کیا کھیل تھا وہ جس کو، ہم دونوں نہیں کھیلے
اور ہار گئے جاناں

◆◆◆

محبت ایسا نغمہ ہے

محبت ایسا نغمہ ہے
ذرا بھی جھول ہولے میں
تو سر قائم نہیں ہوتا

محبت ایسا شعلہ ہے
ہوا جیسی بھی چلتی ہو
کبھی مدھم نہیں ہوتا

محبت ایسا رشتہ ہے
کہ جس میں بندھنے والوں کے
دلوں میں غم نہیں ہوتا

محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا

محبت ایسا رستہ ہے
اگر پیروں میں لرزش ہو
تو یہ محرم نہیں ہوتا

◆◆◆

Scanned with CamScanner

rekhta

امجد اسلام امجد

گورا پبلشرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۲۵- لوئر مال- لاہور

Scanned with CamScanner

ناشر : طاہر اسلم گورا

جُملہ حقوق محفوظ

۱۹۹۸ء

خطاطی : عبدالمتین
سرورق و پس ورق : ساجد قریشی
اہتمام : اِفتخار احمد
قیمت : ۱۲۵ روپے

زاھد بشیر پرنٹرز - لاہور

ملک مُصیب الرّحمٰن

کے نام

rekhta

Scanned with CamScanner

ترتیب

Scanned with CamScanner

rekhta

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزشتہ بیس برس میں مجھ سے تقریباً ہر انٹرویو میں یہ پوچھا گیا کہ میری ڈرامہ نگاری اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے میری شاعری کی مقدار اور معیار پر کچھ منفی اثر پڑا ہے؟ اور ہر بار میں نے یہی جواب دیا کہ شاعری تو ایک خود رو پودے کی طرح ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لیے سوائے اپنی نوت نمو کے کسی اور چیز کی محتاج نہیں ہوتی اور پہاڑی چشمے کی طرح اپنا رستہ خود بنا لیتی ہے۔ سو تمام تر دنیاوی جھنجھٹوں کے باوجود ان بیس برسوں میں میری شاعری کے پانچ مجموعے شائع ہوئے ہیں اور اوسطاً ایک سال میں میں بارہ سے پندرہ غزلیں اور نظمیں کہہ لیتا ہوں۔ یہ مقدار اگرچہ ابتدائی دو کتابوں کے زمانے سے کچھ کم ہے لیکن پھر بھی اسے تسلی بخش کہا سکتا ہے البتہ یہ فرق ضرور پڑا ہے کہ اب شعر گوئی کی تحریک میں پڑنے والے وقفے نسبتاً لمبے ہو گئے ہیں۔ بعض اوقات کئی کئی مہینے ایک بھی مصرعے کے بغیر گزر جاتے ہیں۔

rekhta

Scanned with CamScanner

لیکن پھر کچھ یوں ہوتا ہے کہ دو دن سے لے کر چار پانچ دن کے دورانیے کی ایک لہر سی آتی ہے اور اُوپر تلے پانچ سات چیزیں ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے اس کا میرے پاس کوئی منطقی اور شافی جواب نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

میں ذہنی طور پر اس صورتِ حال کو تقریباً تسلیم کر چکا تھا کہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہُوا، ایک ایسا واقعہ جو میری تیس سالہ شعر گوئی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی منفرد اور انوکھا ہے۔

ہُوا یوں کہ "بارش کی آواز" کی اشاعت کے بعد تقریباً دس ماہ پر محیط ایک "بنجر پن" کا دَور چل رہا تھا جس میں سوائے مرحوم اُستاد نصرت فتح علی خاں کی وفات پر لکھی جانے والی تعزیتی نظم کے شاعری کی ایک سطر بھی لکھی نہ جا سکی تھی کہ اکتوبر ۹ ء کے آخری ہفتے میں لاہور سے اسلام آباد جاتے ہُوئے طبیعت ایک دم رواں ہو گئی اور آئندہ چار پانچ دنوں میں تقریباً آٹھ نو چیزیں ہو گئیں۔ گزشتہ تجربے کے مطابق یہ صُورتِ حال معمول کے عین مطابق تھی اور میں ذہنی طور پر اب اس "آمد" کے انقطاع کے لیے تیّار ہو چکا تھا مگر دن پر دن گزرتے گئے اور ہر روز کاسۂ سخن میں کچھ نہ کچھ گرتا رہا اور یوں تقریباً ڈیڑھ مہینے میں ایک پوری کتاب کا سامان مکمل ہو گیا۔ اب اگرچہ اس SPELL کو ختم ہُوئے تقریباً دو ماہ ہو چکے ہیں مگر اس تجربے کی خوشگوار حیرت اب بھی میرے چاروں طرف پھیلی ہُوئی ہے، مقدار اور معیار کے باہمی رشتے میں اگرچہ مقدار ہمیشہ

Scanned with CamScanner

سے معیار کے لیے خطرے کا باعث رہی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ موجودہ صورتحال میں ایسا نہیں ہُوا۔

اِس مجموعے کا نام "سحر آثار" پہلی نظر میں ممکن ہے کچھ اوپرا اوپرا سا لگے لیکن مجھے یقین ہے کہ جُوں جُوں آپ اس سے مانوس ہوتے جائیں گے یہ آپ کو نہ صرف اچھا لگنے لگے گا بلکہ آپ اسے باقاعدہ پسند کرنے لگیں گے۔

یہ کتاب بھی گورا پبلشرز کے توسط سے آپ تک پہنچ رہی ہے۔ برادرم طاہر اسلم گورا نے ہمیشہ کی طرح اس کی تزئین و آرائش اور پیش کش میں اپنی خوش انتظامی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اس کتاب کے صوری حُسن کا سارا کریڈٹ اُن کو جاتا ہے۔ ترتیب میں حمدیہ غزل، حمدیہ نظم، دو نعتیں، اقبال کے بارے میں لکھی گئی نظم اور مرحوم نصرت فتح علی خاں والی نظم کو اسی ترتیب کے ساتھ بوجوہ ابتدا میں رکھا گیا ہے، باقی کی تمام منظومات زمانی ترتیب کے اعتبار سے ہیں لیکن اس میں جدت یہ ہے کہ یہ سفر آگے سے پیچھے کی طرف کا ہے یعنی سب سے آخر میں کہی گئی نظم کو پہلا نمبر دیا گیا ہے اور اس دَور کی سب سے پہلی تخلیق آخری نمبر پر ہے۔

B ۹۰ جی۔او۔آر III | امجد اسلام امجد
شادمان لاہور | ۲۵، فروری ۹۸ء

حمدیہ غزل

بنتے ہیں ہر سوال کے پیکر نئے نئے
کھلتے ہیں پھول ذہن میں اکثر نئے نئے

کس نے سیاہ رات کو تارے عطا کیے!
پھر ان میں رکھ دیئے کئی چکر نئے نئے

کرتا ہے کون پھول کو خوشبو سے ہم کنار!
رکھتا ہے کون آنکھ میں منظر نئے نئے

کس قاعدے سے پھیلتی جاتی ہے کائنات!
ذرّوں سے نکلے آتے ہیں جوہر نئے نئے

Scanned with CamScanner

اِک کہکشاں کے بعد ہے اِک اور کہکشاں!
پھر ان کے بعد بھی مہ و اختر، نئے نئے

نا مختتم سی ریت ہیں، برفوں کے بیچ بھی
رکھتا ہے کون زیست کے منظر، نئے نئے!

آنکھوں سے دُور اجنبی پرواز کے لیے
دیتا ہے کون ذہن کو شہپر، نئے نئے!

کیونکر یہ شہر لاکھوں برس پانیوں میں تھے؟
کیسے بنے زمیں پہ سمندر، نئے نئے!

بنتے ہیں رشتے کس طرح چیزوں کے درمیاں!
حدِّ شعور سے کہیں باہر، نئے نئے

rekhta

Scanned with CamScanner

روزِ ازل سے ہیں وہی گنتی کے چند رنگ
بنتے ہیں جن سے اَن گنت منظر، نئے نئے

ق

ہر چیز کہہ رہی ہے کوئی اور ہے یہاں
جس کی رضا کے فضل ہیں ہم پر، نئے نئے

امجد یہ سب یقیں بھی، سارے گمان بھی
سب ہیں اُسی جمال کے مظہر، نئے نئے

Scanned with CamScanner

جھپک رہے ہیں ستارے جو اپنی آنکھوں کو
طلوعِ صبح کا شاید یہ اِستعارہ ہے
زمین اپنی طرف کھینچتی ہے، مٹی کو
سفر کی گرد کے اُٹھتے ہیں، بیٹھ جاتے ہیں
جو کوئی غور سے دیکھے تو اِک اشارہ ہے!
ہر ایک چیز نشانی ہے اُس کے ہونے کی
کہ جس نے خاک کے پُتلے کو سرفراز کیا
اِک ایک ذرّے میں سو سو طرح کے بھید رکھے
پھر اپنے راز میں سب کو شریکِ راز کیا
بنا دیئے ہیں زمان و مکان ___ در و دیوار
سروں پہ چھت کی طرح آسماں اُسارا ہے

Scanned with CamScanner

تمام رستے اُسی کی طرف نکلتے ہیں
کہ دیر ہو یا حرم! سب پڑاؤ ہیں اُس کے
یہ روز و شب یہ مہ و سال، جیسے دریا ہیں
جو اُس عمیق سمندر میں جا کے گرتے ہیں
نہیں ہے جس کی کوئی تھاہ ــــ نے کنارہ ہے!
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے جیسے ہر لمحہ،
کسی کی کھوج میں نکلا ہُوا ستارہ ہے!
یہ شش جہات نہیں، بے شمار آنکھیں ہیں!
یہ کائنات کوئی مستقل نظارا ہے!
ہم اُس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، یہ تو برحق ہے
کہیں پہ وہ بھی مگر منتظر، ہمارا ہے!!

Scanned with CamScanner

نعت

آپؐ کا نام مانگتا ہوں مَیں
رُوحِ اسلام مانگتا ہُوں مَیں

ہُوں توجّہ کا آپؐ کی طالب
لُطف و اکرام مانگتا ہُوں مَیں

آپؐ کی یاد سے لبالب ایک
درد کا جام مانگتا ہُوں مَیں

آپؐ کی پیروی سے ہو منسُوب
ایسا الزام مانگتا ہُوں مَیں

Scanned with CamScanner

آپؐ کے سایۂ سعادت میں
آخری شام مانگتا ہُوں مَیں

دِل رہے مُصطفےٰؐ کے رستے پر
بس یہی کام مانگتا ہوں مَیں

صرف اپنے لیے نہیں امجدؔ
رحمتِ عام مانگتا ہوں مَیں

---

rekhta

Scanned with CamScanner

نعت

کوئی بھی مدح مگر اُس کے حسبِ حال نہیں
وہ ایک شخص کہ جس کی کوئی مثال نہیں

کہ جس کے دیکھے سے آنکھیں حسین ہو جائیں
جہاں میں ایسا کوئی اور خُوش جمال نہیں

نبیؐ کے جُود و سخاوت کی وارث و حقدار
ہے ساری خلقِ خُدا، صرف اُن کی آل نہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

ہر اک کمال سے آگے کمال ہے تیرا
تیرے خیال سے بہتر کوئی خیال نہیں

نگاہ ایسی کہ رُوحوں میں روشنی بھر دے
کہ جس کے بعد بھٹکنے کا احتمال نہیں

بہت ہی تیز سہی دشمنوں کی تلواریں
جہاں میں اسمِ محمدؐ سی کوئی ڈھال نہیں

جو تیرا دستِ عنایت نہ کر سکے پورا!
کسی فقیر کے کاسے میں وہ سوال نہیں

وہ اُن کے سامنے بولے، کہ یہ جھجک جائے
زباں کو تاب نہیں، آنکھ کو مجال نہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

بغیر مانگے مُرادیں وہاں سے ملتی ہیں
بیانِ دَرد نہیں ! حاجتِ سوال نہیں !

نہیں ہے کچُھ بھی یہاں جو نہ ہو زوالِ آثار
مگر پیامِ محمدؐ ! جسے زوال نہیں

مرے تھی بس میں کہاں مدحِ مصطفےٰ امجد
یہ نعت اُن کا کرم ہے ، مرا کمال نہیں

Scanned with CamScanner

اقبال

رُوح کو چھُوتے ہُوئے ایک نظارے جیسا
تھا وہ اِک شخص یہاں صبح کے تارے جیسا

فِکر تھی سب سے جُدا، خواب انوکھے اُس کے
پھر بھی لگتا تھا بھر رنگ ہمارے جیسا

پھیلتی جاتی ہے سارے ہیں وہی بانگِ درا
گُونج ہیں جس کی ہُوا سَیل، کنارے جیسا

rekhta

Scanned with CamScanner

شام کی دُھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اُس کا چہرہ تھا گھنی شب میں ستارے جیسا

آئیں گے اور بھی دُنیا میں سخن ور لاکھوں
پر نہ ہوگا کوئی اقبال، تمُھارے جیسا

---

rekhta

Scanned with CamScanner

نصرت فتح علی خاں کے لیے ایک نظم

خلا کی وسعتوں میں ہر گھڑی لاکھوں ستارے ٹوٹتے ہیں
اور فنا کا رِزق بنتے ہیں
مگر آنکھیں!
ہماری آپ کی یہ کم نظر، کوتاہ بیں آنکھیں
نہ اُن کو دیکھ سکتی ہیں نہ اُن کو جان پاتی ہیں
بس اِتنا ہے
کہ کچھ ہونے کا اِک بے نام سا احساس رہتا ہے
ستاروں سے ہماری جانکاری بس یہیں تک ہے۔

rekhta

Scanned with CamScanner

مگر ایسا بھی ہوتا ہے

فضا میں دفعتاً اِک روشنی سی پھیل جاتی ہے

کوئی ایسا ستارہ ٹوٹتا ہے

جس کے ہونے سے

شبِ مہتاب کا اور آسماں کا حُسن قائم تھا

زمیں زادے اُسے جب دیکھتے تھے

اُن کی آنکھیں جگمگاتی اور منظر مسکراتے تھے

وہ اُس کو دیکھتے تھے اور چلنا بھُول جاتے تھے

ابھی جو ٹوٹ کر بکھرا

وہ ایسا ہی ستارہ تھا

ہماری نصرت و فتح و ظفر کا استعارہ تھا

اُسے نغمے سلامی پیش کرتے اور "سرگم" اُٹھ کے ملتی تھی

اُسے وہ سُر بھی آتے تھے جنھیں سُن کر

Scanned with CamScanner

فرشتے وجد کرتے اور ہوائیں جھُوم اُٹھتی تھیں
یہ جتنے ساز ہیں
سب اس کی اُنگلی کے اشارے پر
ہمہ تن راگ بنتے تھے
جو رُوحوں میں سُلگ اُٹھّے
اِک ایسی آگ بنتے تھے!!

Scanned with CamScanner

ہم لوگ

دائروں میں چلتے ہیں!
دائروں میں چلنے سے
دائرے تو بڑھتے ہیں
فاصلے نہیں گھٹتے!

آرزوئیں چلتی ہیں!
جس طرف کو جاتے ہیں
منزلیں تمنّا کی
ساتھ ساتھ چلتی ہیں!

Scanned with CamScanner

گرد اُڑتی رہتی ہے
درد بڑھتا جاتا ہے
راستے نہیں گھٹتے!

صُبح دم سِتاروں کی تیز جھلملاہٹ کو
روشنی کی آمد کا پیش باب کہتے ہیں!
اِک کرن جو ملتی ہے، آفتاب کہتے ہیں!
دائرہ بدلنے کو، انقلاب کہتے ہیں!

---

rekhta

Scanned with CamScanner

بارش کے روپ

ہیں ایک بارش کے رُوپ کتنے !
وہی ہے بادل ، وہی گھٹا ہے
یہ راز کیا ہے!
تمام قطرے زمیں پہ اک ساتھ آکے گرتے ہیں
پھر بھی سب ایک سے نہیں ہیں !
کہ جیسے نغمہ، بہت سے سازوں سے مِل کے بنتا ہے
اور پھر بھی
تمام سازوں کا اپنا اپنا الگ تشخص ہے
جیسے پیڑوں کے سبز پتّے
کہ سبز ہو کر بھی اپنی رنگت کے ایک حصّے میں
سارے پتّوں سے مختلف ہیں

Scanned with CamScanner

کبھی جو بارش کی رُت میں آنکھوں کو بند کر کے
مَیں صرف اُس کی نئی نرالی صدائیں سُنتا
اور اُن میں بنتے طرح طرح کے سُروں کو چُنتا ہوں
ایسے لگتا ہے ،
جیسے آہنگِ نو بہ نو کا کوئی دریچہ سا کھُل گیا ہو !!

شجر ، سمندر ، پہاڑ ، وادی ـــ ہَوا کی پائل
اُداس تنہا سڑک ، بیاباں کی ریت ، ساحل !
مکان ـــ اُن کی چھتیں ، دریچے اور اُن کے چھجّے
گلی کی جانب کو کھُلنے والی ہر ایک کھڑکی اور اُس کے شیشے .... !!

ہر ایک شے سے برستی بارش کی گفتگو کا مزا جُدا ہے
نیا ہے الفاظ کا چناؤ ، نرالی بندش ، نوا جُدا ہے
ہر اک سے باتیں الگ الگ ہیں
ہر اک سے لہجہ جُدا جُدا ہے ،

Scanned with CamScanner

گھنی اُداسی کی برف جیسے

لہُو کے اندر پگھل رہی ہے!

چراغِ اُمّید کے جَلو میں

ہَوا جُدائی کی چل رہی ہے!

فضا میں وعدے بکھر رہے ہیں

اور آگ، پانی میں جل رہی ہے!!

Scanned with CamScanner

درد پھیل جائے تو

درد پھیل جائے تو
ایک وقت آتا ہے
دِل، دھڑکتا رہتا ہے
آرزو گزیدوں کے حوصلے نہیں چلتے
دشتِ بے یقینی میں آسرے نہیں چلتے،
رہروؤں کی آنکھوں میں
منزلیں نہ جب تک ہوں، قافلے نہیں چلتے۔!
اِک ذرا توجّہ سے دیکھئے تو کھُلتا ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

لوگ اِن پہ چلتے ہیں، راستے نہیں چلتے!
سوچنے سمجھنے سے، ساتھ ساتھ چلنے سے
ڈوریاں سمٹتی ہیں، فاصلے، نہیں چلتے

خواب خواب آنکھوں میں رتجگے نہیں چلتے!
درگزر کے حلقے میں مسئلے نہیں چلتے!
دو دِلوں کی قربت میں، تیسرا نہیں ہوتا
" واسطے "نہیں چلتے!

بخت ساتھ چلتا ہے، طالع آزماؤں کے
وقت رام کرنے میں، تجزیوں کے داؤ کیا!
تجربے نہیں چلتے
عِشق کے علاقے میں حُکمِ یار چلتا ہے
ضابطے نہیں چلتے

Scanned with CamScanner

حُسن کی عدالت میں، عاجزی تو چلتی ہے
مرتبے نہیں چلتے

دوستی کے رشتوں کی پرورش ضروری ہے !
سلسلے تعلق کے، خُود سے بن تو جاتے ہیں
لیکن ان شگوفوں کو ٹُوٹنے بکھرنے سے
روکنا بھی پڑتا ہے !
چاہتوں کی مٹی کو، آرزو کے پودوں کو
سینچنا بھی پڑتا ہے !
رنجشوں کی باتوں کو، بُھولنا بھی پڑتا ہے !!

Scanned with CamScanner

کبھی یُوں بھی ہوتا ہے

کبھی یوں بھی ہوتا ہے
دو اجنبی دل
اچانک کسی خُوشنما موڑ پر
ایک دُوجے سے ملتے ہیں تو ایک لمحہ
اچانک کہیں سے اُبھرتا ہے
اور اُن کی آئندہ عمرُوں کے سارے مہ و سال
پر پھیلتے پھیلتے اُن کے چاروں طرف
اِک بظاہر دکھائی نہ دیتا ہُوا دائرہ سا بناتا ہے
جس کی حدیں گھیر لیتی ہیں اِک دن
ازل سے ابد تک کے سب فاصلوں کو !!

rekhta

Scanned with CamScanner

کبھی یوں بھی ہوتا ہے

دو ہم سفر جو ،

زمانوں پہ پھیلی ہُوئی اِک مسافت

کو چاہت کے بادل کے سائے تلے

قدم در قدم کاٹتے جا رہے تھے ،

اچانک کسی اجنبی موڑ پر ایک لمحے کو رُکتے ہیں

تو دیکھتے ہیں

نجانے کدھر سے ہوائے جُدائی کا اِک تیز جھونکا

تعلّق کے سارے دِیوں کو بُجھاتا

دِلوں میں گِلوں کی فصیلیں اُٹھاتا ، بڑھا آرہا ہے ،

اور اُس کی اُڑتی ہُوئی گرد

لمحوں میں بے شکل کرتی

ہے عمُروں پہ پھیلے ہوئے فیصلوں کو !!

Scanned with CamScanner

○

حد سے توقّعات زیادہ کیے ہُوئے
بیٹھے ہیں دل میں ایک ارادہ کیے ہُوئے

اِس دشتِ بے وفائی میں جائیں کہاں کہ ہم
ہیں اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیے ہُوئے

دیکھو تو کتنے چین سے! کس درجہ مُطمئن!
بیٹھے ہیں ارضِ پاک کو آدھا کیے ہُوئے

rekhta

Scanned with CamScanner

ق

پاؤں سے خواب باندھ کے شامِ وصال کے
اِک دشتِ انتظار کو جادہ کیے ہُوئے!

آنکھوں میں لے کے جلتے ہُوئے موسموں کی راکھ!
گردِ سفر کو تن کا لبادہ کیے ہُوئے

دیکھو تو کون لوگ ہیں! آئے کہاں سے ہیں!
اور اب ہیں کس سفر کا اِرادہ کیے ہُوئے؟

اُس سادہ رُو کے بزم میں آتے ہی بُجھ گئے
جتنے تھے اہتمام، زیادہ کیے ہُوئے

اُٹھے ہیں اُس کی بزم سے امجدؔ ہزار بار
ہم ترکِ آرزو کا اِرادہ کیے ہُوئے!

rekhta

Scanned with CamScanner

ہے کوئی نظر والا !

وہ چاند کہ روشن تھا سینوں میں نگاہوں میں ،
لگتا ہے اُداسی کا اِک بڑھتا ہُوا ہالہ ،
پوشاکِ تمنّا کو ،
آزادی کے خلعت کو ،
افسوس کہ یاروں نے
اُلجھے ہُوئے دھاگوں کا اِک ڈھیر بنا ڈالا !

rekhta

Scanned with CamScanner

وہ شور ہے لمحوں کا، وہ گھور اندھیرا ہے!
تصویر نہیں بنتی آواز نہیں آتی!
کچھ زور نہیں چلتا، کچھ پیش نہیں جاتی!

اظہار کو ڈستی ہے ہر روز نئی اُلجھن
احساس پہ لگتا ہے ہر شام نیا تالہ،
ہے کوئی دلِ بینا! ہے کوئی نظر والا!!

Scanned with CamScanner

○

دَر و دیوار ہیں، مکان نہیں
واقعہ ہے، یہ داستان نہیں

وقت کرتا ہے ہر سوال کو حل
زیست مکتب ہے امتحان نہیں

ہر قدم پر ہے اِک نئی منزل
راستوں کا کہیں نشان نہیں

رنگ بھی زندگی کے مظہر ہیں
صرف آنسو ہی ترجمان نہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

دِل سے نکلی ہُوئی صدا کے لیے
کچُھ بہت دُور آسمان نہیں

کل کو ممکن ہے اِک حقیقت ہو
آج جس بات کا گُمان نہیں

شور کرتے ہیں ٹوٹتے رشتے
ہم کو گھر چاہیئے مکان نہیں

خواب، ماضی اسراب، مستقبل!
اور جو "ہے" وہ میری جان "نہیں"

اِتنے تارے تھے رات، لگتا تھا
کوئی میلہ ہے آسمان نہیں

Scanned with CamScanner

شاخِ سدرہ کو چھُو کے لوٹ آیا
اِس سے آگے مری اُڑان نہیں

یوں جو بیٹھے ہو بے تعلّق سے
کیا سمجھتے مری زبان نہیں ؟

کوئی دیکھے تو موت سے بہتر
زیست کا کوئی پاسبان نہیں

اِک طرف میں ہوں اِک طرف تم ہو
سلسلہ کوئی درمیان نہیں

Scanned with CamScanner

○

کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا گیا پھر نظر نہیں آیا

وفا کے دشت میں رستہ نہیں مِلا کوئی
سوائے گردِ سفر، ہم سفر نہیں آیا

پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صُبح کا بھُولا مگر نہیں آیا

کسی چراغ نے پُوچھی نہیں خبر میری
کوئی بھی پھُول مرے نام پر نہیں آیا

Scanned with CamScanner

چلو کہ کوچۂ قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نخلِ دار پہ کب سے ثمر نہیں آیا!

خُدا کے خوف سے جو دل لرزتے رہتے ہیں
اُنھیں کبھی بھی زمانے سے ڈر نہیں آیا

کدھر کو جاتے ہیں رستے، یہ راز کیسے کھُلے
جہاں میں کوئی بھی بارِ دگر نہیں آیا

یہ کیسی بات کہی شام کے ستارے نے
کہ چَین دل کو مرے رات بھر نہیں آیا

ہمیں یقین ہے امجد نہیں وہ وعدہ خلاف
پہ عمر کیسے کٹے گی، اگر نہیں آیا

rekhta

Scanned with CamScanner

○

ہم تو اسیرِ خواب تھے تعبیر جو بھی تھی
دیوار پر لکھی ہُوئی تحریر جو بھی تھی

ہر فرد لاجواب تھا، ہر نقش بے مثال
مِل جُل کے اپنی قوم کی تصویر جو بھی تھی!

جو سامنے ہے، سب ہے یہ، اپنے کیے کا پھل
تقدیر کی تو چھوڑیئے، تقدیر جو بھی تھی

آیا اور اِک نگاہ میں برباد کر گیا
ہم اہلِ انتظار کی جاگیر جو بھی تھی

Scanned with CamScanner

قدریں جو اپنا مان تھیں، نیلام ہوگئیں
ملبے کے مول بک گئی تعمیر جو بھی تھی

طالب ہیں تیرے رحم کے ہم عدل کے نہیں
جیسا بھی اپنا جُرم تھا، تقصیر جو بھی تھی

ہاتھوں پہ کوئی زخم نہ پیروں پہ کچھ نشاں
سوچوں میں تھی پڑی ہُوئی، زنجیر جو بھی تھی

یہ اور بات چشم نہ ہو معنی آشنا
عبرت کا ایک درس تھی، تحریر جو بھی تھی

امجد ہماری بات وہ سُنتا تو ایک بار
آنکھوں سے اُس کو چُومتے، تعزیر جو بھی تھی

Scanned with CamScanner

○

منظر کے اِرد گِرد بھی اور آر پار دُھند
آئی کہاں سے آنکھ میں یہ بے شمار دُھند!

کیسے نہ اُس کا سارا سفر رائیگاں رہے
جس کاروانِ شوق کی ہے رہگزار دُھند!

ہے یہ جو ماہ و سال کا میلہ لگا ہُوا
کرتی ہے اِس میں چُھپ کے مِرا انتظار دُھند

آنکھیں وہ بزم، جس کا نشاں ڈولتے چراغ
دل وہ چمن، کہ جس کا ہے رنگِ بہار دُھند

rekhta

Scanned with CamScanner

کمرے میں میرے غم کے سوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دُھند

فردوسِ گوش ٹھہرا ہے مبہم سا کوئی شور
نظّارگی کا شہر میں ہے اعتبار، دُھند

ناٹک میں جیسے بکھرے ہوں کردار جا بجا
امجدؔ فضائے جاں میں ہے یوں بے قرار دُھند!

---

rekhta

Scanned with CamScanner

زیبندہ بیٹی کے لیے ایک نظم

بیس برس کی بات ہے لیکن یوں لگتا ہے
جیسے کل کی بات ہو، جب وہ
ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر مُجھ کو چُھوتی، میری جانب آتی تھی تو
اُس کے لبوں پر ایک ستارہ کِھلتا تھا،
میری رُوح کی ساری خُوشبو اور سچّائی
اُس کے لمس میں جاگ اُٹھتی تھی
اللہ — ! کیسے اچھّے دن تھے !!

اب میں اُس کی پیاری پیاری
پُھولوں جیسی زیبندہ کو چُھوتا ہوں تو

Scanned with CamScanner

یوں لگتا ہے

جیسے سب کچھ لوٹ آیا ہو

جیسے اُس نے میری خاطر

اپنا بچپن دوہرایا ہو !

مولا ــــ جیسے تُو نے میری عرض سُنی اور

اپنے جاری فیض سے میرے من کو شانت رکھا

مجُھ پر اور اِک رحمت فرما

زیبندہ کو اُس کی ماں کی خُوشبو دے کر

عاقب اور روشین کی دُنیا

پہلے سے بھی روشن کر دے

اِس تازہ معصوم ہنسی سے

اُن کے سارے گھر کو بھر دے !!

Scanned with CamScanner

○

اُداسی میں گِھرا تھا دِل چراغِ شام سے پہلے
نہیں تھا کچُھ سرِ محفل چراغِ شام سے پہلے

حُدی خوانو، بڑھاؤ لَے، اندھیرا ہونے والا ہے
پہنچنا ہے سرِ منزل چراغِ شام سے پہلے

دِلوں میں اور ستاروں میں اچانک جاگ اُٹھتی ہے
عجب ہلچل، عجب جھل مل چراغِ شام سے پہلے

وہ ویسے ہی وہاں رکھی ہے، عصرِ آخرِ شب میں
جو سینے پر دھری تھی سِل، چراغِ شام سے پہلے

rekhta

Scanned with CamScanner

ہم اپنی عُمر کی ڈھلتی ہُوئی اِک سہ پہر میں ہیں
جو ملنا ہے ہمیں تو مل، چراغِ شام سے پہلے

ہمیں اے دوستو اب کشتیوں میں رات کرنی ہے
کہ چُھپ جاتے ہیں سب ساحل، چراغِ شام سے پہلے

سَحر کا اوّلیں تارا ہے جیسے رات کا ماضی
ہے دن کا بھی تو مُستقبل، چراغِ شام سے پہلے

نجانے زندگی اور رات میں کیسا تعلق ہے!
اُلجھتی کیوں ہے اِتنی گِل چراغِ شام سے پہلے

محبّت نے رگوں میں کِس طرح کی روشنی بھر دی!
کہ جل اُٹھتا ہے امجدؔ دِل، چراغِ شام سے پہلے

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Scanned with CamScanner

○

آنکھوں کا رنگ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا!

کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے پہ نقش
پھر یوں ہُوا کہ خُود مرا چہرا بدل گیا

جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

rekhta

Scanned with CamScanner

قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چل پڑی
اُس نے چھڑایا ہاتھ تو صحرا بدل گیا

کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا!

اِک سر خوشی کی موج نے کیسا کیا کمال!
وہ بے نیاز، سارے کا سارا بدل گیا

اُٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اُٹھا تو سارا تماشا بدل گیا

حیرت سے سارے لفظ اُسے دیکھتے رہے
باتوں میں اپنی بات کو کیسا بدل گیا

Library
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Scanned with CamScanner

کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی بنی
گھر کی فضا ، مکان کا نقشہ بدل گیا

شاید وفا کے کھیل سے اُکتا گیا تھا وہ
منزل کے پاس آ کے جو رستہ بدل گیا

قائم کسی بھی حال پہ دُنیا نہیں رہی
تعبیر کھو گئی ، کبھی سپنا بدل گیا

منظر کا رنگ اصل میں سایا تھا رنگ کا
جس نے اُسے جدھر سے بھی دیکھا بدل گیا

اندر کے موسموں کی خبر اُس کو ہو گئی!
اُس نو بہارِ ناز کا چہرا بدل گیا

rekhta

Scanned with CamScanner

آنکھوں میں جتنے اشک تھے جگنو سے بن گئے
وہ مُسکرایا اور مری دُنیا بدل گیا

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
امجدؔ یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

Scanned with CamScanner

rekhta

○

آنکھوں کو التباس بہت دیکھنے میں تھے
کل شب عجیب عکس مرے آئنے میں تھے

سارے دھنک کے رنگ تھے اُس کے لباس میں
خُوشبو کے سارے اَنگ اُسے سوچنے میں تھے

ہر بات جانتے ہُوئے دِل مانتا نہ تھا
ہم جانے اعتبار کے کِس مرحلے میں تھے

Scanned with CamScanner

وصل و فراق دونوں ہیں اِک جیسے ناگزیر
کچُھ لطف اُس کے قرُب میں، کچُھ فاصلے میں تھے

سیلِ زماں کی موج کا ہر وار سہہ گئے
وہ دن، جو ایک ٹوٹے ہُوئے رابطے میں تھے!

غارت گری کے بعد بھی روشن تھیں بستیاں
ہارے ہُوئے تھے لوگ مگر حوصلے میں تھے!

ہر پھر کے آئے نقطۂ آغاز کی طرف
جتنے سفر تھے اپنے کِسی دائرے میں تھے

آندھی اُڑا کے لے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشاں اُسی راستے میں تھے

rekhta

Anjuman Taraqqi Urdu

Scanned with CamScanner

چھُو لیں اُسے کہ دُور سے بس دیکھتے رہیں!
تارے بھی رات میری طرح، مخمصے میں تھے

جگنو، ستارے، آنکھ، صبا، تتلیاں، چراغ
سب اپنے اپنے غم کے کسی سلسلے میں تھے!

جتنے تھے خط تمام کا تھا ایک زاویہ
پھر بھی عجیب پیچ مرے مسئلے میں تھے

امجد کتابِ جاں کو وہ پڑھتا بھی کس طرح!
لکھنے تھے جتنے لفظ، ابھی حافظے میں تھے

Scanned with CamScanner

ظاہر شمال میں کوئی تارا ہُوا تو ہے
اِذنِ سفر کا ایک اِشارا ہُوا تو ہے

کیا ہے! جو رکھ دیں آخری داؤ میں نقدِ جاں!
ویسے بھی ہم نے کھیل یہ ہارا ہُوا تو ہے

وہ جانے، اُس کو خیر خبر ہے بھی یا نہیں!
دل ہم نے اس کے نام پہ وارا ہُوا ہے

rekhta

Anjuman Taraqqi Urdu

Scanned with CamScanner

پاؤں میں نارسائی کا اِک آبلہ سہی
اِس دشتِ غم میں کوئی ہمارا ہُوا تو ہے

اُس بے وفا سے ہم کو یہ نسبت بھی کم نہیں
کچھ وقت ہم نے ساتھ گزارا ہُوا تو ہے

اپنی طرف اُٹھے نہ اُٹھے اُس کی چشمِ خوش!
امجدؔ کسی کے درد کا چارا ہُوا تو ہے!

Scanned with CamScanner

○

اُلجھن تمام عُمر یہ تارِ نفس میں تھی!
دِل کی مُراد عاشقی میں یا ہوس میں تھی!

دَر تھا کھُلا، پہ بیٹھے رہے پَر سمیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی قفس میں تھی!

سکتے میں سب چراغ تھے، تارے تھے دم بخُود!
مَیں اُس کے اختیار میں، وہ میرے بس میں تھی

rekhta

Anjuman Taraqqi Urdu ...

Scanned with CamScanner

اَب کے بھی ہے جمی ہُوئی، آنکھوں کے سامنے
خوابوں کی ایک دُھند جو پچھلے برس میں تھی

کل شب تو اُس کی بزم میں ایسے لگا مجھے!
جیسے کہ کائنات مِری دسترس میں تھی

محفل میں آسمان کی بولے کہ چُپ رہے
امجدؔ سدا زمین اسی پیش و پس میں تھی

---

rekhta

Scanned with CamScanner

○

سب کی اِک اوقات   "عشق نہ پُوچھے ذات"

بالکل بھُول گئے   کرنی تھی کیا بات

سستا کر دے گی   زر کی یہ افراط!

اَب سے تیرے ہیں   میرے دن اور رات

سچّے جذبوں سے   مہنگی ہوگئی دھات

اب کے خُوب ہوئی   بِن موسم برسات

کٹ ہی جاتی ہے   کیسی بھی ہو رات!

باسی ہوتی جائے   دل میں رکھّی بات

کچّی ڈور، میاں!   کب تک دیتی ساتھ!

گرہیں کھولے گا   جانے کب وہ ہاتھ!

Scanned with CamScanner

تجھ کو چاہوں مَیں کیا میری اوقات!
کیسے اُجڑ گئے ؟ خوابوں کے باغات

(ق)

وقت سمندر میں ایک سے ہیں دن رات
آگے گہری کھائی پیچھے ہے ظلمات!

غم کے دھاگوں سے امجدؔ خوشیاں کات!

---

rekhta

Scanned with CamScanner

○

زمین جلتی ہے اور آسمان ٹُوٹتا ہے،
مگر گریز کریں ہم تو مان ٹُوٹتا ہے!!

کوئی بھی کام ہو انجام تک نہیں جاتا!
کسی کے دھیان میں پل پل یہ دھیان ٹُوٹتا ہے

کہ جیسے متن میں ہر لفظ کی ہے اپنی جگہ
جو ایک فرد کٹے، کاروان ٹُوٹتا ہے

rekhta
Anjuman Taraqqi Urdu ...
Scanned with CamScanner

نژادِ صبح کے لشکر کی آمد آمد ہے
حصارِ حلقۂ شب زادگان ٹوٹتا ہے

اگر یہی ہے عدالت! اور آپ ہیں مُنصِف!
عجب نہیں جو ہمارا بیان ٹوٹتا ہے

وفا کے شہر کے رستے عجیب ہیں امجد
ہر ایک موڑ پہ اِک مہربان ٹوٹتا ہے

---

rekhta

Scanned with CamScanner

خلافِ قانون

لوگ کہتے ہیں پانی میں لکڑی نہیں ڈوبتی !

اور وجہ یہ بتاتے ہیں

لکڑی کا اپنا حجم

چونکہ پانی کی اِتنی ہی مقدار کے

بالمقابل زیادہ نہیں !

اِس لیے وہ سدا

سطحِ آبِ رواں پہ رہے گی مگر

ڈوبنے کا عمل اُس پہ ہو گا نہیں

rekhta
Anjuman Taraqqi Urdu
Scanned with CamScanner

اَزل سے یہ قُدرت کا قانون ہے ،
اور قانونِ قُدرت بدلتا نہیں !!

پہ میں سوچتا ہوں
اگر یہ حقیقت میں قانون ہے
تو ترے غم کے دریا میں
دِل کیسے ڈوبا ؟

---

rekhta

Scanned with CamScanner

○

کہتا ہے درپن   میرے جیسا بن !
تاریکی کی موت!   ایک نحیف کِرن
محنت اپنا مال   وقت، پرایا دُھن
بات نہ کرنے سے   بڑھتی ہے اُلجھن
اپنے دِل جیسا !   کوئی نہیں دشمن
دُنیا۔ لَوٹا دے   میرا اپنا پن
جھولے جی اُٹھے   جاگ پڑے جامن
روز وہی قِصّہ!   روز وہی اُلجھن !
صدیاں ٹوٹ گئی   پائل کی چھَن چھَن
یہ تو برسے گا   ساون ہے، ساون!

Scanned with CamScanner

سارے خاک سمان — تَن اور مَن اور دَھن
اپنوں ہی سے تو — ہوتی ہے اَن بَن
سب سے اچھّا ہے — اپنا گھر آنگن!
پیاس بڑی ہے یا — سونے کا برتن؟
کیا اُفتاد پڑی! — لگتا ناہیں مَن
آدم زاد نہیں، — بستی ہے یا بَن!
کیسا بھی ہو رُوپ! — مٹّی ہے مدفن
سِکّے کے دو رُخ — برہن اور دُلہن
دھوکہ دیتے ہیں — اُجلے پیراہن
راہ میں کِھلتا پُھول — بیوہ کا جوبن
دونوں جُھوٹے ہیں — ساجن اور ساون
آہٹ کِس کی ہے — تیز ہُوئی دھڑکن
اُتنی خواہش کر — جِتنا ہے دامن
ہم تم دونوں ہیں — دَھرتی اور ساون

Scanned with CamScanner

عکس بنے کیسے؟ دُھندلا ہے درپن

زیرِ آب ہُوئے خوابوں کے مسکن
ٹھہر گیا ہے کیوں! آنکھوں میں ساون!

(ق)

کچّا سونا ہی بنتا ہے کُندن
اِک دِن نکھرے گا سچّا ہے گر، فن!
کیسے روک سکے! خُوشبو کو گلشن

امجدؔ میرے ساتھ
اَب تک ہے بچپن!

Anjuman Taraqqi Urdu

Scanned with CamScanner

rekhta

ساتھ تو اجنبی بھی چلتے ہیں

اُس نے مجھ سے کہا

مرے ساتھی !

تُم کو مجُھ سے جو ہے گِلہ — کیا ہے !

کبھی فرصت ملے تو یہ سوچو ،

منزلیں کیوں ہے ؟ فاصلہ کیا ہے ؟

Scanned with CamScanner

اپنے اپنے سَفر پہ نکلے لوگ
مشترک راستوں پہ چلتے ہیں
ہمرہی کے حصار میں جتنے
دِن نکلتے، چراغ جلتے ہیں !
سب کی آنکھوں میں جِھلملاتے ہیں
اپنی اپنی اُمید کے دَر و بام
زندگی کے سَفر میں ملتے ہیں
مستقل درد، عارضی آرام !

تُم مِرے ہم سفر تو ہو لیکن
ہم کہیں سے بچھڑ بھی سکتے ہیں !
دیر تک اِک طویل رستے پر
ساتھ تو اجنبی بھی چلتے ہیں!!

Anjuman Taraqqi Urdu

Scanned with CamScanner

آخرِ شب

کہیں نہیں ہے اِشارہ کسی بھی آہٹ کا
وہی ہے درد ، وہی انتظارِ آخرِ شب !

ہَوا گزُرتی ہے گلیوں سے شرمسار سی کچھ
کہ آج بھی کوئی خُوشبو نہیں وہ لا پائی !
ستارے دشتِ فلک میں بکھرتے جاتے ہیں
دِلوں میں پھیلتی جاتی ہے ایک تنہائی !

rekhta

Scanned with CamScanner

تنی ہے دائرہ در دائرہ وہ تاریکی ،
کسی طرف کو کوئی راستہ نہیں جاتا !
زمیں سے کون کہے اب کہ ہم سے بات تو کر،
رگوں کو توڑ نہ ڈالے کہیں یہ سنّاٹا !!

کہیں سے صبح کی پہلی کرن ملے، تو چلے
کھڑا ہے وقت سرِ رہگذارِ آخرِ شب !
کہیں نہیں ہے اشارہ کسی بھی آہٹ کا
وہی ہے درد ، وہی انتظارِ آخرِ شب !

———

rekhta
Anjuman Taraqqi Urdu
Scanned with CamScanner

○

کسی ترنگ ، کسی سرخوشی میں رہتا تھا
یہ کل کی بات ہے، دل زندگی میں رہتا تھا

کہ جیسے چاند کے چہرے پہ آفتاب کی لَو
کھُلا کہ میں بھی کسی روشنی میں رہتا تھا

سرشتِ آدمِ خاکی ، ذرا نہیں بدلی!
فلک پہ پہنچا مگر، غار ہی میں رہتا تھا

کہا یہ کس نے کہ رہتا تھا میں زمانے میں
ہجومِ دردِ، غمِ بے کسی میں رہتا تھا

rekhta

Scanned with CamScanner

ق

کلام کرتا تھا قوسِ قزح کے رنگوں میں
وہ اِک خیال تھا اور شاعری میں رہتا تھا

گُلوں پہ ڈولتا پھرتا تھا اوس کی صُورت!
صدا کی لہر تھا اور نغمگی میں رہتا تھا

نہیں تھی حُسنِ نظر کی بھی کچھ اُسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

وہاں پہ اب بھی ستارے طواف کرتے ہیں
وہ جس مکان میں، جس بھی گلی میں رہتا تھا

Scanned with CamScanner

بس ایک شام بڑی خامشی سے ٹُوٹ گیا
ہمیں جو مان ، تری دوستی میں رہتا تھا

کِھلا جو پھُول تو برباد ہو گیا امجدؔ
طلسمِ رنگ مگر غنچگی میں رہتا تھا

---

rekhta

Scanned with CamScanner

اُلجھن

وہ ایک سوچا ہُوا ناز سا تکلّم میں
نظر میں ایک جھجک سی کوئی بنائی ہُوئی

لبوں پہ ایک تبسّم ذرا لجایا سا
جبیں پہ بزمِ مروّت سجی سجائی ہُوئی

ڈھکا ڈھکا سا تکبّر وہ بات سُننے میں!
تھی جس میں حُسن کی نازش کہیں چھپائی ہُوئی

بدن میں خوف کی لرزش بھی، اور دعوت بھی!
گُریز کرتی ہُوئی اور قریب آئی ہُوئی

کچھ اُس کو دیکھ کے کھُلتا نہ تھا کہ کیا ہے وہ!
فریب دیتی ہُوئی یا فریب کھائی ہُوئی!!

Scanned with CamScanner

○

سب دیکھتے تھے اور کوئی سوچتا نہ تھا
جیسے یہ کوئی کھیل تھا، اِک واقعہ نہ تھا!

لکھتے بیاضِ وقت پہ ہم کیا تأثرات
سب کچھ تھا درج اور کوئی حاشیہ نہ تھا

آپس کی ایک بات تھی، دونوں کے درمیاں
اے اہلِ شہر آپ کا یہ مسئلہ نہ تھا!

rekhta

Scanned with CamScanner

تیری گلی میں آئے تھے بس تجھ کو دیکھنے!
اِس کے سِوا ہمارا کوئی مدّعا نہ تھا

تھے ثبت حکمِ ہجر پہ اُس کے بھی دستخط
تقدیر ہی کا لکھّا ہُوا فیصلہ نہ تھا

اِک سمت پاسِ عشق تھا، اِک سمت اپنا مان
کیسے گُریز کرتے! کوئی راستہ نہ تھا!!

امجدؔ یہ اقتدار کا حلقہ عجیب ہے
چاروں طرف تھے عکس کوئی آئنہ نہ تھا

Scanned with CamScanner

اے ربِّ غفّار !

ایک سوال کے اندر ہم نے کاٹی نصف صدی ،
باندھے لاکھ حساب ،
غلط ہی نکلا ہر اک حل کا لیکن انت جواب !

ضرب ، جمع ، تقسیم کے سارے کُلیے برت لیے
از رُوے تحقیق
ہر کوشش میں ہو جاتا ہے کچھُ نہ کچھُ تفریق

دیکھ تو کتنا اُونچا ہے یہ ردّی کا انبار
تُو ہی اب کچھُ رحمت کر دے اے ربِّ غفّار !

rekhta

Scanned with CamScanner

○

جب تک رستے جائیں — یوں ہی چلتے جائیں

آئینوں سے کیوں ؟ — عکس بکھرتے جائیں!

آنکھیں ہیں آباد ! — خواب اُجڑتے جائیں

ایسی آندھی میں ! — خاک سنورتے جائیں!!

اپنی سوچوں سے — آپ ہی ڈرتے جائیں

عکس کریں تو کیا — نقش بگڑتے جائیں

جلتی آنکھوں میں — سپنے بجھتے جائیں

جتنا دھتکارے — اور لپٹتے جائیں

رولیں خود پر ہی — کچھ تو کرتے جائیں!

ق

بیٹھے بیٹھے ہی — ہاتھ نہ ملتے جائیں

ایک چراغ سہی — راہ میں دھرتے جائیں

سچی بات لکھیں — جب تک لکھتے جائیں

Scanned with CamScanner

جو کچھ بس میں ہے وہ تو کرتے جائیں
رزمِ ہستی سے لڑتے لڑتے جائیں
مُردہ مٹی کو زندہ کرتے جائیں
جب تک زندہ ہیں آگے بڑھتے جائیں

ق

آؤ ہم اور تُم ایسا کرتے جائیں
آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتے جائیں
باتوں باتوں میں غُنچے کھِلتے جائیں
رنگوں میں نکلیں خوشبو ہوتے جائیں
اُمّیدیں پھُوٹیں خدشے مرتے جائیں

امجد سب کے دل
اور نکھرتے جائیں

—

rekhta

Scanned with CamScanner

وہ دن اَب کچھ دُور نہیں

وہ دن اب کچھ دُور نہیں ،
جب آپس میں کرنے والی سب باتیں بھی
انٹرنیٹ پر ہوں گی ،
جذبے ـــــ نقطوں اور لکیروں کی بولی میں بات کریں گے
لفظوں کی امداد لیے بن
اِک دُوجے کے خواب اور خدشے پڑھ پائیں گے ،
دھاگا دھاگا خاموشی سے اپنے گیت اور خواب بُنیں گے ،
خُوشبو دیکھیں، رنگ سُنیں گے!!

وہ دِن اب کچھ دُور نہیں !
وقت سمندر کی لہروں میں تنہا تنہا چلنے والے

INTERNET ⁘

Anjuman Taraqqi Urdu

Scanned with CamScanner

جسموں کی آواز کو سُن کر اِک دُوجے کی سمت بہیں گے
پَل دو پَل کی وحشت میں اِک ساتھ رہیں گے
اور پھر ایسے ہو جائیں گے ،
جیسے یہ صحبت ہی اُن کے جیون بھر کا سرمایہ ہو
جس سے اگلے وقتوں والے
نسل ، قبیلے ، قوم وغیرہ کی پہچانیں کرتے تھے اور
مِل کر جیتے مرتے تھے !

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !
ہر اِک بات اُدھوری ہو گی
ایک ہی گھر کے دو کمروں میں
لاکھوں میل کی دُوری ہو گی
ردّی کا انبار سا ہوں گے جتنے رشتے ناتے ہیں
چاند نگر کی سیر کو خلقت ایسے آتی جاتی ہو گی
جیسے اب ہم بازاروں میں شاپنگ کرنے جاتے ہیں

SHOPPING :⁚

Scanned with CamScanner

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !
جب اِک سوچ اور ایک ہی جیسی شکلوں والے، آدم زادے
آدم زاد تو شاید ہوں گے
لیکن اُن کی شخصیت کے سارے جوہر
آنکھوں اور بالوں کی رنگت ،
خوشیاں ، محفل ، تنہائی ،
فکر ، تدبّر ، دانائی
شعر ، غنا ، تصویر
مستقبل میں آنے والے لمحوں کی تقدیر
سب کچھ اُن کے جینز* کے اَندر حسبِ ضرورت شامل ہوگا
ساری باتیں اَز بر ہوں گی ، ہر اِک فعل مکمّل ہوگا

وہ دن اب کچھ دُور نہیں !
اِنسانی جسموں کے اعضا ،

* GENES

Scanned with CamScanner

فالتو پرزوں کی صورت میں شوکیسوں میں رکھتے ہوں گے
(جینیوئن بھی اور دونمبر بھی)
تیسری دُنیا کے دل والے
پہلی دُنیا کے لوگوں کی آنکھیں اوڑھ کے نکلیں گے تو
سُورج اندھا ہو جائے گا!
آقاؤں کے سینوں میں جب محکوموں کے دِل دھڑکیں گے
سب کچھ اُلٹا ہو جائے گا

وہ دن اَب کچھ دُور نہیں ــــ!
جب آنکھوں سے اوجھل منظر بالکل صاف نظر آئیں گے!
آئینوں میں عکس کے بدلے نمبر جلتے بجھتے ہوں گے
لوگ مشینیں بن جائیں گے،
تخمینوں کے بیش و کم میں ہر اک چیز اضافی ہو گی
جُرم بنیں گے پیار محبّت! دِل کی موت، تلافی ہو گی

GENIUNE :.

Scanned with CamScanner

ڈھند جمے گی سینوں میں اور برف اُگے گی پیڑوں پر
روبوٹوں سے ملتے جُلتے نقش بنیں گے چہروں پر
ایک ہی وقت میں جن کی آنکھیں
آگے پیچھے دیکھ سکیں گی
کان، سمندر کے نیچے کی آوازیں پہچان سکیں گے
تاروں کے اُس پار ہے کیا کیا!
یہ بھی شاید جان سکیں گے!

وہ دن اب کچھ دُور نہیں ــــ!
جب یہ سب کچھ "ہونے والا"
ہو جائے گا
رات ابھی تک باقی ہو گی اور اُجالا ہو جائے گا
ہر اک خواب اور ہر اک جذبہ،
ماضی کے مرحوم دنوں کا ایک حوالہ ہو جائے گا۔

rekhta

Scanned with CamScanner

کل کے آدم کے ہاتھوں میں ہر اِک قفل کی کُنجی ہوگی
لمحے اُس کے چاکر ہوں ہر اِک ساعت باندی ہوگی
دستِ ہُنر کی فنکاری سے، عقل کی روشن مشعل سے
دُنیا ویسی ہو جائے گی، جیسی اُس نے سوچی ہوگی!!
یہ تو سب کچھ ہو جائے گا، پھر بھی دل یہ کہتا ہے!
"یہ جو چاروں سمت ہمارے، وقت کا دریا بہتا ہے
کیا ہے اِس کے آگے پیچھے؟ کیوں ہے یہ اور کب سے ہے؟
کس کے حُکم سے چلتا ہے اور کس کی کھوج میں رہتا ہے؟
جو کچھ ہم نے جان لیا ہے — یہ تو ہے تحقیق!
اپنی اصل میں لیکن چیزیں کس کی ہیں تخلیق؟
کِس نے کی ارزانی ہم کو یہ ساری توفیق؟
جس کا بھید نہ کھل پائے وہ ایک سِرا تو پھر بھی ہے!
اس ساری تعمیر میں یعنی ایک خلا تو پھر بھی ہے!
ہستی کے اس کھیل کے پیچھے، ایک خُدا تو پھر بھی ہے!!"

○

گزرے کل سا لگتا ہو جب آنے والا کل
ایسے حال میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ چل

کرتی ہیں ہر شام یہ بنتی، آنکھیں ریت بھری
روشن ہو اے امن کے تارے، ظلم کے سورج، ڈھل

اپنا مطلب کھو دیتی ہے دل میں رکھی بات
رونا ہے تو کھل کے رو اور جلنا ہے تو، جل

لمحوں کی پہچان یہی ہے، اڑتے جاتے ہیں
آنکھوں کی دہلیز پہ کیسے ٹھہر گیا، وہ پل!

Scanned with CamScanner

عشق کے رستے لگ جائیں تو لوگ بھلے چنگے
ہوتے ہوتے ہو جاتے ہیں، دیوانے، پاگل!

موسم کی سازش ہے یا پھر مٹی بانجھ ہوئی!
پیڑ زیادہ ہوتے جائیں، گھٹتا جائے پھل!

جُھکی جُھکی آنکھوں کے اُوپر بوجھل پلکیں تھیں
لیکن کیسے چُھپ سکتا تھا! کاجل ہے کاجل!

زورآور کے دستِ ستم میں دونوں گِروی ہیں
مزدوروں کا خُون پسینہ، دہقانوں کا ہَل!

بُجھتے تاروں کی جِھلمل میں اوس لرزتی ہے
امجد دُنیا جاگ رہی ہے تُو بھی آنکھیں مَل

Scanned with CamScanner

○

خُود اپنے لیے بیٹھ کے سوچیں گے کسی دِن
یُوں ہے کہ تجھے بھُول کے دیکھیں گے کسی دِن

بھٹکے ہُوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں
دُنیا نے دیا وقت تو لکھیں گے کسی دن

ہل جائیں گے اِک بار تو عرشوں کے دَر و بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کسی دن

Scanned with CamScanner

آپس کی کسی بات کا ملتا ہی نہیں وقت
ہر بار یہ کہتے ہیں کہ " بیٹھیں گے کسی دن!"

اے جان تری یاد کے بے نام پرندے
شاخوں پہ مرے درد کی اُتریں گے کسی دن؟

جاتی ہے کسی جھیل کی گہرائی کہاں تک!
آنکھوں میں تری ڈوب کے دیکھیں گے کسی دن

خُوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اِک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن

سوئیں گے تری آنکھ کی خلوت میں کسی رات
سائے میں تری زُلف کے جاگیں گے کسی دن!

صحرائے خرابی کی اسی گردِ سفر سے
پھُولوں سے بھرے راستے نکلیں گے کسی دن

rekhta

Scanned with CamScanner

خوشبو کی طرح، مثلِ صبا، خواب نما سے
گلیوں سے ترے شہر کی گزریں گے کسی دن

امجدؔ ہے یہی اب کہ کفن باندھ کے سر پر
اُس شہرِ ستم گار میں جائیں گے کسی دن!

---

rekhta

Scanned with CamScanner

○

خواہش کی کسی موج کے ریلے میں رہیں گے
شبنم کی طرح صُبح کے میلے میں رہیں گے!

دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک لوگ جھمیلے میں رہیں گے

مر جائیں گے ہم تم تو، مگر گیت ہمارے
اے دوست رواں وقت کے بیلے میں رہیں گے

موجود تو ہوں گے مگر احساس کی صُورت!
خُوشبو کی طرح رنگ کے میلے میں رہیں گے

آنکھوں میں اُتر آئے گی اَندر کی اُداسی
امجدؔ جو یونہی آپ اکیلے میں رہیں گے!

rekhta

Scanned with CamScanner

○

دَرْدِ دل کا جہاں رواج نہیں
ایک انبوہ ہے، سماج نہیں

اے غمِ ہجرِ یار، یہ تو بتا
کیا تجھے کوئی کام کاج نہیں!

وہ ہے ہرجائی، یہ بجا، لیکن
دِل بھی تو مستقل مزاج نہیں

تیرے غم کے سوا زمانے میں
کون سے دَرْد کا علاج نہیں!

حرص کھا جاتی ہے غریب کا رزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

تیری آنکھوں سی، دوسری آنکھیں
شاید ہوں گی کبھی، پر آج، نہیں

مملکتِ حُسن سی نہیں کوئی
عشق سا کوئی تخت و تاج نہیں

ق

کون سی آنکھ ہے تہی تجھ سے!
کون سے دل پہ تیرا راج نہیں!

اے خُدا، اے مرے ہُنر کے خُدا
اور کچھ میری احتیاج نہیں!

بستیوں کو نہ پستیوں میں رکھ
التجا ہے یہ، احتجاج نہیں

---

rekhta

Scanned with CamScanner

○

رات کی سیج خالی ہے
دیکھ، وہ صبح ہونے والی ہے!

میرے دل سے تری نگاہوں تک
دَرد نے راہ کیا نکالی ہے!

ہے پرے حدِ آسمان سے کیا؟
سب فضا اپنی دیکھی بھالی ہے

کہہ رہی ہے چمک ستاروں کی
درد کی رات ڈھلنے والی ہے!

جو نہ کہنی تھی بات، کہہ آئے
اور جو کہنی تھی وہ چُھپالی ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

اِک طرف دل تھا، اِک طرف دُنیا
ہم نے دونوں سے سُر ملالی ہے

آنکھ والوں کے واسطے، منظر
ایک روزن ہے، ایک جالی ہے!

پھر وہی آنسوؤں کی بارش ہے
پھر وہی دل کی خشک سالی ہے!

پھیلتی جا رہی ہے قوسِ قزح
دل پہ کِس نے نگاہ ڈالی ہے

دوستوں کا وہ دوست ہے امجد
نام جس کا جمیل عالی ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

rekhta

آندھیوں کی بے ٹھکانہ منزلوں میں
ریت ٹیلے ہو گئے
بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرتے کرتے
آپ نیلے ہو گئے

Scanned with CamScanner

○

افلاک کا سایا ہے جو کچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میرا، تعبیر کہیں پر ہے

کچھ ایسی نظر ڈالی ہنگامِ وداع اُس نے
میں خُود تو چلا آیا دل اب بھی وہیں پر ہے

اے فکرِ سماواتی، اے طائرِ لاہُوتی!
پرواز سے کیا حاصل! جو کچھ ہے زمیں پر ہے

"موجود" میں رہنے سے "آئندہ" نہیں ملتا
اثبات کا ہر جلوہ موقوف "نہیں" پر ہے

Scanned with CamScanner

اُس لمحے کے جادُو سے پھر وقت نہیں نکلا
جو چیز جہاں پر تھی وہ چیز وہیں پر ہے

چاہے تو یونہی رکھے، چاہے تو سَحر کر دے
اِس رات کا مُستَقبِل اُس ماہ جبیں پر ہے

اِس عمُر کی فرُصت میں ہر چیز کا ہونا ہے
جنّت بھی یہیں ہو گی! دوزخ جو یہیں ہے

—

rekhta
Anjuman Taraqqi Urdu
Scanned with CamScanner

rekhta

○

کرتا ہُوں جمع میں تو بکھرتی ہے ذات اور
باقی ہے کتنی اے مرے مولا ، یہ رات اور!

لیتی ہے جلتی شمع بھی بُجھنے میں کچُھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں بے ثبات اور!

سیلاب جیسے لیتا ہے دیوار کے قدم
کرتا ہے غم بھی دل سے کوئی واردات اور

Scanned with CamScanner

یوں تو حضور پاکؐ کے لاکھوں ہیں مدح خواں
تائبؔ سی لکھ رہا ہے مگر کون، نعت اور!

مظہر، ازل کے حُسن کے امجد ہیں بے شُمار
لیکن جو دیکھئے تو ہے بارش کی بات اور

۱۔ حفیظ تائب

rekhta

Scanned with CamScanner

میں نے دیکھا اُسے

میں نے دیکھا اُسے ،

اجنبی سی کسی ایک محفل میں ، میری طرح

وہ بھی ہونٹوں پہ اک بے ارادہ تبسم سجائے ہُوئے

ایک کونے میں بیٹھی کبھی اپنے ناخن ،

کبھی سامنے نیم خالی پڑے جامِ مشروب کو

اور کبھی میز کی آڑ میں

اپنی نازک کلائی پہ باندھی ہُوئی وہ گھڑی دیکھتی تھی

جسے آگے چل کر ......

مگر یہ تو سب بعد کے واقعے ہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

ابھی تو اُسے اِس تکلّف بھری اجنبی بزم میں
غالباً
میری موجودگی کی خبر، میرے ہونے کا احساس تک بھی نہ تھا!
میزباں تھا کوئی یا کوئی اور ہی مہرباں تھا!
کہ جس نے ہمیں ایک دُوجے کے نام
اور ان کے کناروں سے لپٹے ہُوئے کچھ حوالے بتائے
کسے یہ خبر تھی کہ اُس سرسری سے تعارف کا وہ
ایک پَل، ایک ایسے تعلّق کی تمہید ہے
جو ہمارے لیے ....
مگر یہ بھی سب بعد کی بات ہے !

تو پھر یوں ہُوا
اپنی اپنی اُداسی کی شالوں میں لپٹے ہوئے، دیر تک
ہم وہیں ایک کونے میں بیٹھے رہے ،

Scanned with CamScanner

پھر کسی نے ڈنر کے لیے سب کو آواز دی
اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، کھانا
بہت پُرتکلف تھا اور میزبانوں
کے حُسنِ مدارات کے ساتھ اُن کے تموّل کا بھی ترجماں تھا، مگر
وہ کسی اور ہی سوچ میں دیر تک
اِک منقش رکابی اُٹھائے ہُوئے ایستادہ رہی،
میں نے اُس کے لیے
میز کے سامنے اِک جگہ سی بنائی اور اُس کی طرف
دوستانہ تبسم سے دیکھا کہ وہ
آگے بڑھ کر رکابی میں کچھ ڈال لے!
اُس نے آدابِ محفل میں بیٹھی ہُوئی
مُسکراہٹ سے مجھ کو نوازا مگر، آگے آئی نہیں،
ایک لمحے کو جب میری اُس کی نگاہیں ملیں
تو مجھے یوں لگا، جیسے وہ

Scanned with CamScanner

اپنی ان خوشنما جھیل سی خواب آنکھوں میں
پھیلی اُداسی، . . . چھپاتے چھپاتے بہت تھک چکی ہو

سبز قہوے کے دَور اور اقبال بانو کی مسحُور کُن
دِل نشیں گائیکی سے مہکتی ہُوئی اُس فضا میں وہ یوں
بے تعلّق سی بیٹھی رہی، جیسے وہ اُس گھڑی،
واں پہ تھی ہی نہیں

میں نے اُس سے کہا، . . . . . .
او خُدا! یہ تو پھر بعد کی بات ہے!
اُس گھڑی تو فقط میں نے چاہا کہ اُس سے کہوں
کچھ کہوں! اُس کو بتلاؤں
"اے اجنبی ہم نشیں
اس اُداسی کو کچھ دیر کے واسطے بھول جا، مُسکرا

rekhta

Scanned with CamScanner

دیکھ ، دُنیا میں غم کے سوا بھی بہت کچھ ہے ، آنکھیں
فقط آنسوؤں کے لیے ہی نہیں خواب بھی
ان کی جاگیر ہیں !
دیکھ میری طرف !
مجھ سے بھی زندگی نے ہمیشہ رقیبوں سا ہی
ایک رشتہ رکھا
میں نے بھی آج تک اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھی نہیں
سنگ و خشتِ تمنّا چُنے ہیں سدا
بخدا ، کوئی تعمیر دیکھی نہیں !"

رات ڈھلنے لگی ،
اور آہستہ آہستہ کمرے سے مہمان گھٹنے لگے ،
میزبانوں کے ہونٹوں کے لفظ
الوداعی مصافحوں کی یکسانیت میں بکھرتے ہُوئے

Scanned with CamScanner

اپنی گرمی سے محروم ہوتے گئے
اور باہر سے آتے ہوئے شور کی
دُور ہوتی صداؤں کے ہنگام میں
میزبانوں سے کچُھ بات کرتے ہوئے
اُس نے دیکھا مجھے‘۔ اُس کے ہونٹوں کے کونے ذرا کپکپائے
وہ جیسے کسی نیند میں مُسکرائی،
چلی، پھر رُکی ۔ رُک کے دیکھا مجھے!

ہاں یہی وہ نظر تھی
یہی وہ مقدّر بداماں نظر تھی
جو میرے لیے، صرف میرے لیے تھی
کہ جس میں اُلجھ کر
مری زندگی کی،
مرے آنے والے شب و روز کی

Scanned with CamScanner

اور مرے سارے خوابوں کی منزل نہاں تھی

زمان و مکاں کے سبھی فاصلے

ایک پل کے لیے بے نشاں ہو گئے

اُسی اِک نظر میں دُھواں ہو گئے

پھر نہ میں تھا کہیں اور نہ کچھ اور تھا

بس ازل تا ابد ایک خوشبو رواں تھی

فقط وہ ــــ وہاں تھی!

rekhta

Scanned with CamScanner

خدشہ

گزرے لمحوں کی اُلجھی ہُوئی ڈور کے اُس طرف
خواب میرے جہاں دفن مٹی میں تھے
بارشوں نے وہاں گھاس اِتنی اُگا دی
کوئی رہنما سی علامت، نشانی کوئی، کچھ بچا ہی نہیں،
کچھ بچا ہی نہیں کہ کسی یاد کی
کوئی اُلجھی ہُوئی اِک گرہ کھولتے!
وہ سِرا ڈھونڈتے!
ایک بھیدوں بھرا اور زمانوں پہ پھیلا ہُوا
وہ سِرا ڈھونڈتے
جو کہیں خواب اور اُس کی تعبیر کے درمیاں کھو گیا!

Scanned with CamScanner

ہو چکی ہیں بہت ہجر کی بارشیں

دن بہت جا چکے !

خواب میرے جہاں دفن مٹّی میں ہیں

اب وہاں ہر طرف گھاس ہی گھاس ہے

اور اس گھاس میں سرسراتا ہُوا

سانپ سا ایک ڈر ہے ،

کہیں یہ نہ ہو !

ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سرا مل بھی جائے !

وہ گِرہ کھُل بھی جائے !

تو لمحوں کی اُلجھی ہُوئی ڈور کے اُس طرف

کچُھ نہ ہو —— !!!"

Scanned with CamScanner

کسی خُوش نِگاہ سی آنکھ نے .....

کسی خُوش نگاہ سی آنکھ نے یہ کمال مجُھ پہ کرم کیا
مری لوحِ جاں پہ رقم کیا
وہ جو ایک چاند سا حرف تھا وہ جو ایک شام سا نام تھا
وہ جو ایک پھُول سی بات پھرتی تھی دربدر
اُسے گلستاں کا پتا دیا
مِرا دل کہ شہرِ ملال تھا اُسے روشنی میں بسا دیا
مِری آنکھ اور مِرے خواب کو کسی ایک پل میں بہم کیا۔

rekhta

Scanned with CamScanner

مرے آئنوں پہ جو گرد تھی مہ و سال کی
وہ اُتر گئی
وہ جو دُھند تھی مرے چار سُو وہ بکھر گئی
سبھی رُوپ عکسِ جمال کے
سبھی خواب شامِ وصال کے
جو غبارِ وقت میں سر بسر تھے اَٹے ہُوئے
وہ چمک اُٹھے
وہ جو پھُول راہ کی دُھول تھے، وہ مہک اُٹھے،
لیے سات رنگ بہار کے
چلا ہیں جو سنگ بہار کے!
تو سجا دیئے سبھی راستے،
کسی دستِ شعبدہ ساز نے
مرے نام پر، مرے واسطے !

Scanned with CamScanner

مری بے گھری کو پناہ دی، مری جستجو کو نشاں دیا
جو یقین سے بھی حسین ہے مجھے ایک ایسا گماں دیا

وہ جو ریزہ ریزہ وجود تھا
اُسے اِک نظر میں بہم کیا
کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے
یہ کمال مُجھ پہ کرم کیا!!

---

rekhta

Scanned with CamScanner

○

شمارِ گردشِ لیل و نہار کرتے ہُوئے
گزُر چلی ہے ترا انتظار کرتے ہُوئے

خُدا گواہ ، وہ آسُودگی نہیں پائی
تمھارے بعد کسی سے بھی پیار کرتے ہوئے

اَزل سے یونہی چلی آرہی ہے یہ دُنیا
اِسے نہال، اُسے بے قرار کرتے ہُوئے

تمام اہلِ سَفر ایک سے نہیں ہوتے
کھُلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

rekhta

Scanned with CamScanner

ق

عجب نہیں کبھی گزُرے ترے خیال کی رَد
مرے گمان کے طائر شکار کرتے ہُوئے

کہیں چُھپائے مرے سامنے کے سب منظر
مجھے، مجھی پہ کبھی آشکار کرتے ہُوئے

کِسے خبر ہے کہ اہلِ چمن پہ کیا گزری !
خزاں کی شام کو صبحِ بہار کرتے ہُوئے

ہَوس کی اور لُغت ہے وفا کی اور زباں
یہ راز ہم پہ کھُلا، انتظار کرتے ہُوئے

عجیب شے ہے محبّت کہ شاد رہتی ہے
تباہ ہوتے ہوئے اور غبار کرتے ہُوئے

Scanned with CamScanner

ق

جو ہو سکے تو کبھی میرؔ جی سے یہ پُوچھیں
یہ جان اُن کی غزل پر نثار کرتے ہُوئے

یہ کارخانہ اگر سر نا پا تو ہم سے ہے ؟
تو لوگ کیسے چلیں، اعتبار کرتے ہوئے

ہمارے بس میں کوئی فیصلہ تھا کب امجدؔ!
جنُوں کو چُنتے ، وفا اختیار کرتے ہُوئے!

---

rekhta

Scanned with CamScanner

○

دو گھڑی دِل کا حال سُنتا جا
اے مرے خُوش جمال سُنتا جا

عِشق کی خُود سُپردگی کو دیکھ!
عقل کی قِیل و قال، سُنتا جا

یہ اَماوس کی آخری شب ہے
داستانِ ملال، سُنتا جا

"من نہ کردم، شما حذر بکنید"
زندگی کا مآل، سُنتا جا

rekhta

Scanned with CamScanner

تجھ سے کرنا نہیں جواب طلب
آخری اِک سوال سُنتا جا

گُونج میں ٹوٹتے ستاروں کی
سب عُروج و زوال سُنتا جا

تجھ پہ بیتی ہے جو بھی کہہ امجدؔ
کچھ مِرے حسبِ حال سُنتا جا

---

rekhta

Scanned with CamScanner

○

آئینوں میں عکس نہ ہوں تو حیرت رہتی ہے
جیسے خالی آنکھوں میں بھی وحشت رہتی ہے

ہر دم دُنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے،
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے

کرنی ہے تو کھُل کے کرو انکارِ وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

شہرِ سخن میں ایسا کچھ کر، عزت بن جائے
سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے عزت رہتی ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

بنتے بنتے ڈھ جاتی ہے دل کی ہر تعمیر
خواہش کے بہروپ میں شاید قسمت رہتی ہے!

سائے لرزتے رہتے ہیں شہروں کی گلیوں میں
رہتے تھے انسان جہاں اب دہشت رہتی ہے

موسم کوئی خوشبو لے کر آتے جاتے ہیں
ہر پل دھیان دریچے میں اک صورت رہتی ہے

چاپ کوئی جو مُڑ جاتی ہے دل دروازے سے
کیا کیا ہم کو رات گئے تک وحشت رہتی ہے!

دھیان میں میلہ سا لگتا ہے بیتی یادوں کا
اکثر اُس کے غم سے دل کی صحبت رہتی ہے

پھولوں کی تختی پہ جیسے رنگوں کی تحریر
لوحِ سخن پر ایسے امجدؔ شہرت رہتی ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

rekhta

○

جو بھی اُس چشمِ خُوش نگاہ میں ہے
حاکمِ وقت کی پناہ میں ہے

فرق سائل کی بے صدا میں کچھ!
یا کمی ظرفِ بادشاہ میں ہے؟

اُس کو اہلِ ہوس نہ سمجھیں گے!
لُطف جو فاصلے کی چاہ میں ہے

Scanned with CamScanner

داستاں، شب کے جاگنے کی، رقم
آنکھ کے حلقۂ سیاہ میں ہے

حالتِ جنگ ہی میں رہتا ہے
جب سے دل دزد کی سپاہ میں ہے

نہیں وہ خواہشِ نجات میں بھی
جو کشش دامنِ گناہ میں ہے!

بے نیازی سہی طبیعت میں
دلبری بھی تو اُس نگاہ میں ہے

رُوح بیدار ہوتی جاتی ہے
دل کسی روشنی کی راہ میں ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

تیغِ دو دم سے بھی سوا خطرہ
حلقۂ قُرب بادشاہ میں ہے

بہت آساں ہے مُدّعی ہونا!
جتنی مشکل ہے سب نباہ میں ہے

کیا یقیں ہو کسی پہ جب، امجد
اپنا ہونا بھی اشتباہ میں ہے!

—

rekhta

Anjuman Taraqqi Urdu

Scanned with CamScanner

اے راندگانِ خاک!!

اُٹھو زمین سے اے راندگانِ خاک، اُٹھو!
خُدا نے سر جو دیے ہیں، اُنھیں اُٹھا کے چلو
تمام سجدے بشر پر حرام ہوتے ہیں
(بس ایک سجدہ ہے جائز جو اُس کو زیبا ہے)
اُٹھو زمین سے اے کشتگانِ دزد کہ اب
وہ بے کسی کے زمانے تمام ہوتے ہیں!!

یہ بے بسی کے وظیفے — یہ عاجزی کے وِرد
اَزل سے آج تک کِس کے کام آئے ہیں!
حقوق گرتے نہیں کاسۂ گدائی میں
کبھی نہ بھیک کے ٹکڑوں پہ نام آئے ہیں!
اُٹھو زمیں سے، اُٹھاؤ سروں کو، دیکھو تو!
تمھارے واسطے کیا کیا پیام آئے ہیں!!

rekhta

Scanned with CamScanner

بھلے دنوں کی توقع میں جاگتی آنکھیں
بکھر گئیں اِسی مٹّی میں انتظار کے بعد!
جو خواب دیکھے ہیں صدیوں تمھارے آبا نے
جو تم بھی دیکھتے جاؤ گے رات دن یوں ہی
تمھیں بھی خواب ہی واپس ملیں گے اور وہ بھی
بڑی اذیّت و ذلّت، بہت پُکار کے بعد!

سو اب جو دیکھو تو زندہ حقیقتیں دیکھو
کہ جن کے سائے میں تم کو حیات کرنی ہے
گزارنے ہیں یہیں پر تمام آتے دن!
یہیں تمھارے عزیزوں نے رات کرنی ہے!
ہے سرِ حرمتِ آدم، زباں کی آزادی،
کرو اے بخت گزیدو جو بات کرنی ہے!!

اسلام آباد کی ایک سڑک

بُلند و بالا، وسیع و عریض، پُر ہیبت
یہ سنگ و خشتِ تراشیدہ سے بنے ایواں!
یہ جگمگاتی ہُوئی کھڑکیوں کے رنگِ رواں!
وہ بُت کدے ہیں جہاں،

ہر اِک غرض کے لیے ایک دیوتا ہے الگ
سب اپنی اپنی مہارت میں مختلف ہیں مگر
ہے سب کی ایک سی صُورت، ہے سب کی ایک زباں
برائے خلقِ خدا سب ہیں یک دل و یکساں

Scanned with CamScanner

جو کوئی غور سے دیکھے عجب تماشے ہیں!
کسی کے کام نہ آئیں یہ وہ دلاسے ہیں!
یہ لوگ پانی میں رکھے ہُوئے بتاشے ہیں!

یہیں پہ بٹتی ہے امن وسکون کی دولت!
یہیں شجاعت وصدق وصفا کے مکتب ہیں
یہیں پہ رہتا ہے اہلِ دُعا کا مستقبل
یہیں ہے عدل کی کُرسی، یہیں مناصب ہیں!
یہاں زمیں کا سِرا آسماں سے ملتا ہے
سوائے خیر کے، سب کچھ یہاں سے ملتا ہے!!

Scanned with CamScanner

○

دِل کو حصارِ رنج و اَلم سے نِکال بھی
کب سے بِکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی

آہٹ سی اُس حسین کی ہر سُو تھی، وہ نہ تھا
ہم کو خُوشی کے ساتھ رہا اِک ملال بھی

سب اپنی اپنی موجِ فنا سے ہیں بے خبر
میرا کمالِ شاعری، تیرا جمال بھی

rekhta

Scanned with CamScanner

حُسنِ اَزل کی جیسے نہیں دُوسری مثال
ویسا ہی بے نظیر ہے اُس کا خیال بھی!

مت پُوچھ کیسے مرحلے آنکھوں کو پیش تھے
تھا چودھویں کا چاند بھی، وہ خُوش جمال بھی!

جانے وہ دن تھے کون سے اور کون سا تھا وقت!
گڈ مڈ سے اب تو ہونے لگے ماہ و سال بھی!

اِک چشمِ التفات کی پیہم تلاش میں
ہم بھی اُلجھتے جاتے ہیں، لمحوں کا جال بھی!

دنیا کے غم ہی اپنے لیے کم نہ تھے کہ اور
دل نے لگا لیا ہے یہ تازہ وبال بھی!

Scanned with CamScanner

اِک سرسری نگاہ تھی، اِک بے نیاز چُپ
میں بھی تھا اُس کے سامنے، میرا سوال بھی!

آتے دنوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ کھُلے
سب کچھ فنا کا رزق ہے ماضی بھی حال بھی!

تم دیکھتے تو ایک تماشے سے کم نہ تھا
آشفتگانِ دشتِ محبت کا حال بھی!

اُس کی نگاہِ لُطف نہیں ہے، تو کچھ نہیں
امجدؔ یہ سب کمال بھی، صاحبِ کمال بھی!

Scanned with CamScanner